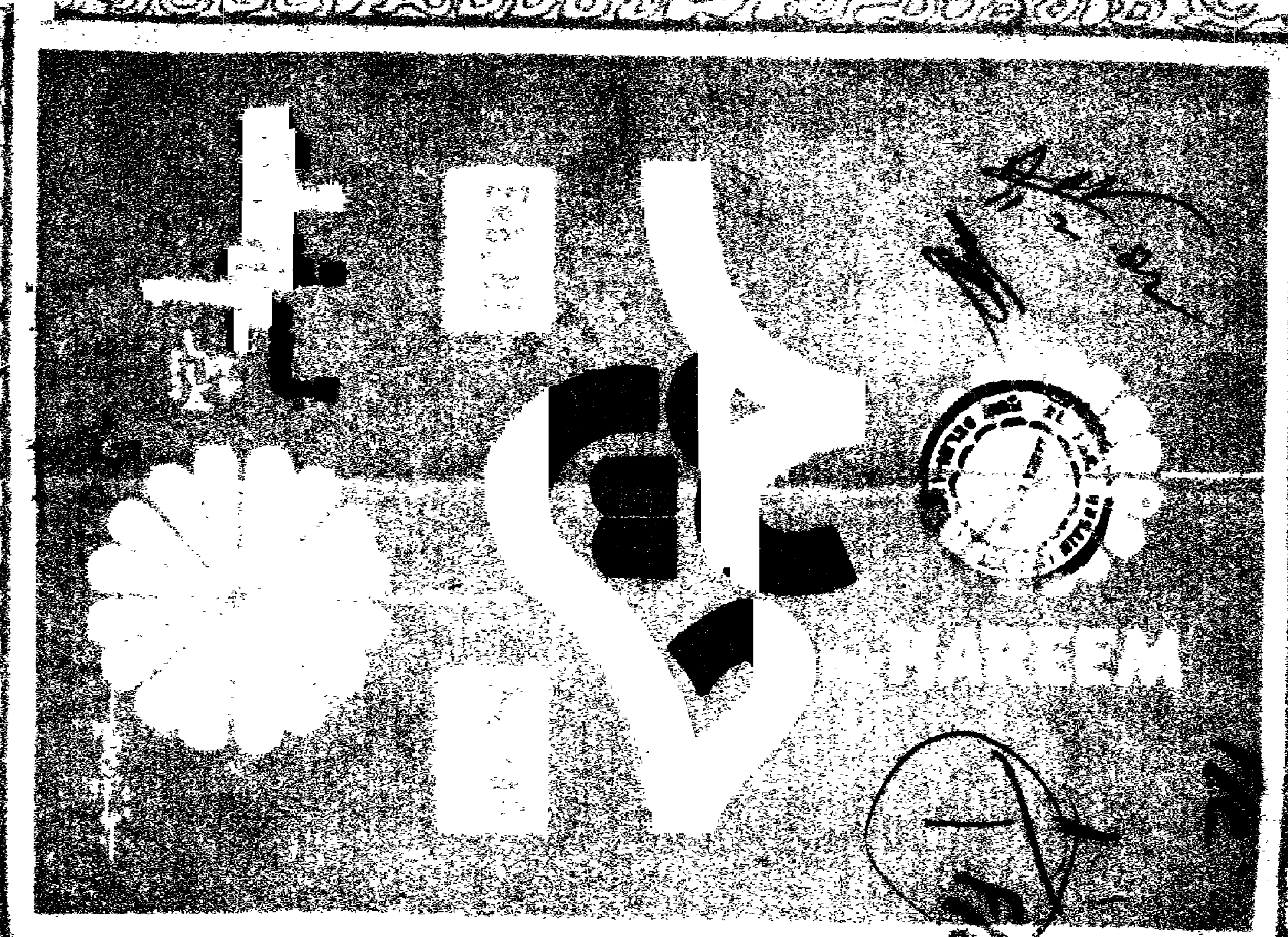

HAREEM

گذشتہ ۵۲ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا
سب سے پرانا رسالہ ہے

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیادگار
محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
بیگم سلیم انہونوی مرحومہ

جلد ۵۲ | فہرست مضامین ماہ فروری ۱۹۸۲ء | نمبر (۲)

ایڈیٹر و نگراں
نسیم انہونوی

معاونین
شوکت جہاں بیگم جانی بیگم ردولوی

فی شمارہ کی قیمت	۱-۴۰	روپیہ
چندہ سالانہ منی آرڈر سے	۲۱/-	روپیہ
چندہ سالانہ (اعزازی)	۲۶/-	روپیہ
چندہ مخصوص ۔ مخصوص	۴۸/-	روپیہ
وی پی سے منگوانے پر چار روپئے زائد		روپیہ
غیر ممالک سے	۴۰/-	روپیہ

یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی میل۔ ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

ناشر: .. .. .. فہیم انہونوی

آفس و ترسیل زر کا پتہ:۔ نسیم بک ڈپو ۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ ۔ فون آفس:۔ ۴۴۵۵۹ ۔ رہائش:۔ ۵۲۳۳۴
فہیم انہونوی نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

لمعات

ایک زمانہ تھا کہ سال بھر میں کہیں دو چار شادیوں میں شرکت کرنا پڑتی تھی اور یہ شادیاں کبھی اس طرح ہوتی تھیں کہ شادی سے ایک دو ماہ پیشتر اس مضمون کا خط آجاتا تھا کہ "نور چشم فلاں کی شادی بتاریخ فلاں ہوگی۔ آپ کچھ روز قبل ہی تشریف لاکر اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں ———"

اور لوگ شادی میں شرکت کا انتظام کرکے واقعی چند روز پہلے ہی پہنچ جاتے تھے۔ لیکن اب تو یہ عالم ہے کہ روزانہ دو چار شادی کے کارڈ وصول ہوتے ہیں اور ایک ایک دن میں کئی کئی شادیوں میں شرکت کی دعوت ملتی ہے۔ عموماً شادیاں یا دن میں ہوتی ہیں یا رات میں۔ اس طرح ایک شخص زیادہ سے زیادہ دو ہی شادیوں میں ایک روز شرکت کر سکتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ بس وقت مقررہ پر بھاگ دوڑ کرکے پہنچ جائے۔ یہ اس لئے کہ اب انسان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ وہ قبل از وقت شادیوں کی تقاریب میں جاکر صاحب خانہ کا ہاتھ بٹائے۔ وقت پر پہنچ کر شرکت کر لینا ہی آجکل دشوار ہو رہا ہے اور اس لئے اب اس طرح کے دعوت نامے کبھی وصول نہیں ہوتے جن میں لکھا ہو کہ چند روز قبل ہی تشریف لاکر ہاتھ بٹائیں۔

اب کبھی مصیبت یہ ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں کئی کئی شادیوں کی شرکت کے دعوت نامے وصول ہوتے ہیں اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ دعوت نامے ایسے حضرات کے ہوتے ہیں جن سے برابر کے تعلقات ہوتے ہیں اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس شادی میں شرکت کی جائے اور کس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اکثر یہ بڑا ہی مشکل ہو جاتا ہے اس لئے کہ جس شادی میں شرکت نہ کیجئے اس کے منتظمین کو یہ علم ہو جاتا ہے کہ فلاں شادی میں گئے۔ میرے یہاں نہیں آئے اور اس علم کے بعد تعلقات میں تلخی پیدا ہو جاتی ہے [illegible] میں شرکت نہیں ہو پاتی وہ سمجھتا ہے کہ اسے حقیر سمجھا گیا۔

ایک بار مجھ کو خود تین شادیوں میں شرکت کی تینوں شادیاں بعد مغرب تھیں۔ شہر ہی میں تھیں۔ پہلے ایک جگہ گیا نکاح میں دیر تھی اس لئے کہ بارات کا پتہ نہ تھا اس لئے دوسری جگہ چلا گیا۔ وہاں اتفاق سے بارات بروقت آگئی تھی۔ نکاح میں شرکت کی۔ صاحب خانہ کو مبارکباد دی اور اجازت لے کر پھر دوسری شادی میں واپس گیا۔ یہاں اتنی دیر میں نکاح ہو چکا تھا۔ کھانا آ رہا تھا۔ میں نے صاحب خانہ سے کہا کہ مجھے ایک اور شادی میں شرکت کرنا ہے۔ اس لئے اجازت چاہتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا۔ ماحضر تو تناول فرمالیں۔ میں نے کہا دیر ہو جائے گی۔ اجازت دیجئے تو بہتر ہوگا۔ صاحب خانہ نے کہا میں آپکو باراتیوں کے ساتھ بٹھائے دیتا ہوں۔ میں خاموش ہو گیا جلد ہی کھانا شروع ہو گیا۔ میں نے صرف چند لقمے شیرمال کے کباب سے کھالئے تاکہ وہ تیسری جگہ کے لئے بھی گنجائش رہے۔ لیکن صاحب خانہ جو میری بہت عزت کرتے اور برابر میرے دست و دہن کی نقل و حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ پاس آکر مرغ کی ڈش سے مرغ کی ٹانگ نکال کر میری پلیٹ میں رکھنے لگے۔ میں نے کہا معاف فرمائیں ایک جگہ کبھی دو چار لقمے کھالے ہیں ورنہ انھیں شکایت ہوگی۔ [illegible] دل بھی رکھنا ہے اس کے باوجود وہ نہ مانے اور مرغ کی ایک ٹانگ کھانا ہی پڑی۔ اس کے بعد ہی وہ پلاؤ کی ڈش لے کر آگئے۔ بعد منت و سماجت کے ساتھ معذرت کی اور اجازت لے کر تیسری جگہ پہنچ جاؤں۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ دس منٹ میں پہنچ گیا۔ تینوں شادیوں کے کارڈ میری جیب میں تھے [illegible] انہیں نکال کر صاحب خانہ کو پیش کر کے ملا۔ اور کارڈ دکھاتے ہوئے معذرت کی اور مسکراتے ہوئے کہا کہ معدے میں تھوڑی سی گنجائش آپ کے پلاؤ کے لئے رکھی ہے۔ چند لقمے ضرور کھاؤں گا اور اس کے بعد میں نے وہ چار لقمے پلاؤ کے کھائے اور اجازت لے کر پھر اس شادی میں پہنچا۔ جہاں نکاح میں شرکت کی تھی یہاں ابھی کھانے کا سلسلہ جاری تھا۔ صاحب خانہ [illegible] تھے۔ کہنے لگے۔ ارے کہاں تھے آپ [illegible]

ہم نے تینوں شادی کارڈ دکھاتے ہوئے کہا، بھائی سب ہی کو خوش رکھنا تھا مگر تم سے جو تعلقات ہیں وہ کسی سے نہیں ہیں۔ ان کے پیش نظر اچھا اور اچھا تمہارے ہی یہاں کی ہے۔ شیرمال، مرغ اور پلاؤ، زردہ پکتا ہوا، بیگم صاحبہ نے کے لئے جگہ محفوظ رکھی ہے۔ شادی کی شکریہ تمہارے یہاں کھاؤں گا۔ اس کے بعد میں نے شادی کی مبارکباد دی اور گھر آگیا۔

اس طرح شادیوں کی اس بھرمار سے بمشکل عہدہ برآ ہوا۔ اب ایک مسئلہ سامنے آگیا ہے۔ یہ رفتار روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے اور اگر آبادی اسی طرح بڑھتی رہی تو میرے خیال سے ہر شادی میں شرکت ممکن ہی نہ ہو سکے گی۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ مجبور ہو کر لوگ شادیاں اس طرح کیا کریں گے کہ دس پندرہ لڑکے لڑکی والے مل کر ایک ہی دن تاریخ کا تعین کیا کریں گے اور مشترکہ طور پر کسی ہال کو کرائے پر لے کر مشترکہ طور پر کھانے پکوا کر شادیاں کرنے پر مجبور ہوں گے۔ اس طرح نہ صرف یہ کہ کفایت ہوگی بلکہ شرکت کرنے والوں کو بھی آسانی ہوگی۔ ایک ہی وقت میں دس پانچ شادیوں میں شرکت کے لئے سو بار دوڑ دھوپ کرنا پڑے گی ایک ہی جگہ سب کی شرکت ہو جایا کرے گی۔ ایسا نہ کیا گیا تو میرا خیال ہے کہ انسان شادیوں میں شرکت کے سوا اور کوئی کام ہی نہ کر پایا کرے گا۔ کاش ہم ان دشواریوں پر غور کر سکیں جو غیر معمولی طور پر بڑھتی ہوئی آبادی سے پیش آ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر بڑی سنجیدگی سے ہم سب کو غور کرنا چاہئے۔

حریم کا سالنامہ ۸۲ء

آپ کی نظروں سے گزر چکا ہوگا۔ یہ سالنامہ حجم کے اعتبار سے کم صفحات پر مشتمل ہے لیکن ناول جتنا دلچسپ ہے اس نے اس کمی کو یقیناً پورا کر دیا ہوگا۔ گرانی کھیرے ککڑی کی طرح بڑھ رہی ہے۔ گذشتہ برس ایک روپیہ سالانہ کا قیمت میں اضافہ کیا گیا تھا۔ بعض بہنوں کو یہ اضافہ بھی گراں گزرا۔ اور گزرنا بھی چاہئے تمام حریمی بہنوں کے مالی وسائل ایسے نہیں ہیں کہ وہ اس بڑھتی ہوئی قیمت کو محسوس نہ کر سکیں۔ لیکن ہم بھی کیا کریں۔ اس اضافے کے اعلان کے بعد حکومت نے دو سو روپیہ فی ٹن کاغذ کی قیمت بڑھانے کا پھر اعلان کر دیا ہے۔ اس اعلان کے بعد ہی کاغذ نایاب ہو گیا اور ہمیں مقررہ قیمت سے کافی زائد رقم دے کر سالنامہ کے لئے کاغذ خریدنا پڑا۔ بہرحال ابھی ہم مزید کوئی اضافہ نہ کریں گے۔ البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ حریمی بہنوں کو اس بات پر ضرور غور کرنا چاہئے کہ تمام ضروریات زندگی کی قیمتیں کس طرح روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ ہمیں کاغذ، کتابت طباعت اور ہر خرچ کے اضافہ کو برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔

ہماری خواہش ہے کہ حریم پڑھنے والی بہنوں کا حلقہ کم نہ ہونے پائے۔ اس لئے جو بہنیں ایک روپیہ سالانہ قیمت کے اضافہ کے باعث اس کی خریداری ترک کر رہی ہوں، وہ ہمیں لکھیں اور سابقہ قیمت ہی روانہ فرمائیں۔ ہم حریم ان کی خدمت میں جاری رکھیں گے ـــــ پچاسوں ایسی حریم نواز بہنیں بھی تو ہیں جو اعزازی اور مخصوص قیمتیں ادا کر کے ہمارے خسارے کو کم کرتی ہیں۔ ایسی بہنیں بھی ہیں جو حریم کی مالی امداد اس طرح کرتی ہیں کہ اپنے نام کی شہرت بھی پسند نہیں کرتیں

محکمہ ڈاک کی بدنظمی

محکمہ ڈاک کی بدنظمی کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے شہروں سے بڑے شہروں کو بھیجے جانے والے خطوط بھی اکثر دس دس بارہ دن میں پہنچتے ہیں۔ میں اپنی بیٹی نجم السحر کو ہر روز ایک خط لکھتا ہوں لیکن اسے کئی کئی خط ایک ساتھ ملتے ہیں۔ رسائل و اخبارات کی ڈیلیوری کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ جب بھی مل جائیں خریدار کی خوش قسمتی۔ ہر ماہ حریم کے ڈیڑھ سو سے زائد پرچے ڈاک میں کھو جاتے ہیں۔ جنہیں ہم دوبارہ بھیجتے ہیں، ساتھ ہی خریداروں کی شکایت اور کبھی کبھی سخت و سست بھی سنتے ہیں۔ لیکن مجبوری ہے کہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اطلاع ملنے پر دوبارہ پرچہ بھجوا دیتے ہیں۔ حریمی بہنوں کو چاہئے کہ ۲۵ تاریخ تک پرچہ نہ ملے تو شکایت کا ایک کارڈ دفتر کو روانہ کر دیں۔

بزم حریم میں چھپنے والی خبریں اور پسندیدہ اشعار کوشش کر کے جلد روانہ کریں تاکہ ہر وقت مل جائیں۔

میں نے سفر کیا۔

خدا کا شکر ہے کہ تین سال بعد خدا نے مجھے اس قابل کیا کہ میں نے بھوپال اور بمبئی کا سفر کیا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اپنے اس سفر کی روداد مارچ کے حریم میں شائع کروں گا۔

خورشیدِ رسالت

از شوکت تھانوی

کیا دنیا تھی قبلِ رسالت — سنئے اس دنیا کی حالت
پھیلے ہوئے تھے ظلم و جہالت — کوئی نہ تھا قانون و شریعت
انسانیت دور کھڑی تھی
شرم و حیا مخمور پڑی تھی

دین نہ تھا اسلام نہیں تھا — شرم و حیا کا نام نہیں تھا
عدل سے کوئی کام نہیں تھا — تفہیم و افہام نہیں تھا
جتنے تھے دنیا میں بستے
سب کے الگ الگ تھے رستے

کوئی جاہل کوئی عامی — کوئی بڑا ہی کافر نامی
جہل کا اپنے کوئی پیامی — کوئی رومی کوئی شامی
مہر و وفا کا مجمع ابتر
ایک سے ایک تھا ظالم بڑھ کر

پردہ جس پر سب ہیں نازاں — آج ہوا جو جز و ایماں
ہے جو سب کی شان کے شایاں — جس سے ہوئی ہے نیکی آساں
اس کا جہاں میں نام نہیں تھا
کون تھا جو بدنام نہیں تھا

عورتیں پھرتی تھیں بے پردا — شرم و حیا کی نہیں تھی پروا
بدکاری کا وا دروازا — عصیاں کا تھا بلند آوازا
عصمت کوئی چیز نہیں تھی
عفت کی تمیز نہیں تھی

پتھر تھے معبود جہاں کے — اور شجر مسجود جہاں کے
امن و اماں مسدود جہاں کے — ہوش و خرد مفقود جہاں کے
ایک سی حالت ایک سی ذلت
ایک سی صورت ایک سی آفت

وہم کی دنیا وہم کے بندے — سب کے گلوں میں جہل کے پھندے
عنڈی جھنڈے جاہل پھندے — سب کے تخیل خدا کے گندے

عجز کی دل میں شان نہیں تھی
اچھی بری پہچان نہیں تھی

کاہن جو کچھ کہہ جاتے تھے — اس کو سن کر رہ جاتے تھے
جرائم میں بہہ جاتے تھے — جو پڑتی تھی سہہ جاتے تھے
گہواروں میں جھولنے والے
نامِ خدا کو بھولنے والے

اتنے میں اک بندۂ اعلیٰ — عرش بریں سے بھی کچھ بالا
حق کی بات بتانے والا — نورِ حق کا لئے اُجالا
چوٹی پر فاراں کی آیا
شمعِ ہدایت ساتھ میں لایا

سارے جہاں کو کیا منور — پھیلا اجالا اس کا گھر گھر
کام جو تھے طاقت سے باہر — ان کو سنوارا آ کر یکسر
بولا خدا ہے ایک تمہارا
اس کا ہے یہ عالم سارا

اس کا ہمسر کوئی نہیں ہے — اس کے برابر کوئی نہیں ہے
اس سے بہتر کوئی نہیں ہے — اس سے باہر کوئی نہیں ہے
ایک رہا ہے ایک رہے گا
جو چاہے گا وہی کرے گا

اس کو ڈھونڈ [illegible] کو پاؤ — آؤ دیکھو آؤ آؤ
نور کو دیکھو [illegible] اٹھاؤ — پاس ہے وہ، کیوں ڈھونڈنے جاؤ
وہ ہے سب سے اعلیٰ بالا
اس کا ہر شے میں ہے اجالا

ہوں میں اسی کا بندہ لیکن — تم سے جدا ہے میرا باطن
میں ہوں اپنی وفا کا ضامن — تم ہو کافر میں ہوں مومن
دل میں مرے ایمان کو دیکھو
آؤ ذرا قرآن کو دیکھو

ہے یہ ہر احکام کا حامل — اس سے منور ہوتے ہیں دل
کرتا ہے نیکی پہ مائل — لے جاتا ہے سوئے منزل
قدرت حق کا ہے یہ لطیفہ
ایسا نہیں ہے کوئی صحیفہ

چھوڑ دو [illegible] سر کو جھکاؤ — شانِ ایزد سب کو دکھاؤ

ایک بنو اور ایک بناؤ تفرقہ باہم کو مٹاؤ
رمز ہے یہ اس رمز کو پاؤ
آؤ آؤ آؤ آؤ
آپس میں مل جانا اچھا مل کر راہ پہ آنا اچھا
مل کر حق کو پانا اچھا ملنا اور ملانا اچھا
جو اس دین کے شیدائی ہیں
آپس میں وہ سب بھائی ہیں
حق کو باہم کے پہچانو بابِ مہر و وفا گردانو
غیروں کو بھی اپنا جانو مانو مانو مانو مانو
کیسی فرقت کیسی جدائی
لڑتے نہیں ہیں بھائی بھائی

گمراہی سے سب کو نکالو ڈوبتے ہیں جو اُن کو بچالو
حالت کو ہر اک کی سنبھالو سب کو اپنے گلے لگالو
بندۂ حق ہیں سب انساں ہیں
دوستی کے یہ سب شایاں ہیں
کیسا مندر کیسی مسجد کیسے مومن کیسے ملحد
چھوڑو لڑائی چھوڑو یہ ضد واحد ہو اللہ ہے واحد
جنگ کوئی ایمان نہیں ہے
ایماں کی یہ شان نہیں ہے
چپکے سے سمجھاؤ سب کو راہ پر اپنی لاؤ سب کو
کھو کر سب کو پاؤ سب کو اپنا غرض بناؤ سب کو
ہاتھ میں اپنے سب کا دل لو سب کو ملاؤ سب سے مل لو

تقدیر کیا ہے؟

نگار سلطانہ جلیلی، قمر لطیف آمبور، تامل ناڈو

قرآن پاک میں رب العزت کا ارشاد گرامی ہے خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا۔ یعنی ہر شئے کو پیدا کیا ہے۔ اس کے لئے خاص اندازہ قائم کر دیا۔ اس اندازہ باندھنے کا نام تقدیر ہے۔ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے ارادے پر عمل کرے۔ اگر برا عمل ہوگا تو نتیجہ برا ہوگا۔ اگر اچھا عمل ہوگا تو نتیجہ بھی عمدہ اور بہتر برآمد ہوگا۔ یہ ایک تقدیر ہے۔

اگر بداعمالیوں کو ترک کر کے توبہ کی جائے تو وہ ہلاکت یا تقدیر ٹل جاتی ہے۔ اس ٹل جانے والی تقدیر کو اصطلاحِ شریعت میں تقدیر معلق کہتے ہیں۔ اور وہ تقدیر جو انسان کے سعی و عمل اور دعا و استغفار سے تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کو تقدیر مبرم کہتے ہیں۔

جس چیز میں انسان کوشش کر سکتا ہے۔ ہمیشہ تقدیر معلق سمجھنا چاہیئے۔ پس یہی ایک طریقہ دنیا میں محنت و مشقت کرنے اور فلاح و کامیابی کا ہے۔ اگر کسی چیز میں انسان کو کوشش اور ذرائع وسائل کے باوجود ناکامی ہو تو اس محرومی کو ہمیشہ تقدیر مبرم سمجھنا چاہیئے۔ اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینا ہی شانِ عبودیت ہے اس کے متعلق قرآن پاک میں اللہ عز و جل کا ارشاد ہے کہ ہم تمھیں آزمائیں گے خوف سے، بھوک سے، اور اموال و نفوس اور اثمار کے خسارے سے اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنادو۔ (البقرہ) چونکہ یہی ایک طریقہ قلبی طمانیت اور سکون کا ہے۔ تاکہ انسان مصیبت سے نہ گھبرائے۔ عذابِ الٰہی کو ہمیشہ معلق سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ عذاب، نتیجہ ہے بداعمالیوں کا۔ اگر انسان برے کام چھوڑ کر نیکیوں کو اختیار کرے تو عذاب بھی ٹل جائے گا۔ فرض کی ادائگی کرتے ہوئے اگر مومن لقمۂ اجل بن جائے یا کوئی مصیبت پہونچ جائے تو اسے ہمیشہ تقدیر مبرم سمجھنا چاہیئے۔

قرآنِ حکیم میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ جو مصیبت بھی آتی ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں تم پر آئے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شگون کوئی چیز نہیں۔ بعض لوگ منگل، سنیچر کو منحوس خیال کرتے ہیں۔ فلاں کام اگر ان ایام میں کیا گیا تو وہ بگڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ یورپ کے لوگ ۳، ۱۳ کے عدد کو منحوس خیال کرتے ہیں۔ ایسے خیالات زمانۂ جاہلیت کے ہیں۔ ان لغویات کو یہ فرما کر مسلمانوں کے ذہن سے مٹایا کہ خدا ہی ساری دنیا کا کارساز ہے وہی کاتبِ تقدیر ہے۔

تدبیر کے دستِ زریں سے تقدیر درخشاں ہوتی ہے
قدرت بھی مدد فرماتی ہے جب کوشش انساں ہوتی ہے

موٹے لوگ وزن کس طرح کم کریں؟

ڈاکٹر عبدالحلیم، میڈیکل کالج، لکھنؤ

موٹاپا غذا کے سلسلہ کی سب سے عام بیماری ہے کیونکہ غلط غذا کھانے سے عام طور پر پیدا ہوتی ہے اور بہت سی دوسری بیماریوں کی جڑ ہے۔ کسی بھی بیماری کا علاج اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ اس کی وجہ معلوم ہو۔ اس سے پہلے کہ آپ اس کے وجوہات سمجھیں ہمارے لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ہم کس شخص کو موٹا کہیں گے۔

موٹاپا کس کو کہتے ہیں

وزن قد کے مطابق صحیح ہونا چاہئے ہر قد کے لئے عمر کے مطابق ایک اسٹینڈرڈ وزن ہوتا ہے اور ڈاکٹری کی کتابوں میں یہ چارٹ موجود ہیں بیمہ کمپنیاں بھی اپنے یہ چارٹ بناتی ہیں۔ موٹے آدمیوں کا بیمہ ان کمپنیوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ موٹے لوگ صحت مند لوگوں سے تجربہ کے مطابق چار پانچ سال کم زندہ رہتے ہیں۔ ایک آسان طریقہ صحیح وزن قد کے مطابق معلوم کرنے کا یہ ہے کہ فرض کر لیجئے کسی ہندوستانی عورت کا قد پانچ فٹ دو انچ ہے تو اس کا وزن کم از کم ۵۳ کلو ہونا چاہئے اور اسی قد کے مرد کا وزن کم از کم ۵۶ کلو ہونا چاہئے اس کے بعد ہر ایک انچ زیادہ قد پر مرد یا عورت کا وزن ½ ۱ کلو اور بڑھتا جائے گا اس طرح کسی قد کے انسان کا اسٹینڈرڈ وزن معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کم از کم اسٹینڈرڈ وزن پر آپ دس فی صدی اور چھوٹ دے سکتے ہیں اگر آپ کی عمر ۳۰ سال سے کم ہے۔ اگر ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان ہے تو یہ چھوٹ نہیں ملے گی بلکہ وزن اسٹینڈرڈ ہی رہے گا۔ ۳۵ سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کا وزن اسٹینڈرڈ وزن سے دس فی صدی اگر کم ہو تب ہی صحیح مانا جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ وزن اور ہے وہ موٹاپے میں شامل ہے۔ مثلاً اگر کسی عورت کا قد ½ ۵ فٹ ہے اور عمر ۳۰ سال ہے تو اس کا کم از کم اسٹینڈرڈ وزن ۵۹ کلو ہونا چاہئے مگر دس فی صدی چھوٹ دینے پر زیادہ سے زیادہ ۶۵ کلو ہو سکتا ہے اگر اس قد کی عورت کا وزن اس سے بھی زیادہ ہے تو اس کو آپ موٹے لوگوں میں شمار کریں گے اور ایسی عورت کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ موٹاپے کی بیماری میں مبتلا ہے اور اسے اپنا وزن کم کرنا ضروری ہے۔

موٹاپے کے وجوہات

موٹاپے کی کوئی ایک وجہ نہیں ہے مگر چند خاص وجوہات پر غور کر لینا ضروری ہے۔

(۱) موٹاپے کی سب سے خاص وجہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھا لینا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ کسی شخص کو روزانہ اپنی کار میں صرف بیس میل جانا ہے اور وہ روزانہ اس میں چالیس میل کے لئے پیٹرول ڈلوائے تو ہر دن آدھا پیٹرول اس کی کار کی ٹنکی میں جمع ہوتا رہے گا۔ اسی طرح اگر کوئی انسان روزانہ ضرورت سے زیادہ کھانا کھاتا ہے تو زیادہ غذا چربی کی شکل میں بدن میں جمع ہوتی رہے گی اور اس کا وزن بڑھتا رہے گا۔

کوئی شخص کیوں زیادہ کھانا کھاتا ہے وہ بہت کچھ اس پر بھی منحصر ہے کہ اس کے خاندان کے لوگ یا اس کے ساتھی روزمرہ کس طرح کی غذا کھاتے ہیں۔ رئیس انسان کو ہر طرح کا کھانا مل سکتا ہے اور اس لئے اگر وہ اپنے آپ پر کنٹرول نہ کرے تو عموماً زیادہ کھائے گا۔ رئیس ممالک میں موٹاپا عام ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ تقریباً چالیس فیصدی امریکن موٹاپے کی بیماری میں مبتلا ہیں اور کم غذا سے پیدا ہونے والی بیماریاں وہاں نہیں ہیں اس کے برعکس ہمارے ہندوستان میں اس قسم کی بیماریاں عام ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ چند دماغی بیماریوں میں بھی آدمی زیادہ کھانا کھا کر موٹا ہو جاتا ہے۔

(۲) کم ورزش اور بہت کم جسمانی کام بھی انسان کو موٹا کر دیتا ہے موٹے لوگ عموماً سست ہوتے ہیں اور اپنے بدن سے بہت کم کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے دن بدن ان کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ آج کل کی زندگی میں شہر کے رہنے والے لوگ جسمانی کام کم کرکے زیادہ تر بیٹھے رہتے ہیں اور کہیں بھی جانا ہو کسی نہ کسی سواری کا استعمال وقت کی بچت کے لئے کرتے ہیں۔ موجودہ زندگی میں ہر چیز میں رفتار ہے اور ہر انسان

وقت کی قلت محسوس کرتا ہے۔ یہ جلد بازی ہمیں بہت سی دوسری بیماریوں میں بھی مبتلا کر دیتی ہے۔ جس میں بلڈ پریشر اور ہارٹ اٹیک بھی شامل ہے۔ چلنے پھرنے سے کافی طاقت خرچ ہوتی ہے جو کہ ہماری غذا سے آتی ہے اور اس طرح بہت کچھ وہ غذا جو ہم زیادہ کھاتے ہیں بجائے بدن میں چربی کی شکل میں جمع ہونے کے خرچ ہو سکتی ہے۔

(۳) عورتوں میں قدرتی طور پر جنسی فرق کی وجہ سے مردوں سے دوگنی چربی ہوتی ہے۔ عمر کے ساتھ ان کا وزن بڑھتا ہے اسی وجہ سے موٹاپے کا مرض عورتوں میں زیادہ ہے۔ حمل سے لے کر بچہ کی ولادت تک عورت کا وزن بڑھتا رہتا ہے۔ ولادت کے بعد اگر اس وزن کو کم نہ کیا جائے تو یہ وزن بڑھتا ہی رہتا ہے۔ عورتوں میں ایام بند ہونے کے بعد بھی وزن بڑھتا ہے۔

(۴) موٹاپا کبھی کبھی خاندانی بیماری بھی ہوتا ہے اور یہ مسئلہ کہ یہ کس طرح آباء و اجداد سے منتقل ہو کر بچوں میں آجاتا ہے ابھی زیر غور ہے۔

(۵) موٹاپا موٹے اور پتلے لوگوں کے بدن کی مختلف بناوٹ سے بھی تعلق رکھتا ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی عمر اور جنس کے لوگ ایک ہی طرح اور ایک ہی مقدار کی غذا کھانے پر بھی ایک سا بدن نہیں رکھتے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کی آنتیں زیادہ غذا ہضم کرتی ہیں، اور دوسرے کی کم۔ یا ایک شخص کا بدن ہضم شدہ غذا کو اچھی طرح استعمال کرتا ہے، اور دوسرے کا جمع کرتا ہے۔ یہ مسئلہ بھی ابھی زیر غور ہے۔

(۶) ایک دوسری طرح کے موٹاپوں میں وہ موٹاپے شامل ہیں جو بدن کی خصوصی گلٹیوں (غدود) کے غلط کام سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کا غذا کی زیادتی سے تعلق نہیں ہے۔ اس طرح کی بیماریاں خصوصی علاج سے ہی ٹھیک ہو سکتی ہیں۔

وزن کم کرنے کی ضرورت

کوئی شخص اپنا علاج اسی وقت کرتا ہے جب کہ وہ اپنی تکلیف کو بیماری سمجھے۔ اس لئے سب سے پہلے مریض کو یہ احساس ہونا ضروری ہے کہ موٹاپا ایک مرض ہے اور بہت سے دوسرے امراض کا پیش خیمہ ہے۔ جب کسی کو یہ احساس ہوگا تب ہی وہ اپنا وزن کم کرنے کی کوشش کرے گا۔ موٹاپے کی وجہ سے زیادہ بلڈ پریشر کی بیماری۔ ذیابیطس یعنی پیشاب میں شکر آنے کا مرض عام طور پر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جوڑوں کے امراض پتہ کا ورم اور اس میں پتھریوں کا بننا اور دل کے امراض ہونے کا بھی بہت بڑا امکان ہے اس طرح موٹے لوگوں کی عمر صحیح وزن والے لوگوں سے کم ہوتی ہے۔ اگر ان خطروں کی طرف موٹے لوگ توجہ کریں گے تو ضرور اپنا وزن کم کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ بغیر کوشش کے وزن کم نہیں ہو سکتا۔

اس کے علاوہ ہر انسان کو یہ شوق ہوتا ہے کہ اس کا بدن خوبصورت رہے اور وہ اسٹنڈرڈ سائز کے کپڑے پہن کر اچھا لگے۔ خوبصورت لگنے کے علاوہ صحیح وزن کے لوگ ہی کھیل کود میں حصہ لے سکتے ہیں اور دوڑ دھوپ بآسانی کر سکتے ہیں۔ موٹے لوگوں کو عموماً دوسروں کی ہنسی مذاق کا شکار بننا پڑتا ہے اور وہ کسی محفل میں جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔

وزن کم کرنے کی ترکیب

(۱) جیسا کہ آپ کو ابھی بتلایا گیا ہے موٹاپے کی خاص وجہ ضرورت سے زیادہ غذا ہے۔ ضرورت بھر کھانا کھانے کے لئے آپ کو یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ آپ کے بدن کو کتنی غذا کی ضرورت ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ہمارے بدن کو روزمرہ کی گرمی اور قوت کس طرح ملتی ہے۔ انسان کا جسم ایک بھاپ کے انجن کے مطابق ہے جو کہ ایندھن (کوئلہ) جلا کر گرمی اور قوت پیدا کرتا ہے انسانی بدن خوراک کو جلا کر گرمی اور قوت پیدا کرتا ہے۔ انسان کی خوراک (ایندھن) میں تین خاص اجزا ہیں۔ کاربوہائیڈریٹ جو کہ شکر، چلی اور نشاستہ غذا میں ہے۔ پروٹین جو کہ گوشت انڈے اور دالوں میں ہے اور چربی جو کہ گھی، مکھن اور تیل میں ہے۔ ان اجزا کے علاوہ لوہا۔ کیلشیم۔ فاسفورس۔ نمک مختلف وٹامن اور پانی بھی بدن کی دوسری ضروریات کے لئے غذا میں ہونا ضروری ہیں۔ مگر صرف پہلے تین اجزا ہی قوت پیدا کرتے ہیں۔ جس غذا میں اوپر کے دئے ہوئے تمام اجزا مناسب وزن میں موجود ہوں اس کو صحیح غذا (Balanced Diet) کہتے ہیں۔

انسانی جسم کو روزانہ جتنی قوت کی ضرورت ہے وہ اس شخص کی عمر جنس۔ بدن کے سائز۔ پیشہ اور موسم پر منحصر ہے۔ قوت کو ہم کلوری میں ناپتے ہیں۔ سائنس داں حضرات کو معلوم ہے کہ ایک کلوری گرمی کی اتنی طاقت کو کہتے ہیں جو ایک گرام پانی کا درجہ حرارت ایک ڈگری سیلسیس (1°C) بڑھا دے۔ ایک عام انسان اس کو یوں سمجھ سکتا

ہے کہ اگر کوئی شخص دروازے کے سامنے بیٹھا ہو اور وہ کرسی پر سے اٹھ کر دروازے کے تالے میں چابی گھمائے اور پھر کرسی پر بیٹھ جائے تو اتنا کام کرنے کے لئے اس کی ایک کلوری قوت خرچ ہوگی۔ اس طرح دن بھر کے مختلف کام کرنے کے لئے ایک انسان کو بہت سی کلوری قوت درکار ہے یہ قوت ہر انسان کے لئے مختلف ہے جیسا اوپر بتلایا جاچکا ہے۔ اندازاً اس ضرورت کو یوں سمجھ لیں۔

	مرد	عورت
(۱) ایک جوان کو جو زیادہ تر بیٹھا رہتا ہو۔	۲۱۰۰ کلوری	۲۰۰۰ کلوری
(۲) " " " تھوڑا جسمانی کام کرے	۲۴۰۰ "	۲۳۰۰ "
(۳) " " " درمیانہ جسمانی کام کرے	۲۶۰۰ "	۲۵۰۰ "
(۴) " " " بہت زیادہ جسمانی کام کرے	۳۰۰۰ "	۲۹۰۰ "

کیونکہ زیادہ تر شہری تھوڑا جسمانی کام کرتے ہیں اس لئے مرد کو روزانہ تقریباً ۲۴۰۰ کلوری قوت درکار ہے اور عورت کو ۲۳۰۰ کلوری قوت کی ضرورت ہے۔ حمل کے دوران اور دودھ پلانے کے زمانہ میں عورت کو تقریباً ۳۰۰ کلوری کی اور زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

اس طرح اگر کوئی شخص ضرورت سے زیادہ کلوری کا کھانا کھا رہا ہے تو وہ موٹا ہوتا چلا جائے گا اس لئے وزن کم کرنے کے لئے سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ضرورت سے بھی کم کلوری کا کھانا کھائیں۔ جب تک وزن ٹھیک نہ ہو جائے اس کے بعد اُتنی ہی کلوری کا کھانا کھائیں جتنا آپ کے بدن کو ضرورت ہے۔ وزن کم کرنے کی خوراک کو عورت کے لئے صرف ۱۰۰۰ کلوری کا ہونا چاہئے اور مرد کے لئے ۱۵۰۰ کلوری۔ ایک گرام کاربوہائیڈریٹ اور ایک گرام پروٹین میں چار چار کلوری قوت نکلتی ہے۔ اس کے برعکس ایک گرام چربی میں ۹ کلوری قوت ہوتی ہے۔ ایک ہزار کلوری کی غذا میں کاربوہائیڈریٹ۔ پروٹین اور چربی مندرجہ ذیل مقدار میں ہونا چاہئے۔

	مقدار	قوت
کاربوہائیڈریٹ	۱۰۰ گرام	۴۰۰ کلوری
پروٹین	۵۵ گرام	۲۲۰ کلوری
چربی	۴۵ گرام	۴۰۵ کلوری
ٹوٹل		۱۰۲۵ کلوری

اس طرح ہم اپنی غذا جتنی کلوری کی چاہیں مقرر کر سکتے ہیں مگر بدقسمتی سے غذا کی مختلف چیزوں میں صرف ایک چیز یعنی صرف پروٹین یا صرف کاربوہائیڈریٹ یا صرف چربی ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً ۳۰ گرام پروٹین ۳۰ گرام گوشت میں نہیں ہے بلکہ ۹۰ گرام گوشت میں ہے کیونکہ گوشت میں علاوہ پروٹین کے پانی اور چربی وغیرہ بھی ہوتی ہے اور ۲۰۰ گرام پیاز میں جو کہ کاربوہائیڈریٹ ہے صرف پانچ گرام کاربوہائیڈریٹ ہوتی ہے باقی پانی اور پھوکس ہوتا ہے۔ اس طرح کسی کے لئے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کتنی کون سی کھانے کی چیزیں لے جس میں ضرورت کے مطابق پروٹین۔ کاربوہائیڈریٹ اور چربی موجود ہو اور ضرورت کی کلوری پہونچا سکے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ ہم روزمرہ کے کھانوں کی طاقت کو کلوری میں جانیں اور اندازہ سے اُن کی اتنی مقدار کھائیں کہ ہمارے بدن کو وزن کم کرنے کے لئے کم کلوریاں پہونچیں ذیل میں ایک لسٹ ہے جس میں کچھ کھانے کی چیزوں کی قوت کلوری میں دی ہوئی ہے۔

گوشت اور انڈا وغیرہ

ایک انڈا	۷۵	کلوری
ایک آملیٹ	۱۲۰	"
۱۰۰ گرام گوشت	۴۰۰	"
۱۰۰ گرام مچھلی	۲۰۰	"

اناج

ایک پتلی چپاتی	۴۰	"
دو سلائس ڈبل روٹی	۷۵	"
ایک پراٹھا	۲۵۰	"
ایک کپ اُبلے چاول	۱۴۰	"
ایک کپ پتلی دال	۱۰۵	"

میٹھے

ایک چمچہ شکر	۳۰	"
ایک سلائس کیک	۱۵۰	"
ایک بار چاکلیٹ	۲۵۰	"

دودھ اور دہی

ایک کپ دودھ	۴۰۰	"

ایک کپ بالائی نکلا دودھ	۷۵	کلوری
ایک کپ دہی	۱۸۰	"
دو بڑے چمچے آئس کریم	۱۹۵	"
گھی مکھن اور تیل		
ایک چمچہ کسی کا تقریباً	۴۰	"
پھل		
ایک سیب، سنگترہ یا امرود	۶۰	"
ایک کیلا	۹۰	"
ایک آم	۱۲۰	"
ترکاریاں		
۱۰۰ گرام آلو	۸۰	"
ایک کھیرا	۱۵	"
دس بھنڈیاں	۳۰	"
ایک پیاز	۴۵	"
۱۰۰ گرام بیگن	۲۵	"
ایک ٹماٹر	۲۰	"
خشک میوہ		
دس بادام	۹۰	"
ایک مٹھی بھر کر مونگ پھلی	۱۷۰	"
چائے اور کافی		
ایک کپ چائے یا کافی دودھ اور شکر کے ساتھ	۶۰	"

اوپر کے چارٹ کی مدد سے اگر موٹے لوگ اندازاً ۱۰۰۰ کلوری کا کھانا کھانا شروع کریں تو ہر ہفتہ ایک کلو وزن کم ہوتا رہے گا۔ اگر وزن کم نہ ہو تو پھر اندازہ چھوڑ کر تول کر کھانا کھائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ ترکاریوں میں اور پھلوں میں بہت کم کلوریاں ہیں اور ان سے پیٹ بھر کر بھوک ماری جا سکتی ہے۔ کم کھانے سے قبض ہو جاتا ہے مگر ترکاریاں قبض دور رکھیں گی۔ کچھ لوگ سوچتے ہیں کہ ایک وقت کھانا کھانے سے وزن کم ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہے اس سے وزن بڑھنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ دن میں کئی بار تھوڑا تھوڑا کھانا کھانا زیادہ بہتر ہے اگر زیادہ کلوریاں نہ پہونچیں۔

وزن کم کرنے کے لئے جن غذا میں کاربوہائیڈریٹ اور چکنائی زیادہ ہو وہ ہرگز نہ کھائیں اور اس طرح شکر، جام، مٹھائی، پڈنگ، پیسٹری، کیک، خشک میوے، انناس، انگور، کیلا، آم، شربت اور شراب سے بالکل گریز کرنا ضروری ہے۔ آپ کو یہ اندازہ دینے کے لئے کہ ۱۰۰۰ کلوری کے کھانے میں کیا غذا کتنی ہوگی ایک دن کا اس طرح کا کھانا مندرجہ ذیل ہے۔

ناشتہ۔

ایک انڈا۔ ایک ٹوسٹ۔ آدھا چمچہ مکھن۔ ایک سیب یا سنگترہ۔

دوپہر کا کھانا۔

تھوڑا گوشت بغیر چربی یا پرند کا گوشت ایک آلو یا تھوڑی کسی جڑ کی ترکاری کی بنی ہوئی سبزی۔

ہری سبزی یا سلاد۔

ایک سیب یا سنگترہ

چائے (سہ پہر)۔

دو کم میٹھے بسکٹ۔ ذرا سا مکھن۔ تھوڑی سلاد۔

شام کا کھانا۔

تھوڑا گوشت بغیر چربی یا پرند کا گوشت۔ چھ بڑے چمچے ترکاری۔ ایک چپاتی۔ تھوڑا مکھن۔ سلاد۔

اگر تولے ہوئے کھانے سے بھی وزن کم نہ ہو تو مریض کو اپنا ڈاکٹری معائنہ کرانا چاہئے اور ڈاکٹر کے مشورے پر چلنا چاہئے۔

اگر کم وزن کی خوراک سے پیٹ نہیں بھرتا ہو تو بھوک کم کرنے والی دوا کا استعمال بھی کیا جا سکتا ہے مگر یہ دوائیں صرف ایک ڈیڑھ ماہ کارگر رہتی ہیں اور اس کے بعد بھوک اپنی اصلی حالت پر آجاتی ہے۔

وزن کم کرنے کی کوشش دراصل بچپن ہی سے ضروری ہے آج کل جب کہ ماں بچے کو خود دودھ نہیں پلاتی اور بہت جلد دودھ میں اناج سے بنی ہوئی غذا ملا دیتی ہے اس کا بہت امکان ہوتا ہے کہ بچہ کو ضرورت سے زیادہ غذا پہونچ جائے اور وہ موٹا ہو جائے کے موٹے بچے موٹے انسان ہی بنتے ہیں۔ بچپن کا موٹاپا دور کرنا بہت مشکل ہے۔ موٹاپا چھ ہفتہ کی عمر سے شروع ہو سکتا ہے۔۔۔۔

(ب) دوسری ترکیب جو وزن کم کر سکتی ہے وہ ورزش ہے اگر موٹے آدمی کو کوئی دل اور جوڑوں کی بیماری نہیں ہے تو اس کو ورزش شروع کرنا چاہئے اور رفتہ رفتہ ورزش کو بڑھانا چاہئے تاکہ وزن اور جلدی کم ہو جائے۔ چلنے پھرنے سے کافی طاقت خرچ ہوتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ایک گھنٹہ میں ۳½ میل چلے تو وہ ۳۰۰ کلوری طاقت خرچ کرے گا۔ اگر وہ ایک ماہ تک روزانہ اسی رفتار سے ایک گھنٹہ چلے تو وہ کم از کم اپنے بدن میں ایک کلو چربی جمع ہونے سے بچا سکتا ہے۔ ایک کلو چربی ایک بڑی مقدار ہے تیز چلنا اور تیرنا اچھی ورزش ہے۔ مگر خالی ورزش وزن نہیں گھٹاتی۔ وزن کم کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت قوتِ ارادی کی ہے تب ہی کم غذا اور ورزش کی پابندی ہو سکتی ہے

ہمت والے لوگ غذا کو بہت ہی زیادہ کم کر لیتے ہیں کچھ مریضوں کو ۴۰۰ کلوری کی خوراک کئی ہفتہ دی گئی اور وہ دس میل روزانہ چلائے گئے اور وہ ٹھیک ہو گئے۔ خاص قسم کے اسپتالوں میں تو صفر کلوری کی خوراک دے کر اور صرف پانی، وٹامن اور منرل دے کر بھی بہت زیادہ موٹے لوگوں کا وزن کم کیا گیا ہے۔

موٹے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنا زیادہ وزن جلد از جلد خوراک کم کر کے اور ورزش کر کے گھٹائیں اور بہت سے مہلک امراض سے بچیں۔ جس کسی کا وزن صحیح ہوتا ہے وہ اپنے کو تندرست محسوس کرتا ہے اور اس کا دل دن کے کاموں میں اچھی طرح لگتا ہے۔ تھوڑی کوشش سے وزن کم ہو سکتا ہے یہ اتنا مشکل نہیں ہے جیسا کہ لوگ سوچتے ہیں۔

حریمی دسترخوان

میٹھے رول

ایک بار بنا کر نوش فرمائیں۔ امید ہے پسند آئیں گے۔ صبح اور سہ پہر کے ناشتہ میں ان سے دسترخوان کی زینت بڑھتی ہے

سامان۔ میدہ ۱۰۰ گرام، انڈے دو۔ دودھ ۲۰۰ گرام نمک چائے کا نصف چمچہ۔ ناریل کا باریک برادہ ۱۰۰ گرام۔ شکر ۱۰۰ گرام۔ بادام کی گری ۵۰ گرام (بادام کی ہر گری چکھ کر دیکھ لیں کوئی کڑوا نہ ہو)، کشمش ۵۰ گرام۔ کاجو ۵۰ گرام۔ چھوٹی الائچی پانچ عدد گھی حسب ضرورت۔

ترکیب: بادام کو گرم پانی میں ایک جوش دے کر اس کے چھلکے علیحدہ کر کے اس کی ہوائیاں تراش لیں۔ کشمش اور کاجو دھو کر الائچی کے دانے ملا کر پیس لیں اور اس میں پسی ہوئی شکر اور ناریل کا برادہ ملا کر رکھ لیں۔ انڈوں کو پھینٹ کر دودھ اور نمک شامل کر کے پھینٹیں پھر میدہ بھی ملا دیں اور اسے ایک جان کرنے کے بعد کسی فرائی پین کو ہلکی آنچ پر رکھ کر چائے کا ایک چمچہ گھی ڈال کر فرائی پین کو اس طرح ہلائیں کہ گھی ہر طرف لگ جائے۔ اس کے بعد دودھ، انڈے اور میدے کا آمیزہ دو تین یا چار ٹیبل اسپون لے کر فرائی پین میں ڈال کر فرائی پین کو اس طرح گھمائیں کہ آمیزہ ہر طرف پھیل جائے۔ (آنچ ہلکی رہنا چاہئے) جب آمیزہ کی پتلی روٹی سی گلابی ہو جائے تو اسے احتیاط کے ساتھ اس طرح نکال لیں کہ وہ ٹوٹنے نہ پائے اسی روٹی پر ناریل اور میوے کا آمیزہ ہلکا ہلکا پھیلا کر روٹی کو رول کی شکل میں لپیٹ کر اس کے کنارے کو آہستہ آہستہ دبائیں تاکہ رول کی شکل قائم رہے۔ آپ یہ بھی کر سکتی ہیں کہ رول بنا کر باریک تاگے میں لپیٹ دیں اور کچھ دیر بعد تاگہ نکال لیں اس طرح رول کھل نہ سکیں گے۔

فرائی پین مختلف سائز کے ہوتے ہیں۔ دودھ و میدے کا آمیزہ فرائی پین کے سائز کے اعتبار سے ڈالنا چاہئے۔ تاکہ روٹی پتلی بنے۔ چھوٹے سائز کے فرائی پین میں رول کی روٹی بنانا مناسب ہوگا۔ روٹی کے ٹوٹنے کا امکان کم ہوگا اور رول چھوٹے سائز کے بنیں گے جو دیکھنے میں اچھے معلوم ہوں گے۔ ۶ انچ کا فرائی پین مناسب ہوگا۔ خیال رہے کہ دودھ و میدے کا آمیزہ گاڑھا نہ ہونے پائے۔ پتلے آمیزے کی روٹیاں زیادہ بہتر بنیں گی اور ان کے رول آسانی سے لپٹ سکیں گے۔ رول ٹھنڈے کر کے نوش فرمائیں۔

مرسلہ: مسز یاسمین زید۔ الٰہ آباد

ابھی کچھ دن اور......

شاہدہ بانو۔ بلگرامی

ماں باپ کے گھر سے رخصت ہو کر گئی تو روزگار کے بھنور نے ایسا لپیٹ میں لیا کہ پانچ سال تک گھر واپس جانا نہ ہو سکا۔ جمی کی نوکری عارضی تھی جلدی چھٹی نہ مل سکتی تھی جب نوکری کے مستقل ہونے کا وقت آیا تو فرم کے مالکوں سے لڑائی ہو گئی اور جمی نے غصہ میں آکر نوکری چھوڑ دی۔ فواد کی آمد نے مشکلات کو اور بھی بڑھا دیا بڑی بھاگ دوڑ کے بعد جمی کو بینک میں سروس مل گئی۔ نئی نئی سروس تھی پیر جمانے کے لئے وقت چاہئے تھا چھٹی ملنے کا کوئی سوال نہ تھا۔

وقت گزر رہا تھا۔ اکثر فواد کو جھکورے دیتے دیتے وہ اس جگہ پہونچ جاتی جہاں ڈریسنگ ٹیبل کے کونے پر اس کی ایک ہنستی قہقہہ لگاتی تصویر رکھی تھی سامنے گلابی پردوں کے سائے میں ایک پتھر کا گلدان تھا جس میں اس نے بڑی خوبصورتی سے کانٹے اور کیکٹس کے پتوں سے ایک خوبصورت ڈیزائن بنا رکھا تھا۔ سامنے شلف تھا جس میں اس کی پڑھنے کی کتابیں پسندیدہ ناول۔ میلے رومال۔ آٹوگراف۔ رنگ برنگی سیپیاں پڑی رہتی تھیں۔ یہ ساری چیزیں جان سے عزیز تھیں۔ قریب ہی دیوار سے لگی ایک الماری تھی جس میں وہ ہمیشہ تالا لگا کر رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ بڑی پُر اسرار چیز بن گئی تھی اور اس کے سارے بھائی بہنوں کے تجسس کا مرکز بنی رہتی تھی۔ اس الماری میں وہ بادام کا حلوہ چھوڑ آئی تھی پتہ نہیں کسی نے نکالا بھی یا اسی میں سڑ گیا۔ کس کو پتہ تھا وقت کی گردشوں میں گھر کا راستہ ہی گم ہو جائے گا۔

پانچ سال ——— وہ سسک پڑی۔ گھر کی یاد ایک ٹیس بن کر چبھنے لگتی وہ بڑی بے چین سی ہو کر ٹہلنے لگتی...... گھر...... گھر...... وہ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی تھی اس کا یہ فلیٹ کیا اس کا گھر نہیں تھا۔ یہ اس کا بیڈ روم تھا جس کو بڑی سادگی سے اس نے سجا رکھا تھا اس سے ملا ہوا ڈرائنگ روم تھا جس میں ہرے پردوں کے ساتھ اس نے کرسیوں پر ہرے کشن بڑی نفاست سے کاڑھ کر لگائے گئے چھوٹا سا چمن۔ صاف ستھری بالکنی۔ مگر وہ گھر کہاں کھو گیا تھا جس کے آنگن میں اس نے کبڈی کھیلی تھی۔ بھائیوں سے جھگڑے کئے۔ [illegible] سے گڑھے کر کے اس میں برسات کا پانی بھرا تھا جہاں [illegible] لگائے تھے اور بے جا ضدیں کی تھیں۔

وقت کا پہیہ چلتے چلتے آخر اس جگہ رک گیا جہاں اسے گھر جانا تھا۔ جمی کو چھٹی مل گئی۔ خوشی کے مارے اس کا برا حال تھا جلدی جلدی شاپنگ کی گئی۔ سامان باندھا گیا اور چھوٹا سا قافلہ اپنے وطن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ننھے فواد نے راستے میں خوب پریشان کیا مگر اسے پریشانی کا احساس نہ ہوا اس کی نظریں دور دور آگے تک پھیلے ہوئے راستے کو ناپ رہی تھیں۔ اسٹیشن گزر رہے تھے۔ لوگوں کا ہجوم چڑھ رہا تھا اور اتر رہا تھا اور اب صرف چار اسٹیشن اور رہ گئے تھے ننھے فواد کو دیکھ کر سب کتنا خوش ہوں گے۔ سیما تو اب بڑی ہو گئی ہو گی بھابھی کا منا بھیا پتہ نہیں کس کو پڑا ہوگا۔

جیسے ہی دور سے وطن کا اسٹیشن دکھائی دیا وہ خوشی اور جوش سے کھڑی ہو گئی ——— گھر آ گیا ——— پھر بیٹھ گئی گاڑی کو اسٹیشن تک پہونچتے پہونچتے گویا سال بیت رہا تھا گاڑی رکتے ہی ایک جانا پہچانا پلیٹ فارم سامنے تھا۔ اس نے فواد کو سنبھالا اور مسافروں کے دھکے کھاتی گرتی پڑتی جلدی سے اتر پڑی۔ جمی نے سامان سنبھالا۔ سب کچھ وہی تھا وہی شاندار ریلوے اسٹیشن وہی بھیڑ بھاڑ اسٹیشن کے باہر رکشوں اور تانگوں کی قطاریں۔

اس کا تانگہ جب گھر کے قریب پہونچا تو پھاٹک بند تھا اس کو تھوڑی سی ناامیدی ہوئی۔ فواد کو سنبھالتے ہوئے اس نے زور سے پھاٹک کو دھکا دیا سامنے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر کسی طرف سے کتے کی غرانے کی آواز آئی اور پھر وہ غراتا ہوا سامنے آ گیا۔

"ارے یہ تو اپنا ٹامی ہے"

ٹامی ـــــ ٹامی۔ اس نے سیٹی بجائی اور ٹامی دم ہلاتا ہوا دوڑا اور اس کے پیروں پر لوٹنے لگا فواد نے اس کی گود سے جھک کر غور سے ٹامی کو دیکھا اور پھر ڈر کر اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ سب کا آگے بڑھنا مشکل ہو گیا۔ بار بار ٹامی پیروں سے لپٹ رہا تھا۔

آوازیں سن کر بھابی باہر نکل آئیں فواد کو ممی کی گود میں تھما کر وہ جلدی سے ان سے لپٹ گئی ـــــ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے ـــــ اف یہ پانچ سال ـــــ بھابی اس کی پیٹھ پر تھپکیاں دیتی ہوئی اندر لے آئیں۔ بھیا نے بڑھ کر گلے لگایا۔ منصور گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر شرما کر بھاگ گیا تھوڑی دیر میں چھوٹے بڑے بچوں کی ایک بھیڑ دروازے میں سے جھانک رہی تھی سب کے چہروں پر حیرت اور تجسس چمک رہا تھا آپس میں کھسر پھسر اور دھینگا مشتی بھی ہو رہی تھی اس نے دوڑ کر سب کو ایک ساتھ باہوں میں سمیٹ لیا۔

"اوہ اسیا اتنی لمبی ہو گئی۔ منصور اب بھی ویسا ہی دبلا ہے او ہو جاوید اور بیلو کس قدر شرما رہے ہیں اچھا ـــــ یہ نوین صاحب کے بچے ہیں وہ اب بھی پڑوس میں ہیں اور وہ نومولود کہاں ہیں۔

بھابی نے بتایا کہ وہ سو رہے ہیں ـــــ اور بتایا کہ حمیرہ کی بیٹی کی شادی ہو گئی۔ محسن کا لڑکا عرب ایر لائنس میں چلا گیا۔ حاجی بابا کا انتقال ہو گیا کلیم کے پھیپھڑوں کا آپریشن ہوا چھوٹا منا بہت تکلیف سے پیدا ہوا وغیرہ وغیرہ۔

باتوں میں وقت کا ہوش نہ رہا اس عرصے میں ممی شیوا اور نہانے سے فارغ ہو کر واپس آ گئے اور فواد بچوں کی گود میں لد کر گھر کے کسی کونے میں غائب ہو چکے تھے۔

بھابی ایک دم سے کھڑی ہو گئیں۔

"اچھا میں تمہارا سامان اپنے کمرے میں لگوائے دیتی ہوں تم وہیں چائے وغیرہ پی کر آرام کرو۔"

"اپنے کمرے میں؟ میرے کمرے میں کیوں نہیں" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

بھابی چلی گئیں تو اس نے کمرے کا جائزہ لیا اس کمرے کو وہ کتنی دلچسپی سے سجایا کرتی تھی اس نے یہاں عنابی رنگ کے پردے ڈالے تھے اب بھابی نے بدل کر پیازی کر دئیے ہیں بک شلف پر وہ صرف پھول سجاتی تھی اب اس پر کئی فوٹو فریم اور کھلونے سجے تھے وہ کمرے سے باہر نکلی۔ او ہو یہاں تو بڑی تبدیلیاں آ گئی تھیں کھانے کی میز جالی والے برآمدے میں لگی تھی شاید کمروں کی کمی پڑ تی ہوگی آنگن کی کیاریوں کو بند کر کے پکا فرش کر دیا گیا تھا۔ ان کیاریوں میں وہ کتنی محنت سے پھولوں کے پودے لگایا کرتی تھی اکثر کھرپی سے ہاتھ کٹ جاتا تو اماں بلبلا کر خفا ہوتیں۔ "تجھے تو سوائے گھر سجانے اور سنوارنے کے کوئی اور کام ہی نہیں ہے" سائڈ کا کمرہ اسٹڈی روم بن گیا تھا گیلری کے سرے پر جو کمرہ تھا اس کے دروازے پر پکا پانی رائٹنگ میں لکھا ہوا ایک بورڈ لٹک رہا تھا "بچوں کی لائبریری" وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی بالکل سامنے دیوار پر الوس پرسلی کی بڑی سی فوٹو چسپاں تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہاتھ کی بنی تصویریں اور سینریاں لگی تھیں۔ بچوں نے اپنے آرٹ کا مظاہرہ کر رکھا تھا۔ وہ تالے والی الماری کھلی تھی اس میں بچوں کی کتابیں میگزین اور اسکول کے بیگ الٹے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے قریب بچے کا پالنا دیکھ کر وہ خود بخود ادھر بڑھ گئی۔ ایک سرخ سفید گول مٹول بچہ گہری نیند سو رہا تھا وہ اس پر جھک گئی ننھے بچے کی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرا گئی اس کے گرم سرخ گالوں پر پیار کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"میرے منے اب یہ کمرہ تمہارا ہے"۔

پھر فواد بچوں کے جلو میں آ گئے اور سب کو لے کر وہ چائے کی میز پر آ گئی۔ بھیا اور بھابی نے خوب خاطریں کیں بھیا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ساری پلیٹوں کا ناشتہ اس کو اکیلے کھلا دیں وہ سوچنے لگی یہ وہی بھیا ہیں جو بچپن میں اس کے سامنے سے کھانے کی پلیٹ اٹھا کر بھاگ جاتے تھے اور وہ چیختی رہ جاتی تھی اس کا دل ڈوب سا گیا۔

بھابی کے کمرے میں وہ پندرہ دن مہمان رہی۔ چھٹیاں گذر گئیں واپسی کے لئے سامان پیک ہونے لگا ایک دن پہلے ہی وہ بالکل خاموش سی ہو کر رہ گئی اس کے ذہن میں طبلے کی تھاپ کی طرح ایک خیال چوٹ پہنچا رہا تھا۔

"یہ تیرا گھر نہیں ہے — یہ تیرا گھر نہیں ہے"۔

گھر چھوڑتے ہوئے اس نے کار کے شیشوں سے پلٹ کر دیکھا گھر پہ لگر ڈالی ٹامی پچھلی ٹانگوں کے بیچ دم دبائے بڑی حسرت سے اس کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

کاہے کو بیاہی بدیس لکھیا بابل مورے۔

بمبئی پہونچ کر اس نے اپنے فلیٹ کا تالا کھولا — دو کمرے ایک چھوٹی سی بالکنی۔ کچن — اس کا دل گھبرانے اور مچلنے لگا۔ مگر یہی اس کا گھر تھا اس کو دلکش بنانا اس کا فرض تھا — وہ آنسو ضبط کرتی بالکنی پر آگئی۔ سڑک پر ہزاروں کا مجمع ادھر سے ادھر بھاگ رہا تھا زندگی ایسے چلتی رہتی ہے آخر میں کون کہاں پہونچ جاتا ہے۔

شام کو آفس سے واپس کر جی نے بتایا کہ فلیٹ کے مالک نے فلیٹ خالی کرنے کو کہہ دیا ہے۔

اس کی نظریں حسرت سے ڈرائنگ روم کے سر سراتے ہوئے پردوں سے لپٹ کر رہ گئیں رات بھر اس کے پیٹ میں سخت درد ہوتا رہا۔

ایک ہفتہ کی بھاگ دوڑ کے بعد جمی نے دوسرے مکان کا انتظام کر لیا یہ ایک سیٹھ جی کے مکان کا باہری حصہ تھا۔ ایک کمرہ اس سے ملا ہوا باتھ روم۔ کچن اور سامنے چھوٹا سا لان۔ اس مکان میں اسے بڑی اجنبیت کا احساس ہوا ایک کھوئی ہوئی روح کی طرح وہ کمرے اور لان کے چکر کاٹتی رہی۔

فواد اس نئے گھر میں خوب رویا۔ اور واپس گھر جانے کی ضد کرتا رہا وہ اس کو بہلاتی رہی اور نئے گھر اور ماحول سے مانوس ہونے کی کوشش کرتی رہی۔ اس ایک کمرے کو اس نے بڑے سلیقے سے سجایا باقی ڈرائنگ روم کا سارا سامان پیک کیا ہوا اس نے مسہریوں کے نیچے کھسکا دیا ایک کمرے کے گھر میں اتنا سارا سامان بیکار تھا۔

چھ مہینے بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ سیٹھ جی نے کرایہ بڑھانے کی دھمکی دینا شروع کر دی اور پھر سامان پھینکنے اور غنڈوں سے پٹوانے کے خط آنا شروع ہو گئے۔

اس کو مستقل پیٹ میں درد رہنے کی شکایت ہو گئی۔ جمی بہت دکھی اور چڑچڑا دکھائی دینے لگا تھا۔

پھر وقت کی آندھی کچھ اس رخ سے چلی کہ جمی کا ٹرانسفر آرڈر آگیا۔ وہ یہ دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا کہ اس کا ٹرانسفر دہلی ہوا تھا دہلی میں اس کا آبائی گھر تھا۔ کم از کم گھر کی فکر سے چھٹی مل جائے گی۔ خوشی خوشی ایک بار پھر سامان باندھا گیا ننھی زینی کی آمد کی وجہ سے روانگی میں ایک مہینہ کا التوا ہو گیا۔ آخر کار وہ دن آیا جب ٹرین دہلی کے لئے روانہ ہوئی بستر کھول کر اس نے دونوں بچوں کو سلا دیا اور پھر اطمینان سے کھڑکی کے باہر جھانکنے لگی اس کو قدرتی مناظر سے والہانہ عشق تھا اس کی نظریں سامنے گذرتے ہوئے مرغزاروں پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن تخیل اس گھر کی طرف بھٹک رہا تھا جہاں جا کر اسے رہنا تھا جمی کے بڑے بھائی پچھلے سال ریٹائر ہو کر آگئے تھے ان کی بیوی بچے وہاں موجود ہوں گے وقت اچھا کٹے گا۔ ان کی دو بڑی لڑکیوں شاہینہ اور ذاکرہ سے تو اس کی خوب گاڑھی چھنتی تھی فواد اور زینی کو بھابھی کے پاس چھوڑ کر وہ خوب تفریح کرے گی۔

دہلی اسٹیشن پر حسن بھائی لینے آگئے تھے گھر پر بڑی بھابھی اور بچوں نے پرجوش استقبال کیا۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ بھابھی نے گھر بڑی اچھی طرح سنبھال رکھا تھا۔ ایک مالی باغیچہ کی دیکھ بھال کے لئے تھا ایک نوکر کھانا پکانے اور سودا لانے کے لئے موجود تھا وقت ملنے پر وہ کچن گارڈن میں سبزیوں کی دیکھ بھال بھی کر لیتا تھا لڑکیوں نے اپنے کمرے نفاست سے سجا رکھے تھے پرویز کو نوکری مل گئی تھی اس لئے اس کے کمرے کا سامان نکال کر وہ کمرہ بڑی بھابھی نے اس کو رہنے کو دے دیا۔ اس کو یہ کمرہ اس لئے پسند آیا کہ اس کی کھڑکی کے بالکل سامنے گلاب کے پھولوں کی کیاری تھی اور دور پر ایک یوکلپٹس کا پیڑ تھا اس کے پیچھے سے چاند نکلنے کا منظر بیحد دلفریب ہوتا تھا۔

دن بڑی لاپرواہی بے فکری کے ساتھ گذرنے لگے جمی کو اپنے بچپن کے پرانے دوست مل گئے وہ آفس سے لوٹ کر ان کے ساتھ تاش کھیلنے چلا جاتا اور وہ خود شاہینہ۔ ذاکرہ۔ ندیم سلیم کے

ساتھ ساری رات گپیں مارا کرتی۔

پھر خدا جانے کیا ہوا کہ بھابی کی تیوریاں چڑھی رہنے لگیں ذرا ذرا سی بات پر بگڑنے لگتیں اور ایک دن انھوں نے اپنا کھانا پینا الگ کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ دوسرے دن کچن میں ایک دیوار کھڑی کر کے اس کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ بڑی بھابی پھر بھی بڑبڑاتی رہیں ان کا خیال تھا کہ اس کی طرف زیادہ حصہ چلا گیا تھا۔

پھر مالی کی شامت آئی اور اس کو نکال دیا گیا کیونکہ حسن بھائی رٹائر ہو چکے تھے اور خرچ بہت تھا۔ کچن گارڈن کی سبزیوں کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا کیونکہ حسن بھائی رٹائر ہو چکے تھے اور سبزیاں بازار سے نہیں خریدی جا سکتی تھیں بجلی کا بل اس کے ہاتھ میں تھما دیا گیا پھر تخت پر سے چادریں اور دروازوں سے پردے غائب ہونے لگے جو اس گھر میں رہے وہی اس کو بہتے۔

اس کے پیٹ میں مستقل درد رہنے لگا۔ گھر میں تناؤ دیکھ کر جمی زیادہ وقت باہر گذارنے لگا۔ تاش کی محفلیں ساری ساری رات جمنے لگیں ــــ کھڑکی کے سامنے گلاب کی پتیاں پیلی پڑ گئیں۔ شاہینہ اور ذاکرہ نے بھی اس سے بولنا چھوڑ دیا۔ ندیم اور سلیم نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اس گھر میں وہ کتنی اجنبی تھی۔ تنہائی کے شدید احساس نے اس کو مایوسیوں کی عمیق تہہ میں پہونچا دیا۔ گلاب کی کیاری کب سوکھ گئی یوکلپٹس کے پیچھے سے چاند کب ابھرا۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا وہ سوچتی رہتی صرف انسانوں کے بارے میں۔ ان کے مختلف اندار یہ رویئے خود غرض پینترے "اف خدا تیری یہ دنیا کتنی حسین ہے۔ اگر یہاں آدمی نہ بسا ہوتا"

ایک دن جمی کے آفس کے کچھ لوگ ملنے آ رہے تھے۔ جمی نے اس سے ڈرائنگ روم صاف کرنے کو کہا وہ جھاڑن لے کر فوراً ڈرائنگ روم میں پہونچ گئی۔ صفائی اور سجاوٹ سے اس کو خاص لگاؤ تھا۔ صفائی کے بعد اس نے کرسیوں اور صوفوں کا اسٹائل بدل دیا پرانی تصویریں ہٹا دیں پیالوں میں پھول سجائے دروازوں کے پردے جھاڑ ہی رہی تھی کہ بڑی بھابی آ گئیں [illegible] برسنے۔

"اماں جان کے وقت سے یہ کمرہ اسی طرح رہتا تھا تم کو بدل کرنے کا حق کس نے دے دیا؟"

وہ بھونچکی ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگی اور پھر مایوسیوں نے اس کے وجود کو سمیٹ کر سوچ کے دھارے پر ڈال دیا۔ اس کا کوئی حق نہیں ــــ اس کا کوئی گھر نہیں۔

کاہے کو بیاہی بدیس لکھیا بابل مورے۔

ایک بار پھر اس کا مرنے کو دل چاہا مگر پھر اس نے جینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ زندگی آگے بڑھنے لگی زینی اور فواد اسکول جانے لگے اس نے ایک کالج میں سروس کر لی پھولوں اور رنگوں سے پیار کرنے والی فطرت بے حس مشین کی طرح کام کرنے لگی۔ کب صبح رنگین ہوئی اور کب شام بھیگ چلی ــــ خدا جانے۔

بیس سال محنت اور مشقت کرنے کے بعد اتنا اثاثہ جمع ہو سکا کہ تھوڑا قرض لے کر ایک مکان خریدنے کی بات سوچی جا سکے۔ کافی تلاش کے بعد آخر کار ایک مکان مناسب قیمت پر مل گیا۔ آئیڈیل تو نہیں مگر پھر بھی گھر تھا وہ خوش خوش سارے گھر کا جائزہ لیتی پھر رہی تھی باتھ روم میں داخل ہوئی تو سامنے اپنا عکس نظر آیا دھنسی ہوئی آنکھیں پیشانی کی سلوٹوں اور سفید بالوں نے پوچھا۔

"وہ کشمیر کی وادیوں میں حسین چشمے دیکھنے کا شوق کہاں گیا"

وہ گھبرا کر ٹلتی اور سفید بالوں کا جوڑا لپیٹنے لگی "ابھی کچھ دن اور بچوں کو دودھ پھل نہیں دینا ہے ابھی کچھ دن اور پیدل کالج جانا ہے ابھی کچھ دن اور سارے کپڑے گھر میں دھونا ہیں۔ کیونکہ قرض ادا کرنا ہے مگر پیٹ میں اتنا سخت درد کیوں ہے۔ اس نے لڑکھڑا کر نئے گھر کی دیوار کا سہارا لیا۔

"ابھی کچھ دن اور ڈاکٹر کی فیس نہیں دینی ہے ابھی کچھ دن اور علاج نہیں کرنا ہے۔

محترمہ ہاجرہ نازلی سے انٹرویو

نجم اعزاز

اس مرتبہ ہم نے آپ کے لئے مشہور مصنفہ محترمہ ہاجرہ نازلی صاحبہ سے وقت لیا تھا کہ کچھ تفصیلی حالات حاصل کر سکیں موصوفہ نے فرمایا کہ اس سے قبل "غالباً ۷۴ء – ۷۳ء میں رسالہ زیور پٹنہ (مدیرہ سلمیٰ جاوید) میں ایسا ہی سلسلہ شروع ہوا تھا اس میں اس خاکسار نے اپنے حالات لکھے تھے "برس پندرہ تھے..." اب جناب میں اتنی بڑی ادیبہ تو ہوں نہیں کہ جا بجا میرے حالات چھپتے رہیں۔ ویسے بھی مدت ہوئی قلم ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور اب اس کو جھک کر اٹھانے کی ہمت دوران سر نے سلب کر لی۔ اور اب قلم اپنی بیٹی شہناز کنول کو پکڑا دیا ہے وہ لکھتی ہے اور خوب لکھتی ہے (یہ مادرانہ جذبہ نہیں، حقیقت ہے۔) یہ موصوفہ کا جواب تھا پھر بھی محترمہ نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔

س ۔ پیدائش۔ نام۔ بچپن اور تعلیم کے متعلق کچھ بتائیے؟۔

ج ۔ نام و نمود، عشق و وفا، پیار حسرتیں
تم کو غرض ہے مجھ سے؟ کہ احوال سے مرے؟

س ۔ ادبی زندگی کی شروعات کب اور کیسے ہوئی ۔ ؟

ج ۔ اسے بھی ۱۹۲۲ء میں جب دنیا میں آنکھ کھولی تو گویا ادبی زندگی اپنے چاروں طرف چاندنی کی طرح بکھری ہوئی دیکھی لبس ۱۲ ۔ ۱۳ سال کی عمر میں ایک افسانہ "غلط فہمی" لکھ مارا اور اس کو رسالہ "سہیلی" لاہور نے چھاپ کر میرا دماغ خراب کر ڈالا۔ اور کافی عرصہ تک میں خود بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ مجھے قلم پکڑنا آتا ہے۔

س ۔ کس ادیب سے زیادہ متاثر ہیں اور کیوں ۔ ؟

ج ۔ مجھے شروع سے ہی عصمت چغتائی کا انداز بیان پسند رہا ہے۔ آج بھی ان کی تحریروں کو شوق سے پڑھتی ہوں ویسے اور دوسرے بہت سے لکھنے والے بھی پسند ہیں۔

س ۔ کیا آپ نے بچوں کے لئے بھی کچھ لکھا ہے ؟

ج ۔ کچھ تھوڑا بہت بچوں کے لئے بھی لکھا ہے جو اکثر "کھلونا" دہلی اور "کلیاں" لکھنؤ میں چھپتا رہا ہے۔

س ۔ آپ نے پہلی کہانی۔ افسانہ۔ ناول کب تحریر کیا کب شائع ہوا۔ اور اب تک تحریر و طبع شدہ کہانیوں افسانوں و دیگر تخلیقات کی تعداد کتنی ہے؟

ج ۔ ناول نویسی کی ابتداء ۱۹۵۲ء میں ہوئی ۱۹۵۴ء میں پہلا ناول چھپا۔ بارہ ۱۲ ناول چھپے ہیں۔ افسانوں کی تعداد یاد نہیں ۔ اس سے یہ نہ سمجھیں کہ وہ لا تعداد ہیں۔ بہرحال "بانو" دہلی اور "حریم" لکھنؤ میں چھپتے رہے اور بعض ان رسائل میں بھی چھپے جو اب مرحوم ہیں مثلاً "ضیا" "لکھنؤ" "صدائے نسواں" دہلی ۔

س ۔ معاشرہ میں اخلاقی گراوٹ کی وجہ آپ کیا سمجھتی ہیں اور اس کے سدھار کے لئے کون سا انداز اپنانا پسند کرتی ہیں۔ آیا واعظ کا یا مصلح کا۔

ج ۔ آج کے معاشرہ میں اخلاقی گراوٹ کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مذہب سے دوری۔ بزرگوں کی عدم توجہی۔ ننگا لٹریچر۔ عریاں فلمیں اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں۔ ہر دور کے اخلاق کا معیار الگ ہوتا ہے یہ تو ناممکن ہے کہ زمانہ الٹے قدموں لوٹ جائے (ہر زمانہ میں ماضی کو اچھا سمجھا گیا ہے اور ہر زمانہ میں اچھے برے لوگ رہے ہیں) دراصل بھلائی اور برائی انسانی سرشت میں موجود رہتی ہے بات پنپنے کی ہے حالات جس کو ابھار دیں وہی بارآور ہو جاتی ہے وہی پھلنے پھولنے لگتی ہے "علم ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا" اگر بزرگ تھوڑی سی ذمہ داری قبول کر کے وہی مقناطیسی نظر پیدا کر لیں تو اچھا ہے۔ اس دور میں جب کہ آج کی نسل دماغی اعتبار سے بہت اونچی ہے وعظ و نصیحت سے زیادہ عملی اقدام یا نظر کی مقناطیسیت شاید زیادہ کارآمد ثابت ہو۔ زبان سے کچھ کہنا بیکار محض ہے کیونکہ موجودہ نسل زبانی میں اپنی مثال نہیں رکھتی ان کے پاس بزرگوں سے [illegible]

تیز زبان موجود ہے۔ کیونکہ مشرق نے اپنی مشرقیت کو عرصہ ہوا بیکار شئے سمجھ کر پھینک پھانک دیا اور لطف یہ کہ جس مغرب میں ڈوبے ہیں وہ آج بھی ہمیں مشرقی سمجھتے ہیں ساتھ میں نااہل بھی کہ جو اپنی چیز کی قدر نہ کر سکے وہ ہماری کیا کریں گے۔ وجہ صاف ہے کہ دوسرے کا لباس جسم پر فٹ ہو ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ اس لاحاصل کوشش میں اپنے جسموں کی کانٹ چھانٹ سے بھی دریغ نہیں کر رہے ہیں لہذا کبھی تو جسم زیادہ کٹ جاتا ہے کبھی لباس۔ لہٰذا اس تضییع اوقات کا مطلب ہے احساس کمتری اپنی بھی نظروں میں کمتر ہونا یا مظہر العجائب۔

س ۔ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ادبی ذمہ داریوں کو سنبھالنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوتی ۔؟

ج ۔ ایک عورت ہونے کے ناطے گھریلو ذمہ داریاں پہلے ہیں اور شوق بعد میں۔ لہٰذا مجھے کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ پکانا۔ سینا پرونا اور بچوں کی پرورش (اب تو ماشاء اللہ میرے سب بچے باکار ہیں) کے باوجود وقت نکال کر میں مزے میں لکھتی تھی۔

س ۔ آپ کو اپنی کون سی ادبی تخلیق زیادہ پسند ہے ۔؟

ج اپنی تخلیقات کے اچھے برے ہونے کا فیصلہ تو قاری پر ہے۔ کوئی پوچھے اپنے بچوں میں کون زیادہ پیارا ہے تو یہی کہیں گے کہ ہمیں تو سبھی پیارے ہیں۔ مصنف خود ناقد نہیں بن سکتا ہے۔

س ۔ آپ کے پسندیدہ مشاغل کیا ہیں ۔؟

ج ۔ پسندیدہ مشاغل نہیں صرف ایک مشغلہ ہے کہ بہت ساری کتابیں ہوں اور میں ہوں۔ سو اسی ڈھیر میں دفن رہتی ہوں۔

س ۔ قلمی دوستی کو آپ کیسا سمجھتی ہیں اور کس حد تک نباہ سکتی ہیں ۔؟

ج ۔ قلمی دوستی کا کبھی شوق نہیں ہوا۔ کیونکہ خط لکھنا میرے لئے سب سے مشکل کام ہے۔

س۔ کیا مذہب مسلم قوم کی ترقی میں رکاوٹ ثابت ہو سکتا ہے؟۔

ج ۔ مذہب کوئی علیحدہ چیز تو ہے نہیں کہ جس کو کسی قسم کی رکاوٹ تصور کیا جائے۔ اللہ و رسولؐ پر ایمان و یقین کا نام مذہب ہے صحیح عقیدہ کے ساتھ انسان ہر طرح کی ترقی حاصل کرے مادی وسائل سے دامن بھرے۔ دنیا بھر کے علوم حاصل کرے۔ اچھا کھائے اچھا پہنے۔ معاشرہ میں عزت و وقار حاصل کرے دوسروں کو فیض پہونچائے مقدور ہو تو دنیا کی سیر کرے۔ گھومے پھرے ایجادات میں حصہ لے (بلا تخصیص مرد و عورت) آخر مذہب ان باتوں کو کب روکتا ہے۔ اور کیا رکاوٹ بنتا ہے۔؟ اب یہ الگ بات ہے کہ اپنی نااہلی کو مذہب کی رکاوٹ کا نام دے کر چھپانے کی کوشش کی جائے۔

س ۔ مشرقی خواتین کو کس حد تک مغربی دھارے میں بہنا چاہئے۔؟

ج ۔ "خواتین" کے ساتھ لفظ "مشرقی" لگا کر یہ پوچھنا کہ کتنا "مغربی" بنا جائے عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ وہ مشرقی ہیں مشرقی ہی رہیں گی خواہ کتنا بھی مغرب کا خول چڑھا لیں مشرق سے ناطہ نہیں ٹوٹ سکتا۔ کتنا بھی مغربی رنگ اختیار کریں کہلائیں گی مشرقی ہی۔ میں اس کے خلاف نہیں ہوں کہ مغرب کی بھلائیاں نہ سیکھی جائیں۔ مغربی عورت کی جفاکشی گھرداری کا سلیقہ۔ صفائی۔ دیانتداری۔ ملک و قوم سے محبت ضرور سیکھنا چاہئے اچھی بات جہاں ملے اس کو اپنانا عقلمندی ہے لیکن مغربی عورت کا ننگا پن۔ سفلہ حرکتیں اور بے راہ روی کو ہی کیوں مغربی دھارا سمجھا جائے جس میں بہنے کا ارمان ہو۔

س ۔ اردو کی ترقی کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے؟۔

ج ۔ یہ سوال تو بڑا ٹیڑھا ہے کیونکہ اردو کی بقا کے بارے میں بولنے والے تو بہت ہیں لیکن ان کے بچے کانونٹ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ خود انگلش آمیز اردو میں بات کرنا باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ اردو اسکولوں کی حالت زار کو در خور اعتنا نہیں سمجھتے۔ اردو اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو بنظر حقارت دیکھا جاتا ہے ان اسکولوں میں غربا کے بچے پڑھتے ہیں جو تعلیم کے نام پر بے حسی اور بے توجہی کا شکار ہیں وہ بچے احساس کمتری میں مبتلا ہیں وہ خود بھی یہ بتلاتے ہوئے کہ اردو اسکول میں پڑھتے ہیں عجیب سی شرمندگی محسوس کرتے ہیں گویا ان کا یہ "عیب" ان کی غربت کی دلیل ہے۔ ان حالات میں اردو کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے ۔؟ البتہ میں یہ ضرور کہوں گی کہ سنسکرت۔ پالی اور پہلوی جیسی

عظیم زبانیں اب زندہ زبانیں نہیں ہیں یہ ودوانوں (عالموں) پروفیسروں دانشوروں کی زبانیں ہیں مجھے یقین ہے کہ اردو کا یہ حشر نہیں ہوگا کیونکہ اردو کے اندر اس کی بقا کا جوہر موجود ہے یہ جوہر ہر آن اور ہر زمان کارفرما رہے گا اس عہد خرابات میں جب کہ اردو کی خرابی کے بیشمار سامان مہیا ہیں اردو نے سخت جانی کا ثبوت دیا ہے۔ علم اور قلم دونوں لالٹنوں میں بڑے بڑے ادیب (جنھیں میں سائنس دانوں کا مرتبہ دیتی ہوں) اردو کی جوہری توانائی کو ترقی دے رہے ہیں اگر اردو کی جوہری توانائی کے ری ایکٹر پر حال یا مستقبل میں حملہ ہو بھی تب بھی وہ محفوظ رہے گا۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ اردو ایک زبان ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ اردو ایک تہذیب ہے یہ ہر گھر میں باقی رہے گی۔ وہ اردو کیسے مر سکتی ہے جو حرمین شریفین (سعودی عرب) اور خلیج کی ریاستوں میں عربی کے بعد دوسری زبان بنی ہوئی ہے۔ اور مسلمانوں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ انگلستان۔ امریکہ اور کینیڈا تک مارچ کر رہی ہے۔ پاکستان میں اردو قومی زبان ہے لیکن ہندوستان میں دہلی۔ لکھنؤ۔ اکبر آباد۔ حیدرآباد میں ختم ہونے کے بعد اب یہ بمبئی (مہاراشٹر) میں پروان چڑھ رہی ہے۔

ضرورت یہ ہے کہ اردو کا ماتم ختم ہو اور صحیح بنیادوں پر اس کی بقا اور ترقی کی مہم شروع ہو۔

آہیں

فرخ اعظم

سال کے دم توڑتے سسکتے لمحوں نے اپنے کپکپاتے ہوئے ناتواں ہاتھوں سے ٹھنڈک کو اپنے عروج پر پہونچا کر ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ اپنی زندگی کا بھرپور احساس جلایا ہے۔ اس کی زندگی کا یہ احساس اس کی موت کے بعد بھی شاید کافی دنوں تک قائم رہے گا۔

آج اس سال کی آخری رات ہے۔ کل کا سورج ایک نئے سال کو لے کر آئے گا۔ اور وہ اپنے مٹی کے بنے ہوئے کچے گھر کے ایک کمرہ میں بیٹھی سال کے ان دم توڑتے ہوئے لمحوں کا، ان کی کامیابی کا جائزہ لے رہی ہے۔ جنھیں اللہ نے نواز رکھا ہے وہ تو اپنے گھروں میں لحاف کی گرمی میں لپیٹے ہوئے سردی سے محفوظ سو رہے ہیں مگر غریب لوگ ...... ؟ وہ خود بھی تو غریب ہے اور اس کا بھائی پاس کے ریلوے یارڈ میں کام کرنے گیا ہے۔ وہ کسی مال گاڑی میں سامان رکھوا رہا ہوگا تاکہ صبح کے سفر کے لئے وہ گاڑی تیار ہو سکے۔ اس کے ساتھ نہ جانے کتنے اور لوگ کام کر رہے ہوں گے۔ اور اس طرح یہ غریب طبقہ اس کپکپاتی ٹھنڈک میں رات بھر جگ کر، محنت و مشقت کر کے سال کے ان آخری لمحوں کی کامیابی کا جشن منا رہے ہیں۔ اس امید پر کہ جب یہ سال ڈوبے گا تو نئے سال کے ابھرتے سورج کے ساتھ ان کے لئے بھی کچھ گرمی، کچھ خوشیاں بھیجے گا۔

دن بھر کا تھکا ہارا اس کا باپ بھی پاس کے کمرہ میں چارپائی پر لیٹا شاید یہی سب کچھ سوچ رہا ہے۔ اسے اپنے باپ پر ترس آنے لگا۔ بے چارہ کئی برسوں سے مستقل دوڑ دھوپ کرنے کے بعد بھی اب تک اس کے ہاتھ پیلے نہ کر سکا۔ کتنی مشکل سے اس نے اس کے لئے کچھ سامان جمع کیا ہے۔ اور اسی لئے تو اس نے اسے پرائیویٹ بی۔ اے کروایا ہے۔ تاکہ جہیز میں اس کی بیٹی کے پاس زیادہ سامان نہیں تو کم از کم علم کی دولت تو ہوگی۔ لیکن لوگ تو دولت دیکھتے ہیں جہیز دیکھتے ہیں۔ صرف جہیز۔ علم یا ہنر نہیں۔ اس کا باپ شاید یہی سب کچھ سوچتے سوچتے سو گیا تھا۔ یا پھر خواب دیکھ رہا ہوگا۔ کل نئے سال کا۔ نئے سال کی نئی روشنی، نئی گرمی کا۔ وہ بھی تو کئی سال سے یہی سب کچھ سوچتی، یہی خواب دیکھتی آ رہی ہے۔ ہر سال کے آخری لمحوں میں ہمیشہ وہ یہی سوچتی ہے کہ آنے والا نیا سال اس بار ایک نئی روشنی لے کر آئے گا۔ اس بار سماج کا پڑھا لکھا طبقہ اور سماج کے ٹھیکیدار (جو سماج کو سدھارنے کی بات کرتے ہیں) خود اپنی بیٹیوں کی شادی میں فضول خرچی اور جہیز سے بچ کر اس کو اور ہوا نہیں دیں گے۔ اس بار شاید ہم لوگ جہیز کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ اس بار ضرور کوئی نوجوان آگے بڑھے گا، جس کی خود اپنی آنکھیں ہوں اور جو جہیز کی آنکھوں سے نہ دیکھتا ہو۔ اور اس بار شاید اس کی بھی شادی ہو جائے۔ وہ سوچنے لگی، کہ نہ جانے اس کی طرح کتنے لوگ، کتنی مائیں، کتنے باپ اور کتنی بیٹیاں ہر سال کے آخری لمحوں میں شاید یہی سب کچھ سوچتی ہوں گی۔ لیکن ہر نئے سال کا گرم سورج ان کے لئے، پچھلے سالوں کی طرح، آہیں لاتا ہے ــــ صرف آہیں۔ ٹھنڈی اور سرد آہیں۔

دیر آید درست آید

● ـــــــ زبیدہ خاتون صدیقی

آج پھر چند عورتیں اسے دیکھنے آئیں۔ اپنے زرق برق لباس کی نمائش کی۔ اسے گھور گھور کر ٹٹول ٹٹول کر چاروں طرف سے دیکھا۔ خوب مذاق اڑایا۔ اور پھر بغیر کوئی جواب دئے چپکے سے کھسک گئیں۔ اس کی ماں حسرت بھری نظروں سے انھیں جاتے دیکھتی رہیں اور پھر ایک لمبی آہ کے ساتھ لیٹ گئیں۔ آنکھوں میں ناامیدی اور اپنی بے بسی سے آئے ہوئے آنسوؤں کو چپکے سے دل ہی دل میں پی گئیں۔

ناہید تھوڑی دیر گم صم سی اندر ہی بیٹھی رہی وہ اس خیال سے باہر نہ نکلی کہ اس کو دیکھ کر اس کی ماں اور زیادہ رنجیدہ ہوں گی... جب محلہ پڑوس کی آئی ہوئی عورتیں بھی چلی گئیں۔ تب ناہید باہر نکلی اور کنکھیوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتی ہوئی بجھے بجھے دل سے گھر کے کاموں میں لگ گئی۔

اس کے باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے۔ ناہید سے بڑی دو بہنیں اور تھیں جن کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ تھیں ناہید نے پچھلے سال بی۔ اے کیا تھا تب ہی سے اب تک چار چھ بار اسے دیکھنے عورتیں آچکی تھیں۔ ہر بار اس کی ماں پر تکلف انتظام کرتیں۔ عورتیں آتیں اور اسے دیکھ کر منہ بناتی چلی جاتیں۔

جس کی وجہ یہ تھی کہ ناہید اپنی بڑی بہنوں کی طرح خوبصورت نہ تھی۔ کالے سیاہ رنگ اور پھیکے ناک نقشے پر اگر کوئی چیز خوبصورت تھی تو وہ اس کی بڑی بڑی پرکشش آنکھیں تھیں جو مخاطب کو مرعوب کر دیتی تھیں ویسے بھی وہ انتہائی ذہین اور حسن سیرت میں لاجواب تھی مگر یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔

اس معذرت کی دکھائی سے اب ناہید دل برداشتہ ہو چکی تھی اس سے پہلے بھی دو ایک بار اس نے دبی دبی زبان سے اپنی ناگواری کا اظہار کیا تھا مگر پھر اپنی ماں کا افسردہ چہرہ دیکھ کر وہ چپ رہ جاتی تھی لیکن آج اس نے اپنے دل میں عہد کر لیا تھا کہ اب وہ مزید اپنا تماشہ نہ بنوائے گی۔

وہ پڑھی لکھی مستقل مزاج اور حساس دل کی لڑکی تھی روز روز کی دل آزار باتیں۔ دیکھنے والیوں کے لٹکے منہ۔ اپنی بے بسی۔ اپنی ماں کی غمگین صورت۔ ان سب باتوں نے اسے شادی سے انتہائی متنفر کر دیا تھا۔ ایک قدرتی خامی کے بدلے اسے دنیا والوں سے اپنی اتنی ذلت اب برداشت سے باہر تھی۔

جوان جہاں دل میں شادی کے متعلق جو ارمان، آرزوئیں اور سپنے سجے تھے اسے خودداری کے پتھر سے چور چور کر کے... قناعت کی چادر میں لپیٹ کر صبر و ضبط کے سمندر میں ڈبو دیا۔ اور دل میں یہ عہد کیا کہ اگر قدرت نے دنیا میں کسی کو اس کا شریک زندگی نہیں بنایا تو نہ سہی۔ وہ یوں تنہا بھی زندہ رہ سکے گی اور اپنی خودداری کو مجروح نہ کرے گی۔ ایک نئے عزم کے ساتھ اس نے دوبارہ کالج جوائن کیا اور بی۔ ٹی کرنے کے بعد ایک دوسرے محلہ میں بڑا سا مکان کرایہ پر لے کر مونٹیسری اسکول کھول لیا صبح سات سے ساڑھے گیارہ تک۔ وہ چھوٹے بچوں کو ابتدائی تعلیم دیتی۔ اور دو بجے سے شام کے ساڑھے پانچ تک تیسری چوتھی کلاس لیتی ..... اور یوں اس نے اپنی ہمت دور اندیشی اور مستقل مزاجی سے خوش آئندہ مستقبل کی نئی راہ نکال لی.... اگر کبھی بھی زندگی اور اس کے تقاضے مجبور کرتے۔ دل بغاوت پہ آمادہ ہوتا۔ پہلو میں دھماکے اٹھتے محسوس ہوتے۔ کانوں میں ننھی منی کلکاریاں گونجتیں۔ اور کسی اجنبی کی آہٹ دل پر دستک دیتی تو وہ اپنے دل کے اٹھتے ہوئے بگولوں کو ضبط و صبر سے دبا دیتی اور ایک نئے جوش و نئے ولولہ کے ساتھ ننھے منے بچوں کی تعلیم و تربیت میں منہمک ہو جاتی۔

مگر ناہید کے برعکس اس کی ماں کو اب بھی اس کی شادی کی فکر تھی۔ وہ نماز کے بعد پہروں دل ہی دل میں نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں مانگتی رہتیں۔ وہ سمجھدار جہاندیدہ خاتون تھیں اور جانتی تھیں کہ لڑکی لاکھ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے مگر شوہر کے مضبوط سہارے کے بغیر سماج میں اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔

خالد تین سال کے بعد جب لندن سے اپنی تعلیم مکمل کر کے گھر آیا تو اسے اپنے محلے میں ایک بڑے سے گیٹ پر مونٹیسری اسکول کا بورڈ لگا ہوا نظر آیا۔ سارا دن گیٹ پر بچوں اور عورتوں کی بھیڑ لگی رہتی.... اس نے اپنی ماں سے اس کے متعلق دریافت کیا انھوں نے بتایا کہ کوئی سید صاحب تھے ان کی تین لڑکیاں تھیں دو بڑی لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی

سب سے چھوٹی لڑکی بہت کالی بدصورت ہے اس کی کہیں شادی نہیں ہوئی..... اس لڑکی نے بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کر کے ایک سال پیشتر یہ اسکول کھولا ہے۔

آپ نے اسے دیکھا۔ سچ مچ بہت بدصورت ہے؟ خالد نے پوچھا۔

دل ہی دل میں وہ اس لڑکی کی بلند ہمتی اور مستقل مزاجی سے بہت متاثر ہوا۔ بجائے اس کے کہ وہ روتی، کڑھتی۔ اور ایک روز ٹی۔ بی میں مبتلا ہو کر مر جاتی.... اس نے دور اندیشی سے کام لے کر جینے کا نیا ڈھنگ سیکھا۔ نئے انداز اپنائے۔ اور غموں سے سمجھوتہ کر کے زندگی اور اس کی دھارا کو ایک نئی ڈگر پر موڑ لیا۔ خالد دل سے اس کا مداح ہو گیا۔

اس کی ماں نے بتایا کوئی دو ماہ ہوئے ہوں گے جب وکیل صاحب کے یہاں میلاد شریف میں اسے دیکھا تھا رنگ کالا ہے اور ناک نقشے کی بھی بس یوں ہی ہے۔ البتہ آنکھیں بڑی پیاری اور موہنی ہیں۔ پھر چند لمحے سکوت کے بعد بولیں ایک بات ضرور ہے کہ کچھ بڑھتی عمر کا اثر.... اور حالات کی تلخی سے لب و لہجہ کچھ ضرور کڑوا سا ہو گیا ہے۔

"عمر کیا ہو گی چالیس پینتالیس؟" خالد نے پوچھا۔

ارے نہیں اس کی ماں بولیں۔ بس بائیس جو بیس سال سے بھلا اوپر ہو گی..... ویسے حسن سیرت کی بہت خوب.... مگر قسمت کے لکھے کو کون مٹائے.... اس کی ماں نے ایک لمبی سانس لی۔

انشاء اللہ..... میں مٹاؤں گا۔ خالد نے ایک عزم کے ساتھ دل میں سوچا اور اس جگہ سے اٹھ گیا.....

اس کے چند دنوں بعد ایک روز صبح خالد اس کے اسکول پہونچا گیٹ پر موجود چپراسی سے اپنا کارڈ اندر بھجوایا۔ چند منٹ بعد ناہید نے اسے اپنے آفس میں بلا لیا اور خالد نے دھڑکتے دل سے آداب عرض کیا ناہید نے سر کے اشارے سے اس کا سلام لیا اور متانت سے بولی۔ "فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں" اور ایک لمحہ کے لئے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کی طرف اٹھائیں.... خالد ڈگمگا گیا آنکھیں کیا تھیں اداسی اور پژمردگی کی دو گہری جھیلیں تھیں۔ جن میں اس کا سراپا ڈوبا جا رہا تھا۔ خدا کی پناہ اس نے جلدی سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں بعد دل میں سوچا ہزاروں حسن اس کی آنکھوں پر قربان۔

آپ نے فرمایا نہیں کیوں تکلیف کی۔ ناہید نے پُر وقار لہجے میں پوچھا۔

جی..... خالد نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو دباتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا میرا نام خالد ہے..... میری ایک عزیزہ کو اپنے چار سال کے بچے کو داخل کرانا ہے.... ایڈمیشن فیس اور دوسرے اخراجات کیا ہوں گے؟ براہ مہربانی بتا دیجئے۔

ناہید نے میز کی دراز سے ایک چھپا ہوا فارم نکال کر کہیں کہیں پر اپنے قلم سے دو چار جگہ نشان لگا کے اور فارم اس کی طرف بڑھا دیا۔

خالد اتنی دیر جوان اور بھرپور نظروں سے سر تا پیر اس کا جائزہ لیتا رہا۔ شکریہ کہہ کر اس نے فارم لیا۔ اب یہاں رکنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ آداب کہتے ہوئے باہر نکل گیا.. یہ سنجیدگی سے پُر وقار جوانی سے بھرپور سلونی سی لڑکی اسے دل سے پسند آئی تھی وہ اس کی شخصیت سے خاصا متاثر ہوا تھا۔

ایک روز ناہید اسکول سے واپس آکر تخت پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی پاس ہی پلنگ پر اس کی ماں کسی سوچ میں مستغرق بیٹھی تھیں اور بار بار ناہید کو دیکھ کر پہلو بدل رہی تھیں۔ ان کی بے چینی کو محسوس کر کے ناہید نے پوچھا امی کیا آپ کچھ مجھ سے کہنا چاہتی ہیں.... ہاں بیٹی! اگر برا نہ مانو تو ایک بات کہوں اس کی ماں قدرے تذبذب سے بولیں۔

کہئے برا کیوں مانوں گی۔ ناہید نوالہ توڑتے ہوئے خوش دلی سے بولی۔

ایک لمحہ سکوت کے بعد اس کی ماں نے کہا ایک جگہ سے تمہاری نسبت آئی ہے وہ لوگ کہتے ہیں کہ.....

ناہید کا چہرہ فق ہو گیا۔ بات کاٹ کر ناگواری سے بولی دیکھئے امی میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ اب بار بار اپنا تماشا بنوانے کی مجھ میں ہمت نہیں.... بلا وجہ آپ اپنی بھی ذلت کراتی ہیں اور میری بھی.... جانتی ہیں کہ کوئی پڑھا لکھا صاحب حیثیت آدمی کالی اور بدصورت بیوی نہیں چاہتا..... اور جو ایسے ویسے ہیں انھیں آپ پسند نہیں کر سکتیں۔ بہتر یہ ہے کہ اب یہ بات ہی ختم کر دیجئے..... میں نے اپنی ہستی چھوٹے بچوں کے لئے وقف کر دی ہے اور زندگی کا مقصد پا لیا ہے۔

پھر بھی سننے میں کیا ہرج ہے۔ اس کی ماں پر یقین لہجہ میں بولیں شاید اللہ پاک میری دعاؤں کی لاج رکھ لے۔

کہئے! ناہید ہاتھ دھوتے ہوئے قدرے بے رخی سے بولی اسے اس ذکر ہی سے کوفت ہوتی تھی لیکن ماں کی محبت کے آگے مجبور تھی۔ چند لمحے سکوت کے بعد اس کی ماں بولیں۔ جہاں تمھارا اسکول ہے اسی محلے میں کوئی ریلوے کے ریٹائرڈ ناظر صاحب رہتے ہیں ان کا لڑکا حال ہی میں فارن سے واپس آیا ہے۔۔۔ اسی کا رشتہ تمھارے لئے آیا ہے۔۔۔ تم ابھی کل کی لڑکی دنیا کی اونچ نیچ یا زندگی کے سرد و گرم کیا سمجھو۔۔۔ لاکھ اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی ہو تو کیا۔۔۔ شوہر کے مضبوط سہارے کے بغیر عورت ذات کی دنیا میں کوئی عزت نہیں۔۔۔ اب میری زندگی کی یہی ایک آرزو ہے کہ اپنے مرنے سے پہلے تم کو اپنے گھر بار کی ہوتے دیکھ لوں۔ ہر ماں کا یہی ارمان ہوتا ہے

آپ ایک آرزو ارمان کو کہہ رہی ہیں ناہید قدرے مسکرا کر بولی حالانکہ آپی اور باجی کی شادی کر کے آپ کی کتنی آرزوئیں ، ارمان پورے ہو چکے ہیں۔

دیکھو ناہید تم میری بات ہنسی میں مت ٹالو۔ اس کی ماں بگڑنے کے انداز میں بولیں۔ جس کے جتنی اولادیں ہوتی ہیں سب میں برابر کا درد ہوتا ہے۔ ان دو کی شادی ہو چکی تو کیا میں تمھارے لئے یونہی ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی رہوں۔۔۔ میں تو آخر دم تک یہ کوشش کروں گی۔۔۔ اللہ پاک سے دعا کروں گی کہ اپنی زندگی ہی میں تم کو شوہر کی سرپرستی میں دیکھ لوں۔۔۔ اور اگر میری یہ حسرت پوری نہ ہوئی تو قبر میں میری پیٹھ بھی نہ لگے گی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

ناہید دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی اور محبت بھرے انداز میں بولی امی آپ قسمت کے لکھے پر کیوں ماتم کرتی ہیں۔۔۔ یہ بھی کوئی اللہ پاک کی مصلحت ہو گی ورنہ میں بھی آپی اور باجی کی طرح خوبصورت ہوتی۔۔۔ دل کو سمجھانے کے لئے آپ یہ سوچئے کہ میرے کوئی بھائی نہیں ہے میں بڑھاپے میں آپ کی خدمت کروں گی۔۔۔ ورنہ کیا آپ کی غیرت یہ گوارہ کرتی کہ عمر کے آخر دور میں آپ بیٹی داماد کے گھر جا کر رہتیں۔۔۔ میری امی اب میری فکر چھوڑ دیجئے۔ میں اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہوں۔ اب اللہ سے دن رات یہ دعا کیجئے کہ اس سال آپ کا نمبر آ جائے اور آپ کو حج بیت اللہ شریف کی سعادت نصیب ہو۔

اس کی ماں نے اسے انتہائی شفقت محبت کے ساتھ سینے سے بھینچ لیا اور روتے ہوئے بولیں۔ بیٹی تم ایک ماں کی محبت کو کیا جانو۔۔۔۔۔ کبھی کبھی وہ اپنی دین و دنیا دونوں بچوں پر قربان کر دیتی ہے۔ تمھیں اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر تو، اللہ معاف کرے، میں حج کرنے بھی نہ جا سکوں گی۔

ناہید نہا کر باہر نکلی سفید بلاؤز اور سفید ساری پہنے وہ صحن میں کھڑی ہو کر تولیہ سے بال جھاڑنے لگی وہ اپنے سیاہ رنگ کی وجہ سے زیادہ تر سفید ہی کپڑے پہنتی تھی اس کی ماں کچن سے نکلیں اور کہا ناہید۔۔ کوئی تم سے ملنے آیا ہے میں نے بنگلی سے کہہ کر باہری کمرہ کھلوا دیا ہے۔

"کون ہو سکتا ہے" ناہید دھیرے سے بڑبڑائی۔

کوئی اپنے بچے کے داخلے کی وجہ سے آیا ہوگا۔ اس کی ماں نے کہا ناہید نے بال پیچھے کر لئے سر پہ پلو ڈال کر وہ کچھ سوچتی الجھتی سی کمرے میں داخل ہوئی۔

آداب عرض۔ کسی نے انتہائی مہذب انداز میں کہا ناہید جو یک گی سر اٹھا کر دیکھا اس کے سامنے سفید براق سے سوٹ میں خالد ہونٹوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ لئے کھڑا تھا۔ اس کی اس مسکراہٹ پہ ناہید دل ہی دل میں جل کر کھردے انداز میں بولی۔ کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔

معاف کیجئے گا خدمت تو میں آپ کی کرنا چاہتا ہوں۔ خالد زیر لب مسکرا کر بولا۔

ناہید نے اس کی طرف کڑے تیوروں سے گھورا۔ میں کچھ نہیں آپ کا مطلب۔۔۔؟

مطلب صاف ہے خالد نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔

تو پھر کیجئے۔ کیا میں نے منع کیا ہے۔ ناہید اسے کاٹ کھانے والے انداز میں بولی "کیا میرے یہاں کوئی شادی کرانے کا دفتر کھلا ہوا ہے جو آپ منہ اٹھا کر اپنی درخواست دینے چلے آئے" اس نے اسے حقارت سے دیکھا۔

خالد نے اسے ایک نظر بغور دیکھا اور چپکے سے بولا۔ میں نے سُنا

ہے کہ ابھی آپ کی بھی شادی نہیں ہوئی۔

ناہید ایک لمحے کے لئے قدرتی شرم و حیا سے جھینپ سی گئی مگر پھر دوسرے ہی لمحے اُسے نوچ کھانے والے انداز میں بولی۔ تو پھر آپ کیوں دُبلے ہو رہے ہیں اور . . . . اور شادی میں رکھا ہی کیا ہے ؟۔

جی کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی رکھا ہوتا ہوگا۔ خالد دبی دبی مسکراہٹ سے بولا" ورنہ میرے اور آپ کے بزرگ اس جنجال میں کیوں پھنستے

"یہی رکھا ہے کہ ہر بیوی ماں بن کر دو چار بچوں کی تربیت اور نگہداشت کرتی ہے" ناہید جلے بھنے انداز میں بولی لیکن میں نے تو سیکڑوں بچوں کو تعلیم تربیت دینے کے لئے اسکول کھول رکھا ہے۔ اس کا لب و لہجہ بیباکانہ تھا اور دل میں وہ یوں کھول رہی تھی کہ جیسے بس چپّل اتار کر خالد کے اوپر پل پڑے گی۔

خدا کی پناہ . . . . یہ تو بالکل ہی تیتیا مرچ ہے خالد نے اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اور کڑوے تیوروں کو دیکھ کر دل ہی دل میں سوچا اور پھر اپنے لب و لہجہ میں دنیا جہاں کا پیار بھر کر چپکے سے کہا۔ آپ سمجھیں نہیں میں تو . . . میں تو آپ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔

ناہید کے دل میں اس سوال کا کہیں وہم و گمان بھی نہ تھا وہ تو شادی شدہ زندگی کے سب ارمان، ولولے اور سپنے دل کی گہرائیوں میں بہت پہلے دفن کر چکی تھی۔ خالد کی بات سن کر سٹپٹا سی گئی نگاہیں نیچی کرکے قدرے تلخی سے بولی۔ آپ نے اپنی اور میری صورت دیکھی ہے ؟۔

"بالکل! بلکہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ میرے سامنے کھڑی ہیں" خالد مسکرایا اور اب اگر آپ اجازت دیں تو یہ انگوٹھی آپ کی انگلی میں پہنا کر اپنی اور آپ کی ازدواجی زندگی کی مبارکباد دے دوں۔ اس نے لال مخمل پر جگمگاتی ہوئی انگوٹھی اس کے سامنے کردی۔

ناہید کی نگاہیں جھک گئیں۔ دل ایک نئے انداز سے دھڑک اٹھا دھیمے لہجے میں بولی۔ لیکن میرے اصول اور . . . اور وہ چپ ہو گئی آگے کچھ کہنے کو اس کی زبان نے ساتھ نہ دیا۔

انھیں میرے اوپر قربان کر دیجئے۔ اور پھر دیکھئے۔ خالد سنجیدہ سا ہو کر بولا

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اس نے آگے بڑھ کر انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنانا چاہی۔ لیکن ناہید یہ کہتی ہوئی شرما کر اندر بھاگ گئی۔ شریفوں کا یہ شیوہ نہیں۔ خدا کے فضل و کرم سے میری ماں کا سایۂ عاطفت قائم ہے ان کی منشا کے بغیر میں ایسی کوئی بات نہیں کر سکتی۔

خالد کی نظروں میں ناہید کی وقعت اور بڑھ گئی۔

تین تین چیزوں کا خیال رکھیں

- صورت، سیرت اور قسمت ہر شخص کی مختلف ہوتی ہے۔
- زن۔ زر۔ زمین، بھائی بھائی کو بھی دشمن بنا دیتے ہیں۔
- اولاد، عورت، دولت، سب کو پیاری ہوتی ہے۔
- عقل، علم، ہنر، کو، کوئی چرا نہیں سکتا
- تیر کمان سے، بات زبان سے، جان جسم سے نکل کر واپس نہیں آ سکتے۔
- حاسد، کاہل، وہمی، ہمیشہ غم میں مبتلا رہتے ہیں۔
- قرض۔ فرض۔ مرض، کو کبھی چھوٹا نہ سمجھیں۔
- صابر مصیبت پر، بہادر مقابلہ پر اور دوست ضرورت پر پہچانے جاتے ہیں۔

مرسلہ:۔ ساجدہ بیگم (بنگا راپیٹ)

عزیزی عطیہ کا ایک خط

امریکہ کے شہر فلوشنگ۔ این۔ وائی سے عطیہ سلمہا نے لکھا ہے: یہاں کی تعلیم تو بہت اچھی ہے ماموں جان، لیکن تہذیب بالکل بے کار ہے۔ بہت سے مسلمان یہاں بالکل امریکنوں کی طرح زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن ایسی بھی مسلم خواتین ہیں، جنھیں میں نے نقاب میں دیکھا طبیعت کتنی خوش ہوئی بتا نہیں سکتی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان پر کوئی آواز سے بھی نہیں کستا۔

یہاں کے لوگوں کو سبق لینا چاہئے۔

- ہر ماہ حریم اگر ۲۰ر تاریخ تک نہ ملے تو فوراً دفتر کو لکھیں۔
- اگر آپ کسی بات کا جواب چاہتی ہیں تو جوابی لفافہ یا ٹکٹ روانہ کریں

عورت کا رومان اور اسکا المیہ

جارج ایلیٹ: حیات خیالات اور فن

قسط پنجم :- ہنگامۂ دار و رسن ؛

——— فہیم اہولوی

تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت
میری ہر ایک شکست میں میرے ہر ایک قصور میں (اصغر)

بس اتنے پہ ہوا ہنگامۂ دار و رسن پیدا
کرنے آغوش میں کیوں آئینۂ مہر درخشاں کو (اصغر)

کسی کا رنج دیکھوں ہو نہیں سکتا مرے دل سے
پلک صیاد کی جھپکے تو کچھ کہدوں عنادل سے

(ثاقب لکھنوی)۔

"ہر نیک اولاد کو وہ لمحہ یاد رہتا ہے جس میں اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی تھی۔ جب پہلی بار اس نے اپنے باپ کی آنکھوں میں فخر کی چمک دیکھی تھی اور اس کی ماں نے اس سے منھ پھیر لیا تھا تاکہ وہ اس کی خوشی کے آنسو اور کرم کے آنسو نہ دیکھ سکے"۔ (جان وسکن)

ہماری آدھی سے زیادہ اچھائی اور نیکی ان پر منحصر ہوتی ہے جنھیں ہم سب سے زیادہ چاہتے ہیں اور جن کو ہم سب سے زیادہ عزیز ہیں۔ (جارج ایلیٹ)

مائلِ گناہ ہونا ایک الگ چیز ہے اور گناہ کرگزرنا بالکل الگ بات ہے۔ (شیکسپیر)

فطرت گل و بلبل کی جو تھی وہی اب بھی ہے
سو بار خزاں آئی سو بار بہار آئی

ہزاروں سال قبل اس دن کہ جسے "روز ازل" کہہ کر یاد کیا جاتا ہے ہم اپنے مالک و خالق کے گھر سے اس دنیا کی سیر کو نکلے تھے اور آج ان ہزاروں سال کے بے شمار دنوں میں بھی ہماری سیر مکمل نہیں ہو سکی ہے ——— پھر بھی آج ہم نے بہت ترقی کر لی ہے، کہاں سے کہاں آگئے ہیں اور کیا کو کیا بنا دیا ہے۔ پہلے بھی کسی کا دل دکھایا جاتا تھا تو پاپ لگتا تھا اور آج بھی کسی کی خوشی مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر کھل اٹھتی ہے تو لگتا ہے صدیوں سے برستے یہ بادل اس ساون میں بھی برس گئے ہیں۔ ہماری خوشیاں آج بھی وہی ہیں جو کل تھیں اور دکھ میں اگر کوئی فرق آیا ہے تو بس اتنا کہ کل کم تھا اور آج زیادہ ہے۔ اور اضافے کے معنی ترقی قرار پائے ہیں۔

اپنے جذبات سے گذری ہوئی صدیوں کی کسی بھی زندگی کو پھر کر دیکھ لیجئے تو یہی معلوم ہوگا کہ اس پر بھی کسی نے پیار سے ہاتھ پھیر دیا تھا تو وہ نیک ہو گئی تھی اور آج بھی کوئی ہمیں اپنی آنکھوں میں یوں بھر کے دیکھ لیتا ہے کہ پلکیں شرم سے جھک جائیں تو دل پاک ہو جاتا ہے۔ ہر جا جہاں دیگر ہونے کے باوجود دنیا میں کوئی ماں ایسی نہیں کہ جو اپنی بچی کو سوتا دیکھ لے تو یہ گمان نہ کرے کہ اس کے گھر کوئی پری اتر آئی ہے، جو اپنے بچے کو ہنستا ہوا سن لے تو اسے یہ نہ لگے کہ جیسے گنگا بہہ رہی ہے۔ یہاں بھی کوئی اولاد نیک ثابت ہو تو ماں کی جاں فشانی اور باپ کی محنت و مشقت ہوگئی اور وہاں بھی کوئی اولاد اپنے ماں باپ کا دل دکھائے تو خدا اسے معاف نہ کرے گا۔

آخر کیا پایا ہے اتنی صدیوں بعد ہم نے؟ بہت کچھ برائی جتنی بھی پھیل سکتی تھی وہ سب تو ہم نے دیکھ لئے ہیں۔ ہر قوم ایک اچھے اور نیک رہنما کو ترس رہی ہے۔ کوئی گھر ایسا نہیں کہ جس کے مکینوں میں برائی اور درد شامل ہوں۔ ادب پڑھئے تو عجیب و غریب علامتیں ہیں کہ علوم کے سمندر موجیں مار رہے ہوں گے مگر صاف ستھرے تالاب بھی تھا کہ جن میں خوبصورت کنول کھلتے ہیں اور جو اپنے کناروں سے بیٹھنے ہوں۔ اچھی بات کہنے سے دل ڈرتا ہے کہ رائیگاں جائے۔ جیسے پھول کی خوشبو دنیا کی آلودہ ہوا میں مل کر کھو جاتی ہے اور برائی کو کوئی شرم نہیں کہ وہ پلٹی اور بڑھتی ہے اور پھیل رہی ہے۔ بند کمروں میں طلبا نباتات کے بارے میں پڑھتے

ہیں سو کھی پتیاں کتابوں میں چھپاں کرتے ہیں اور کسی کو ایک پیڑ لگانا بھی نہیں آتا۔ چیختے چلاتے اور بھاگتے ہوئے آدمیوں میں کوئی سادہ اور خاموش انسان مل جاتا ہے تو طبیعت خوش ہو جاتی ہے ورنہ اچھے انسانوں کے لئے ترستے ہوئے جان جاتی ہے۔ بلا وجہ کے جھگڑے، مذہب اور نسل کے، دھن دولت کے، شکل اور خاندان کے .... اتنے ہیں کہ بس محبت کو ترسا دل کہہ اٹھتا ہے۔ چھوڑیئے یہ لڑائی اور ہمیں پیار کیجئے۔ مگر وہ دل کہاں کہ جنہیں دل کی شکل بیٹھ جائے۔ بھالی اوصاف اور اچھے خیال پر یقین تو لانا درکنار، ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور شریفوں کو بے وقوف گردانا جاتا ہے خدا جانے اس کی نگاہ میں کون بے وقوف ہیں۔

صدیوں کی جدائی نے اپنے خالق کی یاد کو بھی ماند کر دیا ہے۔ دنیا کے رستوں میں ایسا کھو گئے ہیں کہ خدا کے گھر کا رستہ بھول گئے ہیں۔ مگر وہ آج بھی ہر گناہ معاف کرنے کو تیار، سینے سے لگا لینے کو بیقرار ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔ پہلے وہ بھیس بدل کر ہمیں راہ دکھانے آجاتا تھا لیکن جہاں ہماری عزت نہیں ہوتی وہاں ہم نہیں جاتے، جو جگہ گندی ہوتی ہے وہاں ہم بیٹھنا پسند نہیں کرتے تو پھر وہ کیوں آئے ہمارے پاس جب ہمارے دلوں میں اس کا کوئی مان نہیں، اور اس دنیا کو ہم نے گندہ کر دیا ہے۔ اب تو بس جو بیچارے بھولے بھٹکے اس راہ کو پا جاتے ہیں جس کا نام نیکی ہے اور جو خدا کے گھر جاتی ہے وہ تو اس تک پہنچ جاتے ہیں باقی سب کو تو وہ جب خود طلب کرے گا تو کھڑے ہو جائیں گے اس کے سامنے دل میں برائی اور ذہن میں کفر بھرے ہوئے اور گناہ کے بوجھ سے اس کے سامنے ہمارا سر نہ اٹھے گا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے۔ تب شاید وہ بھی ابر رحمت برسائے گا اور فرشتوں کو حکم دے گا کہ نہلاؤ ان کو نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنا دو، دلوں کا میل دھو دو اور ذہن پاک کر دو اور آج ہر ستارے میں دگنی روشنی ڈال دو اور آج میری کائنات کے تمام سورج ایک ساتھ چمکیں گے کیونکہ میری برسوں کی بچھڑی ہوئی، گمراہ، اولاد واپس گھر آ گئی ہے۔

کچھ ایسا ہی کبھی کسی باپ نے اپنے بیٹے کے لئے کہا تھا جو گمراہ ہو کر برسوں کی جدائی کے بعد گھر واپس آیا تھا اور آج بھی باپ ہر غلطی معاف کر دیتا ہے اور ماں دودھ بخشے بغیر نہیں جاتی۔ ہماری ماں، وہ

سبزہ بیگانہ کہ جس پر پل کر اور چل کر ہم بڑے ہوتے ہیں اور وہ صبح کا نکلا، رات کو لوٹنے والا سورج، ہمارا باپ جس کی کرنوں میں سختی اور گرمی تو ہوتی ہے جو شاخ پر پھل اور پھول لاتی ہے لیکن وہ آگ نہیں کہ جو شاخ کو جلا دے۔ وہی نادان ہیں کہ جو سورج اور شعلہ کا فرق نہیں سمجھتے اور نادانی کی عمر میں یہ فرق سمجھ میں آئے بھی کیسے۔ خدا ہر اولاد کے دلمیں بس یہ سبق ڈال دے کہ وہ

'بڑھے شجر کی طرح اور گرے ثمر کی طرح'

کیونکہ جس راہ پر ماں کے قدم پڑتے ہیں وہی جنت کو جاتی ہے اور جب بھی اس دنیا سے کوئی باپ اٹھتا ہے تو یہی صدا آتی ہے۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

۱۹۴۵ء میں اساق کی شادی ہو گئی اور بہت مبارک ثابت ہوئی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے اور چند ہی سال بعد ان کے بچے انھیں سبزہ زاروں میں کھیلنے لگے جہاں کبھی میری آئن اساق کا ہاتھ تھامے گھوما کرتی تھی۔ لیکن اب نہ اس کا بچپن رہا تھا اور نہ اس کا گھر۔ اساق کی شادی کے فوراً بعد وہ اپنے والد کے ساتھ قریب کے ایک چھوٹے سے قصبے میں جا کر رہنے لگی۔ یہاں بھی اس کا گھر بہت کشادہ اور خوبصورت تھا۔ گھنے پیڑوں کے سائے تلے گذرتا ہوا راستہ چمن کے بیچ میں بنے ہوئے گھر کو جاتا جس کا نام برد گروشد (یعنی درختوں کا وہ کنج جہاں طاہر بستے ہیں) تھا نیچے کی منزل پر اس کے والد کا کمرہ تھا اور پیچھے باورچی خانہ جہاں میری آئن بڑے شوق اور لگن سے کھانا پکاتی۔ اوپر اس کا کمرہ تھا جس کی کھڑکیاں نیچے لگے ہوئے باغیچے اور سامنے پھیلے ہوئے سبزہ زار کی طرف کھلتی تھیں۔ ایک جگہ مکان اور گھر کا فرق سمجھاتے ہوئے اس نے لکھا ہے۔

"جب مکان میں چھوٹے بچے ہوں، خوب پیڑ پودے لگے ہوں اور اسکی کھڑکیاں کھلیں تو سامنے نکلے ہوئے سورج کی کرنیں چمکتی ہوئی پیڑوں کی پتیاں نظر آئیں تب ہی وہ ایک پر مسرت اور اچھا گھر بنتا ہے"

اور اپنے اس مکان کو گھر بنانے کے لئے وہ اکثر اپنی بہن فینی کے بچوں کو اپنے پاس بلا لیتی۔ اور دن باغیچہ میں ان کے ساتھ کھیلتی گویا اس کا بچپن لوٹ آیا ہو اور رات کو انھیں اپنی گود میں سلاتی تو ایسا سکھ ملتا جیسے وہ خود

ماں بن گئی ہو۔

لیکن نیک اور نرم دل میری آنٹی کے لئے یہ خوشی کے بجائے حسرت ہوتی تو دوسروں کے دکھوں اور محرومیوں کا احساس اور زیادہ ہوجاتا۔ پاس کی بستی میں رہنے والے مزدوروں کی امداد کے لئے انہوں نے ایک کلب قائم کیا تھا اور وہ اکثر ان کی بستی میں کپڑے اور دوائیں لے کر جاتی اور ان کے چھوٹے اور گندے گھر دیکھتی، غربت میں پلنے والی برائیاں پاتی تو اس کا دل بھر آتا۔ اس نے لکھا ہے۔

"میں جب ان کی بستی سے واپس آتی تو وہاں
کی خستہ حالی اور منحوسیت کی حد تک گندگی میرے
اندر ایک درد بن کر ساتھ آتی"

اور اس کا جی کرتا کہ وہ دن بھر ان کے پاس رہے، انہیں گھر کی صفائی اور دل کی نیکی سکھائے (کیونکہ یہ دونوں اچھائیاں جدا نہیں ہوتیں۔ ہر خاتون کو یہ سمجھ لینا چاہیئے) اور سوچتی کہ جن لوگوں سے فرض شناسی اور وفاداری طلب کی جاتی ہے ان کے پاس کم از کم صاف ستھرے اور انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کے لائق گھر تو ہونا ہی چاہئیں۔ تب شاید نہ ان کی بلکہ ہماری زندگی بھی زیادہ خوشگوار ہو جائے گی۔ لیکن اب اس کے والد اور بھائی کو اس کی شادی کی فکر تھی۔ اس لحاظ سے وہ اسے غریبوں کے پاس زیادہ جانے سے منع کرتے اور اچھے گھرانوں کی لڑکیوں سے ملنے جلنے کی تلقین کرتے مگر سادہ اور خاموش میری آنٹی کو نہ تو دیگر شوخ اور چنچل لڑکیاں بھاتیں اور نہ وہ اس کے لئے کوئی دلچسپی رکھتی تھیں۔ غرض اب جب کبھی میری آنٹی غریبوں کے پاس جاتی تو اس کے والد کے چہرے کے تیور ان کی ناپسندی کا اظہار کرتے ان کی خاموش زبان اسے نافرمانی کی سزا دیتی۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ گناہ کر رہی ہو۔ ہم میری آنٹی کے والد کی سوچ سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی خواہش تو صرف یہ تھی کہ میری آنٹی اچھے لڑکوں میں اٹھے بیٹھے تاکہ اس کا رشتہ کرنے میں آسانی ہو۔ غریبوں کی مدد سے انہیں کوئی اعتراض نہ تھا لیکن ان کے درمیان زیادہ وقت گذارنا ان کی تجربہ کار نظر اور باپ کے دل کو مناسب نہیں معلوم ہوا۔ انہیں ڈر تھا کہ میری آنٹی ان کے پاس بیٹھ کر اپنا دامن داغدار کر لے۔ دراصل تمام والدین کی طرح وہ بھی اپنی اولاد کی خوبیوں سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ شاید یہ سوچتے ہیں کہ وہ اپنی اولاد کو ہر طرح سمجھتے ہیں۔ سچ بھی ہے مگر ادھورا۔ انہیں اپنے بچوں کی کمزوریوں کا شدید احساس رہتا ہے کیونکہ فطرتاً وہ اس کے لئے ڈرتے زیادہ ہیں۔ ان کی ہر سانس کا مقصد اپنی اولاد کو محفوظ رکھنا ہوتا ہے۔ مگر انہیں اس کے جاگنے اور سونے کی فکر تو ہوتی ہے لیکن اس کے خواب تو وہ دیکھتے نہیں۔ پال پوس کر بڑا تو کر دیں گے لیکن اس کا مستقبل کیا ہوگا یہ انہیں کیا معلوم۔ میری آنٹی کے والد بھی اپنی بیٹی کے اصلاحی عزم اور ذہن کے اتنی گہری نیکی سے بے خبر تھے۔ حالانکہ وہ خدا پر پورا اعتقاد رکھتے تھے لیکن خدا پر اعتقاد رکھنے والے بھی اپنی کشتی کو صرف اس کے سہارے نہیں چھوڑتے ــــ لیکن تو ہی ناخدا نہیں۔ ظالم خدا بھی ہے پھر بھی باپ کے لئے تو اولاد "وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے" ہوتی ہے۔ مگر میری آنٹی جاتی تو اب بھی غریبوں کے پاس مگر چھپ کر، بہانے بنا کر غرض۔ "پلک صیاد کی جھپکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے"

بڑھتی ہوئی عمر اور گذرتے ہوئے سالوں کے ساتھ میری آنٹی کے خیالات میں تبدیلی آگئی تھی لیکن یہ تغیر انقلابی نہیں ارتقائی تھا۔ اکثر ہمارے ذہن میں کوئی خیال یا جذبہ سرگوشی سے داخل ہوتا ہے اور اندر پلتا رہتا ہے، پھر جب وہ اعتقاد بن کر منہ سے پھوٹتا ہے تو سب کو یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم کسی سے متأثر ہو کر ایک دم نئے ایمان لے آئے ہیں۔ یہ رویہ خاص طور سے بڑے اپنے بچوں کے ساتھ زیادہ برتتے ہیں۔ لہٰذا جب دس سال پہلے میری آنٹی کے مذہبی جذبے میں شدت آگئی تھی تو اس کے والدین نے [illegible] کے نیک اثر کو ذمہ دار قبول کیا تھا، جبکہ میری آنٹی نے ایک روز مذہب کو ترک کر دینے کا اعلان کیا تو اس کے والد نے چارلس برے کو قصور وار ٹھہرایا۔

میری آنٹی کے پڑوسی چارلس برے ایک فہمیدہ پڑھے لکھے اور کاروباری آدمی تھے۔ خدا نے ان کی بیوی کو اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ نوجوانی ہی میں چارلس نے مذہب سے کنارہ کش ہو کر اپنا ایک فلسفہ اختیار کر لیا تھا جس کی تشریح کے لئے انہوں نے کئی کتابیں بھی لکھیں۔ وہ مشاہدے کی صداقت پر کہتا تھا کہ انسان جیسے گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں ویسے ہی رہتے ہیں اور مذہب بڑے لوگوں پر کوئی نیک اثر

کی کامیاب نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ مذہب کی رسمیں اور ان کے کھوکھلے کلمے ایک بے وقوف ہم کو دیتا ہے۔ لہٰذا اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر بھی دادا میاں بہت نیک اور رحمدل انسان تھے اپنے ملازمین کے ساتھ نیکی کرنے اور غریبوں کی امداد میں ہمیشہ پیش رہتے۔ میری آنٹی وہ خیال کو بہت جلد پسند آگئی۔ اور ان میں دوستی کا پائیدار رشتہ قائم ہوگیا۔ کتابوں سے میری آنٹی کے دل میں مذہب کی صداقت اور اس کی افادیت کے بارے میں مبہم سے سوالات اٹھنے لگے تھے لیکن وہ انھیں کفر کہکر دبا دیتی تھی۔ اب جا رہی اور آلیہ کے خیالات کی روشنی میں وہ اپنے آپ سے یہ سوالات پوچھتی۔

ــــ تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

بچپن میں میری آنٹی نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک آدمی جو اس وجہ سے شیطان گردانا جاتا تھا کہ وہ خدا پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا لیکن بہت نیک اور ہمدرد انسان تھا اور جو متعدی امراض میں مبتلا لوگوں کی تیمار داری میں اپنی جان خود گنوا دیتا ہے۔ وہ اس کہانی کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئی اور اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ مذہب اور نیکی میں کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ اب جب وہ بڑی ہوگئی تھی تو یہ احساس ایک بار پھر بیدار ہوگیا تھا۔ کلیسا میں جب وہ دوسرے لوگوں کو دیکھتی کہ وہ کتنے سج سنور کے کتنے خوش اور غیر سنجیدہ ہوتے تھے تب اسے اندازہ ہوتا تھا کہ عام طور سے مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔
اسی طرح جب وہ ان غریبوں کی بستی میں جاتی جو خدا پرست ہونے کے باوجود کیسی بری بری باتیں کرتے تھے تب بھی اُسے یہی بات سمجھ میں آتی تھی۔ اپنا شک دور کرنے کے لئے اس نے ڈھیروں مذہبی کتابیں پڑھیں لیکن جس بات پر سے دل اٹھ جائے تو اسے ذہن کیا سمجھا سکتا ہے۔ بالآخر اس نے اپنے والد سے کہہ دیا کہ میں مذہب سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔ اور اب آپ کے ساتھ کلیسا نہ جاؤں گی

میری آنٹی کے والد نے اپنی بیٹی کے اس فیصلے کو کفر سے زیادہ نافرمانی تعبیر کیا۔ اور اس سے بولنا چھوڑ دیا۔ ایک چاہنے والی اور نیک بیٹی کے لئے اس سے زیادہ ناقابل برداشت سزا اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ دن میری آنٹی اگر اپنے والد کی وفادار تھی تو اپنے سے بھی وفادار۔ جب اس کا دل مذہب سے ہٹ چکا تھا تو وہ کس طرح یہ کر سکتی تھی کہ کلیسا بھی جائے۔ اسے خدا کی ذات سے انکار نہ تھا۔ بس مذہب کی کتابوں اور رسموں کو اپنانے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ مانتی تھی کہ مذہب کا حاصل صرف نیکی ہے لیکن نیکی کے سادہ اور معصوم سبق کو مذہب اتنی پیچیدگیوں کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ وہ ان میں گم ہو جاتا ہے۔ اور پھر جو برے ہیں انھیں مذہب اچھا نہیں کر پاتا اور جو نیک ہیں انھیں مذہب کی کیا ضرورت۔

کون کہہ سکتا ہے کہ نیک اور رحمدل میری آنٹی میں خدا نہیں رہتا تھا یا وہ خدا کو عزیز نہ تھی۔ اس کے والد بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ لیکن ظاہر کے آگے باطن کو کون دیکھ پاتا ہے۔ اس خدا پہ اعتقاد رکھنے والے بھی کہ جو نظر نہیں آتا، وہ دوسروں کے باطن پہ یقین نہیں کرتے بس ظاہر ہونا چاہیئے۔ اور حالانکہ جس طرح ایک پیڑ کی پتی کو دیکھکر خدا کی ذات کا یقین ہوتا ہے اسی طرح ہمارے اعمال سے ہماری نیکی یا بدی کا پتہ چلتا ہے مگر نیکی کا ظاہر مذہب قرار پایا ہے۔ اور میری آنٹی اسے اختیار کرنے کو راضی نہ تھی۔ اس کے والد اب اس سے بولنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بھائی بہن الگ ناراض ہوگئے تھے۔ چاہنے والے روٹھ جائیں تو زندگی بھی روٹھ جاتی ہے۔ لیکن

ــــ تیری ہزار برتری تیری ہزار مصلحت
میری ہر ایک شکست میں میرے ہر اک قصور میں

خدا نے میری آنٹی کو اس ہنگامے سے کیا سبق سکھایا یہ ہماری اگلی قسط کا موضوع ہوگا۔

چاندنی رات

ایک نوجوان ماہر نفسیات کی بیوی نے کہا
ڈارلنگ! کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ چاندنی راتوں میں پاگل پن حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور عاقل و سمجھدار لوگ حماقت آمیز باتیں کرنے لگتے ہیں۔
ماہر نفسیات نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ اس مسئلہ میں کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا۔
بیوی نے پوچھا "کیوں
ماہر نفسیات نے کہا "اس لئے کہ وہ ایک چاندنی رات ہی تھی جب میں نے تم سے شادی کی درخواست کی تھی۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے لئے ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہر خریدار حریم کا ایک شعر شائع کیا جاتا ہے، بشرطیکہ وہ موزوں، سنجیدہ اور معیاری ہو۔ شعر کے ساتھ نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جو اشعار ۲۰ر کے بعد وصول ہوتے ہیں وہ شائع نہیں کئے جاتے۔

وعدے کی بات نیند نے فرصت نہ دی انھیں
افسوس جاگ کر مری تقدیر سو گئی

مرسلہ: سیدہ امام حمیرہ تسنیم (آمبور)

وقت راحت آگیا دنیائے کلفت کے لئے
فرصت آرام ہے ارباب محنت کے لئے

مرسلہ: نسرین بانو (وینیم باڑی)

کیا منہ وہ مالدار خدا کو دکھائیں گے
ملتی نہیں کبھی جنھیں فرصت نماز کی

مرسلہ: رشہناز بیگم (بنگارا پیٹ)

درد فرقت سے الٰہی مجھے فرصت ہو جائے
کاش تم آؤ اب ایسی مری قسمت ہو جائے

مرسلہ: نگار سلطانہ جلیلی (آمبور)

دل ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

مرسلہ: جے شکیلہ ثمین رحیتا بیٹ۔ (وینم باڑی)

مرسلہ: رضیہ حسین (کرنول)

مرسلہ: عصمت آرا (بانکا)

مرسلہ: کشور سلطانہ لال باغ۔ لکھنؤ

تم تو جو باد صبا تم نے کھلائے گلشن
ہم جو شبنم ہیں ہمیں رونے سے فرصت نہ تھی

مرسلہ: افروز جہاں (آرہ)

اس شغل سے آنکھوں کو دم بھر جو نہیں فرصت
رونے میں وہ کیا ایسا آرام نظر آیا

مرسلہ: ساجدہ بیگم (بنگارا پیٹ)

غم حیات سے فرصت نہ مل سکی ورنہ
یہ زندگی تری آنکھوں میں ہم ڈبو دیتے

مرسلہ: طلعت فاطمہ لکھنوی (گومہ)

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مرسلہ: شمیمہ روحی (حیدرآباد)

چلو جان دے کے حسرت ہوئی خوب غم سے فرصت
وہ کبھی نہ تم سے ملتے، یوں ہی صبح شام کرتے

مرسلہ: شمع نور الصباح (اپوری۔ الہی)

ہمیں تری محبت میں فقط دو کام آتے ہیں
جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی، خاموش ہو جانا

مرسلہ: عقیل احمد راحت (کرنول)

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

مرسلہ:

ہمیں فرصت نہیں ملتی کبھی آنسو بہانے کی
کئی غم پاس آ بیٹھے ترے اک دور جانے سے

مرسلہ: نجمہ انصار منا (چپکل)

اے حسرت نظارہ سب باتیں ہیں فرصت کی
مدت تو بتا تا حافظ الم شب فرقت کی

مرسلہ: قرۃ العین (سندیل)

• دسمبر کے حریم میں پسندیدہ اشعار کے کالم میں میں لبنیٰ زکریا ثمین کے نام میں ثمین کے بجائے یاسمین چھپ گیا تھا۔ درست فرمالیں۔

• دشمنوں کی تنقید کی روشنی میں حقیقت کو تلاش کرو۔
• [illegible]

مرسلہ: [illegible]

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں لکھی جائے۔ جو خبریں ۲۰ر تاریخ کے بعد ملتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی ہیں۔ خبر کے ساتھ پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کا آنا ضروری ہے۔ خبر کی اشاعت میں کسی غلطی کی ذمہ داری ادارۂ حریم پر نہ ہوگی۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے۔

ولادت اطفال کی خبریں۔

● تمیم صوبیدار (امراوتی) میرے ماموں سید عبد العظیم صاحب اور ممانی سیدہ خورشیدہ صاحبہ کو اللہ تعالیٰ نے ۵ر ستمبر ۱۹۸۱ء کو صبح ۵ بجے، بمقام ڈرونا چلم، ایک اور دختر عطا فرمائی نام سیدہ کوثر رکھا گیا۔

● فریدہ الطاف سلیم نذیر (امبور چھیری) بہن شاہدہ سلیم و بہنوئی سلیم الرحمٰن بی۔ اے کو اللہ پاک نے ۲۶ر اکتوبر ۱۹۸۱ء بوقت دو بجے دن ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام عاصم سلیم قرار پایا۔

● فریدہ واجد (سیتاپور) میری دوسری بہن و بہنوئی سید صداقت احمد اسٹیٹ بینک آف انڈیا بنگلور) کو اللہ تعالیٰ نے تیسری بار ایک دختر عطا فرمائی (نہ تاریخ، نہ دن، نہ وقت لکھا ہے۔)

● مسز سرتاج قادر (کوسگی۔ کرنول) اللہ تعالیٰ نے مجھے اور میرے شوہر کو ۸ر دسمبر ۱۹۸۱ء بروز منگل ۷ بجکر دس منٹ پر صبح ایک اور فرزند عطا فرمایا۔

● عشرت نظر (مرتیباری) میری بھابی شہناز جہاں اور بھیا جمال اشرف کو اللہ پاک نے ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو ۱۱ بجے دن میں ایک دختر عطا فرمائی۔ نام ر ا ل ی قرار پایا۔

● مس سنبل قمر (بہرعلی) میری سہیلی صبیحہ کلیم اور بہنوئی کلیم اسحٰق صاحب (گورکھپور) کو اللہ پاک نے ۱۳ر نومبر ۱۹۸۱ء بروز جمعہ پہلی بار ایک دختر عنایت فرمائی۔ نام نوریہ اور پیار کا نام جویی قرار پایا۔

پیغامات نشاط۔

● محترم سید علی محمد زیدی صاحب رئیس ردولی کے بھانجے غلام مہدی زیدی سلمہٗ (فرزند جناب سید حسن احمد زیدی) کی شادی ہمراہ شہناز فاطمہ سلمہا دختر نیک اختر جناب سید بادشاہ حسین زیدی ہائز دلی باؤس۔ لکھنؤ) ۲۲ر جنوری ۱۹۸۲ء بمقام بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

● معراج الدین قدوائی صاحب کی صاحبزادی طلعت سلمہا کی شادی ہمراہ انور سلمہٗ (فرزند جناب سید شاہد علی مرحوم۔ لکھنؤ) ۲۴ر جنوری ۱۹۸۲ء کو بمقام امین آباد انٹر کالج لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

● شمس الدین صاحب (فریدی بلڈنگ لکھنؤ) کے فرزند مشہور ہاکی پلیئر محمد اویس سلمہٗ کی شادی کے سلسلہ میں ۲۵ر جنوری ۱۹۸۲ء کو بمقام کوٹھی جرنل حبیب اللہ صاحب حضرت گنج دعوت ولیمہ دی گئی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

● بیگم صاحبہ آر۔ ڈبلو عبد الحفیظ صاحب مرحوم (ردولی) کی دختر نیک اختر صوفیہ سلطانہ سلمہا کی شادی ہمراہ محمد رفیق سلمہٗ (فرزند حاجی محمد اسماعیل صاحب ۱۰ر جنوری ۱۹۸۲ء بروز اتوار بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

● حبیب احمد صاحب کی صاحبزادی عطیہ فاطمہ سلمہا کی شادی ہمراہ محمد غفران سلمہٗ (ابن جناب محمد سلیمان صاحب تاجر چکن لکھنؤ) ۱۲ر جنوری ۱۹۸۲ء بروز منگل بمقام کانپور بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

● انیس احمد خاں صاحب (ایسٹ ایشیا کارپٹ مودہا۔ مرزاپور) کے فرزند مشیر سلمہٗ کی شادی ہمراہ شبانہ سلمہا (دختر ایس ایم لطیف صاحب گونڈہ) ۲ر جنوری ۱۹۸۲ء بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

● حسن افروز صاحبہ (بیگم اخلاق احمد صاحب مرحوم) کی بیٹی شاہین سلمہا کی شادی ہمراہ ڈاکٹر محمد اقبال سلمہٗ ... کو مٹیا محل۔ دہلی میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے

نسیم انہونوی)

● سید رفیق علی جعفری کے فرزند انیس۔ این۔ آئی جعفری کی شادی کے سلسلہ میں رفاہ عام کلب لکھنؤ میں ایک شاندار دعوتِ ولیمہ ۱۷ر جنوری ۱۹۸۲ء کو دی گئی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

● حبیب احمد صاحب (کانپور) کے فرزند بلال سلمہٗ کی شادی ہمراہ بلقیس سلمہا (دختر نیک اختر محمد سلیمان صاحب لکھنؤ۔) ۱۴ر جنوری ۱۹۸۲ء بحسن و خوبی انجام پائی۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۸۲ء کو حبیب احمد صاحب نے ایک شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

● نوشینہ بیگم (ناسک) "میری ماموں زاد بہن صادقہ بیگم۔ (دختر مرحوم پیرزادہ میر نثار علی صاحب) کی شادی فہیم اختر (فرزند سید شہاب الدین اورنگ آبادی وظیفہ یاب شریک ناظم تعلیمات) کے ہمراہ بتاریخ ۱۴ر جون ۱۹۸۱ء بروز اتوار، بمقام ناسک بخیر و خوبی انجام پائی۔

● افضل النساء سید اقبال حسین (سورت) "میری بھتیجی شگفتہ یاسمین کی شادی محمد یوسف کے ہمراہ ۱۰ر جنوری ۱۹۸۲ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔

● طلعت فاطمہ لکھنوی (گوموہ) "میری سہیلی ماجرہ رحمان کی شادی اشفاق احمد ایڈووکیٹ کے ساتھ ۸ر جنوری ۱۹۸۲ء کو (ریلوے کالونی گوموہ) میں بحسن و خوبی انجام پائی۔

● ربیعہ نثار (چامراج نگر) میری چھوٹی نند سائرہ بانو (بنت سلیم احمد صاحب تمکور) کی شادی ہمراہ آصف بیگ (فرزند جناب ستار بیگ، تمکور) بتاریخ ۱۷ر جنوری ۱۹۸۲ء بروز اتوار بخیر و خوبی انجام پائی۔

انتقال پُر ملال کی خبریں

● سعیدہ بشیر (معصوم پور، لنک) افسوس صد افسوس میرے خالو محمد روشن صاحب ۱۳ر دسمبر ۱۹۸۱ء بوقت ۱۰ بجے شب دماغی فالج میں مبتلا ہو کر اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک ان کے اہل و عیال کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (مجھے بہن ... فجر الصباح سے دلی ہمدردی

ہے جن کا سہاگ اجڑ گیا۔ میں بھی ان کا شریکِ غم ہوں۔ نسیم انہونوی

● شہلا پروین ظفر احمد مرزائی (بھٹکل) افسوس صد افسوس میرے ماموں ابو محمد مرزائی اور ممانی عصمت سلطانہ صاحبہ کی اکلوتی دختر ۵ ماہ فرنصرت ۹ر جنوری ۱۹۸۲ء بروز سنیچر بوقت ۱۲ بجے شب ۸ گھنٹے کی مختصر علالت کے بعد اپنے والدین کو داغِ مفارقت دے گئی۔ مرحومہ کی عمر صرف پانچ ماہ کی ہی تھی دعا ہے کہ اللہ پاک میرے ماموں اور ممانی کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

● سہیلہ خاتون (مظفر پور) بصد افسوس لکھ رہی ہوں کہ میرے خالو محمود عالم ملک صاحب بتاریخ ۱۹ر دسمبر ۱۹۸۱ء بروز سنیچر بوقت نمازِ فجر امامت فرماتے ہوئے بحالت نماز اس جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک خالہ صاحبہ اور ان کے بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (مرحوم کی خوش بختی کا بیّن ثبوت ہے کہ اللہ کی یاد میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ (نسیم انہونوی)

● اسے قمر سلطانہ (دانمباڑی) افسوس میری آپا زیب النساء ایک ماہ کی علالت کے بعد ۱۱ جنوری ۱۹۸۲ء بوقت ۷ بجے شب رحلت فرما گئیں۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

● مس سارہ رمزی (ملیح آباد۔ لکھنؤ) افسوس صد افسوس میرے چچا زاد بھائی عبد المعبود خاں ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۱ء بروز اتوار بوقت دو بجے شب، ایکسیڈنٹ سے حادثہ ہو جانے کے باعث انتقال فرما گئے۔ مرحوم کی عمر صرف ۲۸ سال کی تھی۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور ان کی ضعیف والدہ، بھائی اور دونوں بچیوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (خبر پڑھ کر دل بھر آیا۔ متعلقین کے لئے یہ حادثہ شدید ہے۔ میں بھی شریکِ غم ہوں۔ (نسیم انہونوی)

● سلطانہ مشتاق و نزہتانہ نازلی (پرنام بٹ) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ ہمارے خالو سید ابراہیم پاشا صاحب فارسٹ افیسر ۱۴ر دسمبر ۱۹۸۱ء بروز پیر ایک بجے شب میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اللہ پاک مرحوم کی بیوی اور بچوں و تمام پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

● عابدہ خورشید (بہبل۔ دھاروا) "میرے حقیقی بھائی خلیل

خاں (فرزند جناب عبداللہ خاں صاحب) اشولاپور ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء وقت پانچ بجے شام اس دار فانی سے رحلت فرماگئے۔ اللہ پاک انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

● مرحوم حکیم عبدالقوی مدیر صدق جدید کی بھانجی کے نوجوان شوہر ڈاکٹر مسعود حسن دس بارہ روز کی مختصر علالت کے بعد ۹ر جنوری ۱۹۸۲ء بعمر ۳۲۔۳۳ سال انتقال فرماگئے۔ مرحوم کی شادی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی نواسی اور شیخ قدیر الزماں صاحب سندیلوی کی بیٹی سے چند ہی سال قبل ہوئی تھی۔ اللہ پاک انھیں اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (نسیم انہونوی)

● حکیم شمس الدین صاحب مرحوم کے داماد اور محترمہ روشن آرا صاحبہ کے شوہر پروفیسر راجہ جمیل صاحب ۱۳ دسمبر ۱۹۸۱ء کو انتقال فرماگئے۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

● مرحوم ڈاکٹر فریدی کے شاگرد رشید لکھنؤ کے ہر دل عزیز ڈاکٹر اور میرے مخلص دوست عبدالمنان خاں صاحب کا ایک طویل علالت کے بعد ۳۰۔ ۳۱ جنوری ۱۹۸۲ء کی شب میں انتقال ہوگیا۔ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل دے۔ (نسیم انہونوی)

ماں

★ انگریزی :- کلثوم مصطفےٰ

★ اردو ترجمہ :- ڈاکٹر احمد نسیم صدیقی

پارول گواہوں کے کٹہرے میں خاموش اور پرسکون کھڑی تھی۔ وہ خلا میں خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کی تجسس آنکھوں اور معاندانہ نظروں سے بالکل بے خبر معلوم ہوتی تھی۔ لگتا تھا دیکھنے والے اپنی نگاہوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوں کہ "کس قدر بے درد، بد طینت اور بے رحم عورت ہے۔"

جج کی بڑی کرسی پر بیٹھے ہوئے میں نے بھی ایک پر تجسس نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ لمبی، دبلی اور بہت زیادہ زرد تھی۔ اس کی سفید ساری اس کے دبلے جسم پر لاپروائی سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال سختی سے ایک جوڑے کی شکل میں پیچھے بندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے سال بھر کافی زیادہ بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ خوبصورت بالکل نہیں تھی تاہم اس کی لمبی کماندار پلکوں والی چھوٹی گہری آنکھوں میں ایک غیر ارضیاتی کشش تھی۔

میں جائزہ لینے میں منہمک تھا کہ سرکاری وکیل نے آگے بڑھ کر کہا۔ مائی لارڈ! میں اس مقدمہ میں مس پارول کی پیروی کروں گا۔ کیونکہ انھوں نے کوئی وکیل نہیں کیا ہے۔ . . . . . اس سے قبل کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتا، پارول بولی۔ مائی لارڈ! میرا کوئی وکیل نہیں ہے۔ میں خود اپنے مقدمہ کی پیروی کروں گی۔ اس پر عدالت کا کمرہ ایک بھنبھناہٹ سے بھر گیا۔ ہو سکتا ہے یہ میرا خیال رہا ہو لیکن میں نے ہر چہرے پر اس کے خلاف دشمنی کے جذبہ کو زیادہ سخت ہوتے دیکھا۔ پارول کی درخواست جائز تھی لہٰذا مجھے اسے منظور کرنا پڑا۔ میں نے کہا۔ اب تم آگے کہہ سکتی ہو۔

اس کی نرم اور صاف آواز عدالت کے کمرہ میں گونجنے لگی۔ حضور عالی! اس سے قبل کہ یہ بے درد دنیا اپنے گندے ہاتھ اس تک لے جاسکے میں نے اپنے بچے کو ہلاک کردیا۔ اسے خود اپنے ہاتھوں سے ہلاک کیا۔ اس کا گلا دبا دیا۔ اس کا دم گھونٹ دیا۔ آپ اسے جرم کہتے ہیں؟ نہیں، نہیں مائی لارڈ یہ جرم [illegible]

ایک نابالغ بچہ تھا میں کسی کی جوابدہ نہیں ہوں کیا میں نے اسے نو مہینے اپنے پیٹ میں نہیں رکھا اور اسے اپنا خون پلا پلا کر نہیں پالا.....؟

وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش رہی پھر مجمع کی جانب متوجہ ہوئی. اس کی آنکھیں شعلہ بار تھیں اور اس کی آواز سخت غصہ کی مظہر تھی اسی حالت میں اس نے بولنا جاری رکھا۔ آپ اسے انسانی جرم کہتے ہیں؟ آپ جو میرے اس اقدام کو غیر مادرانہ، عورت کی فطرت کے خلاف اور بے دردانہ کہتے ہیں، کاش آپ لوگوں نے یہ بھی سوچا ہوتا کہ دنیا اسے حرامی کہے گی۔

مجمع بالکل خاموش رہا گویا کہ اس پر جادو کر دیا گیا ہو۔ لوگوں کے چہروں سے وہ سختی اور دشمنی کے جذبات یکسر غائب ہو چکے تھے۔

عدالت میں چاروں جانب ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے گہری سانس لے کر بولنا شروع کیا۔ میں گناہ گار ہوں، میں نے گناہ کیا ہے، میں نے تب جرم کیا تھا جب میں نے اپنا جسم اس آدمی کو دیا تھا جو اسے اپنی روح سے زیادہ پیار کرتا تھا۔ اس کے جذباتی بوسوں اور قربت کے خوشگوار لمحات نے مجھے بھی اس کی جانب متوجہ کر دیا۔ اس کی پُر ہوس باہوں نے مجھے خود سے بہت زیادہ قریب کر لیا یہاں تک کہ اس نے میرے اندر کی معصوم لڑکی کو قتل کر دیا۔ میں ایک عورت بن چکی تھی اور اب واپس لوٹنے میں بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ جلد ہی وہ مجھے چھوڑ کر نئے چارہ کی تلاش میں نکل گیا۔ میں تنہا بالکل تنہا رہ گئی اور اپنے اندر کی ناپسندیدہ زندگی سے خوف زدہ رہنے لگی تھی۔ میں اپنے کو اس سے قبل ختم کر دینا چاہتی تھی کہ بہت دیر نہ ہو جائے لیکن ہر بار میرے اندر کی عورت نے میرے ان خیالات کی مذمت کی۔ اور اس سے قبل کہ میں کام انجام دینے کی قوت اپنے اندر پیدا کر پاتی وہ پیدا ہو گیا۔ اس کے معصوم چہرے نے مجھے بے انتہا متاثر کیا۔ وہ میرے جرموں کی سزا کیوں بھگتے؟ یہ سوال میں بار بار خود سے کرنے لگی اور تب ایک اندھیری رات کو میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے یہ کام کرنا ہے۔ میں نے اسے گود میں اٹھایا اور ایک طویل بوسہ دے کر چند لمحوں کے اندر اسے زندگی سے محروم کر دیا۔ اور اس طرح اسے زندگی بھر کے درد اور پیدائشی شرم و ندامت سے بچا لیا۔

مجھے شک ہے کہ آپ میری بات کا یقین نہ کریں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسی وقت میں نے اپنے اندر ایک ماں کے جذبات کو جاگتے ہوئے محسوس کیا۔ بعض لوگوں کو تعجب ہوگا کہ ایک عورت کس طرح یہ کر سکتی ہے لیکن مائی لارڈ! آپ یقین کریں کہ ایک عورت ہی یہ کر سکتی ہے کیونکہ مردوں میں صرف جسمانی قوت ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک پیار کا مطلب "مالک ہونا" اور ایک عورت کے نزدیک پیار کا مطلب "قربانی" ہے۔

اب میرے لئے موت کی کوئی حقیقت نہیں ہے میں نے بہت پہلے ہی زندگی سے ناطہ توڑ لیا ہے آج میرا محض وجود ہے۔ میں آپ کے فیصلہ کی منتظر ہوں......"

عدالت پر ایک تکلیف دہ خاموشی طاری ہو گئی۔ اور میں نے اس آہستگی سے گویا کہ میں خواب سے بیدار ہو رہا ہوں، اپنا قلم اٹھا کر مرتعش ہاتھوں سے فیصلہ لکھا: "عدالت مس پامول کو دس سال قید کی سزا دیتی ہے........"

اسی لمحہ میرے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں دیوار گھڑی کا واقعی شکر گزار ہوں جس نے دم گھونٹنے والی خاموشی توڑ دی اور عدالت برخاست ہو گئی۔

اس واقعہ کو پچیس برس گزر گئے اور اب میں ایک ریٹائرڈ جج ہوں لیکن آج بھی پامول کا وہ چہرہ میری نظروں کے سامنے گھومتا رہتا ہے میں یقین نہیں کر سکتا کہ واقعی میں نے اس سے انصاف کیا تھا کیونکہ کیا کوئی شخص انصاف کرتا ہے جب وہ ایسی صورت حال پر فیصلہ صادر کرے جس سے وہ خود کبھی نہیں گزرے گا۔

یوم جمہوریہ تعمیر کے عہد کرنے کا دن

ملک کو اعلیٰ اور طاقتور بنانے کا جو خواب راوی ندی کے ساحل پر ہمارے قومی رہبروں نے دیکھا تھا ان کو عملی جامہ پہنانے میں پورا ملک یقین اور لگن کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ دور دراز علاقوں کے قدیم باشندے، ہریجن، گاؤں میں ہر کہیں تعمیر نو کے لئے بے چین دکھائی دیتے ہیں یہی اس بات کا ثبوت ہے۔ ہماری قومی پالیسیاں جن کے لئے بنائی گئی تھیں ان تک پہنچانے میں ہماری کوششیں کامیاب ہو رہی ہیں۔ رعایا تک ایک عملی نشانہ

اتر پردیش آج کے مقدس موقع پر ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے دوبارہ عزم کرتا ہے۔

ایک اہم ستون ثابت ہونے جا رہا ہے۔

مجبور اور غریب لوگوں کو ہر آسانی کے ساتھ بغیر فیس کے انصاف حاصل ہو اور انھیں زمین پر بسانے کی سہولتیں ہوں۔ اور ان کے حقوق پر کوئی حملہ نہ کرے، اس کے لئے حکومت کوشاں ہے۔

ہریجن اور پچھڑے طبقے سے جن سہولتوں کا وعدہ کیا گیا ہے اور حفاظت کے ساتھ جتنی جگہوں اور کاموں کا حق انھیں حاصل ہے ان کو پورا کرنے کے لئے حکومت ہر ممکن کوشش کر رہی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے والے لوگوں کو کسی قیمت پر بھی بخشا نہیں جائیگا۔

جمہوری نظام کو صحیح معنوں میں عوام جان لیں اس کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔

دیگر علاقوں میں لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے جو کام کیا گیا ہے ان پر ایک ہلکی نظر ڈال لینا اچھا ہوگا۔

زراعت:- کھیتی کو قائم رکھنے کیلئے کاشتکاروں کے تمام مسائل حل کئے گئے۔ ربیع کے منصوبے میں دو لاکھ کوئنٹل سے بھی زیادہ تصدیق کئے ہوئے بیج تقسیم کئے گئے۔ سرکاری ذرائع سے ہی تقریباً ساڑھے چار لاکھ ہیکٹر میں آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ نتیجہ میں دو سو پینتالیس لاکھ ٹن اچھی غذائی پیداوار ہوئی۔

بجلی: بجلی کی زیادہ پیداوار میں دو سو چھتیس میگا واٹ کا اضافہ ہوا اور کل پیداوار تین سو باون میگا واٹ ہوئی۔ اب ۴۳ ہزار گاؤں میں بجلی آسانی سے دستیاب ہے اور ۱۷ ہزار ہریجن بستیاں بجلی سے فیضیاب ہیں۔

روزگار:- صنعت کاروں (بڑے حقوق سے شامل کمیٹی) کو موافق صنعتی ماحول بنانے میں کارگر ہوا۔ گذشتہ سال نئے روزگار لانے کے لئے ۵۰ فیصدی سے زائد لائنیں مانگی گئیں۔ ۱۲ بڑے اور متوسط روزگار ان علاقوں میں قائم کئے گئے جو صنعتوں سے خالی تھے۔ ۱۸۵۸۲ چھوٹے روزگار بھی لگائے گئے۔

محنت: کاشتکاری اور دوسرے ۲۲ منصوبوں میں مزدوروں کی کم از کم مزدوری کی شرحیں مقرر کی گئیں۔ جنگلات میں کام کرنے والے مزدوروں کے لئے پہلی بار کم از کم تنخواہ مقرر ہوئی۔ نظام میں ساجھے داری مقرر کی گئی۔

سماج کلیان۔ (عوام کی فلاح و بہبود) ۲۷۔۱۹ لاکھ ہریجنوں اور بے زمین افراد کے پاس قابل کاشت زمین نہیں تھی ان کو کھیتی کرنے کے لئے زمین تقسیم کی گئی۔ ۳۱۔۱۷ لاکھ افراد کو زمین پر قبضہ دلایا گیا۔ ۱۷۔۱۴ لاکھ خاندانوں کو زمین تقسیم کر کے قبضہ دلایا گیا۔ سرکاری ملازمتوں میں ہریجنوں کو ۲۲ فیصدی محفوظ حق حاصل ہوا جبکہ اصول کے مطابق ۱۸ فیصدی محفوظ کے حقدار تھے قانونی امداد دینے کے لئے ۴۸ ضلعوں میں کمیٹیاں قائم کی گئیں۔

پرامن نظام ڈکیتوں کے خلاف ایک سخت مہم چلائی گئی جس کے نتیجہ میں ۵۰۰۰ مڈبھیڑیں ہوئیں اور ۱۷۰۰ سے زائد ڈکیت مارے گئے اور قریب ۱۴۰۰۰ ڈکیت گرفتار کئے گئے۔ اس مہم میں ۱۰۵ پولیس کے آدمی بھی شہید ہوئے۔

تعلیم ۱۱۵ پرائمری اسکول ۳۰۶ جونیر ہائی اسکول ۱۴ آدرش اسکول، ۱۰ ہائی اسکول اور ۱۱ انٹر کالج کھولے گئے۔ پھر بھی منزل ابھی دور ہے۔ آیئے یوم جمہوریہ کی چھتیسویں سالگرہ کے موقع پر ہم ملک کو ترقی پہنچانے کا عہد کریں۔

شائع کردہ ——— محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ ——— اتر پردیش

وصول کرتا اور پوری رقم ماں کو کبھی نہ دیتا۔ اس کے پھن جب زیادہ چل نکلے تو گجی جان نے اسے ایک روز اکیلے میں دھمکایا: "تم یہ نہ سمجھو بنجر کہ میں تمہاری حرکتوں سے باخبر ہوں۔ تم بھی یونیورسٹی کے بدمعاش لڑکوں کی طرح چل نکلے ہو۔ مجھے تو تم کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ لیکن میں دیکھتی ہوں کہ بھائی صاحب کا اور اپنے باپ کا ڈر بھی تمہارے دل سے نکل گیا ہے!"

"اف اوہ۔ امی۔ یہ لیکچر کیوں دے رہی ہیں آپ؟" وہ انھیں تنگ کرنے کے لیے ناگوار انداز میں بولا۔

"میں لیکچر دے رہی ہوں۔ بدتمیز کہیں کے۔" انھیں غصہ آ گیا: "اچھی بات ہے اب تم وہ لیکچر سننا جو بڑے ابا تمھیں دیں گے۔ اب بھی سویرا ہے آنکھیں کھولو۔ سمجھے۔ میں تمھیں کسی بری راہ پر چلتا نہیں دیکھ سکتی۔"

"بری راہ۔!" انھوں نے آنکھیں نکال کر جواب دیا اور توبہ توبہ کرنے لگا "میں اپنی پیاری امی کا ایک بیٹا بھلا بری راہ پر کیسے چل سکتا ہوں۔ امی۔ یقین کیجئے۔ میں اب پانچوں وقت کی نمازیں پڑھنے لگا ہوں۔!"

"میں نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ تم نے اللہ کی جناب میں سر جھکایا ہو۔"

"ظہر کی نماز یونیورسٹی کی مسجد میں پڑھتا ہوں۔ باقی نمازیں محلہ کی مسجد میں۔ اکم سے کم اتنا تو مان لیجئے کہ میں نمازوں کے سلسلے میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔"

"تو بیٹے نماز نے بھی تمہیں برائیوں سے نہیں روکا۔!"

"کون سی برائیاں امی۔ کیا دیکھا ہے آپ نے؟ - خواہ مخواہ آپ خفا ہو کر اندیشے کرکے اپنا دل دکھا رہی ہیں اماں"

[illegible] (باقی آئندہ)

آپ اللہ کے قرب میں آباد ہیں۔ پروردگار سے التجا کیجئے۔ میری بچی ہمیشہ پھولوں ہی میں رہے!"

اور پھر وہ ضبط نہ کر سکیں!

بعد مغرب وقاص احمد بڑی سیدھی سادی بارات لائے۔ ان کے ہمراہ بس ان ہی کے خاندان کے لوگ تھے۔ بیکار کا جم غفیر اور انواع و اقسام کے باجوں کا دھوم دھڑکا نہ تھا۔ بڑی آپا کی بہوئیں بے حد تزک و احتشام سے اتریں اور ممی کا گھر جگمگانے لگا!

عقد کے وقت بے چارے بڑے ابا دلہن کے کمرے میں گئے ان کے پہاڑ ایسے ڈیل ڈول میں دھڑکتے ہوئے کمزور سے دل کی عجیب حالت تھی۔ گویا اب رکا کہ تب رکا۔ انھوں نے تب سوچا۔ مالک تو کسی کو بیٹی کی نعمت نہ دے!

"نوشینہ بنت جنید سلطان۔ تم نے فلاں مہر پر وقاص احمد سلمہ ابن جناب محمد احمد صاحب مرحوم سے نکاح قبول کیا۔!"

اور بس۔ ایک کہانی نوشینہ کی زندگی کی۔ ایک افسانہ اس کی معصوم دلچسپیوں کا ختم ہو گیا۔ اسے ایک بے فکر لاپرواہ لڑکی سے ذمہ دار خاتون میں تبدیل کر دیا گیا۔ ادھر لڑکے والوں میں خوشی و مسرت کی رنگین آتش بازیاں چھوٹنے لگی۔ قہقہے لگنے لگے۔ ادھر لڑکی والوں میں آنسوؤں کی برسات شروع ہو گئی۔ ماں باپ کے آنگن میں چہچہانے والی چڑیا۔ ان کی اندھی آنکھوں کی روشنی، ان کے قلب و روح کی طمانیت۔ آج ان سے جدا ہو گئی۔ اب اسے دوسرے دل میں رہنا، ان کی چشم و ابرو کے اشارے پر چلنا۔ نجانے کیا کچھ سہنا ہے اور ناخوشی سے جھیلنا ہے!

نوشینہ کا [illegible]

وہ وقت پر الہ آباد کے لیے روانہ کیا جا سکے! ۔
اب صرف پھولوں سے ڈھکی ایک کار پھاٹک سے اندر لائی گئی تھی جو زینوں سے لگی کھڑی تھی! ۔
اور آج کوئی جانا پہچانا ہاتھ نہیں تھا جو نوشینہ کو تھام کر آگے بڑھاتا آج اس کا ہاتھ ایک اجنبی ہاتھ میں تھا جس نے اس کے سرد و مرتعش ننھے سے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر رکھی تھی! ۔
وداعی وقت، گھر میں حشر سا اٹھ گیا! ۔
میری جولی ... چچا جان ۔ بڑے ابا ...
چچی جان ۔ میرا بھیا ۔ امی ... ! آج تم سب چھوٹ گئے! ۔
سنجر الگ تھلگ کھڑا آنسو پونچھ رہا تھا! ۔ وقاص بے حد متاثر نظر آ رہے تھے ۔ ممی کی بے قراری دیکھ کر انھیں کہنا پڑا ۔
" خالہ جان ۔ اس طرح تو آپ خدانخواستہ اپنی جان پر بنا لیں گی میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں ۔ ہفتہ بھر کے اندر اندر نوشینہ کو پھر آپ کے پاس پہونچا دوں گا ۔ ہاں بیٹی ... بڑی آپا نے ممی کا سر سینے سے لگا لیا ۔ دل کو سنبھالو ۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے ۔ بی بی ۔ لڑکی بٹھا لینے کی چیز نہیں ۔ اسے اپنے سے جدا کرتے دل پھٹتا ہے مگر ایک وقت اسے جدا تو کرنا ہی پڑتا ہے تم اتنی کیوں پریشان ہو ۔ وہ اپنے دولہا کے ساتھ اللہ رکھے خوش رہے گی ۔ نیا مقام ہو گا نئی جگہ ہو گی ۔ سیریں کرتی پھرے گی ۔ یہاں تم خواہ مخواہ ہلکان ہو رہی ہو ۔ اسے خوشی خوشی وداع کر دو ۔"
جاؤ میری بیٹی ۔ اپنے نئے گھر سدھارو ۔ خدا تمھارا حافظ و ناصر ہے!
بڑے ابا رو رو کر کہہ رہے تھے! ۔

ہائے میں خالہ بنوں گی ۔ امرینہ کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ناچنے لگے ۔
وقاص احمد کو جواب لکھ دیا گیا کہ جب چاہو نوشینہ کو لے آؤ ۔ !

وقت کا طائر پرواز کرتا رہا تھا ۔ غیر محسوس طریق پر ان سب کا رہن سہن ایک خاص دائرہ میں محصور ہو گیا تھا ۔ لگے بندھے انداز اور گھر ایک دھڑے پر چل رہا تھا ۔ جیسے واقعی گھر کی روح نکل چکی تھی ۔
رحمان صاحب ۔ اپنے دوروں پر چلے جاتے ۔ سنجر یونیورسٹی کی راہ لیتا آج کل بڑے ابا پر تصنیف و تالیف کا بار زیادہ پڑ رہا تھا ۔ انھوں نے اپنی پنشن کا قلیل حصہ فروخت کر دیا تھا اور اب اخراجات کو پہلے کی طرح ایڈجسٹ کرنے کے لیے انھیں کام زیادہ کرنا پڑتا تھا! ۔
یوں تو رحمن صاحب بھی اپنی ساری کمائی بڑی شرافت اور محبت سے اپنی بھابی کو دے دیتے تھے ۔ وہ چچی جان کے حوالے کر دیتیں ۔ ! سنجر کے مصارف بہت زیادہ تھے ۔ وہ نہایت قیمتی ملبوسات کا شوقین بھی نہ تھا ۔ نہ اسے سیر سپاٹوں کی عادت تھی ۔ اس کے دوست بھی ایسے نہ تھے جن پر وہ روپیہ برباد کرتا ۔ پھر بھی وہ بگڑ کر اور روٹھ کر اپنی ماں سے ہر ماہ معقول رقم وصول کر لیا کرتا تھا ۔ بے چاری شوہر کی خفگی کے ڈر سے ان سے کہتی نہ تھیں ۔ مگر دل ہی دل میں ڈرتی بھی تھیں اور متحیر بھی تھیں کہ آخر روپیوں کی ضرورت سنجر کو ایسی بھی کیا پیش آتی تھی! ۔ کبھی کبھار رحمٰن صاحب معقول رقم بھیجتے ۔ وہ سنجر کا پوسٹ آفس جا کے

نوشینہ کو کوئی ان کے پاس لایا۔ وہ سرخ و مرصع لباس میں چھپی تھی
پھولوں نے اسے ڈھانک لیا تھا!۔

دفعتہً نوشینہ کے صبر و ضبط کی باگیں اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئیں
"میرے ابّا" ایک تڑپتی ہوئی گریہ آلود چیخ اس کے لبوں سے نکلی
اور دوسرے لمحے وہ بڑے ابّا کے سینے سے چمٹ گئی۔! ان کے بازوؤں
میں اس کا کاہیدہ و نا دیدہ وجود گم ہو گیا!۔

میری بچی۔ نہ رو۔ میری بیٹی۔ چپ ہو جاؤ۔ بڑے ابّا کہہ رہے
تھے۔ انھوں نے اس کا سہرا اٹھایا اور جھک کر اس کی چمکتی ہوئی
پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور پھر وقاص جو دور کھڑے یہ رقت انگیز درد ناک
آخری ملاقات دیکھ رہے تھے انھیں اپنے پاس بلا کر ان کے ہاتھ میں
نوشینہ کا ہاتھ دے دیا! جاؤ میرے بچو یہ ہمیشہ شاد آباد رہو۔!"

بارات اپنے مہمان کو لے کر روانہ ہو گئی۔

اب جلتی بجھتی روشنیاں سوگوار انداز میں غمناک پلکیں جھپکا رہی تھیں
میلے کچیلے ہوئے فرش پر یہاں وہاں پھولوں کی پژمردہ کچلی ہوئی
پتیاں پڑی تھیں۔ فضا ابھی تک سہاگ کے عطر مہندی کی خوشبو
سے معمور تھی!۔

وہ سب اس طرح خاموش کھڑے تھے۔ جیسے ان کے سامنے ان کا خزانہ
چوری ہو گیا ہو اور وہ کچھ نہ کر سکے ہوں!۔

بڑے ابّا اپنی جگہ ایستادہ تھے۔ ان کی سفید داڑھی پر آنسوؤں
کی لکیریں دور ہی سے نظر آ رہی تھیں!۔

آج سب کو پتہ چلا چٹانوں کے سینے میں بھی پانی کے چشمے بہتے ہیں!۔

چونکہ کالج اور یونیورسٹی باقاعدہ چل رہے تھے لہٰذا اسجد اور امرینہ
کو بھی لڑنے جھگڑنے کی فرصت نہ ملتی۔ البتہ امرینہ کبھی کبھی اسجد سے سائنس کا
کوئی مشکل فارمولا پوچھ لیتی تھی۔ یا اس سے کوئی ڈائی گرام بنوا لیتی۔ چونکہ
ایک سنجیدہ مرد کی طرح اسجد خود کو لیے دیے رہنے لگا تھا۔ لہٰذا امرینہ نے
بھی سوچا کہ خواہ مخواہ اس سے جھگڑا کرنا مناسب نہیں ہے۔ آخر وہ بھی
کوئی بچی تو نہیں رہی تھی۔ چھ ماہ بعد اس کی اٹھارویں سالگرہ ہونے
والی تھی۔

نوشینہ اور وقاص احمد کے خط باقاعدہ آتے تھے۔ ایک دفعہ وقاص
احمد کا خط ممی کے نام آیا تھا اس میں لکھا تھا کہ نوشینہ کو عرصہ پندرہ دن
سے سخت متلی کی شکایت ہے۔ شاید تبدیلی آب و ہوا کا اثر ہے کہ اٹھتے
بیٹھتے ان کا سر بھی چکرا جاتا ہے۔ بڑی مشکل سے کچھ کھاتی پیتی ہیں۔ لیکن
وہ بھی نکل جاتا ہے۔ یہاں گھبرا رہی ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ انھیں آپ
کے پاس لے آؤں۔

اس خط کو پڑھ کر ممی پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ چچی
جان نے بے تحاشہ خوش ہو کر کہا۔

ہائے۔ بے چارہ۔ کیا جانے کہ یہ سارے اللہ رکھے حمل کے آثار ہیں
اللہ اصل خیر سے نوشینہ کی گود ہری کرے۔

گھر بھر میں ایک خوشبو کی طرح یہ خبر پھیل گئی۔ چچی جان نے اپنے میاں
کو خط لکھا تو یہ نئی بات بھی لکھ دی۔

بڑے ابّا خط پڑھ کر مسکرائے۔

پھر جان رہ گیا۔ بچے یہاں پیدا ہوگا۔ واہ بیٹی۔

بڑے لوگ وہیں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ امرینہ برآمدے میں بھاگ آئی۔ اور اندھیرے میں ڈوبے اس باغیچہ کو دیکھنے لگی۔ جہاں بہت سے پودے اس کی بہن نے لگائے تھے۔ ان پر محبت کے پھول کھلے ہوئے تھے۔!

امرینہ نے سر دیوار سے ٹیک دیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی!۔

سنجر اوروں کی آنکھ بچا کر اس کے پیچھے چلا آیا۔

آج اس کا دل بھی بوجھل تھا! چپکے سے اس نے امرینہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مگر وہ کچھ بول نہ سکا۔! امرینہ بدستور سسکیاں لیتی رہی

اس طرح ہم سب کا کیا حال ہوگا! بالآخر سنجر ہی بولا" معلوم ہوتا ہے کہ آج گھر کی روح نکل گئی ہے۔ یوں تو ہم سب بیکار ہو جائیں گے۔ امرینہ۔ کیا دنیا میں لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ آخر ہم اپنے دلوں کو کیوں نہیں سمجھاتے!۔ یہ تو تمہارا اور میرا نام ہے نا۔ امرینہ۔ سوچو پلیز۔ سوچو۔! کیا ہم خود کو غموں کے حوالے کر دیں گے!؟"

باجی کی یاد آرہی ہے؟" امرینہ بولی مگر وہ سنبھل گئی اور آنسو پونچھ لیے۔

وہ تو ہمیں عرصہ تک آئے گی! لیکن۔!"

لیکن اب کیا ہوگا؟ آپ کو معلوم ہے؟۔

کیا ہوگا؟" سنجر نے امرینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کرسی پر بٹھا دیا اور خود اس کے سامنے [illegible] پر ٹک گیا۔

"آپ بھی چلی جائیں گی!؟"

بے ضرر ہے۔ اور داڑھی بھی کوئی پھانسی کا پھندہ نہیں تو اس کا دل کچھ ٹھہر گیا۔ اب وہ نہ صرف ان کی باتیں دل تھام کے سنتا تھا بلکہ اپنی طرف سے سوال بھی جڑ دیتا تھا۔ جو اکثر ایسے بے تکے ہوا کرتے کہ بڑے ابا اپنی بے ساختہ ہنسی کو کھوکھلی کھنکھار میں چھپا لیتے تھے!۔

اور امرینہ کو بڑے ابا بے حد اچھے لگنے لگے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دوڑ کے ان سے چمٹ جائے۔ بڑے ابا دیوتا تھے فرشتہ تھے۔ محبت و شفقت کا خزانہ تھے۔ بہت اچھے تھے!۔ مگر اسے ان سے خواہ مخواہ ڈر لگتا تھا۔ سامنے نہیں آتی تھی۔ مگر بڑے ابا کے دل سے اس کی محبت تھوڑی نکلی تھی۔

انھوں نے سنجر کے ذریعہ نجانے کیا کچھ امرینہ کو بھجوا دیا تھا۔ خوبصورت ٹاپس بھجوائے تھے۔ ہلکا پھلکا پنجابی سوٹ کا بے حد خوبصورت کپڑا بھیجا تھا۔ ایک دفعہ لفافہ میں رکھ کر اسے سو روپے دیے تھے۔ ویسا ہی لفافہ تھا جس میں اپنی پنشن رکھ کر ممی کو بھجوائے تھے۔ سفید بڑا دبیز کاغذ کا لفافہ۔ لہذا امرینہ نے غائبانہ شکریہ ادا کر کے وہ سو روپے بڑی احتیاط سے خرچ کر دیے تھے۔ اتفاقاً ممی نے پوچھ لیا تھا۔ پیسے کہاں سے ملے امرینہ نے کھلم کھلا کہہ دیا کہ بڑے ابا نے دیے ہیں۔ ممی کیا بولتیں۔ سارا لیا دیا بڑے ابا ہی کا تو تھا!۔

زندگی بے حد پرسکون ہو گئی تھی۔ رحمن صاحب کو اپنے گھر میں آباد کر کے بڑے ابا نے ممی پر احسان عظیم کیا تھا۔ اب رحمن صاحب ہی سب کچھ رہے۔ اور دونوں خواتین زمانہ بھر سے بے غرض [illegible]

[illegible]

لہذا پھر سب کے سب اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔ نوشینہ کی جدائی
انھیں گراں تو گذرتی ہی تھی لیکن یہ گرانی طاقت انگیز تھی۔ زندگی پھر پرانے
محور پر گھومنے لگی۔

ان دنوں بڑے ابا نے بھی اپنے کڑے اصولوں میں ترمیم کر لی تھی۔ یعنے
اب اندر دالان میں آکے بیٹھنے لگے تھے۔ کبھی رحمان صاحب سے باتیں کرتے
رہتے۔ وہ نہ ہوتے تو ملی اور ملکی جہان بھر کے ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی۔
دونوں خواتین بھی ان کی خدمت میں کچھ بے تکلف ہو گئی تھیں لیکن ان
کی بے تکلفی صرف اسی قدر ہوا کرتی!۔

بھائی صاحب! جو کچھ آپ کہئے۔ رات کے کھانے میں پکا دوں۔
بھائی صاحب۔ ذرا یہ تو کافی بنا لاؤں۔
بھائی صاحب۔ آپ کے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ خدا کے لیے رات دیر گئے
تک لکھنے پڑھنے کا نام نہ لیا کیجئے۔ آپ کی سلامتی ہم سب کی زندگیوں
سے زیادہ قیمتی ہے۔

اور بڑے ابا نہایت مشفقانہ انداز میں بس مسکرا کر اتنی سی بات
کرتے تھے۔

"اچھا بیٹی۔ اب ہم خیال رکھیں گے۔"

ان سے کچھ کچھ سنجر کی بھی "دوستی" ہو گئی تھی۔ پہلے تو سنجر کی روح قفس
عنصری سے پرواز کرنے کے لیے پر تولتی رہتی تھی۔ نگاہیں اٹھا کر ان کی
طرف دیکھتا نہیں تھا۔ دعائیں مانگتا تھا کہ وہ اسے اپنی حاضری سے
جلد چھٹی دیں! ان کی آواز، ان کی داڑھی۔ ان دو چیزوں سے
گھبراتا تھا۔ لیکن جب اسے پتہ چلا کہ ان کی آواز محض گونج ہے۔ اور

میں کہاں چلا جاؤں گا!" بے حد تعجب سے سنجر نے پوچھا اور گھٹنوں
پر کہنیاں ٹیک کر آگے جھک آیا۔

"بڑے ابا کہہ رہے تھے کہ آپ کو اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں باہر بھجوا
دیں گے۔"

"ہاں تو اس میں کیا ہوا۔ ایک دو سال باہر رہ کے میں پھر اندر چلا
آؤں گا۔"

"مطلب یہ کہ۔ ایک ایک کرکے گھر کے آدمی جاتے رہیں گے تو سناٹا
نہ ہو جائے گا۔"

"واہ بھئی۔ ارے یہ بھی تو سوچو کہ اب باجی کے بچے ہوں گے۔ اور۔
کیا کہتے ہیں۔ ہماری تمہاری شادی ہوگی۔ اور۔!" وہ بے خودی
میں بولے جا رہا تھا۔ امرینہ نے اس کی پنڈلی میں زور سے چٹکی لی۔
"یہ کیا۔ یہ کیا" وہ تڑپ کر پیچھے ہٹا۔
"مجھے یہ بکواس ہی تو پسند نہیں ہے۔" امرینہ جھنجھلا گئی۔
"بکواس؟ باجی کے بچے بکواس ہیں؟ کیوں۔!"
"بس اپنی ارمانوں بھری شادی کا تذکرہ کیجئے۔ مجھے اپنے ساتھ
کیوں سان لیتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔ وہ بات" سنجر ہونٹے سے ہنسا۔ "مگر تم میرا مطلب ہی
نہیں سمجھیں۔ اور نہ مجھے اپنی بات پوری کرنے دی۔"
"سمجھ گئی میں پوری بات" امرینہ جھنجھلا گئی۔ "آپ کی شادی ہو
گی اور ٹوکرہ بھر بچے ہوں گے۔ گھر بھر جائے گا۔ یہی کہہ رہے تھے!!"
"بالکل بالکل!" وہ خوش ہو کر بولا۔ "ذرا تو سوچو کہ [illegible]

میرے بچے گھر میں اچکتے پھاندتے پھرا کریں گے تو ہماری خوشیوں کا کیا عالم ہوگا۔ ہم۔ مطلب یہ کہ صرف میری خوشیوں کا کیا عالم ہوگا؟

ہوں!" اس نے صرف پھنکارنے پر اکتفا کی۔ جل گئی تھی۔

امرینہ؟۔

کیا ہے!۔

جب کوئی بزرگ مخاطب کرے تو جواب میں 'جی' کہنا چاہیئے۔!"

سنجر نے نصیحت کی۔

کہا نہ ہو کبھی۔

اچھا نہ کہو۔ مگر میں ایک بات پوچھوں؟ ایمان ایمان سے جواب دینا۔

جیسی بات ہوگی۔ ویسا ہی جواب دوں گی!۔

کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جاؤں؟"

سنجر نے پوچھا۔ اس کے لبوں پر ایسی عجیب سی مسکراہٹ تھی کہ امرینہ کے گال دہک اٹھے۔ وہ پھر پچھلی پوزیشن میں بیٹھا بہت آگے جھک آیا تھا

اس کی گرم گرم سانسیں امرینہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی!۔

اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ دور سے آتی ہوئی روشنیوں کے انعکاس میں سنجر کا چہرہ زیادہ سفید لگ رہا تھا!۔ اس کے لباس سے وہ مہک اٹھ رہی تھی جو نوشینہ سے ملنے کے بعد اس کے لباس میں بس گئی تھی۔ عطر، مہندی اور پھولوں کی مہک۔ اور پہلی دفعہ اپنے بے خبر محسوسات میں امرینہ نے ایک اجنبی ہیجان سے اشتعال سے دوسری دفعہ اس نے سنجر کے چہرے پر نظریں نہیں ڈالیں۔ امرینہ نے

ہاتھ سے دیکھئے میں بھلا کون ہوتا ہوں۔ جس کے ہاتھ سے آپ تحفے وغیرہ دلواتے ہیں" وہ برا مان گیا امرینہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

" نازک مزاج چھوکریوں کی طرح بات بات پر روٹھنا چھوڑ دیجئے۔ سمجھے کہ نہیں۔ اور خبردار خبردار بڑے ابا سے لگائی بجھائی نہ کیجئے گا میں ان کے سامنے نہیں جا سکتی"

بات کو کون سا لباس پہن رہی ہو!۔

اب آپ نکلیے کمرے سے۔!"

اچھا بھائی" کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ ٹیک کر وہ اٹھا۔ اور کانکھتا ہوا کمرے سے نکل کر چلا گیا!۔

پھر امرینہ نے وہ طلائی زنجیر گلے میں ڈالی اور آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر مسکرانے لگی۔!

سر شام سے پرمسرت چہل پہل شروع ہوگئی۔ آج بھی روشنیاں دن کی خیرگی کو چیلنج کر رہی تھیں۔ مہمان آ رہے تھے۔ لان پر گارڈن چیئرز پڑی تھیں۔ بچے ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ بنی ٹھنی خواتین براق ایسے فرش پر بیٹھی بڑی بردباری سے گفتگو میں محو تھیں۔ باہر مرد تھے!۔

پھر دتا مس احمد آئے۔ ان کی سج دھج بڑی باوقار تھی۔ سیاہ شیروانی ٹوپی سفید پاجامہ اور سلیم شاہی جوتے۔ وہ بے حد پرکشش اور جاذب تھے۔ ان کی خوش مزاجی اور انکساری سب کو بہت اچھی لگی تھی!۔

ہفتہ بھر تک دولہا دلہن اپنے عزیز و اقارب کے یہاں مدعو رہے اور پھر ایک روز دتا مس احمد مع نوشینہ کے اپنی سسرال میں چلے گئے۔!

چونکہ ہفتہ بھر میں گھر والے گوشے گوشے کی [illegible] ہو گئے تھے

کیا ہے۔ کیا ہے اس میں؟": مارے اشتیاق کے دانت نکال کر سنجر
نے پوچھا۔
"اللہ": امرینہ یک بیک خوش ہو گئی": دیکھئے کیسی پیاری زنجیر
خریدی ہے انھوں نے میرے لیے۔!"
"واہ واہ۔ سو ڈلیسنٹ" سنجر بولا اور زنجیر اپنی انگلی پر لٹکالی۔ کچھ
دیر تعریفی نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا": اچھا پہن کے تو دیکھو۔
کیسی اچھی لگتی ہے۔ لاؤ میں پہنادوں۔ تم ادھر منہ پھیر کر کھڑی ہو جاؤ۔"
"ابھی نہیں": امرینہ بے حد خوش تھی": رات کو پہنوں گی۔ ڈنر پر۔!"
"اچھا اچھا۔ بڑے موقعہ سے تمھیں انھوں نے یہ تحفہ دیا": سنجر بھی خوش
بولا۔ کہہ رہے تھے کہ اس کے سوٹ کا کپڑا ابھی لایا ہوں۔ مگر نجانے کہاں رکھ
کے بھول گیا ہوں مل نہیں رہا۔ تلاش کر کے کل پرسوں دوں گا!"
"بڑے ابا ہمارے پیچھے برباد ہو رہے ہیں بے چارے۔!"
"ایسا کہہ مت دینا ان کے سامنے": سنجر نے کہا": دل دکھ جائے گا۔ ہاں۔
وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ اب نوشینہ کے سسرال جانے کے بعد امرینہ کے
سوا ہے ہی کون جس پر میں اپنے پیار کی دولت لنڈھاؤں۔ یہ تو کچھ بھی
نہیں۔ جی چاہتا ہے کہ اسے سینے سے لپٹا کر خوب پیار کروں!" سنجر
آبدیدہ ہو گیا۔ اور کچھ یاد کر کے امرینہ کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں!۔
"مجھے ایک بش شرٹ کا پیس دیا بڑے ابا نے": سنجر سخت متاثر ہو
کر بولا۔
"مگر۔ سنجر آپ کے ہاتھ سے کیوں بھجوائی مجھے خود کیوں نہ دی۔!"
"میں ان سے کہہ دوں گا کہ پھر آپ کو دیتا ہوں۔ امرینہ کو [illegible] اپنے

سی سوچنے لگی۔ پل بھر کے لیے جو انوکھے جذبات اس کے دل و دماغ پر
سایہ ڈالتے ہوئے گزر گئے تھے۔ کیسے تھے؟۔ جو سمجھ بوجھ کی گرفت میں نہیں
آرہے تھے!۔
"میں اب جاؤں گی": اس نے کرسی پیچھے سرکائی اور اٹھ کھڑی ہوئی
اس کے ساتھ ہی سنجر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اچانک اس کے سامنے
آ گیا۔
"کیا ہے؟": کچھ بدحواس ہو کر امرینہ پیچھے ہٹ گئی۔
"کچھ نہیں ہے": سنجر جھنجھلا کر بولا": میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس لباس میں
تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔ مطلب یہ کہ غنیمت۔ بس": وہ ہکلایا۔ امرینہ
تو خوشی ہونے کی بجائے آپے ہی سے باہر ہو گئی
"آئینہ دیکھ دیکھ کے آپ اپنی شکل کی بلائیں لیا کیجئے۔ کوئی اچھا لگے کہ
برا لگے۔ اس سے آپ کو کیا مطلب۔!"
سنجر ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ اور وہ پاؤں پٹختی ہوئی چل دی۔
اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر اچک کر منڈیر پر جا بیٹھا!۔
دوسرے روز نوشینہ باجی سسرال سے میکے آئیں! پھول کی طرح کھلی
ہوئی۔ شرمائی شرمائی سی۔ نظریں جھکی جھکی سی۔ سرخ کپڑوں اور خوشنما
زیوروں میں گندھی ہوئی۔ وہ پہلی والی لگتی ہی نہ تھیں!۔ جیسے ایک
ہی رات میں ان سب کے لیے اجنبی اور اجنبیوں کے لیے اپنی بن گئی ہوں!
اکیلے میں چچی جان نے پوچھا": سب تم سے اچھی طرح تو ملے۔ بیٹی کسی
نے کوئی بات ڈھکی چھپی ایسی تو نہیں کی۔ جس سے اندازہ ہو کہ [illegible]
[illegible] جہیز پر انھیں کچھ اعتراض ہے!"

ممی خاموش سی ایک گوشہ میں بیٹھی تھیں۔ ! وہ کچھ نہ بولیں۔ نوشینہ
نے سر جھکا لیا اور بے حد شرمگین لہجے میں بولیں۔

"کچھ بھی۔ نہیں کہا۔ جی جان! کسی نے مجھ سے بات ہی کہاں کی"

"وہاں تمہارا دل لگا بیٹی"

نوشینہ نے سر اور بھی جھکا لیا۔!

آج سنجر اور امرینہ ان کے قرب سے جھجک رہے تھے۔ ان کے
پاس ان کی سہیلیاں تھیں۔

غرض کمرہ بند تھا۔!

امرینہ کترا کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

گھر تھا چوتھی کی دعوت کا ہلڑ مچا ہوا تھا۔!

سنجر نے امرینہ کے دروازے پر دستک دی۔ وہ باہر نکلی! بیحد
بیزار نظر آ رہی تھی

"کیا ہوا؟" سنجر نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں" اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں "آپ نے کیوں دستک
دی تھی۔

تم نے باجی کا وہ افسانہ پڑھا تھا۔ کیا عنوان تھا اس کا۔ ہاں
"دستک سی دی اور دل پر۔" قلم توڑ دیا باجی نے!۔

یہی کہنا چاہتے تھے۔" امرینہ کے لہجے میں بلا کا طنز تھا

نہیں تو۔ وہ۔ تم نے دستک کا لفظ کہا تو مجھے عنوان یاد آ گیا"

سنجر نے جواب دیا: بات تو دوسری ہے اور وہ بھی میری نہیں ہے۔

اندر آ جاؤں؟

اگر کوئی ضروری بات نہیں ہے تو وہ نہیں کھڑے کھڑے بھی کی جا سکتی
ہے!" امرینہ بولی۔

"بڑے ابا کی بات ہے!"

"اندر آ جائیے!"

سنجر کرسی پر بیٹھ گیا

امرینہ اسے بیزار نظروں سے دیکھتی رہی۔ اور منتظر رہی کہ وہ کچھ
کہے گا لیکن وہ منہ میں مونگ بھرے بیٹھا ہی رہا تو امرینہ جھنجھلا گئی۔

"کیا بات ہے بڑے ابا کی۔!"

ارے ہاں۔ وہ۔!" وہ چونکا۔ "تمہارے کمرے میں آ کر میں سب
کچھ بھول جاتا ہوں۔

کہیے جلدی سے۔ اور جائیے۔

سنجر نے ایک طرف ترچھے ہو کر پتلون کی جیب سے ایک سرخ رنگ کا
خوبصورت کیس نکالا اور امرینہ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔

"بڑے ابا نے بھیجا ہے تمہیں!"

کیا ہے اس میں!

میں کیا جانوں۔ کہہ رہے تھے کہ خبردار جو کانوں لڑکی کو دے
آؤ۔ کھول کر دیکھا تو مارے پٹھیوں کے حواس درست کر دوں گا!"

"جھوٹ؟!"

"نہیں تو پٹیا ہوں۔ دوڑ کر پوچھ آؤ!"

[illegible] امرینہ نے کیس کھولا اس میں ایک نہایت نفیس اور نازک
[illegible] ! امرینہ [illegible]



THE HAREEM

Mar. 82

Rs. 1|40

ایڈیٹر

گذشتہ ۵۲ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنیوالا ہندوستان میں اردو کا

سب سے پرانا رسالہ

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

ایڈیٹر و نگراں

نسیم انہونوی

معاونین

شوکت جہاں بیگم ۔ جانی بیگم ردولوی

فی شمارہ کی قیمت ۔ ۱.۴۰ ۔ روپیہ
چندہ سالانہ منی آرڈر سے ۲۱/- ۔ روپیہ
چندہ سالانہ اعزازی ۲۶/- ۔ روپیہ
چندہ مخصوص مخصوص ۲۲/- ۔ روپیہ
وی پی سے منگوانے پر چار روپئے پچاس پیسے زائد روپیہ
غیر ممالک سے ۔ ۔ ۶۰/- ۔ روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی میل۔ ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

ناشر ۔ ۔ ۔ ۔ فہیم انہونوی

جلد ۵۲ فہرست مضامین ماہ مارچ سنہ ۱۹۸۲ نمبر ۳

آفس و ترسیل زر کا پتہ:۔
نسیم بک ڈپو ۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ فون آفس:۔ ۴۴۵۵۹ رہائش:۔ ۴۵۳۳۳
فہیم انہونوی نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

منتری کی چلے نہ سنتری کی
چلے صرف بخشی جنتری کی

بخشی جنتری

۱۹۸۲ء کے شاہانہ استقبال کے لئے پیش خدمت ہے

- سال بھر کی شمسی، قمری، ہندی، بنگلہ تاریخیں، اعراس
- دل کو تڑپا دینے والی حمد و نعت، فکر انگیز مضامین
- خواب نامہ، فالنامہ، نقشہ لابھ خرچ اعضا پھڑکنے کا ثمرہ
- ادارہ "بخشی" کی صحت بخش ادویات سے تعارف)

اور یہ سب آپ ۵۰ پیسے خرچ کر کے مقامی کتب فروشوں سے یا براہ راست کلکتہ سے ڈاک کے ذریعے حاصل کریں۔

پتہ:۔ بخشی جنتری ۳۲ مولانا شوکت علی اسٹریٹ (کولوٹولہ)
پوسٹ بکس ۱۲۳۳۰ کلکتہ میں

عابدہ نرجس

حضرت امام زین العابدین

مشہور سکالر عمر ابو النصر نے لکھا ہے کہ امام حسین علیہ السلام اپنے بچوں کے نام اظہار عقیدت کے طور پر اپنے والدین کے نام پر رکھتے تھے۔ ان کے سب لڑکوں کے نام علیؑ اور لڑکیوں کے نام فاطمہ تھے۔ البتہ بڑے اور چھوٹے ہونے کی رعایت انھیں اکبر اور اصغر اور صغریٰ وکبریٰ کے اضافے سے پکارا جاتا تھا۔

سانحہ کربلا کے بعد امام حسینؓ کے خانوادہ جلیلہ کا ایک ہی چشم و چراغ باقی بچا تھا۔ جن کا اسم مبارک بھی حسینؓ عالی مقام نے علیؓ ہی رکھا تھا۔ وہ درحقیقت اس نام کی [illegible] تھے۔ آپ کو دیکھ کر اس دور کے صحابہؓ اور علماء آپ کے والد بزرگوار حضرت علیؓ ابن ابی طالب کو یاد کرتے تھے۔ محدثین کا بیان ہے کہ آپ صورت وسیرت میں آنجناب سے بہت مشابہ تھے۔ آپ تاریخ اسلام میں "زین العابدین" کے نام نامی سے مشہور و معروف ہیں۔

آپ کی ذات میں عرب وعجم کی شرافتوں کا میل ہوا تھا۔ آپ کے والد امام حسینؓ تھے اور آپ کی والدہ ایران کے شہنشاہ یزدجرد کی بیٹی تھیں۔ جن کا نام شہربانو یا شاہ زنان تھا۔ آپ اپنی نسبی وذاتی شرافت کی بدولت عرب وعجم میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ ۱۲ جمادی الثانی ۳۸ھ کو مدینہ میں پیدا ہوئے تھے۔

آپ زین العابدین، یعنی عبادت کرنے والوں کی زینت اور 'سید الساجدین' سجدہ کرنے والوں کے سردار کے لقب سے مشہور ہوئے امام طلحہ شافعیؒ نے مطالب السئول میں لکھا ہے کہ ایک بار محراب عبادت میں شیطان سانپ کی شکل میں ظاہر ہوا تاکہ امام علیؓ ابن حسینؓ کے استغراق میں خلل ڈالے۔ اس نے آپ کی انگشت پا کو دانتوں میں دبایا مگر آپ کی مشغولیت میں شمہ برابر فرق نہ آیا۔ آخر وہ پشیمان ہو کر دور جا کھڑا ہوا۔ اسی وقت تین بار فضا میں ایک آواز بلند ہوئی۔ جو کہہ رہی تھی: "انت زین العابدین" "انت سید الساجدین" آپ ہی عابدوں کی زینت ہیں۔ آپ ہی سجدہ گزاروں کے سردار ہیں۔

علامہ طبری لکھتے ہیں کہ آپ عبادت خداوندی میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ رات بھر جاگنے سے آپ کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا۔ خوف خدا میں روتے ہوئے آپ کی آنکھیں پھول جاتی تھیں۔ نمازیں کھڑے کھڑے آپ کے پاؤں سوج جاتے تھے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ میرے دادا علی زین العابدینؓ جب تلاوت کلام پاک فرماتے تھے تو آپ کی خوش الحانی سے لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ آپ کے گرد لوگوں کی ایک کثیر تعداد جمع ہو جاتی تھی۔ جنھیں ایک دوسرے کی خبر نہیں ہوتی تھی۔"

اصمعی لکھتے ہیں "کہ میں نے گہری رات میں ایک حسین وجمیل نوجوان کو دیکھا۔ کہ جس کے گیسو دونوں طرف لٹک رہے تھے۔ اور وہ غلاف کعبہ تھام کر حمد و مناجات کر رہا تھا: خدایا اس وقت آنکھیں سو رہی ہیں۔ ستارے ڈوب رہے ہیں۔ لیکن تو وہ حی وقیوم ہے۔ جو ہر شے کو دیکھ رہا ہے۔ خدایا! بادشاہوں کے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ اور پہرہ دار ان کے قلعوں پر پہرہ دے رہے ہیں۔ تیرا در رحمت سائلوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اے ارحم الراحمین! میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں۔ تو میری طرف نظر رحم وکرم فرما۔"

اصمعی کہتے ہیں۔ کہ جب وہ شہزادہ اپنی مناجات سے فارغ ہوا۔ تو میں نے نزدیک جا کر پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا۔ میں علیؑ ابن حسینؓ ہوں۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ ان کے سوا زین العابدین کسی کا لقب نہیں ہو سکتا۔"

اس زہد و تقویٰ اور عبادت خدا میں مشغولیت کے باوصف آپ خلق خدا سے غافل اور گوشہ نشین نہیں رہے۔ آپ نے یزید ابن معاویہ کے دور حکومت سے لے کر ولید بن عبد الملک تک کا عہد دیکھا۔ آپ کے دور میں دین اسلام میں بہت سی اختراعات ہو چکی تھیں۔ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اسلام میں قیصر و کسریٰ کے اثرات نمودار ہو رہے تھے۔ صحابہؓ رسول میں سے بہت کم لوگ حیات تھے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تین نسلیں پروان چڑھ چکی تھیں۔ اور تیسری نسل کے پاس قوت ایمانی، زہد وتقویٰ اور صحیح اسلامی تعلیمات کے بجائے دولت واشرفی کی چکاچوند تھی۔ دلوں سے عبادت وریاضت کی منزلت کم ہو چکی تھی۔ حکمرانوں کی بے اعتدالیوں اور عیاشیوں نے بھلے برے میں امتیاز ختم کر دیا تھا۔

اس وقت ضرورت تھی کہ معاشرے کو اسلام اور اس کے فرائض کی جانب متوجہ کیا جاتا۔ خالق حقیقی کے حقیقی تصور سے انھیں روشناس کرایا جاتا۔ عبادت و ریاضت کی اصل روح کو بے نقاب کیا جاتا۔ علامہ مرتضیٰ الافاضل نے لکھا ہے:" امام زین العابدین نے عوام کی زبوں حالیٔ حقوق کی پامالی، عبادات سے غفلت کی انتہا دیکھ کر ایک نیا انداز تعلیم اختیار کیا۔ خطبوں کا موقع نہ تھا۔ عوامی اجتماع ممکن نہیں تھے تو انھوں نے دعا و مناجات کی زبان میں اخلاق و حقوق، نفسیات و کردار، عقاید و اعمال کا لافانی درس دیا۔"

آپ نے مدینے کو دوبارہ مرکزیت بخشی اور واقعۂ حرّہ کے نتیجے میں تباہ شدہ شہر کو علمی استحکام عطا کیا۔ عوام کو فکر و راستی کا نیا راستہ دکھایا۔ آپ نے تقریباً گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔ لیکن ان معنوں میں کہ سیاست میں آپ کو کوئی دخل نہ تھا۔ آپ اپنے کردار و عمل سے، اخلاق جمیل سے، اپنے زہد و تقویٰ اور عبادت و مناجات سے اپنے دَور کی روش عام کے خلاف خاموش جہاد کرتے رہے۔ اپنی دعاؤں اور مناجاتوں سے تعلیمات اسلام کو تابندگی بخشتے رہے۔ آپ کی مناجات کے سات مجموعے آج بھی موجود ہیں۔

مصیبت زدہ، مفلوک الحال اور غریب لوگ آپ کی ذات میں بے پناہ ہمدردی اور شفقت پاتے تھے۔ عمر ابوالنصر نے لکھا ہے کہ آپ نے بے شمار غلام خرید کر آزاد کیے۔ آپ اپنے بدترین دشمنوں سے بھی مہربانی کا برتاؤ کرتے تھے۔ مروان ابن الحکم جو آپ کی دشمنی میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ جب حکومت کے زیر عتاب آیا تو اپنے اہل و عیال کے لئے آپ سے پناہ کا طلبگار ہوا۔ آپ نے بڑی خندہ پیشانی سے اس کے اہل خانہ کو ایک طویل عرصے تک پناہ دی اور ان کی خبر گیری کرتے رہے۔

آپ کے بے پناہ اخلاق نے خلق خدا کو آپ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ ایک بار سُنا کہ کوئی شخص آپ کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ آپ اس کے پاس گئے اور اس سے ایسا حسن سلوک کیا کہ وہ آپ کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا۔ شعرا نے آپ کی نجابت و شرافت، اخلاق حسنہ، اور عبادت گزاری پر بے شمار قصائد کہے ہیں۔ ان میں فرزدق خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ وہ اپنے ایک مشہور فی البدیہہ قصیدے میں کہتا ہے:" یہ وہ برگزیدۂ خداوند عالم ہیں کہ مکہ، مدینہ، حل و حرم سب ان کے قدموں کی آہٹ پہچانتے ہیں۔" (صواعق محرقہ)

آپ تحریر و تقریر میں اپنے دادا علیؑ مرتضیٰ سے مماثل و مشابہ تھے جب کبھی خطبہ دینے کا موقع ملتا۔ تو لوگ علیؑ مرتضیٰ کی فصاحت و بلاغت کو دیکھ لیتے تھے۔ آپ کا انتقال ۲۴ محرم الحرام سنہ ۹۰ھ کو ہوا۔ تب لوگوں پر یہ راز کھلا۔ کہ مدینے کے غربا کی پوشیدہ امداد کرنے والا آج اس دنیا میں نہیں رہا۔

تبصرات

"بھنور بھنور زندگی" (ناول) مصنف مجید سلیم، سائز $\frac{20 \times 30}{8}$ صفحات ۱۵۲۔ قیمت پندرہ روپیہ۔ پبلشر خود مصنف۔ ملنے کا پتہ مکان نمبر B/۷۶۶ ـ جبریت آباد۔ حیدر آباد

سرتاج احمد جلیلی ایم۔ اے عثمانیہ نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے:" ناول "بھنور بھنور زندگی" عصر حاضر کے مسائل اور تہذیبی اقدار کا ایک بہترین مرقع ہے۔"

عاشق شاہ نے لکھا ہے۔ "اس نوجوان افسانہ نگار کو اپنی بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔"

بہن عفت موہانی نے لکھا ہے:" ان کی تحریر میں دلکشی ہے۔ ناول کی ابتدائی چند سطور قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتی ہیں اور تجسس و دلچسپی پڑھنے والے کو ورق ورق الٹنے پر مجبور کرتی ہے۔"

یہ ساری باتیں مروّتاً نہیں لکھی گئی ہیں۔ ناول بھنور بھنور زندگی میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ بس کمی ہے تو یہ کہ اس کے مطالعہ سے کوئی سبق نہیں ملتا۔ معاشرے کی کوئی اصلاح کی کوشش نہیں کی گئی۔ صرف رومانس ہے جو قاری بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ناول کو ایک رومانی کہانی بنانے میں مجید سلیم صاحب بہت زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ ان کے افسانے اردو کے اکثر مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں، ناول لکھنے کی ان کی یہ کوشش پہلی ہے، لیکن ان کی مشاقی یہ ظاہر نہیں کرتی کہ انھوں نے پہلے اور کوئی ناول نہیں لکھا۔

کتاب اردو اکاڈمی آندھرا پردیش کے مالی تعاون سے چھپی اس کے باوجود مصنف نے اس کی جو قیمت رکھی ہے وہ گرانی کے باوجود بہت زیادہ ہے۔

حریمی دسترخوان

مرسلہ ... فرحت اختر، کلکتہ

کافی وال نٹ کیک

اشیاء: چار اونس مکھن یا مارجرین، چار اونس پسی ہوئی شکر، تین انڈے، چھ اونس آٹا، ایک چٹکی نمک، ایک چائے کا چمچہ بیکنگ پاوڈر، تین اونس چھلے ہوئے اخروٹ، ایک کھانے کا چمچہ کافی (ریسا کیفے)

ترکیب: مکھن یا مارجرین میں شکر ڈال کر اس طرح پھینٹیں کہ کریم کی طرح ہو جائے۔ اب اس میں ایک ایک کر کے انڈے ملائیں۔ آٹا چھان کر مکھن کے آمیزے میں شامل کر دیں، نمک اور بیکنگ پاوڈر بھی ہلکے ہاتھوں سے اس میں ملا دیں، اب کافی اور کٹے ہوئے اخروٹ کے آمیزے میں اچھی طرح ملا دیں، کیک کے سانچے کے اندرونی حصہ میں چکنائی لگائیں آمیزہ سانچے میں ڈال دیں۔ ۳۵۰ ڈگری گرم اوون میں سوا گھنٹے تک کیک بیک کر لیں اگر آپ کے پاس اوون نہیں ہے تو قریبی بیکری میں بھیج کر کیک بیک کروا لیں یا گھر ہی میں اس طرح بیک کر لیں کہ کسی کنسٹر یعنی تیل کے پیپے جس کا منہ ایک طرف سے بالکل کھلا ہو اوپر رکھ دیں وسط میں ایک اینٹ رکھ کر اس کے چاروں جانب انگارے رکھ کر سانچے کو اینٹ پر رکھ دیں اور کنسٹر کے منہ کو نصف یا تین چوتھائی کوئی آڑ لگا کر بند کر دیں انگارے گلنے لگیں تو مزید رکھ دیں امید ہے ایک گھنٹہ میں کیک تیار ہو جائے گا کوئی صاف سینک ڈال کر نکالیں صاف نکلے تو تیار سمجھیں کیک ٹھنڈا ہو جائے تو سانچے سے نکال لیں کافی کی آئسنگ اور اخروٹ کے ٹکڑوں سے اسے سجائیں —

قدرت کی نعمتیں

شاعر لکھنوی

پھل ہے کہیں شجر میں کہیں پھول ہے کھلا نشو ونمائے دہر کا جاری ہے سلسلہ

پودے ہوں یا درخت ہوں وہ پھل ہوں یا ہوں پھول پوشیدہ سب کی تہ میں ہیں فطرت کے کچھ اصول

ہر پھول یوں تو اپنی جگہ انتخاب ہے کیا پوچھنا گلاب کا وہ تو گلاب ہے

رنگینیوں کی چھاؤں ہے رعنائیوں کی دھوپ اک جنت نگاہ ہے تازہ پھلوں کا روپ

ہر پھل کے ارتقا کا ہے اک سلسلہ الگ خوش بو الگ ہے، رنگ الگ، ذائقہ الگ

آراستہ ہے حسن کے زیور سے ڈال ڈال قدرت کے فیض عام کی ملتی نہیں مثال

انگور، ناشپاتیاں، سیب اور سنترے دیکھو تو ان میں کتنے حیاتین ہیں بھرے

جو پھل ہیں سامنے وہ بظاہر تو چند ہیں صحت کے کتنے راز مگر ان میں بند ہیں

انسان ان کے رس کا اگر پی لے اک گلاس لذت زباں کو آئے، تر و تازہ ہوں حواس

قدرت نے اپنی ذات کی پہچان کے لئے
کیا نعمتیں اتاری ہیں انسان کے لئے

(بشکریہ ہمدرد صحت کراچی)

لکھنؤ سے بھوپال اور بمبئی

لمعات کے بجائے سفر نامہ

نسیم انہونوی

اردو کے مشہور اور صاحب طرز مزاح نگار جناب تخلص بھوپالی کا انتقال اردو ادب کے لئے ایک سانحہ تھا۔ ایک سے ایک قابل لوگ زمانے میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے لیکن کچھ ایسے لوگ بھی عالم وجود میں آتے ہیں جن کا مماثل نہیں پیدا ہوتا اور وہ اپنا طرز تحریر لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ تخلص بھوپالی بھی ایک ایسے ہی فنکار تھے، جن کے طنز و مزاح اور اچھوتے انداز تنقید کی کوئی ہمسری نہیں کر سکتا تخلص صاحب کی تحریروں نے بھوپال کا نام بلند کیا۔ تخلص صاحب اپنی تقریر و تحریر، دونوں سے لوگوں کو ہنساتے رہے۔ وہ صرف مزاح نگار ہی نہیں۔ بڑے مخلص اور عظیم انسان بھی تھے۔ عبد القوی دسنوی صاحب کی مرتبہ کتاب نذر تخلص پڑھنے کے بعد تخلص صاحب کے فن و شخصیت کے متعلق کافی معلومات ہو سکتی ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کا فخر نسیم بکڈپو کو حاصل ہے اور یہی کتاب میرے سفر بھوپال کا ذریعہ بنی۔ محترم دسنوی صاحب کا اصرار تھا کہ نذر تخلص کی اشاعت کے بعد اس تقریب میں شرکت کروں، جس میں تخلص مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا جانے والا تھا۔

تخلص مرحوم جب بھی لکھنؤ آتے تھے، غریب خانے کو قہقہہ ساماں بنانے کچھ دیر ہی کے لئے کیوں نہ سہی ضرور آتے تھے۔ جب کبھی میں بمبئی جاتے ہوئے بھوپال سے گذرتا تو مرحوم، مع توشہ اسٹیشن آکر اپنے خلوص و محبت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔ وہ جب بھی ملتے بھوپال آنے کی دعوت دیتے، اصرار کرتے، لیکن میری تقدیر میں یہ لکھا نہ تھا کہ ان کی اس خواہش کی تکمیل کر سکتا۔ اور پھر جب میں نے اچانک سُنا کہ لاکھوں کو ہنسانے والے تخلص بھوپالی اب بھوپال والوں کو رُلا رہے ہیں تو میں بھی رو پڑا۔ جی چاہا کہ اُڑ کر بھوپال جا پہونچوں اور بعد مرگ ہی سہی ان کی تمنا پوری کرتے ہوئے ان کے پس ماندگان سے تعزیت کروں۔ لیکن اس وقت میں خود موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ پلنگ سے اٹھنا بھی دشوار ہوتا تھا۔ بھوپال کا سفر کیسے کرتا۔ لیکن کتاب نذر تخلص مکمل ہوئی تو اس سے پہلے ہی میں معجزاتی طور پر صحت مند ہو گیا تھا اور اس قابل تھا کہ سفر کر سکوں، اس لئے میں نے دسنوی صاحب سے وعدہ کر لیا اور پھر اپنی سہولت کے مطابق میں نے ہی اس تقریب کے وقت کا تعین کیا۔

میں بمبئی بھی جانا چاہتا تھا اس لئے کہ اپنی علالت کے باعث تین سال سے وہاں نہ جا سکا تھا۔ اسی زمانہ میں اللہ پاک نے نجم السحر سلمہا کو ایک اور بیٹی عنایت فرمائی تھی۔ غزالہ پہلے ہی بیٹی کی محبت میں بمبئی چلی گئی تھیں اور وہیں اپنا علاج کرا رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے انھیں قلبی شکایت میں مبتلا ہونے کا اظہار کیا۔ یہ خبر میرے لئے پریشان کن تھی۔ یہی نہیں اس زمانے میں غزالہ کے خط سے معلوم ہوا کہ عزیزی مظفر میاں جلالی بھی شدید علیل ہو گئے ہیں۔ مظفر میرے مخلص ترین دوست اور ساتھی منظور الزماں مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں۔ اس خاندان سے مجھے ہمیشہ قلبی تعلق رہا۔ غرض یہ تمام باتیں ایسی تھیں کہ میں بمبئی جانا چاہتا تھا۔ اور یوں میرا یہ سفر ایک پنتھ دو کاج کے مصداق ۲۵ر دسمبر کی صبح دس بجے لکھنؤ بمبئی ایکسپریس سے شروع ہوا۔ اس سفر میں بہن مس ناہید (یعنی میری شریک حیات کی بہن) بھی ساتھ تھیں انھیں بمبئی جانا تھا۔ بھوپال ان کی جنم بھومی ہے، لیکن انھوں نے کبھی بھوپال دیکھا نہیں تھا، اس لئے میرے ساتھ ہی وہ بھی بھوپال گئیں۔ اسی شب ۱۱ بجے بمبئی ایکسپریس بھوپال اسٹیشن پہونچی جناب عبد القوی دسنوی صاحب، محترم اسرار محمود صاحب، جناب عشرت قادری صاحب اور محمد نعمان خاں صاحب پلیٹ فارم پر موجود تھے دسنوی صاحب نے ان حضرات سے ہمیں متعارف کرایا۔ اسرار مسعود صاحب کے متعلق دسنوی صاحب نے مجھے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ بھوپال میں باہر سے آنے والے ادیبوں اور شعراء وغیرہ کے قیام و طعام کا ٹھیکہ مسعود صاحب نے ہی لے رکھا ہے اور یہ کہ میں بھی موصوف ہی کے یہاں قیام کروں گا۔

اسٹیشن سے نکل کر ہم سب مسعود صاحب کی کار پر بیٹھ کر موصوف کے دولت کدہ پر پہونچ گئے۔ رات زیادہ آچکی تھی اس لئے دسنوی صاحب وغیرہ رخصت ہو گئے اور ہم مسعود صاحب کی کوٹھی کے مشرقی دروازے سے اوپر گئے۔

لکھنؤ سے روانگی کے قبل ہی مجھے یہ علم ہو گیا تھا کہ مسعود صاحب ہمارے کرم فرما اور اردو کے مشہور مزاح نگار وجاہت علی سندیلوی صاحب ایڈوکیٹ کے عزیز ہیں۔ وجاہت صاحب کی ایک صاحبزادی نامی پریس کے خواجہ انوار الدین سے منسوب ہیں، جو علمی ادبی اور ہوشل دنیا میں صبیحہ انور کے نام سے مشہور ہیں۔ صبیحہ صاحبہ کی دوسری بہن مسعود صاحب کی بہو ہیں۔ صبیحہ نے مسعود صاحب کے نام ایک خط کے ذریعہ میرا مزید تعارف کرادیا تھا۔ مسعود صاحب سے گفتگو کے بعد یہ بھی علم ہوا کہ مسعود صاحب وجاہت صاحب کے چچازاد بھائی بھی ہیں۔

ایک کافی طویل وعریض کمرہ میرے قیام کے لئے مع بستر تیار تھا۔ مجھے اپنا بستر بند کھولنے کی بھی اجازت نہ ملی۔

کھانے کے لئے میں نے دسنوی صاحب کو لکھ دیا تھا کہ میں جلد کھانے کا عادی ہوں اور پھر ریل کا کیا اعتبار، آزادیٔ ملک کے ساتھ وہ کیوں غلام بنی رہتی۔ خود مختار ہے، جب جی چاہے چلے اور جب جی چاہے رکے، اس لئے میں شب کا کھانا راستہ ہی میں کھاؤنگا کھانا اور کئی تھرماسوں میں چائے لے کر چلا تھا، اس لئے کہ اب جو کھانا یا جو چائے ریلوے اسٹیشنوں پر ملتی ہے، اس کا کیا بیان کروں کم سے کم میں تو نہ وہ کھانا کھا سکتا ہوں نہ وہ چائے حلق سے اترتی ہے جو چالیس پیسے پیالی چائے کہہ کر دی جاتی ہے۔ میں نے تو وہ زمانہ دیکھا ہے جب کلنر کمپنی کھانے پینے کا انتظام کیا کرتی تھی حیرت ہے کہ ریلوے کے متعلقہ افسران کیوں نہیں دیکھتے کہ کس گندگی کے ساتھ کتنا بدمزہ کھانا اور چائے کے نام سے گرم پانی مسافروں کو دیا جاتا ہے۔

مسعود صاحب سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ چائے آگئی، لذیذ اور گرم۔ چائے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ مسعود صاحب نے فرمایا کہ میں اب آرام کروں۔ شب بخیر فرما کر موصوف رخصت ہو گئے۔ کمرے میں میری ضرورت کی ہر چیز مہیا تھی۔ میں بڑے سکون سے سو رہا۔

میرا خیال تھا کہ بھوپال پہاڑی جگہ ہے، لکھنؤ سے زیادہ سردی ہو گی لیکن یہاں کا موسم خوشگوار تھا۔ ایک رضائی ہی کافی ثابت ہوئی۔ مس ناہید صاحبہ اندرون مکان میری ہی طرح آرام سے سو گئیں۔ ان کا بستر بند بھی بندھا ہی رہا۔

صبح ۶ ہی بجے محترم مسعود صاحب خود اپنی اور میری چائے لئے تشریف لائے۔ میں نے چائے پی اور پھر دیر تک باتیں کرتا رہا۔ تحفۂ درویش کی طرح چند کتابیں ساتھ لے گیا تھا وہ مسعود صاحب کی خدمت میں پیش کیں۔ علمی ادبی ذوق رکھنے والے انسان کے لئے کتابیں بہترین تحفہ ہوتی ہیں۔ مسعود صاحب بے حد خوش ہوئے اور انھیں اپنی الماری میں سجادیا۔

۸ بجے محترم دسنوی صاحب اور نعمان صاحب تشریف لائے، ہم سب کے ساتھ ہی ناشتہ کیا اور "یاد مخلص" کی تقریب میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے۔

راستہ موتی مسجد اور تاج المساجد کے قریب سے گذرتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا ایک سیلاب سا امنڈتا چلا جارہا ہے۔ یہ سب تبلیغی اجتماع میں شرکت کے لئے باہر سے آئے تھے۔ یہ اجتماع ہمارے لکھنؤ میں بھی ہوا کرتا ہے، لیکن اتنا مجمع میں نے اپنے شہر میں کبھی نہیں دیکھا۔ تاج المساجد دیکھنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ لیکن افسوس کہ میں اس جم غفیر سے گذر کر مسجد کے اندر جانے کی ہمت کسی روز نہ کرسکا، جس کا قلق ہے۔ بہر حال زندگی نے وفا کی تو پھر کبھی بھوپال جاکر یہ تمنا بھی پوری کرلوں گا۔

نذر عقیدت پیش کرنے کا یہ پروگرام "یاد مخلص" کے نام سے سیفیہ کالج کے اولڈ بوائز کی تنظیم "کاروان سیفیہ" کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا، جس کے روح رواں جناب محمد نعمان خاں ہی معلوم ہوئے جو فارغ التحصیل ہو کر اسی کالج میں اب لکچرر ہو گئے ہیں۔

ہم ۱۰ بجے کے قریب سیفیہ کالج پہونچے۔ مسعود صاحب کو کسی ضروری کام سے کہیں جانا تھا اس لئے وہ اس پروگرام میں شرکت نہ فرما سکے۔ ہمیں دسنوی صاحب اردو ڈپارٹمنٹ کے لائبریری ہال میں لے گئے۔ جلسہ شروع ہونے میں ابھی دیر تھی، اس لئے ہم نے لائبریری کی سیر کی۔ اس لائبریری ہال کو جس سلیقہ اور ندرت کے ساتھ آراستہ کیا گیا ہے، اسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا شاندار اور مزین لائبریری ہال اس سے پہلے میں نے

کسی کالج میں نہیں دیکھا۔ اور یہ سب کچھ جناب دسنوی صاحب کا رہین منت ہے جو شعبۂ اردو کے ریڈر ہیں۔ موصوف کے علمی ادبی کارناموں کا ذکر کیا جائے تو کافی صفحات درکار ہوں گے۔ اسی سجاد ہال میں اس سے پیشتر ایسے ہی بہت سے اجتماعات ہو چکے ہیں، جو دسنوی صاحب ہی کی علمی ادبی دلچسپیوں کے شاہد ہیں۔ مجلہ سیفیہ کے متعدد تاریخ ساز خاص نمبر بھی ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ ان کی ترتیب کا سہرا بھی دسنوی صاحب ہی کے سر بندھا ہے۔ اور اب "نذر تخلص" بھی دسنوی صاحب ہی کی جد و جہد سے منظر عام پر آئی ہے جو تخلص مرحوم کو زندہ جاوید بنا دے گی۔

تقریباً ۱ ½ ہم سب سجاد ہال میں پہونچے جو بانیٔ سیفیہ کالج کے نام پر مشہور ہے۔ کافی حضرات اور خواتین پہلے ہی سے تشریف فرما تھیں۔

پروگرام کی صدارت کے لئے بانی کالج کے فرزند جناب فخرالدین صاحب سے جلسہ کی صدارت فرمانے کی درخواست کی گئی۔ مجھے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اور محترم صمد صاحب جیلر برادر جناب تخلص مرحوم کو ڈائس پر جگہ دی گئی۔

متذکرہ تنظیم کے سکریٹری محمد نعمان خاں صاحب نے ۱ بجکر ۴۵ منٹ پر تقریب کی کارروائی کا افتتاح کرتے ہوئے مرحوم تخلص بھوپالی کی علمی ادبی خدمات بیان کیں۔ اس حقیر کو شرکائے جلسہ سے متعارف کرایا اور آخر میں ملا سجاد حسین صاحب مرحوم بانیٔ سیفیہ کالج کا بھی ذکر کیا جنھوں نے ایک چھوٹے سے تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈالی تھی اور وہ آج کل مدھیہ پردیش کا سب سے بڑا پوسٹ گریجویٹ کالج ہے، جس میں ہر سبجکٹ کی تعلیم دیجاتی ہے۔

ملا سجاد حسین صاحب آج اس دنیا میں موجود نہیں، لیکن انھیں مرحوم لکھنے کو جی نہیں چاہتا، اس لئے کہ سیفیہ کالج ہمیشہ ہمیشہ ان کو زندۂ جاوید بنائے رکھے گا۔

تنظیم کے صدر جناب اقبال مسعود صاحب نے اپنا مضمون "تخلص صاحب ـــــ کچھ یادیں" پڑھا یہ مضمون کتاب نذر تخلص میں شامل ہے۔

مسعود صاحب کے بعد مشہور ڈرامہ نویس جناب ابراہیم یوسف صاحب نے اپنا مزاحیہ مقالہ "خالص بھوپالی یعنی تخلص بھوپالی" بڑے ہی ڈرامائی لہجہ و انداز میں سنا کر سب کو بیحد متاثر کیا۔ یہ مقالہ بھی کتاب نذر تخلص میں شامل ہے۔

ابراہیم یوسف صاحب کے بعد اس تقریب کے روح رواں جناب عبد القوی دسنوی، بھوپال یونیورسٹی کی فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین اور صدر شعبہ اردو سیفیہ کالج نے اپنا پر مغز مضمون "تخلص بھوپالی میرے مخلص دوست" پڑھا، جس میں خصوصیت سے مرحوم کی نیک نفسی خلوص اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔

دسنوی صاحب کے بعد مرتضیٰ علی صاحب نے "غالب کا غیر مطبوعہ خط بنام تخلص بھوپالی" پر لطف انداز میں سنایا۔ یہ تمام مضامین نذر تخلص میں شائع ہوئے ہیں۔

مرتضیٰ علی صاحب کے بعد سیفیہ کالج کے پرنسپل جناب عبد الشکور صاحب نے تخلص مرحوم کے فرضی کردار "پاندان والی خالہ" اور "غفور میاں" کا ذکر کرتے ہوئے ثابت کیا کہ یہ انتقالِ اقتدار سے پیدا ہونے والی بے چینی کی عکاسی کرتے تھے۔

پرنسپل شکور خاں صاحب کے بعد برق آشیانوی صاحب نے مرحوم تخلص صاحب سے اپنے تعلقات کا تذکرہ فرمایا۔

اس حقیر نے مختصر الفاظ میں تخلص مرحوم سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یاد تخلص کا یہ پروگرام ایک طرح کی تعزیتی تقریب ہے اس لئے درخواست ہے کہ ہم سب ایک منٹ کے لئے کھڑے ہو کر اپنے غم کا اظہار کریں۔ اس مشورہ پر عمل کیا گیا میں نے تخلص صاحب کے متعلقین سے یہ بھی درخواست کی کہ مرحوم کی تصانیف کو جو اب عنقا ہیں دوبارہ شائع کیا جائے۔ اس کے لئے میں نے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔

بھوپال روانہ ہونے سے پہلے میں نے اپنے محب حقیقی جناب برق آشیانوی کو ایک خط لکھتے ہوئے یہ اطلاع دی تھی کہ میں یاد تخلص کی تقریب میں شرکت کے لئے بھوپال جا رہا ہوں، یہ خیال بھی نہ تھا کہ موصوف بھی بھوپال آجائیں گے۔ اس لئے کہ یہ تقریب مقامی طور پر منائی گئی تھی، باہر سے صرف مجھے ہی بلایا گیا تھا۔ لیکن جلسہ شروع ہونے کے کچھ دیر بعد میری نظر حاضرین کی صفِ اول پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ ایک صاحب ہم شبیہ برق تشریف فرما ہیں۔ میں نے بار بار حیرت سے انھیں دیکھا۔ لیکن

وہ مجھے ایک شناسا کی نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے اس لئے میں نے سمجھا کہ بھوپال ہی کے کوئی صاحب ہوں گے جو برق صاحب سے مشابہت رکھتے ہیں، لیکن جب موصوف کی موجودگی کا اعلان کیا گیا تو میں خوشی سے باغ باغ ہو گیا اور میں نے اپنی تقریر میں مخلص مرحوم کے تصور کو رکھتے ہوئے ہلکا سا مزاح پیدا کرتے ہوئے کہا کہ میں حیران تھا کہ بھوپال میں برق صاحب کا ڈپلیکیٹ کہاں سے آگیا۔ تو یہ محفل غم چند لمحات کے لئے قہقہوں سے گونج اٹھی۔ یقیناً اسوقت مخلص صاحب کی روح بھی مسکرا پڑی ہوگی۔ محترم صدر (ٹرسٹی سیفیہ ٹرسٹ) نے مرحوم مخلص صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مرحوم کی بخشش کی دعا فرمائی۔

تقریباً ۱۲½ بجے کاروان سیفیہ کے صدر محترم اقبال مسعود صاحب نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور تقریب ختم ہو گئی۔

میں ڈائس سے اتر کر برق صاحب سے بغل گیر ہوا، اس کے بعد بہت سے حضرات اور لڑکیوں نے مجھے گھیر لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس سے مخاطب ہوں اور کس سے کیا کہوں۔ لڑکیوں نے آٹوگراف بکس پیش کرنا شروع کیں۔ میں نگاہیں جھکائے ان پر کچھ لکھتا رہا، کس نے لکھوایا، میں نے کیا لکھا، کچھ یاد نہیں۔ اس لئے کہ میں نے کسی کو بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ شرمندہ ہوں کہ ان تمام حضرات کے اسماء گرامی ذہن میں محفوظ نہ رہ سکے جو خود سے متعارف ہو کر یہ ثابت کرتے رہے کہ بھوپال کے علم دوست کتنے قدرداں ہیں کہ باہر سے آنے والے مجھ جیسے حقیر انسان کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں۔

شرکاء تقریب میں جناب صمد صاحب جیلر (برادر اکبر مخلص مرحوم)، جناب عبدالرؤف صاحب برادر خورد جناب مخلص بھوپالی مرحوم، رشیدہ بیگم صاحبہ ہمشیرہ مخلص مرحوم، ساجدہ سلطان (اہلیہ مخلص مرحوم)، پروفیسر اختر علی خاں صاحب، پروفیسر حامد جعفری صاحب، جناب وفا صدیقی، پروفیسر نصرت بانو، صفیہ بیدار صاحبہ، انور سلطان صاحبہ، مولانا حمید اللہ ندوی صاحب، رخسانہ صاحبہ، حسام الدین صاحب، ڈاکٹر نسیم شہنوی صاحب، محمد الیاس صاحب، آفاق حسین صدیقی صاحب، حسینہ صاحبہ، (قدیم خریدار حریم) ڈاکٹر کشور سلطان صاحبہ، جناب مختار شمیم صاحب، شاہد بھوپالی صاحب، پروفیسر شوکت سید صاحب، یعقوب یاور صاحب، ڈاکٹر ایوب خاں صاحب، پروفیسر آفاق حسین صدیقی صاحب، ریحانہ قمر انصاری صاحبہ، خورشید اختر صاحب، مسعود ہاشمی صاحب، بیگم صاحبہ جناب عبدالودود خاں مرحوم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

روانگی سے قبل مجھے علم ہوا کہ عبدالودود خاں صاحب مرحوم (جنھیں کسی سنگدل نے کچھ عرصہ قبل شہید کر دیا تھا) کی بیگم صاحبہ، ڈاکٹر کشور سلطان اور ساجدہ سلطان صاحبہ (اہلیہ مخلص مرحوم) بھی موجود ہیں تو میں بغرض تعزیت دسنوی صاحب کے ساتھ اس کمرہ میں گیا جہاں یہ سب موجود تھیں، بہن رضیہ حامد صاحبہ بھی تشریف رکھتی تھیں۔ میں نے تعزیت کا فرض ادا کیا۔ ڈاکٹر کشور سلطان صاحبہ کی تھیسس "جاں نثار اختر۔ حیات و فن" اور ان کے شوہر جناب مختار شمیم کی تالیف "ریاست ٹونک اور اردو شاعری" میں نے ہی نسیم بکڈپو سے شائع کی تھیں، ان دونوں سے غیر متوقع ملاقات سے میں بہت خوش ہوا۔

اس کے بعد ہم سب کالج کی عمارت سے باہر نکلے تو دسنوی صاحب نے ایک نجی گروپ فوٹو لینے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ فوٹو لیا جا چکا تو ہم روانہ ہونے کے لئے باہر جانے لگے، عین اسی وقت اسرار مسعود صاحب کار لے کر تشریف لے آئے، وہ ہمیں سیفیہ کالج پہونچا کر کسی ضرورت سے چلے گئے تھے، تقریب میں بھی شرکت نہ کر سکے تھے، جس کا مجھے افسوس رہا۔ اسرار مسعود صاحب کے ساتھ ہی ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب بھی تھے۔ بعد میں علم ہوا کہ سبب کچھ پارٹی پالیٹکس تھا۔

مسعود صاحب کے ساتھ موصوف کے دولتکدہ پر پہونچ کر دوپہر کا کھانا کھایا، محترم دسنوی صاحب اور نعمان صاحب بھی شریک طعام تھے۔ دو بجے میں حسب عادت آرام کرنے کے لئے لیٹ گیا، دسنوی صاحب اور نعمان صاحب نے ۴ بجے آنے کا وعدہ فرمایا تاکہ مخلص مرحوم کے گھر جا کر تعزیت کی رسم ادا کر سکوں۔

مخلص مرحوم کا گھر کافی دور گوند پورہ میں ہے۔ مسعود صاحب ہمیں اپنی کار میں لے کر حسب پروگرام روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم نے نئے بھوپال کا نظارہ کیا۔ (افسوس قریب جا کر اسے دیکھنے کے لئے وقت نہ مل سکا) مخلص مرحوم کے یہاں پہنچ کر معلوم ہوا

... چودھری یاد تخلص مرحوم کی چھوٹی بیٹی عفت سلمہا کی شادی ہے کاش مجھے علم پہلے سے ہوگیا ہوتا اور میں اسی کے مطابق یاد تخلص کا پروگرام بناتا اگر اس کی شادی میں شرکت کرسکتا۔ ایک اور افسوس یہ ہے کہ مجھے خیال ہی نہ آیا کہ میں تخلص صاحب کی لحد پر جاکر فاتحہ پڑھتا۔

واپسی میں ہم سحر صاحب کے بنگلے پر گئے۔ حسن اتفاق ہے کہ ملاقات بھی ہوگئی۔ بنگلہ نہایت پرسکون جگہ پر سحر صاحب نے تعمیر کرایا ہے۔ دیر تک موصوف سے گفتگو کرتا رہا۔ چائے پی اور رخصت ہوا۔

یہ لکھنا بھول گیا کہ بہن ناہید صاحبہ ہمہ وقت ہمارے ساتھ ہی رہی تھیں۔ سحر صاحب سے رخصت ہوکر ہم سب ابراہیم پورہ پہونچے معلوم ہوا کہ اقبال لائبریری کے روح رواں جناب عمر انصاری صاحب نے ہمیں رات کے کھانے پر بلایا ہے اور یہ پروگرام دسنوی صاحب نے خود ہی طے کرلیا تھا اس لئے کہ مجھے بھوپال بلانے والے وہی تھے میں چاہتا تھا کہ اپنے قیام بھوپال کا ہر لمحہ انھیں کے اشاروں پر گزاروں۔

ہم سب اقبال لائبریری پہونچے۔ لائبریری بہت ہی چھوٹی سی جگہ میں ہے لیکن کافی مقبول ہے۔ ممبروں کی تعداد بھی کافی ہے۔ انصاری صاحب نے اپنی لائبریری کے ریکارڈ رکھنے کے ضابطے خود ہی بنائے ہیں جن سے کتابوں کی آمد و رفت نہایت آسان ہو گئی ہے۔

لائبریری کا بند کرکے انصاری صاحب ہمیں اپنے گھر لے گئے بڑی ہی مخلصانہ دعوت تھی یہ۔ یہیں میری ملاقات جناب کاوش صاحب کی جو مشہور شاعر عظمت بھوپالی صاحب کے صاحبزادے ہیں کاوش صاحب کی اہلیہ محترمہ عزیزہ صاحبہ حریم کی قدیم پرستاروں میں اور حریم کی اشاعت کے لئے ہمیشہ سرگرم رہیں۔ کاوش صاحب کا ... ملاقات نصیب تھی اس لئے وہ غالباً ... کے سلسلے میں بھوپال آئے ہوئے تھے۔ کیا بتایا تھا ... سکا۔

۔۔ دسمبر کی صبح جناب دسنوی صاحب ۸ بجے کے قریب ہی آگئے ... مسعود صاحب کے ساتھ ناشتہ کیا۔ مس ناہید صاحبہ مسعود صاحب کی صاحبزادی رعنا سلمہا وغیرہ کے ساتھ مسعود صاحب کی وہ کوٹھی دیکھنے چلی گئی تھیں جو جھیل سے ملحق اس طرح بنی ہوئی ہے کہ اس کا کچھ حصہ پانی کے اوپر ہے۔ اس کوٹھی کی تعریف میں نے پہلے ہی سنی تھی اسے اب حکومت نے لے لیا ہے۔ ارادہ تھا کہ اسے ضرور دیکھوں گا تاکہ بھوپال تال کو بھی قریب سے دیکھ سکوں، لیکن افسوس کہ اس کا موقع نہ مل سکا۔

رضیہ حامد صاحبہ نے یاد تخلص کی تقریب ہی میں وعدہ لے لیا تھا کہ میں ان کے گھر پر حاضری دوں۔

۱۴ر کی صبح میرے لئے باعثِ صد افتخار تھی۔ حوائج ضروری سے فراغت ہی پائی تھی کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر، ڈاکٹر حامد، پروفیسر آفاق، جناب ابراہیم یوسف، ڈاکٹر کشور سلطان اور مختار شمیم جیسی قابل قدر ہستیوں نے زحمت فرماکر مجھے عزت بخشی۔ افسوس کہ وقت کی کمی کے باعث کوئی ادبی گفتگو کرکے ان حضرات سے استفادہ حاصل نہ کرسکا۔

۹½ بجے کے قریب محترم دسنوی صاحب تشریف لائے محترم مسعود صاحب کسی ضروری کام سے چلے گئے تھے۔ بہن ناہید صاحبہ مسعود صاحب کی صاحبزادی مس رعنا سلمہا کے ساتھ موصوف کی پرانی کوٹھی دیکھنے چلی گئی تھیں۔ بہن ناہید صاحبہ واپس آئیں نہ ہی مسعود صاحب واپس تشریف لائے۔ اس لئے میں محترم دسنوی صاحب کے ساتھ رضیہ حامد صاحبہ سے ملنے کے لئے پیدل ہی روانہ ہوگیا۔ راستہ میں مَیں نے دیکھا کہ ہزارہا خواتین جوق در جوق چلی آرہی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس وقت موتی مسجد میں تبلیغی جماعت کے کسی معزز مقرر کی تقریر تھی جسے سننے کے اشتیاق میں یہ سب اُمنڈ پڑی تھیں۔ مجھے بیحد خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ ان خواتین میں ۹۹ فیصدی برقعہ پوش تھیں۔ میں جہاں بھی خواتین کو برقعے میں دیکھتا ہوں میرا خون بڑھ جاتا ہے اور مجھے یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ پردے کے لئے میری جدوجہد بالکل ہی رائگاں نہیں جارہی ہے۔

رضیہ حامد صاحبہ کی حویلی بہت ہی قریب تھی۔ ہم پہونچے تو موصوفہ ہماری منتظر ہی تھیں۔ ہم ناشتہ کرکے نکلے تھے لیکن رضیہ بہن نے میز انواع اقسام کی چیزوں سے بھر دی تھی۔ میں کہاں تک انکار کرتا اخلاقاً میں نے پینڈی توڑ کر کھائی جو میری ...

مجھے اس قدر پسند آئی کہ جی چاہا باقی پیڑیاں بھی رومال میں
باندھ لوں، لیکن اتنی بے تکلفی نہ برت سکا۔ رضیہ بہن کے یہاں ہم جا نہ
سکے تھے کیونکہ اس لئے ہم وقت کاوش صاحب سے مقرر ہوا تھا۔
وہ گذر چکا تھا۔ کاوش صاحب کو علم تھا کہ ہم پہلے بہن رضیہ کے
یہاں جائیں گے اس لئے وہ زحمت فرما کر وہیں ہمیں بلانے آگئے
ہم نے رضیہ بہن سے اجازت چاہی۔ انھوں نے ایک نہایت ہی
خوبصورت کامدار مخملی بٹوہ ہمیں تحفتاً دیا، حالانکہ اگر وہ ہماری دلی کیفیت
سمجھ پاتیں تو بٹوے میں ایک پیڑی بھی بھر دیتیں۔ بہرحال رضیہ بہن
سے رخصت ہو کر ہم کاوش صاحب کے ہمراہ ان کے مکان گئے جہاں
سارے مکین سراپا انتظار نظر آئے۔ سب کے چہروں سے ظاہر ہو رہا
تھا کہ انھیں اس حقیر کی آمد سے بے حد خوشی ہے۔ کاوش صاحب نے
اپنی نصف بہتر یعنی بہن عزیزہ اور تمام بچوں و اعزہ سے مجھے
متعارف کرایا۔ اسی وقت کاوش صاحب سہارا دے کر اپنے والد
محترم عظمت بھوپالی کو بھی میرے پاس لے آئے جو اب پیرانہ سالی
کے باعث بے حد نحیف ہو گئے ہیں، بولنے میں بھی انھیں تکلیف
ہوتی تھی۔ موصوف کو دیکھ کر مجھے عبرت ہوئی۔ کاوش صاحب نے
مجھے بتایا تھا کہ عظمت صاحب شاعر بے بدل ہی نہیں ایک زبردست
لیڈر بھی تھے۔ کیا آن بان رہی ہوگی۔ افسوس کہ عظمت صاحب کی
عظمتِ دیرینہ کا اب یقین ہی نہیں آ رہا تھا، وہ ایک مجبور و لاچار
انسان نظر آ رہے تھے۔ بہرحال مجھے مسرت ہوئی کہ میں ایک ایسی قابل
اور نامور شخصیت سے ملاقی ہوا۔ اس سے بھی زیادہ خوشی مجھے یہ معلوم
کر کے ہوئی کہ عزیزہ بہن، فخر قوم جناب مولانا علی میاں صاحب کی
ہمشیرہ ہیں۔

یہاں بھی ناشتہ کا پر تکلف اہتمام تھا۔ حالانکہ میں نے کاوش صاحب
سے عرض کر دیا تھا کہ میں صرف چائے ہی پیوں گا۔ کاوش صاحب نے
دریافت کیا تھا، کیسی چائے، تو میں نے بے تکلفی سے کہہ دیا تھا کہ "دم
کی ہوئی" اور واقعی کاوش صاحب نے دم کی ہوئی ایسی نفیس چائے
پلائی، جیسی بھوپال میں کہیں پینے کو نہ ملی تھی۔ افسوس کہ وعدہ کے
باوجود کچھ کھانے کا بھی اصرار ہوا اور یہاں انڈے کا حلوہ کسی ایسے
سلیقے سے تیار کیا گیا تھا، جیسا میں نے کبھی نہ کھایا تھا۔ چکھنے کے بعد
[illegible] قسمیں کھا گیا۔ چائے کے ایک کپ کے بجائے دو کپ
پئے۔ ہم رخصت ہی ہونے والے تھے کہ مسعود صاحب بھی [illegible]
آگئے اس لئے کچھ دیر وہیں اور بیٹھنا پڑا۔ مسعود صاحب نے بھی حلوہ
کھایا اور چائے پی۔

محترم دسنوی صاحب سے تو شاید بھوپال کا بچہ بچہ واقف ہے
جہاں بھی گیا، انھیں سب نے عزت و احترام سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔
اس سے مجھے علم ہوا کہ وہ اپنے کالج میں کتنے مقبول ہیں۔

کاوش صاحب اور ان کے تمام متعلقین سے رخصت ہو کر ہم
مسعود صاحب کے گھر پہونچے۔ کھانا لگ چکا تھا۔ مسعود صاحب
کے بے حد اصرار پر مجھے بھی بیٹھنا ہی نہیں پڑا، چند لقمے کھانا بھی پڑے
اس لئے کہ بھوک نہ بھی ہو تو لذیذ کھانے اشتہا پیدا کر دیتے ہیں۔

اسی وقت علم ہوا کہ کوئی جمیل صاحب وظیفگ کل بھی ملنے
تشریف لائے تھے اور آج بھی لیکن مجھ سے ملاقات نہ ہو سکی [illegible]
بجے آنے کا وعدہ فرما گئے ہیں۔ میں تھکا تو بہت تھا لیکن [illegible]
سے سویا نہیں کہ جمیل صاحب تشریف لائیں تو مل سکوں [illegible]
جمیل صاحب آئے تو معلوم ہوا کہ حریم موصوف کے گھر ایک عرصے
سے آ رہا ہے اور ان کی بیٹیاں چاہتی ہیں کہ مجھ سے ملیں۔ جمیل صاحب
کافی سن رسیدہ انسان ہیں، نوجوانی میں علیگڑھ یونیورسٹی کی ہاکی
ٹیم کے کیپٹن تھے۔ موصوف نے اپنے دور طالب علمی کے بہت سے
واقعات سنائے۔ نہایت ذی علم اور مخلص انسان ہیں۔ میں نے
وعدہ کیا کہ دوسرے دن صبح ہر مشغولیت کے باوجود میں حاضر
ہوں گا۔

شام دسنوی صاحب نے اپنے گھر کے لئے مخصوص کر لی تھی [illegible]
کے بچوں کو مجھ سے انٹرویو لینا تھا۔ چائے پینا تھی اور چائے کے بعد
اسعد ہال میں کھانے کا پروگرام تھا۔ لیکن میں بھوپال [illegible]
کرنا چاہتا تھا، خصوصیت سے اس لئے [illegible] کہ بہن [illegible]
صرف سیر ہی کرنے آئی تھیں، اس لئے [illegible] دیر [illegible]
کے بعد میں نے مسعود صاحب سے کہا کہ اب آپ ہم [illegible]
تو سیر ضرور کرا دیں۔ مسعود صاحب نے فوراً گاڑی [illegible]
سیر کے لئے نکل گئے۔ شملہ ہل پر اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی کوٹھیاں
دور دور پر بنی ہیں، جیسی کہ پہاڑیوں پر ہوتی ہیں۔ [illegible]
صاحب بھی اپنی نئی کوٹھی تعمیر کرا رہے ہیں، ہم نے اسے بھی دیکھا

ٹہلتے ٹہلتے گھومتے ہم اس جگہ تک پہونچ گئے جہاں نیشنل پارک بن رہا ہے۔ یہ نہایت پُرفضا جگہ ہے۔ لیکن وقت کی کمی کے باعث ہم اندر نہ جا سکے، واپس ہوگئے۔ اس لئے کہ پانچ بجے دسنوی صاحب کے گھر پہونچ جانے کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم عیدگاہ ہل بھی جانا چاہتے تھے۔ راستہ ہی میں میرے حریم کی قدیم خریدار اور مشہور ناول نگار بہن وسیم بانو قدوائی کا گھر تھا موصوفہ کے متعلق علم ہوا تھا کہ وہ اپنی علالت کے باعث یادِ مخلص کی تقریب میں شرکت نہ کر سکی تھیں اس لئے اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ میں حاضر ہو کر عیادت کروں۔ مسعود صاحب ہمیں وسیم بانو قدوائی صاحبہ کے یہاں لے گئے۔ خدا کا شکر ہے بہن موصوف صحت مند ہو چکی تھیں ایک سرسری ملاقات کے بعد ہم رخصت ہو کر عیدگاہ ہل کی طرف چلے۔ اسی پہاڑی پر مجھے حریم کی قدیم خریدار بہن رضیہ محسن سے ملنا تھا لیکن وقت بہت تنگ تھا، ہم تھوڑی ہی دور جانے کے بعد واپس ہو گئے اس لئے کہ دسنوی صاحب کا خوف غالب تھا۔

عیدگاہ ہل پر ہی پروفیسر آفاق صاحب نے اپنی نئی کوٹھی تعمیر کرائی ہے۔ ہمارا اخلاقی فرض تھا کہ چند منٹ کے لئے ہی سہی، آفاق صاحب سے بھی مل لیں۔ آفاق صاحب نے چائے پلائے بغیر آنے نہیں دیا اس لئے دیر میں دیر ہوتی گئی۔

دسنوی صاحب نے ۵ بجے قطعی پہونچ جانے کا وعدہ لے لیا تھا لیکن ۶ بج چکے تھے۔ ہم نے مسعود صاحب سے کہا موٹر کے خراب ہو جانے کا حیلہ کر دوں گا۔ لیکن جب ہم دسنوی صاحب کے گھر پہنچے تو [illegible] کیمپس ہی میں ہے تو دسنوی صاحب بظاہر برہم نہیں نظر آ رہے تھے۔ اس لئے مجھے جھوٹ نہیں بولنا پڑا۔

فوراً ہی چائے آگئی اور سادی نہیں مع ناشتہ کے۔ لیکن میں نے صرف چائے ہی پی اس لئے کہ کالج میں اردو ڈپارٹمنٹ کی جانب سے ڈنر تھا اس کے ساتھ انصاف کرنا تھا۔ چائے کے بعد دسنوی صاحب کے بچوں عاتکہ دسنوی سلمہا (ایم۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ایڈ) عصمی دسنوی سلمہا (ایم۔ ایس۔ سی۔ کیمیا) منتقی دسنوی سلمہٗ (متعلم سال چہارم انجینیرنگ کالج) علی نقی دسنوی سلمہٗ، علی نواز دسنوی سلمہٗ، عالیہ دسنوی سلمہا، انجم دسنوی سلمہٗ نے مجھے گھیر لیا اور مجھ سے سوالات کرنے لگے اور میرے جوابات ٹیپ کر لئے تاکہ میں کبھی ان سے منکر نہ ہو سکوں۔

انٹرویو کے بعد ہی ہم سب اردو ہال گئے جہاں لائبریری کی میز ڈنر ٹیبل بنی ہوئی تھی۔ ڈنر سے پہلے ہی محترم عبدالشکور صاحب پرنسپل سیفیہ کالج بھی تشریف لائے اور مجھے شرفِ مخاطبت بخشا دیر تک ہم گفتگو کرتے رہے۔ عبدالشکور صاحب کو اردو سے بے حد دلچسپی ہے اور اس کے سلسلے میں ایک پروگرام آپ کے ذہن میں ہے اگر وہ پایۂ تکمیل کو پہونچ سکا تو مدھیہ پردیش کے متعلق کافی قابلِ اشاعت مواد یکجا ہو جائے گا۔

ڈنر میں سیفیہ کالج کے اولڈ بوائز کی تنظیم "کاروانِ سیفیہ" کے تقریباً سبھی ممبران شریک تھے۔ ڈنر بہت ہی پرتکلف اور لذیذ تھا۔ بہن ناہید صاحبہ بھی بہن رضیہ حامد و فرحت صاحبہ کے ساتھ شریکِ طعام تھیں۔ کھانے سے فراغت کے بعد ہم مسعود صاحب کے ساتھ واپس آگئے۔

۲۸ دسمبر ہمارے قیام بھوپال کا آخری دن تھا۔ محترم مسعود صاحب پر نزلے نے حملہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود حسب پروگرام موصوف ہمیں جناب جمیل صاحب، علیگ کے دولت کدہ پر لے گئے جمیل صاحب اور ان کی صاحبزادیاں ہماری منتظر تھیں۔ گو ہم مسعود صاحب کے ساتھ ناشتہ کر کے نکلے تھے، لیکن ہمیں زبردستی ناشتہ پر ناشتہ کرنا پڑا۔ کچھ دیر لطف صحبت رہا۔ جمیل صاحب کی "یاد ماضی" ہمیں محظوظ کرتی رہی۔ افسوس کہ وقت کی کمی کے باعث ہم زیادہ نہ بیٹھ سکے، رخصت ہو کر مکتبہ شرقیہ گئے۔ اتفاق ہی تھا کہ محترم شرقی صاحب سے ملاقات ہو گئی اس لئے کہ آج تبلیغی جماعت کے اجتماع کا آخری اور دعا کا دن تھا۔ مسلمانوں کی تمام دکانیں بند تھیں اس لئے کہ سب تاج المساجد چلے گئے تھے یا جا رہے تھے۔ شرقی صاحب بھی دکان بند کر رہے تھے اس لئے ہم سرسری طور پر مل کر بھوپال بکڈپو گئے، لیکن یہ ادارہ بند تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنی دکان تاج المساجد لے گئے ہیں۔ جہاں جانے کا کم از کم ہمارے لئے امکان نہ تھا۔ سڑکوں پر چلنے والوں کے کھوے سے کھوا لڑ رہے تھے اور سواریوں کو گذرنے کی قطعی اجازت نہ تھی۔

بھوپال سے ویسے تو کئی اخبار نکلتے ہیں، لیکن صحیح معنوں میں روزنامہ "آفتاب" ہی اچھا اخبار ہے۔ مجھے اشتیاق تھا کہ میں

اس کا دفتر دیکھوں اور اس کے ارباب حل وعقد سے شرف نیاز حاصل کروں۔

اسرار مسعود صاحب کو شاید بھوپال کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ ایسی کوئی جگہ مجھے نظر نہیں آئی جہاں سب ہی مسعود صاحب سے واقف اور بے تکلف نہ ہوں۔ ادارہ آفتاب میں بھی سب نے موصوف کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ مسعود صاحب نے مجھے اور بہن ناہید صاحبہ کو متعارف کرالیا۔ آفتاب کے ایڈیٹر جناب غضنفر علی خاں صاحب اور ارکان ادارت اقبال مسعود صاحب خالدہ نگرامی صاحبہ اور مسلم شریف صاحب موجود تھے۔ ان حضرات سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ میرا انٹرویو بھی لیا گیا۔ بہن ناہید خالدہ صاحبہ سے مخاطب رہیں کچھ تعلیم سے تعلق کے باعث ناہید صاحبہ نے پردہ چھوڑ دیا ہے۔ میں تو پردہ کے سلسلے میں بدنام ہوں ہی، سب ہی میرے ساتھ ناہید صاحبہ کو بے پردہ دیکھ کر متحیر ہوتے ہوں گے، لیکن کسی نے اب تک باز پرس نہ کی تھی لیکن خالدہ صاحبہ نے ناہید صاحبہ سے پوچھا نسیم صاحب تو پردہ کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ آپ ہی پردہ نہیں کرتیں یا ان کی بیگم وغیرہ بھی بے پردہ ہیں۔ بہن ناہید نے مسکرا کر جواب دیا، صرف میں ہی پردہ نہیں کرتی۔

آفتاب کے سلسلہ میں یہ بھی علم ہوا کہ اردو کا یہ شاندار اخبار ایک ہندو برادر وطن کی ملکیت ہے، جنھوں نے لاکھوں روپیہ کی آفسٹ مشین اس کے لئے لگا رکھی ہے۔

آفتاب کے دفتر سے اٹھ کر ہم گھر آئے۔ مسعود صاحب کے گھر کی خواتین بھی دعا میں شرکت کرنے جانا چاہتی تھیں، انھیں لے کر ہم سب پھر تاج المساجد کی جانب روانہ ہوئے، لیکن کسی راستہ سے بھی موٹر کو جانے کی اجازت نہ تھی اور خواتین کا اس انسانی ہجوم سے گزرنا ممکن نہ تھا جو سیلاب کی طرح ہر جانب لہریں لے رہا تھا۔ مجبوراً ہم واپس ہوگئے۔ بہن ناہید رعنا سلیما کے ساتھ بازار چلی گئیں تاکہ کچھ تحائف خرید لیں۔ یہاں پر میں رعنا مسعود سلیما کا تعارف بھی حریم بہنوں سے کرادوں۔ اللہ پاک ایسی بیٹی سب کو دے۔ ایسی سگھڑ، خدمت گذار اور سب کا خیال رکھنے والی بیٹیاں کم ہی ہوتی ہیں۔ بہن ناہید ہمہ وقت اس کا قصیدہ پڑھا کرتی تھیں۔ مسعود صاحب نے بتایا کہ وہ اسے جیب خرچ کے لئے سو روپیہ ماہوار دیتے ہیں، اس میں سے پچاس روپیہ کی رعنا سلیما دوائیں خرید لاتی ہیں اور گھر پاس پڑوس میں جس کسی کو بھی کوئی تکلیف ہوتی، فرسٹ ایڈ کے طور پر ایسے مناسب دوا دینا رعنا سلیما کا دلچسپ مشغلہ ہے امراض کی تشخیص اور مناسب دوا دینے کا علم اسے چھوٹے موٹے ڈاکٹر سے کم نہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک اسے ہمیشہ شاد وخرم رکھے۔ وہ گھر نمونۂ جنت بن جائے گا، جس گھر میں رعنا دلھن بن کر جائے گی۔ آج کل کی لڑکیاں ایسے اوصاف سے عموماً تہی ہوتی ہیں، جیسے رعنا سلیما میں موجود ہیں۔ خدا اسے نظر بد سے بچائے۔ (آمین)

بہن ناہید خریداری کرکے واپس آگئیں تو ہم دسنوی صاحب کے یہاں چلے گئے۔ دیر ہوگئی تھی۔ دسنوی صاحب بے چینی سے ہمارا انتظار فرما رہے تھے۔ محترم عبدالشکور صاحب اور نعمان خاں صاحب بھی موجود تھے۔ ہم سب نے ساتھ ہی کھانا کھایا۔ دسنوی صاحب نے اس کا خیال رکھا تھا کہ غذائیں زیادہ مرغن نہ ہوں۔ اس لئے کہ میں سادہ کھانا کھاتا ہوں۔ میں نے شکم سیر ہوکر، بلکہ کچھ زیادہ ہی کھا لیا تھا اس لئے کہ رات میں کھانے کا ارادہ نہ تھا

سہ پہر کے قریب ہم دسنوی صاحب اور ان کے بچوں اور پرنسپل صاحب سے رخصت ہوکر مسعود صاحب کے ساتھ گھر آگئے۔ اب آرام کرنے کا وقت نہ تھا۔ مسعود صاحب کا نزلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ ان کی تکلیف دیکھی نہ جارہی تھی۔ وہ اوڑھ لپیٹ کر آرام فرمانے لگے اور میں مس ناہید کے ساتھ سامان سفر درست کرنے لگا، اس لئے کہ ۴½ بجے گھر سے روانہ ہوجانا تھا۔ مسعود صاحب اس حالت میں بھی ہمارے ساتھ اسٹیشن جانے کے لئے تیار ہی نہیں، بلکہ مصر تھے۔ لیکن میں نے قسمیں رکھا کر انھیں روکا۔ ان کے صاحبزادے بھی اس وقت موجود نہ تھے، اس لئے کسی پڑوسی کو کار ڈرائیو کرنے کے لئے بلا لیا گیا۔ اور ہم کچھ تاخیر سے روانہ ہوئے سامان کے لئے اسکوٹر رکشہ بلایا گیا تھا جو اس وقت تک نہ مل سکا تھا اس لئے کہ تبلیغی جماعت کا اجتماع بھی واپس ہو رہا تھا بہر حال سامان چھوڑ کر ہی ہم سب سے رخصت ہوکر روانہ ہوگئے محترم دسنوی صاحب اور نعمان خاں صاحب بھی ساتھ تھے ہمارا خیال تھا کہ ہم پنجاب میل آنے کے بعد پہونچیں گے۔ لیکن ہم اسٹیشن

دو گھنٹے لیٹ تھا۔ اسٹیشن پر محترم جمیل صاحب (علیگ) بھی ہمیں رخصت کرنے اس سردی میں آ گئے تھے۔ ہم نے لاکھ لاکھ کوشش کی محترم دسنوی صاحب جناب نعمان خاں اور جمیل صاحب واپس چلے جائیں لیکن یہ حضرات اپنے خلوص بے پایاں کے تحت ہمارے ساتھ ہی رہے اور جب تک ہم پنجاب میل میں بیٹھ کر بھوپال سے رخصت نہ ہو گئے، موجود رہے۔

دسنوی صاحب اور نعمان خاں صاحب کی کوششوں سے کوپے مل گیا تھا اس لئے ہم آرام سے بستر لگا کر لحافوں میں لیٹ گئے۔ میں دیر تک ارباب بھوپال خصوصاً دسنوی صاحب اور مسعود صاحب کی پر خلوص میزبانی کے متعلق سوچتا ہوا سو گیا۔ صبح مناڑ جنکشن میں ہوئی۔

چائے اور ناشتہ سب کچھ مس رعنا مسعود سلمہا نے ساتھ کر دیا تھا۔ ہم نے چائے پی ابلے انڈے اور بسکٹ کھائے سامنے ہی اسٹال پر کافی بن رہی تھی میں نے دو کپ کافی کے لئے۔ بے حد نفیس تھی۔ اسٹیشنوں پر ملنے والی اشیاء میں یہ پہلی چیز تھی، جو اپنا معیار کے ساتھ فروخت کی جا رہی تھی۔ مناڑ سے گاڑی چلی تو ناسک روڈ اور دیولالی وغیرہ پر رکتی ہوئی اگت پوری پہونچی یہ پہاڑی اسٹیشن مجھے بے حد پسند ہے۔ میں ٹرین سے اتر کر وہاں کے قدرتی مناظر کو دیکھتا رہا۔ یہیں سے دلفریب مناظر کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ برسات میں تو میں اسے ثانی کشمیر سمجھنے لگتا ہوں۔ ویسی ہی حد نگاہ تک نظر آنے والی سرسبز وادیاں، ویسے ہی جھرنے اور بہتے ہوئے چشمے، اس خشک موسم میں بھی ان بھاگتے ہوئے مناظر سے نظریں ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

۱۲ بجے ٹرین دادر یارڈ میں داخل ہوئی۔ منزل جتنی قریب ہوتی جاتی ہے، مسافر کی بے چینی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ آن واحد میں پلیٹ فارم آ گیا۔ رفتار سست ہوئی۔ پلیٹ فارم پر میری لخت جگر نجم السحر اور اسمیٰ سب سے پہلے نظر آئیں۔ اس کے بعد منصور، سلیم، ندیم، شمیم، مناظر اور بدر الزماں تیزی سے آتے ہوئے دکھائی پڑے۔ ٹرین کے رکتے ہی میں نے اتر کر نجم السحر اور اسمیٰ کو گلے لگایا اور سب سے بغلگیر ہوا۔ اسی وقت عزالدین نجم السحر کی نومولود بچی کو لئے قاسم بھائی کے ساتھ آ گئیں۔ میں نے آفریں کو پیار کیا۔ قاسم بھائی سے گلے ملا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ میں دادر سے پہلے "انجور" جا کر مظفر میاں کو دیکھوں گا، لیکن یہ معلوم ہو کر بے حد خوشی ہوئی کہ بفضلہ تعالیٰ وہ اب بہتر ہیں اور فیکٹری گئے ہیں۔ اسٹیشن بھی آنے والے تھے مگر کسی وجہ سے نہ آ سکے تھے۔ اس لئے ہم سیدھے باندرہ چلے گئے۔ کھانا تیار تھا، ہم سب نے کھانا کھایا۔ ندیم میاں منصور سلمہٗ کے ساتھ فوراً ہی پھر اسٹیشن گئے۔ پروگرام کے مطابق مسز چترویدی، بمبئی لکھنؤ ایکسپریس سے اسی روز بمبئی پہونچ رہی تھیں۔ ایک گھنٹے بعد وہ بھی آ گئیں۔

شام ہوتے ہی میں منصور سلمہٗ کے ساتھ انجور پہونچ گیا۔ مظفر اور مناظر کے بال بچوں نے مجھے گھیر لیا۔ سب ہی کو میرے آنے کی خوشی تھی۔ مظفر میاں کو صحت مند دیکھ کر مجھے جو مسرت ہوئی وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ انھیں دیکھ کر مرحوم منظور صاحب کی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ داڑھی نے مظفر کی صورت ہو بہو باپ جیسی ہو گئی ہے۔ ہم سب دیر تک پر مسرت ماحول میں باتیں کرتے رہے۔ مظفر میاں نے کھانے کے لئے بے حد اصرار کیا، لیکن نجم السحر سے کہہ دیا تھا کہ کھانا تمہارے ساتھ کھاؤں گا اس لئے ۹ بجے میں باندرہ چلا گیا۔

کھانے کے بعد دیر تک نجم السحر کی نومولود بچی کو گود میں لے کر کھلاتا رہا۔ ابھی تک اس کا نام نہیں رکھا گیا تھا متعدد نام میں نے لکھ کر بھیجے تھے، سب سے زیادہ مجھے "آفریں" نام پسند تھا اس لئے میں اسے اسی نام سے مخاطب کرتا رہا۔

۳۰ دسمبر۔ رات سکون سے گذری۔ تمام دن اسمیٰ، کاشف اور آفریں سے دلچسپی لیتا ہوا آرام کرتا رہا۔ شام کو قاسم بھائی اور بچوں کے ساتھ بہن تہذیبہ خانم صاحبہ اور بہن طاہرہ بیگم صاحبہ سے ملنے گیا۔ ان کا قیام بمبئی ہی میں تھا۔ طاہرہ بہن کے شوہر قدیر صاحب اور تہذیبہ خانم صاحبہ کے فرزند ارجمند بابو میاں بھی موجود تھے۔ بہن تہذیبہ خانم صاحبہ نے میرے لئے عجوہ کھجور منگا کر رکھی تھی، وہ عنایت فرمائی۔ حرمین سے بہنوں کو یاد ہو گا کہ وہ عجوہ کھجوریں بھی بہن موصوفہ ہی نے عنایت فرمائی تھیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے میرے لئے باعث شفا بنی تھیں، اور جنہیں کھانے کے بعد سے مجھے دمہ کی تکلیف سے اب تک نجات

حاصل رہی ہے کچھ دیر بیٹھ کر پھر حاضری کا وعدہ کر کے ہم رخصت ہوئے تو چوپاٹی اور میرین ڈرائیو کی سیر کرتے ہوئے گیٹ وے آف انڈیا گئے۔ ۹ بجے واپس آکر کھانا کھایا۔ رات کے بارہ بجے تک ہم سب ساجدہ بہن (نجم السحر سلمہا کی خوش دامن اور قاسم بھائی کی شریک حیات) سے باتیں کرتے رہے۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء۔ آج سال کا آخری دن ہے۔ عزیزی رشما سلمہا کے دولھا پاشا میاں بھی آگرہ سے آگئے تھے۔ ناشتہ ہم نے شمیم سلمہٗ اور پاشا میاں کے ساتھ کیا۔ پاشا کو اپنے کام سے بمبئی جانا تھا اس لئے میں عزالہ، بہن ناہید اور چتر ویدی دیدی بھی انھیں کے ساتھ ہو لئے۔

ہم سب بھنڈی بازار میں اترے۔ میں سلطان کمپنی چلا گیا۔ اور عزالہ وغیرہ خریداری کرنے نل بازار کی طرف چلی گئیں۔ تین بجے ہم سب نے باندرہ واپس آکر کھانا کھایا۔ میں حسب عادت لیٹ گیا۔ شام کو اٹھا تو معلوم ہوا کہ محترم منیر خاں صاحب کی بیگم صاحبہ اور محترمہ ستارہ بہن صاحبہ ملنے تشریف لائی ہیں۔ بیگم صاحبہ منیر خاں صاحب سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ ستارہ بہن سے پہلی ہی ملاقات تھی۔ نجم السحر سلمہا نے موصوفہ کا غائبانہ تعارف خطوں کے ذریعہ کرا دیا تھا۔ مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ بہن ستارہ صاحبہ انجمن اسلام کے کسی اسکول میں لکچرر ہیں ان سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ بہت سی خوبیوں کی مالک ہیں۔ جس کا ذکر آگے کروں گا۔

اسی وقت قاسم بھائی کے عزیز دوست مسٹر راہانجم صاحب چیف رپورٹر پی۔ ٹی۔ آئی تشریف لائے۔ موصوف سے پہلے بھی میری ملاقات ہو چکی تھی۔ بڑے ہی دلچسپ انسان ہیں۔ انداز گفتگو اتنا متاثر کن ہے ان کا کہ جس سے جو کام چاہیں کرا لیں۔ قاسم بھائی کے تعلق سے مجھے بھی چاہتے ہیں اور آج خصوصیت سے مجھ سے ملنے ہی آئے تھے۔

یہ رات منچلوں کے لئے بمبئی میں ایک ایسی رات ہوتی ہے جس کا سال بھر انتظار کیا جاتا ہے، لیکن میں ہنگاموں سے بیزار [illegible] اس لئے کبھی اس سے لطف اندوز نہ ہو سکا [illegible] اختتام سال اور آمد سال نو کا پروگرام دیکھتا رہا جو اس سال نہایت ہی دلچسپ تھا۔ ۱۹۸۱ء کو الوداع کہنے کے بعد میں سو گیا۔

یکم جنوری ۱۹۸۲ء کی پہلی صبح نجم السحر سلمہا کے کمرے میں ہوئی اور سب سے پہلے میں نے منصور سلمہٗ کی صورت دیکھی خدا کرے یہ سال ساری دنیا کے لئے مبارک ثابت ہو۔ ۱۹۸۱ء میرے لئے بڑا ہی مبارک ثابت ہوا تھا۔ اللہ نے دوبارہ زندگی بخشی اسی سال ادارہ علم وادب لکھنؤ کی جانب سے جون میں میرا جشن منایا گیا۔ ۱۲ر نومبر کو اللہ پاک نے مجھے ایک اور نواسی عطا فرمائی۔ دسمبر میں بھوپال گیا جہاں مجھے عزت بخشی گئی۔ ۲ سال بعد میں نے بمبئی کا سفر کیا۔

اسمیٰ سلمہا کو پکنک منانے کا بہت شوق ہے۔ آج ان کے اسکول میں تعطیل تھی۔ کئی روز پہلے ہی سے پکنک کا پروگرام بنوا رہی تھیں بڑے انتظامات تھے۔ جس کی دیکھ بھال وہ خود ہی کر رہی تھیں۔ دس گیارہ بجے قریب فاکس دیگن پر سامان بار کیا گیا۔ نوکر چاکر سب ہی سوار ہو گئے۔ منصور اور سلیم سلمہٗ فیکٹری میں تھے اس لئے کہ فیکٹری کھلی تھی۔ ہم پہلے فیکٹری گئے۔ تاکہ مسز چتر ویدی کو فیکٹری دکھا دیں۔ وہ پہلی بار بمبئی آئی تھیں۔ فیکٹری کی سیر کرنے کے بعد ہم لوگ سلیم سلمہٗ کو لے کر نیشنل پارک کی جانب روانہ ہو گئے۔ نیشنل پارک سے پہلے وہار جھیل کے کنارے پکنک اسپاٹ ہے۔ یہیں ہم سب نے ڈیرا ڈال دیا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا اس لئے فوراً ہی کھانا شرو[illegible] انواع واقسام کی چیزیں تھیں نہ جانے کیوں پکنک میں ہر چیز [illegible] بالا ہو جاتی ہے۔ اسی وقت منصور سلمہٗ بھی آگئے۔ کھانے کے بعد میں اور قاسم بھائی آرام کرسی پر لیٹ گئے۔ بچے اور جوان جھیل کے کنارے چلے گئے۔ ۴ بجے کے قریب چلنے کا دور ہوا۔ سامان نوکروں نے سمیٹا۔ گاڑی پر بار کیا اور ہم سب نیشنل پارک سے گذرتے ہوئے آبزرویشن پوائنٹ گئے۔ یہ جگہ مجھے بمبئی میں سب سے زیادہ پسند ہے۔ یہاں کی باغبانی اور صفائی ستھرائی دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

۲ جنوری ۱۹۸۲ء۔ آج شمیم سلمہٗ کی واپسی ہے۔ [illegible] گھبراہٹ دیکھنے کے قابل تھی۔ کل ہی رات [illegible] ہو رہا تھا۔ جلدی جلدی ہم نے ناشتہ کیا اور پاشا کے ساتھ [illegible]

ہم اپنا سامان لے کر پاشا کے ساتھ ہی اسٹیشن گئے۔ میری طبیعت ٹھیک نہ تھی لمبا پین ہوگیا تھا ایک عرصے کے بعد چلنا پھرنا دشوار ہوا تھا اس لئے انھیں رخصت کرنے بھی نہ جا سکا مظفر میاں کے ساتھ لیٹا ان کے گھر بلیو فلم دیکھتا رہا۔

۳ر جنوری۔ آج کمر کا درد بڑھ گیا ہے اس لئے لیٹا ہی رہا۔ دوپہر کو قاسم بھائی کے فیملی ڈاکٹر مسز مہتہ تشریف لائے حال معلوم کر کے دوائیں دیں۔

شام کو منیر خاں صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی جنرل منیجر ویسٹرن ریلوے مع بیگم صاحبہ کے تشریف لائے۔ آج اتوار کی وجہ سے ٹی۔وی پر سہراب مودی کا لازوال فلم پکار دکھایا گیا۔ اسی دوران پاشا کے ہم پیشہ اور دوست مجھ سے ملنے آئے افسوس کہ مجھے نام یاد نہ رہا۔ فلم کے بعد کھانا ہوا۔ منیر صاحب رخصت ہوگئے۔

۴ر جنوری۔ قاسم بھائی سلیم اور پاشا کے ساتھ ناشتہ کیا پاشا میاں آج آگرہ واپس جانے والے ہیں۔ مسز چترویدی اپنی کسی عزیزہ سے ملنے پورے دلی گئی ہیں۔ آج سلیم فیکٹری نہیں گئے انھیں پاشا میاں کو پہونچانے جانا تھا۔ میں بھی انھیں کے ساتھ بمبئی کے لئے روانہ ہوگیا۔ پاشا میاں کو اپنے دوست سے ملنا تھا ان کا قیام باندرہ کے "سی راک" ہوٹل میں تھا جو چند سال قبل ہی تعمیر ہوا ہے اور جس کا شمار اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔ زیر زمین اس کا کلب ہے اور آخری منزل پر ایک ردا ونگ (گھومتا ہوا) رسٹارینٹ ہے۔ چند منٹ پاشا ہوٹل میں رکے اس کے بعد وہ ہمیں اکور چھوڑ کر چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا مظفر مناظر اور ان کے بال بچوں کے ساتھ کھایا۔ حسب معمول لیٹا رہا۔ کمر کا درد کم ہوگیا تھا۔ ۳ ½ بجے تنویر میاں کو لے کر مہتہ مارکیٹ گیا چار جٹ کے تھان خریدے اور واپس آگیا۔

سلیم میاں بھیونڈی حسب پروگرام ۵ بجے آگئے تھے مگر میں ۷ بجے واپس ہوا، وہ چلے گئے۔ اسی دوران علی گڈھ کے مشہور صناع ظفر صاحب آگئے، جن کے مشورے سے مظفر میاں نے چند سال قبل ایک نئی فیکٹری قائم کی ہے جو موٹروں کے پینڈل اور [illegible] بناتی ہے۔ ہم سب نے ساتھ ہی کھانا کھایا اس کے بعد [illegible] اپنی کار پر لے کر باندرہ گئے۔ ظفر صاحب کو "بلیو فلیم" میں اتار کر مجھے قاسم بھائی کے یہاں پہونچا دیا۔

۵ر جنوری۔ طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ تمام دن آرام ہی کرتا رہا

۶ر جنوری ۱۹۸۲ء آج بہن ناہید اور مسز چترویدی کا پروگرام ہوائی جہاز سے گوا جانے کا ہے۔ منصور سلمہٗ ۱۱ بجے اپنی کار پر گھر آگئے اور انھیں لے کر ہوائی اڈے پہونچایا۔ میں بھی ساتھ تھا ہوائی جہاز کے جانے کے بعد میں مظفر میاں کے پاس اکور چلا گیا۔ آج رات میں بہن تہذیبہ خانم صاحبہ کے یہاں ہماری دعوت تھی۔ ۸ بجے قاسم بھائی سب کو لے کر وہیں آگئے۔ بہن "صوفہ" کا مکان اکور کے قریب ہی ہے اس لئے میں بھی چلا گیا۔ اس خاندان کی مہمان نوازی مشہور ہے بلکہ اگر یہ کہوں کہ یہ سب کی ہابی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مرغ کا اسٹوان کے دسترخوان کی جان ہوتا ہے۔ مجھے بے حد پسند ہے۔ کھانے میں وہ بھی شامل تھا کھانے سے فارغ ہو کر میں بہن تہذیبہ خانم صاحبہ اور طاہرہ بیگم صاحبہ سے ملنے اندر گیا۔ کچھ دیر باتیں کر کے ہم سب واپس ہوگئے

۷ر جنوری ۱۹۸۲ء۔ صبح ناشتہ قاسم بھائی کے ساتھ کیا۔ ۱۱ بجے مظفر میاں نے اپنی گاڑی بھیجدی۔ پہلے میں سلطان کمپنی گیا۔ سلیمان صاحب سے کاروباری باتیں کرتا رہا۔ ایک بجے بہن تہذیبہ خانم کے شوہر محترم انصاری صاحب سے ملنے منشی کمپنی محمد علی روڈ گیا۔ موصوف سے ابھی تک ملاقات اس سفر میں نہ ہو سکی تھی۔ انصاری صاحب منشی ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ بڑے علم دوست، مخلص، مہمان نواز اور مخیر انسان ہیں۔ اللہ پاک ان کی عمر میں برکت دے۔ انصاری صاحب سے رخصت ہو کر اکور پہونچا۔ سب کے ساتھ کھانا کھایا اور لیٹ گیا ۴ بجے کے قریب بچوں کے مشہور ادیب اور نسیم بکڈپو کے آرٹسٹ بختیار سعید کے بھائی محمد یوسف انصاری مالیگاؤں سے خاص طور پر مجھ سے ملنے آئے تھے۔ باندرہ فون کرنے پر انھیں علم ہوا کہ میں اکور میں ہوں۔ یہ ان کی قیام گاہ سے قریب تھا اس لئے اپنے میزبان ایم عبداللہ صاحب دیوبندی کے ہمراہ تشریف لائے۔ ایم عبداللہ صاحب حریم کے پرانے خریدار ہیں ان کا قیام بمبئی اور دیوبند دونوں جگہ رہتا ہے۔ مجھ سے بے حد عقیدت رکھتے ہیں جس کا ثبوت یوں ملا کہ موصوف نے [illegible]

ایک شیشی مجھے پیش کی جو برسوں ان کی یاد دلاتی رہے گی۔

قبل مغرب میں مظفر و مناظر کے ساتھ قبرستان گیا۔ بھائی منظور الزماں مرحوم اور ان کی شریک حیات بہن سلطان جہاں کی قبور پر فاتحہ پڑھ کر پھر الکور آیا۔ مظفر میاں کو اتار کر میں مناظر سلمہٗ کے ساتھ میرین ڈرائیو وغیرہ کی سیر کرنے چلا گیا۔ واپسی میں کھانا الکور ہی میں کھایا۔ ۱۱ بجے واپس باندرہ پہونچا۔

۸ جنوری۔ آج کمر کا درد بڑھ گیا ہے۔ عرصہ سے مجھے جلدی کینسر ہے اب اس میں تکلیف بڑھ گئی ہے۔ اس لئے سلیم کیساتھ اسلم فقیہہ صاحب کی فیکٹری گیا تاکہ انھیں ساتھ لے کر ڈاکٹر فقیہہ صاحب کے پاس جاؤں جو ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ کے مشہور سرجن اور اسلم صاحب کے سگے بھائی ہیں۔ اسلم صاحب کے قاسم بھائی اور بدر الزماں سے خاص تعلقات ہیں اس لئے مجھے بھی جانتے ہیں وہ فوراً ہی میرے ساتھ ٹاٹا اسپتال گئے اور مجھے ڈاکٹر فقیہہ صاحب نے فوراً ہی دیکھ کر مشورہ دیا کہ میں اس کا آپریشن کرا لوں۔

۸ بجے ہم سب منیر خاں صاحب کی قیام گاہ ریسٹ باندرہ گئے اور شاندار دعوت اڑائی۔ ہم لوگوں کے علاوہ بہن ستارہ صاحبہ بھی تھیں۔

۹ جنوری ۸۲ء میں بہن ہوشیار جنگ صاحبہ کا نیا پتہ لانا بھول گیا تھا۔ ان سے ملنے کے لئے بے قرار تھا۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ خود بہن صاحبہ نے ہی ۸ جنوری کو فون کیا۔ موصوفہ کی رہائش کا پتہ بھی معلوم ہو گیا، اس لئے ناشتہ کے بعد میں منصور سلمہٗ کے ساتھ جو ہو گیا۔ بہن بیگم جنگ کا یہ فلیٹ ایسی پرفضا جگہ واقع ہے کہ وہاں سے آنے کو دل نہ چاہتا تھا کاش یہاں بیٹھ کر میں ناول لکھ سکتا۔ بہن جنگ صاحبہ حریم کی دیرینہ پرستار ہیں۔ موصوفہ کے خلوص و محبت کا کیا بیان کروں، وہ مجھے سگا بھائی سمجھتی ہیں۔ ان کی صاحبزادی پاشا اور نواسی افشاں سلمہا سے بھی ملاقات ہوئی۔ چائے پی کر جلدی رخصت ہو گیا۔

جوہو روڈ ہی پر جناب مجروح سلطان پوری بھی رہتے ہیں بمبئی جاتا ہوں تو موصوف سے بھی مل لیتا ہوں۔ فون نمبر نوٹ نہ تھا اس لئے بلا پروگرام ہی پہونچ گیا۔ بارے ملاقات ہو گئی کسی فلمی کہانی میں مصروف معلوم ہوتے تھے۔ پھر بھی بخندہ پیشانی ملے۔ وہاں سے رخصت ہو کر جناب وجاہت مرزا چنگیزی کی عیادت کو گیا۔ کسی زمانہ میں موصوف کا فلمی دنیا میں طوطی بولتا تھا، لیکن اب میری ہی طرح دمہ میں مبتلا، صاحب فراش ہیں۔ مرزا صاحب نے چڑیا چڑے کی اس کہانی کو منظوم کیا ہے جو کبھی دادیاں اور نانیاں سنایا کرتی تھیں۔ میں اسے شائع کرنے کیلئے لایا ہوں۔ دلچسپ کتاب ہو گی بچوں کے لئے۔ عجوہ کھجور کا نسخہ میں نے مرزا صاحب کو بھی بتایا ہے۔ خدا کرے کہ انھیں بھی اس سے فائدہ پہونچے۔

ایک بجے واپس آیا۔ کھانا کھا کر لیٹ رہا۔ ۳ بجے طاہرہ بہن سے رخصت ہونے گیا اس لئے کہ وہ ۱۰ جنوری کو پونہ جانے والی تھیں۔ ان سے اور قدیر بھائی سے مل کر میں الکور چلا گیا تاکہ کچھ وقت اور مظفر میاں وغیرہ کے ساتھ گذار لوں۔ غزالہ مس ناہید، مسز چتر ویدی اور ندیم وغیرہ مارکٹنگ کرنے گئے تھے وہ سب بھی الکور ہی آ گئے تاکہ سب سے مل کر رخصت ہو لیں۔ وہاں سے ہم سب ستارہ آپا کے یہاں گئے۔ انھوں نے کھانے پر بلایا تھا۔ ہم سب نے لاکھ کوشش کی کہ وہ ہماری دعوت نہ کریں، لیکن انھیں دعوتیں کرنے کی ہابی ہے۔ تنہا زندگی گذارتی ہیں اور لے دے کر صرف یہی ایک شوق ہے انھیں۔ دعوتیں کرنے کے بہانے تلاش کرتی رہتی ہیں۔

ہم تاخیر سے پہونچے تھے دعوت تو صرف ہماری ہی کرنا مقصود تھی، لیکن انھوں نے اپنے تمام اعزہ اقربا کو مدعو کر رکھا تھا اور سب ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ چھوٹا سا فلیٹ ہے۔ لیکن ستارہ آپا کا دل بہت بڑا ہے۔ ڈرائنگ روم ہی میں میز پر کھانے کی ڈشز لگی ہوئی تھیں۔ ان کی لذت کا علم تو کھانے کے بعد ہوا، لیکن ان کی سجاوٹ ایسی تھی کہ میں یہ سوچنے لگا کہ ان ڈشز کو چمچوں سے برباد کیسے کیا جا سکے گا۔ یہ تو ایسی ہیں کہ انھیں دیکھتا ہی رہا جائے۔ ہزاروں دعوتیں میں نے کھائی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی سجاوٹ میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ میں تو بمبئی کی لڑکیوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ یہ فن ستارہ بہن سے ضرور سیکھیں اور ستارہ بہن سے یہ کہوں گا کہ وہ اس کا کوئی کلاس کھول دیں۔ ابھی نہ سہی تو ریٹائر ہونے کے بعد ضرور ایسا ہی کریں۔ جگہ کی تنگی کے باعث ڈنر بوفے

تک ایک کا تھا۔ عزالہ اور نجم السحر نے پردہ کرنے کی وجہ سے بیڈ روم کو ڈرائنگ روم بنا لیا تھا۔ بہن ساجدہ اور ناہید صاحبہ بھی انھیں کے پاس چلی گئیں۔ کھانا بے حد لذیذ تھا اور ستارہ بہن کے کھلانے کا انداز۔ کیا کہوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ پلیٹوں میں کھانوں کے بجائے اپنا خلوص اور محبت انڈیل رہی ہیں۔

۱۰ جنوری۔ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آج تمام دن آرام کرونگا اور رات میں کھانا نہ کھاؤں گا۔ لیکن اچانک بدرالزماں میاں آگئے جو اس کے دوسرے ہی روز کلکتہ چلے گئے تھے، جس روز میں بمبئی آیا تھا۔ اب انھوں نے ضد کی کہ شام کو میں ان کے ساتھ کھانا کھاؤں، لیکن اول تو اس رات میں کچھ کھانا ہی نہ چاہتا تھا، اور پھر دعوت کا کھانا۔ بہرحال جب بدر میاں نے بہت مجبور کیا تو میں نے کہا کہ صرف اس شرط پر کھاؤں گا کہ صرف ارہر کی دال روٹی ہو۔

۸ بجے ہم بلیو فلیم گئے اس کی آٹھویں منزل سے سارے بمبئی کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ کھانا دعوتی ہی تھا لیکن ارہر کی دال بھی تھی اور میں نے صرف وہی کھالی اور جلد ہی رخصت ہو کر قاسم بھائی کے یہاں آگیا۔ سامان سفر درست کیا اور سو رہا۔

۱۱ جنوری۔ ناشتہ کے بعد ہی منیر خاں صاحب مع بیگم صاحبہ کے ہمیں رخصت کرنے آئے۔ عزیزی نجمہ، خالدہ اور معین صاحب بھی الوداع کہنے آئے۔ منیر خاں صاحب ہمارے ساتھ ہی وی۔ ٹی تک تشریف لائے۔ یہاں مظفر، مناظر اور انکی دلہنیں بھی موجود تھیں۔ قاسم بھائی، منصور، سلیم، ساجدہ بہن نجم السحر سب ہی تھے صرف اسمی نہیں آئی تھیں وہ اپنے اسکول چلی گئی تھیں یہ کہہ کر کہ ہمیں نانا نانی کو جاتے دیکھ کر بہت رونا آئے گا۔ میں سب سے مل ملا کر باچشم تر رخصت ہوا اور دوسرے روز لکھنؤ پہونچ گیا۔

نسیم انہونوی

فارم ۴ (قاعدہ ۸)

۱۔ مقام اشاعت ۔	۲۵۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
۲۔ وقفہ اشاعت ۔	ماہوار
۳۔ پرنٹر کا نام ۔	ایس۔ ایم۔ فہیم انہونوی۔ ہندوستانی
۴۔ پبلشر کا نام ۔	〃 〃 〃
پتہ	کاشانہ فہیم۔ گیٹ ملکہ گنجینی لکھنؤ
۵۔ ایڈیٹر کا نام	ایس۔ ایم۔ نسیم انہونوی
پتہ	کاشانہ فہیم۔ گیٹ ملکہ گنجینی لکھنؤ
۶۔ مالکان کے نام	۱۔ ایس ایم فہیم انہونوی
	۲۔ شوکت جہاں بیگم

میں ایس۔ ایم فہیم انہونوی تصدیق کرتا ہوں کہ میرے علم و یقین میں مندرجہ بالا باتیں صحیح ہیں۔ ایس ایم فہیم انہونوی

۲۲ر فروری سنہ ۱۹۸۲ء

افسانہ

روشنی کا مینار

عفت موہانی

محسوس کر کے اس کے دل پر ایک دھکا سا لگا کہ آج کے بعد وہ یہ گھر اور یہ شہر نامعلوم مدت کے لئے چھوڑ جائے گی۔ جب ایک قیدی کو اپنی تنگ و تاریک کوٹھری سے محبت ہو جاتی ہے تو پھر یہ تو اس کا اپنا گھر تھا۔ جہاں وہ بیاہ کے بعد نئی نئی آئی تھی۔ لیکن اس طرح آسودہ نظر آتی تھی جیسے بغیر کسی جادہ پیمائی کے اپنی محبوب منزل تک آ پہنچی ہو۔

منزل ...... جس کے خواب اس نے کبھی دیکھے تھے۔ ان پریشان خوابوں کی اس نے کبھی دل خوش کن تعبیریں ڈھونڈنے کی ناکام کوششیں نہیں کیں۔ وہ جانتی تھی، سبھی خوابوں کی تعبیریں نہیں ہوتی۔ بعض خواب پریشان بھی ہوتے ہیں۔ مگر منزل ہی کی طرح اسے اپنے بھولے ہوئے خوابوں کی تعبیر اقبال کے پیکر محسوس میں ملی۔ تو وہ سمجھ نہ سکی۔ اپنی خوشیوں کے اظہار کا کون سا پیرایۂ اختیار کرے۔ اس ننھے بچے کی طرح بوکھلانے لگی جیسے کسی نے دفعتہً بن مانگے من چاہا کھلونا دے دیا ہو۔

اقبال کی محبت میں کھو کر وہ خود کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن وہ اسے پہلے ہی دن سے بے پناہ سنجیدہ اور افسردہ سے محسوس ہوئے۔ اپنے آپ میں کھوئے ہوئے۔ جیسے اپنی کوئی قیمتی چیز کہیں رکھ کر بھول گئے ہوں۔ اس نے انھیں تنہائی میں آہیں بھرتے ہوئے دیکھا تھا اور نامعلوم سی رقابت کا ننھا سا شعلہ اس کے دل میں جل اٹھا تھا۔ ویسے جب وہ پاس ہوتے تو اپنے مہکتے ہوئے پیار میں اس کا وجود بسا دیتے۔ وہ ان کی اداسی سے مضطرب ہو اٹھتی! ایسا کون سا دکھ ہے جس نے انھیں بے قرار کر رکھا ہے۔ وہ گورنمنٹ سروس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ دولت قدم چوم رہی تھی۔ کئی سال کا ان دیکھا لیکن پسندیدہ جیون ساتھی ملا ہے۔ پھر کیا بات ہے؟ کئی بار وہ بھی دکھی ہو گئی۔

"آپ کیا سوچتے رہتے ہیں؟ کیا کوئی ایسی بات ہے جو آپ مجھے بتانا نہیں چاہتے!" اس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ سیاہ دراز پلکوں پر شبنم کے تارے چمکتے ہوئے اقبال نے دیکھ لئے۔

"نہیں ...... نہیں ...... عزیزہ! ایسی کوئی بات نہیں! بے بنیاد باتیں نہ سوچا کرو خواہ مخواہ اداس ہوتی ہو"

شادی کے بعد دو مہینے یوں گزر گئے جیسے کسی دلکش کتاب کے ورق الٹتے چلے جائیں اور اب اقبال کے ساتھ وہ فارن جا رہی تھی۔

نہ جانے پھر کب یہاں آنا ہو۔ آبھی سکے گی یا نہیں۔ ماں باپ سے نامعلوم مدت کے لئے جدائی کا تصور اس کے لئے کربناک تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اس سے رخصت ہوئے تھے۔ ابا کی بوڑھی آنکھوں میں یوں نمی جھلک رہی تھی۔ جیسے اندھے کنویں کی گہرائی میں پانی! امی نے گلے لگا کر چوم لیا تھا۔ اور اسے اپنی شادی کا دن یاد آ گیا تھا۔ کون سی آنکھ تھی جو پرنم نہ تھی۔ عزیزہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بابل کا آنگن چھوڑ کر پی کے نگر جا رہی تھی! وہ گھر ہمیشہ کے لئے چھٹ رہا تھا جہاں اس نے جنم لیا تھا۔ گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا۔ نیم کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں تلے نکوئیوں کی ہنڈکلیاں پکاتی تھی اور جب نیم کے سفید ننھے ننھے پھول ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے اس پر نچھاور ہوئے تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا، شباب کی پہلی کرن مسکراہٹ کا روپ دھار کر لبوں پر بکھر گئی۔

بہار آ گئی۔

اور جوانی کے شوخ و شریر چنچل احساس نے اس کے انگ انگ میں مٹھاس بھر دی۔ اپنے آپ انجانی راہوں پر قدم اٹھاتے وہ پیار کے دیس آ پہونچی۔ جہاں کے راستے انگ سے منزل بنی تھی۔ پھر ایک سنگی ساتھی نے اس کی کلائی تھام لی اور اپنی راہ پر لے کر چلا گیا۔

پھر پچھلے ساتھ چھوٹے، ناطے ٹوٹے ...... اور بے اختیار اسے اپنی ایک ہمدرد ساتھی کی یاد آئی! دل میں ایک ٹیس جاگی۔ آپا وہ سب سے مل چکی ہے اور آج ہی اپنی چہیتی پروفیسر عذرا جمیل

سے نہیں مل سکی۔ جن کی پراسرار زندگی سے اور گھر میں چھپے ہوئے ماضی سے اسے محبت تھی اور دلچسپی بھی..... جنھوں نے اس کی زندگی میں قدم قدم پر اپنی مسکراہٹوں کے چراغ جلائے تھے۔ آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا تھا.... لیکن جن کی زندگی میں تاریکی تھی اور آنسوؤں کی دھند میں آگے کے راستے ڈوب گئے تھے۔

عنیزہ کی نگاہیں دور بہت دور پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر بھٹکی ہوئی تھیں۔ آفتاب کی زرد زرد روشنی برف پر زرباری کر رہی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ اداس ہوتی گئی۔ وقت کم تھا۔ رخصت سفر چار بجے تھا۔ ابھی ابھی اقبال اپنے دوستوں سے مل کر آئیں گے اور وہ چلی جائے گی! اس کا دل اضطراب سے دھڑکنے لگا۔ نہ جانے دل پر کیا بوجھ رہ جائے گا۔ اگر پردیس میں عذرا جمیل کی یاد آئی۔

پھر وہ ضبط نہ کر سکی۔ چوکیدار سے کہہ کر کہ وہ صاحب کے آنے کے وقت تک آ جائے گی۔ دل میں دید و شنید کے لاکھوں طوفان سمیٹے جمیل کالج پہنچ گئی۔

پروفیسر مس عذرا جمیل کہیں باہر جا رہی تھیں۔ لیکن اپنے کمپاؤنڈ میں اپنی سب سے زیادہ عزیز اور پیاری شاگرد عنیزہ کو دیکھ کر حیرت و مسرت سے چیخ اٹھیں۔ اپنا پرس میز پر پھینکا۔ پھر کچھ وہ بڑھیں کچھ عنیزہ، دونوں ایک دوسرے سے مل گئیں۔

وہ خوشبو جو اچانک عذرا جمیل نے محسوس کی تھی۔ ان کے رگ و پے میں بجلی کی سرد آگ بن کر دوڑ گئی۔ ساری دنیا کی خوشبوؤں سے جُدا، ہیجان انگیز اور جذبات آفریں سہاگ کی خوشبو..... جس سے ان کا پینتیس سال کا کنوارا پن ناآشنا تھا۔ انھوں نے حیرت سے سر اٹھایا اور کچھ عجیب انداز سے عنیزہ کے شانے دبوچ لئے۔ یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ عنیزہ اپنی بے تاب صبحوں اور بے خواب راتوں کا ساتھی پا چکی ہے!! وہ عجیب سی جھینپ اور خجالت میں مبتلا تھیں۔ شادی شدہ لوگوں کا قرب ان کے لئے ناگوار ہوتا تھا۔

"ظالم کہیں کی..... جیسے وہ پڑھا چکی تھیں!

"تم بہت بے مروّت ہو!" جب وہ ڈرائنگ روم میں پاس پاس بیٹھیں تو اچانک عذرا جمیل نے عنیزہ کا گلابی گلابی رخسار اپنی انگلی میں دبا لیا اور وہ ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر سسکی ہنسی ہنس پڑی۔

"مبارک باد تو ہرگز نہ دوں گی۔ کیونکہ تم نے مجھے خبر بھی نہ کی۔" وہ شکوہ کناں لہجے میں بولیں۔ پھر مسکرا پڑیں: "میں تو تم سے خفا ہو جانے کا منصوبہ بنا رہی ہوں!"

"ایسا ستم نہ کیجئے گا، مس جمیل!" وہ جلدی سے بول پڑی: "یقین کیجئے، شادی بہت جلدی میں ہوئی۔ ان کی امّی کی حالت یکایک بہت بگڑ گئی تھی۔ کسی کو بھی بلاوا نہ جا سکا اور آج..... میں آخری بار آپ سے ملنے آئی ہوں۔ پھر آپ کہاں اور میں کہاں۔ آج ہی ہم بحرین جا رہے ہیں۔

"نہیں!" ان کی آنکھوں میں اداسی گہری ہو گئی۔ "سچ کہو!"

"یقین کیجئے۔" عنیزہ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ "میرا دل دکھتا ہے مس جمیل! اب تک مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میری مادی دوری میرے روحانی قرب پر اثر انداز نہ ہو سکے گی۔ لیکن اب یہ سوچ کر دل پر آرے چل رہے ہیں کہ نہ جانے کب تک آپ سے نہ مل سکوں گی مجھے بے حد دکھ ہے۔ آپ کی زندگی اور تنہائی کے بارے میں سوچتے ہوئے محسوس ہوتا ہے جیسے آپ حالات کے سمندر میں ہاتھ پیر مار رہی ہیں اور آپ کو تنکے کا سہارا بھی نہ ملا ہو۔

"تنہائیاں.....!" مس عذرا جمیل پھیکی ہنسی ہنس دیں: "یہ تصور کا فریب ہے عنیزہ! انسان کسی کی رفاقت کے بغیر جی نہیں سکتا۔ اور وہ بدنصیب جنھیں دنیا نے کچھ بھی نہیں دیا، اپنی انجمن الگ سجا لیتے ہیں، جہاں وہ سب کچھ ہوتا ہے۔ جس کی چاہ میں انسان انسانیت کی بلندی سے نیچے گر پڑتا ہے۔ میں نے بھی ایک زمانے میں یہ سب کچھ چاہا تھا۔ پاگل لڑکی! جو آج کل تمہاری حیات کا سرچشمہ ہے..... لیکن میں بھٹک گئی، بھول گئی ان راستوں کے پیچ و خم جو دل کی منزل تک مجھے پہنچا سکتے۔ ہرے بھرے گلستانوں کے فریب میں نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئی جہاں سے واپسی مجھے نصیب نہ ہو سکی!"

پراسرار مس عذرا جمیل، جن کی زندگی ایک معمہ، جن کا طرز حیات ایک چیستان تھا۔ نہ جانے کون سے احساس سے مجبور ہو گئی تھیں کہ دل کے نہاں خانے میں سالہا سال سے خوابیدہ راز ان کی زبان پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ بےخودی اور خودفراموشی کا وہ عالم تھا

لمحہ جب انھوں نے سوچا تھا۔ اگر یہ آتش فشاں اندر ہی اندر کھولتا رہا تو ایک دن پھٹ جائے گا اور آتش فشاں پہاڑ یہ کب دیکھتا ہے کہ سینکڑوں بستیاں تباہ کرنے سے پہلے خود اس کی پتھر کی سی چھاتی پھٹ جاتی ہے۔

"کب جاؤ گی تم؟" انھوں نے یک بیک چونک کر پوچھا۔

"بس کل کا سورج ہمیں یہاں نہ دیکھے گا۔" وہ اپنی رلائی سے نکل جائیں گے!"

پھر چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے عنیزہ نے بڑی ہمت سے کہا "آپ کی یہ باتیں میرے وجود پر ابھرتی رہیں گی مس جمیل! اب آپ بھی اپنی زندگی کا ایک ساتھی چن لیجئے۔"

"تنہائیوں کا ساتھی؟" ہمیشہ کی طرح بات کو دہرا کر وہ پھر ہنس پڑیں۔ "وہ تو میرے پاس ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ جس کے وجود سے میں کبھی بے وفائی نہیں کرسکتی۔ خواب کی دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ یہ تعلیمی اور ادبی مشاغل کسی درد کا درماں نہیں ہیں عنیزہ! اس زنداں میں نہ صبح ہوتی ہے نہ شام۔ یہاں قبر کی سی سیلن ہے اور موت کی سی ٹھنڈک۔ دن کا سورج، باہر کی دنیا وہ کرنیں وہ صبح و شام۔ یہ سب کہاں ہیں۔ میں کہاں ہوں؟ کاش! مجھے پتہ چل جاتا وہ کہاں ہیں، کدھر ہیں، کیسے ہیں؟ اب بھی میری یادوں سے ان کے ماضی میں چراغاں ہوتا ہے یا وہ روشنی کا مینار حالات کے بھرلے کراں میں اپنی آب و تاب ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھا۔

عنیزہ کا اشتیاق بڑھ گیا۔ کیا وہ اپنا ماضی دہرا رہی تھی۔

"آپ کی باتیں راز بنتی جا رہی ہیں پروفیسر..... صاف صاف کہئے!" وہ ہزار چاہنے پر اپنے اوپر قابو نہ پا سکی۔

"صاف صاف....." انھوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور خوابناک لہجے میں بولیں۔ جیسے خود سے مخاطب ہوں! "بعض درد ایسے پیارے ہوتے ہیں جن کے آگے ساری دنیا کے درماں حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ تم وہ سب کچھ جاننا چاہتی ہو جس پر بے نام سے اسرار کا گرد پوش چڑھا ہوا ہے عنیزہ! بابا کی موت میرے ہوش کی بات نہیں ہے۔ امی کی محبت نے کبھی باپ کی شفقت کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ لیکن جب امی نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرا ساتھ چھوڑا تب احساس ہوا کہ قدرت نے میرے ہمہ گیر تبسم کا بہت ہولناک تاوان

لے لیا تھا۔ امی کی ابدی جدائی ستم انگیز تھی۔ میری چارہ گر اور غمگسار میری کلاس فیلو تھیں جنھوں نے اپنے دل پر میرے غم کو محسوس کیا تھا۔

"ان ہی میں شمہ اور ان کے بھائی بھی تھے۔ سب سے الگ سب سے جدا.....؟

شمہ میری بہت پیاری ساتھی تھی۔ جس کی محبت میں ماں کی ممتا، بہن کا خلوص اور ایک دوست کا تعلق شامل تھا اور شمہ کے بھائی جان کیسے شریف تھے۔ دونوں بہن بھائی..... جیسے وہ مجسم عظمت و رفعت ہو گئے ہوں۔ عالی ظرفی اور عالی نسبی جن کے خمیر میں تھی۔ جو سنجیدگی سے ہنستے اور وقار سے گفتگو کرتے۔ آہستہ آہستہ لہجے میں، جیسے لبوں سے نہیں دل کی زبان میں بول رہے ہوں۔ میں ان سے متاثر ہوتی گئی۔ شمہ کی شادی کے بعد ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اتنے قریب، کہ اگر چاہتے تو ایک دوسرے کے سینے پر سر رکھ کر دل کی دھڑکنیں سن لیتے۔ اس مدھر سنگیت میں اپنے آپ کو بھاپ سا محسوس کر لیتے جو تیز تیز دھڑکنیں الاپتی تھیں۔

محبت سن و سال اونچ نیچ نہیں دیکھتی۔ اب بھی نہ دیکھا کہ عمر میں ان سے پانچ منزلیں زیادہ طے کر گئی تھی! نہ انھوں نے محسوس کیا۔ میں بے چین ہوتی گئی۔ میرا پیار ایسا پیار تھا جیسے مدت کے پیاسے لبوں سے کوئی لبریز جام لگا دے! وہ اپنی محبت میں محتاط تھے۔ کچھ ایسے مجبور سے جیسے دل کچھ اور چاہتا ہو۔ جسم کچھ اور..... اور حالات کسی اور ہی دھارے پر بہا لے جائیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک کربناک سکوت گہرا ہوتا گیا۔ ہونٹوں پر کراہتے ہوئے نالے، چیختے دل کی آواز، جو قریب کرنا چاہتا تھا اور قریب..... اور وہ خود گریزاں تھے۔ میرے خوابوں کو اپنے خوابوں میں مدغم کئے وہ ایسی تعبیر کے انتظار میں تھے۔ جو خود بخود سامنے آ جائے۔ ان کا وجود میری شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ تھا۔ ہر پل ہر آن میں ان کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میری محبت میں پہاڑی ندی کا سا بہاؤ تھا۔ آتش فشاں کی سی دھیمی دھیمی رچی بسی مہک!

انھیں بھی اندازہ تھا۔ وہ بھی اسی آگ میں سلگ رہے تھے لیکن نہ جانے کونسا احساس ان کے پژمردہ لبوں پر خاموشی کی مہر ثبت رکھتا۔

ایک مرتبہ میری پلکوں پہ آنسو دیکھ کر انھوں نے کہا تھا۔

"محبت آپ کا مستقبل نہیں ہے عذرا! پیار کی راہیں آپ کو کسی منزل تک پہنچانے کے بجائے راستے ہی میں بھٹکا دیں گی۔ میں تو ہوا کا ایک جھونکا ہوں۔ اپنا پیار واپس لے لیجئے!"

اور میں نے سسکتے کراہتے، ان کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا تھا دل پیار کی مدھر راگنیاں سنا رہا تھا۔ مگر جسم تپ رہا تھا۔ ان کی بانہوں کا حلقہ میرے گرد تنگ ہوگیا بے خود و بے خبری سے انھوں نے میری گردن پر اپنے لب رکھ دیئے۔ ان کا لہجہ آنسوؤں میں ڈوب کر بھر رہا تھا۔

"عذرا مجھ بدنصیب کو تم نے جن نگاہوں سے دیکھا ہے۔ میں انھیں سرچشمۂ حیات سمجھ بیٹھا ہوں۔ تم پہلی ہستی ہو جس نے میری خشک اور ویران زندگی میں پیار کے پھول کھلائے ہیں۔ آہ! کاش یہ نہ ہوتا میں مجبور ہوں عذرا! حالات کی زنجیروں نے مجھے جکڑ رکھا ہے میں کسی اور کا ہوں۔ بہت پہلے کی بات ہے جب یہ حادثہ میری زندگی میں آیا تھا۔ میری بھی کچھ مشکلات تھیں۔ اپنے ماں باپ کے فیصلے پر میں نے سر جھکا دیا۔ اب ماں باپ نہیں ہیں لیکن وہ اٹل فیصلہ اسی طرح قائم ہے جسے توڑنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔ عذرا! زندگی کے اصول بعض وقت بندھن خاہت ہوتے ہیں۔ زندگی کے گردش کرتے ہوئے پہیئے ان میں یوں جکڑتے ہیں کہ پھر نکالے نہیں نکلتے! شاید دل بھی اسی کا ہو جاتا ہے۔ اگر تم مجھے نہ ملی ہوتیں۔ اب میں کیا کروں۔ زندہ رہوں تمہارے لئے یا مر جاؤں اپنے سکون کے لئے!

اور ان کی بانہوں میں ہوتے ہوئے میں نے خود کو ان سے اس قدر دور محسوس کیا۔ جیسے چکور کے لئے چاند!

محبت بڑی عجیب چیز ہے عنبرہ! جتنی شیریں، اتنی ہی تلخ۔ شام و سحر گردشوں میں وہ وجود لپٹا ہوا تھا۔ صبح و شام کی دلکشی اُن کے حسن سے معمور تھی۔ چاند اور ستاروں میں وہ چہرا مسکراتا ہوا دکھائی دیتا۔ میرا پاگل پن ان کا اضطراب آفریں گریز بڑھتا گیا۔ جدا امیرے بس میں نہ تھا۔ فرض محبت کے قدموں کی زنجیر بن گئی تھی۔

اور پھر.... میری ناکام زندگی میں وہ شام بھی آگئی جس نے پھر کبھی اس کی صبح کا منھ نہ دیکھا! ان کی امی سخت بیمار تھیں، ان کا جانا ضروری تھا۔

وہ مجھے دیکھ رہے تھے اور آنکھوں کا کربناک سکوت ہولناک ہوگیا تھا۔ وہ قیامت جس کا ہمیں انتظار تھا آپہنچی تھی! ہمارے درمیان آنسوؤں کی چلمن پڑی تھی۔ کچھ کہنے سننے کا یارا ہی نہ تھا۔ وہ جانتے تھے اور مجھے بھی معلوم تھا۔ اب ہم نہ مل سکیں گے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکیں گے۔ آہ! دل چاہ رہا تھا چھین لوں اپنے محبوب کو ان لوگوں کے مضبوط چنگل سے جو انھیں مجھ سے جدا کر رہے تھے۔ ہم نے محبت کی تھی! محبت کے نام پہ دھوکے دیئے تھے نہ دھوکے کھائے تھے!

لیکن جاں بلب ماں کی منتظر آنکھوں نے مجھے پتھر کر دیا! اور دوسری وہ معصوم و مظلوم ہستی، جس نے مدتوں ایک خیالی دیوتا کی دل ہی دل میں پرستش کی تھی جسے دیکھا نہ تھا لیکن جو اس کا ایمان، اس کی زندگی کا سرمایہ تھا! میں نہیں چاہتی ہوں۔ محرومی الفت کے آنسو مجھے غرق کر دیں۔ اس کی آہیں مجھے پھونک دیں۔ اسکی محبت کے کھنڈر پر میں اپنے پیار کا محل کھڑا کروں! میں جسے چاہتی تھی۔ اس کی بربادی کی خواہاں تو نہ تھی۔ میں نے انھیں واپس کر دیا ایک دیا جلایا، ایک میں نے بجھا دیا! کسی کے لئے ایثار کرنا بہت مسرت آفریں ہوتا ہے۔ محبت ایثار اور قربانی کا سبق سکھاتی ہے۔ رنگی کا نہیں!

اور یوں بے شمار آنسوؤں، لاتعداد آہوں اور جراحتوں کے بدلے مجھے دے کر چلے گئے! اُف! جو لطف دینے میں ہے وہ لینے میں کہاں؟ ہم نے عہد و پیماں کئے۔ اب زندگی کے کسی موڑ پر ہم اپنی بے چینیوں کو بڑھانے کے لئے کبھی نہ ملیں گے۔ بالکل اجنبی کی طرح پاس سے گزر جائیں گے۔ جن میں کوئی ناطہ ہوتا ہے نہ رشتہ، نہ خون کا نہ دل کا اور نہ انسانیت کا! شاید اسی طرح بے تاب دل کو قرار آسکتا۔

اور ہم پھر کبھی نہ ملے۔

سورج سے اس کی کرنیں جدا نہیں کی جاسکتیں۔ چاند سے اس کی چاندنی کوئی نہیں چھین سکتا۔ کہکشاں کا حسن کوئی لوٹ نہیں سکتا۔ بہار سے اس کی لطافتیں الگ نہیں ہوسکتیں۔ لیکن.... ہم ایک سمندر کے دو کنارے تھے۔ ایک یہاں تو دوسرا افق کی بیکراں وسعتوں میں گم....؟

مس عذرا جمیل اب خاموش تھیں۔ وہ بھی خاموش بیٹھی تھی۔ صرف دیوارگیر گھڑی کے دلکی دھڑکن سکوت کا جادو توڑ رہی تھی۔

اس کی پُرنم آنکھیں مس جمیل کے حسین اور پروقار چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ جس پر دکھ کے سائے میں عظمت و محبت کے نقوش خوابیدہ تھے۔

اس کے ذہن میں وہ مستحکم و مضبوط چٹانیں بکھر گئیں جو سالہا سال سے اپنے مقام پر ایستادہ تھیں۔ چٹانیں جن کا ایک مقام ہوتا ہے۔ جو اٹل ہوتی ہیں لیکن ان پتھروں کا بھی دل ہوتا ہے، جن میں پیار کا چشمہ ترنم بکھیرتا نہ جانے کہاں سے پھوٹتا ہے اور نہ جانے کہاں تک بہتا چلا جاتا ہے!

عنیزہ کی محبت عقیدت سے بدل گئی۔ پراسرار مس عذرا جمیل جو ہمیشہ غالب کا سمجھ میں نہ آنے والا شعر بنی رہتی تھیں (یہی تشریح کے بعد زیادہ پیاری معلوم ہونے لگی تھیں)۔ وہ اسے ایک آسمانی مخلوق معلوم ہو رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر محبت کا نور اور ایثار کا حسن چھایا ہوا تھا اسے تو آج معلوم ہوا وہ کیا تھیں؟

عنیزہ نے چپکے سے آنسو پونچھے اور مس عذرا جمال اس کے تاثر پر پھر ہنس پڑیں۔

"محبت بادہ تلخ ہے عنیزہ! اس کا سرور اس کے خمار سے بڑھ کر اذیتناک ہے لیکن محبت کی ناکامی ہی میں اس کا سارا حسن پوشیدہ ہے اور پھر اس جہانِ خراب میں زندہ رہنے کے لئے کچھ جانی بوجھی غلطیاں بھی ہونی چاہئیں۔ مگر ایک غلطی۔ آہ! جس کی تلافی نہیں خلش بن کر ابھرتی ہے۔ ہم نے یہ عہد کیوں کیا تھا کہ پھر کبھی زندگی میں نہ ملیں گے!!"

اب اپنے ہاتھ سے دامن ضبط چھوٹنے پر مس عذرا جمیل بھی ہنسنے لگیں۔ کچھ شرمندگی، کچھ درماندگی! وقت کے پل بھاگ رہے تھے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"شکوہ تو نہ کرو گی کہ فضول باتوں میں وقت گنوایا۔ مگر تم جانو عنیزہ! آج میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ محبت بغیر رازدار کے پھیکی معلوم ہوتی ہے۔"

"لیکن یہ کیسا راز ہے کہ آپ نے اپنے محبوب کا نام بتایا نہ درشن کرائے۔۔۔!"

"دیکھو گی؟" انھوں نے کہا۔ "میرے ساتھ خواب گاہ تک چلو۔"

دو لمحوں بعد جب وہ خواب گاہ میں پہنچی تو اپنے تکیے کے نیچے سے سنہرے فریم میں چھوٹی سی ایک تصویر نکال کر مس عذرا جمیل نے اسے تھما دی۔

اچانک اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے روشنی کا ازلی و ابدی مینار اپنے مقام سے اکھڑ کر سمندر کی تاریکیوں میں ڈوب گیا ہو۔ اور بے بادبان کی کشتی لہروں کے رحم و کرم پر بہہ چلی ہو جس کا کوئی ناخدا نہ ہو!

اقبال!" اس کے لب کانپے اور تصویر ہاتھ سے چھوٹ گئی!

اقوالِ زرّیں

- جس پر نصیحت اثر نہ کرے، جان لو کہ اس کا دل ایمان سے خالی ہے۔
- زندگی یہی ہے کہ تکالیف اور مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے خوش رہا جائے
- جو اپنے دوست کو برے کاموں سے نہیں روکتا وہ دوست نہیں ہو سکتا
- ماضی پر رونا، پچھتانا مضحکہ خیز بات ہے۔ اس لئے کہ مستقبل باقی ہوتا ہے
- دوستی کے بندھن کو مضبوط بنانا ہے تو دوستوں سے ملتے رہئے۔ اگر بہت مضبوط بنانا ہے تو بس کبھی کبھار ہی ملئے۔

مرسلہ :- آسیہ بیگم کھدرہ لکھنؤ

قدیم ہندوستانی سماج اور تلک

سید عارف حسین (ایڈیٹر سیوان ٹائمز)

کسی ملک اور کسی قوم کی سماجی تاریخ اس ملک اور اس قوم کے رسم و رواج کے آئینے میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بعض رسم و رواج تو مذہبی نوعیت کے ہوتے ہیں اس کے پس منظر میں اس مذہب کا فلسفہ حیات پوری شدت کے ساتھ موجود ہوتا ہے اور بعض رسم و رواج خالص سماجی نوعیت کے ہوتے ہیں ان سے مذہب کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تلک کی رسم کہاں سے آئی؟ کب آئی؟ کیوں آئی؟ یہ بتانا بہت مشکل ہے کیونکہ ہندوستان کی مقدس کتابیں رگ وید، شام وید، اتھروید اور یجروید میں اس کے متعلق ایک حرف بھی نہیں ملتا۔ ہندوستان کی ایک مشہور کتاب، مقدس گیتا بھی تلک کے تذکرے سے خالی ہے قدیم ہندوستانی قانون سازی کا وہ دفتر پارینہ اب بھی موجود ہے جو صدیوں پہلے دنیا میں تصنیف کیا گیا جو ہندوستان کا قدیم ترین دیوانی اور فوجداری ضابطہ ہے اور اس کی کسی دفعہ یا دفعات سے اگر کسی کو اختلاف ہو تو ہو لیکن "منو شاستر" کے گہرے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قدیم ہندوستانی سماج کو طبقاتی تقسیم کا ذہن و دماغ اسی نے مہیا کیا اور تقسیم کار کے اصول پر ملک میں سماجی نشو و نما کی بنیاد اسی نے ڈالی، اچھوتوں کے متعلق اس کی شدید تعزیری گرفت کل بھی قابل اعتراض تھی اور آج بھی ہے اس کے لئے کوئی شخص بقید انسانیت کلمۂ تعریف زبان سے نہیں نکال سکتا،، مگر منو شاستر کی کچی پکی سڑکوں اور چھوٹی بڑی پگڈنڈیوں پر بھی تلک کے رسم و رواج کا کوئی نقش قدم نہیں ملتا اس لئے تاریخ کا طالب علم یہ کہنے پر مجبور ہے کہ تلک کی رسم قدیم ہندوستانی سماج میں غیر مذہبی طور پر خودرو پودوں کی شکل میں پیدا ہو گئی ہے۔

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

رسم و رواج کی دنیا میں ایسے خودرو پودوں کی مثالیں بہت ملیں گی مگر کسی رسم و رواج کا وبائی مرض کی طرح پھیل جانا اسکو باقی رکھنے کیلئے کافی نہیں جب تک اس میں انسانی فلاح و بہبود اور معاشرے کی بھلائی کی اسپرٹ موجود نہ ہوتی۔

تلک قدیم ہندوستانی سماج میں کب رائج ہوا اس کا تعین بہت مشکل ہے مگر اس کا سبب عقلاً دریافت کیا جا سکتا ہے، قیاس یہ ہے کہ ہمارے قدیم سماج میں بیٹا ہی جائداد کا وارث ہوتا تھا بیٹی کو جائداد میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا اسوقت ہر داماد اپنی بیوی کی جائداد کی قیمت تلک کی شکل میں وصول کرتا تھا اور اسکو ناجائز نہیں سمجھتا تھا لڑکی کے باپ اور بھائی بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے اور انھیں اس میں کوئی قباحت نہیں نظر آتی تھی یہ ایک مفاہمت تھی جو قانون کی حدود سے نکل کر طرفین کر لیتے تھے اس طرح لڑکیوں کو جائداد سے محرومی کا شکوہ کم ہو جاتا تھا داماد بھی مطمئن ہو جاتے تھے یہ ایک اچھا جذبہ تھا اور اسی جذبہ نے اس تلک کے تن لاغر کو فربہ اندام کیا، یہ تو قدیم ہندوستانی سماج کی بات تھی جو ایک طرف قانونی ضابطہ کی پیروی کرتے ہوئے بیٹی کو وراثت سے محروم کر رہا تھا دوسری طرف تلک کے ذریعہ اس قانون کے مضر اثرات کا بھی ازالہ کرتا تھا، لیکن جو قومیں بعد میں ہندوستانی سماج کا جزو بنیں ان میں اقلیتی فرقہ بھی شامل تھا جس نے دیکھا دیکھی اور محض وقتی منفعت کے تحت تلک کی رسم اپنے یہاں بھی رائج کر لی جبکہ ان کی لڑکیوں کو جائداد میں حصہ ملتا ہی تھا، پھر تلک کی رسم چہ معنی دارد"

یہاں پر مورخ کے ذوق جستجو کو قیاس آرائی کی ضرورت ہے خیال کیا جاتا ہے کہ قدیم ہندوستانی سماج کی وہ بڑی تعداد جو سلاطین مغلیہ کے عہد میں آپس میں خلط ملط ہوئی وہ اپنے ساتھ دوسرے رسم و رواج کے ساتھ تلک بھی لائی، سارے قدیمی رسوم کو یک قلم ترک کر دینا ان کے بس کا روگ نہ تھا یہ اونچے گھرانے کے لوگ تھے جنھوں نے اپنے قبیلوں کی یاد زندہ رکھی، بہار کے کچھ قدیم گھرانے آپس میں گھل مل کر شیخ بن گئے جو کہ بڑی بڑی جائدادوں کے مالک اور شہنشاہ عہدوں

اور [illegible] تلک کی رسم کو [illegible]
[illegible] اس طرح گھس گیا کہ
[illegible] کی [illegible] اپنے اندر
[illegible]

[illegible] نہ مستم
جنید [illegible] و عطار ہم مست

[illegible] تلک کی رسم کو [illegible] پانے کی جو وجہ بھی ہو مگر اسلام [illegible] سراسر شریعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے [illegible] ہے جو فرمایا کہ نکاح [illegible] جب تک مہر کا تعین نہ ہو اور نکاح کے وقت قاضی مہر کی رقم کا اعلان [illegible] کرے لیکن تلک کی رسم نے [illegible] اب لڑکوں کے مہر کا تعین ہونے لگا جس کو غریب لڑکی کا باپ رسم و رواج کے [illegible] کے مطابق ادا کرنے پر مجبور ہے۔۔۔۔

اس غیر شرعی جذبہ عمل کے تسلسل نے سماج میں جو خرابیاں پیدا کی ہیں وہ جہنم کے شعلہ زار سے اتنا منطقی رابطہ رکھتی ہیں کہ وحشت و [illegible] کے آگے سپر ہے۔

ارشاد نبوی ہے کہ جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اسکو اپنے ہاتھوں سے مٹا دے اگر اتنی طاقت نہ رکھتا ہو کہ اس برائی کے [illegible] مسمار کرے تو زبان سے اس کے خلاف اعلان کرتا رہے اور [illegible] دل سے اس کو برا کہے لیکن یہ اضعف الایمان کی علامت ہے اضعف الایمان اسکو کہتے ہیں جس کا ایمان بے انتہا کمزور ہو۔۔۔۔

حیرت ہے کہ مسلمانوں میں تلک کی رسم پر مضامین لکھے جا رہے ہیں [illegible] مقالات چھپ رہے ہیں، [illegible] بھی جاری ہیں لیکن اس واسطہ سے کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا جو ہلکی جنبش دست [illegible] دے، ہر اخلاقی تحریک کی کامیابی کیلئے عقل و خرد کے ساتھ [illegible] جوش جنوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے

عقل والوں سے تو اٹھ سکتا نہیں بار جنوں
[illegible] کو عقل کو [illegible] ہے

[illegible] اس رسم کے خلاف [illegible]

ضرورت ہے کہ جو شخص اس رسم تلک کی بیماری میں [illegible] شریعت نبوی کے واضح اشارے سے واضح حدیث [illegible]
ضرورت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک [illegible] کی طرح [illegible] کے بعد رسم تلک کے خلاف نعرے لگاتے [illegible] کی شکل میں گشت کریں، ضرورت ہے کہ مجالس قانون ساز کے خلاف موثر قانون بنائے جائیں اور ان کا نفاذ [illegible] حکومت کے اہلکاروں اور پولیس کو بدعنوانی کے مواقع [illegible] حاصل ہوں کیونکہ ہر قانون جب بروئے کار آتا ہے تو [illegible] کی طاقت بڑھ جاتی ہے مگر اس پر عمل نہ ہونے سے قانون کی [illegible] افادیت ختم ہو جاتی ہے سچی بات تو یہ ہے کہ قانون [illegible] حل نہیں ہے اصلی اور حقیقی چیز معاشرے کا شعور اور [illegible] ہوتی ہے کسی معاملے میں اگر سماج کا ضمیر بیدار [illegible] قانون کی گرفت ہتھکڑیوں کی جھنکار سے جرائم کا ازالہ [illegible]

اچھے معاشرے کو قانون کے تازیانے کی ضرورت [illegible] جو زندگی کی ترقی یافتہ راہوں پر سرگرم خرام رہتا ہے [illegible] بہتر سے بہتر قانون کو عملی طور پر غیر موثر بنا کر [illegible]

دہلی و پٹنہ کے اجتماع صحت مند ہندوستانی معاشرہ [illegible] سکتے ہیں اور تلک جیسی رسم کو سماج سے [illegible] جس کے لئے مناسب ہوگا کہ ہم امروز و فردا کے [illegible] کیلئے دوسروں کے منتظر رہیں بلکہ ہم اپنے دلوں [illegible] پہل ہم خود کریں اس سماجی لعنت پر پہلا [illegible] موثر احتجاج یہ ہوگا کہ ہم خود تلک نہ لینے کی [illegible] ہم سے طرح اپنے غریب بھائیوں کو اس بدعت سے [illegible] اس سماجی لعنت کے بدنما داغ کو مٹانے [illegible] سلسلہ میں ہم سروں کی الاپ [illegible]
صدا لصحرا ثابت ہو جیسا کہ جناب اکبر الہ آبادی [illegible]

ذرا عقل کو ایک بار لے مسور مجذوبان [illegible]
یہ دیوانے کہیں پیچھے نہ رہ جائیں بیابان [illegible]

خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور [illegible]

ڈاکٹر شاکرہ کاظمی

تحریرات

روزنامہ [illegible] نے روزِ اول کی اشاعت سے ہی عوام میں مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ غیر جانبدارانہ رویہ، نڈر تبصرہ [illegible] دوں کا پردہ فاش کرنا اس کی پالیسی تھی۔ مقامی [illegible] کے علاوہ عالمی سرگرمیوں سے روشناسی میں بھی وہ اکثر سبقت لے جاتا۔

[illegible] پستول رنگے سیاروں سے تو اسے خصوصی بیر تھا۔ [illegible] کے ہفتہ وار [illegible] مخزنِ معلومات ہوتے۔ صحت، آرائش، زیبائش، نفسیات، معاشیات، ادب غرض کہ ہر ذوق کے مضامین ہوتے۔ [illegible] مدیر [illegible] علی انور صدیقی بڑے مخلص، وسیع النظر اور ذہین تھے۔ [illegible] پسند ہونے کے کسی طرح کی بدنظمی [illegible] ان کے لئے [illegible] تھی۔ اردو کے اور اخبارات کی طرح ان کا دفتر اُٹھنے [illegible] گرنہ تھا۔ [illegible] رکھا وہیں وہ کسی سرکاری، غیر سرکاری [illegible] ملاقات میں انور صدیقی سے ان کے دوست بھی بغیر وقت [illegible] ملتے سکتے مگر آج ایک درویش نما [illegible] نے ان کے [illegible] سیاہ لبادے میں ملبوس الجھے الجھے بال [illegible] صورت والا اندر گھس آیا۔ بیچارہ چپراسی اس کی صورت سے مرعوب ہو کر [illegible] روک دیا۔ انور اداریہ ترتیب دینے میں [illegible] تھا۔

"[illegible] دیکھ تیری قسمت جاگ گئی۔ اُٹھ اور فقیر کا [illegible] لگا" رعب دار آواز سے انور چونک گیا۔ "[illegible] زیادہ وقت نہیں۔ نکال چار سو روپیہ [illegible] کہ تیری عقل تیری صحیح رہنمائی کرتی ہے یا [illegible] کی طرف [illegible] ہے:"

[illegible] سا ہو گیا۔ دوسرے لمحہ درویش کے سامنے اس کی [illegible] تھی اور وہ [illegible] قدموں سے واپس [illegible] رہا تھا۔

[illegible] جب [illegible] رہا [illegible] مگر آپ [illegible]

سے مرعوب ہو سکتے ہیں میں [illegible] بھی نہیں کر سکتا تھا۔

سر خالد آپ [illegible] مغربی تہذیب [illegible] تنگ نظری کا اشارہ ہیں وہ واقعی کوئی قطب تھا اگر [illegible] تو [illegible]

"لیکن سر اسی دن تو آپ نے اس جعلی بھکاری کو دس پیسے بھی نہ دیئے بلکہ اس کے گڑگڑانے پر [illegible] دھکے دے کر نکلوا دیا تھا:"

"میں نے آپ کو اخلاقیات کا درس دینے کے لئے نہیں رکھا:" خالد اس رویہ پر ششدر رہ گیا۔ اہانت برداشت کرنا اس کے بس میں نہ تھا مگر [illegible] معاشی زبوں حالی نے اس کے جذبے کا گلا گھونٹ دیا۔

"سر مجھے معاف کریں [illegible] غلطی ہو گئی [illegible] نہ ہوگا۔"

دوسرے دن آفس کے [illegible] میں [illegible] لگی تھی۔ خالد [illegible] روم کے قریب [illegible] میں کام کرنے کا حکم [illegible] خالد کو [illegible] تو تھا [illegible] اور تنگ نظری کا واضح ثبوت تھا مگر۔

مفلسی سب [illegible] کرتی ہے [illegible] ہے۔ [illegible] ضبط کے [illegible] بھی کیا تھا۔ وہ چپ چاپ کام میں مشغول ہو گیا۔

اس واقعہ کے تیسرے روز چپراسی نے آکر کہا آپ کو صاحب فوراً بلا رہے ہیں۔ اس پیغام نے اسے اور بھی پریشان کیا۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر پہنچا۔ انور نے اسے بیٹھنے کو کہا، پھر بولا: "یہ دیکھو! [illegible] چیک۔ کسی [illegible] جیولرز کی فرم کا ہے [illegible] ایک [illegible] اشتہار ضمیمہ کے لئے دیا تھا: [illegible] یہ اسی درویش کی برکت ہے:"

"چار سو کے [illegible] تو ذہن میں [illegible] چار سال ہو گئے اخبار نکلتے۔ کبھی اتنا بڑا آفر [illegible] پیشگی رقم کے ساتھ آیا:"

"سر [illegible] نے تو اسی روز معافی مانگ لی تھی:"

"معافی مانگ لی تھی۔ تمہارے جیسے ایڈیٹر کو [illegible] غلطی [illegible] جرأت [illegible] کرنا [illegible]"

[illegible] سا [illegible] اس کو [illegible] کیا

[illegible] گزریں۔ [illegible] دیا گیا۔

[illegible] ایک [illegible] کھڑا ہو گئے۔ [illegible] اور

[illegible] ہیں۔ [illegible] کے [illegible] ان کی انور کے پاس

ایک [illegible] کی طرف سے۔ پورے چار ہزار

تھے۔ [illegible] کے ذریعہ کی [illegible] عبادت تھی۔ [illegible]

بجے [illegible] کے [illegible] درویش۔

[illegible] نے [illegible] شکر ہوتا مگر ان کا [illegible] ہر

[illegible] بے نیاز اور اب اپنا سکون کھو بیٹھا تھا۔

[illegible] اب کے [illegible] کا خطاب ہے [illegible] چند ہزار

[illegible] کے لیے [illegible] انعام اس

[illegible] کہتا تھا جس کی خدمات [illegible] کے مجبوروں کی نظر میں

[illegible] اس رقم نے انور کو اور بھی مغرور بنا دیا اور بیچارہ

[illegible] کی نظروں سے اور بھی گر گیا تھا۔ اور جب بھی احباب

[illegible] درویش کی تعریف کرتا خالد فخر کے اس

[illegible] سے [illegible] اس سے چھٹکارا حاصل

کیا [illegible]

[illegible] ایک دن اچانک وہ درویش پھر نظر آیا۔ انور کی آنکھیں

[illegible] حضور کی کیا خدمت کریں۔ [illegible] انور نے۔

[illegible] کا دل آ گیا تجھ پر۔ تو وہ پہلا شخص ہے جس کو میں نے ایک

[illegible] سے زیادہ [illegible] دیا۔

[illegible] اور [illegible] ہے برنز

[illegible]

[illegible] درویش نے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تھوڑا تھوڑا [illegible] کرتے تھے۔ تیری [illegible]

تجھ سے ملنے کے لئے اور میں بے چین رہنے لگا [illegible]

[illegible] اس ملک سے جلد کوچ کرنے کا حکم دیا ہے [illegible]

ایک جھلک دیکھنے آ گیا۔ فرط مسرت سے انور پاگل ہو [illegible]

نا [illegible] درویش کے قدموں میں گر گیا اس کے گرد [illegible]

دینے لگے۔

لعنت ہے اس مجبوری پر وہ ورنہ تمام [illegible]

[illegible] اس محبت کی [illegible] شریف نہیں۔

انور نے دست بستہ عرض کیا حضور [illegible] اب میں

ہے آپ جہاں جائیں میں بھی چلوں گا:

نہیں بابا تو جو کر رہا ہے وہ عبادت اور ریاضت [illegible]

ہے اس کو نہ چھوڑنا۔ میں چاہتا ہوں تیرا [illegible] بھی [illegible]

ترین مگر اس کے لئے لاکھوں چاہئیے۔ میں [illegible] سے مجبور ہوں

لا کچھ دے مگر آج نہیں نحس دن ہے۔ پرسوں تو [illegible]

ہے۔ مجھ سے تیرے گھر [illegible]

انور نے [illegible] کہتے بابا جیوں [illegible]

تیری قسمت ہوگی تو خود ہی وہاں پہنچ جاؤں گا۔

دو دن انور کو اپنے روپیہ یکجا کرنے میں [illegible]

کیش تو صرف دس ہزار تھے۔ اس نے زیورات [illegible]

سب رہن رکھ کر [illegible] ہزار اکٹھا کر لئے۔

[illegible] بابا جی آئے [illegible] نے [illegible] ہزار [illegible]

رکھے۔ [illegible] دعائیں دیتا آگے بڑھا۔ خالد [illegible]

دوست تاک میں تھے۔ درویش کا پیچھا کرتے [illegible]

خالد کے دوست [illegible] نے [illegible] میں [illegible]

درویش کے سر پر [illegible] رہا۔ انور [illegible]

[illegible] تھیلا چھین لیا جس میں رقم کے [illegible]

[illegible] ہو گئے۔ اس [illegible] کر کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] وہ ڈاکٹر نے مجھ کو سمجھایا کہ [illegible] انعام ہے
[illegible] ہے! سریندر نے کہا: نہیں اس کامیابی کا سہرا
[illegible] ہے۔

[illegible] کی مرمت ہوئی تو انھوں نے اقرار کیا کہ وہ ایک
[illegible] گروہ کے سرغنہ ہیں۔ کاروبار کی دشواری کی وجہ سے
[illegible] راز پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اشتہار وہ
[illegible] سب ان کی جیب سے تھا اور یہ ساٹھ ہزار کی رقم سے
ان [illegible] تھا اور باقی منافع بھی ان کا تھا۔ پھر بہت سے
[illegible] کے بارہ میں بتایا انھوں نے مگر وہ سب مخفی رکھا
[illegible]

[illegible] اور سب سے بے خبر برکت کا منتظر تھا۔ وقت پر روپیہ
[illegible] کے گھر نیلام ہونے کی نوبت آئی اور [illegible] وقت پر خالہ
[illegible] کے [illegible] سریندر نے تقدیر روپیہ دے کر ان کی مدد
[illegible]

منزل مقصود پر پہنچے

ایم اے [illegible] انجم ([illegible])

[illegible] ہم منزل مقصود پہ پہنچے
[illegible] اشکوں کے موتی ترے گھر پہنچے
ابھی حباب کا عالم ہے ہم پہ [illegible] ہے بیداری
کہ اس ظلمت کدہ سے ہم سوئے نور سحر پہنچے
[illegible] تیری جستجو کی روشنی لے کر
[illegible] کرتے ہوئے ہم [illegible] پہنچے
ہمیں کر جائیں اکرام تیرے در پہ [illegible] آئے
دعا [illegible] لب پہ اشک آنکھوں میں [illegible] جگر پہنچے
[illegible] سے میری خطاؤں کو
[illegible] اے چشم تر پہنچے
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] نے اور [illegible] سے [illegible]
میرا فرض تھا۔ آپ نے مجھے [illegible] کیا [illegible]
یہ رقم آپ کی ہی ہے بابا جی کی برکت سے اور یہ سب میرا [illegible]

نعت شریف

حقی چشتی لکھنوی

کیا شان کرم ہے شاہ زمن سبحان اللہ سبحان اللہ
ذکر آپ کا ہے گلشن گلشن سبحان اللہ سبحان اللہ
کس حسن سے ہے ہر سو جلوہ فگن سبحان اللہ سبحان اللہ
ہر سمت ہے اک نوری چلمن سبحان اللہ سبحان اللہ
ہے [illegible] روشن سبحان اللہ سبحان اللہ
اک نور سا ہے آنگن آنگن سبحان اللہ سبحان اللہ
کیا بات ہے حسن سیرت کی صورت تو ہے ایسی نورانی
[illegible] سے گل و سمن سبحان اللہ سبحان اللہ
معصوم نظر بھی بولی چہرے پہ بڑا ہی بھولا پن
قربان یہ دل اے غنچہ دہن سبحان اللہ سبحان اللہ
طوفان بلا میں ہم نے جہاں گھبرا کے پکارا یا حضرت
ہاتھ آیا وہیں ان کا دامن سبحان اللہ سبحان اللہ
اک بار مدینے جا پہنچوں پھر آنے کا ہرگز نام نہ لوں
کیا خوب لگی ہے دل کو لگن سبحان اللہ سبحان اللہ
گذرے ہیں دبے پاؤں شاید نزدیک سے وہ دیوانوں کے
اشکوں سے بھرا دامن دامن سبحان اللہ سبحان اللہ
سر رکھ دیا ان کی چوکھٹ پر [illegible] عشق
جب جا کے ہوئی کم دل کی چبھن سبحان اللہ سبحان اللہ

[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

اگر آسانیاں ہوں۔۔۔

عبد المجیب سہالوی

بعض لوگ شادی کے بعد بھی اپنے کو ہیرو اور بیوی کو ہیروئن خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ شادی کے بعد حالات بالکل بدل جاتے ہیں نہ عاشق جانباز عاشق باقی رہتا ہے اور نہ دلنواز محبوبہ محبوبہ رہ جاتی ہے بلکہ ان کی حیثیت گھریلو زندگی کی گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہو جاتی ہے جو اگر برابر سے نہ چلیں تو گاڑی کا آگے بڑھنا ناممکن ہو جائے۔

گھر گھر ہوتا ہے اسٹیج نہیں اور میاں اور بیوی اداکار اور اداکارہ نہیں بلکہ شوہر ہوتے ہیں جنہیں کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنا پڑتا ہے ورنہ گھریلو زندگی کی گاڑی لیک سے باہر ہو کر الٹ جاتی ہے۔ اسٹیج پر کھڑے ہو کر محبت بھرے مکالمے بولنا نہیں ہوتے بلکہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے یعنی دال، نون، لکڑی کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ گھر کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ آنے جانے والوں کی خاطر مدارات کا بندوبست کرنا ہوتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد بال بچوں کے پالنے پوسنے کے جھمیلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج منّو کو بخار آ گیا کل منّی کی داڑھ میں درد ہونے لگا۔ پرسوں پپّو کی ٹانگ میں چوٹ لگ گئی کسی کو حکیم کو دکھانا ہے کسی کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے کسی کو اسپتال میں بھرتی کرانا ہے دوا علاج سے فرصت ملی تو پڑھائی لکھائی کا چکر شروع ہوا۔ کوئی فیس مانگ رہا ہے کسی کے پاس کتابیں نہیں ہیں کوئی کہہ رہا ہے کہ کل دیدی نے کہا تھا کہ اگر اسکول ڈریس پہن کر نہ آئے تو کلاس میں گھسنے نہیں دیا جائیگا۔

[illegible] کتابیں خریدے [illegible] اور [illegible] ہوتے [illegible] ماں باپ کا گھر کس طرح چلتا ہے پھر بھی لڑکے لڑکیوں کا فرمائش [illegible] باقی رہتی ہے [illegible] سے [illegible] جب فرصت ملتی ہے تو سناسب لڑکے لڑکیوں کی شادی [illegible]

[illegible]

جا سکتی ہے۔ [illegible] رہتی ہے اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ جو شادی کرتا ہے وہ بھی پچھتاتا ہے اور جو نہیں کرتا ہے وہ بھی پچھتاتا ہے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ شادی کر کے پچھتانا بزدلی اور شادی نہ کر کے پچھتانا بے وقوفی ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے نہ ہم بزدل ہیں اور نہ بے وقوف۔ اسی لئے ہم نے بڑے طمطراق سے شادی کی ہے اور بڑے مزے میں یہ شعر پڑھتے ہوئے گھریلو زندگی بسر کر رہے ہیں ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

دلچسپ لطیفے

● شوہر۔ میرا خیال ہے تم کبھی کبھی جھوٹ بھی بولا کرتی ہو۔
بیوی۔ کیوں نہیں، لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آنے والیوں سے تمہاری تعریف نہ کروں۔

● "شادی ایک لعنت ہے" کے عنوان سے ایک شخص نے ایک کتاب لکھی۔ اس کے دوست نے پوچھا۔ اس کتاب سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔
مصنف نے جواب دیا، ایسی کتاب خوب بکے گی۔ میں اس سے روپیہ پیدا کر کے شادی کر دوں گا۔

● پہلی رات میں شوہر نے بیوی سے کہا "تم ہزاروں لڑکیوں میں سے ایک ہو۔"
بیوی نے رونا شروع کر دیا۔
شوہر نے گھبرا کر پوچھا۔ تم رونے کیوں لگیں۔
بیوی نے کہا۔ "میں نہ جانتی تھی کہ تم ہزاروں [illegible]

● ایک دوست۔ سنا ہے تمہاری شادی [illegible] کیا کر رہے ہو۔
[illegible] کھانا پکانے کی مشق کر رہا ہوں۔

● [illegible] آپ کے خلاف [illegible]
[illegible]

[illegible]

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک [illegible] شائع کی جا سکتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خوش خط صاف مختصر الفاظ میں لکھ کر نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ بھیجی جائے۔ ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر میں کتابت کی غلطی کا [illegible] ادارہ نہ ہوگا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح کر دی جائے گی۔

[illegible] الفال کی خبریں

● [illegible] شاہین حفصا پروین (ویشالی) میری آپا احمدی [illegible] بہنوئی توحید العامر صاحب کو اللہ پاک نے ۱۱ دسمبر ۱۹۸۱ء [illegible] بوقت بارہ بجے شب ایک دختر عطا فرمائی۔ نام [illegible] فاطمہ [illegible]

● [illegible] ہاشمی (آسنور) میری بھابی عزیز نعیم کو اللہ تعالیٰ [illegible] جنوری ۱۹۸۲ء بروز جمعہ بوقت ۷ بجے صبح ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد فضل الرحمن اور پیار کا نام شرجیل الرحمن رکھا گیا۔

● [illegible] (کلکتہ) میرے بھائی محمد حسن شمسی اور بھابی [illegible] کو اللہ پاک نے [illegible] دسمبر ۱۹۸۱ء بروز اتوار ایک فرزند عطا [illegible] نام [illegible] قرار پایا۔

● [illegible] میری چھوٹی بہن [illegible] اور بہنوئی [illegible] کو اللہ پاک نے پہلی بار ۲۲ جنوری ۱۹۸۲ء [illegible] منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔

● [illegible] میری بہن [illegible] زبیدہ [illegible] بانو [illegible] نے ۲۷ جنوری ۱۹۸۲ء بروز [illegible] کو [illegible]

● [illegible] (کلکتہ) [illegible] میرے [illegible]

بی [illegible] اور بیوی [illegible] (کلا پاندھرا) کو اللہ پاک نے [illegible] بروز پیر بوقت ۳ بجکر ۲۰ منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام شفیق احمد قرار پایا۔

● عائشہ تسنیم (گرگیشوری) میری خالہ زاد بہن ڈاکٹر افسانہ [illegible] اور دولہا بھائی [illegible] کو اللہ پاک نے [illegible] بروز چہار شنبہ بوقت [illegible] ایک فرزند عطا فرمایا۔

● [illegible] عصمت افضل (ویشالی) میرے [illegible] ناظم صاحب اور میری چھوٹی بہن راشدہ انجم کو اللہ پاک نے پہلی بار ۲۲ دسمبر ۱۹۸۱ء بروز اتوار بوقت صبح ۴ بجے ایک دختر عطا فرمائی۔ نام امرینہ رکھا گیا۔

● باجی منصور (کلکتہ) میری بھابی [illegible] سرمد کو اللہ پاک نے ۱۸ فروری ۱۹۸۲ء بروز جمعرات بوقت ۱۰ بجے شب پہلی بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام منیب سرور اور پیار کا نام [illegible] رکھا گیا۔

پیغاماتِ نشاط

● صبیحہ مسعود (کولار) میرے بہنوئی ڈاکٹر رحمت ڈیلوی کی بہن روحیلہ بنت ڈاکٹر فضل اللہ صاحب مرحوم (ڈیلوی) کا عقد سعید فاروق احمد کے ساتھ ۷ جنوری ۱۹۸۲ء کو بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔

● فضیلت بہار رحمانی (رجیا گھاٹ۔ بلاسپور) میرے ماموں زاد بھائی محمد حسام الدین ایڈوکیٹ (پسر چودھری محمد عظیم اللہ صاحب) کا عقد ثانی ہمراہ پروین بنت محمد منظور الحسن صاحب (بزرگ دوار) کے ہمراہ بحسن و خوبی انجام پایا۔

● کامران سلطان (فرزند نواب شوکت جعفری۔ [illegible]) کا عقد سعید شہناز سلطانہ دختر مسعود عالم صاحب [illegible] کے ساتھ اور دختر نشاط جعفری سلطانہ کی شادی ڈاکٹر عبد الرحیم (فرزند عبد الرزاق خان مرحوم) کے ہمراہ ۱۹ اور ۲۰ فروری ۱۹۸۲ء کو بمقام [illegible] کا شہد بصد تزک و احتشام انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم [illegible]

● مشتاق حسن صاحب کے فرزند [illegible] کی [illegible] سلطانہ کے ساتھ [illegible] دختر [illegible] سلطانہ کی شادی [illegible] کے ساتھ ۲۱ فروری ۱۹۸۲ء [illegible] صاحب [illegible]

لکھنؤ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم امروہوی

● سوکار سید عبد القادر صاحب جیتور کی سب سے چھوٹی صاحبزادی عالیہ سعید عرف بی۔ اے کا عقد سعید فضل اللہ [illegible] کے ہمراہ ۱۴ فروری ۱۹۸۲ء کو جیتور میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم امروہوی

● مسعود سلمہٗ (فرزند صابر علی صدیقی مرحوم، امروہہ) کی شادی ہمراہ انجم سلمہا دختر محمد مسعود صدیقی ایڈوکیٹ (لکھنؤ) بتاریخ ۱۴ فروری ۱۹۸۲ء بمقام گولہ گنج لکھنؤ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم امروہوی

● نسیم فاطمہ سلمہا دختر نیک اختر محمد کاظم خان صاحب مالک کسان پائپ اسٹور (لکھنؤ) کا عقد، محمد میاں سلمہٗ فرزند جناب احمد علی صاحب (لکھنؤ) کے ساتھ ۱۴ فروری ۱۹۸۲ء کو بخیر و خوبی عمل میں آیا۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم امروہوی

● ظہیر حسن فاروقی صاحب، سمیع منزل لکھنؤ کے فرزند جمال سلمہٗ کی شادی فاطمہ سلمہا دختر جناب سید اوصاف علی صاحب ڈالی باغ (لکھنؤ) کے ساتھ یکم فروری ۱۹۸۲ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم امروہوی

● عبد الرزاق عبد القادر، دسائی (دلال و رسائی۔ تھانہ) کے فرزند عبد الخالق کی شادی ناہید فریدہ سلمہا دختر ابو بکر اسحٰق [illegible] کے ساتھ ۱۶ فروری ۱۹۸۲ء کو [illegible] جماعت [illegible] بمبئی میں انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم امروہوی

انتقال پر ملال کی خبریں

● [illegible] افسوس کے ساتھ [illegible] کے نامور [illegible] عبد الاحد خاں خلیل [illegible] کی علالت کے بعد [illegible] فروری کی سہ پہر کو انتقال فرما گئے۔ مرحوم [illegible] میں [illegible]

● الیاس محمود خان ایم یوسف انصاری، آصف [illegible] سعید (گرلز ہسٹ) نسیم [illegible] مختار حسن اللہ انصاری [illegible] کی والدہ (ججی) [illegible] فروری کو [illegible] ہوگیا۔ مرحومہ کی عمر [illegible] اللہ مغفرت کرے [illegible] کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ نسیم امروہوی

● ایک [illegible] شخصیت [illegible] ۱۹ فروری کی دو پہر [illegible] ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ مولانا سید محمد ثانی حسنی جو مولانا حضرت علی میاں صاحب کے بھانجے اور بچوں کے مشہور ماہنامہ رضوان کے ایڈیٹر [illegible] کوشش کے باوجود اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم کو کچھ عرصہ قبل کسی کتے نے کاٹ لیا تھا۔ اس وقت کوئی خاص [illegible] معالجہ کی نہ کی گئی، اس لئے کہ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن یہی معمولی سی بات موت کا بہانہ بن گئی۔ حسنی صاحب اپنی تالیفات اور تصنیفات کے باعث شہرت رکھتے، اپنے حسن اخلاق سے بھی ہر دل عزیز تھے۔ اللہ مغفرت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم امروہوی)

● بہن صادقہ بیگم صاحبہ (میرپور) کی ایک [illegible] ہوا کہ ان کی والدہ محترمہ یکم فروری کو اچانک انتقال فرما گئیں۔ اللہ پاک انھیں بخشے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ نسیم امروہوی

● نسیم ہاشمی (جالون) افسوس ہے کہ میرے [illegible] کے [illegible] فرزند [illegible] عرف [illegible] ۲۲ جنوری [illegible] کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرحوم کی [illegible] اللہ مغفرت کرے۔ [illegible]

● [illegible] افسوس ہے کہ [illegible] وکیل صاحب [illegible] اللہ کو پیارے [illegible] عمر ۷۰ سال [illegible] اللہ مغفرت کرے۔

● [illegible] افسوس [illegible]

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت ہم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ [illegible] شعر ہر ماہ شائع ہو سکتا ہے. بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو، شعر موزوں، پاکیزہ اور معیاری ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ بھیجا گیا ہو۔ جو اشعار ۲۰ر تاریخ کے بعد وصول ہوتے ہیں وہ شائع نہیں کئے جاتے

ماضی کا احترام ضروری ہے آج بھی
اور بات ہے کہ زمانہ بدل گیا

مرسلہ:۔ شمونہ روحی (حیدرآباد)

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار
گذرا تھا اس مقام سے اک کاروان کبھی

مرسلہ:۔ نکہت شہباز فرحت دیبا (امراوتی کیمپ)

[illegible] کے خلد سے دو چار خیر و شر سے ہوئے
[illegible] لغزشِ ماضی کا اک ازالہ تھا

مرسلہ:۔ نجمہ انصار مشتاد (بھٹکل)

[illegible] تاریخ ماضی زندگی کا درس دیتی ہے
اگر [illegible] ہے تو اسلاف کا ایمان پیدا کر

مرسلہ:۔ اسیہ۔ ایم امجد (بھٹکل)

[illegible] کی یادوں سے ماضی میں چراغاں ہوتا ہے
[illegible] جو کب کا ماند ہوا وہ پھر سے درخشاں ہوتا ہے

مرسلہ:۔ امروز جہاں (آرہ)

ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
مستقبل بھی ہوگا درخشاں، ہم نہیں ہوں گے

مرسلہ:۔ خالدہ حسین قریشی (وینتول)

[illegible] میں جو [illegible] آنسو
[illegible] ماضی کے [illegible] آنسو

مرسلہ:۔ [illegible]

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

مرسلہ:۔ شہناز بیگم (ہنگاہاپیٹ)، [illegible]
نہینہ یاسمین (حسان)، قرۃ العین [illegible]
اسے رکھانہ تبسم (دا نجبا ڈی)، محمد الیاس [illegible]
کشور سلطانہ (لکھنؤ)، کوثر جہاں (پٹنہ)

کام کی باتیں

• جو بھی کپڑا سلائیں یا بنائیں اس کے ٹکڑے محفوظ رکھیں، تاکہ کبھی انھیں جلنے یا کھونچ لگنے سے کچھ حصہ جل، پھٹ جائے تو ان ٹکڑوں کو رفو کرکے انھیں درست کیا جا سکے۔ عموماً اس کا خیال نہیں رکھا جاتا، ٹکڑے پارچے پھینک دئے جاتے ہیں۔

• چادریں اکثر دھوبیوں کے یہاں استری کی چنگاریوں سے ذرا سی جل جاتی ہیں۔ ان پر پیوند لگا کر پھول کاڑھ کر چھپا سکتی ہیں۔

• کسی ہانڈی میں نمک زیادہ ہو جائے تو سخت آٹے کی گولیاں بنا کر پکائیں۔ کچھ نمک ان میں جذب ہو جائے گا۔

• مہمان کے سامنے شاندار کھانا پیش کرنا ہو تو صرف آدھ سیر گوشت کو چار حصوں میں علیحدہ علیحدہ کرکے مختلف طریقوں سے پکائیں۔ تھوڑی محنت تو زیادہ ہوگی لیکن دستر خوان کی شان بڑھ جائے گی۔

• دو چار انڈے اور آلو گھر میں ضرور رکھیں۔ رات برات اچانک کوئی مہمان آجائے تو آپ اس کی خاطر تواضع کر سکتی ہیں۔ انڈوں سے آملیٹ، خاگینہ اور سالن وغیرہ فوراً ہی تیار کیا جا سکتا ہے۔

• کھانے میں نمک مرچ کم ڈالیں۔ کمی کو حسب خواہش دسترخوان پر نمک مرچ چھڑک کر پورا کیا جا سکتا ہے۔ زیادہ ہو جائے تو [illegible] برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

• کھانا [illegible]
[illegible]

انھوں نے وقاص احمد کو حکم دے دیا تھا کہ وہی چھٹی لے کر بیوی کے پاس آجایا کریں۔ دلھن کا پہلا معاملہ ہے۔ اور وقاص احمد کے یہاں کوئی بڑا بوڑھا نہیں۔ لہٰذا دلھن اپنی ماں کے پاس رہے گی۔

نوشینہ نے پھر اپنی الماری کھولی۔ ادھورے افسانے مکمل کیے۔ اور ازسرِنو ناول شروع کر دیا۔ اس کی طبیعت کچھ قابو میں آگئی تھی۔!

اگر اسے وقاص احمد کی یاد ستاتی تو وہ بڑے جانگداز افسانے لکھنے لگتی!۔ وقاص کے طویل طویل محبت نامے آتے!۔ نوشینہ کی دل بہلائی کے لیے سنجر اور امرینہ کیا کم تھے۔ وہ کالجوں سے واپسی کے بعد اس کے پاس ڈیرہ جما دیتے!۔ سنجر کبھی نوشینہ کو خاموش نہ رہنے دیتا

"بجو۔! چپکے سے مجھے بتا دیجئے۔ آپ نے نام کیا سوچا؟"

"کس کا نام؟" نوشینہ کو خیال تک نہ ہوتا اس کا مطلب کیا تھا

"میرے بھانجے یا بھانجی کا نام۔!"

"چل ہٹ۔ بے شرم۔"

"آپ نے چل ہٹ، چل ہٹ کہہ کہہ کے خانہ آبادی تو فرمالی باجی! ہے۔ میں تو اخیر تک یہی سمجھتا رہا کہ آپ کی سی اسٹائلش لڑکی قطعی شادی وادی کی فضولیت کو برداشت نہ کرے گی۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ منہ میاں سیر سیر بھر کے لڈو پھوٹتے ہیں۔ تو آپ نے بھی اپنے لڈو پھوڑ لیے۔ افسانوں اور ناول کا قطعی دھوبی گھاٹ کر دیا۔ لاحول ولاقوۃ۔"

"ہائے باجی" نوشینہ گلابی ہو گئی "کیا میں عام لڑکیوں سے کچھ ہٹ کے تھی۔ اور پھر کس میں سکت تھی کہ بڑے ابا کا حکم ٹال سکتا!۔" (باقی آئندہ)

"پوچھیے!" وہ مسکرایا۔

"مجھ سے زبردستی جو پیسے لے جاتے ہو۔ وہ کہاں خرچ کرتے ہو۔"

"پیسے؟" اس کے ذہن میں چھناکے سے ہو گئے

"میں نے حساب جوڑا تھا۔ پورے ڈیڑھ ہزار ہوئے! یہ کہاں ہے میں گھبرا رہی ہوں کیونکہ میں تو نہیں دیکھتی کہ تم نے کچھ خریدا ہو۔ وہی لباس ہیں تمہارے پاس جو میں نے نوشی کی شادی سے پہلے سلوا دیے تھے۔ تم کوئی نئی چیز بھی گھر میں نہیں لائے۔ بتاؤ سنجر۔ اگر اتفاق سے تمہارے ڈیڈی نے مجھ سے حساب پوچھ لیا تو انھیں کیا جواب دوں گی۔"

"ارے امی۔ خدا کے واسطے۔ یہ سب ڈیڈی سے نہ کہہ دیجئے گا۔" وہ گھبرا گیا۔

"تو پھر مجھے بتاؤ۔!"

"کیا بتاؤں۔"

"مجھے وحشت ہوتی ہے۔" بھولی بھالی خاتون نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "کہیں تم نے کسی لڑکی سے تو دوستی نہیں کر رکھی ہے۔ مجھے بتاتے نہیں ہو اور پیسے لے جا کے اس کی فرمائشیں پوری کرتے ہو۔ سنجر! ایسا مت کرنا۔ تم سے میری بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ سنجر۔ تم میرے ایک ہی تو بچے ہو۔ سنجر۔ شریف لڑکے لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتے!"

"میں کبھی نہیں دیکھتا" سنجر نے کھوکھلا سا قہقہہ لگا کے اپنی ماں کے آنسو پونچھے "امی۔ کیا سچ مچ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔ آپ مجھے بازاری لڑکوں کی طرح آوارہ بدمعاش سمجھتی ہیں۔ مجھے افسوس ہے امی۔! سچ مچ مجھے بہت افسوس ہے!۔"

کوئی لڑکی نہیں ہے؟"

لاحول ولا قوۃ۔ لڑکی، لڑکی۔ امی خدا کی قسم میں یونیورسٹی کی کسی لڑکی کے سایہ کے پاس بھی نہیں پھٹکتا!"

تم نے خدا کی قسم کھالی میرا بھروسہ ہوگیا۔ اب بتا دو۔ ڈیڑھ ہزار کا مصرف۔"

امی۔ باجی کی شادی میں۔ سونے کا ایک چھوٹا سا ہار۔ خریدا تھا آپ اتنی رقم دینے کے موقف میں نہ تھیں۔ دوستوں سے میں نے وقتاً فوقتاً روپیہ لیا تھا۔ وہ ادا کر رہا ہوں"

مم۔ مگر۔ نوشینہ کے گلے میں ہار تو میں نے نہیں دیکھا۔

مٹیل تو سونا لدا تھا ان پر امی۔ تار برابر زنجیر آپ کو کیسے دکھائی دیتا؟ اور اس طرح اس نے اپنی ماں کو تو بیوقوف بنا دیا تھا مگر خود کچھ سراسیمہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس عرصہ میں وقاص احمد نوشینہ کو لے آئے تھے۔

نوشینہ کی حالت خستہ ہو رہی تھی۔ وقاص احمد گھبرا رہے تھے کہ جانے ان کی پھول سی دلھن کو کیا ہو گیا تھا! انھوں نے ممی کے پاس بیٹھ کر اور نہایت پریشان لہجے میں نوشینہ کی پوری ہسٹری کہی۔

ممی مسکرا رہی تھیں۔ چچی جان کے تو دانت ہی دکھائی دے رہے تھے! وقاص احمد کو نہایت تعجب ہوا۔ عجیب بات ہے۔ یہ معزز خواتین اپنی نازوں کی پالی کی مصیبت پر ہنس رہی ہیں۔

نوشینہ کا چہرہ سفید تھا! وہ رہ رہ کر گلا سہلا رہی تھی!۔

میاں تم کچھ نہیں۔ چچی جان نے وقاص احمد سے کہا: "پگلی! پاگل

کمرہ میں رکھوں گی۔ کمرہ مہک اٹھے گا۔!

تھوڑے سے میرے سرہانے بھی رکھ دینا۔! وہاں تو کوئی مہک ہی نہیں۔

ایک بات پوچھوں؟۔

اجازت لیے بغیر پوچھ سکتی ہو۔!

آپ کو جھوٹ بولنا بھی آتا ہے کیا؟

توبہ توبہ۔ مجھے دوزخ میں تھوڑی جانا ہے!۔

تو پھر آپ نے بڑے ابا کا نام لے کر ــــ!"

سنو امرینہ۔ بس وہ حسد کے مارے کہہ دیا تھا۔ تم اترانے لگو کر بھائی اس آنا پر چڑھے کو انھوں نے کچھ نہیں دیا۔ سمجھیں۔ اس میں جھوٹ کا شائبہ بھی نہیں تھا!"

امرینہ چپ ہو گئی۔ اس نے کلیوں سے دامن بھر لیا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔ سنجر نے ٹھنڈی سانس لی اور بڑبڑایا۔

بیٹے سنجر سر سے پاؤں تک جھوٹ میں گندھ کے رہ گئے ہو۔ جا بلت کے لیے ہتھیار تیار رکھو۔!

بڑی آپا نے نوشینہ کو اس کے میکے بھجوا دیا تھا۔ وقاص احمد اپنے مستقر پر جا پہنچے تھے۔ ان لوگوں کے دن پھر خوبصورت ہوگئے!۔ بڑی آپا ممی کے ڈراؤنے خیالات کے برعکس بڑی اچھی ہو نکلیں۔

نہیں ہے۔ تم مطمئن رہو۔

لیکن آمنہ باجی ان کا کھانا پینا چھوٹ گیا ہے۔ مجھے بڑی پریشانی ہے۔

ہاں بیٹے ایسا ہی ہوتا ہے" چچی جان نے کہا۔

ایسا ہی ہوتا ہے؟" وقاص احمد نے حیرت سے دوہرایا "لیکن کیوں ہوتا ہے ایسا؟"

ممی خاموش رہیں۔

میاں۔ میں تمھیں کیا بتاؤں" چچی جان بولیں "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ رکھے اب تمھارے یہاں چاند سا بیٹا ہوگا۔ اب تم سمجھے؟!"

نوشینہ کے سفید چہرے پر یکبارگی سارے جسم کا لہو اکٹھا ہو گیا۔

وقاص احمد کا دل دھڑک اٹھا۔ اور یکبارگی ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ انھوں نے سر جھکا لیا۔ نطق ہی بند ہو گیا۔

چچی جان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا "کچھ دنوں کے لیے لڑکی کو ہمارے پاس چھوڑ جاؤ۔ ہم لیڈی ڈاکٹر کو دکھائیں گے۔ یہ کیفیت جاتی رہے گی۔ تم اطمینان سے اپنے کام پر سدھارو۔!"

جی۔!" وہ بے حد شرمیلے لہجے میں بولے۔

نوشینہ نے دوسری طرف چہرہ پھیر لیا۔ وقاص احمد حجاب کے مارے اس سے نہیں ملے۔ ان کے جانے کے بعد سنجر اور امرینہ بہن کے پاس آ بیٹھے اور اسے چھیڑنے لگے!۔

یہ کہانی آپ نے بڑی زوردار لکھی ہے آجی" سنجر بولا۔

اور اس کا عنوان میں سوچوں گی۔!" امرینہ بولی۔

نوشینہ نے ساڑی کا آنچل اپنے چہرے پر ڈال لیا

کہا تھا کہ بڑے ابا نے لے دیا تھا!۔

وہ خاموش ہو گئی اور پھر اس کی نظریں اوپر اٹھیں تو سنجر وہاں نہ تھا۔ اس کے دل میں شک نے سر اٹھایا۔ بش شرٹ اس کے بستر پر پھینک کر وہ ادھر ہی برآمدے کے راستے باغیچہ میں اتر گئی۔ سنجر اناروں کے جھنڈ کے سائے میں ٹہل رہا تھا۔!

امرینہ کو دیکھ کر سنگی بنچ پر بیٹھ کر اس کی پشت پر دور دور تک بانہیں پھیلا دیں!۔ اور بے حد خوش اخلاقی سے چہک کر بولا۔

"آؤ۔ آؤ۔ امرینہ۔ بیٹھو یہاں۔ چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو تم یقیناً پسند کرو گی۔!"

وہ اسے جھنجھوڑنے آئی تھی لیکن یک لخت وہ شرمانے لگی۔ کیا کہے گی اس سے۔

وہ تو قطعی کھلنڈرہ سا لڑکا نہیں لگ رہا تھا!۔ اس نے خوامخواہ گھنی گھنی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ اور اچھا خاصا قد آور چوڑا چکلا آدمی معلوم ہو رہا تھا!۔ حالانکہ وہ جوں کی توں بچی سی لگتی تھی اس میں کوئی فرق ہی نہیں ہوا تھا۔

اس کی مدبرانہ مسکراہٹ نے امرینہ کو زیادہ بے زار کر دیا۔ وہ لاتعلق سی بنی چنبیلی کی کلیاں شاخوں سے نوچ نوچ کر اپنے آنچل میں بھرنے لگی!۔

"کچھ کلیاں بے چاری بیلی کے نصیب کی بھی رہنے دو" سنجر بولا "تمہیں پھول پہننے کا ارمان کب سے ہوا۔

ارمان ہو تو تمھی پہنتے ہیں کیا؟۔

اور پھر کیا کرو گی؟ اتنے بہت سارے پھول؟

چچی جان اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھیں ۔ اس نے تصدیق کر دی۔ نوشینہ کے گلستانِ حیات میں لالہ زار کھل اٹھے!۔

پھر بڑی آپا نے اسے اپنے پاس بلا لیا ۔

ان دنوں سنجر اپنے پریکٹیکل ٹسٹ میں بڑے اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوا تھا اپنی کارکردگی کی رپورٹ اس نے بڑے ابا کو دکھائی تھی : رحمٰن صاحب دو ایک دن کے لیے آئے ہوئے تھے ۔ ان سے بڑے ابا نے کہا " ہم نے یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ سنجر کو ہم اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر ضرور بھجوائیں گے ۔ اور اس کی شاندار کامیابی نے ہمارے حوصلے اور عزم کو کوئی تقویت دی ہے ۔ ہمارے دوست جرمنی میں بھی موجود ہیں ۔ چنانچہ ہم نے ڈاکٹر رڈولیف سے کہہ رکھا ہے کہ ہمارے بچے کو اپنے پاس بلانے اور اس کے مستقبل کو بہتر بنانے میں ہماری مدد کریں ۔ !"

جی : رحمٰن صاحب نے کہا ۔ بہت خوش تھے! " آپ نے یہ ساری کارروائی چپکے چپکے کر لی بھائی صاحب!"

ہاں بیٹے ۔ جو کام تمھاری لائن کا نہیں ہے ۔ اس میں ہم تم سے کیا مشورہ لیتے : بڑے ابا نے کہا : بہرحال اب ہمیں سنجر کے تکملہ تعلیم کا انتظار ہے ۔ بہت کم دن رہ گئے ہیں ۔ انشاءاللہ تعالیٰ چھ ماہ میں ضروری کارروائی بھی مکمل ہو جائے گی ۔ ! ہم سنجر کو میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی بھجوا دیں گے!"

پانچ سال کے لیے ؟ : رحمٰن صاحب نے دریافت کیا

ہاں ۔ پانچ یا چھ سال کے لیے ؟ : جتنے بھی برس کا کورس ہوگا ۔

بڑے ابا نے کہا ۔ پھر بولے :

اور اسے گھورتا ہوا وہ کمرے سے نکل گیا ۔

امرینہ نے کوٹ پہنا اور پھر آئینے کے سامنے گھوم پھر کے اپنی وضع قطع کا جائزہ لینے لگی ۔ سنجر کمرے سے نکلا تو آپ ہی آپ ہنس رہا تھا!۔

امرینہ نے اپنی ممی اور چچی جان کو بڑے ابا کا تحفہ دکھایا ۔

ارے یہ کب خریدا بھائی صاحب نے ؟ ۔ انھیں بھی اتنی عمدہ چیزیں لینی آتی ہیں " چچی جان دنگ تھیں

یہی ایک کوٹ تھوڑی : ممی نے فخریہ کہا " انھوں نے تو نجانے اب تک کتنی چیزیں دی ہیں ۔ بٹیا لا کے بتا دو تو!۔

امرینہ بھاگی گئی اور نجانے کیا کچھ الم غلم لا کے ان کے سامنے رکھ دیا پھر اس کی نظریں اٹھیں ۔ ریڈیو کی میز سے لگا سنجر کھڑا تھا ۔ امرینہ نے شرارت سے کہا ۔ ممی عرفی بھی کو تھوڑی ۔ انھوں نے تو سنجر بھائی کو بھی بڑا اچھا بش شرٹ پیس دیا تھا!"

دکھایا نہیں سنجر نے ؟ " ممی نے کہا ۔ پھر وہ ہنسنے لگیں " اب تو بھی مجھے بھی کپڑے لتے خریدنے کی فکر لگ گئی ہے ۔ اللہ رکھے ۔ نوشینہ کا بیلا بچہ تو ہمارے ہی یہاں ہوگا نا ؟ "

خرید لیں گے ابھی سے کیا جلدی ہے ؟ " چچی جان نے کہا ۔

امرینہ ابھی ابھی پھر گئی اور سنجر کا وہ بش شرٹ لے آئی ۔ جو کچھ ہی دن ہوئے اس نے سلوا کر الماری میں لٹکا دیا تھا ۔

چچی جان مسکرائیں " وہ کوئی دوسرا ہوگا ۔ یہ تو اس کے ڈیڈی پچھلے مہینے اس کے لیے لائے تھے ۔

گا ؟ " امرینہ حیرت سے بولی ۔ اے تو سنجر نے یہی چھپا رکھا کے

کھو بیٹھی اسے!۔

یک بیک امرینہ کو طرارہ آگیا: کون ہوتے ہیں آپ میری چیزیں دیکھنے والے۔ جائیے یہاں سے۔ میں خود دیکھ لوں گی۔!"

"کہہ دوں گا۔ سب کہہ دوں گا۔ بڑے ابا سے۔ جا رہا ہوں:

امرینہ نے چونکہ دلیر بننے کا تہیہ کر لیا تھا۔ لہٰذا بولی: جائیے۔ جائیے شوق سے کہہ دیجئے۔ میں خود جا کے بڑے ابا کا شکریہ ادا کر آؤں گی!

کیا؟ کیا؟: وہ بوکھلایا۔

مگر امرینہ اس کی کیفیت سے بے نیاز بنڈل ادھیڑنے میں مشغول تھی۔ انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے سنجر بے حد پیار سے مسکراتا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

آئل کلاتھ ادھڑا اور اس میں سے بے حد نفیس اور قیمتی سمور کا لیڈیز کوٹ برآمد ہوا۔ آناً فاناً وہ بھول گئی اپنا غصہ اور برہمی، دونوں ہاتھوں میں کوٹ دبوچا اور سینے سے لگا لیا۔!

"اف فوہ۔ کتنا پیارا ہے: سنجر نے حسد کے مارے جلے ہوئے لہجے میں بولا اور چہرہ پر غصہ بکھیر لیا: واہ بھئی۔ تمہارا اتنا خیال ہے انھیں۔ میرا بالکل نہیں۔ کک۔ کیا۔ سردی مجھے نہیں لگتی۔ میں ابھی جا کے کہتا ہوں دے کیا میں ان کے بھتیجہ۔ بھائی کا بیٹا نہیں؟: غصے کے مارے وہ کانپ رہا تھا۔ امرینہ بے تحاشا ہنس رہی تھی!۔

۔ اچھا اچھا۔ ہنس لو۔ میں بھی دیکھ لوں گا۔ جب تک ایسا ہی کوٹ نہ خرید لوں گا۔ تم سے بات نہیں کروں گا۔"

ارے تو میں نے کیا کیا ہے۔ جا کر بڑے ابا سے کہئے: امرینہ بولی

ہم بھی عنقریب، شاید جا دا جائیں گے۔

آپ کیوں جائیں گے بھائی صاحب: جلدی سے ممی نے پوچھا۔

بیٹی وہ قرآن مجید کے تفسیر و ترجمہ کے سلسلہ میں ایک بورڈ انڈونیشیا جا رہا ہے اس کا صدر ان پروفیسروں نے ہمیں بنا دیا ہے کوئی اور کام غیر ضروری ہوتا تو شاید ہم انکار کر دیتے لیکن اب تو ہم مجبور ہیں۔ یہ کام ایسا ہے جس سے انکار صریح گناہ ہوگا:

بڑے ابا۔ گستاخی معاف: سنجر نے چپکے سے پوچھا: مجھے یہ بتائیے کہ آپ کی تعلیم۔ مطلب یہ کہ۔ آپ کہاں تک۔! وہ گڑبڑا کر چپ ہو گیا انھوں نے اس کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ بولے۔

" میاں۔ علم تو وہ بحر زخار ہے۔ جس کی تہہ اور جس کے ساحل کا پتہ نہ کبھی چلا ہے اور نہ کبھی چلے گا۔ ہم نے بس معمولی سی تعلیم حاصل کی ہے یوں کہو کہ لامحدود علم کو ڈگریوں میں محدود کر دیا ہے۔!"

ایم اے ہیں آپ: نہایت احمقانہ انداز میں سنجر نے پوچھا۔

ہم نے تین دفعہ ایم اے کیا اور دو دفعہ ڈاکٹریٹ: انھوں نے نہایت ہی لاپرواہی سے کہا۔

سنجر اپنا سر سہلانے لگا۔ وہ تو معمولی سے پریکٹیکل میں بیس پچیس نشانات زیادہ حاصل کر کے جامے سے باہر ہوا جا رہا تھا! اس کے غرور کا غبارہ ایسی تیسی ہو کر رہ گیا۔!

اچھا تو بھائی صاحب۔ آپ کی روانگی کب ہوگی اور آپ واپس کب آئیں گے؟: رحمٰن صاحب نے پوچھا۔

ابھی کچھ اطلاع ہمیں مصدقہ طور پر ملی نہیں ہے: انھوں نے کہا

"اور نہ ہمیں خود پر اس قدر اعتماد ہے کہ جو کام ہمارے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ کما حقہ انجام بھی دے سکیں گے کہ نہیں"۔ وہ خفیف سا مسکرائے "کام بھی ایسا نازک کہ جہاں احباب کی ذرا سی غلطی پر کفر لازم آ جائے۔!"

سنجر ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ دوران گفتگو میں وہ رہ رہ کے اس کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ ان کی اس "دزدیدہ نگاہی" سے سنجر بوکھلایا جا رہا تھا! لیکن اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اٹھ کر چلا جاتا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا پہلے کی چٹختی ہوئی انگلیاں دوبارہ چٹخانے لگا۔!

اتنے میں امرینہ کافی کی کشتی لائی۔ اور دور میز کے پاس کھڑی ہو کر کانپتے ہاتھوں سے کافی بنانے لگی۔!

وہ خود تو دست بدست کافی دے نہ سکتی تھی۔ اس کا دم نکلتا تھا۔ لہٰذا جب وہ کافی بنا چکی تو اس نے بڑی مہارت سے سنجر کو اشارہ کیا کہ وہ پیالیوں سے لبریز ٹرے اٹھا کر لے جائے۔

وہ نہایت شرافت سے اٹھا اور نہایت سعادت مندی سے امرینہ کا حکم بجا لایا۔!

اس ایک ایکٹ کے ڈرامہ کو بڑے ابا نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے دیکھا۔ پھر ممی نے پوچھا۔

"ہمیں آج تک یہ نہ معلوم ہو سکا ناظم بی بی کہ۔ تمہاری یہ دوسری لڑکی ماشاءاللہ کیا پڑھ رہی ہے؟"

"انٹرنس میں ہے۔ بھائی صاحب!"

"سائنس پڑھ رہی ہے کہ ادب!"

"جی سائنس!"

دے دوں؟" وہ مسکرایا۔ نجانے کیوں مسکرا دیا تھا۔ امرینہ کو آج اس کے تبسم میں لڑکپن کی سطحیت نظر نہ آئی۔ اس کے تبسم میں سنجیدگی تھی اور کیا بات تھی۔ نجانے کون سی بات۔! وہ اپنے ہاتھ اس کی کلائی پر سے ہٹا نہ سکی ارادے کے باوجود جنبش نہ کر سکی۔ جیسے اس کے ہاتھ اس کی کلائی پر جم گئے تھے۔ اور رگ وپے میں ایک نامانوس سی سنسنی پھیل گئی تھی۔ اس کی پلکیں جھک گئیں۔ اسے احساس تھا کہ اب سنجر ایک لاابالی لڑکا نہیں رہا تھا۔ وہ مرد بن چکا تھا!۔ اس سے بے تکی باتیں کرنا اس سے لڑنا بھڑنا بالکل ٹھیک نہیں۔ یہ لوگ دل میں کچھ اور سوچ لیتے ہیں۔! کیا وہ سنجر کو بھی موقعہ دے گی کہ وہ امرینہ کی ذات سے اپنی سوچیں وابستہ کر دے۔ اس نے ہمیشہ اس کا مضحکہ اڑایا تھا اسے رلا کے ستا کے اس نے بے حد لطیف لیا تھا!۔ اور اگر۔ وہ واقعی قول وفعل میں جھوٹا نکل جائے۔ تب۔ تب کیا امرینہ کوئی روگ لگائے گی۔! اور حسرت نصیب زخم خوردہ لڑکیوں کی طرح آہیں بھر بھر کے خود سے کہے گی کہ۔ اسے ایک بے زنا مرد نے دھوکا دیا۔

چھی چھی۔ توبہ ہے!

وہ بوکھلا کر بیٹھی۔ سنجر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اس نے بڑے مدھم لہجے میں پوچھا۔

وہ چپ رہی!۔ سنجر دروازے کے پاس کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ۔ وہ۔ یہ۔ بنڈل میز پر رکھ دیجئے۔ میں دیکھ لوں گی"۔

"میں نہ دیکھوں اس میں کیا ہے؟" وہ پھر کرسی پر آ بیٹھا۔

"دیکھئے!"

امرینہ جھلا گئی: "ضروری کام ہو تو آئیے۔ ورنہ۔ جائیے۔!"

"کیا بات ہے۔ بڑی بد اخلاق ہو گئی ہو" سنجر اندر آیا۔ اور کھڑا رہا۔

"اجازت ہو تو تھوڑی دیر بیٹھ جاؤں۔!"

ہونٹ چبا کر امرینہ نے اسے گھورا۔

وہ کرسی پر ٹک گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک میڈیم سائز کا بنڈل تھا۔ وہ اس نے امرینہ کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ کیا ہے"

"ہمیشہ تم مجھ سے یہ بے لفظی سوال کرتی ہو" سنجر ہنستا گیا: "مدتوں سے اس میں زیر زبر کا بھی رد و بدل نہیں ہوا۔ اور تمھیں اس کا جواب بھی معلوم ہے کہ میں تمھارے سامنے ہی دیکھتا ہوں۔ جو چیز بڑے ابا میرے ہاتھ سے تمھیں بھجواتے ہیں!"

"آپ اتنے چڑچڑے کیوں ہو رہے ہیں!"

"ان کے اور تمھارے درمیان وسیلہ بنتے بنتے عاجز ہو چکا ہوں!"

"ارے تو کون سے گھٹ گئے۔ کہہ دیجیے ان سے کہ مت دیں مجھے کچھ بھی!" امرینہ کو بھی غصہ آ گیا۔

"اچھی بات ہے۔ اب تو ضرور کہہ دوں" سنجر اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر سے بنڈل بھی اٹھا لیا: "کہہ دوں گا۔ کچھ مت دیجیے۔ نہ میرے ہاتھ سے نہ اپنے ہاتھ سے۔ وہ آپ کی محبت اور عنایت کے قابل ہی نہیں ہے!"

"اچھا اچھا۔ بہت بقراط بن چکے" امرینہ نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا: "دیجیے میری چیز۔!"

"آسان معلوم ہوتا ہے اسے اپنا نصاب!؟"

بڑے بوڑھے کی طرح کھنکار کر سنجر نے فرمایا: "جو کچھ مشکل ہوتا ہے۔ وہ میں بتا دیتا ہوں بڑے ابا۔!"

"اچھا اچھا" وہ کھانسے اور خالی پیالی ایک طرف بڑھا دی جسے رحمٰن صاحب نے جلدی سے لے کر واپس ٹرے میں رکھ دی۔

امرینہ نے کھا جانے والی نظروں سے سنجر کو دیکھا۔ اس نے بڑے ابا کے سامنے نکلنے کھڑے ہو کر چھوٹے موٹے کام کرنا ابھی حال سے شروع کیا تھا کیونکہ انھوں نے دالان میں آ کر سب کے سامنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا معمول بنا رکھا تھا۔!

اچانک انھیں کیا سوجھی۔ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے: "آدمی کا کیا بھروسہ۔ آہ۔ ہمارا سلمان صرف چالیس بیالیس ہی میں چل بسا۔ اللہ کی مرضی" وہ ایک لمحہ چپ رہے پھر بولے: "خدائے کریم نے نوشینہ بٹیا کو اپنے گھربار سے کر دیا۔ اب ہمارا بے حد دل چاہتا ہے کہ۔ اپنی آنکھیں بند ہونے سے پہلے ہم اپنی اس بچی کو بھی اچھی جگہ بیاہ دیتے فاطمہ بیٹی۔ تم شاید سوچتی ہو کہ بھائی صاحب ان باتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہے ہم تمھیں بتا دیں کہ اس ترقی پسند زمانے میں بھی ہم بہت پرانے زمانے کے سوچتے ہیں۔ ہم لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کو اتنا اہم نہیں سمجھتے! ہمیں یہی پسند ہے کہ شریف گھرانوں کی بے زبان بچیاں جلد از جلد اپنے گھربار سے آباد ہو جائیں! بس:"

سب سانس روکے ان کی تقریر سن رہے تھے!۔ امرینہ کا سارا بدن ٹھنڈا تھا وہ تخت کے کنارے رکھے زبردست گاؤ تکیے کے پیچھے دبک گئی۔ خواتین کے چہروں پر اطمینان و مسرت کی لالی تھی۔ رحمٰن صاحب مودبانہ انداز میں مسکرا

رہے تھے ۔ بڑے ابا سر جھکا کر اپنا سگار سلگا رہے تھے ۔ اور سجرہ حق نق
ایک ایک کا چہرہ تک رہا تھا اور اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا ۔
بڑے ابا نے دقیانوسی کھوسٹ بڈھیوں تک کو ہرا پھینکا ۔ ارے ۔ وہ
بھی کتابیں ایسی بوسیدہ باتیں نہ کریں ۔!
واہ بھئی ۔ ابھی سے کہاں امرینہ کا بیاہ ۔!
اب اچھا لڑکا آپ ہی کو دیکھنا ہے ۔ بھائی صاحب ۔! ممی نے چپکے
سے کہا ۔
ہاں ۔ اور کیا ۔؟" انھوں نے سرسری سا جواب دیا اور سگار کا ایک
میل لمبا کش لے کر فضا دھواں دھار کر دی ۔!
اگر ۔ ممی کھسیائی ہنسی ہنس کر بولی ۔ آپ نے سچ مچ اچھا لڑکا دیکھ
لیا بھائی صاحب ۔ تو ۔ تم ۔ میرے پاس تو ۔ اس کے جہیز کے نام کا ایک
تنکا بھی نہیں ۔!
فراہم ہو جائے گا ۔ وقت پر ۔!" بڑے ابا بولے ۔
اور کیا ۔ رحمان صاحب نے لقمہ دیا ۔
ان سب کے لیے یہ امر کتنا باعث مسرت تھا کہ بھائی صاحب ان میں
اس طرح گھل مل گئے تھے ۔ اس طرح کی باتیں کرتے تھے ۔! انھیں معلوم ہوتا
تھا کہ وہ لوگ ایک سنگین قلعہ میں محفوظ و مامون بیٹھے ہیں ۔ ان کے سر
پر نہایت زبردست چھت ہے ۔! انھیں نہایت مضبوط سہارا نصیب ہے
اور شاید ان کو یہ بھی خوش فہمی تھی کہ یہ چھت کبھی نہ گرے گی ۔ یہ سہارا قیامت
تک نہ چھوٹے گا ۔!
پھر وہ کسی کام سے اٹھ کر باہر چلے گئے ۔!

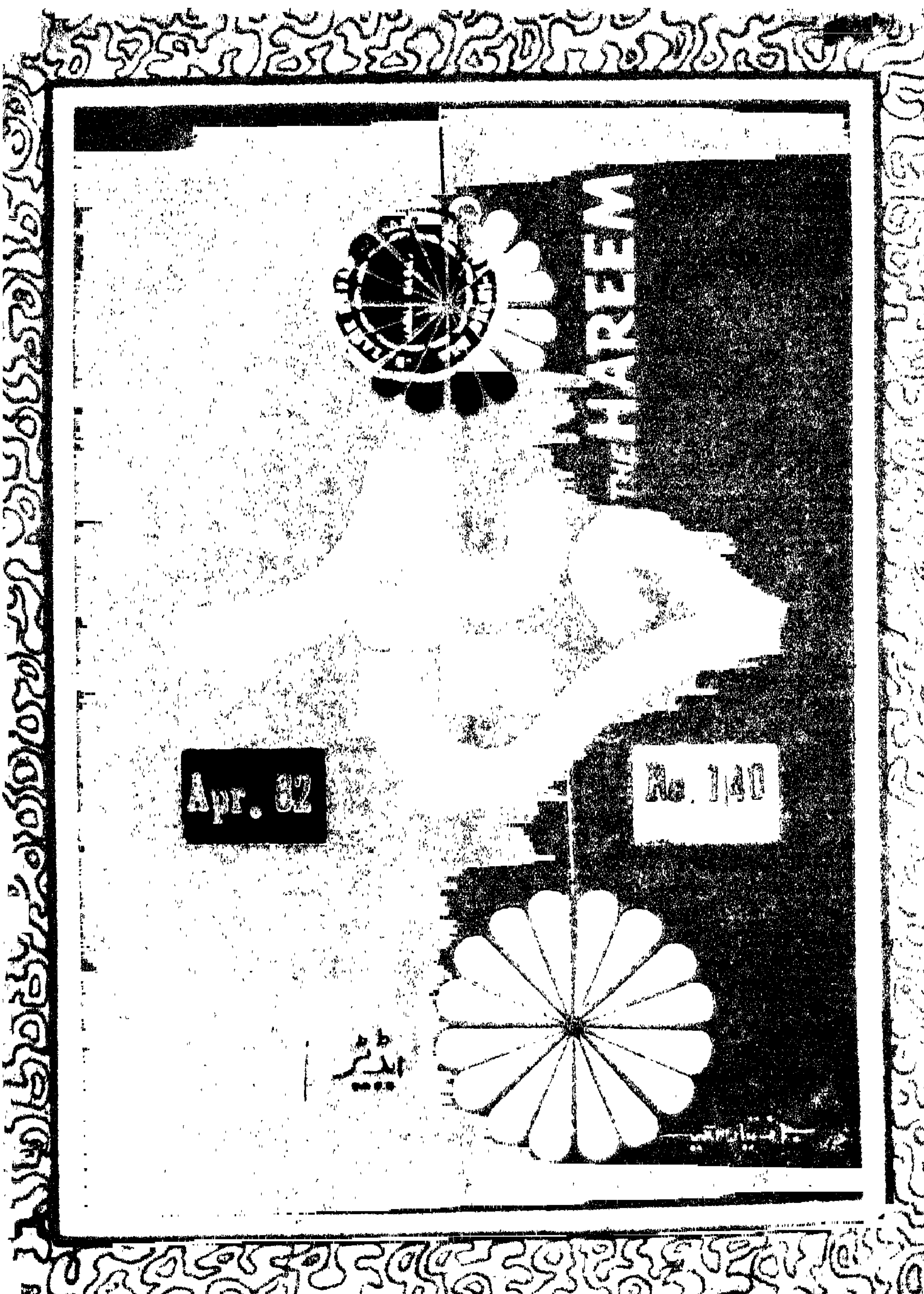
امرینہ بھاگ کے اپنے کمرے میں آ گئی ۔ اور بے حد غصے سے سوچنے
لگی کہ آخر بڑے ابا کو آج یہ کیا سوجھی تھی ۔! انھوں نے جلدی کے مارے
باجی کی شادی کر دی ۔ اب دیکھو کہ ان کا کیا حال ہے ۔ نہ ان سے کھانا
کھایا جا رہا ہے نہ ایک گھونٹ پانی ہی انھیں نصیب ہے ۔ جناب ماں
بن رہی ہیں ۔ اگر اسی طرح ماں بنا جاتا ہے تو اس اعزاز و اکرام کو دور
ہی سے سلام ۔! بے چاری افسانہ نگار تھیں ۔ ناول نویس تھیں ۔ اونچی
اڑان کی تمنا رکھتی تھیں ۔ اور اب کیا ہے ۔؟ آہ ۔ آہ ۔ ان کے نامکمل
افسانوں پر گرد جمی ۔ ادھورا ناول اپنے انجام کو رو رہا ہے ۔ وہ کسی
دوسری ہی تخلیق میں سرگرداں ہیں ۔!
یہی انجام اس کا بھی ہوگا ۔ ہنھ ۔! وہ بھی ماں بننے کے مراحل سے
گزرے گی ۔ ننھا منا سا ایک وجود اس کی آغوش میں ہمکے گا ۔! وہ ایک
بیک جھلا گئی ۔ جناب وہ سارا خوف چھپر پر رکھ کر بڑے ابا سے
کہہ دے گی ۔ آپ نے اپنی تمنا باجی پر نکال لی ۔ الجھا دیا انھیں گرہستی
کے چکر میں ۔ مگر از راہ کرم اسے معاف کریں وہ تو یقیناً اپنی پرنسپل کی
طرح ملازمت کرے گی ۔ ایسے کسی نک چڑھے آدم خور کی بیوی بننا
نہیں ہے ۔! بالکل انکار کر دے گی وہ ۔ کیا کریں گے بڑے ابا ۔ کیا
اسے حلال کر کے پھینک دیں گے ؟! بس انھیں خونخوار آنکھوں سے
گھوریں گے ۔ توپ تنا آواز میں گرجیں گے دہاڑیں گے بازو اس کے
سوا کیا کریں گے ؟ ۔ وہ خود اپنا دل مضبوط کرے کہ ان سے نہ ڈرے گی
بس ۔ اب کیا چاہیئے ۔!
" محترمہ ۔ میں اندر آ سکتا ہوں ۔!"

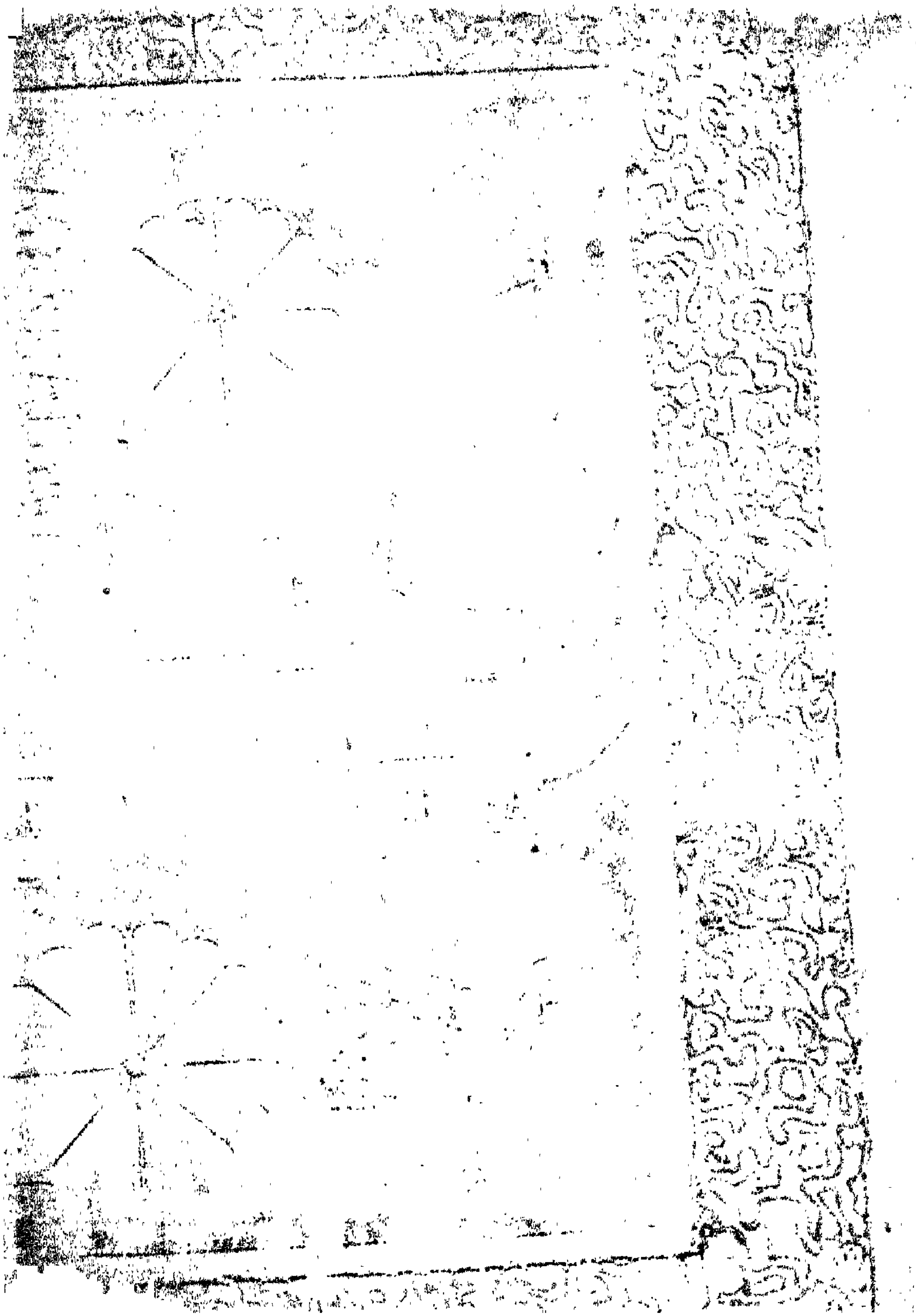
The Hareem, Lucknow March 1962 (Ph[illegible] 44559, 45[illegible] [illegible] No. LW/[illegible]

786

درد آشنا

PRICE Rs. 16/-


THE HAREEM
Apr. 82
Rs. 1.40
ایڈیٹر



گذشتہ ۵۲ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اُردو کا سب سے پرانا رسالہ ہے

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
و
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۲ | فہرست مضامین ماہ اپریل ۸۲ء | نمبر ۴

اڈیٹر و نگراں

نسیم انہونوی

معاونین

شوکت جہاں بیگم و جانی بیگم ردولوی

فی شمارہ کی قیمت	..	۱-۴۰	روپیہ
چندہ سالانہ	منی آرڈر سے	-/۲۲	روپیہ
چندہ مخصوص	مخصوص	-/۲۵	روپیہ
چندہ سالانہ	اعزازی	-/۲۷	روپیہ

وی پی سے منگوانے پر چار روپئے پچاس پیسے زائد روپیہ
غیر ممالک سے -/۶۵ روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی۔میل۔ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

ناشر .. .. .. نسیم انہونوی

آفس و ترسیل زر کا پتہ :۔
نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
فون آفس :۔ ۴۲۵۵۹ ۔ رہائش ۔ ۴۵۳۳۲
نسیم انہونوی نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

لمعات

عورتوں پر مردوں کے ظلم واستبداد کی کہانی اتنی پرانی ہے کہ اس کی ابتدا کا پتہ لگانا بھی دشوار ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی تبدیلی کسی دور میں بھی پیدا نہیں ہو سکی۔ دنیا کے مختلف حصوں میں طرز معاشرت کیسا ہی کیوں نہ ہو، عورت مرد کے ستم اٹھانے پر مجبور رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے طریقے مختلف ہوں۔ میں بھی اپنے گرد وپیش کا جائزہ لیتا رہتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کمتر ہی مرد اپنی بیویوں کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ اسلامی قانون اور اسلامی معاشرے کے تحت ایک مرد کو زوج کی حیثیت سے صرف اپنی بیاہتا بیوی کو ہی دیکھنا چاہیئے۔ بلاشبہ اگر اس نے ایک سے زائد شادیاں کر رکھی ہیں تو اپنی حیثیت کو مساویانہ طور پر تقسیم کرنا چاہیئے اس لئے کہ اسلام نے اس کی ہدایت کی ہے۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ لوگ دوسری شادی کرنے کے لئے تو اسلامی قانون کا جواز تلاش کر لیتے ہیں، لیکن اسلام نے اس سلسلہ میں جو پابندیاں عائد کی ہیں ان کا ذرہ برابر بھی خیال نہیں رکھتے۔ عموماً پہلی بیوی کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور دوسروں پر فدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا ظلم ہے، اس لئے اس سے پہلی بیوی کو قلبی اور ذہنی اذیت پہنچتی ہے۔

کچھ ایسے بھی شوہر ہوتے ہیں جو باضابطہ دوسری شادی تو نہیں کرتے، لیکن دوسری عورتوں کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ اسطرح فطری طور پر جو محبت انھیں اپنی بیوی کے ساتھ کرنا چاہیئے نہیں کر پاتے۔ اور یہ بھی ظلم ہی کہا جا سکتا ہے۔

کچھ ایسے بھی شوہر ہوتے ہیں جو دوسری شادی بھی نہیں کرتے اور دوسری عورتوں کے چکر میں بھی مبتلا نہیں ہوتے، لیکن یار دوستوں سے بیوی کے مقابلے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ بیوی گھر میں شوہر کے انتظار میں کھانا لئے بیٹھی رہتی ہے اور شوہر صاحب دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح یا رمی وغیرہ کھیلنے میں پھنسے رہتے ہیں اور راتوں میں [illegible] گھر آتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا ظلم ہی ہوتا ہے عورتوں کے ساتھ۔

کچھ ایسے مرد ہوتے ہیں جو شراب پیتے ہیں اور نشے میں جھومتے ہوئے کافی رات گئے گھر واپس آتے ہیں۔ چیختے چلاتے ہیں، بیوی کو گالیاں دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ مار پیٹ کرتے ہیں۔ غریب بیویاں سب کچھ برداشت کرتی ہیں ـــ ایسے مرد بھی ظالم ہی کہے جائیں گے۔

ایسے مرد بھی اب تو عام ہوتے جا رہے ہیں جو بیویوں سے ملازمت کراتے ہیں۔ جس طرح وہ دفتروں میں جاتے ہیں بیویاں بھی اسی طرح آفس جاتی ہیں اور مردوں کے ساتھ دفتری فرائض انجام دیتی ہیں۔ عورتیں بھی انسان ہوتی ہیں ان کے بھی نفس ہوتا ہے۔ دفتروں میں مردوں سے تعلقات ہو جاتے ہیں ناجائز نہ سہی جائز ہی سہی، ہونا تو ایک فطری چیز ہے، لیکن بیویوں کی کمائی کھانے والے مرد یہ بھی چاہتے ہیں کہ بیوی دریا میں رہ کر بھی دامن تر نہ ہونے دے ظاہر ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہو سکتا۔ شک شبہ کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔ معترض ہوتے ہیں ایسی بیویاں، ان بیویوں سے مختلف ہو جاتی ہیں جو کلیتاً شوہر ہی کی دست نگر رہتی ہیں۔ وہ دیکھتی اور سمجھتی ہیں کہ خود دوسری عورتوں سے ملنا، ان کے ساتھ پھرنا خود معیوب نہیں سمجھتے اور بیوی کو ایسا کرنے سے روکتے ہیں۔ یہ بھی مرد کا ظلم ہی تو ہے کہ دفتروں میں بیویوں سے سروس کرانے پر بھی چاہتے ہیں وہ سیتا اور ساوتری کی مماثل بنی رہیں۔ اسی طرح کے اور بھی مرد ہوتے ہیں جو مختلف طریقوں سے بیویوں پر ظلم کرتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ خود عورت عورت کے ساتھ کیسے ظلم کرتی ہے۔ مرد تو پیدائشی ظالم ہے ہی اور اس پر ہمیشہ عورتوں پر ظلم کرنے کا الزام لگتا رہا ہے۔ اور میرے خیال سے اس ظلم کی اہمیت زیادہ ہے جو عورت عورت کے ساتھ کرتی ہیں۔

ذرا سوچئے کہ ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ زندگی گزار [illegible]

کہ دوسری عورت اس کے شوہر سے شادی کر لیتی ہے اور اس کے بعد پہلی بیوی کی زندگی ایک عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔ شوہر کی تمام توجہ دوسری بیوی پر مبذول ہو جاتی ہے پہلی کا سکھ چین ختم ہو جاتا ہے اور مختلف صورتیں بھی رونما ہو جاتی ہیں۔ گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ طلاق دے دی جاتی ہے یا لونڈی کی طرح زندگی گذارنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ کیا دوسری شادی کرنے کا الزام مرد ہی پر لگانا انصاف کہا جا سکتا ہے، اگر عورت نہ چاہے تو مرد کیسے دوسری شادی کر لے۔ اس لئے میرے خیال میں عورت کا یہ ظلم اپنی ہی جنس کے ساتھ مرد کے ظلم سے بھی زیادہ قابل نفرت ہے۔

ایک اور ظلم بھی عورت، عورت کے ساتھ کرتی ہے اور وہ ساس بہو کے تعلقات کا ظلم جو عموماً ہر گھر میں ہوتا رہتا ہے۔ اسکی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ساس بہو پر ستم توڑتی ہے اور دوسری یہ کہ بہو ساس کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے اور اکثر اس کے بچے کو اس سے جدا کر کے ایسا ستم ڈھاتی ہے کہ ساس کی زندگی ایک عذاب ہو جاتی ہے، دکھلانے کے لئے بڑے چاؤ اور ارمان سے بہو لاتی ہے لیکن بسنے کے بجائے گھر اجڑ جاتا ہے ۔۔ غرض عورت کا یہ ظلم جو ساس بہو کے ساتھ کرتی ہے یا بہو ساس کے ساتھ ایک بدترین قسم کا ظلم کہا جا سکتا ہے جو عورت خود عورت کے ساتھ کرتی ہے۔

ایک بہت ہی بڑا ظلم عورت پر یہ ہو رہا ہے کہ جہیز کم لانے پر بہو کو اس درجہ ستایا جاتا ہے کہ اکثر وہ خودکشی کر لیتی ہے۔ جو خبریں اخبارات تک پہنچ پاتی ہیں ان کی تعداد بھی کافی ہوتی ہے۔ اس ظلم میں بھی میں سمجھتا ہوں کہ مرد سے زیادہ عورت ہی کا ہاتھ ہوتا ہے اکثر ساس، نندیں اور بھاوجیں ہی ایسے ظلم کی موجب بنا کرتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شوہروں کا دخل اس سلسلہ میں نہیں ہوتا، لیکن زیادہ الزام عورتوں ہی پر آتا ہے۔

عورتوں کے مظالم کا ایک سلسلہ آزادیٔ نسواں کے تحت اب کم ہوتا جا رہا ہے اس لئے کہ عورت اب وہ عورت نہیں رہی جو سو پچاس سال پہلے ہوا کرتی تھی، وہ جسے ہر لمحہ یہی فکر دامن گیر رہا کرتی تھی کہ اگر اسکے شوہر کا انتقال ہو گیا یا خدانخواستہ کرم پھوٹ گیا تو کیا ہوگا۔ وہ کیا کرے گی اور اس کے بچے کیسے پلیں گے۔ لیکن اب یہ خوف بڑی حد تک کم ہو گیا ہے۔ تعلیم نے عورت کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھا دیا ہے اور وہ خود سروس کرنے لگی ہے۔ بلکہ اکثر اس کی تنخواہ مرد سے زیادہ ہوا کرتی ہے۔ اس لئے اسے کوئی پروا کھانے پڑنے کی نہیں ہوتی کہ وہ بیکار کے ستم اٹھائے۔

ایک محاسبہ کے تحت یہ خبر اخبارات میں چھپی ہے کہ صوبہ مدھیہ پردیش میں ۱۹۸۲ء کے اندر ہر آٹھ گھنٹے کے اندر ایک عورت زنا بالجبر کا شکار ہوئی ہے یعنی سال میں گیارہ سو عورتیں برباد کی گئیں۔ اور یہ وہ اعداد و شمار ہیں جن کا اعلان ہوا ہے۔ واضح رہے کہ ایسے شرمناک واقعات کو ۹۹ فی صدی شرفا ظاہر ہی نہیں ہونے دیتے اس لئے کہ "بالجبر" ہی سہی، لڑکی بدنام ہو جاتی ہے اور پھر اس سے شادی کرنے پر شاذ ہی مرد آمادہ ہوتے ہیں اس لئے خود لڑکیاں اس کو راز ہی رکھتی ہیں اور علم ہو جائے تو والدین پردہ ڈالتے ہیں۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر اندازہ کیا جائے تو بالجبر عصمت دری کے ہزارہا واقعات صرف ایک صوبہ میں ہوتے ہوں گے اور پورے ہندوستان کی بات سوچئے تو نوبت لاکھوں تک پہنچے گی۔ میں نہیں کہتا کہ "بالجبر" آبرو ریزی پہلے نہیں ہوتی تھی، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس وقت ایسے واقعات آج کے مقابلہ میں ایک فی ہزار بھی مشکل ہی سے ہوتے ہوں گے۔ اس کی یہ وجہ پردے کی مخالفت کی جاتی ہے۔ جو اس کی سب سے بڑی روک تھا۔ آزادی، فیشن پرستی اور بے راہ روی کو ہوا دی جا رہی ہے جو اس "بالجبر" کے سب سے بڑے اسباب ہیں۔

شکریہ

محترم بہن مسز معصومہ یعقوب صاحب (صفات۔ کویت) نے اور بہن تاج النساء صاحبہ نے ملو دیشرم سے ازراہ برادر نوازی عجوہ کھجوروں کے پارسل روانہ فرمائے ہیں جس کے لئے تہہ دل سے میں شکر گزار ہوں۔

نسیم اہتولوی

۸۲ء اردو کے لئے ایک منحوس سال

ابھی سال نو کی ابتدا ہی تھی کہ مشہور اہل قلم، اردو اور فارسی کے متبحر عالم، قابل استاد اور نقاد ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل صاحب ۷۲ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے مرحوم پہلے کانپور کرسچن کالج اور پھر لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی سے متعلق رہ کر ریٹائر ہوئے تھے۔ اس کے بعد اردو اکاڈمی نے آپ کی خدمات سے برسوں استفادہ کیا تھا۔ ایسے سلیم الطبع استاد اس دور میں عنقا ہیں۔ مرحوم کی علمی

کتاب "مرو وغزل" کے پچاس سال منظر عام پر آنے کا فخر میرے ادارہ کو حاصل تھا۔ پروفیسر خلیل صاحب کے بعد ۲۰ فروری کو مولانا سید ابو الحسن ندوی کے خواہرزادہ مولانا محمد ثانی حسنی ایڈیٹر ماہنامہ رضوان لکھنؤ صرف ۵۵ سال عمر میں انتقال فرما گئے۔ بڑے قابل اور علم وعمل کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ رضوان مسلم بچیوں کے لئے نہایت مفید اور اصلاحی ماہنامہ حسنی صاحب کا مسلسل کارنامہ تھا فروری اور مارچ میں اردو کے دو ستون ایسے گر گئے جن کی تعمیر ممکن نہ ہو سکے گی۔ یہ ستون تھے جوش ملیح آبادی جنھیں شاعر انقلاب کہا جاتا تھا۔ اور جن کی طبیعت شاعری کا جواب نہ تھا نہ غالباً ہو سکے گا۔ دوسرا ستون فراق گورکھپوری تھے۔ جن کی شاعرانہ گھن گرج سے بچہ بچہ واقف تھا۔ ان کا انتقال ہندوستان میں اردو کے لئے زبردست نقصان ہے۔ ان جیسا اردو نواز اور اہو مار اردو کے حق کے لئے صاف گوئی سے کام لینے والا کوئی دوسرا برادر وطن نظر نہیں آتا۔ انھوں نے اردو کی ہمنوائی میں ایسی کھری کھری باتیں کہی تھیں جنھیں کہنے کی دوسرا کوئی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔ افسوس کی شقی فیض نے ہی ان دو عظیم شخصیتوں کو ہم سے چھین لیا۔ جن پر زبان اردو کو ناز تھا۔

حریمی بہنوں اور بھانجیوں کے لئے ایک خوشخبری

حریم پڑھنے والی صدہا حریمی بہنیں اور بھانجیاں ایسی ہیں جو مجھ سے پرخلوص محبت رکھتی ہیں اس لئے ان کی اطلاع کے لئے لکھ رہا ہوں کہ میرے فرزند دلبند عزیزی سید محمد فہیم سلمہ کی شادی طے ہو گئی۔ اللہ پاک چاہے گا تو یہ تقریب ۲۰ مئی کو عمل میں آجائے گی۔ میری مخلص حریمی بہنیں اور بھانجیاں مجھے برابر اپنے گھروں کی تقاریب پر دعوت نامے بھیجا کرتی ہیں چاہتا تو میں بھی ہوں ان تمام بہنوں اور بھانجیوں کو دعوت شرکت دوں۔ لیکن جب چاہتا ہوں تو اپنا دامن تنگ پاتا ہوں۔ بلانا آسان ہے۔ لیکن قیام و طعام کا انتظام ان کی حیثیت کے مطابق کرنا میرے امکان میں کہاں، ورنہ خوشی تو بہت ہوتی اگر میں دیکھتا کہ میری صدہا حریمی بہنیں اور بھانجیاں میری اس خوشی میں شریک ہیں۔ پھر بھی جو بہنیں قیام وطعام کے سلسلہ میں تکلف نہ محسوس کریں، تشریف لائیں بڑی خوشی ہوگی۔ البتہ قبل از وقت مجھے آمد و واپسی کے پروگرام سے آگاہ فرمائیں تاکہ حسب مقدرت انتظام کر سکوں۔

نسیم انہونوی

اضافہ

[illegible] گذشتہ [illegible] کہ حریم کی سالانہ قیمت میں ایک روپیہ سالانہ کا اضافہ کیا گیا تھا کہ اس کے بعد [illegible] تک دو ایسے اضافے بھی کئے ہیں جن سے حریم بھی متاثر ہوا [illegible] تو فیس رجسٹری میں پچاس پیسے اضافے کا ہے۔ [illegible] ڈاک سے معمولی پرچوں کی روانگی کا ہے۔ اب دو پیسے فی پرچہ [illegible] پانچ پیسے لگا کریں گے اور سالنامہ پر دس کے بجائے تیس یا چالیس [illegible] لگے۔ اس طرح وی۔ پی کا محصول اب چار روپیہ کے بجائے چار روپیہ پچاس پیسے ہو جائے گا اور ایک روپیہ محصول کے سلسلہ میں سالانہ بڑھانا پڑ رہا ہے۔ اس طرح اب منی آرڈر سے حریم کی سالانہ قیمت اکیس کے بجائے بائیس روپیہ اور وی۔ پی سے چوبیس کے بجائے چھبیس روپیہ پچاس پیسے وصول کئے جائیں گے۔

حریمی بہنیں اگر منی آرڈر سے ہی سالانہ قیمت روانہ فرمائیں [illegible] زیادہ نہ محسوس ہوگا۔

رجسٹری کا اضافہ جو ہوتا ہے وہ پہلی مارچ سے [illegible] ہو گیا ہے اور جو وی۔ پی مارچ میں گئے ہیں یا اس ماہ اپریل میں جا رہے ہیں ان میں اضافہ کی رقم شامل نہیں کی گئی ہے البتہ مئی سے جو وی۔ پی جائیں گے وہ چھبیس روپیہ کے بجائے چھبیس روپیہ پچاس پیسے کے جایا کریں گے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ اضافہ بھی کچھ حریمی بہنوں کو گراں گذرے گا لیکن حالات ایسے ہیں کہ اضافہ نہ کریں تو ہمارا خسارہ بہت بڑھ جائے گا۔

جشن مظہر الحق علوی

یہ خبر تمام اردو دوستوں کے لئے باعث مسرت ہوگی کہ [illegible] کو "بزم محبان اردو" کی جانب سے احمد آباد میں ایک [illegible] کا انعقاد کیا گیا۔ اسی سلسلہ میں مختلف مقامی ادبی اداروں کی جانب سے اردو کے شہرۂ آفاق مصنف و مترجم جناب مظہر الحق علوی کی گل پوشی کی گئی۔ علوی صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ اردو ادب کو انھوں نے انگریزی کے شاہکار ناولوں کے تراجم کر کے مالامال کر دیا ہے۔ علوی صاحب کے تراجم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ترجمہ میں بھی اصل تصنیف کا لطف قائم رہتا ہے۔ اگر نام و مقام انگریزی نہ ہوں تو [illegible] نہیں سکتا کہ ان کے ناول کسی دوسری زبان [illegible] ہمیں بڑی مسرت ہے کہ علوی صاحب کا جشن منایا [illegible]

[illegible] عرصہ تحقیق ہم بھی [illegible] صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ پاک انھیں عمر طویل عطا فرمائے اور وہ اسی طرح معیاری تراجم پیش کرتے رہیں۔ (نسیم انہونوی)

پسندیدہ اشعار

ہمیں افسوس ہے کہ فروری و مارچ کے شماروں میں پسندیدہ اشعار کے عنوان لکھنے سے رہ گئے۔ اس لئے اس ماہ اس عنوان کے تحت کوئی شعر شائع نہ ہو سکا۔ بہر حال اب نوٹ فرمالیں مئی کے شمارے کا عنوان ہے "حیران" اور جون کے لئے "رفتار"

یادِ مصطفیٰ

ہم یادِ مصطفیٰ سے دل کو بہلایا نہیں کرتے
حقیقت میں وہ لطفِ زندگی پایا نہیں کرتے

زباں پر شکوۂ رنج و الم لایا نہیں کرتے
نبی کے نام لیوا غم سے گھبرایا نہیں کرتے

یہ دربار محمدؐ ہے، یہاں ملتا ہے بن مانگے
ارے ناداں یہاں دامن کو پھیلایا نہیں کرتے

سجالے دل کی دنیا داغ ہائے عشقِ احمد سے
یہ ایسے پھول ہیں جو کھل کے مرجھایا نہیں کرتے

جگہ پائی ہے قسمت سے جنھوں نے کوئے طیبہ میں
وہ ذرے چاند تاروں سے بھی شرمایا نہیں کرتے

یہ ہے دربار آقا کا یہاں اپنوں کا کیا کہنا
یہاں سے ہاتھ خالی غیر بھی جایا نہیں کرتے

حبیبِ کبریا کی شانِ رحمت تو ذرا دیکھو
ستم سہتے تو ہیں لیکن ستم ڈھایا نہیں کرتے

مزہ ملتا ہے جن کو سرورِ کونین کے غم میں
وہ اپنی داستانِ غم کو دہرایا نہیں کرتے

جو ان کے دامنِ رحمت سے وابستہ ہیں اے ساجد
کسی کے سامنے وہ ہاتھ پھیلایا نہیں کرتے

تبصرا

"البدر" (کاکوری) امام اہلسنت نمبر

ماہنامہ البدر، دار العلوم فاروقیہ کاکوری لکھنؤ۔ تقریباً ۵ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ خالص سنی مذہبی پرچہ ہے۔ ویسا ہی جیسے بعض فرقہ اثنا عشری کے لکھنؤ سے شائع ہوتے ہیں اور جن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے واقعات کو اس طرح پیش کیا جائے، کہ قیام خلافت درست نہ تھا خلیفۂ اول حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ہونا چاہئے تھا۔ البدر ان کے جواب دیتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ اثنا عشری فرقہ کی جانب سے جو کچھ کہا جاتا ہے وہ درست نہیں۔ ہم نہ ان اثنا عشری پرچوں کی کوششوں کو سراہتے ہیں، نہ البدر کے ہمنوا ہیں۔ اس لئے کہ اس بحث مباحثہ سے سوا اس کے کہ اسلام میں تفرقہ پیدا ہو، اچھے دل برے ہوں اور کچھ اب ممکن نہیں۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب ان واقعات پر لکھنا پڑھنا سانپ نکل جانے کے بعد اس کے نشانِ راہ کو پیٹنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بہر حال البدر کا یہ نمبر امام اہلسنت حضرت مولانا عبد الشکور صاحب مرحوم کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہے۔ جس میں مولانا کی ذات بابرکات کے مشن اور کارناموں سے متعلق کافی مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ حریم سائز کے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل اس خاص نمبر کی قیمت ۸ روپیہ ہے۔ کاغذ اور طباعت اعلیٰ ہے۔ کور بھی رنگین اور خوبصورت ہے۔ اس کا مطالعہ ان حضرات کے لئے پسندیدہ ہے جو اب بھی خلافتِ راشدہ کے سلسلہ میں حقائق کا علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ مولانا عبد الشکور مرحوم اپنے عہد کے ایک جید عالم تھے اور مسلمانوں کا ایک خاص اور عظیم طبقہ ان کا عقیدتمند تھا اور آج بھی ہے۔ ایسی ہر دلعزیز شخصیت کے حالات و افکار سے آگہی ہونا ایک مستحسن فعل ہے اس لئے اسے خرید کر ملاحظہ فرمائیں۔ البدر کی سالانہ قیمت پندرہ روپیہ ہے۔ یہ خاص نمبر جولائی، اگست، ستمبر کا مشترکہ شمارہ ہے۔ اس کے مدیر عبد العلی فاروقی صاحب فاضل دیوبند ہیں۔

بالآخر

جناب مجتبیٰ حسین کے ۱۸ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا نہایت شاندار اور دلچسپ مجموعہ ہے۔ جسے حسامی بکڈپو مچھلی کمان حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ کتاب ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت چودہ روپیہ ہے۔

مجتبیٰ حسین صاحب کا تعارف کرانا ان کی شہرت و مقبولیت کو ایک طرح سے کم کرنا ہوگا۔ جنھیں بھی اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب سے دلچسپی ہے انھوں نے موصوف کے مضامین ضرور پڑھے ہونگے

ان کا طنز بے حد سادہ اور پر لطف ہوتا ہے۔ پڑھئے اور مسکراتے جائیے اسی مجموعہ کے مضمون "اردو کا آخری قاری" عنوان کے مضمون میں اردو کے قاری نہ ہونے کا ایک جگہ شکوہ کرتے ہوئے آخری حربہ یہ استعمال کیا ہے کہ ایک اشتہار شائع کیا گیا۔

"اگر کوئی شخص اردو قاری کا پتہ بتائے تو اسے اردو اکاڈمی کی طرف سے منہ مانگا انعام دیا جائے گا اور اردو ادب کی اس خدمت کے صلے میں اس کا نام اردو ادب کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا"

اشتہار چھپنے کے بعد کسی نے انڈمان سے خبر دی کہ۔

"یہاں اردو کا ایک قاری موجود ہے۔ خبردار کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے، اس بات کو راز رکھا جائے، اگر اسے پہلے سے معلوم ہو جائے گا کہ آپ لوگ اسے لینے آرہے ہیں تو وہ بھاگ جائے گا"

اسی مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے کہ

"ادھر ہم کئی برسوں سے اردو کے معاملہ میں حکومت کی طرف دیکھنے کے عادی ہوگئے۔ اردو اکیڈیمیوں کی امداد سے کتابیں چھاپتے رہتے ہیں۔ ان کتابوں پر انعام لیتے رہتے ہیں۔ جب حکومت نے ان کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا ہے تو حکومت کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے کے لئے قاریوں کا انتظام بھی کرے"

ایک نقاد کے بیٹے سے پوچھا گیا "کیا تمھارے والد مرحوم نے تمھیں اردو نہیں سکھائی تھی؟"

جواب ملا "میرے والد دوسروں کے لڑکوں کو اردو ضرور پڑھایا کرتے تھے، لیکن ذرا سوچئے وہ خود اپنی اولاد کے ساتھ ایسی زیادتی کیونکر کرسکتے تھے۔ اسی اردو سے بچنے کے لئے تو انھوں نے مجھے انگلینڈ بھیجا تھا۔ میرے والد بڑے دور اندیش آدمی تھے، اردو کی خدمت اس ڈھنگ سے کرتے تھے کہ بھلے ہی اردو تباہ ہو جائے لیکن خاندان پر کوئی آنچ نہ آئے"

صرف یہی ایک مضمون پڑھ کر کتاب کی قیمت وصول ہوسکتی ہے اس کے باوجود قیمت کم رکھی گئی ہوتی تو" قاری کچھ زیادہ ہی مل جاتے

بنتِ حوّا سے خطاب

(حکیم حافظ عزیزی کلیمی۔ جیتول)

ایسی ہمت اور جرأت تو نے دکھلائی نہ تھی
بے نقاب اس طرح بازاروں میں تو آئی نہ تھی
غیر نظروں نے کبھی تیری جھلک پائی نہ تھی
تو کبھی تو جلوہ گاہِ عام پر چھائی نہ تھی

محوِ حیرت ہو رہا ہوں دیکھ کر تیرا چلن
بنتِ حوّا تو نہ میری نظم کا عنوان بن

صانعِ قدرت نے بخشا تجھکو نورانی حجاب
ہائے پردہ ہی بنا تیرے خیالوں میں عذاب
تیری نادانی نے تجھ کو کر دیا ہے بے نقاب
ہمتِ مردانہ کو تو دینے آئی ہے جواب

تجھ کو کیسا بننا تھا لیکن آج تو کیا بن گئی
زینتِ خانہ تھی شمعِ انجمن کیوں بن گئی

گھر سے باہر آگئی ہے ہو کے بے خوف و خطر
تو نے ڈالی ہے نظر ناداں نہ کیوں انجام پر
کس قدر انجان ہے تجھ کو نہیں اتنی خبر
تجھ کو رکھدیں گی یہ دنیا کی نگاہیں چھید کر

لاکھ تو کوشش کرے ہیئت بدل سکتی نہیں
عزم سے بہتر ہے تری فطرت بدل سکتی نہیں

صانعِ قدرت کا تو ہے اک مکمل شاہکار
تیرے دامن سے لپٹ کر آئی جنت کی بہار
دولتِ خلق و مروّت تیرے قدموں پر نثار
تو تو اپنے ساتھ لائی ہے دلِ خدمت گزار

جانِ شوہر تو ہے اور شوہر ترا ایمان ہے
زندگی کی کامرانی کی یہی پہچان ہے

اپنی عظمت کو نہ سمجھا ہے غلط تیرا قیاس
تو نے خود اپنی تباہی کو بلایا اپنے پاس
یہ تری مردانگی تو تجھ کو کر ڈالے گی ناس
کیا تری سیرت بدل دے گا ترا ٹیڈی لباس؟

تو کبھی فولاد کے مانند بن سکتی نہیں
ہر طرح عورت رہے گی مرد بن سکتی نہیں

آفسوں میں اور کلبوں میں نہیں تیرا مقام
تو کہاں ہے۔ اور کہاں یہ شاہراہ خاص و عام
پیس کر رکھدے گا تجھکو تیری آزادی کا جام
تو رہے پردے میں اک یہ بھی ہے قدرت کا نظام

بنتِ حوّا عظمتِ آدم کی تو تقدیس ہے
تجھ کو جو کمتر سمجھتا ہے وہ خود ابلیس ہے

اپنے ہاتھوں تو نے چھیڑا اپنی بربادی کا راگ
گھر سے باہر دیکھ لے پھیلی ہے خود غرضی کی آگ
جا بجا لہرا رہے ہیں عزت و عصمت کے ناگ
جتنی جلدی ہو سکے تو اس فضا سے دور بھاگ
پیکرِ صبر و رضا کا رول کرنا ہے تجھے
عظمتِ نسوانیت بن کر ابھرنا ہے تجھے

تو ہے خود حسنِ سراپا اپنا جلوہ دیکھ لے ۔۔۔ تیری تبدیلی نہ ہرگز راس آئے گی تجھے
اپنی ہستی اپنی رفعت کو تو اب پہچان لے ۔۔۔ بات میری مان لے اور یہ دورنگی چھوڑ دے

واقعی عورت ہے تو اے حاملِ راز و نیاز
تیرے دامن پر فرشتے آئیں گے پڑھنے نماز

تیری عظمت، تیری ہستی لائقِ صد احترام ۔۔۔ فہم اور ادراک سے بھی ہے ترا اونچا مقام
تو نے سوچا ہے کبھی اس بات کو اے نیک نام ۔۔۔ حور و غلماں نے کیا ہے تیرے پیکر کو سلام

ملک و ملت کے امین و رہنما پیدا ہوئے
کوکھ سے تیری محمد مصطفیٰ پیدا ہوئے

پھر سے اب تاریخ عالم میں ابھرنا ہے تجھے ۔۔۔ اپنی عظمت کے لئے ہی جینا مرنا ہے تجھے
زندگی کی منزلوں میں رنگ بھرنا ہے تجھے ۔۔۔ سیرت اسلاف میں ڈھل کر نکھرنا ہے تجھے

حسن کی جاگیر ہے تو؛ قت کا پتوار ہے
اپنے گھر کی زیب و زینت ہی ترا سنگھار ہے

جسم مالک نے دیا ہے پر نہ تن تیرا نہ من ۔۔۔ ہے یہی تو زندگی کی کامیابی کا چلن
تو اگر بیوی ہے تو سن لے بزرگوں کا سخن ۔۔۔ مان لے عزمی کا کہنا اے مری پیاری بہن

روح شوہر کی تو بن۔ وہ تیرے سر کا تاج ہے
جوہرِ نسوانیت کی بس یہی معراج ہے

لطیفے

- ایک اداکارہ نے اپنی اداکار سہیلی سے کہا " میرا نیا شوہر ہر اعتبار سے مکمل ہے۔ وہ نہ شراب پیتا ہے، نہ جوا کھیلتا ہے، نہ کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے سہیلی نے کہا ایسی صورت میں تم اس سے طلاق کیسے لوگی۔
- شوہر کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا تو میں کسی ہوٹل جاکر کھا لوں گا۔
  بیوی۔ بس پانچ منٹ ٹھہر جایئے۔
- شوہر۔ کیا پانچ منٹ میں کھانا تیار ہو جائے گا۔
  بیوی نہیں! تیار ہو کر میں بھی آپ کے ساتھ چلی چلوں گی۔ (مرسلہ کوثر جہاں۔ چھپرہ)
- ایک مالدار شوہر نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ اگر میں دیوالیہ ہو جاؤں تو کیا تم اس وقت بھی مجھ سے محبت کرتی رہوگی۔
  بیوی:۔ یقیناً، بشرطیکہ کوئی دوسری عورت تمہیں دیوالیہ نہ بنا دے۔
- بس میں سفر کرتی ہوئی ایک خاتون نے اپنی بچی سے کہا بیٹی بار بار آئس کینڈی ان کے سوئٹر میں نہ لگاؤ ورنہ تمہاری آئس کریم خراب کر دیں گے۔
- اسے اس کی بد نصیبی ہی کہا جا سکتا ہے کہ پہلی بیوی تو اسے چھوڑ گئی۔ لیکن دوسری ابھی تک موجود ہے۔
- ایک صاحب نے اپنے ہمسفر سے بتایا۔ خدا کا شکر ہے کہ بیس سال تک میری بیوی سے میرا کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ مخاطب نے پوچھا، کیا اب جھگڑا پھر ہونے لگا۔
  مسافر نے کہا۔ ہاں بھئی۔ ۲۰ سال کے بعد وہ پھر اپنے میکے سے آ گئی ہے۔

افسانہ

"بے غیرت"

از شاہدہ بانو ۔ بگرامی

" رقیہ بہن "

" کون ہے "

" میں ہوں فرخ جہاں بیگم استانی

" آئیے ۔ آئیے "

فرخ جہاں بیگم اندر آگئیں نقاب الٹتے ہی کتھئی رنگ کا برقعہ سرک کر کاندھوں پر آگرا وہ اسے سنبھالتی ہوئی امی کے پاس بیٹھ گئیں امی نے پاندان سرکا کر ان کے بیٹھنے کی جگہ کرتے ہوئے پوچھا۔

" اتنے دن کہاں رہیں بہت دن بعد صورت دکھائی "

فرخ جہاں بیگم اپنی جارجٹ کی ساری برابر کرتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

" ارے بہن کیا بتاؤں دنیا بھر کی پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے اب دیکھئے کیا کہتے ہیں پندرہ دن سے تو اسپتال میں داخل ہوں ۔ طبیعت خراب تھی گردن میں درد اٹھا تھا اب تو فائدہ ہے اب دیکھئے کیا کہتے ہیں جس دن سے لکھنؤ آئی ہوں آپ ہی میں دل لگا ہوا تھا میں نے سوچا اپنی بہن سے ضرور ملوں گی "

" اچھا ہوا آگئیں میرا بھی دل لگا ہوا تھا اور سب خیریت ہے " امی نے پان کا بیڑا ان کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

" جی ہاں آپ کی دعا ہے اب دیکھئے کیا کہتے ہیں میری لڑکی کا امتحان ہو رہا تھا میری بیماری کی وجہ سے اس کی پڑھائی کا بڑا نقصان ہو رہا ہے میں پندرہ دن سے یہاں اسپتال میں پڑی ہوں پتہ نہیں وہ کیا کھاتی ہے کیا پیتی ہے امتحان کے زمانہ میں اسے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا ـــــ اور یہ شمو بیٹی کہاں ہے ؟ " فرخ جہاں بیگم نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

ادھر کمرے میں ہے وہ بھی اکیلے گھبراتی ہے کوئی اس کی ہمجولی کا ہے بھی نہیں کس سے بات کرے اندر پڑی رہتی ہے " امی نے اگالدان میں پیک تھوکی۔

" اب دیکھئے کیا کہتے ہیں بڑے بھیا حیدرآباد سے آئے "

" ادھر تو بہت دن سے نہیں آئے ان کو چھٹی نہیں ملتی "

" بڑے بھیا کی شادی کہیں طے کی یا نہیں "

" ابھی کہاں ـــ آپ نے دو ایک جگہ لڑکیاں بتائی تھیں اور کہا تھا کہ ان کے پتے بھیجیں گی مگر آپ تو سلطان پور جا کر ایسی غائب ہوئیں کہ پھر پلٹ کر کوئی خبر ہی نہ لی "

" جی ہاں مجھے کچھ ایسی پریشانی رہی ـــــ اب دیکھئے کیا کہتے ہیں ان کے پتے تو میں لائی ہوں دو ایک لڑکیاں میں نے اور بھی دیکھی ہیں دیکھئے ابھی آپ کو بتاتی ہوں "

فرخ جہاں بیگم نے اپنا پرس کھولا اور اس میں مڑا ہوا ایک کاغذ نکالا گود میں رکھ کر اس کی شکنیں برابر کیں اور اس کو پڑھتے ہوئے بولیں۔

" دیکھئے ایک لڑکی ہے چودھری غلام رسول کی ۔ کلکتہ میں ان کی تجارت چلتی ہے ایک ہی لڑکی ہے جہیز وغیرہ کافی اچھا دیں گے "

" صورت شکل میں کیسی ہے " امی نے بہت ہی رازدارانہ انداز میں پوچھا۔

" اچھی ہے رنگ صاف ہے ناک نقشہ بھی کافی اچھا ہے ۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو میرے ساتھ سلطان پور چلئے میں آپ کو دکھا دوں گی۔

" بالی مکان ان لوگوں کا سلطان پور ہی میں ہے دوسری لڑکی ٹل گڑھ کی ہے اسی سال بی ۔ اے کیا ہے اب دیکھئے کیا کہتے ہیں ایک لڑکی ریاض حسین کمشنر کی ہے آج کل یہ لوگ بہرائچ میں ہیں اس لڑکی کا تو فوٹو بھی میرے پاس ہے اگر آپ چاہیں تو بڑے بھیا کے پاس بھیج دیجئے "

امی اور فرخ جہاں بیگم کی ملاقات خواہ سرسری کیوں نہ ہو اس میں شادی کے قابل لڑکے اور لڑکیوں کی فہرست پڑھی جانی ضروری تھی چنانچہ اس وقت بھی امی اور فرخ جہاں بیگم قریب قریب دو گھنٹہ تک اسی موضوع پر باتیں کرتی رہیں ـــــ

فرخ جہاں بیگم خود تو ایک معمولی

گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں مگر شادی کے موضوع پر ان کی معلومات سن کر ایسا محسوس ہوتا جیسے لکھنؤ، کانپور، فیض آباد اور آس پاس کے شہروں میں کوئی متمول اور اونچا گھرانہ ایسا نہیں ہے جہاں ان کی رسائی نہ ہوا ہو شاید ہی کوئی ایسا نام لیتی ہوں جس کو فرخ جہاں بیگم نہ جانتی ہوں۔

امی اور فرخ جہاں کی ملاقات بھی محض ایک اتفاق تھی ــــ امین آباد پارک میں میلاد تھا امی ایک کونے میں زمین پر چادر بچھائے بیٹھی تھیں فرخ جہاں بیگم قریب آکر بولیں۔

"بہن میں ذرا آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں۔"

امی نے بہت خوشی سے ان کو اجازت دے دی جس وقت میلاد ختم ہوا اور میں امی کے پاس آئی اس وقت تک ان دونوں کی جان پہچان دوستی کے حدود سے گذر کر بہناپے کی حد تک پہونچ گئی تھی چلتے چلتے امی نے اپنی منہ بولی بہن کو گھر آنے کی دعوت دی جس کو انھوں نے بخوشی منظور کر لیا اس دن سے آج تک فرخ جہاں بیگم کی حاضری میں کوئی فرق نہ آیا رقیہ بہن کے بغیر جیسے وہ بے چین رہتی ہوں امی سے ملنے وہ ہر دوسرے تیسرے مہینے خاص طور سے سلطانپور سے لکھنؤ آتی رہتی تھیں امی بھی ان کی پرخلوص محبت سے بہت زیادہ متاثر ہو گئی تھیں اور اکثر و بیشتر بڑی عقیدت سے ان کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ فرخ جہاں بیگم کی زندگی کے واقعات بڑے ہی افسوسناک تھے کم عمری میں شادی ہوئی تھی ابھی دو ہی بچے ہوئے تھے کہ ان کے شوہر نے دوسری شادی کر لی اور ان کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے ایک چھوٹے سے اسکول میں دو سو روپئے کی نوکری کر کے انھوں نے بچوں کی پرورش کی جب دونوں بچے ذرا بڑے ہوئے تو شوہر نامدار پاکستان سے تعزیتاً تشریف لائے اور فرخ جہاں بیگم پر یہ ظلم توڑ گئے کہ ان کے لڑکے کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لیتے گئے فرخ جہاں بیگم جیسے دیوانی ہو گئیں دھیرے دھیرے صبر آتا گیا اور انھوں نے اپنی تمام تر توجہ اپنی لڑکی پر مرکوز کر دیں۔ اپنی لڑکی کی باتیں کرنے جب بیٹھ جاتیں تو ایسا لگتا جیسے اب وہ کبھی خاموش نہ ہوں گی ان کی زندگی کا گھاؤ بڑا گہرا تھا میں نے محسوس کیا کہ دوسری عورتوں کی طرح وہ کبھی اپنے شوہر کی شکایت نہیں کرتیں ان کی بے عنوانیوں کا رونا نہیں روتیں جب کبھی امی اس بارے میں پوچھتیں بھی تو وہ مسکرا کر ٹال جاتیں جیسے وہ اپنے زخم کو چھیڑنا نہ چاہتی ہوں مگر یہ درد ان کی باتوں کے بہکنے کے انداز میں اکثر جھلک جاتا ان کی باتوں میں اکثر دیوانگی کی جھلک نمایاں ہو جاتی۔

فرخ جہاں بیگم کو جلدی ہی اسٹیشن جانا تھا چلتے وقت پھر پوچھنے لگیں۔

"شمو بیٹا کہاں ہے۔"

"اندر ہے ــــ شمو اے شمو باہر آؤ دیکھو تمہاری خالہ جان آئی ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں باہر جاتی وہ خود ہی کمرے میں آگئیں حسب معمول وہ بڑے بڑے بوٹوں کی شوخ رنگ کی ساری پہنے تھیں ان کی وحشت زدہ اداس آنکھوں خشک چہرہ اور سفید بالوں اور بہکی بہکی باتوں کو سن کر ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ زندگی کے ریگزار میں تیز تھپیڑوں سے ہار مان کر راستہ میں بیٹھ گئی ہوں لیکن ان کے بھڑکیلے لباس سرخ پرس خوبصورتی سے بنائے ہوئے بالوں کے جوڑے کو دیکھ کر ایسا لگتا جیسے ان میں مدافعت کی قوت ابھی باقی ہو جیسے ان کی زندگی کا کوئی کام ادھورا رہ گیا ہو جسے پورا کر لینے کا عزم انھیں آگے بڑھنے کے لئے اکسا رہا ہو اور اپنی رہی سہی ہمت کو یکجا کر کے وہ آخری داؤں لگانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ زرد اداس چہرہ شوخ بھڑکیلے کپڑے ــــ خزاں اور بہار کی یہ یکجائیت آنکھوں میں فوراً کھٹک جاتی جیسے سوکھی ٹہنیوں پر شاداب پھول کھل جائیں۔

میں نے سلام کیا۔

"جیتی رہو۔ خوش رہو۔ اچھا یہ سوئٹر بنا جا رہا ہے یہ تو بڑا اچھا نمونہ ہے ہماری بیٹی بڑی سگھڑ ہے کیا بتاؤں مجھے تم سے ایسی محبت ہو گئی ہے۔ میری فرحت بھی بڑے اچھے اچھے نمونے ڈالتی ہے کروشیا کے کام میں تو اس کا بڑا دل لگتا ہے۔ پوری پوری چادریں اس نے بن ڈالی ہیں۔"

فرخ جہاں بیگم میرے قریب ہی بیٹھ گئیں اور میرے ہاتھ سے سوئٹر لے کر دیکھنے لگیں پھر مجھے سوئٹر واپس کرتے ہوئے بولیں۔

"میری فرحت کو بھی سوئٹر بننے کا بڑا شوق ہے دیکھو ابکی میں تمہارے لئے ایک سوئٹر بنوا کر بھیجوں گی۔"

"نہیں نہیں آپ یہ تکلیف نہ کریئے۔"

"اے تو کیا ہوا جیسے فرحت ویسے تم۔ اب دیکھو کیا کہتے ہیں میں تمہیں اپنی بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں آج ٹرین میں مجھے ایک لڑکی ملی تمہارے ہی برابر ہوگی یہیں ایک کالج میں پڑھتی ہے بی۔ایڈ کر رہی ہے میں نے اس سے کہا کہ میری بیٹی شمو نے بھی بی ایڈ کیا ہے اور اس سال ایم۔اے میں داخلہ لے گی بڑی اچھی بیٹی ہے نہ غرور نہ گھمنڈ اتنا پڑھ لکھ کر بھی سادگی سے رہتی ہے شرمیلی ایسی کہ آجکل کی دنیا میں مثال نہ ملے گی۔

اپنی بے جا تعریف سن کر میں جز بز ہونے لگی۔

"اچھا بیٹی اب چلتی ہوں مجھ بدنصیب کو یاد رکھنا میں تو جب تک سلطان پور میں رہتی ہوں تمہارا ہی ذکر کرتی رہی ہوں ایسی اچھی بیٹی مجھے قسمت سے ملی ہے"

انھوں نے چلتے چلتے دو تین بار مجھے گلے سے لگایا۔
میں نے محسوس کیا کہ اکثر ان کا پیار خوشامد کی حدوں کو چھو جاتا ہے۔

فرخ جہاں بیگم اسی طرح ہر دوسرے تیسرے مہینے آتی رہتیں ہر دفعہ جب وہ آتیں تو ان کے ہاتھ میں شادی کے قابل لڑکے اور لڑکیوں کی ایک لمبی فہرست ہوتی امی اور فرخ جہاں بیگم گھنٹوں ایک ایک نام پر بحث کرتیں لڑکے لڑکیوں کے حسب و نسب صورت و شکل اور تعلیم پر نئی نئی معلومات بہم پہنچائی جاتیں امی کا وقت ان کے ساتھ اچھا گذر جاتا اور خاصی تفریح رہتی۔

پھر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ چھ سات مہینے ہو گئے اور فرخ جہاں بیگم نے اپنی شکل نہ دکھائی مجھے کئی بار ان کا خیال آیا امی نے کئی بار ان کے بارے میں تشویش ظاہر کی جب کئی مہینے گذر گئے اور وہ نہ آئیں تو امی ان کو یاد کر کر کے ان کی مصیبتوں کے بارے میں قیاس آرائیاں شروع کر دیں۔

"بیچاری شاید پھر بیمار پڑ گئی — شاید آج کل روپے پیسے کی تنگی ہو اس کی وجہ سے لکھنؤ نہ آسکی ہو۔ پتہ نہیں بیچاری کی لڑکی پاس ہوئی یا نہیں کن مصیبتوں سے پڑھا رہی ہے ایسا ناکارہ شوہر خدا نہ کرے کسی کو ملے وغیرہ وغیرہ۔

ایک دن میں یونیورسٹی سے واپس آئی تو دیکھا کہ امی بڑی ناراضگی سے ساتھ لکچر دے رہی ہیں۔

"دیکھو ذرا دنیا میں ایسی ایسی بھی ہوشیار عورتیں پڑی ہوئی ہیں اور بڑی بڑی اسکیمیں بن رہی تھیں میں بے چاری سیدھی سادھی یہ سب تریا چرتر کیا جانوں —"

"کیا ہوا امی آپ کس کو کہہ رہی ہیں"

"اے وہی استانی — فرخ جہاں بیگم"

"تو کیا ہوا — ان کو کیا ہوا"

"اے وہ تو بڑی مطلبی نکلی — یہ دیکھو ان کا خط آیا ہے خط لکھتے ہوئے بھی غیرت نہ آئی"

امی نے مجھے ایک سفید لفافہ پکڑاتے ہوئے کہا میری سمجھ میں کچھ نہ آیا میں نے ذرا چکرا کر لفافہ کھولا

پیاری بہن - آداب

میں بہت دنوں سے آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکی اس کے لئے معافی چاہتی ہوں میں نے آپکو منظور صاحب کی لڑکی کو دکھانے کا وعدہ کیا تھا لیکن کچھ ایسی مصروفیت رہی کہ میں وقت نہ نکال سکی۔
بہن اگر آپ ناراض نہ ہوں تو آپ سے ایک درخواست کروں میری لڑکی نزہت جہاں نے اسی سال انٹر پاس کیا ہے اس کی شادی کے لئے میں بہت پریشان ہوں کوئی اچھا شریف النفس لڑکا مل جائے آپ کے پاس بڑی امیدیں لے کر جاتی رہی مگر کبھی میری ہمت نہ پڑی میں ہمیشہ ادھر ادھر کے لڑکے لڑکیوں کی باتیں کر کے واپس آجاتی میں نے سوچا میں شاید آپ سے دو بدو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اب یہ خط لکھنے کی ہمت کر رہی ہوں۔ میری لڑکی بہت ہی خدمت گزار اور فرمانبردار ہے لڑکی بہت ہی صابر اور خاموش ہے آپ چاہیں تو اسے دیکھ کر اپنا اطمینان کر سکتی ہیں۔

جواب کی منتظر فرخ جہاں بیگم

لڑکی کی شادی — تو یہ ہے ان کی زندگی کا عزم۔ ان میں زندگی کی حرارت — امی کا لکچر جاری تھا۔

"اے میں کہتی ہوں جو دل میں یہی اسکیم تھی تو اتنی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت تھی پہلے ہی کہہ دیتیں کہ میری لڑکی سے شادی کر لیجئے توبہ توبہ اب ایسی اندھیر ہو گئی ہے —"

"امی تو حرج ہی کیا ہے"

"اے چپ رہو کہاں میرا ساجد کہاں ان کی لڑکی۔ کہاں گنگو تیلی کہاں راجہ بھوج اور پھر بے غیرتی تو دیکھو۔ اپنے منہ سے اپنی لڑکی کا پیام

لیڈیز کلب

نجم اعزاز

(گذشتہ چار ماہ سے لیڈیز کلب کی ماہانہ میٹنگ چند ناگزیر حالات کی بناپر نہ ہوسکی جس کی شکایت کئی بہنوں نے اپنے اپنے خطوط میں کی ہے۔ میں ان سبھوں سے معافی کی خواستگار ہوں انشاء اللہ آئندہ انھیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔)

بیگم جہاندار کی کوٹھی میں گذشتہ کی طرح لیڈیز کلب کی تمام ممبران اکٹھا ہیں تبھی دروازہ کھلتا ہے بیگم ناخدا اندر آتے ہوئے سب کو حسب مراتب سلام دعا سے نوازتی ہیں۔ ان کو اپنی نشست سنبھالتے دیکھ کر بیگم خضر اپنی جگہ سے اٹھ کر سب کو مخاطب کرتی ہیں۔

بیگم خضر:۔ عزت مآب صدر صاحب اور معزز ممبران لیڈیز کلب کے سامنے میں آج کے ایجنڈے کے مطابق پہلا مسئلہ رکھتی ہوں ہمارے کلب کی کئی ممبران کو اپنی سسرال والوں سے مختلف شکایتیں ہیں۔

بیگم ناخدا:۔ براہ مہربانی آپ ان سسرالی رشتہ داریوں کی تفصیلی وضاحت پیش کیجئے۔

بیگم خضر:۔ بہت بہتر۔ میں فہرست پڑھتی ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

محترمہ حسین نے کرنول سے اور بیگم فضلی صاحبہ نے رامپور سے اپنے اپنے دیوروں کی شکایت کی ہے۔ مسز عزیز صاحبہ نے بھٹکل سے محترمہ سلطانہ نے لکھنؤ سے بیگم جلیلی صاحبہ نے بانکا سے ساجدہ صاحبہ نے دھنباد سے انجم نشاط صاحبہ نے بھوجپور سے اور ان کے علاوہ چار خواتین ایسی ہیں جنھوں نے اپنے نام پوشیدہ رکھنے کی درخواست کی ہے۔ ان سبھوں کو اپنے اپنے شوہروں سے چھوٹی بڑی بے شمار شکایتیں ہیں۔ اسی طرح ساس سسر اور جیٹھ سے شکایت رکھنے والیوں کے بھی خطوط ہیں۔

بیگم جہاندار:۔ ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے کلب کی شہرت دور دور تک پہونچ گئی ہے لیکن کیا آج کا ایجنڈا ان ہی خطوط پر ترتیب دیا گیا ہے۔

بیگم خضر:۔ ان خطوط سے قطع نظر بھی ایسی ہی شکایات مقامی خواتین ممبرز کی ہیں۔ ہماری رپورٹر مس سفینہ حیات نے گذشتہ ہفتہ ہی اپنی رپورٹ مکمل کی ہے۔ تمام شکایتیں ایک ہی جیسی ہیں۔

بیگم ناخدا:۔ چونکہ اس کلب کے قیام کا مقصد یہی ہے کہ دلوں میں بغض و نفرت کے پودوں کو جڑ پکڑنے سے پہلے ہی اکھاڑ پھینکا جائے۔ اس لئے میٹنگ کی کاروائی شروع کی جائے۔

بیگم خضر:۔ بہتر ہے۔ تعمیل حکم کے تحت میں محترمہ رسولن بی۔ شریمتی رستوگی اور مسز فرید سے گزارش کرتی ہوں کہ اپنے مسائل پیش کریں۔

رسولن بی:۔ بیبیو میں ایک غریب لاچار نچلے طبقہ کی عورت ہوں۔ نہ تو میں اس قابل ہوں کہ آپ جیسی معزز خواتین کے ساتھ بیٹھ سکوں اور نہ اس قابل کہ آپ سب جیسی مہذب گفتگو کر سکوں۔

بیگم ناخدا:۔ (جلدی سے بات کاٹ کر) براہ مہربانی آپ اپنے لئے ایسے الفاظ استعمال نہ کریں۔ جاہ و حشمت ہی سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔ غریب ہو کوئی تو کیا۔ عزت اور خودداری کا جوہر جس میں ہے وہی اعلیٰ و ارفع ہے۔

رسولن بی:۔ یہ آپ کا بڑاپن ہے بی بی کہ آپ اتنی امیر ہو کر بھی ایسا سوچتی ہیں لیکن ہر ایک تو ایسا نہیں سوچتا۔ میری سسرال والوں کو ہی لے لیجئے۔ بڑے بزرگ تو الگ رہے بچہ بچہ میری بے عزتی کرتا ہے۔ میرے والدین کی غربت کو بہانہ بنا کر مذاق اڑایا جاتا ہے حالانکہ خود یہ لوگ بھی کچھ امیر نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دو روٹی اطمینان سے کھا کما لیتے ہیں۔

ایک خاتون:۔ جہیز کی کمی کا کیس لگتا ہے۔

رسولن بی:۔ نہیں بی بی ایسا نہیں۔ بڑا بول تو نہیں بولتی لیکن میرے جہیز میں وہ سبھی کچھ شامل تھا جو کسی درمیانی طبقہ والوں کی بیٹی کو جہیز میں ملتا ہے۔ برتن بھانڈے کپڑا لتّا تو الگ رہا سلائی مشین بجلی کا پنکھا اور دو تولہ سونا بھی ملا ہے مجھے۔

بزرگ خاتون:۔ اے ہے تو پھر اور کیا چاہتے ہیں تمھارے گھر والے۔

رسولن بی:۔ چاہتے تو کچھ نہیں بی بی صاحب۔ (روہانسی ہو کر) بس اٹھتے بیٹھتے یہی مذاق کرتے ہیں کہ میں ساجھے کی بیٹی ہوں۔

بیگم خضر:۔ (حیرت سے) کیا مطلب۔

رسولن بی:۔ (گردن جھکا کر کھسیائی آواز میں) میں نے بتایا نا بی بی کہ ہمارا گھرانہ بہت غریب ہے میری شادی میں خاندان بھر کے چچاؤں، ماموؤں، خالوؤں، پھپھاؤں نے مل کر جہیز میں حصہ لیا تھا۔

ایک لڑکی:۔ یہ تو فخر کی بات ہے اس پر آپ کو شرمندہ ہونے کے بجائے خوش ہو کر کہنا چاہئے کہ آپ اپنے والدین پر بوجھ نہیں بنیں۔ بلکہ سب نے مل کر بوجھ بانٹ لیا۔

رسولن بی:۔ میں تو اسی لئے سب کا احسان مانتی ہوں بی بی لیکن میری سسرال والے صاجھے کی بیٹی کہکر رلاتے ہیں۔

بیگم خضر:۔ اوہ ـــــ یہ تو بہت بڑی بات کہتے ہیں وہ لوگ۔

بیگم ناخدا:۔ واقعی بیہودہ طعنہ ہے۔ آپ کے شوہر اپنے گھر والوں کو روکتے تو ہوں گے۔

رسولن بی:۔ (روتے ہوئے) رونا تو یہی ہے بی بی جی کہ وہ بھی دل کھول کر کہتے ہیں، انھیں کی شہ پر تو نندیں دیور جیٹھ بھی کہنے لگے ہیں۔ سچ تو یہ ہے بی بی کہ اپنا ہی مال کھوٹا ہو تو پرکھنے کا کیا دوش۔

سفینہ حیات:۔ یہ سخت زیادتی ہے آپ کے ساتھ۔ اس کا کوئی مداوا کرنا ہی چاہئے۔

ایک خاتون:۔ کم تعلیم یافتہ جاہل گھرانوں میں ایسے واقعات زیادہ ہوتے ہیں۔

شریمتی رستوگی:۔ (تلخی سے) کم تعلیم یافتہ یا جاہل شوہروں کی بات تو رہنے دیجئے۔ آج کل تو اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بھی کچھ پیچھے نہیں رہتے۔

بیگم ناخدا:۔ تعجب سے) یہ کس کے متعلق فرما رہی ہیں آپ۔

شریمتی رستوگی:۔ اپنے پتی دیو کے علاوہ میں اور کس کا بکھان کر سکتی ہوں۔

مس سفینہ حیات:۔ (اٹکتے ہوئے) آ ـــــ آپ کے شوہر تو ـــــ تو ایک سلجھے ہوئے دماغ کے روشن خیال شخص ہیں۔

شریمتی رستوگی:۔ (طنز سے) جی ہاں ہیں تو۔ مگر یہ سب روشن خیالی وغیرہ غیروں کے لئے ہے میرے لئے تو وہ ہزار جاہلوں سے بڑھ کر ایک جاہل ہیں۔

ضعیف خاتون:۔ (ناگواری سے) اپنے شوہر کے لئے ایسے الفاظ استعمال کرنا خود ایک جہالت ہے۔ اس کے علاوہ ہندو مذہب میں تو شوہر کو خدا مانا گیا ہے۔

شریمتی رستوگی:۔ (گلوگیر لہجہ میں) معاف کیجئے ماتا جی۔ میں غصہ میں ادب تمیز سب بھول گئی۔ لیکن میری بپتا سنیں گی تو آپ کا دل بھی بھر آئے گا۔

وہی ضعیف خاتون:۔ اے ہے بٹیا۔ کیا ہوا۔ کچھ بتاؤ تو۔ میں نگوڑی تمھیں بلا وجہ برا بھلا کہہ بیٹھی ہوں گی۔

شریمتی رستوگی:۔ کیا بتاؤں ماتا جی۔ مجھ کرموں جلی کا جیون ہی اکارت ہے۔ ماتا پتا کے گھر سکھی جیون گزار رہی تھی ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی ماتا پتا نے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ نئے نئے ناول خرید کر پڑھنا مصنف کو تنقیدی و تعریفی خطوط لکھنا فلمیں دیکھنا۔ قلمی دوستی کرنا میرے پسندیدہ کام تھے۔ کالج کے ڈراموں میں بھی کام کیا کرتی تھی وہیں کہیں مجھے دیکھ کر اور میری تعریفیں سن کر رستوگی صاحب نے الٹا پیام دیا۔ حالانکہ ممی تبھی کھٹکی تھیں ہم لوگوں میں تو لڑکی والے پیام لے جاتے ہیں لیکن پاپا رجھ گئے کہ لڑکا اچھا ہے اور اپنی خواہش پر لے جا رہا ہے تو سکھ چین سے رکھے گا۔ مگر قسمت میں تو دکھ بھوگنا تھا۔ (شریمتی رستوگی سانس لینے کے لئے رکیں تو ایک لڑکی جلدی سے بولی۔)

لڑکی:۔ میں نے آپ کا گھر دیکھا ہے۔ ایرکنڈیشنر، فریج، ٹی۔ وی، کار، اسکوٹر، ریڈیو گرام۔ کیا نہیں ہے آپ کے گھر میں پھر کیسا دکھ بھوگ رہی ہیں آپ۔

شریمتی رستوگی:۔ (رندھے گلے سے) تن کا سکھ ہی سب کچھ نہیں ہوتا بہن، جب من اچاٹ ہو جائے تو شاہی محل بھی جھونپڑی سے برا لگتا ہے۔

بیگم خضر:۔ مگر من اچاٹ ہو جانے کی وجہ تو آپ نے بتائی نہیں۔

شریمتی رستوگی:۔ سمجھے تو بہت کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں۔ بیگم خضر بات یہ ہے کہ شادی کے بعد اپنے پسندیدہ کام کرنے کو ترس گئی۔ ناولیں پڑھنے پر ساس جی ٹوکتی ہیں تو رستوگی صاحب قلمی دوستوں سے خط و کتابت کرنے پر آنکھیں نکالتے ہیں پتا سسر جی

کے کارن تو فلموں کا نام بھی نہیں لے سکتے۔

وہی لڑکی:۔ مگر رستوگی صاحب تو ہمارے بھائی جان کے ساتھ کبھی کبھار فلمیں دیکھتے ہیں۔

شریمتی رستوگی:۔ ہاں جی۔ وہ مرد ہیں باہر سب کچھ کر سکتے ہیں انھیں کون ٹوکنے والا ہے۔ یہ تو ہم استریوں کی ہی جان آفت میں ہے ساس سسر کے اشاروں پر ناچنا پڑتا ہے ورنہ چھوٹی چھوٹی شکایتوں اور لگائی بجھائی سے گھر میں سرد جنگ کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے پھر بھی الزام ہمارے ہی سر آتا ہے کہ شوہر بیوی کی ساڑی کا آنچل تھامے گھومتا ہے۔

ایک خاتون:۔ مگر آپ لوگوں میں تو میاں بیوی کا گھُل مل کر باہر نکلنا برا نہیں مانا جاتا۔

شریمتی رستوگی:۔ سو تو ٹھیک ہے بہن جی۔ مگر شوہر اپنے ماتا پتا کے حکم کے باہر کیسے ہو سکتا ہے۔ اور اس کے ماتا پتا یہ کب چاہیں گے کہ ان کی بہو اپنی مرضی سے سانس بھی لے سکے۔

بیگم ناخدا:۔ جب رستوگی صاحب اپنے والدین کے خیالات سے اچھی طرح واقف تھے تو پھر انھوں نے آپ جیسی زندہ دل سوشیل لڑکی سے شادی کیوں کی۔ آپ نے ان سے کبھی پوچھا تو ہوتا

شریمتی رستوگی:۔ اپنی حماقت سے ایک بار پوچھا تھا۔

کئی آوازیں:۔ پھر —— پھر جواب کیا ملا۔

شریمتی رستوگی:۔ (افسردگی سے) ان سب مردوں کا جواب ایک ہی سا ہوتا ہے جی کہ ان سے غلطی بیشک ہوئی ہے لیکن اس کی تلافی بس اسی طرح ہو سکتی ہے کہ غلط بیوی سے پیچھا چھڑا کر دوسری بیوی ایسی تلاش کی جائے جو شوہر کی مرضی پر اندھیرے کو بھی اجالا کہتی ہو۔

بیگم خضر اور کئی دوسری خواتین:۔ اوہ —— واقعی ستم ہے۔

مسز فرید:۔ (تیز لہجہ میں) خدا کا شکر ادا کیجئے کہ آپ لوگوں میں ایک پہ دوسری نہیں آسکتی۔

ضعیف خاتون:۔ اوئی بیوی۔ تو کیا تمھارے میاں نے تم پر سوت لا بٹھائی ہے۔

ایک لڑکی:۔ ارے نہیں نانی اماں۔ بھابی کی شادی کو تو ایک سال بھی پورا نہیں ہوا۔ بھیا مذاق کرتے ہیں۔

ضعیف خاتون:۔ (اسی لڑکی سے) تم کہاں رہتی ہو بیٹی۔ اور یہ مسز فرید تمھاری کون ہیں۔

وہی لڑکی:۔ میں کوچہ چیلاں میں رہتی ہوں اور فرید احمد میرے خالہ زاد بھائی ہیں۔

ضعیف خاتون:۔ اچھا —— آ —— آ (کچھ رک کر) مگر کچھ وجہ تو ضرور ہوگی۔ جو تمھارے بھائی اپنی بیوی سے ایسا مذاق کرتے ہیں

(لڑکی کے جواب دینے سے پہلے ہی مسز فرید بول اٹھتی ہیں۔)

مسز فرید:۔ (بگڑ کر) سب سے بڑی وجہ تو میرا رنگ روپ ہی ہے خاتون۔ کالا کوئلہ۔

بیگم خضر:۔ (نرم لہجہ میں) خیر کالا کوئلہ تو نہیں۔ سانولی سلونی رنگت ہے لیکن ناک نقشہ تو تیکھا ہے، خوبصورت نہیں تو قبول صورت ضرور ہو۔

ضعیف خاتون:۔ اب خوبصورت ہو یا قبول صورت شادی تو ہو ہی گئی۔ کیا پہلے دیکھا نہ تھا۔

مسز فرید:۔ (ہاتھ مٹکا کر) ابھی ہم لوگوں میں اتنی آزادی نہیں آئی ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا لڑکی کو دیکھے۔

ایک خاتون:۔ اے تو لڑکا نہ دیکھتا۔ لڑکے والیاں تو دیکھ گئی ہوں گی۔ پھر لڑکے کو بیوی پر اعتراض کیوں۔ وہ اپنی گھر والیوں سے جھگڑا کرے۔ تم بھی اپنے شوہر سے یہی کیوں نہیں کہتیں۔

مسز فرید:۔ (سٹپٹا کر) جنھوں نے شادی کرائی ہے انھوں نے کہا تھا کہ رنگت خاصی ہے۔ اب اگر میں اپنے شوہر سے ایسا سوال کر دوں گی تو بیچاری بیچ والی کی شامت آئے گی نا۔

وہی لڑکی:۔ بیچ والی کو بیجا الزام نہ دو بھابی۔ انھوں نے پیام لگاتے وقت تمھارے والدین کو لکھ دیا تھا کہ لڑکی خوبصورت چاہیئے۔ ان بیچاری نے تمھیں بچپن میں کبھی دیکھا تھا انھیں کیا معلوم تھا کہ بڑے ہونے پر تمھاری رنگت میں اتنی تبدیلی آگئی ہوگی۔ یہ تو تمھارے والدین کا فرض تھا کہ ان بیچاری کو صاف صاف تمھاری رنگت کے متعلق لکھ دیتے۔ تصویر سے تو رنگت کا اندازہ کبھی نہیں لگایا جا سکتا۔

ایک خاتون:۔ پھر بھی اس میں بیچاری مسز فرید کا کیا قصور فرید صاحب کو ان بیچ والی خاتون سے جواب طلب کرنا چاہئے۔

ربیعہ تم بلا وجہ اپنے بھائی کی طرفداری نہ کرو۔

ربیعہ:۔ (دبی لڑکی) واہ کیوں نہ کروں۔ اور آپ کیوں خواہ مخواہ ان بیچ والی کو الزام دے رہی ہیں انھوں نے تو صرف خدا ترسی میں یہ پیام لگایا تھا اور فرید بھائی کو بھی صفائی سے لکھ دیا تھا کہ وہ اپنی رشتہ دار خواتین کو بھیج کر لڑکی کی دیکھ بھال اچھی طرح کرالیں۔

مسز فرید:۔ (بھویں سکوڑ کر) اے تو پھر انھوں نے بھیجا کیوں نہیں۔

ربیعہ پاکستان کا جانا ایسا ہی تو آسان ہے کہ لڑکی پرکھنے جاتے اور ایک بار شادی کرانے۔ تمھارے ابو کے سنجیدہ خطوط سے انھیں ویسے بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ دھوکا فریب کا خیال ان نہیں آیا۔

مسز فرید:۔ (دانت پیس کر) تمھارا مطلب ہے کہ ہم فریبی اور دھوکہ باز ہیں۔

بیگم ناخدا:۔ (جلدی سے) اس بیچاری نے ایسا کب کہا ہے مسز فرید۔ آپ بلا وجہ بگڑ گئیں۔

ربیعہ:۔ (ناک پھلا کر) کہہ بھی دیتی تو کچھ غلط نہ ہوتا۔ یاد نہیں ہمارے کراچی پہونچنے کے دو دن بعد نکاح ہونا تھا۔ لیکن تمھارے ابو نے سفر کی تھکن اتارنے کا موقعہ ہی نہ دیا دو گھنٹے کے اندر اندر نکاح کر دیا کہ تمھارے خاندان کی یہی رسم ہے جبکہ نکاح سے پہلے مجھے بھی اجازت نہیں ملی کہ تمھیں دیکھ سکتی۔ حالانکہ یہ بات پہلے معلوم ہو جاتی تب بھی ہم بارات کی واپسی سے تمھارے خاندان کو رسوا نہ کرتے۔

مسز فرید:۔ اے ہے ایسے ہی خیال رکھنے والے ہوتے تو اب میری صورت پر نام نہ رکھتے۔

ربیعہ:۔ (بگڑ کر) دیکھو بھابی بہت دھاندلی ہو چکی ہاں فرید بھائی نے کب پہل کی ہے بھلا جب تم ہی اس طرح کی باتیں شروع کرتی ہو تب عاجز آکر وہ بھی کہہ دیتے ہیں۔

ایک ممبر:۔ اوئی بیوی۔ تم کیا کہتی ہو اپنے شوہر کو۔

(مسز فرید کو خاموش دیکھ کر ربیعہ جواب دیتی ہے)

ربیعہ:۔ (مسز فرید کے لہجہ میں نقل کرتی ہے) وہ دیکھو آگیا شمشان کے بھوتوں کا سردار۔ تمھی چپ ہو جاؤ ورنہ چیر پھاڑ ڈالے گا۔

وہی ممبر:۔ شمشان کے بھوتوں کا سردار؟ (حیرت سے دہرا کر) اس کا کیا مطلب ہوا۔

ربیعہ:۔ فرید بھائی کی رنگت کالی ہے نا اور وہ ڈاکٹر ہیں بس ان کے پیشہ پر طعنے دیتی رہتی ہیں کہ قبرستانوں اور شمشانوں کی آبادی بڑھا رہے ہیں۔

نئی خاتون:۔ ڈاکٹر فرید کے متعلق تو تقریباً سارا شہر جانتا ہے کہ خدا نے ان کے ہاتھ میں شفا دی ہے۔ پھر یہ بے جا طعنہ کیسا؟۔

ربیعہ:۔ بھابی کا یہی حال ہے۔ جب سے بیاہ کر آئی ہیں فرید بھائی کے پیشے پر چوٹیں کرتی ہی رہتی ہیں یہاں تک کہ بچوں کو قصے کہانیاں اور لطائف سناتی ہیں تو وہ بھی ڈاکٹروں ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ غرض ہر طرح انھیں طنز و مزاح کا نشانہ بنائے رکھتی ہیں۔ ان کا یہ طریقہ فرید بھائی کے بھانجے برداشت نہیں کر پاتے وہ بھابی سے لڑتے ہیں۔ گھر کا سکون و آرام حرام ہو گیا ہے اسی سے عاجز آکر فرید بھائی کی امی کہتی ہیں کہ ایسی تعلیم یافتہ بہو سے وہ جاہل بہو ہزار درجہ بہتر ہے جو۔۔۔۔

ضعیف خاتون:۔ (بات کاٹ کر) کیا ان کے خاندان میں کوئی بہو سچ مچ جاہل ہے۔؟

ربیعہ:۔ فرید بھائی کی بڑی بھاوج آٹھواں نواں کچھ پاس ہیں۔ وہ دل و جان سے نہ صرف سب کی خدمت کرتی ہیں بلکہ شوہر کی عزت کو اپنا ایمان سمجھتی ہیں۔ انھیں کی مثال دیتی ہیں تو۔

مسز فرید:۔ (بھڑک اٹھتی ہیں) ہاں کوئی کیوں دے مثال ہم نے کیا کمی ہے جو دوسروں کو نمونہ کے طور پر سامنے رکھیں۔ (آستین چڑھانے لگتی ہیں) اب کوئی کچھ کہہ کر تو دیکھے۔

بیگم حضر:۔ (گھبرا کر) ارے۔ ارے یہ آپ دونوں باہم مارکٹائی پر کیوں آمادہ ہو گئی ہیں۔

باقی آئندہ

افسانہ

مارِ آستین

راحت بھٹی

بازار میں شاپنگ کرتے ہوئے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ باجی میں ایک دم چونک پڑی۔ مڑکر دیکھا تو ایک عورت میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ آپ۔ آپ کون ہیں۔ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ اور میں باوجود کوشش کے اسے بالکل نہ پہچان سکی اور شرمندگی سے کہا جی نہیں میں آپ کو نہیں پہچان سکی۔ میں نسرین ہوں باجی۔ اف اللہ نسرین تم۔ میں نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور سچی بات ہے مجھے خوشی سے زیادہ حیرانگی ہوئی تھی۔ خدایا نسرین کو کیا ہو گیا ہے۔ اتنی خوبصورت پیاری سی لڑکی جس کے ساتھ کبھی لڑکیاں بات کرنے میں فخر محسوس کیا کرتی تھیں — عمر کے ساتھ ساتھ انسان میں اس قدر تبدیلی آسکتی ہے۔ یہ تو میں سوچ بھی نہ سکتی تھی بجائے اس کے کہ وہ اس عمر میں بھاری بھرکم قسم کی عورت ہوتی۔ وہ بالکل سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔ سانولی سلونی رنگت کچھ زیادہ ہی سیاہی مائل ہو گئی تھی۔ اور اس میں زردی کی ملاوٹ سے وہ بالکل کسی لمبی بیماری کی مریضہ لگ رہی تھی وہ لمبی لمبی سیاہ گھنیری زلفیں جنھیں دیکھ کر اکثر لڑکیاں کہا کرتی تھیں۔ بس اس سے کہیں آدھے بال ہمیں دے دے۔ آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ آنکھوں پر نظر کے موٹے موٹے شیشے کے سامنے دو دانت غائب۔ اللہ کس طرح باور کر دوں یہ نسرین ہے ہے، نسرین ہے، نسرین یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیسی حالت بنالی ہے تم نے، وہ پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کے بولی۔ میں باجی گردش ہے زمانے کی۔ کچھ فکر معاش۔ کچھ گھریلو ذمہ داریاں زندگی کی ہزاروں مصیبتیں تو ساتھ لگی ہوئی ہیں۔

نسرین ذمہ داریاں کس پر نہیں ہوتیں۔ فکر معاش سے آج کون آزاد ہے۔ ہمارے اوپر بھی تو ذمہ داریاں ہیں، تم سے زیادہ عمر ان ہی ذمہ داریوں کو نبھاتے گزر گئی ہے لیکن کیا تم نے تو اپنا حلیہ ہی بگاڑ لیا ہے۔ آخر کچھ تو کہو ایسا کیوں ہوا تو۔ باجی ساری کتھا کے بازار ہی میں بیٹھ جاؤں۔ چلئے نا میرے ساتھ گھر سب آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر گئی اور اپنے ساتھ ایک چودہ پندرہ سال کی پیاری سی لڑکی کو لے کر آئی۔ جس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے پوچھا نسرین یہ تمہاری بچی ہے۔ وہ ہنس کر بولی باجی یہ میری سب سے چھوٹی بہن شمیم ہے۔ جو ان دنوں امی کی گود میں تھی.... تو یہ تمہارے پاس رہتی ہے۔ تمہارے اپنے بچے کہاں ہیں۔ نسرین کا چہرہ ایک دم اداس ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ باجی یہ میرے چھوٹے بہن بھائی تو میرے بچے ہیں۔ یہی میری دنیا ہیں۔ میں انھیں کے لئے جی رہی ہوں۔ بس یہی زندگی کا سرمایہ ہیں۔

کیا کہہ رہی ہو نسرین تمہارا پھوپی زاد بھائی سجاد کیا تھا اور نام تھا اس کا کہاں گیا۔ جس سے تمہاری منگنی ہوئی تھی۔ جو ان دنوں ڈاکٹری میں پڑھتا تھا۔ وہ.... وہ... اس کی تو شادی ہو چکی ہے باجی.... اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔

کیا کہہ رہی ہو نسرین جلدی جلدی جاؤ قصہ کیا ہے تم نے تو مجھے حیرت میں ڈال دیا ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے باجی کہ ہم سب بہت چھوٹے چھوٹے تھے جب ہمارے ابا جان کا انتقال اچانک حرکتِ قلب بند ہونے سے ہو گیا تھا۔ میرے ابو کے اور کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ صرف ایک بڑی بہن تھیں۔ جن کا صرف ایک ہی بیٹا یہی سجاد۔ ہمارے پھوپا کا انتقال ہوئے مدت ہو گئی تھی۔ مگر وہ چونکہ بہت بڑے زمیندار تھے۔ اس لئے ان کی موت کے بعد پھوپی اماں کو کوئی معاشی دقت نہیں ہوئی۔ ابا جان کے چالیسویں کے بعد پھوپی ہم پانچوں بہن بھائیوں اور امی کو اپنے یہاں لے آئیں۔ پھوپی نے ہمارا کون سا ناز نہیں اٹھایا خدا کی قسم انھوں نے ہمیں ابا جان کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ میرے بڑے بھائی طاہر اور سجاد کلاس فیلو تھے۔ انھوں نے اکٹھا ہی میٹرک کا امتحان دیا۔ اور ایک ہی کالج میں داخل ہو گئے۔ آپ کو پتہ ہے کہ ہمارے طاہر بھائی کس قدر حساس تھے۔ انھیں ہر وقت یہ احساس رہتا کہ بچاری پھوپی اماں پر ہمارے سارے گھر کا بہت زیادہ بوجھ ہے گو پھوپی جان نے یہ کبھی نہ جتایا تھا۔ مگر ہماری امی کی بھی یہی خواہش تھی کہ طاہر کہیں نوکر ہو جائے تو بچاری پھوپی کی ذمہ داری کچھ کم ہو۔ پھوپا جب کبھی امی یا بھائی کے

...سے کوئی ایسی بات سنتیں تو بے حد ناراض ہوتیں۔ اور غصے سے کہتیں خبردار جو ایسی بات کا نام لیا، دیکھو میرے لئے سجاد طاہر یا نسرین میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ مجھے یہ بچے سجاد سے کہیں زیادہ عزیز ہیں یہ تو میرے مرحوم بھائی کی نشانیاں ہیں۔ میرا مرحوم بھائی جو میرے باپ کی نشانی۔ جسے میرے اللہ نے مجھ سے چھین لیا۔ یہ کہہ کر ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پھوپی کی یہ محبت اور شفقت امی کو بے حد متاثر کرتی اور وہ بے اختیار پھوپی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر رونے لگتیں۔ یہ منظر بے حد رقت انگیز ہوتا اور سب دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی بھر آتیں۔

ایف۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد سجاد بھائی نے تو میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا۔ مگر طاہر بھائی۔ بی۔ ایس۔ سی۔ تھرڈ ائیر میں داخل ہو گئے۔ جب پھوپی نے میڈیکل میں داخلہ دلوانے پر اصرار کیا تو بولے۔ پھوپی امی مجھے ڈاکٹری کا پیشہ بالکل پسند نہیں یہ کیا ہر وقت انسانی جسم چیرتے پھاڑتے رہو، اس کے لئے تو بہت دل گردہ چاہیئے۔ اور پھوپی اماں اس خیال سے کہ بیٹے کا دل [illegible] خاموش ہو گئیں۔ مگر حقیقت میں طاہر بھائی پھوپی پر اپنی پڑھائی کا زیادہ بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بی۔ ایس سی کرنے کے بعد کوئی چھوٹی موٹی نوکری مل جائے۔ تو وہ ہم سب کا بوجھ سنبھال لیں۔

ان ہی دنوں میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ میری حد سے زیادہ خواہش تھی کہ آگے کالج میں داخلہ لوں مگر امی نے مجھے چپکے چپکے سمجھا دیا تھا۔ کہ بیچاری پھوپی کا خیال کرو اور اگر اتنا ہی شوق ہے تو گھر بیٹھ کر ایف۔ اے کی تیاری کرو۔ سجاد اور طاہر سے مدد لے لیا کرو۔ امی کی بات بھی ٹھیک تھی۔ اس لئے میں نے داخلے کے لئے زیادہ ضد نہ کی۔ گو پھوپی نے مجھے بہت مجبور کیا۔ مگر امی نے بھی پھوپی سے یہی کہا کہ آپا کیا ضرورت ہے لڑکی کو کالج داخل کرانے کی زمانہ کون سا جا رہا ہے۔ ایسا ہی شوق ہے تو گھر پر ہی پڑھے گی۔ کون سی ہمیں نوکریاں کرانی ہیں کہ سجاد بھائی نے جب سنا کہ میں داخل نہیں ہو رہی تو بولے کوئی بات نہیں۔ ہم اپنی بھتیجی کو گھر ہی میں پڑھائیں گے۔ اور دوسرے دن واقعی وہ ایف۔ اے کے کورس کی کتابوں کا گٹھڑ اٹھا لائے۔

باجی! آپ کو یاد ہے نا میری کلاس میں ایک لڑکی سیما تھی۔ ہاں ہاں۔ وہی سیما نا۔ جس سے تمہاری بیحد دوستی تھی۔ چھیا اور چھیا کی پیاری سی جوڑی تو سارے اسکول میں مشہور تھی۔ نسرین بولتے بولتے تھوڑی دیر کے لئے رک گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے جذبات پر قابو پا رہی ہے۔ پھر بولی۔ جی وہی سیما۔ واقعی وہ میری بڑی اچھی اور پیاری سہیلی تھی۔ سارے سکول میں وہی تو میری ایک سہیلی تھی۔ اکٹھے سکول جانا۔ اکٹھے آنا۔ اکٹھے بیٹھ کر رات گئے تک اسکول کا کام کرنا۔ غرض ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ سیما نے جب سنا کہ میں کالج میں داخل نہیں ہو رہی ہوں تو وہ بے اختیار رو دی۔ اور بولی نسرین خدا کی قسم تمہارے بغیر تو کالج بھی سونا سونا لگے گا۔ تمہارے بغیر تو کالج کی زندگی بے مزہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں باجی کہ میری اور چھیا کی محبت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے پڑھائی کے دوران مقدور بھر میری مدد کی۔ وہ خود تو ایف۔ ایس۔ سی کی طالبہ تھی۔ مگر آرٹس کی لڑکیوں سے اکثر نوٹس وغیرہ اکٹھے کر کے میرے لئے لے آتی .... اور سچی بات ہے۔ انگریزی میں میں اس سے بہت زیادہ مدد لیتی۔ کیونکہ سجاد بھائی تو پڑھاتے کم اور تنگ زیادہ کرتے تھے۔ تنگ کرنے کے لئے کبھی مجھے ڈبل مائنڈڈ کبھی خر دماغ اور کبھی کوڑھ مغز کہہ دیتے تو میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ جب میں رو کر پھوپی اماں سے شکایت کرتی تو وہ انہیں خوب ڈانٹتیں مگر جب انہیں ڈانٹ پڑتی تو پھر بھی میرے دل کو بے حد تکلیف ہوتی۔ تو انہیں ڈانٹ کا قطعاً کوئی اثر نہ ہوتا۔ اور وہ اسی طرح ہی ہی۔ کر کے ہنستے رہتے۔ اور جب میں رو دھو کر چپ ہو جاتی۔ تو مجھ سے کہتے تم رو دھو کر اور خوبصورت لگنے لگتی ہو۔ تمہاری یہ سانولی سلونی رنگت ذرا نکھر آتی ہے۔ اور یہ خوبصورت سوچی سوچی آنکھیں تمہارے معصوم سے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیتی ہیں.... مجھے ان کے یہ الفاظ بے حد اچھے لگتے۔ نہ معلوم میرا جی کیوں چاہنے لگتا کہ وہ ہمیشہ مجھے یوں ہی کہتے رہیں... اور جب یہ سب باتیں میں شریر سیما کو بتاتی تو وہ بہت ہنستی اور بے اختیار میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہتی کہ بس بھئی یہ لڑکی تو گئی ہمارے ہاتھ سے اب یہ ہمارے کسی کام کی نہیں رہی۔ جانا با جانا اپنے سجاد کے پاس۔ اب

ہمارا اعتبار کیا واسطہ۔ اور جب میں ہنس کے اسے کہتی کہ لگتی تو تو مجھے ان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تو وہ آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ماشاء اللہ ماشاء اللہ یہ ان کیا بلا ہے۔۔ سیدھے سیدھے سجاد کہو۔ یہ ابھی سے وہ محترم "ان" کیسے ہو گئے۔ کیا کہنے۔ اس اعزاز کے اور میں بے اختیار شرما جاتی۔۔۔۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ میں نے ایف۔ اے اور طاہر بھائی نے بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کر لیا، سیما ایف۔ ایس۔ سی اور سجاد بھائی میڈیکل کے دوسرے سال تک امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ ہماری کامیابی پر ہمارے گھر میں بے حد خوشی منائی گئی۔ خصوصاً میری کامیابی پر میری پھوپی بے حد خوش تھیں۔ وہ کہتی تھیں نسرین کی بہادری ہے۔ کیوں کہ اس نے تو پرائیویٹ امتحان دیا تھا۔ میری کامیابی پر سجاد بھائی نے مجھے بے حد خوبصورت لاکٹ بطور تحفہ لا کر دیا۔ جس کی شکل دل جیسی تھی اور میرے گلے میں ڈالتے ہوئے بولے نسرین کیا میں امید کروں کہ تم ایک غریب دل کا خیال رکھو گی۔ اور اسے ہمیشہ ہمیشہ اپنے دل کے قریب رہنے کا موقع دو گی۔ باجی مجھے اس وقت یہ معلوم ہوا جیسے مجھے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ اُف میں کس قدر خوش تھی اس دن۔ میں لاکٹ لے کر سیدھی سیما کے گھر گئی۔ اسے دکھایا تو وہ بے حد خوش ہوئی اور بولی یہ تیرے "اُن" ہیں بہت خراب تیرے لئے تو تحفہ لے آئے۔ مگر اگر اپنی بہن سیما کے لئے چاندی کا ایک چھلا ہی لے آتے تو کیا بگڑ جاتا ان کا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا اچھا میں ضرور سجاد بھائی سے یہ بات کہوں گی۔

پھوپھی اماں نے ہم تینوں کی کامیابی کی خوشی میں تمام رشتہ داروں اور دوستوں عزیزوں کی دعوت کی اور اسی دعوت میں مجھے سجاد سے منسوب کر دیا گیا۔ میں اپنے آپ کو اس دن دنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھنے لگی تھی۔ سچ جانئیں باجی میرے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ میری امی بھی اس رشتے پر بیحد خوش تھیں۔

سجاد کا میڈیکل کا تیسرا سال شروع ہو چکا تھا گھر پر ان کا زیادہ وقت اِدھر اُدھر ضائع ہو جاتا تھا وہ پڑھائی کی طرف توجہ زیادہ نہیں دے پاتے تھے۔ اسی لئے پھوپھی کے مشورے پر انھوں نے ہوسٹل میں داخلہ لے لیا۔ اور وہ گھر چھوڑ کر ہوسٹل میں پہنچ گئے۔ اور جاتے جاتے مجھ سے کہہ گئے چھینی تم فکر نہ کرنا۔ میں اتوار کے اتوار آیا کروں گا۔ اُف باجی میں یہ چھ دن کس مشکل سے گزارتی۔ ان کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے میرا دل تڑپ جاتا یہ چھ دن مجھے چھ سال سے کم نظر نہ آتے۔ حالانکہ جب سے منگنی ہوئی تھی۔ میرا ان کے سامنے جانا یا بات چیت کرنا بالکل بند کر دیا گیا تھا پھر بھی وہ اتوار کو گھر آتے تو مجھے ایک انجانی مسرت ہوتی۔ ویسے چھ دنوں کے دوران سیما سے ان کی خیریت مل جاتی۔ کیونکہ اب وہ بھی تو اسی کالج میں داخل ہو گئی تھی۔

طاہر بھائی کو چند ہی دنوں میں ایک فرم میں اچھی نوکری مل گئی۔ نوکری ملتے ہی انھوں نے علیحدہ مکان لے لیا۔ اور ہم لوگ اس میں اٹھ آئے۔ پھوپی اماں اس دن کس قدر روئی تھیں۔ انھوں نے کتنا اصرار کیا تھا۔ مگر طاہر بھائی یہی کہتے رہے پھوپی جان آپ کے احسانات سے تو میری گردن دب گئی ہے۔ اب خدارا مجھے اپنے پاؤں پر بھی کھڑا ہونے دیجئے۔ علیحدہ گھر ہو جانے سے اتوار کو سجاد کو دیکھنے والی آس بھی ختم ہو گئی تھی۔ کیونکہ منگنی ہو جانے کی وجہ سے اتوار کو پھوپی کے گھر جاتے ہوئے بھی شرم آتی کہ نہ معلوم پھوپھو کیا خیال کریں۔ میں جب دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتی تو سیما کے ہاں سجاد کو رقعہ بھیج دیتی۔ جس کا وہ بے حد پیارا سا جواب دے دیتے۔ بس یہی جواب میرا سہارا تھا۔ ان کی تحریر کے سہارے میرے دن کٹ رہے تھے۔ سیما اکثر کہتی چھینا واقعی تیرا سجاد ایک گریٹ آدمی ہے۔ واقعی تو خوش نصیب ہے۔ اور واقعی میں بھی اپنی قسمت پر ناز کرنے لگتی۔ خدایا کب سجاد کی تعلیم ختم ہوگی۔ کب وہ ڈاکٹر بنیں گے۔ اور کب وہ مجھے لے کر جائیں گے، مجھ سے تو اب صبر بھی نہیں ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ سیما میرا پیغام لے جانے میں حیل و حجت سے کام لینے لگی۔ کبھی چھینا آج کل سجاد بچارا امتحان کی تیاری میں بہت مصروف ہے۔ اس کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا کہ تمہارے نامۂ محبت کا جواب دے۔ اب ذرا صبر سے کام لو۔ مجھے بھی ندامت ہوئی کہ میں بھی کیسی خود غرض ہوں۔ بچارا سجاد کتنا مصروف ہے۔ اور میں نے پھر کبھی کبھار خیریت کی اطلاع ملنے پر ہی اکتفا کر لیا۔ لیکن یہ دیکھ کر میں حیران ہوتی رہی کہ سیما نے بھی میرے ہاں آنا جانا کم کر دیا۔ اور جب کبھی میں اس کی شکایت کرتی تو برا سا منہ بنا کے کہتی تمہیں کیا پتہ ایم۔ بی۔ ایس پاس کرنا کس قدر مشکل ہے۔ طالبان کو پڑھائی کے سوا دوسری طرف توجہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ میں نے نے کہا سیما یہ تو سچ ہے۔ لیکن میں نے اس سے بیشتر میڈیکل کے طالب علموں کو

کے زمانے میں تارک الدنیا ہوتے تو نہیں دیکھا — مگر سیما میری بہن باتوں کا بُرا مان جاتی۔ اس لئے میں نے بھی اس کے ساتھ ملنا جلنا ترک کر دیا۔

ایک دن بازار میں مجھے سیما کی سہیلی نگہت ملی۔ جو اس کے ساتھ ہی میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی، تو میں نے سیما اور سجاد کا حال پوچھا۔

وہ ہنس کے بولی۔ اری اب سجاد سے ہاتھ دھو لے۔ آج کل سجاد اور سیما کے متعلق کالج میں خوب چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ باجی میں آپ کو کیسے بتاؤں میری اس وقت کیا حالت ہوئی۔ کاش مجھے موت آجاتی۔ کاش زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتی۔ میں پاگلوں کی طرح گھر پہنچی اور دھڑام سے چارپائی پر گر کر بیہوش ہو گئی ہوش آنے پر امی نے لاکھ پوچھا کہ کیا بات ہے تمہاری طبیعت کیوں خراب ہو گئی ہے مگر میں نے انھیں کچھ نہیں بتایا۔ میں ساری رات روتی رہی۔ الہٰی یہ کیا ہو گیا ہے۔ یہ سیما ایسی لڑکی تو نہ تھی۔ خدایا یہ بات غلط ہو میرے اللہ اس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔

دوسرے دن شام کو سیما کے ہاں گئی تو اس کی امی نے بتایا وہ آج کل سارا سارا دن کالج میں رہتی ہے سنا ہے پریکٹیکل میں بہت وقت لگتا ہے۔ میں وہاں سے ناکام آگئی۔ میرے دل میں تو باجی آگ لگی ہوئی تھی۔ مجھے تو کسی کل چین نہ آتا تھا۔ میں تڑپتی ہوئی پھر نگہت کے پاس گئی۔ اور اس سے کہا کسی طرح مجھے سجاد کے پاس لے چلو۔ صرف دو گھڑی کے لئے۔ نگہت مان گئی۔ اور ایک دن شام کے وقت وہ مجھے ہاسٹل میں لے گئی۔ سجاد کے کمرے کی ایک کھڑکی باہر کی طرف کھلتی تھی۔ اس کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ نگہت مجھے پہلے کھڑکی کی طرف لے گئی۔ کہنے لگی پہلے ادھر سے دیکھ لیتے ہیں۔ سجاد کمرے میں ہے یا نہیں کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا تو باجی میری آنکھوں کو یقین نہ آیا۔ سیما سجاد کے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور دونوں میٹھی میٹھی باتیں کر رہے تھے۔ میں ایک دم ایسے پیچھے ہو گئی جیسے بھڑ نے ڈنک مار دیا ہو۔ آہ یہ سیما تھی۔ میرے بچپن کی سہیلی۔ میری مونس و غمخوار۔ میری ہمدرد۔ آہ اس دنیا میں انسان کس پر اعتبار کرے کیسے پہچانے۔ اور پھر میں سجاد سے ملے بغیر ہی گھر واپس آگئی۔ آہ مجھے کس قدر اعتماد تھا سیما پر اور اس سے بڑھ کر سجاد پر۔ لیکن یہ

سب کیا ہو رہا تھا۔ خدایا۔ پھوپی اماں کو پتہ چل گیا تو وہ کیا سوچیں گی۔ انھیں کس قدر صدمہ ہوگا۔ مگر میری بدقسمتی کہ ان ہی دنوں پھوپی اماں بیمار ہوئیں۔ دمے کی مریضہ تو وہ پہلے ہی تھیں۔ بیماری کا ایسا شدید حملہ ہوا کہ جانبر نہ ہو سکیں۔ . . . سیما کو میں نے پھوپی اماں کی موت پر دیکھا مگر سچی بات ہے میرا بالکل جی نہ چاہا کہ اس سے بات کر دں۔ اور وہ بھی چوروں کی طرح میرے قریب آنے سے گھبرا رہی تھی، نہ معلوم وہ کس وقت اٹھ کر چلی گئی۔ مجھے پتہ نہ چل سکا۔ اور پھر وہ دوبارہ میرے ہوتے ہوئے وہاں نہ آئی۔ اس کے بعد تو یوں ہوا جیسے سجاد بھائی کو کھلی چھوٹ مل گئی ہو۔ میں نے بارہا۔ بازار میں شاپنگ کرتے ہوئے سینما ہال میں اور تفریح گاہوں میں دونوں کو اکٹھا گھومتے پھرتے دیکھا الہٰی دونوں کو دنیا کی شرم بھی نہ رہی تھی۔ یہ سیما کے ماں باپ کیسے والدین تھے۔ جو سب کچھ جانتے ہوئے بھی سیما کو روک نہیں رہے تھے۔ انھوں نے آخر سیما کو کیوں کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ انکی غیرت کو کیا ہو گیا تھا سجاد بھائی تو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے آخری امتحان میں کامیاب ہو کر ڈاکٹر بن گئے اور سیما سال دوم کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے پڑھائی چھوڑ دی۔ سجاد کے پاس ہونے پر طاہر بھائی اور امی انھیں مبارک باد دینے گئے۔ ان کا خیال تھا اب سجاد ضرور شادی کی بات کرے گا۔ مگر سجاد نے اس قدر بے رخی اختیار کی کہ امی اور طاہر بھائی کو بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ اور بولے مجھے کسی سے ملنے جانا ہے وقت دے دیا ہے۔ اس لئے معافی چاہتا ہوں۔ پھر ملاقات ہوگی۔

اور پھر آخر ایک دن ایٹم بم کے دھماکے کی طرح یہ خبر میرے سر پر پڑی کہ سجاد نے سیما سے شادی کر لی ہے اور کسی رشتہ دار یا عزیز کو خبر تک نہیں دی، آہ باجی کیا بتاؤں ہمارے دل پر کیا گذری۔ میں تو ظالم سیما کو اپنی بھابی بنانے کا سوچ رہی تھی۔ لیکن وہ تو مار آستین نکلی۔ اس سنگدل نے تو مجھے ہی ڈس لیا تھا۔ میں اپنا دکھ کیسے سناتی، امی کی حالت بالکل غیر ہو چکی تھی۔ لوگ ہمارے ہاں اس طرح افسوس کرنے آتے جیسے کسی کی تعزیت کرنے آئے ہیں۔

مصیبت جب آتی ہے تو اکیلی نہیں آتی۔ ایک کے بعد دوسری ایسے ٹوٹ پڑتی ہے کہ پہلی بھول جاتی ہے خداوند کریم کو ابھی ہماری اور آزمائش منظور تھی۔ طاہر بھائی آہ میرے پیارے بھیا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اور وہ پھر دنیا میں ایک سانس بھی نہ لے سکے۔ وہیں ختم ہو گئے۔ میرا پیارا بھائی جو صبح ہنستا کھیلتا کام پر گیا تھا دوبارہ زندہ سلامت گھر نہ آیا۔ اس کی جوان لاش کو دیکھ کر تو غیر بھی چیخ پڑے۔ دشمن بھی میرے

بھائی کو ایک نظر دیکھنے آ گئے۔ مگر نہ آیا تو سجاد اور سیما۔۔۔۔ ہمارا آخری سہارا بھی خدا نے یوں چھین لیا۔ میں تو صرف ایف۔ اے پاس تھی، میرے پاس کوئی ٹریننگ نہ تھی۔ مگر بھلا ہو ماڈل سکول منیجر کا۔ جس نے مجھے ۔۔ روپے ماہوار پر اپنے سکول میں رکھ لیا۔ ۱۰ روپیہ وہاں سے مل جاتا۔ کچھ رقم ٹیوشن وغیرہ سے مل جاتی۔ کچھ چھوٹی پروین اور امی گھر میں سلائی وغیرہ کر لیتیں، اور اس طرح وقت گزرتا گیا، میں نے پرائیویٹ بی۔ اے کیا۔ پھر بی ایڈ اور اس کے بعد ایم۔ اے کر لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مجھے اتنی تنخواہ ملتی ہے کہ عزت سے گزارا ہو رہا ہے۔ پروین کی میں نے شادی کر دی ہے۔ خدا شکر ہے وہ اپنے گھر میں خوش ہے حامد نے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا ہے۔ شمیم اس دفعہ دسویں درجہ میں ہے۔ خداوند کریم ان کے ساتھ ہو۔ یہی میری دنیا اور یہی میری متاع ہیں۔ جس دن یہ سب اپنے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے۔ پھر مجھے اپنی زندگی کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ میں تو زندہ ہوں صرف ان کے لئے۔ خداوند کریم انھیں زندگیاں دے۔

کبھی آمنا سامنا ہوتا ہے اس بے وفا سے

افسوس اس کا ہے بہن! کہ سیما نے سجاد کے ساتھ دغا کی۔ چند ہی سال بعد اس کا کسی اور سے اسکینڈل ہو گیا اس لئے کہ سجاد اپنی مصروفیتوں کے باعث اسے زیادہ وقت نہ دے سکتا تھا۔ یہ راز پوشیدہ بھی نہ رہ سکا۔ اور جب سجاد کو اس کا علم ہوا تو اس نے اسے طلاق دے دی۔"

"تو اس میں افسوس کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا "تمہیں تو گھی کے چراغ جلانا چاہئے تھے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ میں کیوں خوش ہونے لگی نسرین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔"

"اس لئے کہ اس نے تمہیں دھوکا دیا تھا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔" نسرین نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "انھوں نے اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہوتے ہوئے پھر مجھ کو اپنا بنانا چاہا تھا۔ لیکن اب مجھ میں رہ کیا گیا تھا میں نے خط کا جواب بھی نہیں دیا۔"

"بہت اچھا کیا تم نے نسرین" "میں تو اس کے نام کا کتا بھی نہ پالتی بہن۔"

چند لمحے خاموشی میں گذرے۔ اس کے بعد میں نے پوچھا۔

امی کہاں ہیں نسرین۔ نسرین کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔ کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بولی۔ طاہر بھائی کی موت اور سجاد کی بے وفائی نے انھیں بالکل کھوکھلا کر دیا تھا باجی، وہ تو کب کی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔ سجاد کی پھر کوئی خبر نہیں ملی نسرین۔ باجی مجھے کیا کرنا تھا اس کی خبری کر کے میرا کیا واسطہ۔ جہاں رہے خوش رہے۔۔۔ اُف نسرین کس قدر صابر اور باحوصلہ عورت ہے۔ خداوند تو ہی اسے عزم و ہمت، صبر و حوصلے کا اجر دے (آمین ثم آمین) اتنے میں شمیم آ گئی، باجی چائے تیار ہے۔ اور ہم لوگ اٹھ کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔

نسرین چائے کے دوران ہنس ہنس کے یوں باتیں کر رہی تھی۔ جیسے اس نے کبھی دکھ نہ دیکھا ہو۔ لیکن کس قدر کھوکھلی ہنسی تھی اور کتنا درد تھا اس ہنسی میں کس قدر دکھ پوشیدہ تھے، اس کی اس مسکراہٹ میں کیا کوئی اندازہ کر سکتا تھا۔ کہ صنفِ نازک۔ کہلانے والی یہ نازک ہستی، ایک پہاڑ جیسے حوصلہ و ہمت کی مالک ہے۔

اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا کبھی کوئی ایسا دور بھی آئے گا۔ جس میں عورت مرد کے ظلم کا نشانہ نہ بنے گی۔ جس میں عورت عورت کے ستم کا شکار نہ ہوگی۔

کیا آپ جانتی ہیں ـــ؟

(مرسلہ کوثر جہاں صاحبہ پٹنہ)

- فروری، مارچ اور نومبر ہر سال ایک ہی دن سے شروع ہوتے ہیں۔
- ہمیشہ یکم اپریل کو جو دن ہوگا وہی یکم جولائی کو ہوگا۔
- دنیا بھر میں ۳۰۶۴ زبانیں اور ایک لحاظ سے زیادہ مذاہب ہیں۔
- سمندر میں ایک مربع میل کے اندر بارہ کروڑ مچھلیاں رہتی ہیں۔
- ٹائیفائڈ کے کیڑے اتنی باریک ہوتے ہیں۔ کہ ایک گھونٹ پانی میں تقریباً بیس لاکھ ہوتے ہیں۔
- ایک گھونگا دس دن میں ایک کیلو مٹی کھا سکتا ہے
- ایک وھیل مچھلی کی زبان سے ایک ٹن تیل نکالا جا سکتا ہے۔
- کوئی بھی شمسی جنتری بیس سال بعد پھر صحیح طور پر استعمال ہو سکتی ہے۔

اسلام میں اخلاق کی اہمیت

سید فضل الرحمٰن جعفری

اگرچہ دنیا میں ہر مذہب کی بنیاد اخلاق پر ہے۔ اور ہر مذہب کے پیشواؤں اور مصلحوں نے یہی تعلیم دی کہ سچائی بڑی دولت ہے۔ انصاف بڑی نعمت ہے۔ اور خیرات بڑی سعادت ہے۔ لیکن اسلام ایسا مذہب ہے جس میں اخلاق کا درجہ تمام مذاہب سے زیادہ بلند ہے۔ چنانچہ محسن انسانیت خاتم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:۔

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق

(ترجمہ) میں تو اسی لئے بھیجا گیا کہ اخلاق حسنہ کی تکمیل کروں۔

چنانچہ اعلان نبوتؐ کے بعد ہی اسلام نے اخلاق و محبت کے جو مظاہرے کئے ہیں وہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ اخلاق ہی اسلامی تعلیمات کی اساس ہے۔ لوگ اخلاق حسنہ کے بھوکے تھے۔ وہ انصاف کے لئے ترس رہے تھے۔ محبت و دل سوزی کی تلاش میں تھے۔ اور یہ سب باتیں ان کے دل کی تمنا تھیں۔ چنانچہ مکے میں "فاران" کی چوٹیوں سے جب اعلان نبوت ہوا تو ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو مکے بھیجا اور یہ ہدایت کی کہ "تم یہ معلوم کر کے آؤ کہ مدعی نبوت کیسا ہے۔ اس کی زندگی کیسی رہی ہے۔ اس کی کیا تعلیم ہے اور اس کی تبلیغ کا کیا طریقہ ہے۔" پھر جب ابوذر کے بھائی مکے سے لوٹ کر آئے تو انھوں نے کہا کہ:۔

"بھائی! میں نے اسے دیکھا کہ وہ لوگوں کو مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے"

سے زیادہ بڑھا دی۔ چنانچہ اسلام نے حقوق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حقوق اللہ ہے اور دوسرا حقوق العباد۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہمیشہ مہربان ہے اس کی صفت رحمٰن اور رحیم بھی ہے۔ وہ غفار و ستار بھی ہے۔ اس کی رحمت کا دروازہ کسی بندے پر بند نہیں ہوتا۔ شرک و کفر کے سوا اس نے ہر قسم کے گناہ کو قابل معافی قرار دیا ہے۔ مگر حقوق العباد کی معافی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی۔ بلکہ یہ حق ان بندوں کو بخشا ہے جن کے ساتھ یہ ظلم ہوا ہے۔ اسی لئے محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس بھائی نے اپنے دوسرے بھائی پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہیئے کہ اسی دنیا میں وہ اس مظلوم بھائی سے اسے معاف کرا لے ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا، صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔" اس طرح اسلام کے چاروں ارکان میں اسلام کے بنیادی مقاصد یعنی اخلاقی تعلیم کو پیوست کر دیا گیا ہے۔ اگر ان عبادات سے اخلاقی اور روحانی بالیدگی اور اعمال صالحہ کا جذبہ پیدا نہ ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ احکام الٰہی کے جوہر اور روح سے خالی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں وہی بندے خدا کے مقبول اور نیک قرار دیئے گئے ہیں جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں۔ اسلام میں اخلاق کو جو رتبہ دیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس میں یہ دعا بھی شامل ہوتی تھی:۔

"اور اے میرے خدا! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر۔ تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی نہیں دکھا سکتا۔ اور برے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے۔ اور میں ان کو نہیں پھیر سکتا۔ لیکن تو۔"

ابوسفیان اسلام کے دشمن تھے۔ اور اس کی بیخ کنی پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ لیکن وہ جب قیصر روم کے دربار میں طلب کئے گئے اور ان سے داعی اسلام اور مدعی نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پوچھا گیا تو باوجود اس کے کہ وہ کافر تھے۔ اور اسلام کے دشمن تھے۔ لیکن انھوں نے داعی اسلام اور مدعی نبوتؐ کے اخلاق کے بارے میں جو تصویر کھینچ کر رکھی وہ یہ تھی کہ وہ خدا کی توحید کے ساتھ لوگوں کو پاک دامنی، سچائی، اور قرابت کا حق ادا کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ سچ پوچھو تو تعلیمات محمدی نے اخلاق کی اہمیت بہت

یہ پیغمبرانہ الفاظ اس اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب کے موقع پر بارگاہ الٰہی سے جو چیز طلب کرتا ہے وہ حسن اخلاق ہے اور پیغمبر برحق صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی اعلان فرماتے ہیں کہ:۔

مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔"

حسن اخلاق کو اسلام نے ایمان کے کمال کا معیار و میزان قرار دیا ہے۔ پھر اسلام میں اخلاق ہی وہ پیمانہ ہے جس سے انسانوں میں باہم ایک دوسرے کے مرتبہ کا فرق ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ پیغمبرانہ ارشاد ہے کہ:۔

خیارکم احسنکم اخلاقاً (بخاری)

"یعنی تم میں سب سے اچھا وہ ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں فرماتے ہیں:۔

اَحبّ عباد اللہ الی اللہ احسنہم اخلاقاً۔ (طبرانی)

(ترجمہ) "اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔"

عہد نبویؐ میں دو صحابی خواتین تھیں۔ ایک وہ تھیں جو رات بھر نماز پڑھتی تھیں۔ اور دن کو روزہ رکھتی تھیں۔ اور صدقہ بھی دیتی تھیں لیکن اتنی زبان دراز تھیں کہ پڑوسی سخت پریشان رہتے تھے۔ دوسری صحابیہ صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو کپڑے دیتیں۔

جب ان دونوں صحابیات کے بارے میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا تو ارشاد نبویؐ ہوا کہ:۔

"پہلی خاتون میں کوئی نیکی نہیں۔ وہ اپنی بد خلقی کی وجہ سے سزا بھگتے گی، اور دوسری صحابیہ کے بارے میں فرمایا وہ جنتی ہوگی۔"

اسلام میں حسن خلق کی جو عظمت ہے وہ ان خواتین کی سیرت سے نمایاں ہوگئی۔ اخلاقی عظمت ہے وہ ان خواتین کی سیرت سے نمایاں ہوگئی۔ اخلاقی عظمت کو اسلام نے جو وسعت دی ہے اس کا قیاس کرنا مشکل ہے گویا ساری نیکیاں اور آخرت کی تمام کامرانیاں سمٹ کر دامن اخلاق میں آگئی ہیں۔ گویا ہر نیکی اخلاق کی آئینہ دار ہے۔ اور بد خلقی کی مظہر ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ:۔

"تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔"

یہ اخلاق کا انتہائی بلند درجہ ہے جس میں ایثار، صبر اور قناعت کی صفات کو سمویا گیا ہے۔ ایک شخص دریافت کرتا ہے کہ اے خدا کے رسولؐ! اسلام کیا ہے؟"

ارشاد ہوتا ہے:۔

• اچھی بات بولنا۔ اور کھانا کھلانا۔"

پھر پوچھا۔ ایمان کیا ہے؟

• فرمایا صبر کرنا، اور اخلاقی جوانمردی دکھانا مومن کی تعریف یہ ہے کہ نہ تو وہ کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بد دعا دیتا ہے۔ اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بدزبان ہوتا ہے۔" پھر ارشاد نبویؐ ہوا۔

"مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں۔ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں۔ مہاجر وہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنت میں نہیں جا سکتا، جب تک اس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہ رہا ہو۔"

یہ چند حدیثیں اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ اسلام کا اخلاقی معیار کتنا بلند ہے اور اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام سراپا اخلاق ہے اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان بالکل بجا ہے کہ:۔

انی بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

ضرورت رشتہ

اسپیشل ایگزیکیو ٹیو افسر کے عہدے پر سروس کرنیوالے، اعلیٰ خاندان سید سنی المذہب ۲۷ سالہ، تندرست و خوبرو پابند صوم وصلوٰۃ لڑکے کے لئے رشتہ درکار ہے لڑکے کا رنگ صاف ہے۔ قد ۵ فیٹ گیارہ انچ ہے تعلیمی قابلیت بی۔ اس۔ سی ہے۔ لاکی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

لڑکی اعلیٰ خاندان، سید سنی المذہب، حسین، تندرست اور تعلیم یافتہ ہو۔ امور خانہ داری سے دلچسپی رکھتی ہو، پابند صوم صلوٰۃ ہو اور پردہ کرتی ہو۔ لڑکی کا قد ۵ فٹ سے کم نہ ہو۔

سلسلہ جنبانی کے لئے تفصیلات اڈیٹر حریم لکھنؤ (نمبر) کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔ تمام خط و کتابت صیغہ راز میں رکھی جائے گی۔

حریمی دسترخوان

گوبھی کے پراٹھے

سامان۔ آٹا گیہوں ۲۵۰ گرام میدہ ۱۰۰ گرام۔ گوبھی کا پھول مڈیم قسم کا بغیر پتوں کے ۵۰۰ گرام ادرک ۵۰ گرام ٹماٹر ۱۰۰ گرام ہری مرچ حسب خواہش نمک اور ڈالڈا حسب ضرورت۔

ترکیب۔ گوبھی کے پھول کو دو تین بار پانی سے دھو کر کدوکش سے باریک کرلیں۔ کدوکش نہ ہو تو چاقو سے کاٹ لیں، لیکن خوب باریک کاٹیں پھر اس میں ادرک کو خوب باریک باریک کاٹ کر یا پھر پیس کر ٹماٹر میں ملائیں۔ ٹماٹر پکا ہونا چاہیئے، ہری مرچ باریک کاٹ کر اور ٹماٹر کے آمیزے میں ملائیں نمک بھی اندازے سے ڈالیں اور گوبھی کے پھول میں ملا کر ایک جان کرلیں۔

آٹا اور میدہ ایک ہی میں ملا کر گوندھیں (میدہ نہ ہو تو صرف آٹا ہی کافی ہے۔ میدہ پراٹھوں کی رنگت اچھی کرنے کے لئے ملایا جاتا ہے اور اس لئے بھی خستہ زیادہ ہو جائے)۔ آٹا چپاتیوں کے آٹے سے کم ڈھیلا اور سخت۔ گوندھتے وقت تھوڑا سا نمک آٹے میں بھی ملا دیں۔

آٹے کی چھوٹی چھوٹی لوئیاں بنا کر پتلی پتلی بیلیں اور ہر دو کے درمیان گوبھی کے آمیزے کو تھوڑا تھوڑا پھیلا کر کناروں کو انگلیوں کی مدد سے چپکا دیں اور الٹے توے یا فرائی پین میں ہلکی آنچ پر تھوڑا تھوڑا گھی یا ڈالڈا ڈال کر پکائیں۔ ایک طرف کچھ گلابی ہو جائے تو پلٹ دیں۔ یہ عمل دو تین بار کریں، لیکن خیال رکھیں کہ جلنے نہ پائیں۔ اگر کھلانے کے وقت تک ٹھنڈے ہو جائیں تو کھانے کے وقت ہیٹر یا انگیٹھی سے ٹوسٹر پر رکھ کر یا توے و فرائی پین ہی میں گرم کرلیں۔

گوبھی بادی ہوتی ہے۔ اسی لئے ادرک زیادہ ڈالی جاتی ہے۔ ادرک بادی پن کو مار دیتی ہے۔

اور ٹماٹر نہ مل سکیں تو لیمو کا عرق شامل کرلیں۔ یہ بھی ممکن نہ ہو سکے تو ہلکی سی کھٹائی پسی ہوئی گوبھی کے آمیزے میں ملالیں۔

مس وزیر النساء ناہید

سنہ ۱۹۸۲ء کی ایک اور نحوست

آخری کاپی پریس جارہی تھی کہ یہ افسوس ناک خبر ملی کہ اردو کے عظیم اور مزدوروں کے ہمنوا شاعر جناب احسان دانش بھی جوش و فراق کے ساتھ داغ مفارقت دے گئے۔ احسان دانش صاحب عرصہ سے پاکستان میں تھے اور وہیں انتقال فرما گئے۔

نسیم انہونوی

نسیم انہونوی کا وہ اصلاحی ناول جو عرصہ سے نایاب تھا اب مل سکتا ہے۔

عفت کا وہ ناول جس پر عفت کو ناز ہے

تقدیر

نیا اڈیشن اب تیار ہے۔ قیمت پچیس روپیہ

مس طلعت

باعتبار پلاٹ، دلچسپی اور سسپنس، یہ ناول بے حد مقبول ہوا تھا۔ قیمت مجلد۔ سولہ روپیئے۔

نذر تخلص

صاحب طرز مزاح و طنز نگار تخلص بھوپالی مرحوم پر لکھے گئے ان مضامین کا مجموعہ جو ان کی شخصیت اور فن پر مشتمل ہے اور جسے پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے مرتب فرمایا ہے۔ قیمت بیس روپیہ

حریمی دسترخوان

کھانا پکانے کے فن پر اس صدی میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب۔ مرتبہ ادارہ حریم خانہ داری سے دلچسپی رکھنے والی ہر بہن کو یہ کتاب ضرور اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔ قیمت نو روپیہ

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ

آمنہ ابراہیم (بنگلور)

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ اور نامور اولیاؤں میں سے گزرے ہیں۔ آپؒ نے حضور صلعم کا مبارک زمانہ دیکھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصری کی والدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہ کی کنیزوں میں تھی۔ حسن بصریؒ بہت چھوٹے تھے جب ان کی ماں کام و کاج میں لگی رہتی تھیں۔ بچہ جب بھوک سے رونے لگتا تو اُم سلمہؓ اپنا دودھ بچے کے منہ میں دے دیتیں اور بچہ خاموش ہو جاتا۔ ام سلمہؓ حسن بصری کی ماں کے کام و کاج کے دوران بچہ کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔ یہ بچہ اُم المومنین کی تربیت میں پروان چڑھتا رہا۔ جب حسن بصریؒ کچھ بڑے ہوئے اور ہوش سنبھالا تو ایک دن کھیلتے میں پیاس لگی۔ اُم سلمہؓ کے گھر آ کر حضور صلعم کی صراحی سے پانی پی لیا۔ جب حضور صلعم گھر میں تشریف لائے اور پانی پینے کے لئے صراحی کو دیکھا تو خالی تھی آپؐ نے اُم سلمہؓ سے دریافت فرمایا اس صراحی کا پانی کس نے پیا؟ ام سلمہؓ نے کہا حسن نے پی لیا ہے۔ یہ سنکر آپؐ نے فرمایا یہ بچہ بڑا ہو کر اعلیٰ مرتبہ کو پہونچے گا۔ جس قدر پانی پیا ہے اسی قدر علم سرایت کرے گا اور بچہ کو گود میں لے کر اس کے حق میں دعا کی کہ "الٰہی العالمین اس کو مقتدائے خلق بنا دے" یہ رحمت العالمین کی دعا کا ہی فیض تھا جس نے حضرت حسن بصریؒ کو اولیاؤں کی صف میں متصف کیا حضرت حسن بصری کا مولد بصرہ تھا اس لئے آپؒ بصری کہلائے۔ روایت ہے کہ آپؒ نے ایکسو بیس صحابہ کا زمانہ پایا۔ حسن بن علیؓ سے آپ کو خاص ارادت تھی۔ اور خرقہ حضرت علیؓ سے حاصل کیا تھا۔ آپ بڑے پائے کے مجتہد تھے۔ حسن بصریؒ کا دنیا سے تنفر کا واقعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ ابتداء میں آپ گوہر فروشی کرتے تھے جس کے باعث عوام میں حضرت لولوی مشہور تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں ایک دفعہ روم تشریف لے گئے۔ وہاں اپنے ایک دوست سے ملاقات کی جو روم کا وزیر تھا۔ کچھ دیر کی بات چیت کے بعد وزیر نے کہا "مجھے ایک جگہ جانا ہے کیا تم بھی ساتھ چلوگے"۔ آپؒ نے فرمایا، کیوں نہ چلیں گے۔ وزیر کے حکم سے آپؒ کے لئے بھی ایک گھوڑا منگوایا گیا۔ اور دونوں جانب صحرا روانہ ہوگئے۔

صحرا میں پہنچکر حضرت حسنؒ نے دیکھا کہ اس صحرا میں ایک بڑا خیمہ دیبا و حریر کا ایستادہ ہے۔ اور مسلح سپاہی پہرا دے رہے ہیں۔ جب دونوں خیمہ کے قریب پہونچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مسلح سپاہیوں کا ایک گروہ خیمہ کے اطراف گھوم کر کچھ کہتا تھا اور چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد چند بوڑھوں کو دیکھا وہ بھی خیمہ کے گرد گھوم کر کچھ کہتے ہوئے چلے گئے۔ اسی طرح فلسفی اور اطبار کے گروہ بھی خیمہ کے گرد گھوم کر کچھ کہتے ہوئے چلے گئے۔ آخر میں بادشاہ اور وزیر بھی اسی خیمہ کے گرد گھوم کر چلے گئے۔ یہ دیکھ کر حسن بصریؒ کو تعجب ہوا کہ یہ سب کیوں اس طرح گھوم کر اور کیا کہکر لوٹ جاتے ہیں۔ جب وزیر اپنے کام سے فارغ ہو کر آیا تو حسنؒ نے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے یہ لوگ کیوں خیمہ کے گرد اس طرح گھومتے اور کیا کہتے ہوئے جاتے ہیں۔ وزیر نے کہا، اس بادشاہ کا اکلوتا بیٹا نہایت حسین و جمیل ستودہ صفات دانشمند خوش خلق بہادر نوجوان تھا اچانک بیمار ہوا۔ اس کی بیماری نے اس قدر طول کھینچا کہ بڑے بڑے حکیم حاذق تجربہ کار طبیب اس کے علاج معالجہ میں تن دہی سے مصروف تھے۔ مگر جیسے جیسے علاج ہوتا رہا بیماری بڑھتی گئی۔ آخرکار اسی بیماری سے شہزادہ فوت ہوگیا۔ اس کو اسی جگہ دفن کر دیا گیا۔ اب ہر سال یہ سب لوگ اس کی زیارت کو اس جگہ آتے ہیں۔ سپاہیوں کے گروہ اس کے مدفن کے گرد گھوم کر یہ کہتے ہوئے جاتے ہیں کہ "اے شہزادے جو موت تجھکو واقع ہوئی اگر جنگ کی وجہ سے ہوتی تو ہم سب اپنی جانیں دے کر تجھکو بچا لیتے مگر جو موت خدا کے حکم سے آئی۔ ہم اس سے لڑ نہیں سکتے" بوڑھے یہ کہتے ہوئے گزرے کہ اے شہزادہ اگر ہمارے اختیار میں ہوتا تو ہم اپنی عمریں تجھکو دیکر تجھے موت سے بچا لیتے مگر خدا کی مرضی کے آگے ہم سب بے بس ہیں۔ فلسفی اور اطبار یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ اے شہزادہ اگر ہماری عقل و دانش مشیت کے حکم کو ٹال سکتی تو ہم تیرے لئے اپنے علم و حکمت کو خرچ کرتے

سکتے اگر تجھکو موت کے منہ سے چھین لیتے۔ مگر قدرت کے آگے ہم مجبور ہیں۔ اطبا یہ کہتے ہوئے چلے گئے اے شہزادے اگر ہماری کوششیں کامیاب ہوتیں اور دوائیں اثر کرتیں تو ہم تجھ کو بچا لیتے مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ ہم حکم خداوندی کے آگے لاچار ہیں۔

سب سے آخر میں بادشاہ آکر یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ "اے جان پدر تیری موت پر مجھے اختیار ہوتا تو میں اپنی ساری سلطنت اپنا تخت و تاج تجھ پر نثار کرکے۔ تجھکو بچا لیتا۔ مگر یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ خدا کی مرضی کے بغیر کوئی طاقت موت سے نہیں بچا سکتی"۔ الغرض سب اپنی اپنی مجبوریاں اور بے بسی ظاہر کرکے چلے گئے۔ پس کر حسن بصریؒ کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ وہ خدا کے خوف سے کانپ اٹھے۔ اور دل میں کہنے لگے کہ جب انسان اس قدر لاچار اور بے بس ہے تو پھر وہ کیوں دنیا پر مٹتا ہے یہ سوچ کر بے ثباتی عالم کا ایسا نقش دل پر بیٹھا کہ انھیں دنیا سے نفرت ہوگئی اور کاروبار سے دل اچاٹ ہوگیا۔ وہ بصرہ لوٹ آئے دل میں عہد کرلیا اور قسم کھائی کہ وہ پھر کبھی اس فانی دنیا سے واسطہ نہ رکھینگے۔ دنیا والوں سے منہ موڑ کر ترک تعلقات کرکے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اور عبادت و ریاضت میں منہمک ہوگئے۔ رات دن کی عبادت و سخت ریاضت اور مجاہدہ نے انھیں ایسی روشن ضمیری عطا کی کہ آپ پر اسرار الٰہی کے راز منکشف ہونے لگے۔ یہاں تک کہ آپؒ پر کشف کے دروازے کھل گئے۔ قرب الٰہی میں ڈوب کر ماسوا کو بھول گئے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔ جب حسن بصریؒ اس منزل پر پہنچے تو اپنے آپ میں الوہیت کا ظہور پانے لگے۔ اس قدر نفس کشی کے باوجود آپ کو ہر وقت گناہوں کا خدشہ گھیرے رہتا کہ نہ معلوم مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوگیا ہو اسی خوف سے آپؒ الحاح وزاری کرتے اور پہروں رویا کرتے تھے۔

آپ کی اس حالت پر لوگ .... آپ پر اعتراض کرتے اور آپ میں عیب نکالتے ہیں تو حسن بصریؒ فرماتے "میں لوگوں سے سلامتی کی طمع نہیں رکھتا۔ کیونکہ ان کے پیدا کرنے والا بھی ان کی زبانوں سے سلامت نہیں ہے"۔ روحانی طاقت کی وجہ سے الٰہ کا الہام ہونے لگا۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کا خاص الخاص لوگوں پر ورود ہوا کرتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ کے منقبت میں بہت سی روایات منقول ہیں جنمیں سے چند ایک کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے آپ کو خط لکھا کہ "مجھے کچھ نصیحت فرمائیے جس کو میں اپنا ایمان بناؤں" حضرت حسن بصریؒ نے جواب میں لکھا "اگر خدا تیرے ساتھ ہے پھر کس سے ڈرتا ہے اور اگر خدا تیرے ساتھ نہیں ہے تو پھر کس سے امید رکھتا ہے"۔ حضرت مالک بن دینار بھی بڑے پہنچے ہوئے اور بلند پایہ اولیاؤں میں سے تھے اس لئے وہ بھی اکثر حسن بصریؒ سے استفادہ حاصل کیا کرتے تھے ایک دفعہ حضرت حسنؒ سے پوچھا کہ "عالم کا عذاب کیا ہوتا ہے"۔ آپ نے فرمایا دل کا مرجانا"۔ پوچھا دل کا مرجانا کیا ہوتا ہے۔ فرمایا دنیا کی محبت میں مبتلا ہوجانا"۔ ایک دن حضرت حسنؒ کسی کے نماز جنازہ پر گئے۔ بعد تدفین اس کے سرہانے بیٹھ کر اس قدر روئے کہ لوگ حیران رہ گئے اور رونے کا سبب پوچھا آپؒ نے فرمایا۔ "قبر آخرت کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ ڈرتا ہوں کہ آخرت کی دوسری منزلیں کیسے طے کروں گا" ایک مرتبہ آپ نے سنا کہ آدمی نے آپ کی غیبت کی ہے آپ نے اس شخص کے پاس ایک کشتی کھجوروں کی بھیجدی۔ اور کہلا بھیجا کہ "مجھے معلوم ہوا کہ تونے اپنی نیکیاں میرے دفتر اعمال میں منتقل کردی ہیں۔ میں نے چاہا کہ اس کا عوض ادا کروں معاف کرنا مجھ میں پورے معاوضہ کی طاقت نہیں"۔ ایک اعرابی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صبر کے متعلق دریافت کیا۔ آپؒ نے فرمایا "صبر دو قسم کے ہیں ایک تو مصیبت اور بلا میں صبر کرنا۔ دوسرا ان چیزوں سے بچنا جس سے حق تعالےٰ نے منع فرمایا ہے" ظاہر ہے خدائے تعالےٰ کے حکم اور اس کی خوشنودی کے لئے نفس کو مارنا کتنا صبر آزما کام ہے۔ ناگہانی حادثات اور موت پر صبر کے سوائے چارہ نہیں۔ مجبوراً صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر نفس کو مارنا اور دل پر جبر کرکے اپنی خواہشات کو روکنا بڑا کٹھن صبر ہے۔ نقل ہے کہ چند لوگوں نے آپؒ سے استفسار کیا کہ کیا سبب ہے کہ بعض لوگوں پر نصیحت کا اثر نہیں ہوتا۔ حسن بصریؒ نے فرمایا ان کے دل مردہ ہیں۔ سویا ہوا اٹھانے سے اٹھ جاتا ہے۔ مگر مردہ بیدار نہیں ہوتا۔ مردہ دل بھلا نصیحت سے کیسے اثر لے سکتا ہے۔ روایت ہے کہ حسن بصریؒ اپنے

آپ کو ہمیشہ دوسروں سے کم تر تصور کرتے تھے کبھی اپنے کو سب سے بہتر تصور نہ کیا۔ ایک دن دریائے دجلہ پر سے گزرے تو ایک سیاح کو دیکھا کہ ایک عورت کے ساتھ بیٹھا صراحی سے کچھ پی رہا ہے۔ آپ کے دل میں اس کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہوئی۔ اور دل میں کہا کہ یہ کیسا شخص ہے کہ عورت کے ساتھ تنہا بیٹھا ہوا پی رہا ہے آپ کے قلب پر انانیت غالب ہوئی۔ ابھی وہ اس کے متعلق سوچ ہی رہے تھے کہ دریا میں ایک کشتی نمودار ہوئی جس میں سات آدمی بیٹھے ہوئے ہوئے تھے۔ اچانک وہ کشتی پانی میں چکر کھانے لگی۔ چکر کھانے کے بعد دریا میں غرق ہو گئی جو لوگ اس میں سوار تھے وہ پانی میں ڈوب گئے۔ سیاح فوراً پانی میں کودا اور چھ آدمیوں کو پانی سے باہر نکال لایا۔ پھر حسن کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ میں نے چھ لوگوں کو ڈوبنے سے بچایا اگر تو مجھ سے بہتر اور پارسا ہے تو ایک کو بچا لا۔ گفتگو کا سلسلہ قائم رکھتے ہوئے سیاح نے کہا۔ اے امام المسلمین یہ میری ماں ہے اور صراحی میں پانی ہے جو میں پیتا تھا۔ میں نے چاہا کہ تیری آزمائش کروں تاکہ تیری بینائی معلوم ہو" حسن بصریؒ یہ سن کر سخت شرمندہ ہوئے اور اس سے معذرت چاہتے ہوئے کہا اے مرد خدا تو نے ان لوگوں کو دریا سے نجات دی مجھے بھی قعر غرور و تکبر سے نجات دے" سیاح نے کہا تمہاری آنکھیں روشن ہوں" اس واقعے کے بعد آپ کی کسر نفسی نے کسی کو کمتر اور اپنے آپ کو بہتر نہ جانا۔ ایک اعرابی نے آپؒ سے کہا اے حسنؒ میں نے آپ سے بڑھکر زاہد اور آپ سے بڑھ کر صابر کسی کو نہیں دیکھا" آپؒ نے فرمایا اے اعرابی میرا زہد خواہش اور رغبت کی وجہ سے ہے۔ اور صبر رجا کی وجہ سے ہے" اعرابی نے کہا یہ بات میری سمجھ سے باہر ہے اس کی وضاحت فرمائیے" آپؒ نے فرمایا" آپؒ نے فرمایا طاعت اور بلا میں صبر کرنا آتش دوزخ کے خوف سے ہے۔ اور دنیا میں زہد کی جانب راغب ہونا آخرت کی طرف راغب ہوتا ہے۔ مبارک اس شخص کو جو ایسی ہے جو اپنی غرض اور خوف کی وجہ سے نہ ہو بلکہ اس کا صبر محض حق تعالیٰ کے لئے ہو نہ کہ اپنے کو دوزخ سے بچانے کی غرض سے اور اس کا زہد بھی صرف حق تعالیٰ ہی کے لئے ہو نہ کہ اپنے لئے بہشت حاصل کرنے کی غرض سے۔ ایک بزرگ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں: ایک دن میں فجر کی نماز باجماعت پڑھنے کے لئے حضرت حسنؒ بصری کی مسجد کو گیا۔ دیکھا

تو مسجد کا دروازہ بند تھا۔ اندر سے حضرت حسنؒ کی آواز آرہی تھی وہ دعا کر رہے تھے اور بہت سے لوگ آمین کہہ رہے تھے۔ میں نے خیال کیا شاید آپ کے دوست ہوں لہذا دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر کچھ دیر تک دروازہ نہ کھلا اور نماز کا وقت چلا جا رہا تھا تو میں نے دروازہ پر دستک دی دروازہ کھل گیا میں اندر گیا تو حضرت حسنؒ کو تنہا پاکر حیران ہوا اور آپؒ سے استفسار کیا کہ یہ کیا بات ہے۔ آپ دعا کر رہے تھے تو بہت سے لوگ آمین کہہ رہے تھے اب آپ کو تنہا پاتا ہوں" حسنؒ نے فرمایا ایک مخلوق مجھ سے علم حاصل کرنے کے لئے آتی ہے جب میں دعا کرتا ہوں تو وہ آمین کہتی ہے ایک اور بزرگ کہتے ہیں کہ میں حسنؒ بصری کے ساتھ حج کو گیا راستہ میں مجھے پیاس لگی میں پانی پینے کے لئے ایک کنویں پر گیا۔ مگر وہاں نہ کوئی رسی تھی نہ ڈول میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کروں کہ حسن بصریؒ نے میری حیرانی کو دیکھکر فرمایا" جب تک میں نماز پڑھ لوں تم کنویں پر جاکر پانی پی لینا" یہ کہکر وہ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے اور میں حسب ارشاد جب کنویں پر پہونچا تو پانی کنویں کے کنارے پر آیا ہوا تھا میں نے سیر ہو کر پانی پیا اور ایک دوست جب اپنی صراحی بھرنے لگا تو پانی کنویں کے نیچے چلا گیا۔ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر فرمایا تم نے خدا پر بھروسہ نہ کیا اور تمہارا خدا پر یقین محکم نہ تھا اس لئے پانی کنویں کے نیچے چلا گیا۔ آپؒ کے ایسی اور بھی کرامات ہیں جو دوسرے اولیاء کرام کے بیان میں آئیں گے۔

افسانہ

طلوعِ سحر

رعنا کہکشاں

عصر کی نماز سے فارغ ہو کر اس نے دھیرے دھیرے سنہری دوپٹہ اور جا نماز اٹھا کر جوں ہی پلٹی سامنے وقاص کھڑا تھا۔

"ہاں بھئی یہ اتنے انہماک سے کیا مانگا جا رہا تھا اللہ میاں سے؟"

"کچھ بھی مانگوں آپ کون ہوتے ہیں دخل در معقولات کرنے والے؟" سحر اکھڑے لہجے میں بولی۔

"ارے بھئی نہ بتاؤ لیکن جانتا ہوں کہ کیا مانگ رہی تھیں یہی نا کہ ..... پیارے اللہ میاں ہمارے گھر میں سب کو ملانیاں بنا دیجئے۔ سب کو فرسودہ خیالات سے نوازیئے تاکہ ہم سب دقیانوسی کہلائیں" وہ دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں پھیلا کر بولا۔

"آپ ہوش میں تو ہیں"؟ اسے غصہ آچکا تھا۔

"جی ہاں! بالکل حواسوں میں ہوں" وقاص بھی کم ڈھیٹ نہ تھا۔ تب سحر بھناتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اس گھر کے مختلف مکینوں میں ایک مکین کی شخصیت ایسی بھی تھی جس کا مزاج دوسرے سے مختلف تھا اور وہ تھیں سحر جو سراپا سادگی پسند تھی جسے فیشن سے نفرت تھی۔ سیدھا سادہ لباس پہننا اور پانچوں وقت نماز سحر کی عادت بن چکی تھی اس کے برخلاف گھر کے دوسرے افراد اکثر ماڈرن قسم کے تھے جو جدید تہذیب کے تقاضوں کو نبھانے میں اپنی روایات تک فراموش کر بیٹھے تھے۔ سحر دو بہن بھائی تھے جو ممی ڈیڈی کے نقش قدم پر آنکھیں موندے چلے جا رہے تھے۔ بھائی طارق جو اب ٹائی بن چکا تھا بیبیوں کا قیمہ بنانے والی کمپنی مختلف بیہودہ تقریبات میں مشغول رہتا۔ سحر جو حقیقت پسند تھی انکی ان حرکات کو سخت نفرت سے دیکھتی اور آخر ایک دن استفسار کر ہی بیٹھیں، اس کے جواب میں وہ کہنے لگا کہ ارے پگلی، لڑکیاں تو خوشبو کی مانند ہوتی ہیں اور جب خوشبو اپنے چاروں طرف بکھری ہو تو اس سے لطف اندوز نہ ہونا کفرانِ نعمت ہے۔

جواب سن کر سحر کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ طارق کو اس کا احساس تک نہ ہوا کہ وہ اپنی بہن کے سامنے کیا بکواس کر گیا ہے۔

تزئین سحر سے چھوٹی تھی اور بالکل اسم بامسمیٰ آرائش و زیبائش کی دلدادہ ماڈرن تہذیب میں سرتاپا رنگی تزئین سے سحر کی نہ بنتی اور وہ جل کر بوڑھی روح" جیسے القابات سے نوازتی۔

گھر کی اس متضاد فضا نے ماحول کو ایک ایسی بے نام سی بے چینی دے دی تھی جس میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جو سحر کے مزاج سے مطابقت رکھتی ہو۔ اگرچہ وہ ایک امیر گھرانے کی فرد تھی جسے سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل تھا لیکن وہ سوچتی یہ کیسی ترقی ہے جو تنزلی کے راستے پر لے جا رہی ہے۔

سحر یہ تمام باتیں سوچتی اور کڑھتی رہتی یہ تمام باتیں سمجھنے کی صلاحیت دراصل اسے دادی جان نے دی تھی جو بڑی پیاری بڑی شفیق ہستی تھیں۔ جن کے سایہ میں آکر سحر کو سکون مل جاتا تھا۔ لیکن یہی دادی جان بقول ممی راہ کا ایک ایسا کانٹا تھیں جو سحر کی عادتیں بگاڑ رہی تھیں۔

ابھی چند سال پہلے ہی کی تو بات ہے کہ دادی جان کی دعائیں سیدھی فرش سے عرش تک جا پہنچیں اور ڈیڈی ترقی کر کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیئے گئے اعلیٰ فرنیچر اور خوبصورت بنگلہ سب کچھ دفتر کی جانب سے ملا تو رہنے سہنے کے ڈھنگ ہی بدل گئے۔ حالات بدل گئے۔ قدریں بدل گئیں اور پرتصنع زندگی کا آغاز ہو گیا۔ سب ہی بدل گئے۔ پر سحر جانے کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اس پر ان بدلتے حالات کے تیز دھارے کا کوئی بھی وار نہ پڑا۔ اس کی وجہ شاید دادی جان کی مضبوط اور شفقت بھری شخصیت ہو جس نے سحر پر بڑے پائیدار نقوش چھوڑے تھے۔ ممی کو تو جانے دادی جان سے کیا چڑ ہو گئی کہ انھیں

گوارا نہ ہوا کہ ماڈرن قسم کے اس خوبصورت بنگلے میں جدید ثقافت
کی اس تیز بھاگ دوڑ میں یہ دقیانوسی بڑھیا ان کی ساس کہلائے
پردادی اماں جن کی دعاؤں سے آج شکیل احمد ترقی کے اس بلند
زینے پر پہنچے تھے۔ اپنی حساس طبیعت اور ذہانت سے بہو کے بدلتے
تیور بھانپ گئیں اور ایک دن ایسی سوئیں کہ سحر کی التجائیں اور
آنسو کوئی بھی تو انہیں واپس نہ لا سکا۔ اس دن سحر اس سایہ دار
سائبان کے چھن جانے پر بہت روئی۔

وقاص ڈیڈی کے دوست کا بیٹا تھا۔ انہیں کی طرح آزاد
خیال۔ پھر جانے اسے سحر کی کونسی ادا بھا گئی کہ من ہی من میں کچھ
فیصلہ کر بیٹھا۔ اگرچہ وہ اس کے رہن سہن پر ہمیشہ تنقید کیا کرتا تھا اور
اسے ملانی قسم کی لڑکی کو چھیڑنے میں بڑا مزا آتا تھا لیکن وہ یہ بھی
چاہتا تھا کہ سحر ذرا جدید لڑکی بنے۔

"کیا ہو رہا ہے سحر!" وہ اندر آتے ہوئے بولا
"قمیض سی رہی ہوں" وہ مشین چلاتے ہوئے بولی
"کام! کام! اوہ کبھی تم لڑکی ہو یا مشین، ارے سلیقہ بیگم
خدا ہر کی ہوا بھی ڈکھا یا کرو۔ آؤ ذرا آؤٹنگ پر چلیں۔"
"جی نہیں مجھے فرصت نہیں" وہ آہستگی سے بولی "دیکھا نہیں
رہے قمیض سی رہی ہوں؟"
"بھئی یہ اتنی ضروری تو نہیں؟" وہ بھی جرح پر اتر آیا۔
"ضروری نہ بھی ہو تو میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔"
"کیوں؟" وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔
"یوں! کہ مجھے پسند نہیں۔"
"او! مائی گاڈ کس سے میں نے کہہ دیا ایک تزئین ہے جب کہو
چلنے پر تیار! ہاں! سمارٹ سی تزئین اور ایک تم ہو! بوڑھی روح۔"
وہ جل کر بولا تو سحر کو بھی غصہ آ گیا۔ "دیکھئے مسٹر مجھے آپ کے
ساتھ جا کر اسکینڈل بنوانے کا کوئی شوق نہیں اور آئندہ میرے
کمرے میں بغیر پوچھے نہ آئیے گا۔" وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

دادی اماں کے انتقال کے بعد ممی کا خیال تھا کہ اب سحر بدل
جائے گی لیکن بعض اوقات انسان کتنا بور ہو جاتا ہے جو سوچتا ہے
وہ ممکن نہیں ہو پاتا۔ یہاں تو دادی جان ایمان، خلوص کو جو دیا روشن
کر گئی تھیں آج بھی بدستور روشن کرنیں بکھیر رہا تھا۔ جن کی چمک
سے سحر کا من روشن تھا۔

گھر کی بوریت سے بچنے کے لئے سحر نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا
تھا۔ اب سحر تھی اور کتابوں کی دنیا۔ مطالعہ جو کہ غم اور اداسی کا بہترین علاج
ہی نہیں بلکہ انسان کی سوچ کو بھی وسعت دیتا ہے۔ سحر کے لئے مطالعہ
بہترین دوست قرار پایا۔ ممی کا خیال تھا کہ یونیورسٹی کا ماحول اسے ٹھیک
کر دے گا۔ وقت اپنی اسی بے ڈھنگی رفتار پر چل رہا تھا لیکن گھر کے
ہنگامے بھلا کب ختم ہوئے تھے وہ بدستور تھے۔

وقت اپنی تیز رفتاری سے گزرتا چلا گیا اور سحر ایم۔ اے کر کے
فارغ ہو چکی تھی۔ وہ گرمیوں کی ایک خوبصورت شام تھی۔ خوبصورت
پھولوں کا ایک حصہ لگ رہی تھی وقت گزاری کے لئے سحر نے ایک ناول
پڑھنا شروع کر دیا۔ تب ہی وقاص چلا آیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے
کے بعد بولا۔

"سحر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم خود کو تھوڑا سا بدل لو"
"نہیں جناب بالکل نہیں، ہم دونوں کے خیالات میں ذرا بھی
تو ہم آہنگی نہیں پھر دو مختلف راستوں پر چلنے والی یہ گاڑی کیونکر
منزل مقصود پر پہنچے گی۔"
"دیکھیں صاحب مجھے کسی منزل کا پتہ نہیں اور اگر بدلنے ہی کی
بات ہے تو آپ خود کو کیوں نہیں بدل لیتے؟"
"نہیں جناب ایسا ممکن نہیں۔ آپ کو خود کو بدلنا پڑے گا۔"
"سحر پلیز تم زیادہ نہیں تو تھوڑا سا ہی خود کو بدل لو"
"یہ بھی بھلا کوئی فالت ہے سارا دن گھر میں گھسے اپنی رعنائی گنوا رہی
ہیں۔"

"بہت خوب! بس یا ابھی کچھ اور باقی ہے" سحر نے تحمل سے
پوچھا اور رسالے میں محو ہو گئی۔ وقاص اس کی سرد لہری پر جھلا
گیا لیکن آج وہ بھی فیصلہ چاہتا تھا اور تب ہی سحر نے اپنا بھی فیصلہ سنایا۔
"دیکھیں وقاص میں اپنی موجودہ طرز زندگی پر مطمئن ہوں۔"
"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"
"جی ہاں!"
"ٹھیک ہے مجھے بھی زندہ دل لڑکیاں پسند ہیں تم جیسی بور

[illegible] اور وہ چلا گیا۔
اس دن "زیب دلا" میں رنگ و بو کی کہکشاں اتر آئی تھی۔ کیونکہ آج تزئین اور وقاص کی شادی تھی سحر تمام دن کام میں لگی رہی۔ پتہ جانے کیوں دل میں پھانس سی چبھ گئی جیسے کچھ چھن گیا ہو۔ تو اچانک جانے کیوں اپنی عزیز شے کے بچھڑنے کا غم ہو رہا تھا لیکن چہرے پر ضبط کے گہرے پہرے بٹھا لئے تھے کہ بعض جذبے [illegible] کے بعد اہمیت کھو دیتے ہیں کہ وقت گذر چکا ہوتا ہے۔

تزئین وقاص کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

سحر نے خود کو مختلف کاموں میں مصروف کر لیا۔ پر یہ من بے کل سا رہنے لگا۔ اس دوران اس نے لیبیا یونیورسٹی میں لیکچرر کے لئے درخواست دے دی پھر سحر لیبیا سدھاری۔ زندگی میں بڑا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ اس نے خود کو علم کی دنیا میں ڈبو دیا تھا۔ تب ہی ایک جانی سی تحریر ملی، یہ وقاص کا خط تھا۔

عظیم سحر! ہمیشہ سورج کی کرنوں کی طرح منور رہو سحر ہمیشہ خوشیوں کی علمبردار ہوتی ہے اور ظلمتوں میں گھرنے کے بعد روشن سحر کا انتظار ہوتا ہے۔ آج میں ایسی ہی روشن سحر کا منتظر ہوں۔ سحر حیران نہ ہو! وقت اور حالات یہاں تمہارے جانے کے بعد بڑا انقلاب لائے ہیں ایسا انقلاب جو تم چاہتی تھیں جانتی ہو۔ اب تمہارے وقاص کے ایک نئے روپ نے جنم لیا ہے۔

جانتی ہو سحر یہ سب کیونکر ہوا۔ یہ ایک لمبی تفصیل ہے مختصراً سنو کہ تمہارے جانے بعد تزئین کی بے حد آزادانہ روش کو دیکھتے ہوئے میں نے روکنا چاہا کیونکہ میں نے جان لیا تھا کہ عورت کا حقیقی مقام گھر ہے اور اگر وہ اس مقام سے ہٹ جائے تو کیا بن جاتی ہے میں نے تزئین کو روکنا چاہا تو وہ بپھر گئی کیونکہ اس کے خیال میں مجھ پر تمہارا اثر ہو گیا تھا۔ بات بڑھی تو اس نے مجھ سے طلاق لے کر ادلیس سے شادی کر لی۔ اونچی سوسائٹی میں یہ معمولی بات ہے پر میں ٹوٹ پھوٹ گیا ہوں۔ سحر اب میں نے جان لیا ہے کہ حقیقی سکون کیا ہے؟ امید ہے مجھے معاف کر کے واپس آ جاؤ گی

(تمہارا وقاص)

خط پڑھ کر اسے عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے۔ ایسا شخص بھی بدل سکتا ہے۔ خوشی کے احساس اور شکر گزاری پر اس کے آنسو نکل آئے۔

اور اب تین سال بعد وہ وطن آ رہی تھی کسی کو پانے کی خوشی تھی۔ دل کے تمام جذبوں نے عیاں ہو کر چہرے پر شفق سی بکھیر دی تھی۔ تب ہی ہوائی جہاز نے اس کی پیاری دھرتی پر قدم رکھا اور سحر جذبہ تشکر سے سرشار، سربسجود ہو گئی۔ سحر طلوع ہو رہی تھی۔

اقوال زرّیں

- نیکی کی ترغیب دینا بھی نیکی ہے۔ اسی طرح بدی پر کسی کو ابھارنا بدی کا ہے۔
- مظلوم کی بددعا سے بچو۔
- خاطر تواضع کرنے سے مرتبہ بلند ہوتا ہے۔

مرسلہ: ایس۔ ایم مختار (پیلی بھیت)

- والدین کی رضامندی خدا کی خوشنودی کا سبب بنتی ہے اور ناراضگی غضب کا۔
- ماں باپ کی نافرمانی، جھوٹی گواہی اور شرک گناہ عظیم ہیں۔
- بدنصیب ہے وہ جس نے اپنے والدین کو ان کی ضعیفی میں پایا اور ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی۔
- والدین کی نافرمانی کے سوا اللہ پاک جس گناہ کو چاہے گا بخش دیگا
- اپنے والدین کے ملنے والوں سے تعلقات استوار رکھنا سب سے بڑا حسن سلوک ہے۔
- ضعیف اور معذور پر مہربانی، والدین کی خدمت اور ماتحتوں پر احسان کرنا موت کو آسان بناتا ہے۔
- والدین کی شفقت رحمت الٰہی ہوتی ہے اور والدین کا قہر و غضب اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب ہوتا ہے۔

مرسلہ:۔ سیدہ جمیل (حیدرآباد)

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال کے سلسلہ میں ہو۔ مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھی گئی ہو اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح روانہ کی جائے کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہونچ جائے ورنہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوگی۔

ولادت اطفال کی خبریں

• بہن تہذیبہ خانم انصاری صاحبہ (بیلاوستا نیج گنج) کی صاحبزادی عزیزی نجم الصباح سلمہا مسز ظاہر سلمہ (رچ لارڈ۔ امریکہ) کو اللہ پاک نے ۱۱ رجنوری ۱۹۸۲ء کو ایک دختر عطا فرمائی۔ نام بدر النساء الماس قرار پایا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے بلند اقبال اور صاحب نصیب بنائے (نسیم انہونوی)

• درسلا طاہرہ ترنم، تفسیرہ تبسم (آمبور) میری بہن دی احمدی عظمت اور بہنوئی حاجی محمد عظمت اللہ کو اللہ پاک نے ۲۸ رجنوری ۱۹۸۲ء بروز جمعرات بوقت ۵ بجے شب ایک اور فرزند عطا فرمایا۔ بلند اقبال ہو اور عمر دراز پائے۔

• پٹیلا دسے عزیزی نصرت سلطانہ اور عظمت سلطانہ لکھتی ہیں" میری پیاری باجی فرحت سلطانہ اور عزیز بھائی جان سید محمد صادق صاحب کو اللہ پاک نے ۲۶ رجنوری ۱۹۸۲ء بروز منگل ایک بجکر ۱ منٹ پر ایک چاند فرزند عطا فرمایا۔ (فرحت سلطانہ صاحبہ کی والدہ بہن اختر النساء بیگم نے اکیاون روپیہ بھیں اس خوشی میں مٹھائی کھانے کے لئے روانہ فرمائے ہیں۔ اس لئے ہماری دعا ہے کہ نومولود اقبال مند ہو اور عمر طویل پائے۔ (شریک مسرت۔ نسیم انہونوی)

• عصمت جہاں (آنولہ) " ہمارے بھائی عادل اور بھابی انجم کو اللہ تعالیٰ نے پہلی بار ۲۸ ر دسمبر ۱۹۸۱ء بروز پیر بوقت چار بجے شام ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد فیصل قرار پایا" عمر دراز پائے اور صاحب نصیب ہو۔

• سعدیہ رضوی صاحبہ تحریر فرماتی ہیں" میری بھابی شمیمہ نشاط سلمہا اور داماد عزیزی اجمل الحق سلمہ کو اللہ پاک نے پہلی بار ۲۷ ر نومبر ۱۹۸۱ء بروز جمعرات بوقت ۱۰ بجے شب ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام رضوان الحق رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور فخر خاندان بنائے۔

• کہکشاں شگفتہ ترنم (آمبور) "میری چاند خالہ فرحت ظفر و چاند ماموں ظفر اللہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے پہلی بار بتاریخ ۱۴ ر دسمبر ۱۹۸۱ء بروز پیر بوقت ۷ بجے صبح ایک دختر عطا فرمائی۔ نام فارعہ آفرین رکھا گیا۔ اللہ پاک عمر طویل دے اور صاحب نصیب بنائے۔

• حسن آرا (راجہ پور سکرور۔ سرائے میر) "میرے بڑے لڑکے ضیاء الدین اور بہو تسنیم کوثر کو اللہ پاک نے پہلی بار ۲۴ فروری ۱۹۸۲ء کی صبح ۴ بجے ایک دختر عطا فرمائی نام " فروغ تسنیم رکھا گیا۔ دعا ہے کہ عمر طویل پائے۔

نمبر خریداری ۱۰۲۰۷ - خبر میں ۷ بجے شام لکھا ہے تاریخ نہیں لکھی گئی۔ ڈاک ٹکٹ کے بجائے رسیدی ٹکٹ، ۴۰ پیسے کے لئے۔ خبر اور ٹکٹ پھر سے روانہ کریں۔ تاریخ ہوتی تو میں بلا ٹکٹ بھی چھاپ دیتا۔

• راحیلہ اسد (آمبور) نمبر خریداری لکھئے۔ خبر صاف لکھئے نام پڑھا نہیں جاتا۔

• مہ ناز فریدی (مراد آباد) "میری بھابی شبانہ ارشد اور بھائی ارشد فریدی کو اللہ پاک نے ۱۲ ر مارچ ۱۹۸۲ء بروز جمعہ بوقت ۲ بجکر چالیس منٹ (شب) پر دوسری بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام فیضان فریدی اور پیار کا نام جنٹی قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے۔

• فیروزہ سلطان مرجکر (اندھیری۔ بمبئی) "میری چھوٹی بہن رفعت اور بہنوئی عبدالوہاب سکندر کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۸ ر دسمبر ۱۹۸۱ء بروز جمعہ بوقت ۱۱ بجے دن ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام فوزان قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل دے۔

پیغامات نشاط

• چودھری اختر حسین صاحب (رئیس انہونہ) کی صاحبزادی جبیں فاطمہ سلمہا کا عقد نکاح عزیزی شاہ نفیس احمد (پسر منظور حسن صاحب رئیس مظفر گڑھا) کے ہمراہ ۲۲ ر مارچ ۱۹۸۲ء کو بمقام انہونہ بحسن و خوبی انجام پایا اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• سید محمد اسرار الحق (گورکھپور) کے فرزندان عزیزی سید محمد عزیز الحق (منجم) اور سید محمد [illegible] الحق کی شادیاں بالترتیب

درخشاں (نشو) سلمہا بنت حاجی کمال الدین صدیقی اور حمیرہ سلمہا دختر حکیم ابوالکلام صدیقی کے ساتھ بحسن و خوبی انجام پائیں۔ اس سلسلہ میں اسرار الحق صاحب نے ۵ ارمارچ ۸۲ء کو ایک شاندار دعوت طعام دی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

- ڈاکٹر زین العابدین (اسسٹنٹ ڈائریکٹر - اعظم گڑھ) ہمارے چھوٹے صاحبزادے محمد ثاقب کا نکاح صبا خانم (بنت زین الدین صاحب موضع کھنڈیواری اعظم گڑھ) بتاریخ ۱۴ فروری ۸۲ء بحسن و خوبی انجام پائی۔

- اشرف النسا (ترنافل - مدراس) میرے چچازاد بھائی اشارت علی عثمانی (فرزند جناب نواب جان صاحب) کی شادی خانہ آبادی ہمراہ نسرین سلطانہ سلمہا (دختر جناب عبدالغنی قریشی صاحب) ۱۸ فروری ۸۲ء کو بمقام مدراس بحسن و خوبی انجام پائی۔

- شاہدہ پروین (چکولیا) میری چھوٹی بہن شبانہ عندلیب (دختر جناب یحییٰ مسعود الرحمٰن) کی شادی ہمراہ پرویز احمد سلمہ (فرزند شرافت حسین صاحب مرحوم - مونگیر) ۴-۵-۶ فروری ۸۲ء بحسن و خوبی انجام پائی۔

- بی عظمت فاروق (آمبور) میری خالہ زاد بہن حلیمہ ناز (دختر بیگ اختر جناب وی - عبدالرشید - پرنامبٹ) کی شادی زبیر احمد بی کام (فرزند - ایم عبداللہ صاحب - آمبور) کے ہمراہ ۱۴ فروری ۱۹۸۲ء بمقام پرنامبٹ بحسن و خوبی انجام پائی۔

- محمد نعیم خاں (فرزند محمد شریف خاں مرحوم - مظفر نگر) کی شادی ہمراہ شاہین انجم (دختر جناب ضمیر احمد خاں صاحب موضع شالہ ضلع میرٹھ) بخیر و خوبی انجام پائی۔ اس سلسلہ میں بیگم صاحب محمد شریف صاحب مرحوم نے ایک دعوت ولیمہ دی۔

- یہ سلسلہ شادی امتیاز احمد صاحب کے فرزند غیاث احمد قدوائی سلمہ ہمراہ تنظیم قدوائی سلمہا (بنت واجد حسین صاحب قدوائی - کرم اللہ پور - بارہ بنکی) ۲۲ فروری کو بمقام ممبئی - سفینہ آباد دعوت ولیمہ دی گئی۔ (نسیم انہونوی)

- عبدالرزاق (الیسین) میرے بڑے بیٹے عبدالخالق کی شادی جناب ابوبکر بھائی ممبئی والے کی دختر ہاجرہ سلمہا کے ساتھ ۲۸ فروری ۸۲ء کو کچھی میمن جماعت خانہ ممبئی میں بخیر و خوبی انجام پائی۔

انتقال پُرملال کی خبریں

شہر بانو رضویہ سلمہا (براڈفورڈ - انگلینڈ) کی کیپسٹن والدہ محترمہ عباسی بیگم صاحبہ (حیدر آباد) کا ۱۵ دسمبر ۸۱ء کو صبح ۴ بجے انتقال ہوگیا۔ یہ خبر اس وقت وصول ہوئی تھی جب میں سفر بھوپال و بمبئی میں دفتر سے غیر حاضر تھا۔ تحریر اب نظر سے گذری۔ بیحد افسوس ہوا۔ مرحومہ مجھے اپنا سگا بھائی تصور فرماتی تھیں۔ بڑے ہی پرخلوص خطوط سے نوازتی رہتی تھیں۔ اللہ پاک ان کی روح کو سکون بخشے۔ مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

(نسیم انہونوی)

- درسلا طاہرہ ترنم (آمبور) میری پھوپھی زاد بہن رحمت النسا عرف جانی بی ۵ جنوری ۸۲ء کو بمقام پرنامبٹ اس دار فانی سے رحلت فرماگئیں۔ اللہ مغفرت کرے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

- حریم کی آخری کاپی پریس جارہی تھی کہ عزیزی ایم۔ اے۔ کے سرکھوت سلمہ (بونی۔ ٹرانسوال۔ افریقہ) کے خط سے یہ المناک خبر ملی کہ مرحومہ بہن میمونہ بی سرکھوت کے شوہر محترم جناب غلام محی الدین سرکھوت صاحب (کبھی) ۲ مارچ ۸۲ء کو دو بجکر ۴۵ منٹ پر شب میں رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم عرصے سے قلبی عارضہ میں مبتلا تھے۔ گذشتہ چند ماہ قبل حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تھے اور فریضہ کی ادائی کے بعد بخیریت اپنے مستقر پر واپس آگئے تھے، لیکن صحت ٹھیک نہ تھی۔ اور آخرکار یہ بخیر ترین شخصیت اللہ کو پیاری ہوگئی۔ بہن میمونہ بی سرکھوت حریم کی برابر مالی امداد فرماتی رہتی تھیں۔ مرحوم غلام محی الدین سرکھوت صاحب نے بھی یہ روایت برقرار رکھی۔ ان کی حریم و نسیم نوازی ایسی تھی کہ میں اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اللہ پاک مرحوم کو بخشے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ساتھ ہی میری دعا ہے کہ خداوند کریم مرحومین کے پسماندگان کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے۔ شریک غم نسیم انہونوی

- ہر تحریر پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔
- جواب درکار ہو تو جوابی کارڈ یا لفافہ روانہ فرمائیں۔

پھنسا رہتا ہوں "۔

کوئی بات ضرور ہے " ممی بولیں " ایسے خاموش تو تم کبھی نہیں رہتے تھے ۔ اب تو جیسے ہونٹوں پر گوند لگا لیا ہے ۔ کسی کی کوئی بات تمہیں بری لگی ہے بیٹے ؟ "

نہیں بڑی امی ۔ کوئی بات نہیں ۔ میں تو بہت خوش ہوں " وہ ہنسنے لگا
تو پھر پہلے کی طرح ہنستے بولتے کیوں نہیں ؟ " ممی نے کہا ۔
کس سے باتیں کروں ۔ کس سے ہنسوں بولوں ۔ بڑی امی " اس نے گلا صاف کر کے کہا " پہلے باجی تھیں ۔۔۔ اب کون ہے ؟ "
ارے تو کیا تمہارا کوئی دوست وست بھی نہیں ہے ؟ " چچی جان بولیں ۔ " ہے امی " سنجر نے جواب دیا " اس سے جو کچھ کہنا سننا ہوتا ہے باہر ہی کہہ سن لیتا ہوں ۔ "
میں مان نہیں سکتی تمہیں کوئی دکھ ہے ۔ ضرور ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ تم مجھ سے نہ کہو " ممی نے کہا ۔
ایسی کوئی بات نہیں ہے ۔ بڑی امی " وہ بولا اور اٹھ کر چلا گیا !
شاید اسے یہ غم ہے کہ کچھ برسوں کے لیے ہم سب سے دور چلا جائے گا ! "
ممی نے کہا ۔
نہیں بھابی ۔ وہ تو باہر جانے کے دن گن رہا تھا ۔ " چچی جان نے کہا ۔
بڑے ابا کے قرب کا ایک بہانہ سنجر کو ہاتھ آیا تھا ۔ شاید بات بن جائے !
اپنی امی کے حسب ہدایت وہ اس شام کو بڑے ابا کی خیریت معلوم کرنے ان کی خدمت میں پہنچا تھا ۔ !
عجیب حلیہ تھا ۔ میلا لباس ، چہرے پر داڑھی پھیلی ہوئی ۔ اداس و مضطرب !

ارباب اللہ میاں کا یہ حکم کبھی نہ ملے گا " سنجر نے سخت عبرتناک لہجے میں کہا " میں تو قسم سے اس وقت کا منتظر ہوں ۔ جب میں جرمنی سے واپس آؤں گا اور میرا منا بیٹا ماموں جان ماموں جان کہہ کے میری ٹانگوں سے آ لپٹے گا ۔ ہائے اللہ وقت کی باگ میرے ہاتھ میں ہوتی تو کھینچ لیتا "
" عورتوں کی طرح ہائے اللہ ہائے موئی کب سے بولنے لگے ؟ " نوشینہ کو ہنسی آ گئی ۔
بڑے آئے کہیں سے ماموں جان " امرینہ کو ننھے منے مونچھ دار بچے کی خوشی پھوٹی آنکھ نہ بھائی ۔ اس نے بھاجی ماردی " اجی ۔ وہ تو میرا بھانجہ ہو گا ۔ آپ تو چلے جائیں گے جرمنی ۔ میں البتہ یہیں رہوں گی ۔ آپ کو وہ پہچانے گا بھی نہیں ۔ مجھے خالہ خالہ کہہ کے بس میرے ہی لپٹا رہے گا ! "
جی ہاں ۔ جی ہاں ۔ اور کیا ؟ " سنجر نے سخت طنزیہ انداز میں سر ہلایا " آپ کا اچار تو گھر ہی میں پڑے گا ۔ ؟ اس دن سنا نہیں تھا بڑے ابا آپ کو بھی بھگانے کی سوچ رہے ہیں ۔ بگران کے لیے پرابلم یہ آ کے پڑا ہے کہ بے چارے بڑے ابا کو کوئی اچھا شریف زادہ نہیں مل رہا ہے ! "
چوپ کے بند کیجئے آپ اپنا ۔ ! " امرینہ بھنا گئی ۔
سچی سنجر ؟ " نوشینہ اشتیاق سے بولی " کیا یونہی کہہ رہے تھے بڑے ابا ؟ "
" پوچھ لیجئے محترمہ امرینہ سے ۔ ! "
باجی آپ بھی کن باتوں میں الجھ گئی ہیں ۔ ! " امرینہ بولی ۔
باجی آپ بڑے ابا سے کہیے کہ میری نظروں میں ایک بے حد اچھا لڑکا ہے " سنجر سنجیدگی سے بولا " خاندان کا نہایت شریف ہے ۔ غریب ضرور ہے تو اس قدر ہے کہ بس آپ کے ۔۔ ابا کا ہمیر لگتا ہے ۔ اور مناسب یہی ہے کہ وہ عنقریب انجینئری کی ڈگری

پہنے انگلینڈ یا امریکہ بھی جانے والا ہے!"

"میں بڑے آپا کے سامنے کہاں جاتی ہوں" نوشینہ بولی "مگر یہ لڑکا ہے کس کا کہاں ہے۔ دوست ہے تمہارا کوئی؟"

"باجی یہ شاطر گری کی آپ کو سوجھی کیا ہے؟" امرینہ چیخی۔

سنجر نے سنی ان سنی کر کے کہا "جی ہاں۔ میرا بہت عزیز دوست ہے۔ اتنی دوستی ہے ہم میں۔ باجی، اتنی دوستی ہے کہ دوسرے لوگ ہمیں ایک جان اور ایک قالب کہتے ہیں۔ مگر۔ افسوس۔ یہاں بھی ایک پرابلم آ کے کھڑا ہو گیا ہے۔!" وہ افسوسناک صورت بنا کر رہ گیا۔

"لڑکے والوں کا مطالبہ زیادہ ہے شاید۔!" نوشینہ نے پوچھا۔

"مطالبہ تو ان کا کچھ ہے ہی نہیں باجیا" سنجر نے کہا۔ پھر سر کھجا کھجا کے بولا "بس وہ یہ کہتا ہے کہ مجھے کوئی بینگن لوٹ نہ چاہیئے۔!"

"اس جنم جلے کی صورت کو خود آگ لگے!" امرینہ آپے سے باہر ہو کر بولی۔

"ارے اور کیا" سنجر نے ہاں میں ہاں ملائی "میں نے بھی الو کے پٹھے کو پچاس ہزار گالیاں دیں۔ ایک لاکھ کوسنے دیے۔ اور اس سے دوستی ختم کر دی۔"

"ابھی تو کہہ رہے تھے کہ دوست ہے!" نوشینہ نے کہا۔

"بس وہی بے غیرت آگے پیچھے پھرا کرتا ہے خوشامدیں کرتا ہے اور ہاتھ پاؤں جوڑتا رہتا ہے" سنجر نے کہا "اس نے کبھی ان گلاب جامن محترمہ کے رخ کر لیے تھے کہہ رہا تھا کہ رنگ پہ پھسکا دیڑی ہے کو کیا۔ سالی کا ناک نقشہ ایسا ہے کہ جی چاہتا ہے بٹھا میں [illegible] کر جیب میں رکھ لوں!"

"اے [illegible] بے غیرت ہو کر تمہاری بہن کے لیے ایک [illegible] ایسا [illegible]" نوشینہ نے [illegible] کہا "اے [illegible] کر کے نہ

تو امرینہ اس کی پرچھائیں بھی دکھائی نہ دی۔ اور پھر اسے اندیشہ لگا ہوا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔!

اسے صرف یہ غم تھا کہ وہ امرینہ کے سامنے اپنی صفائی نہیں کر سکا! اور وہ نجانے کیا کچھ سمجھ بیٹھی ہے!۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ ایک تفصیلی خط اسے لکھ دے!۔ اور اس نے خوب دل لگا کر باجی کے افسانوں کے رومانی جملے خط میں تحریر کیے۔ دو تین دن خط جیب میں رکھے پھرتا رہا۔ امرینہ تنہائی میں ملے تو اسے پکڑا دے۔ لیکن وہ ہر وقت بڑے ابا ہی کے سینے سے چپکی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ڈرتا تھا۔ وہ بے وقوف چھوکری کہیں اس کا رومان سے لبریز خط بڑے آپا کو نہ دکھا دے تب تو شاید اسے گھر ہی چھوڑ کے بھاگنا پڑے گا!۔

امرینہ نے اپنا کمرہ چھوڑ دیا تھا۔ ممی کے کمرے میں سوتی تھی! گویا اس نے جان بوجھ کے بہت سے ستم سنجر کی جان پر ڈھا رکھے تھے۔!

باوجود اتنی ستم ظریفیوں کے سنجر کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ امرینہ رقابت کی آگ میں جل جل کے اپنا حال برا کر رہی تھی! کیا وہ خوش تھی؟ کیا سچے دل سے ہنستی تھی۔ کیا اس کی باتوں میں تازگی اور جان ہوتی تھی۔ نہیں کچھ بھی نہیں۔ ویسے وہ بالکل پہلے کی سی تھی۔ پہلے سے بڑھ کر خوش۔ مسرور۔ بڑے آپا کے پاس بیٹھی پڑھا لکھا کرتی!۔

ایک روز گجی جان نے سنجر کو آڑے ہاتھوں لیا "تم تو جیسے کہیں باہر سے آئے ہو۔ کل ہی بھائی صاحب کہہ رہے تھے کہ سنجر کیا کرتا رہتا ہے دکھائی دیتا ہے۔ نہ میرے پاس آتا ہے۔!"

"کچھ نہیں امی۔ میرا امتحان سر پر آ گیا ہے۔ آخری سال ہے۔ [illegible]

پھینک دیا؟"

"کیسے ذبح کر دیتا بجو۔ اب اس کا دل ہی تو ہے۔ قصور ان صاحبزادی کا بھی ہے۔ ان سے پوچھئے۔ اس رنگ و روغن پر یہ اپنے جلوے کیوں لٹاتی پھرتی ہیں؟"

امرینہ کی یہ حالت تھی کہ چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ ایک جا رہا تھا غصے کے مارے سینہ دھونکنی بنا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے!۔

"روتی کیوں ہو؟" سنجر نے ہمدردی جتائی "میں نے اس صورت حرام سالے سے کہہ دیا تھا کہ ابے تو کیا تیری اوقات کیا۔ اسے ایک سے ایک گورا خوبصورت حسین اور پڑھا لکھا میاں مل جائے گا!"

"مگر میں کہتی ہوں سنجر تمہارے لفنگے آوارہ دوستوں میں معصوم بچیوں کا تذکرہ ہی کیوں آتا ہے" نوشینہ بولی۔

"اب وہ سالے سب کے سب لوفر ہی تو ہیں۔ باجی" سنجر بولا۔

"یہ رال ٹپکا ٹپکا کے ان کی بہنوں کے تذکرے کرتے ہوں گے۔ یہ کہاں کے [illegible] ہیں" امرینہ چنگاریوں بھرے لہجے میں بولی۔

"کیوں رے بدمعاش؟" نوشینہ نے للکارا۔

"ارے ارے۔!" سنجر للکار کے جواب میں للکارا "یہ تو آپ کی زبردستی ہے۔ واہ بھئی۔ آخر میری بھی شادی کہیں نہ کہیں ہو گی ہی۔ آپ کسی سے چغل خوری کر کے مجھے جوتے نہ کھلوانے کا وعدہ کیجئے تو میں ایک راز کی بات آپ کو بتاؤں"

"کسی بدذات چھوکری کی بات ہوگی اور کیا" امرینہ نے جل بھن کر کہا۔

"ایک صاحبزادی کی بات ہے" سنجر نے فخر و غرور سے اکڑ کر اور اپنا کالر درست کر کے فاتحانہ لہجے میں کہا "واہ کیا چیز ہے بجو۔ وہ بھی۔ پھولوں کی ڈالی، خوشبوں کی شہزادی۔ [illegible]"

ناقص العقل، احمق۔ شیطان کی خالہ نے سب کچھ ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ دماغ اڑن کر دیا۔ طبیعت مکدر کر دی۔ معاملہ چوپٹ کر دیا۔

"اگر میرے ہاتھ لگ گئی کا بجو۔ تو یاد رکھو کہ بری طرح پیٹ کے رکھ دوں گا۔"

سنجر نے پھر ٹیبل لیمپ آن کیا اور کرسی پر آ بیٹھا۔ مگر وہ کوشش کے باوجود ایک لفظ تک نہ لکھ سکا!۔

پھر اس کے دن بڑے کرب و عذاب کے گزرے۔ امرینہ کہیں دکھائی ہی نہ دی کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکتا۔ اس عرصہ میں وقاص بھائی اور نوشینہ الٰہ آباد چلے گئے!۔ اور نجانے بڑے ابا نے کیا سوجھی کہ وہ مستقل دالان ہی میں آ گئے! کچھ دنوں کے لیے انھوں نے رخصت لے لی تھی۔ ڈاکٹروں نے انھیں مکمل آرام کی ہدایت کی تھی۔ امرینہ کالج جانے سے پہلے ان کی خدمت میں رہتی! اور کالج سے واپس آ کے پھر ان کے پاس بیٹھ جاتی۔ ان کی شفقتوں نے امرینہ کے دل سے خوف دور کر دیا تھا۔ آج کل اسے مثنوی مولانا روم سے سخت دلچسپی ہو گئی تھی۔ وہ ایک ایک شعر سناتی اور بڑے ابا اس کا مطلب بتاتے۔ وہ خود قدردانِ علم تھے ہی دوسروں کو بھی تعلیم سے دلچسپی لیتے دیکھ کر بے حد خوش ہوتے اور حتی الامکان اس کی حوصلہ افزائی کرتے!۔

کسی کو کیا پتہ تھا کہ۔ کھلنڈرے دلوں میں کیا طوفان اٹھ رہے تھے سنجر بالکل کتابی اداس ہیرو کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔ ہنسنا بولنا بھول چکا تھا۔ کھانے کی میز پر آتا تو گم صم سا کھا کر جلد ہی اٹھ جاتا۔ پڑھنا لکھنا بھی نہ تھا۔ سرِ شام ہی بجلی بند کر کے بستر پر آ گرتا! اس کی اداسی کی اداسی [illegible] سب نے پوچھی۔ لیکن وہ کیا بتاتا۔ مذاق کو سنجیدگی بلا سبب کیوں کر دیتا؟۔

[illegible] ایک آدھ بار امرینہ کا کالج کے چکر بھی لگائے۔ لیکن وہاں امرینہ

تو سن لو۔!

سن لی۔ میں نے پوری بات۔!" امرینہ نے جواب میں کہا: "ایک کالی بدشکل لڑکی پر اتنی بے پناہ نوازشیں مت کیجئے۔! آپ کو مجھ سے نفرت ہے نا تو سن لیجئے کہ مجھے بھی آپ سے نفرت ہے!!"

اور وہ ایک جھٹکے سے پردہ ہٹا کر باہر نکل گئی۔!

ایک لمحہ تک سنجر بت بنا کھڑا رہا اور اپنا نچلا لب دانتوں سے کچلتا رہا۔ یکبارگی اس پر جیسے بجلی گر پڑی تھی!۔

اس کی سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ یک بیک رشک و رقابت اور نفرت کے شعلے امرینہ کے سینے میں کیونکر بھڑک اٹھے تھے۔ اس نے عورتوں کی رقابت اور جلن کے قصے سن رکھے تھے۔ اسے ان جذبات کا تجربہ نہ تھا۔!

اس نے ٹھوکر مار کر لفافہ صوفہ کے نیچے پھینک دیا۔ اور ٹیبل لیمپ آف کر کے کرسی پر آ بیٹھا۔! اس کا دماغ سنسنا رہا تھا! کس طرح اس بیوقوف لڑکی کو سمجھائے گا کہ اس نے باجی کے سامنے محض امرینہ ہی کو سنانے کے لیے یہ بکواس کی تھی! کیسے سمجھائے گا۔ اور کیا وہ ظالم لڑکی جو رقابت کے جہنم میں جل رہی ہے۔ اس کی بات کو سچ بھی سمجھے گی؟!۔

نہیں۔ وہ اس کی ایک نہ سنے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آپے سے باہر ہو کر نیا چیخے چلائے اور سب کو متوجہ کر لے۔!

پاگل، بیوقوف۔ خدا اس سے سمجھے۔!"

سنجر نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

پھر اسے ہنسی آنے لگی۔! اگر اسے سنجر سے نفرت ہے۔ تو پھر یہ حسد اور جلن کس بات کی ہے۔

اور اپنے بٹوے میں رکھ لوں۔ مگر ایک خرابی ہے اس میں کہ۔ معلوم ہوتا ہے جنگلی بلی کی نسل میں پیدا ہوئی ہے۔ میرے منہ سے ایک بات نکلتی ہے اور وہ اس کا قیمہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ بس یہی خرابی ہے اس میں بجو!"

قصائی کی اولاد ہوگی" جل جل کے امرینہ کوئلہ بنی جا رہی تھی۔ "مجھے تو وہ خود قصائی معلوم ہوتی ہے۔ تک چڑھی کٹکھنی بلی" سنجر نے کہا۔

مگر شاباش ہے تمہاری بے شرمی کو سنجر" نوشینہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر اور دانت پیس کر کہا: "تم اتنی تفصیل سے اپنی بدمعاشی کی داستان مجھ سے کہنے بیٹھے ہو۔ کیا یہی پڑھائی پڑھتے ہو یونیورسٹی میں۔! ارے کچھ تو شرم سے سر جھکاؤ۔ سوچو کہ جب چچا جان کو تمہاری بے ہودگی کا علم ہوگا تو کتنی کچھ تکلیف انہیں نہ ہوگی۔؟!"

یہی تو میں بھی سوچتا ہوں۔ بجو!" سنجر نے غمناک لہجے میں کہا: "انہیں کتنی تکلیف ہوگی اور وہ مجھے نہ ملی تو مجھے کتنی تکلیف ہوگی؟"

پڑھ لکھ کے کچھ نام کما دُبیا۔ ایسی فضول باتیں نہ کرو۔ یہ تمہارے شایان شان نہیں ہیں۔!" نوشینہ نے نصیحت کی۔

بہت اچھا۔ آپ کہتی ہیں تو آئندہ سے نہیں کروں گا۔

وہ آفت کی پرکالہ کیا تمہارے ساتھ پڑھتی ہے؟"

کہیں اور پڑھتی ہے۔ میرے ساتھ نہیں پڑھتی۔!" وہ سنجیدگی سے بولا۔

پھر تم نے اس چھوکری کو کہاں دیکھا؟" نوخیزہ کو کچھ کچھ کرید لگی تھی۔

ایک دو بار۔ خواب میں دکھائی دی تھی باجی۔!"

[illegible] جاؤ یہاں سے۔ خوامخواہ میرا بھیجہ کھا رہے

[illegible]

امرینہ۔ سنو تو۔ امرینہ خدارا صبر و سکون سے میری بات سنو: وہ دھیمے لہجے اور مدھم آواز میں گڑگڑایا۔ اگر کوئی ان لوگوں کی لڑائی سن لے تو کیا سوچے۔! مگر امرینہ کو کچھ خیال نہیں۔ یہ اتنی سمجھ کیوں ہوگئی۔ اس کے کمرے میں تنہائی میں کیوں آگئی ہے۔؟ کیا اسے اپنی نفرت کے اگلنے کا کوئی اور وقت نہ ملتا؟ مجھے آپ کی کوئی بات اب کبھی سننا نہیں ہے: امرینہ بدستور برہم لہجے میں بولی: سمجھے آپ۔! میرا بازو چھوڑیے۔ دکھنے لگا ہے۔ ایسے درندے کیوں ہو رہے ہیں؟:

ایک گہری سانس لے کر سنجر نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور اس سے دور ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ امرینہ نے اپنی بانہہ پر ہاتھ رکھ کر ایک سسکی لی۔ اور پھر دروازے کی طرف مڑی۔!

میری بات سن لو۔ پھر چلی جانا۔ امرینہ۔ خدا کا واسطہ تمہیں۔ ٹھہر جاؤ۔ میری نیت بری نہ تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ۔ میں کبھی تمہارے لیے کچھ نہ کچھ لاتا رہوں۔ کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ میرے لیے مٹھائی لائیے۔ کپڑے لائیے۔ اگر میں لے آیا تو ایسا کون سا گناہ کیا۔ امرینہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم اس وقت بہت سنجیدگی سے لڑنے کے لیے آئی ہو:

ہاں ہاں میں تو نفرت تھی۔ نہ کھا رہی تھی نہ پہن رہی تھی۔ آپ نے رحم کیا ہے نا مجھ پر: امرینہ زہر چکاں لہجے میں بولی: سن لیجئے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔! یہ سب کچھ لے جاکے اسی خوب صورت ظالم کو دے دیجئے آپ نے خواب میں دیکھا تھا جس نے آپ کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ جو دلوں کی ڈال ہے۔ خوشبوؤں میں بسی رہتی ہے۔!

ارے۔ نہیں۔ بالکل نہیں: وہ بے ساختہ ہنسنے لگا: امرینہ تم پوری بات

امرینہ نے خواہ مخواہ اطمینان کی سانس لی۔ اس کے چہرے پر اڑتی ہوئی ہوائیاں غائب ہوگئیں۔ سنجر سے یہ تغیر پوشیدہ نہیں رہا۔ وہ اسے دیکھ کر ہنسنے لگا!۔ اور نوشینہ نے خفا ہو کر اسے کمرے سے نکال دیا۔!

دو تین تک دونوں بہنوں کو سنجر کی باتوں کا صدمہ رہا۔ پھر بات آئی گئی ہوگئی لیکن ہفتہ بھر بعد گھر میں ایک قیامت اٹھی!۔

وقاص احمد ان دنوں آئے ہوئے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ نوشینہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ اب وہ ٹھیک تھی اور خواتین کا خیال بھی تھا کہ چھ سات ماہ تک مستقل میکے میں نوشینہ کا قیام مناسب نہیں تھا۔ لہٰذا نوشینہ جانے والی تھی۔

ان دنوں موسم کافی سرد ہونے لگا تھا! نوشینہ کی "دوسری حالت" کا خیال کر کے امرینہ نے اپنا خوب صورت کوٹ اسے پہنا دیا۔ وہ یکبارگی بہت پیاری لگنے لگی!۔

وقاص احمد نے کہا: یہ کہاں سے لیا ہے نوشینہ۔ بہت خوب صورت ہے! تمہارے جہیز کا ہے شاید!:

جی نہیں۔ یہ امرینہ کا ہے۔ اسے کہیں سے بڑے ابا نے خرید دیا ہے:

نوشینہ بولی: آپ کو پسند ہو تو۔ میں امرینہ سے لے لوں۔؟:

نہیں نہیں۔ اس بے چاری بچی سے لے لینا ٹھیک نہیں: وقاص احمد نے کہا: میں بڑے ابا سے پوچھوں گا دکان کا پتہ۔ تمہارے لیے لے آؤں گا:

چنانچہ بے خبر وقاص احمد جب بڑے ابا کے سلام کو حاضر ہوئے اور ان کی خیریت دریافت کی۔ ادھر ادھر کی گفتگو کرنے کے بعد برسبیل تذکرہ اس دکان کا پتہ بھی پوچھا جہاں سے انھوں نے خوب صورت کوٹ خریدا تھا

معذرت کرنے لگے!:

میں چونکہ بہت عرصے سے الہ آباد میں رہ رہا ہوں۔ بڑے ابا۔ اور حیدرآباد میں نئی نئی دکانیں کھل گئی ہیں۔ لہٰذا میں اکثر پتے نشان نہیں جانتا۔ مجھے معاف کیجئے گا!:

بیٹے ہم نے تو عرصہ سے کچھ خریدا ہی نہیں۔ ہماری تمام عورتوں کا خیال ناظمہ بی بی ہی رکھتی ہیں۔ اور ہم سمجھے بھی نہیں کہ تم کون سے کوٹ کا تذکرہ کر رہے ہو؟: بڑے ابا نے کہا۔

وہ۔ جو آپ نے سنجر کے ہاتھ سے۔ امرینہ کو بھجوایا تھا۔ بادامی سمور کا لیڈیز کوٹ: وقاص احمد نے یاد دلایا۔ مگر بڑے ابا حیران دکھائی دیے۔ انھوں نے قطعی لاعلمی ظاہر کی!۔ بلکہ کچھ برافروختہ بھی ہوئے کہ اگر بچوں نے آپس میں کچھ مذاق بھی کیا ہے تو اس میں ان کی بزرگ ہستی کو کیوں ملوث کیا گیا۔!

وقاص احمد خاموشی سے آگئے اور نوشینہ سے سارا ماجرا کہا۔ سنجر اس وقت اس کے پاس بیٹھا تھا۔ وقاص احمد کی روداد سن کر کرسی سے اچھل کر چھت میں جا لگا۔

خدا کی پناہ۔ آپ نے مجھ سے پوچھا ہوتا وقاص: وہ تو حواس ہی سے اتر گیا: آپ بڑے ابا سے کیوں جا ٹکرائے!: اس نے اپنا سر تھام لیا: واللہ اب میں بن موت مر دوں گا!:

کیا بات ہے!: وقاص احمد سخت پریشان ہوئے: کیا میں نے کوئی غلطی کر دی ہے؟۔

آپ نے [illegible]: سنجر ناچنے لگا: اب آپ لوگ میرے [illegible]

سرئی دھندلکا چھانے لگا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر ٹیبل لیمپ آن کیا اور [illegible] سے لکھنے لگا۔

کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ اس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور حیرت کے مارے اٹھ کھڑا ہوا۔

امرینہ!: اس نے زیرلب کہا۔

وہ خاموشی سے آگے بڑھی اور اس کے ہاتھ میں جو لفافہ تھا۔ اس نے سنجر کے قدموں میں پھینک دیا۔ اس کی سیاہ آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں برس رہی تھیں!۔ سنجر نے اپنے پیروں کی طرف دیکھا اور پھر تعجب سے امرینہ کی طرف نظریں اٹھا دیں۔!

امرینہ جانے کے لیے پلٹی اور تبھی اس نے لپک کر اس کی بانہہ پکڑ لی۔

"یہ سب کیا ہے۔ میں کچھ نہیں سمجھا:

باجی کے آنے کے بعد کوٹ بھی پھینک مار دوں گی۔ تب آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے:

امرینہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ کپکپا رہی تھی۔

لیکن۔ امرینہ۔!

کچھ نہیں۔ میرا ہاتھ چھوڑ دیجئے۔ مجھے جانے دیجئے: اس نے سنجر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اور بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر سنجر کے ہاتھ نے جنبش تک نہ کی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا!۔ پوری سنجیدگی سے۔ بے حد دکھ سے!

کیا میں نے کوئی بہت برا کام کیا امرینہ؟: دکھ اس کے لہجے سے برس رہا تھا۔

امرینہ آپ کی کون ہوتی ہے۔ کیوں بڑے ابا کا نام لے کر اتنی ذلت سے [illegible]۔ کیا کہا تھا آپ نے؟

"بھتا نہیں رہے ہو اللہ کرے اس سے بڑھ کر رو دو۔"

پھر وہ اٹھی۔ بڑی کراہت سے وہ طلائی زنجیر گلے سے اتار دی جو چار ماہ سے اس کے گلے میں سانپ بنی لپٹی تھی۔ ادھر سے ڈھونڈ کر سنجر کا دیا ہوا تنکا تنکا بٹورا سب کو ایک لفافے میں ڈالا۔ اور خود سے بلند آواز میں بولی

"پھینک ماروں گی منہ پر۔ زندگی بھر بات نہیں کروں گی۔ سمجھتے کیا ہو خود کو" پھر سارے غصے کے بڑے بے تکے فقرے اس کے منہ سے نکلے۔

"بدذات پہلوان۔ اماں باوا کی کمائی کھا کھا کے پہلوان ہو گئے ہو۔ اللہ کرے کہ کوئی غم ایسا لگے کہ سوکھ کے پنجر ہو جاؤ۔ خدا کرے کہ تمہاری اولاد کالی کلوٹی پیدا ہو۔ کوئلے کی سی دس بارہ لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہو جائیں اللہ کرے۔"

پھر اس نے دونوں ہاتھ دعا کے طور پر پھیلا دیے اور بچکیاں لے کر بولی۔

"اللہ میاں آپ کو میرے جلے دل کی قسم۔ میری ساری بددعائیں قبول کر لیجئے آمین ثم آمین۔"

پھر وہ غم اور غصے کی تصویر بن کر صوفے پر ٹک گئی!۔

کافی کے بعد قاصی احمد نوشینہ کو لے کر اپنے گھر چلے گئے!۔

وہ ایک روز سے بڑے ابا کی طبیعت ناساز تھی۔ ان کی خفیف سی سوء مزاجی بھی عورتوں کے لیے بہت بڑی مصیبت بن جاتی تھی۔ چچی جان تو بس اٹھتے بیٹھتے دعائیں مانگتیں اور ممی آنچل پھیلا کر آسمان تلے کھڑی ہو جاتیں۔ مولا بھائی صاحب کو اتنی ہی زندگی اور دیدے جتنی وہ گزار چکے ہیں۔ میرے خدا میری عمر انہیں لگ جائے!۔

وہ جا کر ممی تو ان کی خدمت میں پہنچ گئی اور چچی جان ان کے لیے پرہیزی شوربہ [illegible] سنجر کی [illegible] تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ سر شام کا گہرا

"سچی بات کہہ دو۔ ورنہ پھر میں تمہارا برا حشر کر دوں گی۔" نوشینہ نے کہا۔

"بجو۔ میرا برا حشر ہو رہا نہیں ہے۔!" وہ گھبرا رہا تھا۔

"منہ سے کچھ پھول بھی تو جھڑواؤ۔" نوشینہ نے دانت پیس کر کہا۔

"بجیا۔ وہ۔ وہ تو۔ وہ تو۔"

امرینہ پھولدار پردے کے پیچھے ساکت کھڑی تھی۔ سانس روک لی تھی اور دل کی دھڑکن کو قابو میں کرنے میں لگی تھی۔ وہ یہ پوچھنا بھی بھول گئی کہ قاصی احمد اس وقت چائے پیئیں گے کہ کافی!۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ سنجر کسی وقت ان کے کمرے میں آ گیا تھا!۔ اور اب حیرت کے مارے اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں!۔

"بولو۔ بولو۔" نوشینہ نے کہا۔

"باجی۔ وہ۔ میں نے اپنی طرف سے دیا تھا اسے۔" بالآخر سنجر کے ہونٹوں کے ٹانکے ٹوٹے۔ مگر باجی اچھل پڑیں۔

"بڑے ابا کا نام لے کر؟" قاصی احمد بھی کچھ چونک پڑے۔

"جی ہاں۔ ان کا نام نہ لیتا تو وہ لومڑی مجھ سے کب لیتی۔" سنجر بولا۔ "مگر تم نے"۔ نوشینہ نے جرح کی۔ "تم نے تو اسے بہت سی چیزیں دی تھیں۔ کیا وہ سب کی سب۔ بڑے ابا کی طرف سے تمہی نے دی ہیں؟!"

"سب باجی۔ اب میری لاج آپ کے ہاتھ میں ہے اور زندگی خدا کے ہاتھ میں۔" سنجر نے لپک کر ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ "کسی سے مت کہیے۔ میری بجو۔ میں آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ میری اچھی بجیا!"

"معاملہ کچھ دور تک پہنچ گیا ہے۔" قاصی احمد نے قہقہہ لگایا۔ "کیوں یار شاید اسی لیے تم نے مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ میں نے [illegible]

یا نہیں؟"

"وقاص بھائی۔ مرے پرسو دُرّے اسی کو کہتے ہیں" سنجر بولا۔

"اچھا اٹھو کرسی پر جا کے مرو" نوشینہ نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر جھکول ڈالے۔ کراہتا ہوا وہ اٹھا اور کرسی پر جا بیٹھا۔

"خیر یار۔ ہم تمہارا پردہ ڈھکے لیں گے" وقاص احمد بولے "لیکن ایک شرط پر۔ تم اپنی باجی کو بالکل ایسا ہی ایک کوٹ خرید دو۔ کتنے کا ہے؟"

"جی۔ وہ" کچھ شرما کر سنجر بولا "سوا دو سو کا۔!"

"ہم پرسوں دوپہر کو نکلیں گے" وقاص احمد نے کہا "تم خیال کر کے ذرا جلدی لے آنا۔ انھیں بہت پسند آیا ہے"

انھوں نے پرس سے سو سو کے تین نوٹ نکالے اور سنجر کی طرف بڑھا دیے پھر مسکرا کر بولے "قیمت اور آنے جانے کا کرایہ نکال کے جو کچھ بچے وہ تم رکھ لینا"

"شکریہ!" وہ سچ مچ شرما گیا۔ پھر اٹھا اور تیر کی طرح کمرے سے نکل گیا وقاص احمد بے ساختہ ہنس پڑے۔

نوشینہ نے پیار سے برا سا منہ بنایا "مکار اتنا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنی مرضی پوری کر ہی کے دم لیتا ہے۔"

"اچھا نوشینہ۔ سنجر کی ان باتوں کی خبر کسی کو نہ ہونے دینا" وقاص احمد نے کہا "کیا فائدہ۔ بے چارے پر ڈانٹ پھٹکار پڑے۔!"

"اس کی دیدہ دلیری تو دیکھیے۔!"

"تم نے سنا نہیں محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے!"

نوشینہ نے کہا "ایک دوسرے کو کھائے لیتے ہیں۔

امرینہ کی سانولی رنگت پر نفرت کس کے ہمیشہ اسے رلاتا ہے۔!"

دروازے سے ملازمہ نے انھیں آواز دی۔ باہر کافی پینے کے لیے ممی بلا رہی تھیں۔ ان کے کمرے سے جانے کے ساتھ ہی امرینہ بھی پردے کے پیچھے سے نکلی اور برآمدے سے ہوتی ہوئی اپنے کمرے میں بھاگ آئی۔

آج اسے واقعی کسی کو جان سے مار ڈالنے کا سا غصہ آ رہا تھا!۔ دماغ میں انجن سے چل رہے تھے۔ وہ خود سے بار بار سوال کرتی۔ آخر سنجر نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ کس لیے کیا۔ مگر اسے کسی سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا!۔

وہ فرش پر بیٹھی صوفے سے سر ٹیکے مسلسل سوچے جا رہی تھی!۔ رہ رہ کے سنجر صاحب کا چہرہ اس کے افق تخیل پر ابھرتا اور بے پناہ طیش لے آتا!۔

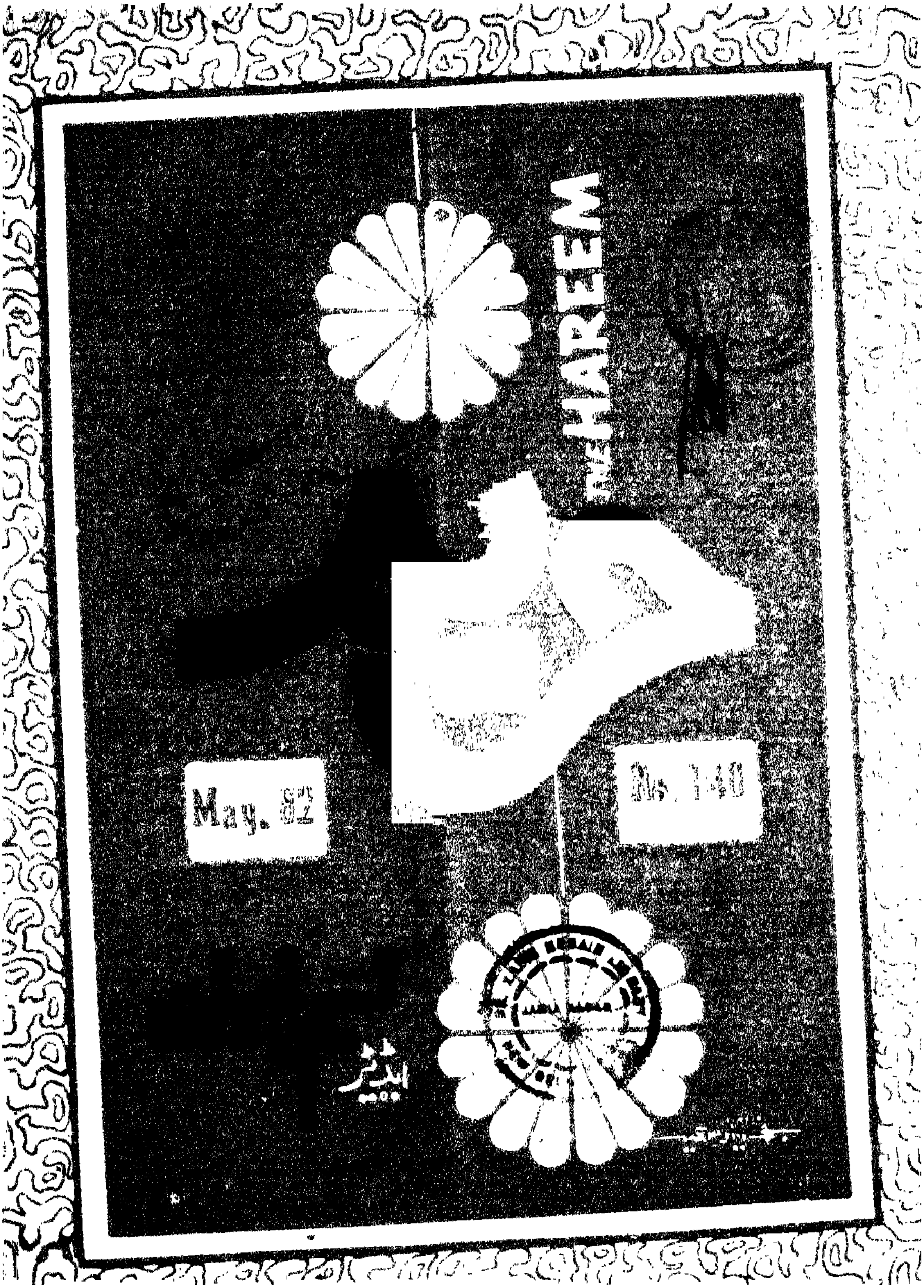
جتنی گالیاں اسے یاد تھیں وہ دل ہی دل میں اس نے سنجر کو بخش دی تھیں۔ جتنے کوسنے اس نے یہاں وہاں سے سنے تھے۔ سب اسے دے دیے اور اس وقت قطعی یہ نہ سوچا کہ وہ ماں باپ کا اکلوتا تھا۔ جس پر اسے کبھی کبھی ترس بھی آیا تھا۔! اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس طرح بے وقوف بنے پر خوب زار زار روئے۔ مگر اسے رونا نہیں آ رہا تھا!۔ وہ تو بس اپنے غصے پر کباب ہو رہی تھی!۔

باہر قہقہے۔ دلچسپ محفل گرم تھی۔ اور ان آوازوں میں وہ آواز بھی شامل تھی۔ جو اسے اس وقت زہر لگ رہی تھی۔ بے غیرت بے شرم۔ چوری کھل چکی ہے۔ مگر نام کو حیا نہیں ہے۔ ایسے ڈھیٹ بھی کبھی نظر سے نہیں گزرے۔ دانت پیس کر امرینہ بولی۔

دردآشنا

Price Rs 15/-

عفّت موہانی


THE HAREEM
May. 82
Rs. 1.40

گزشتہ ۵۲ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیادگار
سید محمد سلیم انہونوی مرحوم
بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد ۵۲ | فہرست مضامین ماہ مئی ۱۹۸۲ء | نمبر ۵

ایڈیٹر و نگراں

نسیم انہونوی

معاونین

شوکت جہاں بیگم غزالہ

جانی بیگم ردولوی

قیمت فی پرچہ :۔ ایک روپیہ چالیس پیسے
قیمت سالانہ منی آرڈر سے ۔/۲۲ روپیہ
قیمت مخصوص ۔/۲۵ روپیہ
قیمت اعزازی ۔/۲۰ روپیہ
وی پی سے منگوانے پر چار روپئے پچاس پیسے زائد
غیر ممالک سے ۔/۶۵ روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ بحساب سی میل
ائیر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔

ناشر فہیم انہونوی

آفس و ترسیل زر کا پتہ :۔
نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ
فون آفس :۔ ۴۴۵۹ ۴۴ ۔ رہائش :۔ ۴۵۲۳۴

فہیم انہونوی نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

لمعات

اخبارات میں ایک خبر چھپی ہے، جو کسی مغربی ملک سے متعلق نہیں جہاں عورتوں کی آزادی نے عفت و عصمت کی قدر و قیمت تقریباً ختم کردی ہے اور ایسی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا کہ کنواری لڑکیاں بوائے فرینڈس کے ساتھ خوش فعلیاں کرتی پھرتی ہیں جہاں شادی شدہ عورتیں اپنے مرد دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کرتی ہیں۔ جہاں عورت کو آزادی بخش کر لوٹا جا رہا ہے اور وہ خوش ہیں کہ اب ان پر کسی طرح کی قید و بند نہیں رہ گئی، بلکہ خبر ہندوستان سے متعلق ہے۔ جہاں سیتا اور ساوتری نے جنم لیا تھا اور اب اسی ملک میں انگریزوں کی پھیلائی ہوئی تعلیم اور اقدار یہ رنگ لا رہی ہیں کہ اسے دیکھ کر یا سن کر گھن آنے لگتی ہے۔ خبر کا متن حسب ذیل ہے۔

"کلکتہ۔ ۲۹ مارچ۔ ایک جائزے کے مطابق مغربی بنگال کے شہری اور دیہی علاقوں میں کم عمر غیر شادی شدہ ماؤں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔

یہاں ذہنی و نسوانی امراض کی ہندوستانی انجمن کی ایک میٹنگ میں کلکتہ اسپتال و طبی تحقیق انسٹی ٹیوٹ میں امراض نسواں کے ممتاز ماہر ڈاکٹر بی کے خان نے اپنا یہ جائزہ پیش کیا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کم عمر غیر شادی شدہ ماؤں کو سماج میں کلنک کا ٹیکا لگنے کا نہیں البتہ بچوں کے مستقبل کی فکر ضرور لاحق ہے۔

جائزے کے مطابق ان غیر شادی شدہ ماؤں میں خواہ وہ شہر کی ہوں یا دیہات کی ۵۰ فی صدی عمر ۱۵ سے ۱۹ سال تک ہے۔ ۸ مائیں ۱۲ سے ۱۴ سال عمر کی ہیں اور تعجب خیز طور پر دو لڑکیاں اس وقت ماں بن گئیں جب ان کے ایام بھی شروع نہیں ہوئے تھے۔

معاشی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے پتہ چلا کہ غیر شادی شدہ ماں بننے میں مالی حالات کا کوئی دخل نہیں رہا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر واقعات لڑکیوں کی لڑکوں سے اور خاندانی دوستوں کے سبب رونما ہوئے ہیں۔ یہ واقعات ان لڑکیوں کے ساتھ زیادہ پیش آئے جو اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پاتی ہیں یا ملازمت کرتی ہیں۔

جہاں تک باپ بننے والوں کا تعلق ہے ان میں سے تقریباً ۴۰ فی صد لڑکیوں کے دوست ہیں ان کے بعد ان کے قریبی رشتہ داروں اور ٹیوشن پڑھانے والوں کا نمبر آتا ہے۔ جبر اً عصمت دری کے صرف تین واقعات پائے گئے۔

جائزے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر شادی شدہ ماؤں میں صرف ۵ فی صد نے اسقاط حمل کو ترجیح دی جب کہ ۹۵ فی صد نے بچہ جننا پسند کیا۔"

یہ حالات صرف اس تعلیم سے پیدا ہو رہے ہیں جو اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے، اور جسے حاصل کرنے کے لئے لڑکیاں اور دھڑلے سے آزادانہ رواں دواں نظر آتی ہیں۔ اب وہ اسکولی بسیں ہوتی ہیں نہ اور کوئی ایسا ذریعہ جو محفوظ طور پر انھیں اسکول و کالج لے جائے اور واپس گھر پہنچا دے۔ جیسا کہ ابتدا میں ہوتا تھا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لکھنؤ کا کشمیری محلہ گرلس کالج ایک مثالی کالج تھا اور اس کی پرنسپل مسز گپتا کو کوئی شریف النفس فراموش نہیں کرسکتا۔ جنھوں نے لڑکیوں کے لئے پردہ دار بسیں گاڑیاں رکھی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک ایک ڈولی اور دو دو کہار بھی ہوتے تھے۔ بس یا گاڑی گلی کے سامنے رکتی اور کہار ڈولی پر لڑکیوں کو بٹھا کر ان کے گھروں پر پہنچاتے اور اسی طرح صبح انھیں لا کر بس یا گاڑی پر بٹھاتے۔ اور یہ بسیں اور گاڑیاں پردہ پوش ہوتی تھیں۔ کالج اس طرح بنا تھا کہ بس یا گاڑی اندر جا کر رکتی۔ پھاٹک بند ہو جاتا۔ لڑکیاں اتر کر کلاسوں میں چلی جاتیں۔ کالج کا آنگن کالج سے باہر اس طرح بنایا گیا تھا کہ وہاں آنے والوں کی نگاہ بھی کسی لڑکی کو دیکھ نہ سکتی تھیں۔ مسز گپتا ہندو خاتون تھیں۔ خود پردہ نہیں کرتی تھیں لیکن مسلمان لڑکیوں کے پردہ کا انھیں بڑا احترام تھا۔ کاش ایسے ہی کالج ہوتے، ایسی ہی سواریوں کا انتظام ہوتا اور ایسی ہی پرنسپل ہوتیں۔ لیکن یہ سب تو جیسے خواب و خیال ہو

کی باتیں ہیں۔ آج تو عالم یہ ہے کہ زنانہ کالجوں کے گیٹ کے سامنے اور قرب و جوار میں نوجوانوں، جوانوں اور نظر بازوں کے جھنڈ کھڑے رہتے ہیں اور لڑکیاں ان کے منھ سے گندی گندی باتیں سنتی گذر جاتی ہیں اور کبھی کبھی انھیں میں دوست بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ بیگ بڑھتے ہیں۔ ملنا ملانا ہوتا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا رہتا ہے۔ جیسا کہ اس جائزے میں لکھا گیا ہے۔ اور یقین کیجئے کہ یہ جائزہ بجبور لڑکیوں کا ہی لیا گیا ہوگا۔ بیشتر اس جائزے کی گرفت میں آتی ہی نہ ہوں گی۔ اپنے گناہوں کو چھپانے کے لئے انھوں نے دوسرے طریقے اختیار کئے ہوں گے۔ خود ان کے والدین نے آگاہ ہو کر پردہ پوشی کی ہوگی اور کوشش کر کے بیٹیوں کو انگشت نمائی سے بچایا ہوگا۔

میں جب کبھی ایسی تعلیم کی مخالفت کرتا ہوں تو مجھے دقیانوس سمجھا جاتا ہے، بیک ورڈ سمجھا جاتا ہے، مذاق اڑایا جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ تعلیم نسواں کے ساتھ ہی ساتھ مخلوط تعلیم کو بھی پسند کیا جانے لگا ہے، بلکہ اس کی حمایت کی جاتی ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس طرح لڑکیاں اس خوف و ہراس سے دور ہو جاتی ہیں جو پرانی اقدار کے باعث ان میں پیدا ہو گیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خوف و ہراس سے عورت اس وقت تک گھری رہے گی۔ جب تک وہ عورت رہے گی۔ فطرت کی بخشندہ اس کمزوری سے اسے کبھی نجات نہ مل سکے گی۔ خواہ وہ کتنی ہی تعلیم کیوں نہ حاصل کرے۔ کہیں بھی جا کر کیوں نہ پڑھے نسوانیت کا فطری خوف ہمیشہ اس سے لپٹا رہے گا۔ وہ مرد سے ہمیشہ ڈرتی رہے گی۔ ایسا کبھی نہ ہو سکے گا کہ مرد اس سے ڈرنے لگے۔ ہاں اس وقت یہ ضرور ممکن ہو سکتا ہے، جب وہ اپنی عزت و ناموس کو بھول جائے۔ عفت عصمت کو ایک دلچسپ مشغلہ سمجھ کر لٹانے پر کمر بستہ ہو جائے۔ اس لئے کہ مرد اس سے یہی چاہتا ہے اسی کے لئے اس سے قریب ہوتا ہے۔ اسے محبت کے جال میں پھنسا کر لوٹتا ہے۔ اس پر جبر و استبداد کرتا ہے۔ اس کی عصمت لوٹتا ہے اور اکثر اسے جان سے بھی مار ڈالتا ہے۔ کیا کبھی آپ نے ایسی کوئی خبر کسی اخبار میں پڑھی ہے کہ کسی عورت نے جبراً کسی مرد سے زبردستی منہ کالا کر کے اسے مار ڈالا ہو۔ یقیناً آپ کا جواب "نہیں" میں ہوگا اور یہی ثبوت ہے کہ عورت کبھی مرد پر قابو حاصل نہ کر سکے گی۔ خود حفاظتی کی عورت کے پاس صرف یہی صورت ہے کہ وہ پردہ کرے۔ آزاد نہ پھرے اور حتی الامکان غیر مردوں کی نگاہوں سے اپنے کو بچائے۔ لیکن آپ میں سے بہت سی بہنیں اور بھانجیاں اس مشورے پر ہنسیں گی اور کہیں گی کہ یہ دقیانوسی انسان بس اسی پردے کی رٹ لگائے رہتا ہے، جیسے اکبر کی پوتیوں نے تو اپنے دادا کے انتقال کے بعد ان کی قبر پر اتار پھینکا تھا، لیکن اس کی پوتی نے اس کی زندگی ہی میں اتار پھینکا۔

سینما بینی ایک جرم

ہندوستان کے چند علاقوں میں یہ تحریک کچھ عرصہ سے چل رہی ہے کہ مسلمان عورتوں کو سینما نہ دیکھنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں ایک آدھ جگہ لوگ تشدد پر بھی اتر آئے تھے۔ اس کے بعد کچھ عورتیں رضیہ پٹیل کی سرکردگی میں سینما دیکھنے چلی گئیں۔ تحریک چلانے والوں کی جانب سے تشدد کا امکان تھا، اس لئے شو ختم ہونے کے بعد پولیس نے سینما کا محاصرہ کر لیا اور ان عورتوں کو اپنی حفاظت میں ان کے گھروں تک پہنچایا۔

سینما بینی زیادہ اچھا فعل نہیں، اس سے مالی نقصان تو ہے ہی، لیکن اس سے زیادہ اخلاقی تباہی آتی ہے، اس لئے کہ بیشتر فلم ایسے ہوتے ہیں، جن میں مخرب اخلاق مناظر، باتیں اور رقص و گانے پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن موجودہ زمانے میں یہ ایک ایسی عام تفریح ہے، جسے روکنا آسان نہیں۔ سینما گھروں کے علاوہ یہ فلم ٹی۔ وی پر بھی دکھائے جاتے ہیں۔ ان کے عامیانہ گانوں کے ریکارڈ تمام دن ریڈیو سے نشر ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کسی گھر میں ریڈیو نہ ہو تب بھی اس گھر کے لوگ ان گانوں کو سننے پر مجبور ہوتے ہیں، اس لئے کہ وہ پاس پڑوس کے گھروں میں آواز بلند بجتے رہتے ہیں۔ دراصل ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت ایسی پابندیاں فلمسازوں پر عاید کرے کہ وہ پاک صاف فلمیں بنانے پر مجبور ہو جائیں۔

دنیا جانتی ہے کہ تخریب جلد اثر انداز ہوتی ہے اور گناہ میں ثواب سے زیادہ لذت ہوتی ہے، اسی لئے فلم ساز ایسے فلم بناتے ہیں جو گناہوں کی لذت سے بھرپور ہوں تاکہ لوگ انھیں زیادہ سے زیادہ دیکھیں اور ان کا کاروبار چمکے۔ چند سنجیدہ فلمسازوں نے

کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ ایسے فلم پیش کریں جو پاک و صاف ہوں اور جنھیں بھائی بہن اور باپ بیٹی ایک ساتھ بیٹھ کر دیکھ سکیں —— لیکن افسوس کہ ایسے فلم فیل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے مقابل مخرب اخلاق اور گندا ہوں و بدکاریوں کی ترغیب دینے والے فلم بھی دکھائے جا رہے ہوتے ہیں۔ اگر حکومت سب کو پاکیزہ فلم بنانے پر مجبور کرے تو لوگ مجبور ہو کر انھیں کو دیکھیں گے۔ فلم تخریب پیدا کر سکتے ہیں، تو تعمیری کام بھی کر سکتے ہیں، بشرطیکہ حکومت اس طرف ایمانداری کے ساتھ متوجہ ہو جائے اور ایسے فلموں کو نمائش کے لائسنس نہ دے جو مخرب اخلاق ہوں —— بہرحال یہ تحریک جو مذہبی جنونی لوگ چلا رہے ہیں نہ وہ معقول تحریک ہی ہے، نہ اس کے کامیاب ہونے کی امید ہے۔ اس میں سب سے بڑی خامی تو یہ ہے کہ ممانعت صرف خواتین کے لئے ہی ہے۔ کیوں۔ کیا مردوں کے اخلاق سینما دیکھ کر نہیں بگڑتے۔ سب سے پہلے انھیں ہی چاہئیے تھا کہ سینما نہ دیکھیں۔ اس کے بعد عورتوں سے درخواست کرتے تو کچھ بات ہوتی۔ یہ سراسر مردوں کا ظلم ہے کہ وہ خود بری باتیں کرتے رہیں، اور عورتوں کو مجبور کریں۔ بالکل اسی طرح۔ جس طرح بیوی سے تو مرد چاہتے ہیں کہ وہ کسی مرد کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھے لیکن وہ خود عیاشی کرتے رہتے ہیں۔

حریمی دسترخوان

سبزیوں کا آملیٹ

اشیا۔ آلو ۵۰۰ گرام۔ پالک ۱۰۰ گرام۔ گوبھی کا پھول ۱۰۰ گرام۔ ولایتی گاجر ۱۰۰ گرام۔ نئی ساگ دار پیاز ۱۰۰ گرام۔ انڈے دو عدد۔ ہرا دھنیا یا پودینہ اندازے سے۔ ہری مرچ باریک باریک کٹی ہوئی حسب خواہش۔ کالی مرچ پسی ہوئی چاولہ کا ایک چمچہ۔ نمک اندازے سے۔ ڈالڈا یا کوئی تیل حسب ضرورت۔ سرخ مرچ پسی ہوئی بھی اپنی خواہش کے مطابق لیں۔

ترکیب۔ سب سے پہلے آلوؤں کو (آلو دیسی ہوں تو بہتر ہے) اچھی طرح ابال کر چھیل لیں اور اچھی طرح مسل کر یا سل پر پیس کر مرغ کالی مرچ، ہرا دھنیا یا پودینہ باریک کاٹ کر تھوڑا سا نمک ڈال کر ایک جان کر کے رکھ لیں۔ اس کے بعد سبزیوں کو علیحدہ علیحدہ صاف دھو کر ابال لیں۔ گوبھی کو تراش کر باریک کر لیں۔ اسی طرح گاجر چھیل کر اسے بھی کدوکش کر لیں یا باریک باریک کاٹ لیں۔

ہری پیاز کو تھوڑے ڈالڈا یا تیل میں کاٹ کر تلیں اور پھر اسی میں ابلی ہوئی سبزیاں ڈال کر تلیں۔ نمک، کالی مرچ اور تھوڑی کٹی مرچ ملا دیں۔ آلو کے آمیزے کے پیڑے بنا کر روٹی کی طرح بیل لیں اور ان پر انڈے کی سفیدی و زردی پھینٹ کر ایک سمت لگا دیں۔ انڈے لگے سمت پر ترکاریوں کے آمیزے کو مسل کر پھیلائیں، لیکن حاشیہ کا ایک ایک انچ چھوڑ کر۔ سبزیاں پھیلانے کے بعد بیلی ہوئی ایک اور روٹی پر انڈے کو لگا کر ترکاری لگی روٹی پر اس طرح رکھیں کہ انڈہ لگا رخ اندر کی طرف ہو۔ پھر آلو کی دونوں روٹیوں کے کناروں کو ملا دیں تاکہ ترکاریاں اندر چھپ جائیں۔ اسی طرح آلو کے تمام آمیزے کو استعمال کریں۔ پیڑے بنا کر اندازہ کر لیں کہ کتنے ہوں گے۔ دو کے حساب سے شمار کر کے ترکاریوں کے آمیزے کو بھی تقسیم کر کے رکھ لیں۔ اور تمام روٹیاں تیار کر کے اگر آپ کے یہاں اوون ہے تو اس میں بیک کر لیں۔ یا پھر فرائی پین میں رکھ کر ہلکی آنچ پر سینک لیں۔ ایک طرف پک جانے کے بعد دوسری طرف بھی پکا لیں۔

جو بہنیں پسند کریں وہ ہلکا سا تیل یا ڈالڈا بھی انھیں فرائی پین پر تیار کرنے کے دوران ڈال سکتی ہیں۔

اوون میں بیک کرنے میں تیل یا ڈالڈا کی قطعی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ آلو کے آملیٹ کھانے کے ساتھ گرم گرم نوش فرمائیں تو اچھے ہوں گے۔ ٹماٹر آپ کو نقصان نہ کرتے ہوں تو ترکاریوں کا آمیزہ بناتے وقت تھوڑا سا ٹماٹر کا عرق نکال کر شامل کر لیں۔ ٹماٹر کے بجائے لیموں کا عرق بھی شامل کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ دونوں چیزیں ضروری نہیں۔

مرسلہ۔ فیروزی بیگم قسیم اشرفی۔ لکھنؤ۔

بہن ایس، کے خیر النساء (بنگلور) کا خط

بہن موصوفہ نے لکھا ہے کہ بنگلور کے روزنامہ سالار میں کچھ عرصہ قبل جوڑے کی قبیح رسم کے سلسلہ میں بہت سے مضامین موافقت اور مخالفت میں شائع ہوئے، لیکن پھر یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔

یہ بھی لکھا ہے کہ بنگلور میں ایک شادی کمیٹی قائم ہوئی جس میں سات لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں جامع مسجد میں سادگی کے ساتھ ایک ساتھ عمل میں آئیں۔ یہ بڑا ہی مستحسن اقدام تھا، لیکن افسوس کہ اس کے بعد یہ کمیٹی بے عمل یا ختم ہوگئی۔

تیسری بات یہ لکھی ہے کہ مردم شماری سے یہ ثابت ہوا ہے کہ کرناٹک میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اس لئے معاشرے کو پاکیزہ رکھنے کے لئے ضرورت ہے کہ مرد ایک سے زاید شادیاں کریں۔ زائد شادیوں کا حکم اسی لئے دیا گیا تھا کہ غزوات میں مرد شہید ہوجاتے تھے اور بیواؤں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی

خیر النساء بہن نے جو باتیں لکھی ہیں ان میں اول الذکر دونوں باتیں واقعی ہمدردی کے ساتھ سوچی جانا چاہئیں۔ جوڑے اور فرمائشی جہیز کی رسموں کو ہم بھی لعنت سمجھتے ہیں، ان میں اصلاح ضروری ہے۔ اسی طرح شادی کمیٹی کا قیام مختلف شہروں میں بھی ہونا چاہئے۔ ایسی کمیٹیاں مالدار اور صاحب خیر لوگوں سے رقمیں حاصل کرکے نادار لڑکیوں کی شادی کرانے کا اہتمام کریں۔ بڑے ہی ثواب کا کام ہوگا۔

تیسری بات کے سلسلہ میں یہ عرض کروں گا کہ عورتوں کی تعداد کرناٹک میں اتنی بھی زیادہ نہیں ہے کہ مرد ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کریں۔ یقیناً اسلام میں ایک سے زائد شادیاں کرنے کے سلسلہ میں مردوں کو اسی لئے اجازت دی گئی ہوگی کہ غیر شادی شدہ عورتیں جذبات سے مغلوب ہوکر گمراہ نہ ہوجائیں۔ موجودہ زمانہ اُس زمانہ سے مختلف ہے۔ ہندوستان کے ہر خطے میں خواتین بھی ملازمت کررہی ہیں۔ خصوصیت سے محکمۂ تعلیم میں ان کی کافی کھپت ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس محکمہ میں سروس کرنے والی خواتین کم سے کم ۲۵ فیصدی غیر شادی شدہ ہوتی ہیں۔ یعنی وہ شادی کرتی ہی نہیں، حالانکہ انھیں کوئی مجبوری نہیں ہوتی۔ دوسرے محکموں میں بھی ملازمت کرنے والی خواتین شادی کا جنجال پالنے سے گریز کرتی ہیں۔ اس لئے مردم شماری میں نظر آنے والی تعداد اس سے زاید نہ ہوتی ہوگی۔ جتنی شادی کو پسند نہ کرنے والی خواتین کی ہوتی ہے۔

اس حقیقت سے بھی خیر النساء بہن مزید واقف ہوں گی کہ دو چار فیصدی لڑکیاں ایسی صورتیں لے کر پیدا ہوتی ہیں، جنھیں مرد پسند نہیں کرتے۔ حسنِ ظاہر عورت کے لئے ایک ضروری چیز ہے۔ اس لئے ایسی بہنیں جو یہ سمجھ لیتی ہیں کہ وہ دلکش چہرہ نہیں رکھتیں، شادی نہ کرنے ہی کو بہتر سمجھ لیتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ مرد جو حسنِ ظاہر پہ فدا ہونے کی خصلت رکھتا ہے۔ انھیں کبھی پیار نہ کرسکے گا۔ اور جب مقابل زندگی میں پیار ہی نہ ہوا تو پھر کیا فائدہ۔ شادی نہ کرنے پر ایسی خواتین کو صرف ایک ہی محرومی ملتی ہے، جب کہ شادی کر لینے کے بعد ایسی خواتین کو ہمہ وقت کباب سیخ بنا رہنا پڑتا ہے۔

ان حالات میں میرا خیال ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کرنے کی تحریک قطعی مناسب نہیں اور نہ ہی اس سے معاشرے میں کوئی گندگی پیدا ہوسکتی ہے۔ دراصل گندگی تو یوں بھی پھیل رہی ہے جیسے جیسے مغربی تعلیم و تہذیب بڑھتی جائے گی، معاشرہ گندہ ہوتا جائیگا بشرطیکہ معاشرے کی پاکیزگی پرکھنے کا ہمارا وہی انداز رہے جو سو سال پہلے تھا۔

حضرت

ابوذر غفاریؓ

عابدہ نرجس

اسلام دنیا کا وہ واحد مذہب ہے۔ جس نے نفس انسانی کو اس طرح بدل کے رکھ دیا۔ کہ اسے صحیح معنوں میں تالیف قلب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ ہادیٔ برحقؐ کی ہدایت کی روشنی تھی۔ جس نے دلوں کی تاریکیاں دور کر کے ان میں خدائے بزرگ و برتر کی محبت و عظمت اس طرح سمودی کہ پھر ان میں نہ مال دنیا کی ہوس رہی۔ نہ جاہ و جلال کی۔ اور نہ کسی عہدے کی۔ وہ اپنے حال پر قانع اور شاکر ہو گئے۔ اور اپنے محبوب نبیؐ کے پیغام کے امین بنے۔ مدینے کی گلیاں اب بھی اس مرد درویش کو نہیں بھولیں جو بلند آواز میں مال و دولت جمع کرنے والوں کو، دوسروں کا حق مار کر اپنی تجوریاں بھرنے والوں کو ان کے انجام کی خبر دیتا تھا۔ "جو لوگ سونے چاندی کو سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو۔ اس دن وہی چاندی سونا آگ میں گرم کئے جائیں گے۔ پھر ان کی پیشانیاں پہلو اور پیٹھ داغی جائے گی اور کہا جائے گا۔ کہ یہ وہی ہے جسے اپنے فائدے کے لئے تم نے اکٹھا کر رکھا تھا۔ بس چکھو اس چیز کو جسے تم لوگ جمع کرتے تھے۔"

تاریخ اسلام کے صفحات میں اس مرد قلندر کا سراپا آج بھی "زر" کے خلاف جہاد کرنے والوں میں سر فہرست ہے۔ جس کا نام تو "ابوذرؓ" تھا لیکن بقول ابن سعد۔ انھیں دنیاوی آسائش سے نفرت تھی۔ وہ کمبلوں کے خود ساختہ جھونپڑے میں رہتے تھے۔ ان کے متعلق خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ "جو حضرت عیسیٰؑ کے زہد سے اپنے دل کو مسرور کرنا چاہتا ہے۔ وہ ابوذر کو دیکھ لے۔"

عرب کے مشہور ڈاکوؤں کے قبیلے "بنی غفار" سے تعلق رکھنے والے نوجوان "جندب" نے کہیں سے اڑتی ہوئی یہ خبر سنی کہ مکے میں ایک نبی کا ظہور ہوا ہے۔ جو دنیا کو ایک خدا کی عبادت کرنے کا حکم دیتا ہے اس کے اخلاق کریمانہ کا چرچا ہے۔ وہ صادق و امین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے نوجوان "جندب" جو اپنے قبیلے کے برے افعال سے نفرت کرتا تھا۔ اور اپنی گزر اوقات بھیڑ بکریاں چرا کر کرتا تھا۔ اپنے دل میں ایک عجیب امنگ اور آرزو کو ابھرتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ اس کا اشتیاق روز بروز بڑھنے لگا۔

آخر وہ ایک دن مکے کی جانب چل پڑا۔ طویل مسافت کے بعد مکے پہنچا۔ یہ پر صعوبت سفر اسے ہدایت کی بلند منازل تک لے آیا۔ وہ تاریکی سے روشنی میں چلا آیا۔ یہ اس کے مقدر کی یاوری تھی۔ جو اسے کشاں کشاں راہ ہدایت پر لے آئی تھی۔ اس نے شمع رسالت کا دیدار کیا اور پروانہ وار اس کے حسن میں محو ہو گیا، اس کے دل کی دنیا بدل گئی۔ وہ حرم کعبہ میں داخل ہوا۔ اور کمال جرأت سے اعلان کیا۔ کہ بلاشبہ۔ یہ سچ ہے کہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں۔ اے لوگو۔ ان سے ہدایت حاصل کرو۔ ان کے حلقۂ اثر میں شامل ہو اور ان کی تعلیمات پر عمل کرو۔"

مخالف و ناموافق فضا میں یہ اعلان اس جرأت کا آئینہ دار تھا۔ جو صرف پختہ ایمان اور یقین سے پیدا ہوتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی سرمستی و بے خودی کو دیکھا۔ تو انھیں ان کے اپنے قبیلے کی طرف تبلیغ کی غرض سے بھیجا۔

وہ اس نعمت خداوندی کو لے اپنے قبیلے بنی غفار کی جانب لوٹ گئے۔ اور انھیں بتایا۔ کہ وہ ان کے لئے اک ایسے محبوب خدا کا پیغام لیکر آئے ہیں۔ جس سے افضل کوئی نہیں آسمانی کتب و صحائف جس نبیؐ کی آمد کی خبر دیتے تھے۔ وہ مکے میں موجود ہے۔ ان کے اس جذب و سرور ان کے اس انداز تبلیغ شیفتگی و وارفتگی نے اتنا اثر کیا کہ نہ صرف لوٹ مار کرنے والا قبیلہ بنی غفار، جلد ہی ایمان لے آیا۔ بلکہ قریب رہنے والا اک اور قبیلہ بنو اسلم بھی مسلمان ہو گیا۔

آپ دونوں قبیلوں کے معزز لوگوں کے ساتھ اپنے محبوب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رحمت دو عالمؐ نے مسرور ہو کر فرمایا: "خدا ان دونوں قبیلوں کی مغفرت کرے اور انھیں سلامت رکھے۔"

اس کے بعد ابوذرؓ حضور کی بارگاہ اقدس سے کبھی جدا نہ ہوئے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ایسا تقرب حاصل ہوا کہ آج بھی

ان کا نام اکابر صحابہ میں شامل ہے۔ اور ان کی قدر و منزلت بہ اعتبار مرتبہ انھیں اس محبت و اطاعت سے حاصل ہوا۔ جس میں وہ سرتاپا غرق تھے۔ روایت ہے کہ جنگ تبوک میں ابوذرؓ اپنے اونٹ کے کمزور اور کم رفتار ہونے کے باعث تین دن تاخیر سے پہنچے۔ آنحضرت صلعم نے دیکھا کہ بہت ہی پیاسے اور تھکے ہوئے ہیں۔ حضور صلعم نے صحابہ سے فرمایا کہ ابوذرؓ کو پانی پلاؤ۔ ابوذرؓ پیاس بجھا چکے تو اپنی چھاگل نکال کر حضورؐ کی خدمت میں پیش کی۔ آنحضرتؐ نے دیکھا کہ اس میں پانی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ابوذرؓ تمہارے پاس پانی تھا۔ تو تم نے اپنی پیاس کیوں نہیں بجھائی۔ ابوذرؓ نے وارفتگی اور شیفتگی سے فرمایا۔ کہ راہ میں مجھے ٹھنڈا اور شیریں چشمہ ملا تھا۔ میں نے اپنی پیاس بجھائی۔ میں نے اسے استعمال نہیں کیا ـــــ حضور ان کی اس محبت سے بہت خوش ہوئے اور انھیں دعا دی۔

انھیں حضورؐ سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے بارگاہ نبوت سے بے پناہ فیض پایا تھا۔ ان کے زہد و تقوے کی دھوم تھی۔ امیرالمومنین علی مرتضیٰؑ فرماتے ہیں کہ ابوذرؓ نے کچھ علوم ایسے حاصل کئے ہیں جن کے تحمل سے عام لوگ عاجز ہیں۔ آپ عموماً جذب و سرور کی کیفیت میں ڈوبے رہتے تھے۔ ہمہ وقت ذکر و فکر میں مشغول رہتے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ جب آپ بکریاں چرانے میں مصروف ہو جاتے تو اک جانب بیٹھ کر ذکر خداوندی میں مصروف ہو جاتے اور جنگلی درندے آپ کے ریوڑ کے قریب سے گزرتے لیکن کوئی نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔

حضرت ابوذرؓ غفاری فقر و قناعت کے عظیم علمبردار تھے۔ کلام اقبال میں ان کا ذکر عموماً اقلیم فکر کے بلند پایہ درویش کی حیثیت سے آتا ہے۔

آپ جادہ حشم کے متوالوں میں سے تھے۔ اپنی دنیا کو تم ہی لو۔ اور اسے خوب زور سے تھامو ہمیں اس کی ضرورت نہیں ـــ" وہ عموماً کہا کرتے تھے۔ کہ امرا مجھے فقر و افلاس سے ڈراتے ہیں۔ حالانکہ مجھے فقر تونگری محبوب ہے۔

ایک بار امیر معاویہ نے آزمائش کی غرض سے کہ ابوذرؓ جو کچھ کہتے ہیں۔ ان کی خدمت میں کئی ہزار اشرفیوں کی ایک تھیلی شام کو بھیجی لیکن صبح ہوتے ہی اپنے غلام کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا۔ کہ وہ تھیلی واپس کر دیجئے۔ آپ وہ تھیلی واپس کر دیجئے۔ آپ کے نام ایک دوسری تھیلی ہے۔ ابوذرؓ نے جواب دیا کہ وہ تھیلی اب ہمارے پاس کہاں وہ جن کا حق تھا۔ ان کے پاس پہنچ گئی۔ غلام نے ابوذرؓ کے قریب رہنے والوں سے معلوم کیا۔ تو پتہ چلا کہ ابوذرؓ نے اشرفیاں وصول کرتے ہی حاجت مندوں میں بانٹ دی تھیں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا تھا "آسمان نے سایہ نہیں کیا اور زمین نے بوجھ نہیں کیا اور زمین نے بوجھ نہیں اٹھایا۔ کسی ایسے شخص کا، جو ابوذر سے زیادہ سچا ہو" ان کی حق گوئی اور بیباکی کے ذیل میں اک واقعے کا ذکر عموماً کیا جاتا ہے۔ کہ جب امیر معاویہ نے اپنا شاندار محل الخضر تعمیر کرایا۔ تو حضرت ابوذرؓ سے پوچھا کہ یہ محل کیسا ہے۔ انھوں نے بے اختیاری سے فرمایا "اگر تم نے اسے لوگوں کے مال سے بنایا ہے۔ تو یہ خیانت ہے۔ اگر اپنے مال سے بنایا ہے تو یہ اسراف ہے"

آپ جہاں بھی تشریف لے جاتے لوگ آپ کے وعظ و نصیحت سننے اور آپ کی زیارت کے شوق میں دور و نزدیک سے چلے آتے اور آپ کی بصیرت افروز گفتگو سے مستفیذ ہوتے۔ خود ابوذرؓ فرماتے ہیں "میں جہاں جاتا ہوں۔ لوگوں کا مجھ پر اس قدر ہجوم ہوتا ہے جیسے انھوں نے مجھے کبھی نہیں دیکھا"

آپ کی تمام زندگی اسلام کی تبلیغ اور اس کا عملی نمونہ پیش کرنے میں گزری۔ آپ نے ربذہ کے مقام پر انتقال فرمایا۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ میرے غسل و کفن کا انتظام وہ شخص کرے جو نہ تو کسی صوبہ کا والی ہو ـــ نہ خائن نہ ڈاکو، بلکہ اپنی محنت کی کمائی سے گزر اوقات کرتا ہو۔

حضرت ابوذرؓ نے اپنی زندگی کو رسول مقبولؐ کے ارشادات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اور وہ ان اقوال زریں پر عمر بھر عمل پیرا رہے جو ہادیٔ برحق نے انھیں تعلیم فرمائے تھے اور جو مذہب اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ ابوذرؓ فرماتے تھے۔ میرے محبوب نے مجھے پانچ باتوں کی وصیت کی ہے۔ مسکینوں پر مہربانی کروں اور انہی کے ساتھ نشست و برخاست رکھوں۔ ہمیشہ اپنے سے ابتر حال والوں پر نظر رکھوں اور اپنے سے بہتر حال والے کو نہ دیکھوں۔ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کروں سچ بولوں اگرچہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ اور کہتا رہوں کہ حق سے باز نہیں رہ سکتا۔ نہ فرمانبرداری پر قادر ہو سکتا ہوں مگر خدا کی مدد [illegible]

جڑیں

صالحہ خاتون

"میں ہمیشہ تمہارے بہت پاس رہا ہوں۔ اتنے قریب کہ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہو سکا۔ شادی کے بعد معلوم ہوا کہ تم اتنی دور نہیں جانا چاہتی تھیں۔ تم نے بابا کے حکم کو مانا ضرور، یہ بابا کی تربیت کا اثر تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا گیا لیکن دوسرے ہی لمحے جب مجھے بابا کا خیال آتا تو میرے دل کو ایک گونہ اطمینان ہوتا کہ یہ فیصلہ بابا نے کیا تھا اور بابا سے زیادہ کون ان کی بیٹی کو سمجھ سکتا ہے۔ وطن سے دور ہو کر تم شدید قسم کی بے چینی کا شکار ہو گئیں۔ میں سب کچھ محسوس کرتا تھا۔ میں نے کبھی تمہارے محسوسات میں مخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت صورت ایسی تھی کہ تم اسے میری محبت کے بجائے خود غرضی تصور کرتیں۔ بابا سے تمہاری جدائی کو میں نے اچھی طرح محسوس کیا۔ اور تیرہ سال تک میں ایک قسم کے احساس جرم میں مبتلا رہا۔ ہمارے بچے ہوئے تم ان پھولوں کی نگہداشت کے لئے وقف ہو گئیں میں زندگی کی بھیڑ میں اکیلا تھا، بالکل تنہا۔ تمہاری رہی سہی توجہ سے بھی محروم ہو گیا۔ تاہم یہ دیکھ کر میں اپنے دل میں ٹھنڈک کی لہر دوڑتی محسوس کرتا کہ تم نے میرے بچوں کی پرورش اور تربیت انہی خطوط پر کی ہے۔ جس پر میں نے چاہا تھا۔ ہر چند ہم دونوں نے کبھی مل بیٹھ کر اپنے بچوں کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ مگر ہمارے درمیان ایک غیر محسوس قسم کی مفاہمت تھی۔ تمہیں یاد ہے۔ میں نے وہ ریکارڈ چھپا دیا تھا جس میں بابل کے گیت تھے اور تم ایک شام یہ گیت سنتے سنتے بے سدھ ہو گئی تھیں، اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر تم نے مجھ سے وہ ریکارڈ دوبارہ نہیں طلب کئے۔ شاید تم مجھ سے احتجاج کرنا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ مگر تم نے اپنے گرد جو حصار بنا لیا تھا اسے توڑنا ضروری تھا۔ میں اچھی طرح باخبر تھا کہ میری غیر موجودگی میں تم روزانہ یہ گیت سنا کرتی تھیں اور روتی تھیں۔ اپنے آپ کو مظلوم سمجھنا بھی ایک قسم کی خود اذیتی ہے۔ تمہیں میری بات بری تو نہیں لگ رہی ہے۔

تمہیں [illegible] تمہارے سب کچھ سنانا چاہتی ہوں۔"

اور میں بھی سب کچھ سنانا چاہتا ہوں۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو اپنے دل کا حال نہیں سنایا صرف نباہ کرتے رہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم تم اس غیر مطمئن اور جبر کی کیفیت سے نہ گزرتیں ممکن ہے اس میں میری غلطی ہو۔ یا ہم دونوں قصوروار ہوں۔ بہرحال ان پانچ دنوں میں میں نے تمہارا جو روپ دیکھا ہے اس سے میرے ذہن پر چھائے بادل چھٹ گئے ہیں ہیں۔ جیسے شدید حبس کے بعد خوب تیز بارش سے پہلے کی ساری ناگواریاں ساری بے چینیاں اور گھٹن ٹھنڈی ٹھنڈی بوندوں میں جذب ہو جائیں۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ بابا کتنے زیرک تھے کتنے دوراندیش تھے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ بابا نے تمہارا غم کچھ کم کیا ہوگا۔؟ نہیں۔ وہ بہت اعلیٰ ہمت کے مالک تھے۔ میں نے تمہیں وہ خطوط نہیں دکھائے جو بابا نے مجھے لکھے ہیں۔ ہر خط میں تمہارا خیال رکھنے کہ تمہیں خوش رکھنے کے لئے اتنی ڈھیر ساری نصیحتیں ہوتی تھیں ایک ایک لفظ پیار و چاہت کے اتھاہ جذبوں میں ڈوب کر لکھا گیا تھا۔ میں بابا کی تڑپ کو محسوس کرتا تھا۔

"میں تمہاری حالت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہوں۔ یہاں جو کچھ ہوا ہے تمہاری امیدوں کے خلاف ہوا ہے۔ مگر ساری باتیں اس طرح وقوع پذیر نہیں ہوتیں جس طرح ہم چاہتے ہیں اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہے۔ جس کے گھمانے سے کایا پلٹ جائے۔ تم نے تو ہمیشہ حالات سے سمجھوتہ کیا ہے ایک اور سہی۔ ہم ساری چھٹیاں یہیں کیوں گزاریں۔ بابا کا کچھ حق تمہارے اوپر بھی تو ہے۔ تم ادا نہیں کرو گی؟"

میں نے نایاب کا ہاتھ تھام کر اقرار کیا ہے۔ پتہ نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں آج اس شخص کے سامنے اپنی شخصیت کی ساری جہت کے ساتھ آجاؤں۔ اپنی انانیت کے حصار سے باہر نکل کر تسلیم کروں کہ میں نے اس سے شدید محبت کی ہے۔ وہ ساری باتیں جو اس نے ابھی مجھ سے کہی ہیں ان سب باتوں کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ میں نے نایاب سے بے پناہ محبت کی ہے۔

"بابا واقعی بہت عظیم انسان تھے نایاب! انہوں نے بہت صحیح فیصلہ کیا تھا۔ (اگر میں یہ کہوں کہ یہ خط دیکھنے کے بعد مجھے اپنے آپ سے نایاب سے حجاب آرہا ہے تو کیسی عجیب بات ہوگی۔)

وہ ساری رات ہم نے کس طرح تاروں کو تکتے ہوئے گزار دی، صبح ناشتے کے بعد [illegible]

چھوٹی بھابھی نے رات کے کھانے کے لئے کہا ہے کیسا عجیب لگ رہا ہے مجھے کبوتروں کی طرح ایک ہی کوٹھری میں اپنی اپنی کابکوں میں بند یہ لوگ بھی ویسے ہی ہو گئے ہیں۔

ناشتے کے بعد میں بڑی بھابی کے ڈرائنگ روم میں آگئی ہوں۔ دیوار کی الماری میں بہت ساری نادر قسم کی آرائشی چیزیں سجی ہیں۔ بھابی کے انتخاب ہمیشہ سے بہت اچھوتے رہے ہیں۔ ایک دم مجھے یاد آتا ہے۔ ایک ننھا سا سنگ مرمر کا بنا ہوا تاج محل جو بابا کے ایک دوست نے مجھے تحفے میں دیا تھا۔ نظر نہیں آرہا۔ میں نے روبی سے جو ان چیزوں پر سے گرد جھاڑ رہی ہے اس کے بارے میں پوچھا۔

"وہ ایک دن صفائی کرتے ہوئے نانی کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔"

چلو وہ پتھر کا تاج محل تھا۔ یہاں تو گوشت پوست کے بنے ہوئے بڑے بڑے محل آن کی آن میں کرچی کرچی ہو جاتے ہیں اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا۔

"آنٹی آپ نے اسے دیکھا" روبی نے ایک مندر کے خوبصورت ماڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی بہت خوبصورت ہے" میں نے کہا۔

"یہ صوبہ بہار کے شہر گیا۔ میں واقع بدھ مندر کا ماڈل ہے۔ ڈیڈی نے بتایا تھا کہ انھوں نے یہ مندر دیکھا ہے۔ بہت بڑا ہے۔ اس کے ساتھ ایک پارک بھی بنایا گیا ہے جہاں دنیا بھر میں اگنے والے ہر قسم کے پھول لگائے گئے ہیں۔ ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔"

"ہاں۔ میں نے بھی دیکھا تھا وہ بدھ مندر — مگر میں نے تو تاج محل بھی دیکھا تھا۔ ایک بڑی سی تصویر فریم کرا کے لگائی تھی۔ میں نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ مزار مبارک کی وہ خوبصورت تصویر کہاں گئی۔ مجھے خوف آنے لگا۔ آگے اب اور کچھ استفسار کی گنجائش نہیں رہی کہ بہت سی باتیں پوچھنے کی نہیں سمجھنے کی ہوتی ہیں۔

دوپہر کا کھانا دوسرے کا یک میں کھانے کے بعد شام کو ہم شہر کی سیر کرنے کو نکلے۔ بیچ بازار سے گزرتے ہوئے مجھے ٹھیلے پر رکھے تازے تازے امرود دکھائی دیئے۔ میں نے گاڑی رکوا لی۔ نایاب بھی میرے ہمراہ باہر آگئے۔ اپنی پسند کے دو دو سیر امرود چھانٹ کر میں نے تلوانے۔ پیسے دے کر لفافہ تھاما تو یکایک آنکھوں کے سامنے کوندا سا لپک گیا۔ میرے ہاتھ سے لفافہ چھوٹ کر ٹھیلے پر گر گیا۔ میں تیزی سے واپس مڑ گئی۔ ٹھیلے والا حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو چلنے کا حکم دیا۔

"ممی آپ نے امرود واپس کیوں کر دیئے"
رشیق نے مجھ سے سوال کیا۔

"بیٹے وہ اچھے نہیں تھے" نایاب نے جواب دیا۔

"پھر آپ نے پیسے کیوں دے دیئے"

"بیٹے وہ غریب آدمی تھا بیچارا۔ اسی لئے" نایاب نے مجھے جواب دہی سے بچائے رکھا۔ میں نے شکر کا سانس لیا۔ میں نے ہمیشہ بابا کے ہاتھ کے امرود کھائے تھے۔

جب سے میں یہاں آئی ہوں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ نعمان بھائی کی حالت اچھی نہیں ہے۔ ان کے پاس گاڑی نہیں ہے۔ ان کے بچے اپنے "پڑوسیوں" کے مقابلے میں کمتر درجے کے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ ان کے بچے دوسرے بچوں کے آگے دبے دبے سے لگتے ہیں۔ بھابی کی میز پر پھلوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے۔ نعمان بھائی بابا کے سگے بیٹے نہیں تھے۔ خالہ اور خالو جان موٹر کے حادثے میں ہلاک ہو گئے تو بھابو تین سال ننھے نعمان کو اپنے ہاں لے آئیں۔ گھر میں اس وقت کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا۔ میں برہان بھائی سے تقریباً دس سال چھوٹی ہوں۔ نعمان بھائی کے آنے کے سات سال کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ بابا اور بھابو نے نعمان کو بہت محبت سے پالا تھا۔ عرفان بھیا اور برہان بھائی کے برابر درجہ دیا تھا اور ترکے میں سے مساوی حصّہ بھی۔

بابا نے میرے نام ساٹھ ہزار کی رقم اپنے اکاؤنٹ میں چھوڑی ہے، میں نے بابا اور بھابو کی قبروں کے گرد پختہ دیواریں کھنچوائیں۔ سنگ مرمر کے بابا کے من جیسے سفید پتھر کے کتبے نصب کرائے۔ ۱۵ نومبر کو بابا کی برسی پر میں نے قرآن خوانی کرائی۔ یتیم خانے میں دیگ بھجوائی۔ کپڑے تقسیم کئے۔ کچھ رقم میں نے شکور میاں کے اکاؤنٹ میں جمع کرائی ہے۔

"ہم تو وہاں رہتے ہیں جہاں خیرات بھی قبول نہیں ہوتی۔ شکور میاں، ہر سال ان پیسوں میں سے بابا اور بھابو کی برسی کے موقع پر غریبوں میں کھانا تقسیم کرا دینا۔ ایصال ثواب کے لئے۔ اور کس طرح انھیں اپنی محبت کا یقین دلا سکتے ہیں" میں رو پڑی ہوں۔

قرآن خوانی کے موقع پر دور و نزدیک کے بہت سارے عزیزو

رشتے دار جمع ہوئے ہیں۔ خاندان کی نسبتاً پسماندہ عورتیں مجھے بڑے رشک سے دیکھ رہی ہیں۔ یوں جیسے میں اس دنیا کی باشندہ نہیں چاند سے اتری ہوں۔ میرے کپڑے ہاتھوں سے چھوکر دیکھ رہی ہیں میری قسمت پر رشک کر رہی ہیں۔ ہر شخص مجھ سے دعوت کرنے کا خواہشمند ہے۔

"کرن تمہاری ساڑھی بہت پیاری ہے۔ ایسا کپڑا یہاں نہیں ملتا" میری ہم زاد نے میری ساڑھی کو چھوتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پسند ہے تو لے لو"

(اب میں کس کس کے لئے کیا کیا اٹھا لاتی۔ خاندان میں تو اتنے لوگ تھے کہ ہر ایک کے حصے میں ایک دھاگہ بھی لانا چاہتی تو کم ہی پڑتا)

"تم کیا پہنو گی" اس نے تکلفاً کہا۔

"میری فکر نہ کرو" میں نے اپنے ہمراہ لائے ہوئے سارے لباس اور وہاں کی دیگر قابل استعمال اشیاء ان لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ نایاب کے کپڑے بھی میں نے دلوا دیئے ہیں۔ ہمارے لئے بھیا نے کپڑے بنوائے تھے ہم نے وہی پہن لئے خود میں نے بھی یہاں سے اپنے نایاب اور بچوں کے لئے ڈھیر سارے کپڑے لے کر سلوائے تھے۔

"لوگ تو باہر سے کپڑے لاتے ہیں اور تم یہاں سے کپڑے سلوا کر لے جا رہی ہو" صغریٰ نے میرے ہاتھ سے سینے کے لئے کپڑے لیتے ہوئے کہا۔

"اس لئے کہ ہم اس چیز کی قدر کرتے ہیں جو ہماری دسترس سے باہر ہو"

"تم ابھی تک بالکل ویسی ہی ہو۔ ذرا نہیں بدلیں" میری ماموں زاد بہن صغریٰ نے کہا۔

"ہاں میری مٹی بھی بڑی عجیب ہے۔ طوفان کے ہر تھپیڑے نے مجھے صیقل کیا ہے ورنہ لوگ تو ہوا کے ذرا سے جھونکے سے بکھرنے لگتے ہیں" میں یہ کہنا چاہتی ہوں مگر زیر لب کہتی ہوں۔ دو دن کے لئے تو آئی ہوں۔ خواہ مخواہ کسی کے نشتر چبھونے سے فائدہ؟

وہ رقم جس پر مجھلی بھابی کو اعتراض تھا کہ بابا نے اپنی بیٹی کو دے دی۔ اس رقم کی ایک پائی بھی میں نے اپنے آپ پر خرچ نہیں کی۔ بس ہزار جو بچ گئے تھے وہ میں نے نعمان بھائی کو دے دیئے۔ اپنے کاروبار میں لگا لیں۔ میں نے اپنا کمرہ بھی کھول دیا ہے۔ نعمان بھائی سے کہہ دیا ہے کہ نہ خواہ مخواہ تنگی میں نہ رہیں بند اس کمرے کو استعمال میں لے آئیں۔ آخر میں اپنے بابا کو اور کس طرح خراج تحسین پیش کر سکتی ہوں؟

تین ماہ کے قیام کے بعد میں کل واپس اپنے ٹھکانے پر جا رہی ہوں۔ شام ہوتی ہے تو پرندے گھونسلوں کا رخ کرتے ہیں میرے بچوں نے بھی جی بھر کر اپنے وطن کی سیر کی ہے۔ انھیں پاکستان بہت پسند آیا اور آج شام میں آخری مرتبہ بابا سے ملنے جا رہی ہوں۔ جب سابق میں اور دوسرے بابا کے پاس نایاب، ربوسہ اور رشیق کو احتراماً کھڑے دیکھ رہی ہوں۔ نایاب نے ہاتھ اٹھائے اور ربوسہ اور رشیق نے بھی ان کی پیروی کی۔ میں بے دم ہو کر سیٹ کی پشت سے لگ گئی ہوں تاکہ کسی طرح آنسو رک رہے ہیں یہ رواں ہے کہ بہتا چلا آ رہا ہے۔

"ما آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ اگلے سال ہم پھر بابا سے ملنے آئیں گے" ربوسہ نے میرے گلے میں باہیں ڈال کر مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔

"ما! میں آپ کو اپنے ہوائی جہاز میں اڑا کر لاؤں گا" ننھے رشیق نے ہاتھ کے اشارے سے ہوائی جہاز اڑا کر بتایا۔ میں نے دونوں کو بھینچ لیا۔ میرے بچے مجھے چپ کرانے کی کوشش میں خود بھی رو پڑے ہیں تبھی میں نے کار کے دروازے میں نایاب کو دیکھا بے اختیار میرا دوسرا ہاتھ نایاب کی طرف بڑھ گیا۔ ہم چاروں ایک دوسرے کے گلے سے لگے تھے کہ میں نے بابا کو دیکھا۔ میں اپنے سر پر بابا کا ہاتھ، وہ مخصوص لمس محسوس کیا۔ میری ساری تڑپ سارا کرب اس لمس میں جذب ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے سینے پر جو بھاری پتھر کی سل رکھی تھی وہ آپ ہی آپ اٹھ گئی ہے میں ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔

شاید بابا کی دعا تھی کہ میں نارمل حالت میں آج شام کی فلائٹ سے جا رہی ہوں۔ میرا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا تھا اور میں تین ماہ میں ایک رات بھی سکون سے نہیں سوئی تھی۔

ایئر پورٹ جاتے ہوئے راستے میں ثوبیہ نے مجھ سے پوچھا ہے "آنٹی آپ پھر کب آئیں گی؟"

"آؤں گی۔ جب مجھے میری جڑیں اپنی جانب بلائیں گی درخت کی شاخیں پھیل کر کتنی ہی دور کیوں نہ چلی جائیں تنے کے ساتھ ان کا رابطہ نہیں ٹوٹتا۔ پرندے ہر سال رزق کی تلاش میں نسبتاً گرم علاقوں میں چلے جاتے ہیں مگر کبھی انھیں اپنے علاقے کی یاد آتی ہے۔ وہ اسے بھولتے نہیں جب تک میں زندہ ہوں آتی رہوں گی۔ میرے بعد میرے بچے آئیں گے۔ آتے رہیں گے۔ جب تک انھیں اپنی جڑیں یاد رہیں گی۔"

لیڈیز کلب

(گزشتہ سے پیوستہ)

بیگم انسراز

بیگم ناخدا: (سنجیدہ لہجہ میں سب کو مخاطب کرتی ہیں) یہ کتنے شرم کی بات ہے بہنو! کہ ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل بھی اس طرح کا سلوک سسرال والوں سے روا رکھتی ہے۔

ایک ممبر: جہاں تک مسز فرید کا سوال ہے۔ واقعی ان کا رویہ بجا ہے لیکن سبھی بیویاں ایسی نہیں ہوتیں ان کی پریشانیوں کا تو کوئی حل ڈھونڈھنا ہی ہوگا۔

دوسری ممبر: جی ہاں جیسے رسولن بی صاحبہ اور شریمتی رستوگی نے حالات ہمارے ساتھ آپ نے بھی سنے بیگم ناخدا کیا ان کی مدد کرنا لیڈیز کلب کی ممبران کا اخلاقی فرض نہیں ہے۔

تیسری ممبر: بیشک ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مگر اس سلسلہ میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔

چوتھی ممبر: ہم مجبور و لاچار نہیں ہیں بہنو! ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ رسولن بی اور شریمتی رستوگی کے شوہروں کو اطلاعی نوٹس دیا جا سکتا ہے پھر بھی وہ نہ مانیں تو ان کا اور ان جیسے سبھی شوہروں کا مکمل سماجی بائیکاٹ کیا جا سکتا ہے (وقفہ وقفہ سے مختلف گروہوں کی مختلف رائیں)

"اس طرح تو وہ لوگ اور اینٹھ جائیں گے"

"اینٹھتے ہیں تو اینٹھ جائیں۔ کیا وہ نعوذ باللہ خدا ہیں ہمارے"

(اتفاقی و اختلافی رائیں بڑھتی ہی رہیں تو بیگم ناخدا مداخلت کرتی ہیں)

بیگم ناخدا: (میز پر ہاتھ مار مار کر سب کو خاموش کراتے ہوئے) خاموش ہو جائیے۔ للہ چپ ہو جائیے — بہنو! تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو کر میری بھی سن لیجئے — اس بیجا جوش و خروش سے کیا حاصل۔

(شور رفتہ رفتہ دھیما ہو کر ختم ہو جاتا ہے)

بیگم ناخدا: (اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے) اپنی توانائی بیجا اظہار میں ضائع نہ کر کے اچھے کاموں میں لگائیے — ہمیں اتفاق رائے سے کام کرنا ہے۔

کئی آوازیں: ہم متفق ہیں۔ ہم سبھی۔ ضدی ظالم مردوں کے خلاف اتحاد رائے سے ریزولیشن پاس کرتے ہیں کہ رسولن بی و شریمتی رستوگی جیسی خواتین پر سے پابندی ہٹائی جائے اور - - - - -

بیگم ناخدا: (سنی ان سنی کر کے) جن بہنوں نے آج کی میٹنگ میں حصہ لیا اور گھریلو لڑائی جھگڑوں کا خطرہ مول لے کر اپنے حالات سے ہمیں آگاہ کیا ان کا شکریہ ادا کرنے سے قبل میں انھیں اور ان جیسی بے شمار مجبور بیویوں کو صلاح دینا چاہتی ہوں کہ وہ ابتدائی حالات سے مایوس نہ ہوں۔ ہر رات کے بعد طلوع سحر ایک حقیقت ہے۔ اسی طرح ہر خزاں کے بعد موسم بہار آتا ہے۔ صبر و شکر اور قربانی مشرقی خواتین کے بہترین اسلحہ ہیں۔ کچھ ہی عرصہ میں آپ خود ہی محسوس کرنے لگیں گی کہ حالات آپ کی موافقت میں بدل رہے ہیں اور —"

ایک آواز: ہمیں آپ سے اتفاق نہیں۔ مجبور و بے زبانوں کو اور دبانا فطرت انسانی ہے۔ آپ اس طرح ظالم مردوں کو اور شہ دے رہی ہیں۔

بیگم ناخدا: آپ میری پوری بات تو سن لیجئے —

کئی آوازیں: نہیں ہمیں کچھ نہیں سننا ہے۔ اس وقت آپ ہماری نہیں مردوں کی نمائندگی کر رہی ہیں۔

شور و غل: کالی بھیڑ، ہائے ہائے۔

بیگم غضنفر: (غصہ سے) اس طرح آپ ایک معزز خاتون کی ہی نہیں بلکہ اپنے ہی کلب کی صدر کی توہین کر رہی ہیں۔ آپ سب کو شرم آنی چاہیئے۔

بیگم ناخدا: (بیگم غضنفر کو زبردستی چپ کراتے ہوئے) نہیں نہیں انھیں نہ ٹوکئے بیگم غضنفر جو یہ کہتی ہیں میں سننے کو تیار ہوں اس میں میری کوئی بے عزتی نہیں۔ (حاضرات کی طرف متوجہ ہو کر) ہاں بہنو آپ بے خوف و خطر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتی ہیں کوئی آپ کو روکنے کا حق نہیں رکھتا۔ میں بھی آپ سب میں سے ایک ہوں اگر اکثریت کی رائے یہی ہے تو مردوں کے خلاف اعلان جنگ میں میں آپ کے آگے آگے ہی نظر آؤں گی لیکن آغاز جنگ سے پہلے کمانڈر کو ہر پہلو پر غور کر کے انجام کے متعلق بھی طے کر لینا پڑتا ہے۔

کئی غصہ بھری آوازیں :۔ انجام کے متعلق کیا سوچنا ـــ سماجی بائیکاٹ کے نتیجہ میں ان فردوں کو ہمارے آگے گھٹنے ٹیکنا ہی ہوں گے۔ جیت ہماری ہی ہوگی۔ ورنہ ان کا کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سب حرام کردیا جائے گا۔

ربیعہ اور کئی لڑکیاں :۔ ارے واہ ـــ ہوگئے کھانا پینا حرام کرنے والے ـــ ہماری زندگی میں ہمارے بھائیوں پر یہ ظلم ہو۔ ممکن ہی نہیں۔ کیا ہم نہیں ہیں جو انھیں وقت پر کھانا پانی دے سکیں۔ ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھ سکیں۔

مسز فرید :۔ اے انھیں تو دیکھنا ذرا ـــ بڑی آئیں اپنے بھائیوں کی چہیتیاں ـــ

بیگم خضر :۔ (سنجیدہ لہجہ میں) اس آپسی سرپھٹول سے کیا فائدہ ہے بہنو۔ ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ کیا خود تمہیں اچھا لگے گا کہ تم تو گھر میں آرام سے کھاؤ پیو ہنسو بولو اور تمہارے شوہر بات کرنے کو ترسیں ایک وقت کے کھانے کے لئے ماں بہنوں کا منہ تکیں۔ کیا یہ ان کی محبت کا کھلا ثبوت نہیں کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے دن بھر کولھو کے بیل کی طرح لگے رہتے ہیں۔ نہ دن کو دن سمجھیں نہ رات کو رات۔ گرمی سردی برسات کے موسم میں جبکہ تم سب گھروں میں محفوظ بیٹھی رہتی ہو تب وہ جھلستی دھوپ۔ کڑاکے کے جاڑوں اور موسلا دھار بارش میں بھی اپنے کام میں رہتے ہیں۔ ساس نندوں کی اچھی بری سن کر تمہارا منہ پھول جاتا ہے اور تم شوہر کو طعنہ دیتی ہو کہ وہ تمہاری طرفداری کیوں نہیں کرتا انھیں چھوڑ کیوں نہیں دیتا۔

لیکن کبھی اس کے متعلق بھی سوچا کہ تمہارے شوہروں کو بھی تو باہر ہزار قسم کے آدمیوں سے سابقہ پڑتا ہے افسروں کی گرم سرد تلخ ترش سننا پڑتی ہے تب تم ان سے ہمدردی کیوں نہیں کرتیں کہ نوکری چھوڑ دیں۔

کئی آوازیں :۔ ارے واہ ـــ وہ نوکری چھوڑ دیں گے تو ہمیں کھلائے گا کون ـــ

بیگم ناخدا :۔ سچ کہتی ہو تم سب ـــ لیکن جب نوکری کرنا تمہاری دیکھ بھال کرنا تمہارے شوہر کا فرض ہے تو کیا تمہارا فرض نہیں کہ اس کو گھر پر سکون دو۔ تھکے ہارے شوہر کو گھر میں قدم رکھتے ہی باہر کی دوزخ کا خیال بھی نہ آنے دو ـــ بتاؤ کیا میں غلط کہتی ہوں کہ آج تمہارا شوہر جو کچھ ہے۔ وہ اپنے بل بوتے پر ہوگیا ہے یا اس کے والدین کی محنت و شفقت کا نتیجہ ہے۔ کیا تم سے شادی سے پہلے وہ لاوارث تھا اس کی ماں بہنیں اس کی دیکھ بھال نہیں کرتی تھیں جو تم آج اس کے سماجی بائیکاٹ کی بات کرتی ہو ـــ اگر تم اس زعم میں "بائیکاٹ" کے مشورہ پر عمل کروگی تو کیا وہ ماں بہنیں جو ہمیشہ سے اس کی ضروریات کا خیال رکھتی تھیں اب نہ رکھیں گی۔ کیا سچ مچ اس بائیکاٹ سے وہ مجبور و محتاج ہوکر تمہارے آگے سر خم کردے گا۔

ایک شرمندہ سی آواز :۔ آپ سچ کہتی ہیں یہ سماجی بائیکاٹ بیکار سی چیز ہے خود میں ہی اپنے بھائی کو بھابی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔ ایسے حالات میں ڈٹ کر بھائیوں کا ساتھ دوں گی۔

مسز فرید :۔ (چڑ کر) ارے واہ ابھی تو کہہ رہی تھیں کہ شوہر کا بائیکاٹ ضرور کریں گی۔

وہی آواز :۔ ہاں شوہر کا بائیکاٹ ضرور کرتی لیکن بھائیوں کا نہیں ـــ خود آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے کیا اپنے بھائی کو ان حالات میں بے یار و مددگار چھوڑ دیں گی۔

مسز فرید :۔ (دانت پیس کر) ہاں ضرور چھوڑ دوں گی۔

ربیعہ :۔ (طنزیہ) کیا اس لئے کہ وہ آپ کو فرید بھائی کی عزت کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

مسز فرید :۔ تم چپ رہو بی جمالو ـــ

بیگم ناخدا :۔ مسز فرید اب میں آپ سے براہ راست سوال کرتی ہوں۔ کبھی آپ نے اپنا محاسبہ تو ضرور کیا ہوگا۔ کہیں آپ احساس کمتری کا شکار تو نہیں یا بچپن سے ہی آپ نے دوسروں کی نصیحتوں کو طعنہ تو نہیں سمجھا۔ کیا آپ کے دیگر بھائی بہنوں کے شریک حیات آپ کے اپنے شریک حیات سے صورتاً بہتر تو نہیں یا آپ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی خوابوں کی دنیا میں خوبصورت سا بانکا سجیلا ہیرو ٹائپ آئیڈیل تو نہیں سجا رکھا تھا۔

مسز فرید :۔ احساس کمتری و برتری تو میں جانتی نہیں۔ رہی آئیڈیل کی بات تو کون سی لڑکی ایسی ہے جس کے سینے میں خواب نہیں پلتے۔ جن کے سینوں میں آئیڈیل نہیں سکتے۔

بیگم ناخدا:۔ معلوم ہوتا ہے آپ ان بے شمار بیوقوف لڑکیوں میں سے ایک نہیں ہیں جو فلموں اور ناولوں کے ہیرو کو حقیقی دنیا میں تلاش کرتی ہیں۔ ناول کے ہیرو کی بابت تو میں نہیں جانتی یہ مصنفوں کو معلوم ہوگا لیکن فلمی ہیرو کے متعلق ضرور بتا سکتی ہوں کہ وہ جیسے پردۂ سیمیں پر نظر آتے ہیں اصلی زندگی میں اس سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ پردۂ فلم کا ہر دلعزیز ہیرو جب شہر کی سڑکوں اور بازاروں سے گذرتا ہے تو ایک عام محتاج کے برابر سے گذرنا بھی کسرِ شان سمجھتا ہے ان کے کردار کی اصلیت ہوٹلوں اور شراب خانوں سے جانی جا سکتی ہے اور رنگ روپ۔ تو وہ مصنوعات کا مرہونِ منت ہے تو پھر ہم سیدھے سیدھے میک اپ باکس سے محبت کیوں نہ کرنے لگیں یا پھر اس کیمرہ مین کی بلند خیالی کے عاشق کیوں نہ ہو جائیں جو کہانی کار کے خاکہ میں خاص زاویہ سے رنگ بھر کر ایک معمولی سے اداکار کو خوبصورت آئیڈیل بنا دیتا ہے۔

(مسز فرید گردن جھکائے ساڑی کا آنچل دانتوں سے چبا رہی ہیں ان کی حالت کا اندازہ کر کے بیگم خضر موضوع بدلنے کی کوشش کرتی ہیں)

بیگم خضر:۔ مگر یہ آئیڈیل ہر ایک کا مرض نہیں۔ رسولن بی اور شریمتی رستوگی جیسی خواتین کے مسائل تو الگ ہی ہیں۔ کیا اس پر کچھ روشنی نہیں ڈالیں گی آپ ـــ

بیگم ناخدا:۔ مسز فرید کا مسئلہ نفسیاتی مسئلہ تھا جو کہ زمانہ تعلیم میں میرا خاص موضوع رہا ہے اس لئے میں نے اس کی گرہ کھول دی۔ اب بیگم جہاندار کو کچھ بولنا چاہئیے وہ تو شروع سے ہی لب سیئے بیٹھی ہیں۔

کئی آوازیں:۔ جی ہاں بیگم صاحبہ اب آپ کچھ فرمائیں۔

بیگم جہاندار (کھنکھار کر گلا صاف کرتی ہیں) معزز مہمانوں کی فرمائش اور محترمہ صدر صاحبہ کے حکم سے میں بھلا روگردانی کیسے کر سکتی ہوں، فرمائیے کس موضوع پر مجھے بولنا ہوگا۔

بیگم خضر:۔ رسولن بی صاحبہ اور شریمتی رستوگی کے مسائل کا حل کیا ہو سکتا ہے اس کے متعلق ارشاد فرمائیں ـــ

بیگم جہاندار (رسولن بی سے) بیٹی اگر تم مجھے اجازت دو تو میں پہلے شریمتی رستوگی سے دو باتیں کر لوں۔

رسولن بی:۔ بیگم صاحبہ آپ اس طرح کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہی ہیں ـــ آپ بخوشی شریمتی رستوگی سے گفتگو فرمائیے ہو سکتا ہے اس میں میرے لئے بھی کوئی سبق ہو۔

سفینۂ حیات:۔ آفریں ہے بہن تم پر کہ دوسروں کو کی جانے والی نصیحتوں سے تم سبق حاصل کرتی ہو۔ اگر ہم سب ایسی ہو جائیں تو غلطیوں کی اصلاح خود بخود ہوتی رہے۔

بیگم جہاندار:۔ (شریمتی رستوگی سے) بیٹی تمہارے بیان سے میں نے یہی اندازہ لگایا ہے کہ تمہیں اپنی سسرال میں کھانے پینے پہننے اوڑھنے کی کوئی تکلیف نہیں ـــ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔

شریمتی رستوگی:۔ جی نہیں ـــ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے ایسی کوئی تکلیف نہیں ہے۔

بیگم جہاندار:۔ جیسا تم نے کہا کہ شادی کے بعد تمہارے پسندیدہ مشاغل میں تمہارے ساس سسر اور شوہر کی مداخلت جاری رہتی ہے ـــ تمہارا سارا دکھ صرف اتنا ہے۔

شریمتی رستوگی:۔ جی ہاں۔

بیگم جہاندار:۔ تو بیٹی کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ عرصہ اپنی سسرال والوں کی مرضی پر شاکر ہو جاؤ۔ بیشک اس طرح تمہیں روحانی تکلیف ہوگی لیکن اگر انجام خوشگوار نظر آئے تو آغاز میں سختیاں سہہ لینا بری بات نہیں۔

شریمتی رستوگی:۔ لیکن بیگم جہاندار یہ آپ کیسے کہہ رہی ہیں کہ انجام خوشگوار ہوگا۔

بیگم جہاندار:۔ ناپختہ ذہن سطحی حالات سے بہت جلد بیچین ہو اٹھتے ہیں بیٹی۔ لیکن تم تعلیمیافتہ ہو غصہ گرمی کو الگ کر کے غور کرو تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ ہر نئی نسل پرانی نسل سے باغیانہ خیالات رکھتی ہے۔

شریمتی رستوگی:۔ (جلدی سے) نہیں نہیں۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ اقتدار اپنے ہاتھ میں لوں۔ باغی خیالات میرے ذہن میں آ ہی نہیں سکتے۔ میں تو ایمانداری سے اقرار کرتی

ہوں کہ مسٹر رستوگی آج جو بھی ہیں اپنے والدین کی محبت شفقت محنت و مشقت کے نتیجہ میں ہیں میں تو صرف تھوڑی سی آزادی چاہتی ہوں۔

بیگم جہاندار:۔ یہی میں بتا رہی تھی) بیٹی کہ جیسی آزادی تم چاہتی ہو وہ بھلے ہی تمہارے لئے معمولی بات ہے لیکن تمہارے پرانے خیالات کے ساس سسر اسے باغیانہ انداز ہی سمجھیں گے۔ اگر تم اپنے والدین کے عمل پر غور کرو گی تو تمہیں یاد آئے گا وہ بیچارے تمہارے دادی کے سامنے کھل کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔

شریمتی رستوگی:۔ جی ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے دادا جی کے سامنے تو پاپا ہم بہن بھائیوں تک سے محبت کا برتاؤ نہیں کرتے تھے۔

بیگم جہاندار:۔ ٹھیک ہے —— پھر تو تمہیں اپنے دادا کے والدین کے بارے میں بتایا گیا ہوگا کہ اس زمانہ میں دن کے وقت بھی میاں بیوی نوکروں کی موجودگی میں ایک کمرہ میں اکٹھا نہیں ہو سکتے تھے۔ والدین اور بھائی بہنوں کی کیا بات ——

شریمتی رستوگی:۔ دادا جی کبھی کبھی غصہ میں پاپا کو بے شرم کہتے تھے کہ وہ ممی کو باورچی خانہ میں خانساماں کے سامنے دعوت کے کھانے سے متعلق تفصیلات بتاتے ہیں۔

بیگم جہاندار:۔ ہاں بیٹی اس وقت کی تہذیب یہی تھی اسی لئے میں کہہ رہی تھی کہ ہر نئی نسل پرانی نسل سے باغیانہ خیالات رکھتی ہے۔ پیڑھیوں در پیڑھیوں سے یہی ہوتا آیا ہے مگر رفتہ رفتہ اخلاقی قدروں کے بدلنے سے رسم و رواج میں تبدیلی آ رہی ہے اب حالات یہ ہیں کہ میاں اپنے والدین کے سامنے بھی ہنس بول لیتے ہیں لیکن ابھی اتنی تبدیلی وہ برداشت نہیں کر پاتے کہ بیٹے بہو کو آزادانہ سڑکوں پر گھومنے دیں گے —— ہاں تمہاری اگلی نسلوں میں یہ بات معیوب نہ سمجھی جائے گی۔ دراصل مشرقی تہذیب پر مغربی تہذیب کے رفتہ رفتہ اثر انداز ہونے سے یہ سب ہو رہا ہے کچھ دن صبر کرو پھر زمانہ تمہارا ہی ہوگا جو چاہے کرنا۔

شریمتی رستوگی:۔ مگر یہ تو زیادتی ہے کیا سیر و تفریح کی یہ عمر ہمیشہ یوں ہی رہے گی

بیگم جہاندار:۔ یہ تم نے کبھی سوچا کہ کیا ہماری پرانی نسل کی پختہ عادت آسانی سے چھوٹ سکتی ہے یا تم جیسی کم عمر نئی نسل کی ابتدائی عادت آسانی سے بدلی جا سکتی ہے؟ ؟ اور یہ بھی چھوڑو اگر تمہارے بھائی بھابی اسی طرح آزادی سے گھومنا چاہیں تو کیا تمہارے والدین اعتراض نہ کریں گے۔

شریمتی رستوگی:۔ جی جی ہاں بیشک۔ انھیں اعتراض ہونا چاہئے۔

بیگم جہاندار:۔ پھر بھی تمہارے بھائی ان کی مرضی کے خلاف چلتے رہیں تو۔۔۔

شریمتی رستوگی:۔ تو ممی پاپا کو سخت صدمہ ہوگا۔

بیگم جہاندار:۔ اچھا تو تم کس کا ساتھ دو گی۔ بھائی بھابی کا۔ یا ممی پاپا کا۔

شریمتی رستوگی:۔ (ہچکچا کر) میں تو ممی پاپا کی ہی دلداری کروں گی۔

بیگم جہاندار:۔ بس تو بات ختم ہو گئی بیٹی۔ جو تم ممی پاپا کے لئے چاہتی ہو وہی اپنے ساس سسر کے لیے کیوں نہیں چاہتیں۔ کیا اپنے والدین اور شوہر کے والدین میں کچھ فرق ہوتا ہے۔

ربیعہ:۔ (ہنس کر) لیجئے شریمتی رستوگی تو اپنے جال میں خود ہی پھنس گئیں۔

(سب ہنسنے لگتی ہیں۔ بیگم جہاندار بھی مسکرا دیتی ہیں۔)

بیگم جہاندار (مسکرا کر) خیر —— تمہاری دیگر شکایات میں یہ بھی شامل ہے کہ تمہاری ساس کو تمہارا ناول پڑھنا پسند نہیں۔ تو بیٹی یہ غلط بات نہیں — آج کل تو ہر طرح کے ناول لکھے جا رہے ہیں بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اچھے ناول کم اور برے ناول زیادہ ہیں۔

تم تو بچی ہو کیا جانو ایسے ناول اگر میں پڑھنے بیٹھوں تو اس عمر میں بھی پسینے چھوٹ جائیں۔ حالانکہ مصنف لکھتے ہیں ہمیشہ غلط نظریہ سے نہیں۔ لیکن اچھائی برائی کا موازنہ کرنے کے لئے برائیوں کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ کم سمجھ قاری لڑکے لڑکیاں انھیں اپنا لیتے ہیں اور معاشرہ میں عریانیت اور جرائم بڑھتے جاتے ہیں نا تجربہ کار ذہن ہرگز اچھے ناولوں کا انتخاب نہیں کر سکتے وہ تو وہی مواد پڑھتے ہیں جن میں انھیں دلچسپی ہو اور عمر کے تقاضہ سے اچھائیوں کے بجائے برائیوں میں کشش زیادہ ہوتی ہے اسی لئے اگر جہاندیدہ بزرگ اپنے چھوٹوں پر روک نہ لگائیں تو کچھ دنوں میں معاشرہ کی شکل ہی بدل جائے

آتے جاتے ۔

شرمیتی رستوگی :۔ (مسکرا کر) مگر میں تو کم عمر نا سمجھ نہیں ۔

بیگم جہاندار :۔ میری پیاری بیٹی ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وہ سب سے زیادہ عقلمند ہے حالانکہ یہ فطرت کے خلاف ہے کہ کوئی شخص پوری طرح سمجھدار ہو۔ کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نہ کوئی خامی ضرور رہتی ہے اور وہیں سے انسان برائیوں میں کشش محسوس کرنے لگتا ہے۔ یا آئیڈیل بنانے لگتا ہے۔ اور جب یہ آئیڈیل نہیں ملتا تو ۔۔۔۔۔

رسولن :۔ (بات کاٹ کر) تو ہماری بھابی کی طرح اپنے شوہر کے نام رکھنے ۔۔۔۔

مسز فرید :۔ (پوری بات سنے بغیر) اچھا اب چپ رہو۔ میں ویسے ہی شرم سے گڑی جا رہی ہوں ۔

بیگم جہاندار :۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم نے اتنی جلدی اپنی اصلاح کر لی ۔۔۔ خیر (شرمیتی رستوگی سے مخاطب ہو کر) ہاں تو بیٹی میں یہ کہہ رہی تھی کہ تم ناول پڑھو اچھے ناولوں کا انتخاب کر کے نہ صرف خود پڑھو بلکہ اپنی ساس کو بھی سناؤ یقیناً وہ اس سے خوش ہوں گی کہ تمہارا انتخاب اتنا بہترین ہے اور تمہارا ذہن اصلاح پسند ہے۔ تب وہی تمہیں پڑھا دادیں گی تمہاری سب سے بڑی ہمدرد بن جائیں گی ۔ کچھ عجب نہیں کہ اچھے ناول لکھنے کی صلاح بھی دیں ۔

شرمیتی رستوگی :۔ (منہ بنا کر) وہ تو شاید ایسی ہو بھی جائیں لیکن ان کے بیٹے صاحب کو مرچیں نہ لگنے لگیں گی جو قلمی دوستی میں بھی روڑے اٹکاتے ہیں ۔

بیگم جہاندار :۔ معاف کرنا بیٹی (سنجیدہ ہو کر) میں تو کہوں گی کہ وہ بہت اچھا کرتے ہیں۔ قلمی دوستی نادیدہ شخصیتوں کی آپسی گفتگو ضرور ہے لیکن ہر کوئی وہی نہیں ہوتا جو اپنی تحریر سے نظر آتا ہے کس کے دل میں کیا ہے کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ وہی تعریفی یا تنقیدی خطوط بعد میں پریشانی کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔ تم تو ناول افسانے پڑھتی ہو ایسے واقعات اکثر زیر بحث اور زیر تحریر لائے جا چکے ہیں ۔

شرمیتی رستوگی :۔ (جلدی سے) لیکن میں تو صرف صنف نازک سے خط و کتابت کرتی رہی ہوں۔ ممی پاپا اور بھیا نے بھی اسی کی اجازت دی تھی تو مسٹر رستوگی بھی کیوں اجازت نہیں دیتے ۔

بیگم جہاندار :۔ میری بھولی بیٹی تحریر کے پس پردہ کون جلوہ افروز ہے یہ تم یا میں کیسے جان سکتے ہیں۔ کیا زنانہ نام اور زنانہ تحریر صرف صنف نازک ہی کا ذخیرہ ہے۔ اس کو بھی اگر نظر انداز کر دیا جائے تو کیا یہ کچھ کم خطرناک ہے کہ تعریفی خطوط کا کچھ حصہ الگ کر کے اپنے مقاصد کے لئے کوئی استعمال کرے ۔

مس سفینہ حیات :۔ مثلاً

بیگم جہاندار :۔ (سفینہ حیات کو دیکھتے ہوئے) مثلاً یہ کہ آپ نے کسی محترمہ کو ان کی کسی کہانی ۔ نظم ۔ غزل ناول غرض کسی تخلیق کے سلسلہ میں تعریفی خط لکھ مارا کہ "آپ کے قلم میں جادو ہے جتنی خوبصورت تصویر ہے اتنے ہی خوبصورت خیالات ہیں ۔ میں تو آپ کی تحریروں کی عاشق ہوں" وغیرہ وغیرہ تو کوئی "فسادی ذہن" ان محترمہ سے یہ خط کسی بھی طرح حاصل کر کے اس "وغیرہ وغیرہ" والے حصہ کو حذف کر کے آپ کے والدین یا شوہر یا کسی بھی رشتہ دار کو بھیج سکتا ہے۔ پھر آپ کس کس کے سامنے صفائی دیتی پھریں گی ثبوت پیش کرتی رہیں گی کہ آپ نے یہ خط کسی "محترم" کو نہیں محترمہ کو لکھا تھا۔ اور پھر یقین کون کرے گا آپ کی بات کا۔ جبکہ تحریر آپ کی۔ خیالات آپ کے۔ اور قلمی دوستی کا الزام آپ کے سر ہے۔ تب کیا ملا آپ کو۔ مدتوں کی قلمی دوستی سے حاصل شدہ ذہنی آسودگی پل بھر میں روحانی خلش اور جگ رسوائی میں بدل جاتی ہے ۔

شرمیتی رستوگی :۔ مگر ایسا تو شاذ و نادر ہی ہوتا ہوگا۔ ورنہ قلمی دوستی کا طریقہ ہی رائج نہ ہوگا ۔

بیگم جہاندار :۔ جنگوں میں ایٹم بم کا استعمال شاذ و نادر ہی ہوتا ہے مگر ہر بڑے ملک نے ایٹم بم بنانے پر پابندی کی بات کیوں کی ہے

رسولن بی :۔ (جھرجھری لے کر) سچ مچ بڑی گہری بات بتائی بیگم صاحبہ نے۔ اب تو میں اپنی بہنوں کو بھی خطوط لکھتے وقت الفاظ کی ناپ تول کروں گی ۔

بیگم جہاندار :۔ (رسولن بی کی طرف پلٹ کر) بیٹی۔ تمہاری باتیں سن کر تو میں حیران رہ گئی ہوں۔ کون کہتا ہے کہ عقل و سمجھ

ادب و تمیز صرف دولت مندوں کی جاگیر ہے تمہاری باتوں سے سمجھداری کی بو آتی ہے رسولن بیٹی حیرت ہے کہ پھر بھی تم اپنے گھریلو مسائل حل نہ کر سکیں۔ کیا شکایت ہے تمہاری۔

رسولن بی:۔ (جلدی سے) اب کوئی شکایت نہیں ہے بیگم صاحبہ۔

مس شگفتہ حیات:۔ (حیرت سے) ارے۔ آپ نے تو مجھے بتایا تھا کہ آپ کے گھر والے آپ کو ساجھے کی بیٹی کہتے ہیں۔ بچہ بچہ کی زبان پر یہی ہوتا ہے اور اب آپ کہہ رہی ہیں کوئی شکایت نہیں ہے۔

رسولن بی:۔ سلطینہ بی بی۔ آج یہاں آکر میں نے سیکھ لیا کہ اپنی پریشانیوں سے کیسے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔ ان سبھوں سے میں ہی نپٹ لوں گی۔

بیگم نصر:۔ (پریشانی سے) مگر کیا کریں گی آپ۔ کہیں بات اور نہ بگڑ جائے۔

رسولن بی:۔ بات تو پہلے بگڑا کرتی تھی بیگم صاحبہ (شرمندگی سے) پہلے میں ایسے طعنوں پر غصہ کرتی تھی کہ میرا جہیز اگر ساجھے کا ہے تو واپس کر دو اس پر وہ لوگ اور ستاتے تھے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔

بیگم ناخدا:۔ اچھا —— پھر اب کیا ہوگا۔

رسولن بی:۔ (مضبوط لہجہ میں) اب سب کے ایسے طعنوں پر میں کچھ کہنے یا غصہ کرنے کے بجائے ہنس دیا کروں گی۔ جب کئی مرتبہ ایسا ہوگا تو وہ سب بھی بدل جائیں گے۔

(بیگم جہاندار نے بے ساختہ آگے بڑھ کر رسولن بی کو گلے سے لگا لیا)

بیگم جہاندار:۔ میرا دل خوش کر دیا بیٹی تم نے (ہاتھ سے کنگن اتار کر رسولن بی کو پہناتے ہوئے) تم نے ثابت کر دیا کہ عقلمندانہ فیصلے صرف ہم بزرگوں ہی کا وصف نہیں۔ یہ میری طرف سے تمہاری نذر ہے اپنی والدہ والد کو میرا سلام کہنا جنھوں نے تمہاری ایسی پرورش کی ہے۔

(سبھی خواتین رسولن بی سے ملنے اور مبارکباد دینے میں مشغول ہو گئیں)

بیگم نصر:۔ (کھڑے ہو کر) تو بہنو ہماری آج کی میٹنگ ختم ہوتی ہے۔ اگلی میٹنگ انشاء اللہ اگلے ماہ اسی تاریخ کو ہوگی۔

بیگم ناخدا:۔ (جلدی سے) مگر ان تمام خطوط کے مسائل تو رہ ہی گئے۔ ان سبھوں کو اعتراض ہوگا کہ انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

بیگم نصر:۔ ایسی کوئی خامی نہیں رہ گئی جو کوئی اعتراض کرے۔ دراصل آج کے جلسہ کا ایجنڈا انھیں خطوط کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا ان تمام خطوط میں جو شکایتیں تھیں وہ ہماری آج کی تین ممبران کی شکایتوں سے بہت کچھ ملتی جلتی تھیں اس لئے جب ان تین ممبران کے مسائل طے ہو گئے تو سمجھئے ان کے بھی طے ہو گئے جلسہ کی کارروائی کا حال ان تک پہنچ جائے گا وہ اس کی روشنی میں اپنی اپنی راہ خود متعین کر لیں گی۔

(لیڈیز کلب کی اگلی ماہانہ میٹنگ میں آپ کے مسائل بھی رکھے جا سکتے ہیں۔ پتہ وہی پرانا ہے۔ "معرفت حریم۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ" یا ڈی ۹، ۲۷ سروجنی نگر —— نئی دہلی ۱۱۰۰۲۳ —— اب اس ریکارڈ کیپر کو اجازت دیجئے۔ خدا حافظ)

رشتوں کے بندھن

خالدہ حمید

"ہم مرد بھی اوّل درجے کے منافق ہوتے ہیں اور یہ عورتیں پہلے درجے کی بیوقوف" سگریٹ کا گہرا کش لے کر اس نے عرشی کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ کتنے خلوص کتنی صداقت و فرماں برداری سے میرے پیار کا یقین کئے ہوئے ہے۔ کتنا آسان ہے اسے محبت کے نام پر دھوکہ دینا میرے معمولی سے محبت بھرے جملے پر جان جیسی قیمتی چیز فدا کرنے پر تیار ہے۔ بے ناعقل کی جگہ بھوسا بھرا..... اچھا بھلا جانتی ہے کہ میں شادی شدہ ہوں دو عدد بچوں کا باپ ہوں۔ (ہماری آزادی ہمیں جوان رکھتی ہے ان کی قید انھیں بوڑھا کر دیتی ہے) محبت اندھی نہیں ہوتی بلکہ اس میں انسان اندھے ہوتے ہیں جو بنا سوچے سمجھے ان راہوں میں سرپٹ بھاگ نکلتے ہیں ——— بیوقوف لڑکی ——— جو شخص ساری زندگی گزارنے والے ساتھی کے ساتھ دھوکہ کر سکتا ہے علاوہ دفتر میں چند گھنٹے اکھٹے رہنے والے ساتھی کے ساتھ کیا وفا کرے گا۔ شاید ان کی اندر کی سچائی ہر ایک کو سچا سمجھنے پر مجبور کرتی ہے۔ محبت اور برائی میں بلا کی کشش ہے کم بخت انسان سے خود بخود سرزد ہو جاتی ہے جیسے بھی محبت اور دولت کی ہوس جتنی بڑھاؤ بڑھیگی بھئی دیکھیں گھر میں اچھی خاصی بیوی موجود ہے۔ محبت و وفا کی پتلی ——— خوبصورت ہے بیں و مگر زندگی کو مزید رنگین و خوبصورت کرنے کے لئے یہاں ہوٹل کے پرسکون گوشے میں عرشی کے ساتھ محبت و سکون کی تلاش میں سرگرداں ہوں۔ رابعہ سمجھ رہی ہوگی کسی دفتری کام میں الجھا ہوں یا آج بھی صاحب نے میٹنگ بلائی ہے۔ تبھی لیٹ ہو گیا ہوں کبھی میری آنکھوں میں جھوٹ کا فرق محسوس کرنے کے لئے انسیں جھانکتی شاید اس لئے کہ بیوی شادی کے بعد آنکھوں میں نہیں جبیوں میں جھانکتی ہے۔ دوسرا سگریٹ لے کر بیرے کو چائے کا آرڈر دیا شادی کے بعد دیہا نے یہ صرف بیوی گھر اور بچوں کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہیں۔

کتنی خوش رہتی ہیں اپنے محدود سے حلقے میں کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔ قریب سے آنے والی پرفیوم کی خوشبو ابھی تک عرشی کے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔ شخصیت میں کتنا سلیقہ ہے۔ جدید تراش خراش سے پہنا لباس نت نئے اسٹائل سے بنے بال۔ رنگ برنگی چوڑیاں جسم سے اٹھنے والی خوشبو۔ ہلکی پھلکی باتیں (ایسی خوبصورت بھی نہیں مگر میں اسے چاند کہتا ہوں۔ (کیونکہ عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کی تعریف ہے اور وہ بھی اس کے حسن کی۔) یہ عورتیں بھی عجیب کودماغ ہوتی ہیں ——— شادی کے بعد کیسی بے ڈول اور بے ڈھنگی ہو جاتی ہیں جسم سے پرفیوم کے بجائے ہر وقت پیاز لہسن کی بو آئے گی۔ بے ڈھب سے کپڑے الجھے الجھے بالوں میں یوں پریشان ہوں گی جیسے ساری دنیا کا نظام یہی چلا رہی ہیں ماں بنتے ہی بیوی کو نجانے کہاں گم کر دیتی ہیں اور ہم اس روپ کی تلاش میں بھٹک جاتے ہیں۔ صرف میں ہی نہیں ——— ہم مردوں کی اکثریت ہر روپ میں دھوکہ اور جھوٹ کے ساتھ زندہ ہیں ——— ماں سے ٹیوشن کے بہانے سینما میں۔ بیوی سے دفتری کام کے بہانے ہوٹل میں۔ اور یہ ہیں کہ اپنے اعتماد و یقین کے قلعے میں مقید ہیں۔ ایک ہم مرد ہیں کہ دل میں کچھ ہے، دماغ کہیں اور ہے اور زبان کوئی الگ بیان جاری کر رہی ہے۔ لیکن ہوشیاری عقلمندی سے نبھاہ کر رہے ہیں ——— کتنی بھولی ہے عورت ——— کتنے خرانٹ ہیں ہم ——— یہ میری بیوی رابعہ اچھی خاصی شکل و صورت کی مالک تھی کنوارے پنے میں ایک شادی میں دیکھا تھا خوب نچ رہی تھی ——— تبھی تو تھوڑا سا اکڑنے کے بعد مان گئے تھے۔ یہ ٹیں ٹاں بھی یونہی نہیں کی تھی۔ ان دنوں ایک کزن ثوبیہ پر فدا تھے۔ اس کی خاطر دیوانے ہوئے پھرتے تھے۔ جیسے ثوبیہ نہ ملی تو مر جائیں گے ——— (ہماری ہر عشق میں یہی کیفیت ہوتی تھی) وہ بھی کچھ اسی قسم کے جذبات رکھتی تھی ایک دن نظر نہ آتے تھے تو موٹی موٹی آنکھیں رو رو کر سرخ کر لیتی تھی عجیب تھی وہ بھی کہاں ایک دن نہیں رہ سکتی تھی کہاں ساری زندگی کسی دوسرے کے ساتھ ہنستے مسکراتے گزار دیتی ہے۔ بلا کی قوت برداشت ہوتی ہے عورت میں۔ ہماری شادی پر کیسے کیسے خوبصورت گیت گا تی تھی ——— میں تو کہتا ہوں اگر عورت میں یہ برداشت نہ ہوتی تو قیامت کب کی آچکی ہوتی ——— ایک ہم مرد ہیں اپنے بھی وفادار نہیں۔ اپنے وجود سے بھی ہمدردی نہیں ہے۔ اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے سوچا۔ رابعہ کی بیوقوفی اور ناسمجھی سے لاپرواہی ڈھٹائی سے یہاں بیٹھا ہوں۔ عرشی کا داخلہ بھی پر لطف رہا۔

ہے۔ جیسے کسی یونیورسٹی میں جانا ہے۔ رابعہ نے راشن ختم ہونے کی خوشخبری گوش گزار کر دی تھی۔ گوگو کی ٹافیاں چاکلیٹ بھی ابھی خریدنی ہیں۔ رابعہ بھی بھائی کی شادی کے لئے کب سے کپڑوں کا مطالبہ کر رہی ہے۔ کتنی محبت کرتی ہے مجھ سے۔ کتنا اعتماد ہے اسے مجھ پر۔ میرے گھر کو جنت بنا کر رکھتی ہے۔ میرے بچوں کی کتنی جانفشانی سے پرورش کر رہی ہے۔ میرے تھکے ماندے وجود کو سکھ کی دولت بخشتی ہے۔ یہ اس کا فرض ہے نادان۔ اس کے بدلے کا وقت اور محبت کسی اور پر نچھاور کر دیتا ہوں۔ ہوٹلوں پر تفریح پر کتنا روپیہ اور وقت ضائع کرتا ہوں اور اس کے آگے ہر وقت تنگی وقت تنگیٔ جیب کا رونا روتا رہتا ہوں۔ میرے ہر جھوٹ کو کتنی سادہ لوحی سے سچ مان لیتی ہے۔ میں اس کی سب خوبیوں اچھائیوں سے آگاہ ہوں۔ خاوند کا تحفظ۔ گھر کی جنت بچوں کی دولت۔ اور کیا چاہیئے انھیں۔ اس سے آگے یہ بیوقوف کچھ سوچتی بھی نہیں۔ ان کی انتہائے پرواز بس یہی تین چیزیں تو ہوتی ہیں۔ وفا، محبت، اعتماد کے قلعے میں قید۔ ان کا کوئی ماضی نہیں ہوتا۔ حال خاوند کو سونپ دیتی ہیں۔ اور مستقبل بچوں کو۔ لطف آزادی میں ہے۔ لامحدود میں۔ محدود ہونے میں نہیں۔ زندگی محبت کرنے کا نام ہے محبت پھیلانے کی چیز ہے چھپانے کی..... اور یہ عورت بس ایک کے نام میں قید ہو کر ہمیں بھی قید کرنا چاہتی ہے اونہہ۔ سامنے ہوٹل کے دروازے سے بچوں کو داخل ہوتے دیکھ کر وہ چونکا۔ سنہرے چہرے آنکھوں کے آگے آکر مسکرا دیئے۔ گوگو۔ گوشی۔ پاکیزہ سی مسکراہٹ ہونٹوں پر آگئی وہ سب سے دھوکہ کر سکتا ہے ان معصوم روحوں سے نہیں۔ سب کچھ چھوڑ سکتا ہے۔ مگر اپنے بچے نہیں۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ بل ادا کر کے وہ جلدی سے باہر نکلا۔ ان کی محبت اور رشتے میں کتنی طاقت ہے کہ وہ اس رنگ و نور کے سحر کو توڑ نکلتا ہے۔ ان کی مسکراہٹ کے آگے اس کی خوشیاں۔ یہ ہوٹل۔ یہ خوبصورت ماحول۔ یہ سکون۔ یہ عرشی سب کتنے حقیر ہیں۔ کتنی مضبوط ڈور ہی ہے۔ اس بندھن کی جو روز شام کو کھینچ لیجاتی ہے۔ ان کی محبت میں اتنی طاقت اتنی کشش ہے کہ وہ کہیں گم نہیں ہو سکتا کہیں بھٹک نہیں سکتا۔ رابعہ۔ اسے میری محبت اور وجود کی اہمیت کا احساس کہاں وہ تو بس محبت و خدمت کرنا جانتی ہے۔ ویسے بھی لڑکی بیوی بن کر کشش کھو دیتی ہے۔ اسے مجھ پر اعتماد ہے تبھی تو میرا ہر بہانہ ہر جھوٹ کتنی صداقت سے مان لیتی ہے۔ شاید تبھی جھگڑا نہیں ہوتا ہمارا بہانہ سوچتے ہوئے اسے یقین تھا کہ وہ فوراً یقین کرنے گی اسی اعتماد کی عظمت پر تو وہ کھڑا تھا بیوی کی نظر دل بچوں کی نگاہوں میں بلند تر۔ گھر کے آگے کالی کار کھڑی دیکھ کر اس کو فوراً پتہ چل گیا کہ رابعہ کی چہیتی سہیلی فرزانہ اندر موجود ہو گی۔ وہ خوش ہوا۔ چلو اس کم بہانہ پاک۔ اب کیا بہانہ۔ ڈرائینگ روم کی جانب تیزی سے مڑا مگر اپنا نام سن کر اتنی ہی تیزی سے رک گیا۔ رابعہ ضبط تار رو رہی تھی یہ آواز اس کی بیوی گوگو گوشی کی ماں کی نہیں تھی۔ بھرائی آواز میں رابعہ کی اندر کی عورت بول رہی تھی وہ ساکت پشیمانی کے پاؤں پر کھڑا تھا۔

فرزانہ..... میں بھی گوشت پوست کی ایک لڑکی تھی۔ میرے سینے میں بھی دل تھا میرے بھی احساسات و جذبات تھے..... میں نے سب کچھ کس کے لئے مار ڈالا..... رضا کے سکون کے لئے — بچوں کی محبت کیلئے..... مجھے رضا نے کیا دیا ہے — جھوٹ — دھوکہ — فریب — لاپروائی — مفلسی کا رونا..... کیا تم سمجھتی ہو مجھے کچھ پتہ نہیں..... کیا مجھے علم نہیں کہ وہ باہر کیا کرتا ہے..... میں سب جانتی ہوں..... مجھے سب پتہ ہے۔ وہ اس وقت بھی کسی ہوٹل میں کسی لڑکی کے ساتھ ہو گا۔ یا دوستوں کے ساتھ کسی تفریح میں مصروف ہو گا۔ مگر فرزانہ مجھے سب برداشت کرنا ہے سب سہنا ہے..... اسی کے ساتھ نباہ کرنا ہے..... مجھے یہیں رہنا ہے۔ گوگو کے لئے گوشی کی خاطر..... ان کے مستقبل کے لئے مجھے اپنا حال قربان کرنا ہے۔ وہ مجھے بیوی نہیں صرف بچوں کی ماں سمجھتا ہے..... اور مجھے بھی اپنے خاوند رضا کے دھوکے اس کے جھوٹ..... فریب سے نفرت ہے۔ مگر گوگو گوشی کے باپ سے مجھے محبت کرنی ہے خدمت کرنی ہے ہماری زندگی ..... سسکیوں کی آواز مزید تیز ہو گئی۔ کیا عورت بھی منافق..... کیا مرد بھی بیوقوف.....؟ رابعہ اپنی تمام تر منافقت کے باوجود اسے بہت اونچی لگی اسے اپنا وجود زمین میں دھنستا ہوا محسوس ہوا.....

دُوسرا آدمی

حنا فردوس

عرشی بڑی بے صبری سے اپنے بھائی جاوید کے خط کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی آج کی ڈاک سے ضرور بھیا کا خط آئیگا۔ اسی لئے وہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ سائیکل کی ٹرن ٹرن سن کر وہ دوڑ کر گیٹ پر چلی گئی تھی جہاں پوسٹ مین ایک لفافہ لئے کھڑا تھا۔ لفافے سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ خط جاوید کا ہے وہ لفافہ چاک کرتی ہوئی اندر آئی تھی۔ امی کے نام کا خط اس نے امی کی گود میں ڈال دیا اور اپنا خط پڑھنے لگی۔

میری پیاری گڑیا سی بہن

سدا خوش رہو

تمہارا خط ملا۔ جس سے مجھے پتہ چلا کہ تم بہت بے صبری کے ساتھ میرا انتظار کر رہی ہو۔ میں بھی بہت بے چین ہوں۔ تم لوگوں سے ملنے کے لئے۔ یہ خط بہت مختصر سا لکھ رہا ہوں۔ اب ملنے پر ہی باتیں ہوں گی۔ میں نے تار دیا تھا امید ہے مل گیا ہوگا۔ میں اسی تاریخ کو شام کی پلین سے وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اور ہاں میں یہ لکھنا تو بھول ہی گیا کہ تم دو آدمیوں کے رہنے کا انتظام کرنا۔ میرے ہی کمرے میں ایک اور بیڈ لگا دینا۔

اچھا اب خدا حافظ۔ جلد ملونگا۔

تمہارا بھائی جاوید

عرشی خط پڑھ کر تعجب میں آگئی بھلا دوسرا آدمی کون ہوسکتا ہے۔ کیا وہاں بھیا نے شادی کرلی اور ہم لوگوں کو خبر بھی نہ کی۔ بھیا نے کیسے ایسا کرلیا۔ کتنا ارمان تھا کہ خوب دھوم دھام سے بھیا کی بارات جائے گی اتو کے گھر۔ اتو میری پیاری سہیلی ہے۔ کتنا ستاتی تھی میں اسے۔ جب اس نے سنا تھا کہ بھیا آرہے ہیں تو کتنی خوش ہوکر اس نے پوچھا تھا کب۔ اور میں اسے ستاتی رہی۔ بہت دیر کے بعد اس کو بتایا تھا اور اس کا چہرہ خوشی سے گلنار ہوگیا تھا۔

پھر عرشی چونک اٹھی جب اس کی امی نے اس سے پوچھا کہ تم کو جاوید نے کیا لکھا ہے۔ عرشی نے اپنا خط اپنی امی کے ہاتھ میں دے دیا۔ امی نے بھی خط پڑھ کر حیرت ظاہر کی۔ انھیں بھی یقین نہ تھا کہ ان کا بیٹا ایسا کرسکتا ہے۔ پھر بھی انھوں نے اپنے ممتا بھرے دل کو سمجھا لیا اور خود کو بہلانے کے لئے کہنے لگیں اسے زندگی تو اسے ہی گزارنی ہے اچھا ہے اس نے اپنی پسند سے شادی کرلی۔ دونوں خوش رہیں یہی میری دعا ہے لیکن ان کی آنکھیں یہ کہتے کہتے نم ہوگئی تھیں اور انھوں نے اپنا چہرہ گھما لیا۔

عرشی بھیا کا کمرہ ٹھیک کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی آج پھر ٹھیک کئے دیتی ہوں کل جب بھیا آجائیں گے تو بھابھی ہی ٹھیک کیا کریں گی اس نے بھی اپنے دل کو سمجھا لیا اور اتو کو اپنے دل سے نکال دیا تھا۔ اب وہ ایک امریکن بھابھی کو اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

ٹیکسی کی آواز سن کر وہ کمرے سے نکلی تو دیکھا کہ بھیا آنگن میں کھڑے ہیں۔ وہ دوڑی اور بھیا کہہ کر وہ لپٹ گئی۔ جاوید نے بھی میری گڑیا کہہ کر اسے اپنے گلے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ دونوں کی آنکھیں فرط مسرت سے نم ہوگئیں۔ امی نے بھی اپنے کمرے سے آکر بیٹے کو کلیجے سے لگا لیا۔ دونوں ماں بیٹے کتنی ہی دیر تک محبت سے لپٹے رہے اور آنکھیں خوشی کے آنسو بہاتی رہیں۔

عرشی نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں دوسرے آدمی کا کہیں پتہ نہ تھا وہ باہر کی طرف چلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں کوئی کرسی کھسکا رہا تھا۔ وہ دھیرے سے داخل ہوئی لیکن وہاں کوئی نہ تھا صرف ایک خوبصورت سا سوٹ کیس رکھا تھا۔ شاید بھابھی باتھ روم چلی گئی ہیں یہ سوچ کر اس نے سوٹ کیس اپنے ہاتھ میں لیا اور اندر چلی آئی۔ دیکھتی ہوں کتنی دیر باہر رہتی ہیں؟ یہ سوچ کر وہ مسکرانے لگی اور سوٹ کیس اپنے کمرے میں چھپا کر جاوید کے پاس آگئی جو امی سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا۔ عرشی کو

دیکھ کر دونوں چپ ہوگئے۔ پھر جاوید نے کہا چلئے امی باہر ڈرائنگ روم میں ان سے مل لیجئے۔ دونوں ماں بیٹے جانے لگے تو عرشی بھی ساتھ ہوگئی جاوید نے مسکراتے ہوئے کہا "تو جا تین کپ چائے بنا لا خوب اچھی سی"۔ وہ باورچی خانے کی طرف مڑ گئی۔ جلدی جلدی اس نے چائے بنائی۔ اس کا دل تو کام میں لگ نہیں رہا تھا۔ اسے تو اپنی بھابھی کو دیکھنے کی جلدی تھی۔ وہ ہاتھ میں ٹرے لئے۔ کچن سے باہر آئی تو جاوید اور امی دونوں پریشان سے سارے گھر میں گھوم رہے تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ لوگ کیا تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے منہ بنا کر پوچھا کیا بات ہے؟

ماں نے کہا ارے دیکھو نا اس کا سوٹ کیس پتہ نہیں کیا ہوگیا۔ اتنی جلدی کون لے جائے گا۔ میری عزت کی بات ہے۔ اس میں گھر کے لئے اس میں بہت سارے سامان تھے۔

عرشی مسکراتی ہوئی بولی بھائی سے کہیئے خود آکر ڈھونڈھ لیں۔ کیا انہیں اندر آتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔ پہلے آپ میرا تعارف تو ان سے کرا دیجئے پھر دیکھئے سوٹ کیس مل جائے گا۔ اوہ تو تم نے چھپا دیا ہے۔ ابھی سے یہ حرکت" جاوید ہنستا ہوا اس کے پاس آگیا۔

بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ آپ نے ابھی تک بھابھی سے نند کا تعارف بھی نہیں کرایا" عرشی نے ذرا ناراض ہوتے ہوئے کہا اچھا تو آپ اپنی بھابھی سے ملیں گی چلئے میرے ساتھ جاوید نے اس کی چوٹی پکڑ لی اور باہر لے گیا۔ اس نے کمرے کے باہر سے ہی ہانک لگائی دیکھو تمہارے سوٹ کیس کی چور مل گئی۔ دراصل یہ تمہیں اپنی بھابھی سمجھ رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں کہ دوسرا آدمی اس کی بھابھی نہیں میرا ہونے والا بہنوئی ہے۔

عرشی نے دیکھا کہ ایک خوبصورت وجیہہ نوجوان سامنے کھڑا تھا اور بڑی پیاری ادا سے مسکرا رہا تھا۔ وہ شرم سے سرخ ہوگئی اور اپنی چوٹی چھڑا کر بھاگ گئی۔ دور تک اسے دونوں کے قہقہے سنائی دیتے رہے۔

حنا فردوس

جذبات درخشاں ـــــ ملیح آبادی

جب سپہر علم کا ماہ منیر کھو گیا
چھا گیا ابر الم ساروں کا لشکر کھو گیا

باغ ہستی سے چلا جب بلائے گلعذار
گم بہاریں ہوگئیں ہر کیف منظر کھو گیا

یوں تو گلزار جہاں میں ہیں گل رنگیں بہت
مل سکے شاید نہ جس کا کوئی ہمسر کھو گیا

ہوگئی درہم یکایک محفل شعر و ادب
جب شب تاریک میں ماہ منور کھو گیا

نبض عالم پر رہا کرتی تھیں جس کی انگلیاں
وہ بیستی ہو کے خود بیمار و مضطر ہو گیا

اب سنوارے کون اے لیلائے اردو تیری زلف
جو نظر رکھتا تھا ہر اک پیچ و خم پر کھو گیا

ناز تھا جس پر تجھے اے گلشن ہندوستان
دشت غربت میں وہی تیرا گل تر کھو گیا

پھٹ رہا ہے غم سے دل ارض ملیح آباد کا
گود میں پالا ہوا اس کی جو دل بر کھو گیا

اس نے پیدا جو کیا تھا ایک لعل بے بہا
دست نا جو ہر شناس میں وہ پڑ کر کھو گیا

کچھ خبر ہے تجھ کو اے اجڑے ہوئے قصر سخن[1]
اب دیار غیر میں تیرا مقدر کھو گیا

بجھنے والے تھے جواب ایوان گویائی کے چراغ
کر کے روشن ان کو خود الفت کا پیکر کھو گیا

الغرض یاد لے کر دلمیں اور یاد وطن
ہائے وہ بیمار غم آخر تڑپ کر کھو گیا

کر دیا جس نے معطر کل فضائے دہر کو
جوش وہ پھیلا کے عطر روح پرور کھو گیا

غرق بحر غم ہے تیرا کلبۂ ویراں ملیح
دنیا کہتی ہے کوئی نایاب گوہر کھو گیا

[1] جوش صاحب کا وطن چھوڑنا

شک

اُمِ صدف

"ہاں مہناز! تعجب تو خود مجھے بھی ہے..... تم جیسی لڑکی سے میں بات کرنے کی جرأت کبھی نہ کر سکا تھا۔ پھر... کبھی تم میری بن سکو گی، سوچ بھی کیسے سکتا تھا؟" جنید نے مسکرا کر مہناز سے کہا۔

"کیوں...؟ میں کوئی ہوا تھی جو بات کرتے ہوئے گھبراتے تھے؟" شریر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"خیر! ——— ہوا تو نہیں تھیں... لیکن تمہارا حسن و جمال، پُر رعب چہرہ، پُر وقار انداز گفتگو اور تمہارا لباس دیکھ کر ہر کوئی بھی مرعوب ہو جاتا ہے..." جنید نے مسکراتے ہوئے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"بس۔ بس۔ آسمان پر چڑھانے کی کوشش نہ کرو جنید۔"

"سچ کہتا ہوں مہناز۔ کالج لائف میں کئی لڑکیوں سے سابقہ پڑا، لیکن کبھی کسی سے متاثر نہ ہوا۔ لڑکیاں میرے لئے بس تفریح کا سامان ہیں، گھمایا..... پھرایا... اور چھوڑ دیا۔ جہاں کسی لڑکی کو سنجیدہ پایا، میری طرف التفات سے بڑھتے یا پیار کا اظہار کرتے سنا، وہیں سے دوستی ختم ——— چاہت ..... محبت ..... عشق سب ایک ہی حماقت کے کئی نام سمجھتا رہا۔ لیکن ——— پتہ نہیں تم نے کیا جادو کر دیا..." اس نے مسکراتے ہوئے مہناز کو دیکھا "تم سے اس درجہ متاثر ہوا کہ پیار محبت حماقت نہیں، زندگی کا ایک لازم جز محسوس کرنے لگا... اور تم سے ملنے سے قبل میں بس تنہا ہی رہا ——— کاش! ——— تم اور بھی پہلے ملتیں"... وہ مہناز کی ران پر سر رکھے لیٹا ہوا بڑے پیار سے اسے دیکھ رہا تھا ———

اور مہناز دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اچانک اس کے لب جنبش میں آئے، "رک رک کر ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے اس نے کہا...

"کہیں ایسا تو نہیں ہمارا بھی ساتھ وقتی ہو ———؟"

"نہیں مہناز۔ نہیں"... اس نے اپنا ہاتھ مہناز کے لب پر رکھ دیا...

"تم ایسا کبھی نہ سوچنا... یقین جانو مہناز!... اب میں تم سے ایک پل بھی جدا نہیں رہ سکتا.. تم سے ملنے کے بعد میں نے لڑکیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا تک چھوڑ دیا، کبھی اتفاق سے کوئی پرانی دوست یا واقف کار مل جاتی تو میں انجان بن کر گزر جاتا ہوں، کسی سے مخاطب ہونا بھی اب گوارہ نہیں ہوتا... تمہیں پا کر مجھے سب کچھ مل گیا۔ اور اب کوئی تمنا یا آرزو باقی نہیں رہ گئی"———

"بس! ——— ایک وعدہ کرو"——— التجا آمیز لہجے میں اس نے جنید سے کہا ———

"ایک کیا ——— ؟ مجھے سب منظور ہے" جنید نے کہا

"زندگی بھر ساتھ نبھاؤ گے"——— اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا

"ہاں مہناز! ——— وعدہ رہا ——— تم تو خود میری زندگی ہو۔ میری چاہت اور میری آرزو ہو ——— پیار کا مفہوم تم سے ہی سمجھا ہے میں نے..... پھر بھلا ہم کیسے جدا ہو سکتے ہیں"——— اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے جنید نے کہا۔

رفتہ رفتہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں... پیار عشق میں بدل گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے سکھ دکھ کے ساتھی بن گئے۔

جنید کو مہناز کی شکل میں مایۂ ناز سرمایہ ملا تھا۔ جب بھی موقع ملتا بڑے خلوص سے اپنے ہاتھوں اسے کھانا کھلاتی، ہر ضرورت کا خیال رکھتی..... جنید کی ہر چھوٹی بڑی پسند یا ناپسند کا خیال رکھ کر عمل کرتی ——— پھر وہ بات جو جنید کی مرضی کے خلاف ہوتی ترک کر دیتی.... یہاں تک کہ اس نے جنید کے بغیر کہیں آنا جانا بھی چھوڑ دیا۔

"ایک روز جنید نے مہناز کو بتایا "مجھے سعودیہ میں سروس کی آفر ملی ہے.... تمہاری کیا رائے ہے؟ تنخواہ اچھی، مکان، کار اور ضرورت کی تمام چیزیں کمپنی سے مجھے مل رہی ہیں"

جنید کے سوال پر ایک لمحہ وہ خاموش رہی پھر نگاہیں جھکا کے

ہوئے آہستہ سے اس نے کہا۔ "جنید! — میں ہمیشہ ہی تمہارے بہترین مستقبل کی خواہاں رہی ہوں، اس قدر اچھی آفر تم ضرور قبول کر لو یہ موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دو۔"

"یہ تمام باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن تمہارے بغیر ایک دن گزارنا مجھے مشکل ہوتا ہے.... پھر تمہیں چھوڑ کر اتنی دور کس طرح جا سکتا ہوں.... مجھے نہیں چاہیے ایسی سروس جو مجھے تم سے جدا کر دے"

"چند مہینوں کی جدائی شاندار مستقبل کی راہ میں حائل کیوں ہو۔؟ جب تم مستقل ہو جاؤ تو مجھے اپنا کر لے جانا۔ چاہے ہمارے درمیان کیسے ہی فاصلے کیوں نہ ہوں، میری چاہت کبھی کم نہ ہوگی"..... مہناز نے اس کا جواب سننے کے لئے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مجھے تم پر بھروسہ ہے مہناز.... لیکن حالات و زمانے سے ڈرتا ہوں کہیں میری غیر موجودگی میں تمہارے والدین کسی اور کو تمہارا ہاتھ نہ تھما دیں... پھر مجھے اپنے والدین کو بھی تو منانا ہے... نہیں ناز! میں تمہارے بغیر نہیں جا سکتا... اور اگر گیا تو تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"جنید! — نادانی نہ کرو... روشن مستقبل کو وقتی جدائی کے لئے نہ ٹھکراؤ میں مرتے دم تک تمہاری ہی رہوں گی" اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں جانتا ہوں مہناز! — میری ایک معمولی سی خوشی کے لئے تم بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہو.... پھر ان حقیر چیزوں کے لئے تم جیسا نایاب ہیرا چھوڑ کر چلا جاؤں...؟ مانا یہ چیزیں بھی اہمیت رکھتی ہیں، لیکن تمہارے بغیر میرے لئے ان کی کوئی اہمیت نہیں... قسمت نے ساتھ دیا تو تمہیں پا کر بھی یہ چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں... بس! — اب تم کچھ نہ کہنا" — اس کا حسین چہرہ ہاتھوں میں تھامتے ہوئے جنید نے کہا۔

"اچھا! — اب یہ بتاؤ کل کے لئے کیا پروگرام ہے، سنڈے جو ہے"؟

"پروگرام ترتیب دینا تمہارا کام.... عمل کرنا میرا"... مہناز نے کہا

"ٹھیک ہے... کل ہم پہلے کہیں لنچ لیں گے پھر پکچر دیکھنے چلیں گے — کیوں کیا خیال ہے"؟

مہناز نے مسکرا کر رائے سے اتفاق کا اظہار کیا

دوسرے دن ہوٹل جاتے ہوئے مہناز کی گرتی ہوئی طبیعت جنید سے چھپی نہ رہ سکی..."کیا بات ہے مینی! — بے چین سی لگ رہی ہو طبیعت ٹھیک ہے نا...؟ کچھ زرد سی دکھائی دے رہی ہو"

"ہاں جنید! — کل سے دائیں جانب پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہے"

"ڈاکٹر کو دکھایا نہیں...؟" بے چین ہو کر جنید نے پوچھا۔

"تم سے پوچھا نہیں اس لئے ڈاکٹر سے رجوع نہیں کیا" آہستہ سے پیٹ دباتے ہوئے مہناز نے کہا۔

"کمال کرتی ہو تم بھی...! — درد برداشت کرتی رہیں لیکن مجھ سے پوچھا نہیں اس لئے ڈاکٹر کو دکھایا نہیں... حد ہو گئی۔ چلو ہم ابھی وقت ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں... تمہارے فیملی ڈاکٹر کون ہیں؟؟"

"ڈاکٹر صدیقی... بچپن سے وہی میرے معالج رہے ہیں"

کچھ ہی دیر میں وہ ڈاکٹر صدیقی کی ڈسپنسری پہنچے۔

"تم ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ، میں باہر تمہارا انتظار کروں گا، وہ تمہارے فیملی ڈاکٹر ہیں، اس لئے میرا آنا مناسب نہیں" مہناز کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"کیا بتایا ڈاکٹر نے...؟" کچھ دیر بعد جب وہ واپس ہوئی تو جنید نے پوچھا۔

"اپینڈیسائٹس کا شک ہے، فوراً ایکسرے لینے کو کہا ہے..." جنید کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے مہناز نے کہا

جہاں مہناز صاف گو اور کھلے دل کی زندہ دل لڑکی تھی.... وہیں جنید میں ایک کمزوری تھی۔ حالانکہ مہناز پر اسے کامل بھروسہ تھا پھر بھی جنید کی یہ کمزوری، اسے غلط انداز سے سوچنے کا عادی تھا وہ بغیر کسی حقیقت کے ہی مہناز پر برس پڑتا۔ اور وہ کمزوری تھی اس کی تنگ نظری اور بیجا شک — مہناز کی جانب کوئی دیکھتا بھی تو وہ غلط انداز میں سوچنے لگتا۔ کسی سے بات کرتے دیکھ لیا تو مہناز کی خیر نہ رہتی، لیکن ان تمام باتوں کو بھی مہناز خاموشی سے درگزر کر دیتی۔ اگر جنید اس پر خواہ مخواہ کبھی ناراض ہوتا جو دل میں آتا کہہ دیتا پھر خود ہی اپنی ڈانٹ ڈپٹ پر نادم ہو کر معافی مانگتا۔ ڈانٹ کے وقت وہ خاموشی سے اس کی ساری باتیں خاموشی سے سن لیتی اور کوئی صفائی پیش نہ کرتی۔

دیتی اس سے خفا ہوتی لیکن جب جنید شرمسار سا معافی مانگتا تب وہ مسکرا کر کہتی ......

"کوئی بات نہیں جنید! سچے عشق کا تقاضہ یہی ہے، دل اپنے محبوب کو کسی سے بات کرتے ہوئے بھی نہیں ...... بلکہ کسی کو محبوب کی جانب دیکھتے ہوئے بھی برداشت نہیں کرسکتا.... اس لئے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں اور نہ ہی ہم دونوں کی لغات میں شکریہ و معافی جیسے الفاظ کو جگہ ہے.... ان الفاظ کے استعمال سے غیریت کا گمان ہوتا ہے.... اور ہم دونوں تو ایک ہیں..." اور بڑی خندہ پیشانی سے وہ یہ باتیں یکسر درگزر کردیتی...

ایک مرتبہ جنید کی شرمندگی بے حد بڑھ گئی، بیجا خفا ہوگیا تھا کسی شادی کی تقریب میں اس نے مہناز کو کسی شخص سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا... بہت کچھ اول فول کہنے پر مہناز نے اس سے کہا تھا...

جن صاحب سے باتیں کرنے پر تم اس قدر برہم ہوگئے ہو، تم ان سے واقف نہیں وہ میرے سگے ماموں ہیں.... بیرون ملک سے برسوں بعد لوٹے ہیں۔"

اور... اسی قسم کا بے سرو پا شک دوبارہ اس کے ذہن میں بیدار ہوا... اور وہ سختی سے پوچھ بیٹھا..." مہناز! ڈاکٹر کیسے ہیں؟ میرا مطلب جوان ہیں یا ادھیڑ عمر؟..

چونک کر مہناز نے جنید کو دیکھا... اور متذبذب ہوکر کہا "جنید! ڈاکٹر، ڈاکٹر ہی ہوتا ہے، مریضوں سے نہیں اس کا تعلق مرض سے ہوتا ہے اور ڈاکٹر صدیقی نہ صرف میرے معالج ہیں بلکہ امی کے دور کے رشتہ سے بھائی بھی ہیں ..." پہلی بار اس نے منہ کھولا۔

کیا بات ہے... ؟ بہت طرفداری کر رہی ہو اپنے ڈاکٹر کی... وہ پھر کہا...

مہناز کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں... "ٹھیک ہے جنید!.... میں ڈاکٹر سے علاج نہیں کراؤں گی... تم خوامخواہ خفا نہ ہو..." اس نے سر جھکالیا پہلے بھی اسی قسم کی باتوں کے باعث مہناز نے اپنے رشتہ داروں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی... اپنی سہیلیوں سے بھی بات چیت بند کردی تھی کیونکہ جنید کو اس پر بھی اعتراض تھا۔

جنید جب بھی ٹھنڈے دل سے اپنی اس حرکت پر غور کرتا... اسے اپنی بزدلی کا احساس ہوتا... اور پھر کئی کئی بار مہناز سے معافی مانگتا۔

اس واقعے کے بعد چند روز مصروفیات کے باعث جنید مہناز سے نہ مل سکا۔ اور اب کی بار بھی ہمیشہ کی طرح جنید پشیمان تھا...... اور اس سے مل کر پھر دل سے معافی مانگنا چاہتا تھا... بالآخر پانچویں دن وہ اس سے ملا....

اس شام مہناز کو دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا... مہناز اسے بہت ہی کمزور دکھائی دی... نقاہت سے چہرہ زرد پڑ چکا تھا گلاب سا چہرہ مرجھا چکا تھا۔ آنکھوں کے اطراف سیاہ حلقے نمایاں تھے.... چال دھیمی تھی.... تکلیف کی جھلک چہرے سے عیاں تھی۔

کیا ہوگیا ہے تمہیں... ؟ ان چار دنوں میں تم برسوں کی بیمار لگ رہی ہو... کیا بات ہے؟ کیا ابھی تک درد ہے"...؟ اس نے بے قرار ہوکر کئی سوال ایک ساتھ کر دیئے... دوائی لیتی رہیں؟۔ ڈاکٹر کا علاج جاری ہے نا... ؟ ایکسرے نکلوایا تو رپورٹ کیا ہے؟ ایکسرے نکلوایا بھی یا نہیں.... ؟ ان تمام سوالوں کے جواب میں وہ خاموش ہی رہی۔

تم خاموش کیوں ہو...." ؟ اس نے پھر پوچھا۔

" تم نے ایک ساتھ سوالوں کی بارش کردی کیسے جواب دیتی" .... حسب معمول مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔

" مذاق چھوڑو... جواب دو... اتنے دنوں درد ہوتا رہا... ہے نا..." اس نے سنجیدگی سے پوچھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ہاں... مختصر ترین جواب تھا....

علاج کروایا تم نے..." ؟ پھر جنید نے سوال کیا...

جواب ملا نہیں"

کیوں.... ؟ میری بات تم نے گرہ میں باندھ لی...... ہے نا... ؟ اور اپنے کہے کا پاس رکھتے ہوئے علاج نہیں کروایا ... کیوں ؟"

" چھوڑو جنید.... ! زندگی کی چند حسین ساعتیں ان فضول سی باتوں میں کیوں گنوائیں..." مہناز نے بات ٹالنا چاہی۔

فضول سی باتیں۔ تم انہیں فضول کہہ رہی ہو... ؟ سچ ! میں بے حد شرمندہ ہوں جو تم سے ڈاکٹر کی بات پر خفا ہوگیا تھا۔ خیر!... اب آخری بار مجھے معاف کردو... پھر اس طرح شکایت کا

موقع دوں گا اور فوراً چلو ڈاکٹر کے پاس ...۔" جنید اسے بازوؤں سے اٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"چلیے کچھ دیر یہیں پارک میں بیٹھتے ہیں پھر چلیں گے ....
تکلیف بڑھ گئی ہے، مجھ سے چلا نہ جائے گا...۔" پارک کی بنچ کی طرف بڑھتے ہوئے مہناز نے کہا۔

دونوں کچھ دیر یونہی خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک مہناز نے جنید کا ہاتھ بڑی زور سے دبایا... مجو... نید... ! ... درد .... میری جان ... لے کے جائے گا ... شاید .... چلو.... فوراً یہاں سے تڑپتے ہوئے اس نے کہا۔

چلو پہلے ڈاکٹر کے پاس ... اس نے اسے سہارا دے کر ٹیکسی میں ڈالا اور فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔
مہناز! — کیا ہوگیا ہے تمہیں"... ڈاکٹر صدیقی فوراً متوجہ ہوئے۔
درد نا قابل برداشت ..." ادھورا جملہ ہی مہناز کہہ پائی اور وہیں بے ہوش ہوگئی ... ڈاکٹر صدیقی نے جنید کی مدد سے اسے لٹایا۔
آپ کو نہیں پہچانا میں نے ..... ڈاکٹر نے جنید سے دریافت کیا۔
"ڈاکٹر صاحب! — میں مہناز کا دوست جنید ہوں ..... اور پھر اس نے خود ہی تفصیل ڈاکٹر کو بتادی ... "انھوں نے آپ کے کہنے کے مطابق ایکسرے نکلوایا اور نہ ہی دوا لی ..... اسی لئے تکلیف کی شدت اس قدر بڑھ گئی ..."

وہ پشیمان بھی تھا .... اور سوچ رہا تھا یقیناً اس کا ذمہ دار وہ خود ہے ... اور اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔
میرے خیال میں انھیں فوراً اسپتال میں داخل کروانا چاہیے۔"
اچھی طرح معائنہ کرکے سر اٹھاتے ہوئے انھوں نے کہا... "اپنڈکس بہت بڑھ چکا ہے .... فوراً آپریشن کروانا چاہیے
میں ان کے والدین کو فون پر مطلع کئے دیتا ہوں اور ہم فوراً انھیں لے کر رحمانیہ اسپتال جاتے ہیں ... ڈاکٹر خان ماہر سرجن ہیں ... وہ اس کیس کو لے لیں گے۔"

تیسرے روز ٹسٹ وغیرہ لینے کے بعد تھیٹر کے باہر مہناز کے والدین اور جنید پریشانی و فکر کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ کسی کو دوسرے کا ہوش نہ تھا ... امید و نا امیدی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبتے ابھرتے دو گھنٹے بیت گئے۔

آپریشن تھیٹر کی سرخ بتی بجھ گئی ... تینوں کی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں ... کچھ ہی دیر میں ... ڈاکٹر خان باہر آئے۔ چہرے کی سنجیدگی مزید گہری ہو چکی تھی ... اور خاموش انداز ... بہت کچھ کہہ گیا ... پھر بھی جنید کی تسلی نہ ہوئی ... ڈاکٹر! — مہناز کیسی ہیں"؟

"افسوس ... مسٹر جنید اور آپ رحمان صاحب ... میں نے اپنی پوری کوشش کی ... پروردگار کی مرضی کے آگے ہم ڈاکٹر بے بس و مجبور ہیں۔ مہناز صاحبہ نے بڑی دیر کردی تھی ... جس سے اپنڈکس اندر ہی اندر پھٹ گیا ... اس کا سارا زہر تمام جسم میں پھیل گیا ... جس سے کچھ نہ ہوسکا ... آپ صبر سے کام لیں ..." نگاہیں نیچی کئے ڈاکٹر خان نے یہ کہہ دیا ... ماں یہ عظیم صدمہ برداشت نہ کرسکیں ... وہیں چکرا کر بے ہوش ہوگئیں .... رحمان صاحب حواس باختہ ان پر جھکے .....
اور .... جنید .... وہیں خلاؤں میں اپنی کھوئی ہوئی مہناز ... اپنی جانی کو تلاش کر رہا تھا ... ہوش و حواس سے بیگانہ ....
"افسوس! — میرے شک نے یہ دن دکھایا ... میرے شک نے تمہیں مجھ سے چھینا ... تمہاری موت کا ذمہ دار میں ہوں ..."

اچانک

شام بارکپوری

کافی دنوں سے میرے دوست منظور کے خط پر خط آ رہے تھے۔ آخری خط میں لکھا تھا: "تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے شادی کر لی ہے۔ تفریح کا موڈ ہو تو کلکتہ کا چکر ضرور لگاؤ۔ اس طرح اپنی بھابی کے درشن بھی کر لینا۔ شیریں کو تمہارے بارے میں تفصیلات بتا چکا ہوں۔ تمہاری آمد ہمارے لئے باعثِ مسرت ہوگی۔"

اس خط کے ملنے پر میں منظور سے ذرہ برابر بھی ناراض نہ ہوا، کیونکہ یہ اس کی عادت تھی کہ اچانک کوئی انوکھی بات کر کے دوسروں کو حیرت زدہ کر دے۔ میرے ساتھ ایم۔ اے کر رہا تھا کہ اچانک پڑھائی سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ اسکول کے زمانے سے شعر و شاعری کا شوق تھا۔ اچانک اسے بھی ترک کر دیا۔ یونہی بیٹھے بٹھائے اچانک ایک دن کلکتہ واپس آ گیا۔

ان دنوں میری چھٹی تھی۔ اچانک رختِ سفر باندھا اور کلکتہ جانے کیلئے اسٹیشن جا پہنچا۔ منظور نے لکھا تھا کہ روانگی سے قبل خط کے ذریعہ ضرور مطلع کرنا تاکہ تمہیں لینے کے لئے اسٹیشن پر موجود رہوں۔ چونکہ میرا پروگرام اچانک بنا تھا، اس لئے اسے اپنی روانگی کی اطلاع نہ دے سکا۔ ویسے بھی میرا ارادہ تھا کہ اچانک پہنچ کر اسے حیرت میں ڈال دوں۔

ریلوے اسٹیشن بھی عجیب جگہ ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ مختلف شکل و صورت کے لوگ نظر آتے ہیں۔ جسے دیکھو بھاگا جا رہا ہے۔ یہ غم و انبساط کا گہوارہ ہے کوئی کسی کو الوداع کہنے آتا ہے تو کسی کا خوش آمدید کہنے۔ ٹرین اپنے وقت پر پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ میں جس کمپارٹمنٹ میں سوار ہوا تھا اس میں مسافر بہت ہی کم تھے۔ کھڑکی کے پاس سے گزرتے ہوئے سگریٹ فروش سے میں نے ایک پیکٹ سگریٹ خریدا۔ اچانک ایک سریلی آواز سن کر میں بڑھا۔ ایک شخصیت ایک حسین لڑکی کے ساتھ ایک ہی کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ لڑکی

برتھ پر اپنا بیڈنگ بچھانے لگی۔ بوڑھا مجھ سے مخاطب ہوا: "کہاں جائیے گا؟"

"کلکتہ" میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

اس کی آنکھوں میں امید و بیم کی قندیلیں جل اٹھیں۔ اس نے ایک نظر لڑکی پر ڈالی پھر مجھ سے کہا "میری بیٹی بھی کلکتہ جا رہی ہے۔ اس کا شوہر وہاں ملازمت کرتا ہے۔ اکیلی سفر کر رہی ہے۔ اگر آپ اسکا ذرا خیال رکھیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔" اس شریف آدمی کو میں نے اطمینان دلایا۔ اس بار لڑکی اپنے باپ سے مخاطب ہوئی۔ "ابو آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں میں تنہا سفر کر سکتی ہوں اور پھر وہ خود مجھے ریسیو کرنے کے لئے اسٹیشن پر موجود رہیں گے۔" لڑکی بہت تیز طرار تھی۔

اس آدمی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"دیکھا آپ نے میری لڑکی کتنی نادان ہے۔"

اب میں نے اس پر گہری نظر ڈالی۔ سرو قد، کتابی چہرہ، گھنگھریالے بال، سفید ساڑھی کا بلو باڈر اور اس کی مناسبت سے اس کا بلاؤز بھی نیلا۔ دونوں ہاتھوں میں پتلی پتلی چوڑیاں وہ مشرقی حسن کا شاہکار تھی۔ ٹرین نے روانگی کی سیٹی بجائی وہ آدمی رینگتی ہوئی گاڑی سے اتر گیا۔ لڑکی ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ اس آدمی نے چیخ کر کہا: "منو پہنچ کر اپنی خیریت کی اطلاع ضرور دینا۔"

جب ٹرین فراٹے بھرنے لگی تب وہ پہلی بار مجھ سے بولی: "آپ سے ایک بات کہنی ہے۔"

"فرمائیے" میں نے اطمینان سے کہا۔

"میں تنہا سفر کر سکتی ہوں۔ آپ کو میری دیکھ بھال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ہوسکتا ہے آپ کو ضرورت نہ ہو مگر میں آپ کے والد سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ ٹرین تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ وہ منہ پھیرے کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔ یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آ گئی کہ اسے میری موجودگی بری طرح کھل رہی تھی۔ اس وقت تک میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ اسے ناگوار گزرے۔ ہم حسبِ جاب بیٹھے رہے، صرف کمپارٹمنٹ کے کھڑکنے کی کھٹ کھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس ڈبے میں کوئی دوسری عورت نہ تھی۔ دوسرے

لوگوں نے کئی بار ہماری طرف کنکھیوں سے دیکھا پھر گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ میں بھی یوں ہی بے مقصد باہر دیکھتا رہا۔ تار کے کھمبے گھوڑے کی طرح بھاگ رہے تھے۔ میں نے سگریٹ جلائی اور کش پر کش لینے لگا آہستہ آہستہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اچانک اس کے جگانے پر آنکھ کھل گئی

"اٹھئے"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" میں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

اس اسٹیشن کے بعد بردوان آ رہا ہے۔ کیا وہاں کی مٹھائی نہیں لینی ہے۔؟ جو بھی یہاں سے گذرتا ہے "سیتا بھوگ" اور "مہی دانہ" ضرور خریدتا ہے۔"

میں نے ٹانگیں سیدھی کر لیں۔ ٹرین رک چکی تھی۔ چند مسافر سوار ہوئے اور چند اترے بھی۔ ٹرین دوبارہ حرکت میں آ گئی۔ وہ کھڑکی پر جھکی قدرت کے مناظر دیکھنے میں محو تھی۔

"کھڑکی کے باہر اتنا مت جھکئے" میں نے منع کرنا چاہا۔

"کیوں؟ وہ چڑ گئی۔

"ڈر لگتا ہے، اگر گر پڑیں تو..... ؟"

"وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی: "آپ تو بچوں جیسی باتیں کرتے ہیں"

"نادان تو آپ ہیں۔ اسٹیشن پر آپ کے والد نے کیا کہا تھا" میں نے جوابی حملہ کیا۔

ہم دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ ریل گاڑی دھواں اڑاتی بھاگی جا رہی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ ڈھلنے لگا تھا۔ گھڑی دیکھی تو چار بج کر تیس منٹ ہو چکے تھے۔ لڑکی نے تنگ آ کر کہا "آخر کب تک باہر دیکھ کر وقت گذاروں"

"تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں"؟

"کوئی رسالہ یا میگزین آپ کے پاس ہے؟"

بیگ سے ایک میگزین نکال کر دیا۔ وہ رسالہ پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ اور میں دوبارہ کھڑکی کے باہر نظارہ کرنے لگا۔ ٹرین جب دوسرے اسٹیشن پر رکی باہر [illegible] لینے گیا پھر اسٹال پر چائے پینے لگا۔ [illegible] آہستہ آہستہ [illegible] سے رینگنے لگی۔ اچانک [illegible] ٹرین پر سوار ہو گیا۔ وہ کھڑکی کے باہر گردن نکالے دیکھ رہی تھی۔

"باپ رے باپ! میں تو گھبرا گئی تھی۔ میں تو سمجھی تھی کہ شاید آپ سوار نہ ہو سکیں"

"گھبرانا کیا؟ آپ تو تنہا سفر کرنا چاہتی تھیں" میں نے برجستہ کہا۔

وہ زور زور کا قہقہہ لگا کر بولی: "اپنے لئے تو نہیں گھبرائی بلکہ آپ کے لئے۔ یہاں پہلی بار آئے ہیں۔؟"

"ہاں۔ اور آپ؟"

"دوبارہ، یہاں میری باجی کی سسرال ہے"

اب ہم کھل کر باتیں کرنے لگے اور ٹرین برق رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی۔

آخر کار ٹرین اپنے وقت کے مطابق پانچ منٹ دیر سے پٹنہ اسٹیشن پر پہنچی۔ میں سب سے پہلے اتر پڑا۔ اب میری موجودگی غیر ضروری تھی۔ اسٹیشن پر اس کے شوہر کے آنے کی بات جو تھی۔ اچانک پلیٹ فارم پر منظور کو دیکھ کر میں چونک پڑا۔ وہ بھی متحیر ہوا۔ "یہ اچانک" میں نے ہنس کر کہا "ہاں۔ اچانک پروگرام بن گیا۔ سوچا کہ بھابی سے شرف نیاز بھی اچانک حاصل ہو جائے گا اور ملاقات بھی ہو جائے گی مگر تم کیسے آ گئے؟"

"شیریں، اچانک پٹنہ چلی گئی تھی۔ اسی ٹرین سے آنے والی تھی" منظور نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر تلاش کرنے کی کوشش کی۔

ایک خیال ذہن میں ابھرا۔ مگر میرے ہم سفر کا نام مجو تھا اس وقت تک مجو قریب آ چکی تھی۔ وہ ہنس کر بولی "شیریں بھی آپ کو ریسیو کرنے کے لئے اچانک آئی ہے"

"ارے تم نے اسے کیسے پہچانا" منظور نے متعجب ہو کر اپنی بیوی سے پوچھا۔

"اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

"تم دونوں کا تعارف ٹرین میں ہو چکا ہے؟" منظور نے حیرانی سے پوچھا۔

"شیریں کھل کھلا کر ہنس پڑی اور بولی: [illegible] سامنے سفر میں تمہارے دوست نے [illegible]"

منظور نے [illegible]

میں نے [illegible] ہو کر کہا لیکن [illegible] اسٹیشن پر آپ کے [illegible]

عزیزہ ایم۔اے (میرٹھ) کا ایک خط

جناب محترمی مکرمی ماموں جان قبلہ گاہی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ماہ مارچ کے رسالہ "حریم" میں یہ پڑھ کر ازحد مسرت ہوئی کہ فہیم بھائی کی شادی مبارک ۸ر مئی ۱۹۸۲ء کو طے پاگئی ہے ہم بہنوں اور والدہ محترمہ اور والد صاحب کی جانب سے پُرخلوص تہہ دل کے ساتھ مبارکباد قبول فرمائیں۔

جس خلوص و محبت کے ساتھ آپ نے بذریعہ حریم دعوت نامہ تحریر فرمایا ہے اس کی بھی ہم بہنیں اور والدین بے حد شکر گزار ہیں اور بارگاہ رحمت خداوندی میں دعا گو ہیں کہ اس جوڑے کو دین و دنیا کی خوشیوں سے نوازے اور اپنے بزرگوں کی مایۂ ناز خدمات کو بدستور ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

ہمارے اس فخر النساء اور رہبر خواتین رسالہ حریم کے لئے نیک فال اور اس کی شاندار تاریخ کا ایک روشن و تابناک باب ہو، انشاء اللہ تعالیٰ۔

میں نہایت شرمندہ ہوں کہ برابر خط لکھنے کا ارادہ کرنے کے باوجود پہلی بار لکھ رہی ہوں حریم ہم لوگوں کو اس لئے بھی عزیز ہے کہ میری پھوپھی جان جن کا میری پیدائش سے بھی قبل انتقال ہو گیا تھا شاید ۱۹۳۰ء تھا۔ وہ حریم کی مستقل خریدار تھیں اور کبھی کبھی مضامین اور کشیدہ کاری کے نمونے بھی تحریر فرماتی تھیں، شادی کے بعد کم عمری میں وفات پاگئیں اسکے بعد حریم میری والدہ صاحبہ اور بڑی بہنوں کے مطالعہ میں رہا اور اب بھی میری والدہ صاحبہ والد صاحب بڑے شوق اور انہماک سے مطالعہ کرتے ہیں اور لمعات و مضامین کے بارے میں بہت پسندیدگی کی رائے فرماتے ہیں شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جس مشن کے آپ علمبردار ہیں مبلغ ہیں میرے والدین بھی ان ہی خیالات کے حامل ہیں اور پردہ عورتوں کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ اپنی لڑکیوں کو پردہ کے ساتھ ہی ایم۔اے تک تعلیم دی ہے جبکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں شعبہ اردو ادبیات کے صدر تھے۔ وہاں مخلوط تعلیم تھی وہاں کے لکچرار بہت زور دیتے تھے کہ لڑکیوں کو کالج میں داخل کر دیں ہر طرح کی سہولیات بہم پہونچائی جائے گی۔ وہاں بہت سے اسلام کے علمبردار مبلغ اسلام اور مصلحین تھے مگر پردے کی بڑی دلائل کے ساتھ مخالفت کرتے تھے اور احادیث کا حوالہ دے کر کہ "خواتین اسلام نے جنگوں میں مردوں کے دوش بدوش کام کیا ہے"۔ تو پردہ کس طرح جائز ہے یہ فرسودہ رسم ہے اور آج بھی وہاں چشم دید دیکھا جاسکتا ہے کہ کیا حالات ہیں مگر قدم قدم ہم لوگوں کو ناگزیر حالات سے دوچار ہونا پڑا پھر بھی خدا کا شکر ہے آپ کی تعلیم پر تقلید کرتے ہوئے ہم لوگوں کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ اتفاق سے میری شادی (صاحبزادہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب) کے ساتھ ہوئی وہ بھی پردہ کو فرسودہ رسم و رواج قرار دیتے ہیں لڑکیاں بے پردگی سے رہتی ہیں مجھ سے بھی کہا گیا کہ میں بھی برقع اتار دوں مگر میرے ناپختہ ذہن میں جو کچھ رچ بس گیا ہے نہیں مٹ سکتا اور اسی طرح پابند ہوں اور ہمارا واحد گھرانہ ہے جو پردہ کا سختی کے ساتھ پابند ہے۔ اس گمراہ کن دور میں جب کہ بڑے بڑے علماء ناصحین جید مبلغین کے قدم ڈگمگا چکے ہیں آپ جس مستقل مزاجی حسن خوبی کے ساتھ اپنے مخصوص طرز تحریر سے پردہ کے مشن میں جدوجہد تبلیغ فرما رہے ہیں، قابل ستائش و تحسین ہیں۔

"لمعات" تو الفاظوں کا ایک بیش بہا خزانہ اور مردہ دلوں کیلئے مژدہ زندگی کا ایک پیغام ہے اور آزادی پسند معاشرہ کے لئے سنجیدگی کے ساتھ راہ مستقیم کی دعوت ہوتے ہیں اس کو پڑھ کر دل کو سکون محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرہ کا بھی کوئی علمبردار ہے۔

قدرت کا قانون اٹل ہے اور ہمیشہ اٹل رہے گا اور ہر زمانہ میں گمراہی کی جانب لے جانے والا ایک طبقہ رہا ہے اور رہے گا۔

عم مکرم! میرے بے ربط خط سے آپ بوریت محسوس فرما رہے ہونگے سچ کہتی ہوں حریم کا اس شدت سے انتظار رہتا ہے کہ جس کے بھی ہاتھ میں پہلے آتا ہے وہ اپنی بھوک پیاس بھول کر حریم کو ختم کر کے ہی دم لیتا ہے۔ اس کا ایک ایک حرف ان قیمتی موتیوں کے مانند ہے جس کے زیور سے ہر عورت خود کو آراستہ کرنے میں فخر محسوس کر سکتی ہے اور اپنی اخلاقی باطنی ظاہری حسن کو دوبالا کر سکتی ہے۔ اس آزادی فیشن پرستی سینما بینی اور گمراہی کے دور میں آپ مصلح اعظم کا کام انجام دے رہے ہیں بیشک خواتین کے زبردست محسن ہیں ہم آپ کا کس طرح شکریہ ادا کریں۔ ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں انشاء اللہ آپ ہمیشہ ہمیشہ رہبر خواتین کے

کے نام سے زندہ پائندہ رہیں گے۔ اللہ آپ کو صحت کلی عطا فرمائے۔ اور عمر میں برکت فرمائے آمین ثم آمین۔

حریم مارچ کے "لمعات" میں بھی اس وقت کی دکھتی رگ کو پکڑ کر اہم کام انجام دیا ہے اور آخر کی چند لائنیں یہ کہ اس کے باوجود پردے کی مخالفت کی جاتی ہے جو اس کی بڑی روک تھا۔ آزادی، فیشن پرستی بے راہ روی کو ہوا دی جا رہی ہے اس بالجبر کے سب سے بڑے اسباب ہیں" یہ سب آج کل بالکل معمولی باتیں ہو گئی ہیں اور ان تمام عوامل کو انجام دینے والیاں بہت معصوم، نیک، بے گناہ اور پاکیزہ مانی جاتی ہیں گویا ان کی رہنمائی کرنے والیاں معاشرہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں کیونکہ وہ آزادی کی علمبردار اور بے حیائی کی آخری حد کو چھو لینے کو زندگی میں کامیابی کی منزل قرار دیتی ہیں اور یہ جملہ تو ہر زبان پر ہوگا کہ "زمانہ کے ساتھ چل کر ہی زندگی کامیاب بنائی جا سکتی ہے"۔ ہمارے میرٹھ میں "بزم خواتین" اس مشن کی کامیابی کے لئے مصروف ہے جو پردہ کرنے والی بچیوں کی راہ میں ہر طرح قدم قدم پر مشکلات حائل کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتیں۔ دل تو چاہتا ہے کہ وہ باتیں جو ہر وقت ہم پردہ کرنے والیوں کے دل کو چیر کر رکھ دیتی ہیں اور دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں آپ کے سامنے کھول کر رکھ دوں مگر آپ سے معافی چاہتی ہوں اس ٹوٹی پھوٹی بے ربط تحریر سے آنجناب اُکتا چکے ہوں گے۔ آپ کی ادارت میں "حریم" تاقیامت زندہ و پائندہ رہے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ دن دونی رات چوگنی ترقی کی طرف گامزن رہے گا۔ معاونین حریم بھی قابل صد تحسین ہیں کہ جس ~~[illegible]~~ لگن اور استقامت کے ساتھ اس کی کامیابی کے لئے مصروف ہیں محترمہ شوکت آپا محترمہ غزالہ آپا محترمہ جانی بیگم صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔ فہیم بھائی کو مبارکباد۔ فقط والسلام۔

تبصرے

یادوں کی لکیریں

یہ ڈاکٹر سیدہ آمنہ شوکت صاحبہ کے دس افسانوں کا مجموعہ ہے جس کے ناشر ماہنامہ "نور" بریلی اردو الٰہ آباد ہیں۔ سائز $\frac{20 \times 30}{8}$، صفحات ۱۴۴ قیمت مجلد کی بارہ روپیہ اور مجلد کی پندرہ روپیہ۔

ڈاکٹر آمنہ شوکت صاحبہ کے افسانے میں نے پہلے کبھی نہیں پڑھے کتاب میں رسم کے مطابق کوئی دیباچہ یا پیش لفظ وغیرہ بھی نہیں، جس سے موصوفہ کے ادبی کیریر پر روشنی پڑتی ہو، بہرحال جو افسانے اس مجموعے میں شامل ہیں انھیں پڑھ کر سیدہ آمنہ صاحبہ کی پختہ کاری کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے افسانے روزمرہ کی عکاسی کرتے ہیں انہیں پڑھتے وقت افسانوں پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ سیدہ آمنہ صاحبہ کو جذبات نگاری میں کمال حاصل ہے اور یہی انکی کہانیوں کی کامیابی کا راز ہے۔ پلاٹ سلجھے ہوئے، عبارت سلیس اور آسان ہے اس لئے کم پڑھے لکھے لوگ بھی ان کہانیوں کو بآسانی پڑھ سکتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ افسانے پڑھنے والے یادوں کی لکیریں ضرور پسند کریں گے۔

ڈوبتے سورج کا کرب

یہ عبدالجبار صاحب کی کہانیوں کا مجموعہ ہے، جن کا قلمی نام عابد ضمیر ہے۔ اس مجموعہ میں جگن ناتھ آزاد، مجتبیٰ حسین، علقمہ شبلی اور احسن مفتاحی نے عابد ضمیر کی افسانہ نگاری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس میں ۲۲ مختصر افسانے شامل ہیں۔ سائز $\frac{18 \times 22}{8}$ صفحات ۱۴۴۔ کاغذ اور طباعت اچھی۔ جلد رنگین گرد پوش سے مزین ہے۔ قیمت عام اڈیشن دس روپیہ۔ ڈی لکس پندرہ، جو موجودہ گرانی کے دور میں مناسب سے بھی کم ہے۔ کتاب کے ناشر محمد نظام الدین صاحب ٹیکا بازار۔ آسنسول ہیں۔

عابد ضمیر محتاج تعارف نہیں اس لئے کہ ان کے افسانے بیسویں صدی اور مختلف اردو رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں انھوں نے زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ ان کے افسانے صرف پاکیزہ تحریر کا نمونہ ہیں، بلکہ ان میں نصیحت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز کی عکاسی میں عابد ضمیر صاحب کو بڑا دخل ہے۔ وہ کہانی ایسے انداز میں لکھتے ہیں کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں اترتے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ڈوبتے سورج کا کرب ہاتھوں ہاتھ بکے گی اس لئے کہ دس روپیہ میں ۲۲ افسانے اور وہ بھی دلچسپ و معیاری بہت سستے ہیں۔

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا غمی سے متعلق ہو۔ خبر کم سے کم الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے اور نمبر خریداری و پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ اس طرح بھیجی جائے کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں وصول ہو جائے۔ ۲۰ کے بعد وصول ہونے والی خبریں ایک مہینہ تاخیر سے چھپتی ہیں۔ ایک سے زائد خبر روانہ کرتے وقت ہر خبر الگ الگ کاغذوں پر لکھیں اور یہ بھی لکھیں کہ کون سی خبر کس ماہ میں شائع کی جائے۔

ولادت اطفال کی خبریں

● مس ماسی رمزی خاں۔ خبر بلا نمبر خریداری و ٹکٹ ملی۔

● مس لبنیٰ ذکریا (کونور) میری بہن زینت عارف، نعیم دوبئی کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۸ فروری ۱۹۸۲ء بروز جمعرات ایک بیٹی عطا فرمائی۔ نام ادم عارف رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے۔

● شگوفہ ناز (سکلسپور) میری بہن دلنواز سلطانہ اور بہنوئی محمد ضیاء اللہ کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۸ مارچ ۱۹۸۲ء بروز جمعرات ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد نعمت اللہ قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر خضر عطا فرمائے۔

● ثمینہ شاہین، روبینہ شاہین (آمبور) میرے ماما فیاض احمد و مامی شکیلہ فیاض کو اللہ پاک نے ۱۵ مارچ ۱۹۸۲ء کو ڈیڑھ بجے شب میں ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد شعیب حسین قرار پایا، اللہ پاک اسے عمر طویل عطا کرے۔

● ایس تنویر اقبال (وانمباڑی) میری ہمشیرہ محترمہ عزت افضل و بہنوئی الیس۔ اے محمد افضل صاحب کو اللہ پاک نے تیسری بار ۲۶ مارچ ۱۹۸۲ء بروز جمعہ صبح ۹ بجکر ۵ منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام واصف کامران رکھا گیا۔

● عنبرینہ ناز بنت قمر لطیف (آمبور) میرے چچا نانا خلیل الرحمن اور چچا نانی فریدہ ناز کو اللہ پاک نے ۸ اپریل ۱۹۸۲ء بروز جمعرات بوقت ۳ بجے دن ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ نام تنزیل الرحمن قرار پایا۔ اللہ پاک عمر طویل عطا فرمائے۔

پیغامات نشاط

● خدائے رحیم و کریم کا ہزار ہزار شکر و احسان ہے کہ ۲ مئی ۱۹۸۲ء بروز اتوار بوقت شام، بمقام بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ اپنے فرزند دلبند عزیزی سید محمد فہیم امہوتوی سلمہٗ کو بشریٰ صدیقی سلمہا (دختر نیک اختر، محترم نیاز احمد صدیقی و محترمہ نسیم آرا صاحبہ) سے بیاہ کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا۔ ۳ مئی کو بارہ دری قیصر باغ لکھنؤ ہی میں دعوت ولیمہ دی گئی۔

عزیزی فہیم سلمہٗ کو غزالہ نے اپنی والدہ مرحومہ آمنہ صاحبہ کو دے دیا تھا۔ اس کی پرورش انھیں کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ افسوس کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے میری خوشدامن موصوفہ کو ہم سب سے اپریل ۱۹۸۲ء میں چھین لیا۔ آج وہ بقید حیات ہوتیں تو ان کی خوشیوں کی انتہا نہ ہوتی۔ بہرحال ان کی کمی کو غزالہ کی بہن محترمہ مس وزیر النساء ناہید نے پورا کر دیا۔ بلکہ یہ کہنا قطعی مبالغہ نہ ہوگا کہ سب کچھ انھوں نے ہی کیا ہے۔ مہینوں سے موصوفہ نے اپنا چین سکھ فہیم پر نچھاور کر رکھا تھا۔ غزالہ اپنی علالت کے باعث شادی کے لوازمات کی تکمیل کر ہی نہ پاتیں۔ لیکن مس ناہید صاحبہ نے فہیم کی شادی ایک خالہ بن کر نہیں ماں بن کر کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جیں شادی کے جن رسم و رواج کے خلاف تھا وہ بھی ادا ہوئیں، اس لئے کہ وہ اپنے دل کے حوصلے نکالنا چاہتی تھیں اور یہ کہہ کر کہ آج بھا بھو (میری خوشدامن مرحومہ) حیات ہوتیں تو نہ جانے کیا کیا ہوتا۔ اس کے بعد میں خاموش ہو جاتا تھا۔

عقد نکاح عزیزی مولانا فاخر میاں سلمہ (فرزند جناب مولانا ناصر میاں صاحب مرحوم) کے ہاتھوں انجام پایا۔ حریمی بہنیں دعا فرمائیں کہ اللہ پاک فہیم و بشریٰ سلمہ اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ اور مجھے غزالہ اور مس ناہید کو ایسی توفیق عطا فرمائے کہ ہم بشریٰ سلمہا کو بہو کے بجائے بیٹی سمجھتے رہیں۔ شادی کی تفصیلات انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ حریم میں شائع کروں گا — نسیم امہوتوی

● پروین جمال شمسی و گوہر جمال شمسی (کلکتہ) میری بہن رعنا جمال (دختر جمال حسین صاحب) کی شادی سلیم الرحمن (فرزند حبیب الرحمن مرحوم۔ کلکتہ) کے ساتھ ۵ جنوری ۱۹۸۲ء بروز [illegible]

اللہ پاک دونوں کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

● مہ جبیں رضا (بیگو سرائے) میری پھوپھی زاد بہن شاہین رضوی (بنت ڈاکٹر ابو الحسن بیچین پورہ سیوان) کی شادی سید جاوید حسنین کے ساتھ ۲۴ر فروری ۱۹۸۲ء کو انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

● طلعت فاطمہ لکھنوی (گومہ) میرے خالہ زاد بھائی پرویز اختر کی شادی میری ماموں زاد بہن آسیہ جبّاری کے ساتھ ۱۲ر مارچ ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں کو شاد و خرم رکھے۔

● رعنا قدیر سلمہا دختر محمد قدیر خاں صاحب، گیسٹ ملک گیتی لکھنؤ کی شادی خالد محمد سلیمان کے ساتھ ۲ر اپریل ۱۹۸۲ء بمقام ہوٹل برلنگٹن بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اہنولوی)

● اردو کے نامور مزاحیہ شاعر جناب شرف علی جھنجھٹ لکھنوی مرحوم کی صاحبزادی قمر جہاں سلمہا کی شادی سید خورشید الاکبر خلف جناب سید رضی اکبر صاحب۔ اکبر پور۔ الہ آباد) کے ساتھ ۸ر اپریل ۱۹۸۲ء کو بمقام لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ روشن جہاں صاحبہ، زوجہ جھنجھٹ صاحب مرحوم کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم اہنولوی)

● عزیزی ڈاکٹر شریف الحسن (ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ) کی صاحبزادی ڈاکٹر پروین اختر سلمہا کا عقد نکاح ہمراہ ڈاکٹر محمد عظیم خاں سلمہ پسر الحاج الیف۔ بی خاں صاحب۔ (اترولہ) بتاریخ ۴ اپریل ۱۹۸۲ء بمقام بارہ دری قیصر باغ۔ لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اہنولوی)

● چودھری شفقت علی صاحب کی پوتی اور چودھری نسیم صاحب کی صاحبزادی سیما خاتون سلمہا (گیسٹ ملک گیتی۔ لکھنؤ) کی شادی محمد غنی صدیقی سلمہ (فرزند جناب عباس علی صدیقی) کے ہمراہ ۴ر اپریل ۱۹۸۲ء کو بمقام برلنگٹن ہوٹل لکھنؤ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم اہنولوی)

انتقال پُر ملال کی خبریں

● حمیدہ خاتون (لکھنؤ) افسوس کہ میری بھابی جان کے والد محترم حامد حسین خاں صاحب (ملیح آباد) نے ۱۴ر مارچ ۱۹۸۲ء بروز چہار شنبہ [illegible] انتقال کیا۔ اللہ پاک [illegible] رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

● طاہرہ بیگم (اچھائپور۔ اے۔ پی) میری چھوٹی بہن ۱۹ر جنوری ۱۹۸۲ء کی شب میں حادثاتی طور پر بمقام کراچی، جل کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔ قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ لالٹین میں تیل کم ہو گیا۔ تیل ڈالتے وقت آگ لگ گئی۔ شوہر اور بچوں نے آگ بجھانے کی کوشش کی۔ لیکن اللہ کو منظور نہ تھا کہ آگ فرو ہو سکے۔ میرے بہنوئی اور بچے بھی زخمی ہو کر اسپتال داخل ہوئے۔ اللہ پاک انھیں صحت بخشے اور اس صدمہ جانکاہ کو برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے۔

● فریدہ واجد (بھنسور) افسوس میرے میرے نانا اردو کے مشہور شاعر جناب اجمل نادری، بنگلوری کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر ۲۹ر جنوری ۱۹۸۲ء کو گیارہ بجے دن میں انتقال فرما گئے۔ انتقال بنگلور میں ہوا۔ تدفین میسور میں ہوئی۔ مرحوم لاولد تھے، لیکن انکے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اللہ پاک مرحوم کو غریق رحمت کرے اور متعلقین و معتقدین کو صبر جمیل دے۔

● اردو کی مشہور ناول نگار بہن نوشابہ سعید ناز صاحبہ کے تازہ ترین خط سے علم ہو کر افسوس ہوا کہ موصوفہ کے نانا محترم الحاج حکیم سراج الاسلام صاحب ۲۲ر جنوری ۱۹۸۲ء بروز جمعہ بوقت صبح صادق بمقام پھلواری شریف انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے سولہ سال کی عمر میں پہلا حج کیا تھا، اس کے بعد متعدد بار یہ شرف حاصل کیا۔ بڑے ہی شفیق اور بزرگ منش تھے۔ اللہ مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم اہنولوی)

بقیہ افسانہ

اچانک

بسلسلہ صفحہ ۲۰

آپ کو کسی اور نام سے پکارا تھا۔

"میرا گھر کا نام منجو ہے۔ ابّو پیار سے اسی نام سے پکارتے ہیں۔"

"ہر بات اچانک ہو رہی ہے۔ تم اچانک آئے۔ خبریں اچانک۔ چھٹی" منظور نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"ہم تینوں [illegible] سامان [illegible] اور اسٹیشن سے باہر نکل کر [illegible] میں سوار ہو گئے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک ایسا شعر ہر ماہ شائع ہوسکتا ہے جو ہمارے دیئے گئے عنوان کے مطابق ہو، ساتھ ہی سنجیدہ موزوں اور معیاری ہو۔ نمبر خریداری لکھنا ضروری ہے۔ ۲۰ر تاریخ کے بعد وصول ہونے والے اشعار شامل نہیں کیے جاتے۔ جون کے لئے عنوان ہے "رفتار" اور جولائی کے لئے "آسمان"۔ ادارہ

وقت کی رو، وقت کی رفتار میرا نام ہے
عزم میرا انقلاب گردش ایام ہے

مرسلہ:۔ نجم النساء منا (بھٹکل)

خدارا وقت کی رفتار دیکھو
قیامت کے ہیں سب آثار دیکھو

مرسلہ:۔ طلعت فاطمہ لکھنوی (گومو)

حیراں کھڑی ہوئی ہے دوراہے پہ زندگی
ناکام حسرتوں کا جنازہ لئے ہوئے

مرسلہ:۔ مسعودہ روحی (حیدرآباد)

حور منہ تیرا تکے ششدر و حیراں بنکر
ہوش پریوں کے اڑے، تخت سلیماں بنکر

مرسلہ:۔ قرۃ العین (نندیال)

پہلو نہ نکلتا تھا کوئی عفو خطا کا
حیران تھی رحمت، وہ گنہگار ہیں تھے

مرسلہ:۔ صوفیہ مظفر (ٹلکو۔ جمشید پور)

مشفق لکھوں، شفیق لکھوں، مہرباں لکھوں
حیراں ہوں اپنے دوست کو القاب کیا لکھوں

مرسلہ:۔ احمدی بیگم (بریلی)

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

مرسلہ:۔ فیروزی قسیم۔ لکھنؤ

• جواب چاہتی ہوں تو جوابی کارڈ یا ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں۔ خریدار بہنیں نمبر خریداری بھی لکھیں۔

کچھ مفید مشورے

• اپنی سلائی کے ڈبہ میں ہمیشہ ایک چھوٹا سا مقناطیس رکھیئے تاکہ سوئیاں ادھر ادھر نہ بکھر جائیں۔

• سگرای کو چھیلنے کے بعد اس کے چھلکے پھینکیے نہیں بلکہ باورچی خانہ کے کسی کونے میں رکھ دیجئے اس سے جھینگر بھاگ جائیں گے۔

• چمچہ بھر لیمو کے رس میں چند قطرے ادرک کا رس ملا کر استعمال کرنے سے بدہضمی دور ہو جاتی ہے۔

• بستر کے نیچے تمباکو کا پتہ رکھنے سے کھٹمل بستر کے قریب نہیں آتے۔

• اپنے برش اور کنگھے کو صاف کرنے کے لئے بیکنگ سوڈا اور نیم گرم پانی استعمال کیجئے۔

• جست کا برتن صاف کرنے کے لئے بند گوبھی کا پتہ استعمال کیجئے۔

مرسلہ۔ بیگم ہوشیار جنگ

معذرت

• حریم اپریل میں ایک خبر ولادت اطفال کے سلسلہ میں نصرت سلطانہ اور عظمت سلطانہ کی جانب سے چھپی تھی غلطی سے کاتب نے ۱۹۸۲ء کو ۱۹۲۸ء لکھ دیا درست کرلیں، ساتھ ہی نومولود کا نام محمد سہیل بھی چھپنے سے رہ گیا تھا۔ نسیم انہونوی

کا چہرہ دبا لیا۔ بالکل ڈول کے یہ سارا ڈرامہ تم نے اسی لیے تو کیا تھا کہ میں گھبرا کے بھاگ آؤں!"

اب دیکھئے گا آپ کا کیا گت بنائیں گے بڑے ابا"

بڑے ابا مجھ جائیں گے کہ اب مجھے شریف ناشی صاحب کی ضرورت ہے!"

سنجو بولا۔

"بہت خوب۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ انہیں گرد و پیش کا احساس ہی نہ تھا اور گرد و پیش میں کھڑے ہوئے لوگ بھونچکوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے!!!

تمام شد

دسویں قسط ۵ ۱۱ ایک نظر ضمیر حریم ۱۵ مئی [illegible]

بڑے ابا نے اسے تعجب سے دیکھا۔ مگر کچھ نہ بولے۔

وہ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا!۔ اور سر جھکا لیا!!

امرینہ ان کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ منہ پھٹ کہیں کچھ کہہ نہ دے۔!

دو لمحوں کی خاموشی کے بعد بڑے ابا ہی نے پوچھا: کیوں کیا بات ہے؟۔ خاموش کیوں ہو؟"

جی۔ میں آپ کی خیریت پوچھنے آیا تھا: سنجو نے کہا

ہم تو ٹھیک ہیں لیکن۔! بڑے ابا بولے: تمہیں کیا ہوا ہے کیا اسٹڈی کا بار۔ بہت زیادہ پڑ رہا ہے تم پر۔

جی۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بڑے ابا۔ بس مجھے ایک بات کا کچھ ملال ہے:

کیا ملال ہے:

بڑے ابا۔ ایک دوست سے۔ میرا جھگڑا ہو گیا ہے۔ وہ پہلے میرا بہت اچھا دوست تھا لیکن اب جب سے وہ دشمن بن گیا ہے!

بیٹے تم نے سنا نہیں۔ بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ ۔ مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ۔ : اور پھر تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بہترین دوست ہی بدترین دشمن ہوتا ہے۔ ملال دل سے دور کر دو۔ اگر وہ تم سے دوستی کا خواہاں نہیں ہے تو نہ سہی تھوڑی دیر کا دکھ ہے! دنیا بڑی وسیع ہے بچے۔ اور یہاں دوستوں کی کمی نہیں!:

بڑے ابا۔ آپ نے بے حد اچھی بات کہی ہے۔ میں اب اس سے نفرت شروع کر دوں گا۔ میرے جرمنی جانے میں کتنا عرصہ باقی ہے؟"

امروز و فردا میں کاغذات مکمل ہو جائیں گے

اگر میں پاس نہ ہو سکا تو کیا ہوگا۔!

تمہیں جرمنی جا کے از سرِ نو ایم۔ ایس۔ سی کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ سمجھے؟!

جی۔!

امتحان کب ہے۔

جی بس اگلے ماہ کی اکیس تاریخ سے شروع ہوگا!۔

میری دعا تو یہی ہے کہ تم پاس ہو جاؤ!۔

آپ کے پاؤں دبا دوں۔ بڑے ابا۔!"

نہیں بیٹے۔ شکریہ!۔

وہ پھر چپ ہو گیا! کچھ دیر بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر اٹھ کر چلا گیا۔ بڑے ابا نے سگار سلگایا اور پھر اپنی تندرستی کی کتاب دیکھنے لگے!۔

ممی۔ میں جاؤں۔ بڑے ابا۔

جاؤ بیٹی۔! تھوڑی دیر بعد کافی دے جانا۔

جی اچھا!۔

وہ ممی کے کمرے میں آئی۔ تب اسے سحر کے کمرے میں ٹیپ ریکارڈ بجتا سنائی دیا۔ [illegible]

[illegible] کتنا نازک ہے دل

[illegible] سے ظالم زمانہ

[illegible] محبت کا بیداد دیکھے

[illegible] ہائے ظالم زمانہ

رہتا۔ نجانے میری دل آزاریوں کا بوجھ اپنے دل پہ لیے کس انداز سے زندگی کے دن گزار رہی ہو۔!"

آپ کو میرا اتنا خیال ہے: وہ اب کھل کر رو دی۔

یقین نہیں آتا: وہ ہنسنے لگا: صرف تمہاری خاطر ہی تو بھاگ آیا ہوں۔

مجھ سے تو آپ کو۔ نن نفرت تھی۔"

"بہت نفرت ہے۔ اتنی نفرت ہے امرینہ کہ میں تمہارے بغیر زندہ رہنے کا تصور نہیں کر سکتا۔!"

اس نے اس کی بانہہ تھام کر ہلکی پھلکی گڑیا کی طرح اٹھایا اور اپنے وجود میں چھپا لیا۔!

ایر پورٹ خالی ہو چکا تھا۔ مسافر جا چکے تھے! طیارہ دور خلاؤں میں آہستہ آہستہ گم ہو رہا تھا!۔

مگر سحر کہاں تھا!۔

سحر کہاں ہے۔ سحر کہاں ہے۔ اس کا جہاز چلا گیا۔

وہاں ایک بھگدڑ پڑی تھی۔ لیکن لاحاصل۔ سحر کہیں نہ ملا کسی کو نہیں ملا۔ پریشان حال۔ وہ سب گھر واپس ہوئے۔ ان کے دل خوف سے پُر تھے آخر کہاں بھاگ گیا تھا وہ۔!

اوپر پہنچ کر وہ یکبارگی امرینہ کے کمرے کی طرف لپکے۔ باتوں کی آوازیں یہیں سے آ رہی تھیں۔!

امرینہ بستر پہ نیم دراز تھی۔ سحر اپنے اسی لباس میں ملبوس اس کے سرہانے بیٹھا اس کا سر دبا رہا تھا!۔

اب تو تمہارا بخار بالکل کم ہے: سحر نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس

منجو کہا: آپ میرا سامان لے کر چلیے۔ میں ایک گرم کپ کافی پی کر ابھی آتا ہوں
اچھا اچھا: وہ بے سبب سے آئے!۔
کہاں ہیں منجو؟ رحمان صاحب نے پوچھا۔
کافی پینے گئے ہیں۔ سر میں درد تھا: عباس احمد نے کہا۔
لیکن وہاں سا تھ سے لے کر رحمان صاحب برآمدے کی طرف بڑھ گئے!
منجو ادھر سے باہر آیا۔ جھجکی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور آگے بڑھ کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا!
کہاں۔ صاحب۔ کہاں جانا ہے! ٹیکسی ڈرائیور پوچھ رہا تھا۔ گھر چلنا ہے بھائی۔ اپنے گھر چلنا ہے!: منجو نے کہا۔ اور پیچھے ٹک کر آنکھیں بند کر لیں۔
جو ٹیکسی اسے ایرپورٹ لائی تھی۔ اسی نے اسے واپس گھر پہنچا دیا
منجو دوڑتا ہوا اوپر پہنچا!۔
امرینہ اپنے کمرے میں تنہا تھی۔ اور اپنی حیات کی بے پایاں خلا میں اکیلی چکرا رہی تھی!
اس کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں!
دلدوز سسکی نے اس کو کتنا ہی مضطرب کر دیے!
بڑا مانوس انداز تھا!
وہ گھبرا کر اٹھی۔
"آپ" امرینہ کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
ہاں۔ منجو کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ طاری تھی: تمھیں چھوڑ کر کیسے چلا جاتا ... پاگل لڑکی۔ میں مجھے سمجھایا نہ۔ میں سوچتا

وہ پاگل ہونے لگی۔ کیا چاہتا ہے یہ آدمی۔ کیوں اسے بے چین کر رہا ہے اب وہ اس کی راہوں سے ہٹ چکی ہے تب بھی اسے قرار نہیں۔ کیا وہ سچ مچ چلا جائے گا۔ چھ سال کے لیے۔ از خود جائے۔ اس نے اپنی حرکتوں سے اتنی نفرت دلا دی ہے کہ اب اس کے لیے دل میں رتی بھر محبت نہیں رہی۔ اچھا ہے وہ بھی سکھ کی سانس لے گی۔
اور پھر۔ دونوں کی راہیں بالکل الگ الگ ہو گئیں!
انھیں آپس میں بات چیت کیے پورے پانچ چھ مہینے گزر چکے تھے۔
امرینہ کا امتحان ہو چکا تھا!
منجو کا امتحان بھی رہا تھا۔ مگر جلد ختم ہونے والا تھا۔ ابھی اس کا پریکٹیکل باقی ہی تھا کہ باہر جانے کے کاغذات مکمل ہو کر آ گئے!
منجو تو دیوانہ ہو گیا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر چلا جاتا!
بہت دنوں کے بعد اس کے لبوں پر تبسم نظر آیا تھا!
بچی جان کا دل ڈوبنے لگا تھا! چلا جائے گا ان کا بیٹا ایک طویل مدت کے لیے۔ بجائے اس کی عدم موجودگی میں یہاں کیا ہو جائے!
خدا خدا کر کے ایک مہینے بعد پریکٹیکل بھی اختتام کو پہنچے! اور اسی رات کو وہ اپنا رخت سفر درست کرنے لگا!
بچی جان کو بے حد مغموم دیکھ کر بڑے ابا نے منجو سے کہا: یہ کوئی رنجیدہ ہونے کی بات نہیں ہے۔ خوشی کا سودا ہے۔ تمھیں یہاں بھی بہت اچھی سروس مل سکتی ہے اپنی ماں کو رنجیدہ کر کے مت جاؤ!
مجھے زور دیجیے بڑے ابا۔ خدا کے لیے مجھے جانے دیجیے: وہ ان کے قدموں پر ہاتھ رکھ کر گڑگڑا دیا: میں امی کو بھول تھوڑا جاؤں گا!

سنجر بے حد مسرور تھا۔!

رحمٰن صاحب بھی آ گئے۔ بظاہر وہ خوش تھے۔ بباطن زمین میں اترے جا رہے تھے سنجر تو بے شک اپنا مستقبل سنوارنے جا رہا ہے لیکن ان کے مستقبل کا کیا ہوگا۔؟ کیا وہ اس کے بغیر جی سکیں گے۔! خود کو لاپرواہ اور خوش و خرم ظاہر کرنے کے لیے انھیں اپنے آپ سے بڑی شدید جد و جہد کرنی پڑ رہی تھی۔!

بڑی جان کی طرف دیکھنے سے ان کا کلیجہ منہ کو آتا۔ اور وہ ان سے اکیلے میں ملتے ہوئے گھبرانے لگے۔ کیا ہوگا اگر یہ سادہ لوح ہستی ان کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ وہ اسے کس طرح تسلی دے سکیں گے؟!

امی بھی بہت پریشان تھیں!۔ انھوں نے سنجر کو منع کیا۔ وہ نہ جائے۔ اسے یہاں کمی کس بات کی ہے۔ بڑے ابا اسے بے حد عمدہ ملازمت دلوا دیں گے!۔

وہ ہنستا ہوا ان سے لپٹ گیا تھا! "بڑی امی۔ کیا آپ کا دل نہیں چاہتا۔ آپ کا بیٹا فارن رٹرنڈ ڈاکٹر کہلائے۔!

نہیں۔ میرا جی نہیں چاہتا۔ تم میرے سامنے رہو۔ میرے لیے یہی کافی ہے"! وہ رو پڑیں۔ اور اسے بے تحاشا چومنے لگیں!۔

مگر اب وقت گزر چکا ہے۔ بڑی امی۔ اب بڑی دیر ہو چکی ہے "کس بات کی دیر ہو چکی ہے۔!

[illegible] نہیں جا کہنے لگا تھا: وہ ادھر کا دل سے جھینپا۔

امرینہ نہیں جانتی تھی کہ کس کا چہرہ کو محبت کہتے ہیں۔ وہ کیا ہے! لیکن اب جو

کو اپنے اندر سمیٹ کر آہستہ سے بند ہو گئی تھیں۔؟

اُف خدا وندا۔ اس نے اپنے بال پکڑ لیے۔ اس وقت کو اگر اس کی زندگی میں آنا ہی تھا تو کچھ پہلے کیوں نہ آ گیا؟۔

اگر وہ چلا جائے گا تو ایک طویل مدت تک رہے گا۔

وہ چھپتا رہے گا!۔

پھر امرینہ اسے واپسی پر نہ ملے گی!۔

تھما دیا جائے گا اس کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں۔

جدائی کی مدت بڑی طویل ہے۔!

اُف وہ۔ اناؤنسر کی دلخراش آواز آ رہی ہے۔

طیارہ رن وے پر آ رہا ہے۔

بمبئی جانے والے مسافر تیار ہو جائیں۔ شکریہ۔

وہ پرواز کر جائے گا۔

اس کا جہاز خلاؤں میں اڑتا رہے گا۔

اور یہ لوگ۔ جب گھر پہونچیں گے۔ تب۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گی۔ ان سب میں۔ وہ نہیں ہے۔ ان میں سنجر نہیں ہے!۔

زہرِ غم پینے کے لیے وہ اکیلی رہ جائے گی!۔

نہیں۔ مجھے نہیں جانا ہے!۔

کیا میرا مستقبل امرینہ سے بڑھ کر ہے۔!

تمھارا جہاز آ گیا ہے۔ سنجر! "وقاص احمد کہہ رہے تھے: مسافر جا رہے ہیں۔ تم بھی چلو!"

میرے سر میں سخت درد ہے۔ وقاص بھائی۔ "سنجر نے کہتے ہوئے

امرینہ ۔ سنجر نے اسے ہلایا جلایا ۔ مگر اس کا بدن بوجھل ہو کر اس کے بازوؤں میں جھول گیا !

کیا ہوا ۔ کیا ہوا ۔ کتنی آوازیں دروازے پر گونجیں ۔

سنجر نے امرینہ کے بھیگے وجود کو آگے بڑھ کر بستر پر لٹا دیا ۔ ! اور اس کا چہرہ تکنے لگا ۔ اس کے دل کی عجیب حالت تھی ! ۔

بے ہوش ہو گئی ۔ عجیب لڑکی ! ۔ نجانے کون بولا ۔

مگر جلد ہی اسے ہوش آ گیا ۔

بہت وقت ہو رہا ہے ۔ جلدی چلو بھائی ! ۔ کوئی اور بولا ۔ امرینہ کے پاس کسی کو بٹھا دو ۔ کاش یہ بھی ایرپورٹ جا سکتی ! ۔

گھر کی پرانی ملازمہ امرینہ کے پاس متعین کر دی گئی ! ۔

ایک گہری سانس لے کر سنجر نے امرینہ کی طرف دیکھا ! ۔ امرینہ نے سر جھکا کر کانپتا ہوا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ دیا ۔

السلام

اور بس ۔ سنجر کا وجود کرچی کرچی ہو گیا ! ۔

ایرپورٹ پر میدان حشر کا منظر تھا ۔ دوڑ دھوپ ۔ بھیڑ ۔ شور و ہنگامہ طیارے کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا ۔ مسافر سامان لیے ۔ ٹیکنگ مشین کی طرف بھاگے جا رہے تھے ۔

اور ایک طرف ۔ جب سے بے خبر اس جہان سے ۔ ہوسے بڑی دور اس کے دماغ میں سناٹے گونج رہے تھے ۔ اس کا جسم پھونک رہا تھا ! ۔ وہ دو آنکھیں اس کی آنکھوں میں کھلی تھیں ۔ جن میں غم اور پچھتاوے کی ایک دنیا ۔ اب ہونٹوں پر کانپتا سوال تھا ۔ مگر اس کی تمام مجبوری

ایک خلش مسلسل اس کے دل میں ہو رہی تھی ۔ وہ کیا تھی ۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے بس ایک خیال ، ایک وحشت ، ایک تڑپ ۔ وہ بے ربط ہے ۔

دماغ کہتا ہے ۔ تو تمھیں کیا پریشانی ہے ۔

دل کہتا ۔ روک لے پاگل ۔ اسے روک لے ۔ وہ کسی کا کہنا نہیں مان رہا ۔

ٹرے ابا کا بھی نہیں لیکن تیرا ایک اصرار ہی اسے روک لے گا ! ۔

اور دل اور دماغ چپکی کی رسّی پاش پاش ۔ جس میں دیوں کی طرح پگھلی جا رہی تھی ۔ وہ بھی کسی کا کہنا ماننے کو تیار نہ تھی ۔

سچ سچ ۔ مجھے اس سے نفرت ہے ۔ آج تک سوائے اس کا مضحکہ اڑانے اسے ستانے اور اس پر پھبتیاں کسنے کے اس نے اس کے ساتھ کیا ہی کیا ہے ۔

اور اس کے دل میں اس بد ذات لڑکی کی محبت رچی بسی ہے ۔ جیسے وہ خواب میں دیکھتا ہے ۔ وہ مکر تو نہیں سکتا اس نے باجی کے سامنے لن ترانی گائی تھی ۔ ہنہ کہیں سے آئے اجڑے خواب ۔ جس میں وہ اجنبی لڑکی بسی ہوئی ہے تو پھر یہ کیا دیوانہ پن ہے ۔ وہ اس لڑکی سے شادی کر لے گا ۔ اور میں ۔ کیا باجی کے افسانوں کے ناکام محبت مایوس الفت محروم القسمت ہیروئن کی طرح میں چپکے چپکے زہر غم پیئں اور آہستہ آہستہ اپنی حیات کی شہ رگ کاٹتی رہوں گی ؟ ۔

نہیں ۔ میں دل کو سمجھانے کی کوشش کروں گی ۔ ! ارے پاگل کہیں تو نے سنا ہے کہ پتھر میں بھی جونک لگی ہے ۔ !

اور وہ دل کو سمجھانے لگی ! ۔

اس کے بے اعتنائی بے رخی بدستور تھی ۔ لیکن اب جان بوجھی ہوئی تھی ۔ جیسے کوئی نا سمجھ اپنی قیمتی چیز کہیں رکھ دے اور اداکاری کرنے لگے کہ وہ اپنی چیز بھول گئی ۔ گھر بھر میں چھوٹی موٹی قیامت تو روز ہی مچی رہتی ہے ! ۔ لیکن یہی تو اس

وقت ہوگی جب اسے رخصت کرنے کے لیے، تمام احمد اور باجی بھی آ گئے!۔

سنجر کو اپنے رزلٹ کی پرواہ بھی نہ تھی!۔ وہ تو بس اس انتظار میں تھا کہ کب ویزے کی تاریخ آئے اور وہ چل دے!۔

بڑوں نے دل کو سمجھا لیا تھا۔ نئی نسل کی ضد، خودسری اور سرکشی کے سامنے خود انہی کو شکست ہوگی۔ لہٰذا شکست کا دکھ سہنے کا کیا فائدہ۔ جو رہا ہے جو کچھ اسے ہونے ہی دو!۔

اور پھر۔ وہ ایک روز جا کر ویزا لے آیا۔

دالان میں کھڑے ہو کر اس نے پرمسرت قہقہہ لگایا تھا۔ اور بولا۔

"لو بجو۔ اب ہم چلے۔ بہت جھگڑتے تھے نا بجو آپ سے۔ آپ کی کہانیوں کے اچھے اچھے پیارے پیارے کرداروں کے نام رکھتے تھے۔ بجو۔ وہ سب جھوٹ تھا۔ بناوٹ تھی۔ آپ اسے سچ سمجھتی تھیں۔ اور دل دکھاتی تھیں۔ ہاں۔ بجیا سچ سچ وہ سب بناوٹ تھی۔ میں آپ کو دل سے تھوڑی چھیڑتا تھا۔ مجھے آپ سے بڑی محبت ہے بجیا۔ کاش آپ میرا دل چیر کر دیکھ سکتیں۔!"

اس کے آنسو گالوں پر بہنے لگے۔

[illegible] ہی برا ہوگیا۔ اس نے سنجر کو سینے سے لگا لیا: "جاؤ۔ سنجر تم [illegible] جا رہے ہو۔ نجانے کب آؤ گے۔ اس عرصہ میں یہاں کیا کچھ نہ ہو [illegible]۔ سنجر [illegible] کی یہاں کمی ہے۔ تم کہیں ملازم کیوں نہ ہو جاؤ۔ [illegible] کرو۔!"

[illegible] آپ نے میرا مرتبہ [illegible] کر دیا ہے: اس نے اس [illegible] آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور وہ [illegible] رہا تھا!۔

[illegible] روز [illegible] آ پہونچا۔ جب اسے جانا تھا! وہ [illegible]

کچھ تو کہہ رہا تھا: "میں نے تمہیں ہمیشہ ستایا ہے۔ ہمیشہ رلایا ہے۔ اس کا بدلہ تو یہی۔ تم سے۔ دور جا رہا ہوں۔ پھر کبھی تمہارا دل نہ دکھے گا!۔ امرینہ! کیا۔ وہ ساری کہانیاں تم نے۔ سچ سمجھی تھیں۔!"

وہ کھلی کھلی سی آنکھوں سے اسے یک ٹک تکتی رہی۔

"میں تم سے۔ یہ کچھ بھی نہ کہتا۔ امرینہ۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ میری بچکانی سی باتوں کا بوجھ تمہارے دل پر رکھا رہے! تم جب کبھی مجھے یاد کرو۔ نفرت سے یاد کرو۔!"

اس کے دماغ نے اس کے وجود کو چکر دینے شروع کیے تھے!۔

سنجر مسکرایا۔

"میں تمہاری دنیا سے جا رہا ہوں۔ مگر۔ میری محبت کا ایک تار۔ ایک امام ضامن تمہارے پاس نہیں۔ اچھا۔ خدا حافظ"

اور تبھی وہ بے ہوشی کی حالت میں آگے بڑھ آئی۔ جیسے اس سے ٹکرا جائے گی!۔

"سنجر!" امرینہ کے لبوں سے نکلا!۔

اور وہ دفعتاً اس کے سینے سے آ لگی!۔

سنجر نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ امرینہ کا بدن جل رہا تھا۔ [illegible] بدن کو جلا رہا تھا! اور سنجر کے اندر کی دنیا میں بڑا خوفناک زلزلہ آیا ہوا تھا۔ وہاں توڑ پھوڑ مچی تھی! اس کے دل کی دھڑکن رک رہی تھی!۔

"امرینہ۔! امرینہ۔ ہوش میں آؤ" سنجر بدحواس تھا! مگر امرینہ کو ہوش کہاں تھا۔ اس نے بس ایک دفعہ کھلی کھلی آنکھوں سے سنجر کو آنکھوں میں [illegible] اور بس اس کی گردن ڈھلک گئی [illegible] غافل ہو گئی۔

بچا بچا۔ لڑکی بن رہی ہے۔ مگر یہ جسمانی عارضہ نہیں۔ وہ تو بھیا کے جانے
سے اس حال کو پہونچی ہے اے ماں۔ بچا کہوں بہن :
جلدی چلئے۔ وقت ہو رہا ہے : کسی نے ہانک لگائی۔
ایک لمبا سا سانس لے کر سنجر نے کہا۔
میں۔ امرینہ سے۔ مل آؤں۔ !"
سب کاروان کی شکل میں باہر کی طرف رواں دواں تھے کسی کے ہاتھوں میں
پھولوں کے ہار تھے کسی نے سنجر کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ !بڑے ابا۔ بڑی آپا۔
اپنا ہوش جا چکے تھے۔ ان کے نزدیک یہ جذبات انگیز ملنا ملانا سب بکواس تھا۔
ادھر۔ جو آدمی جا رہا ہے وہ پھر چلا آئے گا ! ۔
امرینہ کے کانوں میں وہ مانوس آہٹیں گونجیں۔ اسے کوئی جانی پہچانی مہک
محسوس ہوئی۔ جو اس سے بڑی دور پہونچ چکی تھی ! ۔
امرینہ ! : بہت دنوں بعد ایک دلکش آواز امرینہ کے دل کی پنہائیوں
میں گونجی۔

امرینہ اپنے کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ اس کا عجیب حال ہو رہا تھا
بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور آنسوؤں کی دھند نے
اس کے اور سنجر کے درمیان یہ وہ سامان رکھا تھا ! ۔
امرینہ۔ میں جا رہا ہوں۔
امرینہ نے کچھ نہیں سنا۔ اس کے حواس ڈوب رہے تھے۔ سنجر جا رہا ہے۔ سنجر
جا رہا ہے۔ سنجر جا رہا ہے :
اس کے اطراف ہزاروں آوازیں چیخ رہی تھیں ! ۔
امرینہ۔ میں جا رہا ہوں ! ۔ مجھے خدا حافظ تو کہہ دو : وہ شاید یہی سب

میں اس کے لیے ناشتہ پکتا رہا۔ بہت سے لوگ آگئے اسے رخصت کرنے کے لیے۔ حتیٰ کہ
بڑی آپا۔ ان کے تمام بیٹے اور بہوئیں بھی آگئیں ۔ !
معلوم ہو رہا تھا جیسے پھر کوئی شادی تھی اس گھر میں ۔ !
سب لوگ خوش تو بہت کم تھے۔ سنجیدہ اور غمگین زیادہ تھے۔
بڑی آپا کی بھاری مردانہ آواز دالان میں گونج رہی تھی : میں دیکھ رہی ہوں کہ
ایک سرے سے سب ہی کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ ارے۔ کیا کوئی باہر پڑھنے نہیں جاتا
اب تو جیسے دیکھو دولت ہی کی خاطر غیر ملکوں کی طرف دوڑا جا رہا ہے۔ آمنہ کی کچھ
پھوہڑی لگی ہے۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ آنکھ بند کرکے کھولے گی کہ یہ زمانہ گزر
ہو جائے گا۔ اور لڑکا ماشاء اللہ بڑا آدمی بن کر چلا آئے گا۔
اس کے بعد وہ خلاف عادت ہنسیں : اب بسورتی پھر رہی ہو۔ خبردار جو کوئی
دونوں ہاتھوں سے نہ بٹور لیو۔ اچھا۔ بیٹا۔ دیکھو۔ گھور رہے ہو۔ !
بڑی آپا۔ میں کہاں رو رہی ہوں : آمنہ بیگم نے جواب دیا۔ !
کیا رحمان بھی آنسو بہا رہا ہے۔ ؟ وہ گرجیں۔
جی۔ جی نہیں تو۔ بڑی آپا : رحمان صاحب عجیب سی ہنسی ہنسے : میں بھلا
کیوں خواہ مخواہ رونے لگا ! :

دیکھو۔ میں کہے دیتی ہوں : وہ دہاڑیں : لڑکے کے جاتے وقت خبردار کسی کی
آنکھ میں آنسو نہ آئے۔ بیٹی تم سے اوروں کی چاہ کو کہتا ہو۔ لو اور سنو۔ یہاں لڑکا
نقطہ پڑھنے جا رہا ہے تو ندی نالے ایک ہوئے جا رہے ہیں۔ بھلا وہ کیا زمانہ
تھا۔ جب ان کے لڑکے جوش شہادت میں جہاد کے لیے گھر سے نکلے تھے اور
مائیں انھیں ہنسی خوشی رخصت کرتی تھیں ! ۔ بات یہ ہے کہ اب مسلمانوں
کے ایمان ہی غارت ہو گئے ہیں۔ اے توبہ ۔ !

سچ ہی تو کہہ رہی تھیں بڑی آپا۔ اور کیا۔ بزرگوں کی بزرگانہ بات۔ روتے بسورتے چہروں پر کچھ تازگی آئی۔ سینوں میں دم ٹھہر گیا۔

سہ پہر کو سنجر جانے والا تھا۔

میز پر پھولوں کی بے شمار ٹوکریاں دھری تھیں۔ پاس امام ضامنوں کا ڈھیر تھا۔ [illegible] رکھی تھی۔!

[illegible] تھا۔ ہر [illegible] بھیڑ بھاڑ تھی! مگر سب سے بے نیاز بڑے ابا اور [illegible] آپا سب سے الگ تھلگ بیٹھے اپنی گونجدار آواز میں گفتگو کیے جا رہے تھے۔

ان کے نزدیک یہ سارا شور وغوغا محض لڑکپن تھا!۔

سنجر نوشینہ کے پاس بیٹھا تھا! چپکے سے بولا۔

میرے بس میں اگر ہوتا تو میں بڑے ابا اور دادی اماں کی شادی کرا دیتا۔ بجیا۔ کیسے خاندانی میاں بیوی ہوتے!"

ارے چپ۔ شیطان۔ ان کا کوئی آدمی سن لے تو تیری بوٹیاں اڑا دے"

نوشینہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی!۔

ملازم نے اطلاع دی: ایرپورٹ جانے کے لیے گاڑیاں آگئی ہیں!"

بجیا جان کا دل [illegible] اڑ گیا۔ بڑی آپا کے صاحبزادے کے پاس ان کی [illegible] کہا: "سمیر اور بھائی سیف السلطان الگ چلے [illegible] اطمینان سے آئیں گے!

[illegible] چلیں گی؟: بڑے ابا نے حیرت سے ان کے [illegible]

[illegible] پوچھا۔

کیوں؟: وہ [illegible] کیا تم [illegible] پوچھا؟"

جی ہاں۔ جی ہاں۔ اگر آپ چلیں گی تو میں بھی چلوں گا۔ اور اس وقت عمر بھر میں پہلی مرتبہ ان لوگوں نے بڑے ابا کو ہنستے ہوئے دیکھا!

سنجر باری باری سب سے رخصت ہوا۔

عجیب منظر تھا۔ ان سب کے لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ تھی اور وفورِ گریہ سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں!۔

سنجر بھی خود کو سنبھال رہا تھا! لیکن اس کے بس کی بات نہ تھی! کئی دفعہ چھپ چھپ کے رو چکا تھا!۔ وہ تو جبراً جا رہا تھا۔ ہنسی خوشی نہیں جا رہا تھا!

اسے سب نے ہار پھولوں سے لاد دیا۔ اس کا سیدھا بازو امام ضامنوں سے گندھا ہوا تھا۔!

جب یہ سارا قافلہ کاروں میں بھرنے لگا تب بڑی آپا نے پوچھا: "فاطمہ۔ تمہاری چھوٹی لڑکی نظر نہیں آ رہی۔ کیا وہ بھی کہیں کونے کھترے میں منہ دیے آنسو بہا رہی ہے۔!"

ممی نے کہا: "بڑی آپا۔ اسے کل رات سے بہت تیز بخار ہے۔ سر کے درد سے وہ بے چین ہے۔ ورنہ بھلا وہ سب کے سامنے کیوں نہ آتی۔ کیوں نہ ساتھ جاتی!"

وہ بھلا۔ لڑکی کو ایسے ہی موقعہ پر بیمار پڑنا تھا!: انھوں نے کہا اور پھر بلکتی ہوئی امرینہ کے کمرے میں گئیں۔

اس نے اپنے پاگل ہوتے ہوئے دماغ کو سنبھالنے کے لیے سر میں کس کے رومال باندھ رکھا تھا! اس کا سارا بدن کسی بھٹی میں جل رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے شعلے تھے۔ انفاس میں آگ۔! وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی!۔

[illegible] کا ہاتھ اس کے گال پر رکھا۔ اور [illegible] گیا۔

THE HAREEM

June 82

Rs. 1/40

ایڈیٹر

سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا سب سے پرانا رسالہ ہے

ماہنامہ حریم لکھنؤ

جلد ۵۲	فہرست مضامین ماہ جون ۸۲ء عیسوی		نمبر صفحہ

قیمت فی پرچہ ——— ایک روپیہ چالیس پیسہ
قیمت سالانہ منی آرڈر سے -/۲۲ روپیہ
قیمت مخصوص -/۴۰ روپیہ
قیمت اعزازی -/۲۷ روپیہ
وی پی سے منگوانے پر چار روپے پچاس پیسے زائد
غیر ممالک سے -/۴۵ روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ بھارتی کرنسی میں
اپریل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

ناشر نسیم انہونوی

آفس و خط و کتابت کا پتہ: نسیم بک ڈپو - لاٹوش روڈ لکھنؤ فون نمبر ۲۲۰۴۴
نسیم انہونوی نے ... پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم لکھنؤ سے شائع کیا

لمعات

ان حریمی بہنوں سے معذرت کرتے ہوئے جو میرے سفر بھوپال و بمبئی کی اشاعت پر معترض ہو چکی ہیں، اپنے بیٹے فہیم سلمہ کی شادی کی تفصیلات شائع کر رہا ہوں، بلاشبہ یہ ایک نجی بات ہے اور ضروری نہیں کہ اس سے سبکو دلچسپی ہو لیکن اعتراض کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ میں نے اپنی زندگی کے ۲۵ سال حریم کے لئے صرف کئے ہیں، کتنی محنت کی ہے اور کسطرح حریمی بہنوں سے تعلقات قائم رکھکر انھیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں صرف حریمی بہنوں کو اس کا علم ہوگا۔ اس کے بعد کیا مجھے اس کا حق بھی نہیں ملنا چاہیئے کہ کبھی کبھی میں اپنی نجی باتوں کے لئے اس کے چند صفحات لے لیا کروں۔

۲۰ رمئی ۱۹۸۴ء کو فہیم سلمہ اور بشریٰ سلمہا رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے ۲۶ رمئی کو بارہ دری قیصر باغ میں دعوت ولیمہ دی گئی، جس میں میرے صد ہا کرمفرما حضرات نے شرکت فرماکر عزت بخشی، خواتین کی تعداد مردوں سے بھی زیادہ تھی شرکاء میں ہر مکتب خیال کے حضرات شامل تھے۔ بہت سے برادران وطن نے بھی شرکت کی، ان کے لئے ویجی ٹیرین کھانوں کا انتظام تھا۔

حتی الامکان میں نے ان تمام اعزہ اقربا اور دوست احباب کو مدعو کیا تھا لیکن بعد میں علم ہوا کہ چند حضرات کو کارڈ دیل ... میں سہواً انھیں دعوت نامہ دانا ذکر سکا۔ ایسے تمام اعزہ اقربا سے دست بستہ معذرت خواہ ہوں۔ میری کوشش تھی کہ ایک ایک فرد کو جس سے میری صاحب سلامت رہی ہو بلاؤں، لیکن یہ کام آسان نہیں، ہر کوشش کے باوجود بعض نام ذہن میں نہ آسکے۔

تقریب میں مقامی حضرات کے علاوہ باہر کے بھی بہت سے عزیز و اقربا نے اس شدید گرم موسم میں سفر کرکے شرکت کی۔ ان میں سب سے پہلے میں بہن عفت موہانی صاحبہ کا نام لوں گا جو اپنے فرزند خالد سلمہ کے ساتھ حیدرآباد سے لکھنؤ کا طویل سفر کرکے تشریف لائیں اور شادی کی تمام تقریبات میں شرکت فرماکر ۲۵ مئی کو آنکھوں میں آنسو بھرے ہم سب سے رخصت ہوئیں۔ عفت موہانی کی زندگی ایک مکمل المیہ ہے، جس سے کم ہی لوگ واقف ہوں گے۔ وہ مجھ سے بڑی عقیدت رکھتی ہیں۔ ۲۵ رسال سے میں انھیں بہن سمجھتا آرہا ہوں، لیکن عفت مجھے بھائی کے ساتھ ہی باپ کی جگہ بھی دیتی رہتی ہیں۔ میری تمنا تھی کہ زندگی میں عفت سے ملاقات ہو جائے خدا کا شکر ہے کہ اس شادی میں یہ آرزو بھی پوری ہو گئی۔ عفت ایک سادگی پسند اور خاموش طبع خاتون ہیں، دنیا کے ہنگاموں سے دور رہنا پسند کرتی ہیں۔ قیام لکھنؤ میں انھیں کہیں آنا جانا پسند نہ تھا، لیکن ولیمہ کی دعوت میں ان کا تعارف بہت سی خواتین سے ہوا، ... میں عائشہ صدیقی بیگم انور صاحبہ، بیگم نسیم اقتدار علی صاحبہ، زیبا صلاح الدین صاحبہ اور مسز ... جہاں صاحبہ اور چند دیگر خواتین بھی شامل تھیں۔ جو بزم اردو کی روح رواں ہیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ عفت کے اعزاز میں ایک جلسہ کیا جائے لیکن عفت نے اقرار نہیں کیا۔ آخر ایک روز عائشہ صدیقی صاحبہ نے میرے گھر آکر بمشکل تمام انھیں تیار کیا، اور وہ بھی اس شرط پر کہ ساجدہ مسز قاسم (بمبئی) اس ... صاحبہ (الہ آباد) اور بیگم ... کے ساتھ جائیں۔

سرور جہاں صاحبہ انھیں کھانے پر مدعو کرنے آئیں، بہت اصرار کرتی رہیں، لیکن وہ راضی نہیں ہوئیں۔ شاید اسی لئے سرور جہاں صاحبہ نے جلسہ میں شرکت نہیں کی۔ جلسہ ... عفت نے سب کے اصرار پر اپنا ایک افسانہ "قربانی" پڑھا، جو بہت پسند کیا گیا۔ در اصل عفت نام و نمود سے گھبراتی ہیں۔ حیدرآباد میں بھی وہ شاید ہی کسی سے ملتی ہوں، حالانکہ ان کے ناولوں کو پسند کرنے والی خواتین ہر جگہ موجود ہیں۔

عفت موہانی کے علاوہ جن حضرات اور خواتین نے باہری مقامات سے آکر شرکت کی ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

مسٹر قاسم اے حق ... مسز ساجدہ اے حق (ماہم، بمبئی)

عزیزی سلیم سلمہ (ماہم، بمبئی)

[illegible] (بامردہ ۔ بمبئی)
[illegible] (بمبئی) مع مسز جلالے اور عزیزہ [illegible]
[illegible] اور بے میاں [illegible] تعالےٰ
[illegible] شاہد فرزانہ اور [illegible] اللہ
[illegible] مع مسز شمیم بدرالزماں (بامردہ ۔ بمبئی)
[illegible] صاحب ڈائرکٹر اسسٹنٹ جنرل [illegible] بمبئی
بیگم [illegible] صاحبہ پرنسپل انجمن اسلام اسکول (ولے پارلے ۔ بمبئی)
مسز [illegible] اسد صاحب (بمبئی)
مسز خالدہ حسین صاحب (بامردہ)
مسز [illegible] صاحب رئیس بھوپال مع صاحبزادیاں رعنا ، وشیبا
سلمہٗ تعالےٰ (بھوپال)
چودھری [illegible] صاحب رئیس پیارہ ۔ بارہ بنکی)
[illegible] سید علی محمد زیدی عرف بن میاں صاحب رئیس (اردولی)
چودھری سید حسن عرف الن میاں صاحب " "
[illegible] صاحب ، ریٹائرڈ ایگزیکیٹو انجینیر (پٹنہ)
مسز فرزانہ فرحیا (چائے باسا ۔ سنگ بھوم)
بیگم [illegible] صاحبہ مع فرزند [illegible] سلمہٗ (حیدرآباد)
بیگم پاشا [illegible] مع مسز پاشا [illegible] آگرہ
[illegible] محمد [illegible] صاحب ، ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر (نینی تال)
بیگم صاحبہ اسلام صاحب مرحوم (کانپور)
مسز فرزانہ آفتاب صاحب (کانپور)
[illegible] کمال سلمہٗ (دہلی بھیت)
[illegible] صاحب مع بیگم (دہلی بھیت)
بیگم صاحبہ محمد [illegible] صاحب مرحوم (دہلی بھیت)
بیگم صاحبہ [illegible] امام صاحب مرحوم (دہلی)
[illegible] علی شاہ صاحب ایڈوکیٹ (میرٹھ)
بیگم صاحبہ [illegible] صاحب (لکھیم پور)
[illegible] صاحب (لکھیم پور [illegible])
چودھری [illegible] مع مسز [illegible] اجھوئی
چودھری [illegible] صاحب مع بیگم صاحبہ اجھوئی

چودھری اطہر حسین صاحب اجھوئی
چودھری اظہر حسین صاحب اجھوئی
چودھری انور حسین صاحب مع بیگم صاحبہ اجھوئی
ایس [illegible] صاحب اجھوئی
چودھری [illegible] حسین صاحب مع بیگم صاحبہ اجھوئی
چودھری اختر حسین صاحب مع بیگم صاحبہ اجھوئی
فائقہ شیروانی صاحبہ علی گڑھ
کشور [illegible] صاحبہ علی گڑھ
نوریجہاں صاحبہ (پی۔ ایس سی ڈبل ، گریڈ) مع [illegible] گڑھ
وجاہت علی صاحب سندیلوی سندیلہ
سید سلطان فرزند عبدالعزیز صاحب بمبئی
بیگم صاحبہ عبدالقوی قدوائی صاحب سدھور بارہ بنکی
اپنے عزیزوں اعزہ و اقربا کی فہرست طوالت کے پیش نظر نہیں شائع کر رہا ہوں۔

تقریبات میں سارے کام صاحب تقریب ہی کے ہاتھوں نہیں ہو پاتے۔ بہت سے دوسرے اعزہ و احباب ہاتھ بٹاتے ہیں اس لئے فروگذاشتیں بھی ہوتی ہیں۔ کوتاہیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ ان سب کی ذمہ داریاں بہرحال صاحب تقریب پر ہی ہوتی ہے۔ اس لئے میں اس تحریر کے ذریعہ ان تمام خورد و کلاں سے معذرت خواہ ہوں ، جنھیں کسی طرح کی تکلیف یا شکایت ہوئی ہو۔
شادی کے سلسلہ میں جن ہمدردوں نے ہمارا ہاتھ بٹایا ان کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی۔
اس سلسلہ میں سب سے پہلے شبیر احمد صاحب کا اسم گرامی آتا ہے ، جو میرے عزیز ہی نہیں اب پڑوسی بھی ہیں۔ آپ نے ابتدا ہی سے اپنے زریں مشورے دیئے اور سب سے زیادہ یہ [illegible] فرمایا کر اپنی کوٹھی کا مکمل بالائی حصہ پندرہ روز کے لئے ہمارے مہمانوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔
شبیر صاحب ہی کے ذریعے جناب [illegible] صاحب [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

نگرانی فرماتے رہے۔ ان کی ہمدردی اور خلوص و محبت کا شکریہ ادا نہیں
کرتا البتہ ان کے لئے ہمیشہ دعا کرتا رہوں گا کہ شاد و خرم رہیں۔

عزیزی نسیم اشرفی سلمہ کے چھوٹے بھائی نعیم اشرفی سلمہ نے بھی [illegible]
کی نگرانی میں [illegible] اور دوسرے کاموں میں بھی بڑی مستعدی سے
ہاتھ بٹایا۔

عزیزی کمال احمد (فرزند جناب حنیف حق صاحب مرحوم) [illegible]
نے کمال ہی کر دیا۔ ایک ہفتہ قبل سے آکر تمام خریداری کی ذمہ داری
لے کر ہمہ وقت لگے رہے۔ ہر چھوٹے بڑے کام کا انہوں نے اس طرح
خیال رکھا کہ اپنا کوئی عزیز بھی اس طرح نہ کرتا، اور یہی وجہ ہے کہ
کمال نے میرے گھر میں عزیزوں جیسی جگہ بنالی ہے۔ وہ شادی کے
بعد بھی رہے اور چوتھی میں خوب نار کھانے کے بعد رخصت ہوئے۔

اپنے پڑوسی سجاد صاحب کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہوگی۔
انہوں نے بھی ایک ہفتہ قبل سے رخصت لے کر ہر طرح کے کاموں کو
بڑی دلچسپی سے کیا۔ اللہ پاک انہیں جزائے خیر دے گا۔

محترم طفیل احمد صاحب ایڈوکیٹ جو ہمارے معزز پڑوسی اور
کرمفرما ہیں۔ ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ موصوف نے اپنی کوٹھی
کے دو بڑے کمرے ہمارے مہمانوں کے لئے وقف کر دئے تھے۔

محترم غوری صاحب ہمارے مخلص ترین پڑوسیوں میں ہیں۔
اپنی کم سنی کے باوجود برابر آتے اور مشورے دیتے رہے۔ اپنے رہائشی
مکان کے کمرے بھی ہمارے مہمانوں کے قیام کے لئے وقف کر دئے
تھے اور جو کچھ کر سکتے تھے سب کچھ کرتے رہے تھے۔ اللہ پاک ان
کی عمر میں برکت دے۔

[illegible] سے متعلق کاموں میں سب سے زیادہ تعاون ان کی [illegible]
[illegible] صاحبہ کا رہا جو شب و روز [illegible] کے ساتھ بازاروں کی خاک
چھانتی رہیں۔ وہ [illegible] لیکن میں ان کا
شکریہ ادا کروں گا [illegible] سے زیادہ چاہتی ہیں
[illegible] صاحب [illegible] رہی تھیں۔

[illegible] سب سے زیادہ
[illegible]
[illegible]
[illegible] کام [illegible]

عزیزہ اسماء دختر محمد عمر خان نانپارہ نے ایک ہفتہ قبل سے [illegible]
وغیرہ کے کام میں [illegible] ہاتھ بٹایا۔ اللہ پاک اسے شاد و خرم رکھے۔

عزیزی قسیم اشرفی سلمہ اور مسز فیروز زیدی سلمہا نے ہر کسی کام میں
ہماری مدد کی۔ قسیم کو میں نے ہمیشہ اپنے عزیز رکھا کہ ان سے مجھے
سب کچھ ملتا رہا جو کسی اولاد سے متوقع ہوتا ہے۔ شادی کے دوران
ہی نہیں دلہن کی تلاش کے زمانے سے لے کر شادی کے سب ہی کاموں
میں انہوں نے جس مستعدی اور خلوص سے ہاتھ بٹایا اسے
ہم کبھی نہ بھول سکیں گے۔ دلی گہرائیوں سے ان کے لئے دعا نکلتی ہے۔

سعد اللہ صاحب عرف دولھا میاں صاحب نے جس طرح نجم الحسن کی
شادی میں باورچیوں کے کام کی دیکھ بھال کی تھی، اس مرتبہ بھی اپنی
خرابی صحت کے باوجود تمام کاموں کی نگرانی کرتے رہے۔ عزیزم [illegible]
خالد سلمہ، جنون سلمہ اور مشتاق سلمہ نے بھی ان کی دوستی کا حق ادا
کرتے ہوئے کھانا کھلانے کے سلسلہ میں ہر کام کیا۔

شادی کی دوڑ بھاگ کے کام شاید اس آسانی سے پورے ہو
سکتے اگر عزیزی نور الحسن خان سلمہ نے اپنی جیپ ہر روز کے لئے ہمیں
نہ دے دی ہوتی۔ اس سے ہر کام تیزی کے ساتھ ہوتا رہا۔ اسی طرح
عزیزی اقبال میاں (بمبئی الکٹرک کمپنی) نے بھی اپنی کار ہمیں دے دی
تھی۔ یہ دونوں مجھ سے بہت چھوٹے ہیں اس لئے انہیں صرف دعائیں
دینا کافی سمجھتا ہوں۔

اسی سلسلہ میں عزیزی منصور و سلیم سلمہما اللہ تعالیٰ کے لئے بھی دل
سے دعائیں نکلتی ہیں، جنہوں نے اس گرمی میں دن بھر کی [illegible]
کرکے مہمانوں کو کھلانے اور رخصت کرنے کے ساتھ ہی انہیں [illegible]
بھی کراتے رہے۔

ولیمہ کے روز میں نے کوشش کی تھی کہ خواتین پردے میں
رہ کر طعام نوش فرمائیں۔ انتظام کے لئے بیرے [illegible]
انتظام کیا تھا کہ بیرے کھانا لاکر باہر رکھ جائیں۔ [illegible]
اور [illegible] کرنے کے لئے ایک گیٹ پر رہیں اور [illegible]
[illegible] رہیں۔ کھانا ختم ہونے کے بعد [illegible]
[illegible] اور بچے کھانا [illegible]
[illegible] اس لئے [illegible]
[illegible] دوسری خواتین نے [illegible] اور [illegible]

برتنوں اور گلاسوں وغیرہ کا ہٹانا خواتین اور لڑکیوں کے بس کی بات نہ تھی۔ درخواست کی گئی کہ تھوڑی دیر کے لئے آپ سب باہر چلی جائیں تاکہ بیرے آکر میز صاف کر لیں، لیکن کسی نے کرسی نہیں چھوڑی۔

خواتین کے طعام کا انتظام چودھری عظیم الدین اشرف صاحب رئیس پیلاور کی صاحبزادیوں، بیگم نور خالدہ سنبھالنے لے رکھی تھی۔ انھوں نے صورت حال سے مجھے بلا کر آگاہ کیا اور کہا کہ آپ بیروں کو بھیج دیجئے۔ بی بیاں اٹھ ہی نہیں رہی ہیں۔ مجبوراً مجھے ایسا ہی کرنا پڑا۔ جس سے مجھے دکھ ہوا۔ میری بہت سی عزیز لڑکیوں اور خواتین نے بھی اس سلسلہ میں تعاون کیا۔ ان کا شکریہ نہیں ادا کرتا۔ البتہ انھیں دعائیں دے رہا ہوں۔

مردانے میں بھی تقریباً یہی صورت تھی۔ دسترخوان صاف ہونے سے پہلے ہی حضرات کرسیوں پر قبضہ کر لیتے تھے، اس لئے ذرا بدنظمی رہی۔ میں اس وقت یہ سوچتا رہا کہ پچاس سال کے اندر کیسے کیسے انقلاب آگئے ہیں۔ میرے بچپن میں یہ حالت تھی کہ جب تک صاحب خانہ یا اس کے متعلقین آکر یہ درخواست نہ کرتے کہ جناب تناول طعام کے لئے تشریف لے چلیں، کوئی اپنی جگہ سے نہ اٹھتا تھا۔ افسوس کہ اب یہ تہذیب تقریباً خواب و خیال بن کر رہ گئی ہے۔ اور جو اس پر عمل کرتے ہیں، وہ گھنٹوں بیٹھے ہی رہ جاتے ہیں۔ بہرحال یہ صورت حال تقریباً ہر تقریب میں ہونے لگی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وقت قیمتی ہو گیا ہے۔ مشینی زندگی ہے۔ سب ہی چاہتے ہیں کہ فرصت ملے اور چل دیں۔ بہرحال یہ طریقہ مناسب نہیں۔ دعوتوں میں تھوڑے صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔

مسز چترویدی اس تقریب کی درمیانی کڑی بن کر نسبت کے سلسلہ میں اہم رول ادا کرتی رہیں اس لئے کہ ان کے تعلقات ہم لوگوں کے ساتھ ہی زیادہ محمد صدیقی صاحب کے گھرانے سے بھی کافی دیرینہ تھے۔ سارے معاملات انھیں کے ذریعہ طے ہوتے رہے۔ انھوں نے جس ہمدردی سے سارے کام کئے ان کے خلوص و محبت کا احساس اور پختہ ہو گیا۔ ان کا شکریہ تو میں بڑے پیارے الفاظ میں ادا کرنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ مس ناہید کے بعد وہی میری منجھلی سالی ہوتی ہیں۔

شادی کے سلسلہ میں مانجھے کی رسم عام ہوگئی ہے۔ دولہا کی بہنیں اور بھاوجیں اس رسم میں بڑی دلچسپی لیتی ہیں۔ لیکن نعیم سلمہ بچارے عورتوں کے سلسلہ میں شرمیلے رہے ہیں۔ گھر میں کوئی خاتون آجائیں تو بھاگ جاتے۔ اس لئے وہ مانجھے کے دن راہ فرار اختیار کرنا چاہتے تھے، کسی طرح اس رسم کے لئے راضی نہ تھے، بیگم نجم السحر سلمہا نے آکر انھیں اس شرط پر ہموار کر لیا کہ صرف وہ چند مسز جعفری، مسز نجمہ شمیم سلمہا اور مسز فیروزی قسیم اشرفی علیحدہ کمرے میں جاکر ابٹن لگا دیں گی اور ایسا ہی ہوا بھی۔

شادی کے دن انھیں مردانے اجتماع میں دولہا بنا کر زبردستی خواتین کے ہجوم میں لے جایا گیا، اس لئے کہ تمام عورتیں انھیں دولہا کی شکل میں دیکھنے کے لئے بے چین تھیں۔

بارات وقت مقررہ سے آدھ گھنٹہ تاخیر سے یعنی ۶ بجے روانہ ہو کر سوا چھ بجے بارہ دری پہنچ گئی تھی۔ بارات کے لئے میرے جن کرم فرما حضرات نے اپنی کاریں بھجوا دی تھیں، ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

مجھے افسوس ہے کہ نکاح میرے اعلان کے مطابق قبل مغرب نہ ہو سکا اس لئے کہ مولانا فاخر میاں صاحب نے یہ کہلا بھیجا تھا کہ بارات آجانے پر ان کے لئے کار بھیجی جائے۔ یہ کام دلہن والوں کا تھا کہ قبل از وقت موصوف کو لانے کا انتظام کرتے، بہرحال شمیم سلمہ کار لے کر مولانا صاحب کو لینے گئے تو مغرب کا وقت قریب تھا، اس لئے نماز پڑھ کر ہی آسکتے تھے۔ اس طرح نکاح بعد مغرب ہو سکا۔

عقد نکاح کے بعد عزیزی ظفر الحسن سلمہ (پسر جناب نور الحسن ہاشمی) نے بڑی خوش الحانی سے سہرا پڑھا، لیکن اب لوگ سہرے سنتے نہیں، اسی لئے چھپوا کر تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ عزیزی مظفر جمال سلمہ نے اپنے بی۔ ڈی۔ او کیمرے سے دیر تک فوٹو لئے اس کے بعد کھانا ہوا اور بارہ بجے کے قریب رخصتی ہو گئی۔

شادی کے چند روز بعد چوتھی کی رسم ہوتی ہے۔ میں اس کے سخت خلاف تھا خود نعیم کسی طرح اس کے لئے راضی نہ تھے، لیکن میری ایک نہ چلی، چوتھی کھیلنے کے لئے دولہا کی چند بہنیں اور چند بھائی بڑی تیاری کے ساتھ گئے۔ عزیزی شمیم سلمہ اس ٹولی کے سرغنہ تھے۔ ان کا [illegible] ہر معاملے میں قابل دید ہوتا ہے، خیال تھا کہ وہ چوتھی [illegible] میں اس ٹولی کی فتح کا ڈنکا بجا کر لوٹیں گے، لیکن اس کے برعکس

ہوا یہ کہ انھیں کی سب سے زیادہ سالیوں اور سالوں نے مرمت کی اور شکست کا اعتراف کرتے ہوئے واپس آئے ۔۔ اس طرح شادی کی یہ آخری رسم بھی ادا ہوگئی فہیم سلمہ بشریٰ سلمہا کو لے کر [illegible] چلے گئے۔

میرے کرمفرما محترم مقبول احمد لاری صاحب اس [illegible] میں لکھنؤ میں موجود نہ تھے اس لئے شرکت تقریب [illegible] لیکن اس کی تلافی موصوف کے فرزند دلبند [illegible] ظفر احمد لاری سلمہ نے کردی۔ وہ کافی دیر تک بڑے خلوص کے ساتھ تقریب کا اس طرح جائزہ لیتے رہے، جس طرح [illegible] لیتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کن الفاظ میں مظفر احمد لاری سلمہ کا شکریہ ادا کروں۔

بہن [illegible] اپنی صحت کی خرابی کے باعث لکھنؤ نہ آسکیں۔ ان کی کمی بہت ہی زیادہ محسوس کی گئی۔ انھیں فہیم سلمہ کا سہرا دیکھنے کا بڑا ارمان تھا لیکن ان کی صحت نے اجازت نہ دی۔ اسی طرح ہمارے اس دور کے واحد مخلص دوست مختار احمد صاحب ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ جی۔ پی۔ او بھی اس تقریب میں شریک نہ ہوسکے ڈاکٹروں نے نقل و حرکت سے انھیں روک دیا تھا۔

مجھے ان دونوں ہی کی عدم شرکت کا بہت افسوس رہا۔ میری دعا ہے کہ [illegible] انھیں اپنی امان میں رکھے اور صحت بخشے۔

آخر میں ان تمام معزز حضرات اور خواتین کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے اس تقریب میں شرکت فرما کر مجھے عزت بخشی۔ (نسیم انہونوی)

قلمی دوستی

حریم کی اکثر خریدار بہنیں، بھانجیاں اور بھتیجیاں قلمی دوستی کی شائق ہوتی ہیں۔ ان کے خطوط آتے رہتے ہیں کہ ان کے نام پتے حریم میں شائع کر دیئے جائیں کہ وہ قلمی دوستی کرنا چاہتی ہیں، لیکن ہم ایسا نہیں کرتے، اس لئے کہ اکثر مرد عورت کا نام رکھ کر خط و کتابت شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح کے اکثر واقعات دوسرے رسائل کے ذریعہ سننے میں آچکے ہیں۔ ہم کسی کے لئے کسی بھی بہن کا پتہ حریم میں شائع نہیں کرتے۔ [illegible] مناسب سمجھا ہے۔ [illegible] بہنوں اور بھانجیوں کو مشورہ دوں گا صرف انھیں سے قلمی دوستی کریں، جنھیں وہ بخوبی طور پر جانتی ہوں اور جن کی تحریر بھی پہچانتی ہوں۔ بلا جان پہچان خط و کتابت کرنا مناسب نہیں۔ (نسیم انہونوی)

عریاں تصویر کے خلاف احتجاج

دہلی کی ایک خبر شروع مئی کے ملکی اخباروں میں نمایاں طور سے نکلی ہے کہ وہاں کے کسی مشہور کارخانہ نے ایک ایسا کلنڈر اپنے مصنوعات کو فروغ دینے کے لئے شائع کیا جس میں ایک بالکل برہنہ عورت کی تصویر تھی ۔۔ اس تصویر اور عریاں کلنڈر کے خلاف تحریک چلانے والی خواتین اور دہلی کی دو کالجوں [illegible] ہوئی لیکن [illegible] اب بھی ایسے مرد ہی ہیں بلکہ [illegible] اور قومی سماجی کاموں میں حصہ لینے والی عورتیں بھی ہیں جو اس بے حیائی کو برداشت نہ کرسکیں اور انھوں نے فی الفور [illegible] کر دیا کہ بے حیائی کے اس مظہر کلنڈر کو فوراً ان چائے خانوں اور دوکانوں سے ہٹایا جائے۔ عورتوں کے ایک آل انڈیا ادارہ ویلفیر ایسوسی ایشن (انجمن فلاح و بہبود نسواں) جو دقیانوسی اور تاریک خیال عورتوں کی نہیں جدید تعلیم و تہذیب سے آراستہ عورتوں کی تنظیم ہے۔ اس کارخانہ کے خلاف دہلی کی عدالت میں مقدمہ ٹھونک دیا کہ جس نے اس تصویر کو شائع کر کے [illegible] کی نسائیت کے وقار کو ٹھیس لگائی ہے۔ اس نے نہ صرف اس تصویر والے کلنڈر کو واپس لے بلکہ اس کو [illegible] دس ملین روپیہ کی رقم خطیر کی شکل میں اس دعوے کی دائر کرنے والی انجمن کو ادا کرے۔

دہلی کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال مرد بھی اس ایجی ٹیشن میں عورتوں سے پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے بھی اس ناموزوں حیا سوز [illegible] تیار کرنے والے کارخانہ کی اس حرکت کی شدید مذمت کی ہے۔

بے حیائی و عریانی کے خلاف مردوں اور عورتوں دونوں کے اس رد عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب بھی ہندوستان کے روشن خیال طبقہ میں قدیم اخلاقی قدروں کی قدر قائم ہے۔ [illegible] کو بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

[illegible]



یہ خوبصورت پھول ٹی کوزی پر کاڑھا جاسکتا ہے

ٹی کوزی کے کپڑے کے رنگ کو خیال میں رکھتے ہوئے رنگ استعمال کریں ڈنڈیاں گہرے ہی رنگ سے ہی بنائیں۔ پھول کسی ایک رنگ میں یا پھر مختلف رنگوں سے کاڑھ سکتی ہیں۔ (مرسلہ صدیقہ بیگم انصاری۔ ناگپور)

اچھی کتابیں خریدیئے، پڑھئے اور اپنی گھریلو لائبریری میں محفوظ کیجئے

قربانی

عفت موہانی

اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا آخر بڑے بھیا کی برہمی کا سبب کیا ہے؟ وہ اسی کے دشمن کیوں ہیں؟ اس کی اپنی حالت بیمار دل سے بدتر تھی۔ مسلسل انتھک محنت نے اُسے نچوڑ ڈالا تھا لیکن کسی نے اس کی محنت کو نہیں سراہا تھا۔ تعریف کا کوئی بول کسی کی زبان سے نہ نکلا، اگر نظریں اس پر پڑیں تو معاندانہ انداز میں پڑیں۔

اور وہ جو پیار کا پیاسا تھا، اب بھی پیاسا ہی رہا۔

بھیا کی شادی میں تو روز و شب کا فرق بھول گیا تھا۔ دوڑ دوڑ کر کام کرتا تھا۔ کیسے گھٹیا کام سب نے اس کے سپرد کر دیئے تھے۔ برتن والوں سے کہہ آؤ، گوالے کو آرڈر دے آؤ ــــ نوکروں کے ساتھ جا کر باہر جھاڑو دلوا دو۔ کرسیاں بچھوا دو۔ دریاں گھر سے باہر لے جا کے جھٹکو۔ خبردار گرد اڑ کے اندر نہ آنے پائے۔ اس نے بڑے بھیا کا ہر حکم مان لیا تھا، شاید اسی طرح رحم و محبت کی کوئی کرن ان کے دل سے پھوٹے۔

سوچتے سوچتے ایک بار پھر اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔ کتنے بہت سے بے چین دن اور کرب انگیز راتیں اس نے گذاری ہیں۔ شادی ہو گئی۔ دلہن گھر میں آ گئی۔ پروانوں کی طرح دلہن پر گھر کے لوگ ہجوم کر آئے اور وہ دور کھڑا دیکھتا رہا۔ کسی نے اس طرف رتی بھر توجہ نہ دی۔ اماں نے یہاں تک بھلا دیا، اگر وہ اسے پاس بلا لیتیں تو شاید وہ اپنے سارے دکھ بھلا دیتا۔ اماں کو اتنا بے مروت نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ دھندلی آنکھوں سے بہت سارے انسانی پیکروں کو آس پاس پرچھائیوں کی طرح سرکتے پھرتے دیکھتا رہا اور انتظار کرتا رہا۔ اماں کسی سے کہیں گی۔ ہائے اس جاں نثار کو بھی اپنی بھابی کی صورت دیکھ لینے دو۔ مگر اماں اس کی طرف سے قطعی لاپرواہ اطمینان سے بیٹھی ہنستی رہیں اور دوسری عورتوں سے فخریہ لہجے میں باتیں کرتی رہیں۔ اونچے خاندان کی

[illegible]

اور جب انتظار ایک دُکھ بن کر اس کے دل میں سما گیا، اس کے سارے جسم میں اُتر گیا تب بے پناہ تھکان نے اسے جھکا دیا اور وہ مایوس ہو گیا، تب اپنے چھوٹے سے اندھیرے کمرے کی طرف ہو لیا۔

یہاں سناٹا تھا۔
لیکن شور تو کہیں اس کی ذات کے اندر ہو رہا تھا۔
دماغ میں آندھیاں گونج رہی تھیں۔
ویرانوں کے سناٹے چیخ رہے تھے۔
بگولوں کی سی شدت زلزلوں کی ہلچل۔

گرد و پیش سے بے خبر وہ اپنے ناسمجھ دل کو منانے لگا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر نہیں لیتے۔ اس طرح معصوم بچے کی مانند پھوٹ پھوٹ کے رونا بھی سزاوار نہیں۔ ایک نہ ایک دن تمام دکھوں کا مداوا ہو جائے گا۔

وہ تو ماں تھیں، انھیں تو اتنی سرد مہری اختیار نہ کرنا تھی۔ اماں تم ہی نے زخم چھیلے ہیں۔ تم ہی نے آنکھوں میں آنسو بھر دیئے ہیں۔ تم نے جان بوجھ کر مجھ سے منہ پھیرا ہے۔ یہ تو اسے پتہ تھا کہ وہ بڑے بھیا کا اپنا بھائی نہ تھا

ابا نے جب اماں سے نکاح کیا تب پہلے ہی سے ان کے تین بچے تھے اور وہ اپنی ماں کا صرف ایک تھا۔ اماں نے کبھی سوتیلی ماں کی روایت نہ دوہرائی۔ شوہر کے خاندان میں گھل مل جانے اپنا بھرم قائم رکھنے کی خاطر وہ اپنے شوہر کے بچوں کے پیچھے مٹ گئیں۔ انھوں نے سب کی محبت پائی تھی۔ بچے ان سے لپٹے رہتے۔ خاندانوں میں ان کی تعریفیں ہوئیں۔ بھلا یہ بھی سوتیلی ماں ہے۔ خدا ایسی ماں سب کو دے۔ اور اپنی منفرد روایت قائم کرنے کی دھن میں اماں اس کو بالکل ہی بھول گئیں۔ جس نے ان کے جسم سے سر ابھارا، ان کی گود میں لوٹ پوٹ کر گھٹنیوں چلنے کے قابل ہوا تھا۔

اماں کو بس خوف کھائے جاتا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں اپنے بچے کی محبت کے آگے وہ دوسرے بچوں کو فراموش کر دیں۔ وہ اکیلے میں اسے سلانے لائیں تو اسے سینے سے لگا لیتیں۔ اس کے گالوں اور [illegible] اپنے پیار سے گرم کر دیتیں لیکن سب کے سامنے ان کا

[illegible] چاہیے وہ کسی کی [illegible] ہوں، اس تک د[illegible]
[illegible] پہنچ کر [illegible] اس کی محرومیوں کا خیال نہ کرتیں۔ الٹا
[illegible] اور جھڑکیاں [illegible] کرتیں۔

اسے حیرت ہوتی۔ ماں کا سلوک سمجھ سے باہر تھا۔ وہ روز بروز الجھتا گیا۔ اس کی شخصیت بچپن سے متوازن نہ رہی اور پھر محبت کے پیاسے [illegible] ماں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے وہ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگا۔

چاہے چپاتو جان بوجھ کر پیالی اپنے اوپر لڑھکا لیتا۔ اماں متوجہ ہو جاتیں لیکن اس طرح نہیں جیسے وہ چاہتا تھا طمانچوں اور گھونسوں سے اس کی تواضع ہوتی۔ طرح طرح کے الٹے سیدھے خطاب ملتے۔ وہ روتا بھول کر ماں کا چہرہ تکنے لگتا جس پر تنہائی میں اگر نرمی اور ممتا کا نور ہوتا تو سب کے سامنے غیظ و غضب کی سُرخی۔

وہ کانپ جاتا!

دکھ اور جلن اس کا نصیب بنتے گئے۔

چھوٹے چھوٹے داغوں میں بڑی تیز ٹیسیں اٹھتیں۔

اس کی پیدا ہوتی ہنسی آہستہ آہستہ ناسور بنتی گئی۔

اور توجہ طلب حرکتوں نے اسے دیوانہ سا بنا دیا۔ اس کے بڑے بھائی بہن اس کا تماشہ بنا کر ہنستے تھے۔

اس پاگل کو دیکھو۔ پھر مٹی میں لوٹ لگا کے آیا ہے۔

بھوت ہے بھوت!

بدتمیز!

خانہ خراب!

ارے تو پیدا ہی کیوں ہوا؟

کلیجے میں گھاؤ ڈال دیئے ہیں بدبخت نے!

اور پھر دوسرے بچوں کے سامنے اسے پیٹا جاتا۔ وہ اسے بچانے کے بجائے دور کھڑے تالیاں بجا بجا کر ہنسا کرتے۔

اور بچپن کا شعور جوانی کی سرحد تک پہنچتے پہنچتے زیادہ کند اور کھوکھلا ہو گیا۔ ماحول کے تلخ رویے نے اسے پریشان کرنا شروع کر دیا وہ آہستہ آہستہ اس حقیقت کی تہ تک پہنچا۔ اگر وہ بڑے بھیا، چھوٹے بھیا ہوتا یا اس کے سرچڑھے بھائی بہن ہیں تو ماں بھی ان سے بڑھ کر سوتیلی [illegible] اس کا شمار نہیں۔ اس کا حصہ بھی نہیں وہ کسی اور

کے نصیب کا ہے۔ اسے اپنے لئے رحم و کرم کی بھیک بھی نہیں چاہیئے۔
مانگنے کی ہمت سے سیری نہیں ہوتی

وہ بھولا بھٹکا رہنے لگا۔ اپنے خیالوں سے لڑتے لڑتے سچ مچ دیوانہ سا ہو گیا۔ اسے لوگوں نے اپنے سے دور کیوں کر دیا تھا۔ اسے سب برا بھلا کیوں کہتے رہتے تھے۔ اگر اس نے کسی سے توجہ اور کرم طلب کیا تھا تو کون سا قصور کیا تھا لیکن سب نے اسے پاگل، سودائی دیوانہ کیوں کہنا شروع کر دیا۔ کیا یہ لوگ کسی کے دل کے اندر جھانکنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ——— !

پتھر کی دنیا!
پتھر کے لوگ!

محبت تو ہمیشہ خاموش رہتی ہے۔
لیکن سلوک اپنے منہ سے بولتا ہے۔

وہ سب سے ڈرنے لگا۔ الگ تھلگ رہتا۔ تب بھی کسی نے چین لینے نہ دیا۔ فلسفی ہے، بقراط، کوئی نیا مسئلہ سلجھا رہا ہے۔

ارے پاگل ہے پاگل!

ماں سے تو کوئی ڈرتا ہی نہ تھا۔ ابا کی بھی کچھ حقیقت نہ سمجھتے۔ اب وہ سب کے سب بڑے ہو چکے تھے۔ ان پر پہرے بٹھانے کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔

کتنی عجیب بات ہے کبھی اولاد کی بے راہ روی کا خمیازہ ماں باپ کو بھگتنا پڑتا ہے اور کبھی ماں باپ کی ناسمجھی کا نتیجہ اولاد بھگتتی ہے دنیا تو یوں بھی بڑی ناانصاف اندھی اور بے حس ہے۔ وہ کسی کی مجبوریوں کو ٹھنڈے دل سے نہیں دیکھتی۔ اچھے برے کی تمیز بھی کسی کو نہیں۔ کیا کسی کو احساس نہیں کہ وہ بھی اسی گھر کا فرد تھا؟ اس سے بھی محبت کرنا چاہیئے۔

جاہل پڑھ نہیں سکتے لیکن وہ سوچتے بہت اچھا ہیں۔ تعلیم یافتہ دماغ سے تمہیں بہتر لیکن اس کی سوچوں نے اسے زیادہ بیوقوف بنا دیا۔

فکر کی دنیا عملی دنیا سے یکسر الگ ہے وہ جو کچھ سوچتا وہ کر نہ سکتا اور انجام پھر وہی الجھن۔

[illegible] نے اسے جاہل ہی [illegible]
پڑھنے بیٹھتا تھا تو کتاب پر نظریں [illegible]

چہرے پر نگاہیں گڑائے رہا۔ انھیں الٹے سیدھے جواب دیئے، یا پھر ان لڑکوں کو دیکھتا رہا جو درختوں پر چڑھے ہوئے امرود جھڑ رہے تھے اچھال رہے تھے۔ اس نے خالی الذہنی کے انداز میں ماسٹر صاحب سے فرمائش کی تھی۔

آیئے نا ہم بھی آنکھ مچولی کھیلیں

ماسٹر صاحب کی آنکھیں نکل پڑیں۔

ساتھیوں نے قہقہے لگائے اور تب غضب ناک ابو نے اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل کھیلا تو اس کا جسم کئی روز تک درد کے مارے چٹخا رہا تھا۔

"قطعی کند ذہن اور غبی ہے تمہارا بیٹا" ابا نے اماں سے کہا: "رکشا چلائے گا، ٹھیلا دھکیلے گا، دوسرے بھائیوں کی طرح پڑھ لکھ کے آدمی نہیں بنے گا۔"

اس نے بہتیری کوشش کی کہ کچھ تو پڑھ ہی لے، بڑا آدمی نہ بنے کم سے کم آدمی ہی بن جائے لیکن وہ اپنے بکھرے ہوئے دماغ کو اکٹھا نہ کر سکا۔

حافظہ معطل تھا۔ مفلوج تھا۔ جانے کیا تھا۔ اماں تو کہتی تھیں کہ تین چار سال کی عمر تھی، تب سر کے بل زینوں سے نیچے گر پڑا تھا۔ سارا دن بیہوش پڑا رہا۔ دماغ میں جانے کہاں چوٹ لگی تھی۔ دوا علاج پر بھی وہ یونہی بھولا بھٹکا سا رہا۔ عقل میں کوئی بات کافی نہ تھی۔ اس سے کچھ کہا جاتا تو وہ یوں منہ کھولے گھورا رہتا جیسے منہ سے سن رہا ہو۔ اسے اپنا بکھرا بکھرا پن خود بھی محسوس ہوتا تھا۔ عجیب سی خواب اور بیداری کی سی کیفیت۔ کیا یاد کرنا چاہتا تھا، جو کبھی یادداشت کی گرفت میں نہ آیا۔ بچپن کی کوئی شرارت، جوانی کی کوئی بے ساختہ لغزش، کچھ بھی نہیں، اسے اگر ہوش رہتا تو دھندلے سے ماضی کا، یا اس حال کا جس کے دھندلکوں میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔

اس نے خود کو سنبھالنے اور سنوارنے کی بہت جدو جہد کی، خود کو سمجھدار اور دانشمند بنانا چاہا لیکن خود فراموشی میں وہ کوئی نہ کوئی حرکت ایسی کر گذرتا کہ پھر تماشا بن جاتا۔

اب وہ ایک بیکار شے تھا۔ ماں باپ بیزار، بڑے بھائی متنفر اور وہ خود شکستہ۔ وہ کیا کروں گا میں؟ اس کی نظریں اپنے جسم پر بھٹکتیں تو وہ سہم جاتا۔

[illegible] ہے؟ کس مصرف کا ہے، اسے اپنا پھیلتا ہوا [illegible] لوگ اسی کو [illegible] دیتے ہیں۔ گو بچے کی طرح پھول رہا ہے [illegible] آخر کس کام آتا ہے [illegible] بھرا ہے [illegible] تھا [illegible] صرف

کھانے پینے اور مر جانے کے لئے دنیا میں آیا ہے۔ اسے کیا کرنا چاہیئے کہ اس پر لگے ہوئے کلنک مٹ سکیں۔

اس نے کسی سے کچھ کہے بغیر ایک ہوٹل میں نوکری کر لی اور جی میں طے کیا کہ جب وہ اپنی تنخواہ ماں کے ہاتھ پر رکھ دے گا تب ان کی خوشی کا عالم ہی اور ہوگا؟ ہر ایک سے کہتی پھریں گی کہ اللہ رکھے ان کا بیٹا بھی کمانے لگا ہے، جسے تم لوگ نکھٹو اور ناکارہ کہتے تھے۔

ایک بجلی سی اس کے بدن میں بھر گئی۔

دوڑ دوڑ کر سروس کر رہا تھا کہ اچانک ٹھٹک کر کھڑا رہ گیا۔ صدر دروازے سے بڑے بھیا اپنے چند معزز دوستوں کے ساتھ ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ اس نے بھاگنا چاہا لیکن بڑے بھیا اسے دیکھ چکے تھے۔ وہ لاپرواہی سے ایک طرف چلے گئے۔ اس نے اپنے دل کو سمجھایا، کوئی حرج نہیں ہوا۔ وہ ان کے پوچھنے پر کہہ دے گا کہ جس طرح آپ ہوٹل میں کھانے گئے تھے، وہ بھی گیا تھا مگر وہ اپنی جگہ سہما ہوا سا تھا۔

بڑے اور چھوٹے آدمیوں کے کھانے میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ بڑے آدمی نوش فرماتے ہیں، چھوٹے آدمی نگلتے ہیں۔

رات کو جب وہ ڈرتا ڈرتا گھر پہنچا تب خلاف توقع اس کے شایان استقبال کے لئے ابا اور بھائی جان صاحبان جاگ رہے تھے۔ اماں ایک طرف چپ چاپ بیٹھی تھیں۔

ابا کا چہرہ آگ بگولا دکھائی دیا۔ بڑے بھیا نے شاید ان سے اس کی ساری کارگذاری کہہ سنائی تھی۔ انھوں نے اسے بلایا اور کسی قسم کا [illegible] دیئے بغیر ایک ہاتھ ایسا رسید کیا کہ سچ مچ اس کا منہ پھر گیا۔ پھر وہ گرجتے چلے گئے۔

"ذلیل کمینہ! اب تیرے لئے بس بیرہ گیری ہی رہ گئی تھی۔ جانے کس کس نے پلیٹیں اٹھائے دوڑتے دیکھا تھا۔ ناک کٹا دی مردود نے۔ تیری عزت تو دو کوڑی کی بھی نہیں، مگر خبیث تو نے میری عزت کا تو خیال کیا ہوتا!"

وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔

کم بخت نے یہ خیال کیا کہ میں دوستوں سمیت وہیں بیٹھا ہوں۔ نگاہیں لئے پھر رہا تھا۔ بڑے بھیا نے [illegible] سے جل رہی۔

بیچارہ پاگل [illegible]

ابا ہاتھ [illegible] ساتھ [illegible] رہے تھے۔ اماں بیٹھی تکتی رہیں۔

اسے تو بھی شاید غصہ ہی تھا۔ نامراد، کوڑی کے کام کا نہیں۔ پیدا ہوتے ہی مر جاتا تو اچھا ہوتا۔

اس کے جسم پر چوٹ کم لگی، دل پر زیادہ لگی۔ وہ آواز سے رویا۔ لیکن ماں کی ہچکیاں، گریہ وزاری، ابا کا غصہ تیز کرتی رہی۔ ہاتھوں کی طاقت بڑھاتی رہی۔ اس کے آنسوؤں نے انھیں پگھلایا نہیں۔

تب اس کا دل ٹوٹ گیا۔

اس نے آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں سے اماں کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ادھر سے چہرہ پھیر کر اٹھ گئیں۔

اس کا وجود شیشے کا بنا ہوا تھا۔

وہ چکنا چور ہو گیا۔

شعور میں کرچیاں سی چبھنے لگیں۔ خون کا سیلاب سا بہہ نکلا۔

آخر کب تک؟

پھر وہ پاگلوں کی طرح ہنستا چلا گیا

چلو ٹھیک ہے۔ ایک تسمہ لگا تھا اماں کی محبت کا، ٹوٹ گیا، اب کوئی آس نہیں۔ ان کی ذات ایک قلعہ تھی، جس میں وہ محصور تھا۔ اب وہ سنگی دیواریں گر چکیں۔ وہ تپتے ہوئے میدان میں کھڑا تھا۔ اوپر آگ برساتا سورج نیچے جلتی ہوئی زمین، اور بس!

اپنے گھر میں اجنبی کی طرح رہنے لگا تھا۔ سب سے بدن چرائے ہوئے سب کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش میں زیادہ اجاگر ہوتا ہوا۔ زیادہ بدحواس ہونے لگا۔

گھر کی دیواریں اسے باہر دھکیلتی تھیں اور باہر کی دنیا دامن کشاں تھی۔ اس نے خود کو اپنے کمرے تک محدود کر لیا۔ کسی کو اس کی فکر ہی نہ تھی۔ اماں تک لاپرواہ ہو گئیں،

... اور وہ کون سی چیز تھی جس نے گہرے بندھے رشتوں کو توڑا تھا، کوئی سمجھ نہ سکا۔ روایت شکنی کا خیال، ناگفتہ نامی کا خوف، نہ جانے اماں کے اور اس کے درمیان کسی احساس کی آہنی دیوار حائل تھی۔

انہی دنوں بڑے بھیا کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ آپا بھی سسرال سے آئیں۔ بہت دنوں بعد آئی تھیں، اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

مظفر یہ کیا اپنا حال بنا رکھا ہے۔ ہائے بالکل جنگلی لگ رہا ہے۔

اپنا ہوش ہو تو صورت شکل کی طرف توجہ بھی کرے۔ اماں نے سارا قصہ اپنے سر سے اتار کر اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔ میں تو سچ مچ بیزار ہو چکی ہوں۔ اس بدنصیب کی بربادی اب دیکھی نہیں جاتی۔ مولا یا تو اسے اٹھا لے یا میری ہی مٹی عزیز کر لے۔"

"کیوں اماں؟" آپا نے پوچھا۔

اور کیا سوائے جوتیاں چٹخانے اور جوتیاں کھانے کے اس کے مقدر میں اور رہ ہی کیا؟ اوقات کا مارا۔ پھول سے گال کر نظروں سے چھلکا جا رہا ہے۔ کام کا نہ کاج کا۔ سوچ سوچ کر میرا تو دم اوبھا جاتا ہے کہ ہمارے بعد اسے پوچھے گا کون؟ اب تو کسی طرح دو نوالے مل رہے ہیں۔"

"مگر اسے تو آپ سب نے پاگل بنا دیا ہے۔" آپا کے دل میں اس کی محبت جاگی۔ "میں تو پہچان بھی نہ سکی تھی۔ یہ ڈاکوؤں کی سی مونچھیں، داڑھی، میلے کپڑے، یہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"اسی سے پوچھو۔" اماں یہ کہہ کر باورچی خانے کی خبر لینے پہنچ گئیں۔

"بتاؤ مظفر!" آپا نے اسے گھورا۔

"کچھ نہیں آپا!" اسے آنسوؤں کے پینے میں بڑی دقت پیش آئی۔ سینے میں درد سا ہونے لگا۔ پلکیں جھپکا کر وہ مسکرانے کی کوشش میں بولا۔

"اچھا تو ہوں، کھا رہا ہوں، پی رہا ہوں، اور ——"

"جانوروں کی طرح جی رہے ہو۔ کیوں؟"

"اور کیا کروں۔ پڑھا لکھا نہیں، کسی کی محبت کے قابل نہیں۔

نفرتوں کا پشتارہ۔

ہنسی مذاق، طعن تشنوں کا انبار۔

میری ذات کسی کے لئے باعث تفریح ہے۔ بڑی خوش قسمتی ہے نا آپا!"

"جلی کٹی باتیں چھوڑو —— آدمی بنو۔"

اس نے جھیں کہا کہ آپا تم میرے درد کا درماں نہیں بن سکتیں۔ لیکن اسے کچھ ڈھارس تو بندھی تھی۔ آپا نے اسے اپنے ساتھ کام کاج میں گھسیٹ لیا اور شادی سے پہلے طرح طرح کی ذمہ داریاں دے کر سب نے اس کا خوب کچومر نکالا۔ لیکن وہ بے حد خوش تھا۔ اسی طرح تو ان سب کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چاروں طرف اسی کی پکار تھی۔

"مجو۔ لڑکیوں کے ساتھ مل کر ڈھولک ڈھلا دو۔"

"مجو ادھر آؤ۔"

"مظفر وہ کام کردو"

اب سب ٹھیک ہے۔ اسے آپ ہی آپ ہنسی آتی۔ وہ لاکھ کچھ ہوا پھر بھی اپنا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی بھی کہیں اسے بھول سکتے ہیں۔ یہ تو وہ خود احمق بنا رہا تھا۔

شادی ہوگئی اور دلہن گھر میں آئی۔

سب سے اس نے سن رکھا تھا کہ اس کی بھابی بہت خوبصورت نرم و نازک گڑیا سی تھی۔ لوگ اس کا چہرہ دیکھ دیکھ کر تعریفیں کر رہے تھے۔

لیکن اب ——— وہ پھر بیکار وجود تھا۔

یعنی اہم ———!

مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ ڈھنڈار کمرے میں اکیلا بےچین اور بے آرام وہ ساری رات آنسو بہاتا رہا تھا۔

آپا چلی گئیں۔ شیش محل ایک بار پھر چھن چھن کرتا زمین پر آرہا۔

سب سے بڑی اذیت اسے اس وقت پہنچی جب اس کی بھابی ...

... نے بھی اوروں کے ساتھ مل کر اس کا مذاق اڑانا شروع کیا۔

دل پر ان گنت زخم لئے وہ صرف اماں کی خاطر اس گھر میں پڑا رہا۔ وہ انھیں دیکھ تو سکتا تھا، اماں اس سے نہ بولیں نہ سہی

لیکن قدرت نے اس کی قسمت کی تاریکیوں میں ایک اضافہ اور کردیا۔ اماں جو اس کا غیر مرئی سہارا تھیں، اسے چھوڑ کر چل بسیں۔

تاگا ٹوٹا اور موتی بکھر گئے۔

چھوٹے بھیا پڑھائی کے بہانے ہوسٹل چلے گئے۔

ابا نے کرسی اور کتاب سنبھال لی۔

بھابی پر گھر گرستی کا بوجھ آپڑا۔

"تم کس مرض کی دوا ہو" بڑے بھیا اس کے سب سے کٹر دشمن تھے "اب تک ہم نے تمہارے ساتھ خواہ مخواہ کا بھگتان بھگتا ہے لیکن اب تم اپنا بندوبست کہیں اور کرلو۔ اماں کے بعد گھر کا نگہبان کوئی نہیں رہا۔ میری بیوی تنہا ہوتی ہے۔ تم گھر ہی میں دندناتے رہو۔ غالباً تم سمجھ گئے ہوگے میرا ———"

یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ ایک شاک سا اسے لگا، جیسے بڑے بھیا نے گلی کا ننگا ٹوکرا اسے تھمادیا ہو۔ وہ بہت بڑا انھیں سمجھتا رہا۔ اسے چہنچ تھا کہ الفاظ بھی کبھی ایٹم بم بن کر انسانی زندگی کے پرخچے

پرسوچتا کے پرخچے اڑا سکتے ہیں۔ الفاظ کے دھماکے کسی کی دنیا بھی چکنا چور کر دیتے ہیں۔

اپنے محدود خیالوں کی معصوم وادی سے نکل کر خوف و دہشت کی دلدل میں گر پڑا، اور تحت الثریٰ میں دھنستا چلا گیا۔

ابا نے صرف کھنکھار نے پر اکتفا کیا تھا۔ وہ بھی کیا کرتے؟

بڑے صبر و سکون سے اپنے کمرے میں آیا۔

اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

کونسی چیز ساتھ لے جانے والی تھی۔

کچھ بھی نہیں!

وہ پاگلوں کی طرح ادھر اُدھر ہاتھ مارنے لگا۔

یہ ابا کا اترا ہوا شیروانی۔ جس کا کالر اور جس کے کف ادھڑ چکے ہیں، کس کام کا ہے؟

چھوٹے بھیا نے ترس کھا کر اپنا پتلون دیا تھا۔ وہ تو پھٹ چکا۔ پہنا نہیں جاسکتا۔ مرے چوہوں کی سی گندی بنیائن۔ یہ کونسی قیمتی ہیں؟

اور کچھ ——— ٹین کی پیٹی اس نے دری پر الٹ دی۔ کبھی کسی نے اس کی ضرورتوں کو بھی اہم سمجھ کے کانی کوڑی نہیں دی تھی۔ اس کے دل کی طرح پیٹی بھی خالی تھی۔

ایک ادھوری سانس اس کے سینے سے نکلی۔

کہاں جاؤں؟

کیا کروں؟

اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی وسعت اور بلندی پر ایک قہقہہ اس کے دل سے ابل پڑا۔

"اوپر والے کبھی نیچے بھی دیکھ"

وہ اتنا ہنسا کہ اس کے آنسو بہنے لگے۔

آج اگر میں ایسا نہ ہوتا تو مجھے بھی سب میں جگہ ملتی۔ آج تنہائیاں میرا نصیب نہ ہوتیں۔ آج آنسو میرا سہارا نہ بنتے تھی عجب تھی میری ماں۔ اپنے نا شاد و نامراد بچے کو چھوڑ کر چلی گئی میری ماں ——— سب سے زیادہ شکوہ تجھ سے ہے۔ تو نے بھی سینے سے نہیں لگایا۔ آنسو نہیں پونچھے۔ دکھ نہیں بٹایا۔ سکھ نہیں دیا۔

"ہاں ـــــــ تو نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا تھا!"

دنیا نے مجھے کیا دیا!

[illegible] کرتے ہیں۔

میں کیوں پاگل بن رہا ہوں۔ کس لئے لوگوں سے رحم کی بھیک مانگ رہا ہوں۔

بہت ہو اب فضول!

میں چلا جاؤں گا ـــــــ ابھی اور اسی وقت!

وہ باہر نکلا۔

تبھی اس نے گلی میں شور وغل سنا، لوگ اس کے گھر کی طرف آ رہے تھے۔

کیا ہوا، کیا ہوا؟

"حادثہ ـــــــ ہائے پورا چہرہ خون میں ڈوبا ہوا ہے۔"

وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ بڑے بھیا کو لوگ ایک چھوٹے پلنگ پر ڈالے لا رہے تھے۔

تیز رفتار ٹرک کا دھکا لگا۔ اوندھے منھ فٹ پاتھ پر گرے تھے۔ آنکھیں جاتی رہیں۔ ابا سر پکڑ کے رہ گئے۔ بھابی رو رہی تھیں، چیخ رہی تھیں۔ چھوٹے بھیا ہوسٹل سے آئے اور سب نے ہاتھوں ہاتھ بڑے بھیا کو ہسپتال پہونچا دیا۔

وہ بھی پہنچا ـــــــ اب اسے کون نکال سکتا ہے یہاں سے وہ بھیا کی خدمت کرنے آیا ہے۔

بڑے بھیا کو ہوش تو آ گیا۔ لیکن آنکھیں نہیں آئیں۔ ماہر چشم نے اپنا فیصلہ دے دیا۔ آپریشن سودمند نہیں ہے۔ جب تک کہ کسی اور کی آنکھیں نہ لگائی جائیں۔

بڑے بھیا اپنے سرد و ساکت بستر پر پڑے تھے۔ آج ان کی بے بسی پر اسے بہت ترس آ رہا تھا۔ یہ بے بسی ہی تو تھی کہ وہ ان کے پاس بالکل ان کے پہلو میں بیٹھا تھا اور وہ جھڑک کے اپنے پاس سے اٹھا نہیں رہے۔

وہ روز ہی تو کہتے تھے تیوری بدل کے کہتے تھے۔

بھاگ جاؤ یہاں سے

اس نے [illegible] انھیں آواز دی۔

بڑے بھیا۔

"بجو! تم ہو؟"

اندھے کنوئیں سے آواز ابھری۔

ہاں بڑے بھیا! میں ہوں آپ کے پاس۔"

وہ بلک کر رو دیا۔

"آپ کے بہت درد ہو رہا ہوگا بھیا!"

"بجو!"

ہاں بھیا!"

"تو رو رہا ہے؟"

"آپ کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔"

بڑے بھیا نے ٹٹول کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

بجو! میں نے تجھ سے گھر چھوڑ کر نکل جانے کو کہا تھا۔ بھول گیا تھا۔ بجو کہ تو بھی میرا بھائی ہے۔ اب تو کہیں مت جا۔ میں اچھا ہو جاؤں تو تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اب تک میں نے تجھے جتنی تکلیفیں دی ہیں۔ وہ سب تو بھول جا میرے بھائی۔ ان سب کو میں ہاتھوں سے بدل دوں گا ارے۔ تو تو آواز سے رونے لگا، پاگل، نہ رو، چپ ہو جا۔ چپ ہو جا بجو!"

ان کی آواز گھٹ گئی۔

"بھیا خدا کرے کہ کسی کی آنکھیں آپ کو مل جائیں۔ آپ جلدی سے دیکھنے لگیں۔

ہاں بجو، دعا کرو۔ اب تو زندگی میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ انھوں نے ایک لمبی سانس لی، اور وہ سانس بھالے کی سردانی کی طرح بجو کے دل میں اتر گئی۔

"بھیا۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔" وہ بولا "میں ہی برا تھا۔ آپ سچ کہتے تھے بھیا کہ میں سوچتا ہی نہ تھا کہ آپ کے دل میں نفرت کیوں ہونے لگی۔ آپ میرے بھائی ہی تو ہیں! بھیا مجھے معاف کر دیجئے۔ جس چیز کو میں آج تک ترستا رہا وہ مجھے مل گئی۔ اب مجھے آپ سے، دنیا سے اور خدا سے کوئی گلہ نہیں، بھیا کوئی شکایت نہیں۔"

"بجو بہت اچھا ہے اب گھر سے نہ جانا۔ دیکھ میری [illegible] جان کو [illegible] آنکھیں ملیں گی [illegible] میں ساری زندگی [illegible] کروں گا۔"

"نہیں بھیا نہیں"

اور ——— وہ بات اس کے لئے پہاڑ بن گئی۔ وہ اپنے محسوسات کو اچھی طرح سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ہجوم تھا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ، وہ سب کچھ بھول گیا۔ بس اب کیف و مستی کا ایک دھارا تھا، جو اسے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا۔

"مجو تو گھر سے مت جانا
مجو دعا کر مجھے آنکھیں مل جائیں۔

مجو۔ مجو، وہ ——— کیا اتنے پیار سے اس کا نام بھیا ہی نے لیا تھا۔ وہ جس چیز کے لئے ساری زندگی تڑپتا رہا وہ مل گئی۔ تو پھر اب وہ بھیا کو کیا دے سکے گا۔ اس کے پاس کیا ہے؟

پھر اس نے جھک کر اپنے آنسو پونچھے اور ایک چمک سی اس کے کند دماغ میں لہرائی۔

یہ آنکھیں۔ یہ تو ہیں میرے پاس، بھیا کی انمول محبت کا اعتراف انہیں کبھی تو معلوم ہو۔ ان کا مجو ناکارہ، بیکار اور زمین کا بوجھ نہیں،

بھیا تم نے نہلا دیا ہے مجھے اپنے پیار میں۔ میں تمہیں اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں چھوڑوں گا۔

"بھیا تم دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں"

وہ ہنسنے لگا۔

صبح کو بھابی ناشتہ دان ہاتھ میں لٹکائے دروازے پر آئی۔

"مجو بھیا" اس نے دروازے پر دھکا دیا۔ دونوں پٹ کھل گئے "یہ ہسپتال میں ہیں رے آؤ"

دفعتہً اس کی نظریں اندر پڑیں۔

ایک دلخراش چیخ اس کے لبوں سے نکلی اور ہاتھ سے ٹفن باکس چھوٹ گیا۔ وہ چیخی چلاتی بھاگی اور بابا، چھوٹے بھیا سب اس کے کمرے میں گھس گئے۔

ایک خنجر اس کے سینے میں دھنسا ہوا تھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

وہ کرائے گا۔

"ان سے کہنا کہ اپنی آنکھوں میں اپنے مجو کو زندہ رکھیں"

"ا ——— میں ——— ساری زندگی نفرت کا زہر پیتا رہا مگر محبت کا ایک گھونٹ بھی نہ پی سکا۔

بڑے بھیا کو!

میری آنکھیں ......؟

اور اس کی آخری سانس خون کے ایک بلبلے کے ساتھ اس کے لبوں سے نکل گئی۔

ان سے بچئے

- ظلم سے کہ ظلم کرنا خود ظلم کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے۔
- کنجوسی سے کہ، اس لئے کہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔
- جھوٹ سے، اس لئے کہ جھوٹا سکہ بھی مشکل ہی سے چلتا ہے۔
- فضول خرچی سے اس لئے فضول خرچی گدائی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔
- غصہ سے کہ غصہ کے وقت شیطان اس میں حلول کر جاتا ہے۔
- کاہلی سے، اس لئے کہ وقت ایک انمول سرمایہ ہے اور جو لمحہ بھی گزر جاتا ہے، پھر واپس نہیں آتا۔ اور کاہل کے بے شمار لمحے بیکار گزرتے رہتے ہیں۔

مرسلہ۔ بی عصمت فاروق (آمبور)

پندرہ سال بعد

شمع فیروز

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بہت دیر سے کھڑکی کے پاس بے خودسی کھڑی خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ اس کے دماغ میں بیتے دنوں کی یادیں آ کر اسے بے چین کر رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ رات بھیگنے لگی۔ ہر سو خاموشی کا تسلط تھا۔ سینکڑوں یادیں ایک ساتھ مچل کر اسے تڑپا رہی تھیں۔ یادوں کی یلغار سے گھبرا کر اس نے پھر وہی میگزین اٹھا لیا۔ جس نے آج اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ اور اس کے خالق سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

احمد یزدانی کا شمار ملک کے مایۂ ناز افسانہ نگاروں میں تھا۔ اس کے بے شمار مداح تھے ان بے شمار مداحوں میں میں بھی ہوں۔ ان سے ملنے کا اشتیاق جب شدت پکڑ گیا تو میں نے انہیں ٹرنک کال کر کے ملاقات کا وقت لے لیا۔

اور آج میں ایک ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے ان سے ملاقات کرنے کے لئے ان کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔

اس دوران ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی جو بے حد نفاست سے آراستہ کیا گیا تھا ایک طرف الماری میں مختلف موضوعات اور مختلف زبانوں کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری طرف پدم شری کا ایوارڈ آویزاں تھا، جو اسے بہترین ادیب کی حیثیت سے ملا تھا۔ اعزازی طور پر ملے ہوئے تحائف ادیب کی زندگی کو مزید اعزاز و امتیاز بخش رہے تھے۔ میں سرسری طور پر ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہی تھی کہ ادیب کمرے میں داخل ہوا۔ چال میں تمکنت کشادہ پیشانی، خاص اسٹائل سے سنوارے گئے بال جو اس کی شخصیت میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ ہونٹوں پر مخصوص مسکراہٹ لئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

میں گفتگو کا آغاز کرنے کے لئے الفاظ سوچ رہی تھی کہ اس کی کھنکتی [illegible]

"کہئے محترمہ کیسے آنا ہوا؟"

اس کی مترنم آواز پھر میرے کانوں سے ٹکرائی اور میرے حواس پر چھا گئی۔ وہ آواز جسے سننے کے لئے میں ایک مدت سے ترس رہی تھی۔ میں یک لخت چونک اٹھی اور آہستہ سے میرے لب وا ہوئے۔

"اوہ ...... ہاں، ذرا آپ .... سے کچھ دریافت کرنا تھا چھوٹا سا انٹرویو ہی سمجھ لیجئے۔"

وہ حیرانی سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سوال پوشیدہ تھا۔

"کیوں؟" اس نے کھنکتی آواز میں پوچھا.... !

"میری خواہش ہے۔"

"میں کسی کو انٹرویو نہیں دیتا۔" اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"لیکن آپ مجھے ضرور انٹرویو دیں گے" میرے لہجے میں چنچل تھی۔

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"آپ گھبرائیے نہیں، میں جرنلسٹ نہیں ہوں، جو آپ کے انٹرویو کو شائع کر دوں گی۔ میں تو ایک معمولی سی ٹیچر ہوں، خالص گھریلو عورت... میری صرف ایک خواہش تھی، ایک آرزو تھی کہ آپ سے ملوں۔ آپ کو دیکھا اور دیکھ کر ہی یہ خواہش بیدار ہوئی کہ آپ سے کچھ طویل گفتگو کروں۔ اسے چاہے آپ انٹرویو ہی سمجھ لیجئے۔"

میں نے آہستگی سے کہا۔

اسے ایک گونہ اطمینان سا ہوا جو اس کی آنکھوں سے مترشح تھا۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جب سے آپ کی تخلیقات کا مطالعہ کیا ہے، میں پاگل ہو اٹھی ہوں۔ آپ کے ناول سکون کی تلاش نے مجھے بہت متاثر کیا۔ آپ کا افسانہ "منزل ابھی دور ہے" ایک ممتاز جریدے میں نظر نواز ہوا۔ اسی کی کشش آپ تک کھینچ لائی۔ آپ کے افسانے وہ صاف و شفاف آئینے ہیں جن میں میرا عکس منعکس ہے۔ میں اپنے ماضی سے بُری طرح مجروح ہوں۔ آپ کا وہ افسانہ جیسے میرے ماضی کی کہانی ہو۔ اسے پڑھ کر ہی میں بے اختیار آپ سے ملنے چلی آئی۔ آپ کے تجربے و تصور سے چند نکات لینا چاہوں گی کیا آپ دے سکیں گے"

میں سراپا سوال بن گئی۔

"ضرور ... ضرور ..." اس نے خوش دلی سے کہا۔

بیتے دنوں کی یاد مجھے بے چین کر رہی تھی اور آج جو ان لمحوں [illegible]

آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔ میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ میری زندگی
کے پھول کو تقدیر نے روند ڈالا ہے پامال کر دیا ہے اور آج بکھر جانے
کے لئے ہی یہاں آ پہنچا ہوں۔ مجھے اپنا ماضی یاد آنے لگا ہے۔ اس
کے ساتھ گزارے ہوئے کچھ سال، اس کی آنکھوں کی مخصوص چمک، اس
کا پرکشش چہرہ جس کا مرجھا گیا ... وہ بے حد خوب صورت تھا جسے
دیکھ کر میں چند لمحوں کے لئے بالکل سب کچھ بھول جایا کرتی تھی۔ اور
اس کی بانہوں میں جا کر سکون کی سانس لیتی تھی۔ اب بھی اس کے
ساتھ بیتے لمحات یاد آ جاتے ہیں میرا پورا وجود فرط مسرت سے جھوم
اٹھتا ہے اور پھر وہی اداسی چھا جاتی ہے جو میرا مقدر بن جاتی ہے۔
میں شدت جذبات سے آنکھیں بند کر لیتی ہوں۔

اور جب میری محویت سے محظوظ ہوتا رہا۔ آخر خاموشی کا طلسم
اس نے اپنی ترنم ریز آواز کے جادو سے توڑ دیا۔ اس کی مسحور کن آواز
سے میں ہوش و خرد کی دنیا میں واپس آ گئی۔

"کہاں کھو گئی تھیں آپ؟"

اس نے بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بے اندازہ مسرت، دولت اور شہرت پا کر آپ کو سکون ملا جو آپ
نے اپنی بیوی صوفیہ کو موت کے منہ میں پہنچا کر حاصل کیا؟"

اس کے سوال کو ایک دم نظر انداز کرتے ہوئے میں نے جو کچھ
کہا اسے اس کی امید نہ تھی۔ گھبرا کر بولا "غلط، بالکل غلط، آپ آخر کیا
لینے آئی ہیں یا ذاتیات میں دخل اندازی کرنے؟"

"میں پولیس افسر نہیں ہوں، بلکہ ایک معمولی سی صحافی ہوں،
صرف چند سوالوں کا جواب لیتے ہی واپس چلی جاؤں گی۔"

"آپ کے اوٹ پٹانگ سوالات کا میرے پاس جواب نہیں ہے"
اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔ [illegible]

"اوٹ پٹانگ سوالات یا حقائق کی حقیقت سے گریز؟"

"بالکل غلط ... غلط ... غلط ..." اس نے جذباتی انداز
سے چیخ کر [illegible]

اور میں پھر ماضی میں گم ہونے لگی تھی۔ آہستہ آہستہ میرے
ذہن میں [illegible]
[illegible] آج سے چند سال پہلے [illegible]
[illegible]

لگا جہاں میں نے زندگی کے چند سال گزارے تھے اور جہاں
[illegible] اندھیری راتیں جنہوں نے میرے وجود کو تہس نہس کر دیا
تھا، پامال کر ڈالا تھا، کچھ بھی نہ بچا تھا۔ ان گزرے ہوئے لمحات نے
میرا سکون چھین لیا تھا۔ میرے دل میں وہ دکھ اژدہا بن کے
ناگ بن کے مجھے ڈستے رہے۔ اذیتوں کے گھاؤ ناسور بن گئے۔ ان اذیتوں
سے چھٹکارا پانے کے لئے پڑھنا شروع کر دیا۔ میرا دل پڑھائی کے رنگین
ماحول میں بھی نہ بہل سکا۔ بہرحال ڈگریاں حاصل کرتی رہی اور اس
کے بعد صحافت میں ملازمت کر لی، وقت نے کم عرصہ میں ہی سب کچھ سکھا دیا
تھا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ فراموش کرنے لگی۔ اس نے میری زندگی کو تباہ
کر دیا۔ دس سال اس کا انتظار کرتی رہی۔ اسے یاد کرتی رہی۔ ایک لڑکی اپنی
محبت سے زندہ نہ رہی۔ اتنی دردناک زندگی، سوچ کر ہی کپکپی طاری
ہونے لگتی ہے غم کی کالی راتیں میرا مقدر بن گئی تھیں اور ساتھ رہنے
والی صرف میری تنہائی ... اور میری جوانی جو میرے لئے عذاب کے
سوا کچھ نہ تھی۔ زمانے نے سب کچھ مجھ سے لے لیا تھا۔ میری مسرتیں میرا
چین، میرا سکون اپنے والدین کی اکلوتی لاڈلی بیٹی چند سال بعد ہی
انھیں لوٹا دی گئی۔ میرے ذہن میں ایک ہی سوال تھا جو بار بار
اٹھتا تھا کہ بتاؤ میرا جرم کیا ہے؟ جس کی اتنی بڑی سزا۔ مجھ سے میری
زندگی کی خوشیاں کیوں چھین لی گئیں، آخر کیوں ......؟

ادیب کی حالت آہستہ آہستہ ٹھیک ہوئی اور وہ [illegible]
سے لہجے میں گویا ہوا۔

"اور کچھ پوچھنا باقی ہے؟"

میں اپنے آپ میں واپس آتے ہوئے بولی۔ "ابھی تو پوچھا ہی کیا ہے!
صرف پہلا سوال کیا ہے جس کا جواب ابھی تک نہیں
ملا ہے۔"

"اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔
"ٹھیک ہے میرے سوال کا جواب دینا چاہتے ہو تو نہ دو [illegible]
[illegible]
[illegible]

"کون؟ آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟" وہ [illegible]
بولا۔

"آپ کی بیوی کی [illegible]

بجھوا دیا تھا۔

"آپ ... آپ مجھ سے ایسے سوالات کیوں پوچھ رہی ہیں جن کا تعلق میری زندگی سے نہیں ہے۔"

"یوں ہی اپنے سکون کے لئے پوچھ رہی ہوں۔ کیا آپ اتنا سکون دے سکیں گے ....؟"

"میں نے اپنی بیوی کو نہیں مارا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے؟"

"کیا غلط ہے اور کیا صحیح، اس کا فیصلہ تو آپ خود کر سکیں گے۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آپ نے اپنی بیوی کو راستے سے ہٹانے کے لئے اس کے جسم میں ایک خاص مقدار میں زہر پہنچایا اور وہ ..... وہ بدنصیب ایک دن موت کے دہانے پر کھڑی دستک دینے لگی؟"

شاید میرا ایک ایک لفظ ادیب کے ذہن میں ہلچل مچا رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ پھر ایک دم پھٹ پڑا۔ شدید جذبات کا لاوا بہہ نکلا اور اس نے مغلوبیت سے کہا "اب بس کرو، ضبط نہیں ہو رہا ہے! ...."

میں قہقہہ مار کر ہنس پڑی اور بولی۔

"ضبط نہیں ہو رہا، صرف غم دینا جانتے ہو، برداشت کرنا نہیں؟"

میں نے طنز کا ایک تیر چھوڑا۔

"کون سا غم دیا ہے میں نے تمہیں؟"

"مجھے نہیں اسے .... اپنی بیوی کو جس کا سکون برباد کر کے اپنے آپ عیش کی زندگی گزار رہے ہو۔"

"اسے ٹی بی تھی ...." وہ یک لخت بولا اٹھا۔

"ٹی بی تھی نہیں .... کی گئی تھی۔"

ادیب ایک دم چلا پڑا۔

"نکل جاؤ، دور ہو جاؤ میری نظروں سے ....!"

"کیوں؟ ایک بار صرف ایک بار اپنی زبان سے اقرار کر لیجئے کہ بے پناہ عزت، دولت اور شہرت پا کر کیا آپ کو سکون ملا ہے۔"

"یہ بکواس بند کرو۔ یہ سب غلط ہے۔ آپ میرا وقت برباد نہ کریں۔"

"اور وہ بھی اتنی دیر سے وقت ہی تو برباد ہو رہا ہے .... اور وہ بھی آپ جیسے عظیم ادیب کا، جس کا ایک ایک لمحہ ملک کی امانت ہے لیکن .... لیکن آپ ہی کی وجہ سے آپ کا وقت برباد ہو رہا ہے۔"

میرا ایک ایک لفظ ادیب کے دل میں نشتر کی طرح چبھ رہا تھا۔ آخر کار وہ بولا

"وہ .... بے حد حسین اور دلفریب تھی۔ حسین تو میری بیوی بھی بہت تھی لیکن .... لیکن میری بیوی کی سہیلی کی بات ہی کچھ اور تھی .... اس کا بات کرنے کا موہ لینے والا انداز اور اس کی نقرئی ہنسی مجھے بے چین کر جاتی تھی اس لئے میں اسے چاہنے لگا تھا۔ وہ بھی شاید مجھے چاہنے لگی تھی۔ جب ہی تو اس نے موقع ملتے ہی اپنی چاہت کا اظہار کر دیا تھا اور اس طرح وہ آہستہ آہستہ میرے احساسات پر چھاتی چلی گئی اور اس کی محبت کی آگ میرے دل میں بھڑک اٹھی۔ اور جب محبت شدید ہو جاتی ہے تو بے خودی طاری ہو جاتی ہے اور اس بے خودی میں درمیان کا فاصلہ بھی مٹ جاتا ہے۔ میں نے ایک دن سرگوشیوں کے درمیان کہا کہ ہمیں مستقبل کا پروگرام بنانا چاہئے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ پتہ بھی نہ چل سکا کہ ہم کس منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ ہوش آیا تو پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ میری بیوی میرے راستے کا پتھر تھی۔ میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے ہی مناسب مقدار میں اس کے جسم میں زہر پہنچایا تھا۔ آخر ایک دن وہی ہوا جس کا ہمیں انتظار تھا۔ اسے ٹی بی ہو گئی۔ ہسپتال میں ڈال کر ہم بے فکر ہو گئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔"

وہ نجانے کیا کچھ بولتا رہا۔ اس کی محویت میری آواز سے ٹوٹی۔

"آپ نے اپنے حقیقی نام سے افسانے کیوں نہیں شائع کرائے؟"

اس سوال نے بم کا کام کیا اور وہ بھڑک اٹھا۔

"کیا آپ کو میرے نام پر بھی شبہ ہے؟ احمد یزدانی ہی میرا حقیقی نام ہے۔"

"مریم بہت خوبصورت نام ہے اسی نام سے لکھتے تو ....!"

"آپ کو میرے حقیقی نام کا کیسے علم ہوا؟ اس کے سوا میرا حقیقی نام کسی کو نہیں معلوم ہے .... آپ .... کون .... ہیں؟" وہ [illegible]

چند سال بعد میرے دل کے کھنڈر میں تم آ کر [illegible]

ہیں۔ جن کی ٹیس اور شدید درد سے میں تلملا اٹھا ہوں اب بے چین ہو اٹھا ہوں.... پندرہ سال بعد ماضی کے اوراق جو دھندلے ہو چکے تھے آپ نہ آئی ہوتیں۔

وہ میری صورت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا لیکن پندرہ سال کے طویل عرصے میں آفات اور آفتاد نے میرے چہرے کو بالکل بدل دیا تھا۔ اور میں کالا چشمہ بھی لگائے تھی، اس لئے وہ پہچان نہ سکا۔

"بتائیے! آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں، بتائیے۔ خدارا بتائیے؟"

"سننا ہی چاہتے ہو تو سنو!
میں نے چشمہ اتارتے ہوئے کہا میں صوفیہ رہی ہوں جو اتفاق سے زندہ رہی اور آج تم سے انتقام لینے آئی ہوں۔ تمہارا فوٹو ایک رسالے میں دیکھ کر مجھے علم ہوا کہ ایسے اصلاحی ناول اور افسانے لکھنے والا وہی شیطان جس نے مجھے اکر دہ گناہ مارنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔

یہ سنکر وہ کانپا اور بیہوش ہو کر گر پڑا

ابوالہول

مصنف رابن کوک
مترجم منظر الحق علوی

وادی فراعنہ مصر کے عجیب کھنڈروں میں دفن ایک عظیم خزانے کی چوری سے متعلق ایک سنسنی خیز اڈونچرس اور جاسوسی ناول تین ہزار سال قبل خزانہ کھودنے والوں کی اموات پراسرار طریقے پر اسرار طریقے پر ہوئیں۔ پھر اس کے لئے قتل و غارتگری کا سلسلہ جاری رہا۔

قیمت مجلد۔ تیس روپیہ

یکم جون سے ڈاک کی شرحوں میں اضافہ ہو گیا ہے۔ کارڈ کی حسب سابق ۱۵ پیسے ہی ہے لیکن ان لینڈ اب ۳۵ پیسے کا ملے گا اور لفافہ معمولی وزن کا پچاس پیسے میں جائے گا۔ جو بھی بہنیں نوٹ فرمالیں اگر کسی بھی جواب طلب بات کے لئے کارڈ یا ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں ورنہ جواب کی امید نہ رکھیں۔

رخصتی

(واجدہ تبسم)

مبارک ہو بیٹی نیا گھر بسانا
نئے گلستان میں نیا آب ودانا

یہ دنیا کا دستور ہے اک پرانا
کہ عنوان شادی بنے اک فسانا

گوارا ہی کب تھا تراپاس سے جانا
ہوں مجبور لیکن بہ رسم زمانا

نشیمن کو شوہر کے تم یوں سجانا
خلوص و محبت کے دیپک جلانا

جدائی سے غم کا ہے طوفاں دل میں
اگرچہ یہ منظر بہت ہے سہانا

ذرا گوش دل سے مری بات سن لے
وہاں جا کے انگڑائی لے گا زمانہ

نماز اور روزے کی پابند رہنا
رہے تیرا مسلک سدا مومنانا

وہاں اپنے کم ہوں گے بیگانے زیادہ
انھیں انکساری سے اپنا بنانا

ہیں دشواریاں بھی رہ زندگی میں
جنھیں عزم محکم سے آساں بنانا

کسی سے بھی نفرت دکھانا خدارا
اٹھائے نہ تجھ پر یہ انگلی زمانا

مسرت کے دامن میں غم بھی ملیں گے
غموں میں ترا کام ہو مسکرانا

تری واجدہ کی دعا بس یہی ہے
سبق لے تری زندگی سے زمانہ

([illegible])

ٹیلیفون

سامان راحت یا مصیبت

(غزالہ اسد)

ٹیلیفون باعث رحمت یا باعث زحمت ؟ اس سوال کا جواب ہر شخص اپنے تجربات کی روشنی میں دیتا ہے۔ جب ہمارے یہاں فون نہیں تھا تو ہم دوسروں کے گھر میں رکھے ہوئے فون کو ایسی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے جیسے فون کے سیٹ کی بجائے چاکلیٹ سے بھرا ڈبہ رکھا ہو۔ ان دنوں ہمیں فون سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا دل کرتا تھا کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر کہیں سے فون کا ایک عدد سیٹ لے آئیں۔ لیکن صاحب بات اگر فون کے سیٹ لانے کی ہوتی تو اس میں کوئی مشکل نہ تھی سارا مسئلہ ٹیلیفون کنکشن کا تھا۔ فون کا محکمہ دو چار سالوں میں کبھی کبھار غلطی سے یا منہ کا مزہ بدلنے کے لیے چند ایک لوگوں کو عطا کر دیتا ہے۔ فی الحال ان چند ایک لوگوں میں ہم شامل نہ تھے، جس کا ہمیں دلی صدمہ تھا۔ سال دو سال تو انتہائی شرافت سے صبر کیا اور صبر کے پھل میٹھے ہونے کا انتظار کرتے رہے۔

صبر کا پھل کسی صورت میٹھا ہونے میں نہ آیا تو ہم نے وہی راہ اختیار کی جس پر ساری دنیا چلتی ہے۔ یعنی ایک زبردست قسم کی سفارش لڑائی ایک ہفتے بعد ہم فون والے بنے بیٹھے تھے۔ پہلے تو سوچا کہ فون کو ڈرائنگ روم میں رکھا جائے تاکہ ہر آنے جانے والے کو پتہ چلے کہ ہم ایک عدد فون رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی خوا ہوں نے ڈرایا کہ ڈرائنگ روم میں فون رکھنے سے جہاں شان کا اظہار ہوتا ہے وہاں بل بھی بہت شاندار آتا ہے۔ ہر آنے جانے والا آپ کی عزت افزائی کے لئے فون استعمال کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ فون کو اپنے کمرے میں رکھنے کی تجویز بھی بے حد خلوص کے ساتھ پیش کی۔ لیکن اسی پر سب بول اٹھے جیسے ہم کوئی غرض وہ نا ہوا کام کر رہے ہیں یا کہ فون کسی کے کمرے میں نہیں رہیگا۔ بلکہ راہداری میں رہے گا تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ اس پر بڑی آسانی سے اتفاق رائے ہو گیا۔ اور یوں ٹیلیفون صاحب راہداری میں جلوہ افروز ہوئے۔

پہلے دن سب جاننے والوں کو باری باری فون کرکے خوشخبری سنائی اور ڈھیر ساری مبارکبادیں وصول کیں۔ بلکہ ہماری ایک ہمسائی مٹھائی کا ڈبہ اٹھا لائیں۔ ہم بار بار فون کی طرف تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کرتے رہے جس کی بدولت ہم نے اتنی لذیذ مٹھائی کھانے کی سعادت حاصل کی (مٹھائی کی ساری لذت اس وقت بھاپ سے اڑ گئی جب وہ محترمہ آئے دن ٹیلیفون سے محبت جتانے ہمارے ہاں تشریف لانے لگیں۔) جاننے والوں کو اپنے ہاں ٹیلیفون لگنے کی اطلاع دینے کے بعد ہم ہر وقت اس بات کے منتظر رہنے لگے کہ کب فون کی گھنٹی بجے اور اس کی سریلی آواز سے سارا گھر گونج اٹھے اس انتظار میں ہم آدھا دن فون کے پاس ہی گزار لے گئے رسالہ پڑھنا ہو۔ کیسٹ سننا ہو کسی کو خط لکھنا ہو۔ سارے کام فون کے پاس بیٹھ کر ہی ہونے لگے چاہے فون کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ کر کمر میں درد ہی کیوں نہ ہو جاتا۔ مگر مجال ہے جو کسی کو ہمارے اس انتظار کا خیال ہوتا۔ آخر تنگ آ کر ہم نے خود ہی ایک دوست کے ہاں فون کر کے ان سے کہا کہ وہ ہمارے یہاں فون کریں۔ اس بیچاری نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے فوراً فون کیا۔ جب اسے اس کی وجہ معلوم ہوئی تو وہ پورے چار منٹ اور سینتیس سیکنڈ تک قہقہے لگاتی رہی۔ ہم غصے میں پیچ و تاب کھاتے رہے۔ ہم نے غصے میں ریسیور اتنی زور سے پٹخا کہ ہمیں شک ہوا کہ ٹوٹ گیا ہوگا لیکن وہ ڈھیٹ بنا ہمارا تمسخر اڑا رہا تھا۔

رفتہ رفتہ فون کی اتنی گھنٹیاں بجنے لگیں کہ بے چارہ فون ہر دو چار منٹ بعد چیخ چیخ کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا۔ گھنٹی پر ہم سب فون کی طرف یوں بھاگتے جیسے ایمرجنسی سے کال آئی ہو۔ بلکہ اکثر یوں ہوتا کہ ہم فون اٹھا لیتے اور [illegible] کا نشان بنا کر سننا کی طرف دیکھتے۔ [illegible] کی صورت پیدا ہو گئی ہے [illegible] ہو گئی ہے۔ ہماری ابھی [illegible] فون [illegible] کر دیا جاتا کہ کہیں غلطی سے اس نے پاگل خانے کا نمبر تو نہیں ملا دیا۔

پھر یوں ہوا کہ فون کی گھنٹیوں کی عادت سی ہو گئی فون کی گھنٹیاں سن سن کر ہمارے کان پک گئے۔ فون بھی دوسری تمام چیزوں کی طرح پھیکا سا لگنے لگا۔ مگر اس کے وجود بھی یہ دل سے نہ اترا۔ اس کی وجہ ڈھیر سارے لوگوں کی وہ دلچسپ گفتگو تھی جو اکثر نمبر ملاتے ملاتے اُن مل جانے پر ہم نے سنی۔ اسی فون کی وجہ سے ہمیں نئے نئے فیشنوں کا پتہ چلا۔ ٹی۔وی پروگراموں پر تبصرے سننے کو ملے کرکٹ میچوں اور کھلاڑیوں پر دلچسپ بات چیت سننے کا موقع ملا۔ فون کے ذریعے ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا مثلاً ہمیں پتہ چلا کہ دیا نرڈ ڈاکٹر ساہی فلم اتنی اچھی ہے کہ اسے چار مرتبہ دیکھنے پر بھی دل نہیں بھرتا۔ اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ہم نے بھی یہ فلم دیکھی۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی پتہ چلا کہ بابرا شریف ایک دن اداکاری کرتے کرتے رو پڑی تھی۔ یہ بھی کہ ایک لڑکی نے برقع میں وحید مراد کو دیکھا اسے وہ اتنا بونا لگا کہ وہ فون پر باقاعدہ سر پیٹ کر یہ بات اپنی دوست کو بتا رہی تھی۔ اس کے علاوہ وارث کی آخری قسط دیکھ کر ایک صاحب عابد علی سے باقاعدہ حسد کھا رہے تھے اور یہ کہ عمران خان فون پر بڑی بھدی آواز میں بولتا ہے۔ ایسی مزے مزے کی باتیں اگر آپ سنیں تو بتائیے بھلا آپ فون جیسی نعمت کو درخور اعتنا سمجھیں گے یا نہیں۔

ان سب خبروں کے علاوہ ہمیں اکثر خواتین کی گفتگو سننے کا بھی موقع ملا۔ جو بس ابھی پانچ منٹ اور کہہ کر مسلسل دو گھنٹے گفتگو کرتی ہیں۔ ان کی گفتگو کا محور زیورات اور کپڑے ہوتے ہیں۔ فون پر ہمیں بڑے اچھے اشعار سننے کا موقع ملا۔ فون ایک اور لحاظ سے بھی باعث رحمت ہے کہ موسم کی تبدیلی کی وجہ سے پھیلنے والی بیماریوں کا بھی پتہ چل سکتا ہے۔ مثلاً جن دنوں زکام کی وبا پھیلی ہو سب کی آوازیں بیٹھ جاتی ہیں کہ سننے والے کے کان خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اکثر چھوٹے بچوں کو فون پر انگریزی نظمیں سناتے ہوئے بھی پایا۔

اور سب سے دلچسپ چیز محبت کے متوالوں کی باتیں ہوتی ہیں، جو بیٹھ کر ایک پیار بھری گفتگو کرتے رہتے ہیں، ایسے کہ ان کی بات کوئی سن ہی نہیں سکتا [illegible]

فون ہر لحاظ سے ایک مفت ذریعہ تفریح ہے گھر بیٹھے لوگوں کی مزے کی باتیں سنئے اس کے لئے آپ کو سوائے چونگا اٹھانے کے اور کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ چونگا اٹھائیے بھانت بھانت کی بولیاں اپنے گھر بیٹھے سنئے۔ نئی تازہ خبریں سنئے، بلکہ اخبار بند کر دیجئے۔ کیونکہ فون کے ہوتے ہوئے اس کی قطعاً ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ خواتین کی باتیں اسپورٹس کی خبریں اور بچوں کے خاص نمبر فون پر زیادہ جامع انداز میں پیش کئے جاتے ہیں اور سننے کا لطف صحیح معنوں میں آتا ہے۔

فون ہر لحاظ سے بہترین تفریح ہے اگر اس میں خامی ہے تو بس یہی کہ جن دنوں یہ خراب ہوتا ہے یا جن دنوں ہماری غیر موجودگی کی وجہ سے استعمال میں نہیں آتا۔ انہی دنوں اس کا بل سب سے زیادہ آتا ہے۔ اس کی وجہ آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آسکی۔ کیا آپ کو اس کی وجہ معلوم ہے؟

فون لگوانے کے بعد سب سے بڑی مصیبت یہ محسوس ہوتی ہے کہ بارہ، ایک یا دو تین بجے فون آتا ہے کہ ذرا تکلیف فرما کر فلاں صاحب کو اطلاع کر دیں کہ ہسپتال میں ان کے مریض کی حالت خراب ہے۔ اور ہم لباس تبدیل کر کے بھاگتے ہوئے موصوف کے گھر جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے محلے میں دور دور تک کسی کے گھر میں فون نہیں ہے، اس لئے ہر آدمی نے ہمارا نمبر نوٹ کر کے اپنے اعزہ و اقربا کو لکھا دیا ہے اور وہ بے تکلفی کے ساتھ جب چاہتے ہیں۔ فون کر کے ذرا فلاں کو بلا دیجئے۔ نہ بلائیں تو بد مزگی ہوتی، بلاتے ہیں تو اپنے آرام میں خلل پڑتا ہے۔ اس لئے اب سوچ رہا ہوں کہ فون کٹوا دوں۔

خوشی کے آنسو

شکیل انصاری۔ دھولیہ (مہاراشٹر)

"کبھی دو ہنسنے والوں کے مقابلے میں رونے والوں میں زیادہ ملامت ہوتی ہے۔ انسان اگر اپنے لئے نہ کبھی روئے تو کیا، مگر دوسروں کے لئے تو ضرور رونا چاہیئے۔ اس دنیا میں محبت، عبادت، خدمت، قربانی، تیاگ وغیرہ جو کچھ بھی اچھائیاں پیدا ہوتی ہیں تو وہ کس وجہ سے؟ دور کبھی کسی نہ کسی کی آنکھ سے برسنے والا ساون ہی اس نیکیوں کی فصل کو پروان چڑھاتا ہے۔"
برٹرینڈ رسل

"میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی جریر! اللہ مجھے اس طرح چھوڑ کے نہ جایئے۔ ابھی ہماری شادی کو ایک سال بھی تو نہیں ہوئے۔ اور آپ آج یوں مجھ کو اپنے سے جدا کر رہے ہیں؟"

خاموش کھڑی رضوانہ سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔

ہمیشہ کھلکھلاتے ہنستے ہنساتے رہنے والے خوبرو جریر بھی چپ چاپ اپنی خدمت گذار زندگی کی ساتھی کو تک رہے تھے۔ اور منتظر تھے کہ رضوانہ اپنی زبان سے گلے شکوے، شکایتیں کرے۔ مگر وہ تو ایک سنگ مرمر کے مجسمہ کی طرح ایستادہ تھی۔

جریر فوج میں اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ ناگہانی چھڑنے والی جنگ نے ان کو فرائض کی ادائیگی کے لئے پکار لیا۔ محب وطن جریر ملک کی محبت میں سرشار کیپٹن کی وردی پہنے میدان جنگ میں جانے کو تیار تھے۔ مگر جب ان کی نظر معصوم رضوانہ پر پڑی تو انھیں ایسا لگا جیسے وہ جنگ پر ـــ فرض ادا کرنے نہیں بلکہ فرض ادا کرنے گناہ کرنے جا رہے ہوں ـــــ ہر چند کہ جریر فرائض اور گھر گرہستہ داری کے تئیں اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے تھے۔

ترے ماتھے پہ یہ رنگین آنچل خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس شعر کی تحت انھوں نے کبھی بھی فرض اور گھر کو غلط ملط نہیں کیا۔ ان کے مطابق آنچل اپنی جگہ ہے ــ اور پرچم اپنی جگہ ہے۔ دونوں مقدس ہیں۔ اور اپنی اپنی جگہ پاکی اور اچھائیوں کے مظہر ہیں۔ لیکن ان دونوں کو ملانا نہیں چاہیئے۔ ان کے تقدس کو ایک نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سادہ حقیقت کے ستون کو جریر کے عمل نے اور بھی واضح کر دیا تھا۔ رضوانہ سے پیار بھری گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کبھی خندقوں کا تذکرہ، بارود سے دھواں میدان جنگ اور بارود کی بدبوؤں کو یاد نہیں کیا۔ اور چھاؤنی میں پریڈ کے وقت۔ رجمنٹ میں کمانڈ کو حکم دیتے ہوئے۔ اسلحہ کو صاف کرتے ہوئے۔ اور اپنی پلاٹون کو جنگ کی ریہرسل کراتے وقت انھوں نے کبھی بھی اپنی رضوانہ اور سانولی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ لال اینٹوں سے بنا دو منزلہ خوبصورت مکان، جس کی کھڑکی کے کھلے دریچے میں جوہی اور گلاب کی پتیوں بھری شاخ جھانکتی۔ دور پہاڑی سے چشمہ کی کھلکھلاہٹ کے پاس سرگوشی کرتے ننھے پرندوں کی آہٹ کھڑکیوں میں سرسراتی۔ رضوانہ کے دم سے یہ مکان ایک خوشنما گھر تھا۔ تبھی تو جریر نے رضوانہ کی سنگت پر اپنے گھر کا نام "سانولی" رکھا تھا۔

جریر نے رضوانہ کو مخاطب کیا۔ "جب میں محاذ پر ہوتا ہوں تو صرف ایک عام سپاہی ہوتا ہوں۔ نہ کسی کا بیٹا اور نہ ہی کسی کا شوہر۔ میں کسی کو یاد نہیں کرتا اور میں صرف اپنے فرض کو جواب دہ ہوتا ہوں۔ میرا یہ جسم و جان، دل و دماغ اور یہ سب کچھ جو سب کچھ تمہارا ہے۔ اس وقت بلا شرکت غیرے وطن کی ملکیت ہوتا ہے۔ اور میں ان سب کا استعمال مکمل طریقے سے اپنے وطن کے لئے کرتا ہوں۔ اور ..." جریر نے اپنی مختصر تقریر کا اثر دیکھنے کے لئے رضوانہ کے چہرے پر نظریں جمائیں۔ رضوانہ کا سانولا سا چہرہ خاموش تھا۔ اتنا خاموش کہ جریر کی تقریر بھی شرما گئی۔

وہ اپنے شریک حیات کی خوشی میں خوش رہنے والی سادہ لوح لڑکی شرم و حیا سے چپ تھی خاموشی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ .....

...... جریر چاہتے تھے کہ وہ کچھ بولے، مگر رضوانہ کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا، وہ چپ تھی۔ لیکن اس کی نگاہیں بول رہی تھیں۔

جریر کی روانگی کا وقت تھا۔ انھوں نے ایک تشنہ اور الوداعی نگاہ رضوانہ پر ڈالی۔ رونے سے قد والی معصوم سانولی سی لڑکی جتنی کم گو تھی اتنی ہی نیک اور بھولی بھالی، [illegible] محبت کی

اچھی۔۔۔ غمِ جدائی کی شدت نے اس کے گلاب جیسے صبیح رخساروں کو
جوہی کی رنگت دے دی تھی۔ اس کے حسن کی کشش بڑھا دی تھی۔
لرزاں غم سے کپکپاتے ہوئے پنکھڑی ہونٹ۔۔۔۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں
میں جاگتے اشک بہنے کو بے قرار و تیار تھے جنہیں پلکوں کی جھالر
سے تھپک تھپک کر وہ سلا رہی تھی۔ جریر کو ایسا لگا جیسے ڈل جھیل
میں طوفانی پانی بڑھ کر چھلک رہا ہو، کوئی دم میں جھیل چھلکنے والی
ہے اور کنارے پر کھڑے چناروں کے پتے اپنی پھڑپھڑاہٹ سے ہوا
اور پانی کا تناسب برقرار رکھ کے جھیل کو چھلکنے سے روکے ہوئے ہوں۔
جریر ہلکے سے قدموں سے آگے بڑھے۔ سیاہ مخملی پلکوں کو تھرتھراتی
انگلیوں سے بہ آہستگی چھوا۔ نہیں رضوانہ!۔۔۔ ان آنسوؤں کو نہ
بہاؤ۔ وہ دھیرے سے گنگنائے۔

؎ نکھرے ہیں مرے دل کے اے یار ترے آنسو!
دیکھے نہیں جاتے ہیں دلدار ترے آنسو!!

وعدہ کرو رضوانہ تم کبھی میری یاد میں کہیں کوئی آنسو نہیں
بہاؤ گی۔ تمہاری پھول سی آنکھوں میں لرزنے والے یہ آنسو
جیسے شبنم کے مہکتے قطرے ہیں۔ یہ وہ آبدار موتی ہیں جو ابھی
تک صدف میں بند ہیں۔ سیپ میں پوشیدہ ہیں۔ رخسار پر
ڈھلک کر تھم جانے والے آنسو جگمگاتے روشن ستارے ہیں۔۔۔
بس انھیں بہنے نہ دینا۔ اگر یہ ستارے تمہارے رخسار کا آسماں
نہ پا سکے۔ کوئی سہارا نہ پا کر ٹوٹے اور گر کر مٹی میں جذب ہو گئے
تو یہ صرف چند کھارے پانی کی بوندیں ہی رہ جائیں گی:

رضوانہ نے یہ سن کر آنکھیں کس کر بھینچ لیں۔ لرزتے ہوئے
اشک چھپ گئے۔ پلکوں کی جھالر یادوں سمیت ہلنے سے بکھرنے والی
بھینی خوشبو پلکوں میں لوٹ گئی۔ آبدار موتی واپس صدف میں قید
ہو گئے۔ اور جریر ملک کو حملہ آور دشمن کے شکنجے سے آزاد کرانے چلے
گئے۔

جدائی کی کسک سے بھرے دن پہاڑ بن کر گزرنے لگے۔
[illegible]

قطرے نہیں چھلکے ہیں ان آنکھوں کے پیالوں سے
[illegible] محبت کے ان پھول سے گالوں سے
بہنے جنہیں دوں گا میں بے کار ترے آنسو!!

گھر کے کام کاج اور مصروفیتوں میں رضوانہ اپنے کو گم کرنے کی
کوشش کرتی۔ مگر ناکام رہتی۔ کبھی کہیں جریر کا کوئی ایروگرام
آجاتا تو وہ دن دن بھر بیٹھی خط ہی پڑھا کرتی۔ اس کے ایک ایک
جملے اور ایک ایک لفظ کا ہفتوں لطف لیتی اور شاد رہتی۔ اگر اخبار
میں کوئی خبر پڑھ لیتی تو تشویش میں مبتلا ہو جاتی۔ یا ریڈیو پر کوئی خبر سنتی
تو پریشان ہو اٹھتی۔ اس کا ننھا سا دل کانپ کانپ جاتا۔ وہ نفلیں پڑھ کر
دعاؤں پر دعائیں مانگتی۔ اس کی نمازیں، اس کے سجدے، اس کے
روزے اس کی حمد و ثنا کی تسبیحات سب کچھ جریر کے لئے ہی ہوتے۔
سیدھی سادی لڑکی کو جنگ و جدل، فتح و شکست اور ملک و وطن
والی باتوں سے بھلا کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ امن پرست گاندھی کی سرزمین
میں جنم لینے والی رضوانہ بھی عدم تشدد کی قائل تھی۔

؏ خون اپنا ہو یا پرایا ہو نسلِ آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں امنِ عالم کا خون ہے آخر

(ساحر لدھیانوی)

رضوانہ نے کبھی اپنے ملک کی فتح و نصرت اور صلح و سلامتی کی دعا
نہیں مانگی۔ اس کی دعاؤں کا مرکز تو جریر اور صرف جریر تھے۔ بالآخر
اس کی دعائیں رنگ لائیں۔ اور وفاؤں کا جواب آ ہی گیا۔ ایک بند
تازہ لفافہ میں جریر نے پیام بھیجا کہ "جنگ صلح میں تبدیل ہو گئی ہے۔
اب بس میں آنے ہی والا ہوں"۔ اس کے علاوہ لفافہ میں جریر کی کئی
تصویریں بھی تھیں۔ جو اس نے محاذِ جنگ پر اپنے ساتھی جوانوں کے
ساتھ اتروائی تھیں۔ اپنے جریر کو تصویروں میں ہنستا ہوا دیکھ کر
رضوانہ کا سیروں خون بڑھ گیا۔ [illegible]
[illegible]

[illegible]

رضوانہ کے سارے آنسو آنکھوں کے غار میں لوٹ گئے۔ اور جریر بھی وہیں آ گئے۔ رضوانہ نے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ کہیں جریر ان کے رخساروں کے آنسوؤں کو غم کے آنسو نہ سمجھ بیٹھیں۔ جریر نے اس کا چہرہ اپنی جانب کیا... "ارے یہ کیا... بیگم صاحبہ رو رہی ہیں! کیا [illegible] کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اسی لئے تو یہ موتی [illegible] جا رہے ہیں۔" رضوانہ نے جلدی جلدی آنچل سے [illegible] اور جب اپنی [illegible] رہی... "تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم پھر [illegible] جاتے ہیں۔ یہاں تو اپنی آمد سے کسی کو مسرت ہی نہیں" [illegible] رضوانہ نے جلدی سے کھڑے ہو کر ان کا دامن تھام لیا۔ اور بے ساختہ بولی: "اللہ دیکھئے..." اور پھر یک بیک [illegible] "ہاں ہاں کیجئے جائیے۔ اللہ دیکھ رہا ہے" جریر کا [illegible] "اللہ [illegible] کہتی ہوں..." رضوانہ دھیرے سے بولی "مجھے آپ کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی اور..."

"تب یہ آنسو کیوں محترمہ؟" جریر کا شرارتی سوال تھا۔

"جی... یہ خوشی کے آنسو تھے۔ جو آپ کے آنے سے بے ساختہ نکل آئے..." رضوانہ نے جواب دیا۔

"ارے بھئی! پانی کے ان ننھے قطروں پہ یہ تو نہیں لکھا ہوتا کہ یہ خوشی کے آنسو ہیں یا غم کے آنسو ہیں... ویسے آنسو کوئی اچھی چیز [illegible] سے نکل آتے ہیں۔ اور اچھے بچے کبھی نہیں روتے..." جریر [illegible] رضوانہ کے گال اپنے رومال سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتے [illegible] دھیمے لہجے میں بولے: "رضوانہ میری روح! تمہارے آنسو خوشی کے ہوں یا غم کے ہوں... یہ وہ آبدار موتی ہیں جو [illegible] صدف میں بند ہیں۔ تمہارے رخسار پر ڈھلک کر [illegible] جانے والے آنسو روشن چمکتے ستارے ہیں۔ ان روشن ستاروں کو، آبدار موتیوں کو [illegible] قطروں کو پانی بنا کر نہ بہاؤ..."

"[illegible] آپ آ گئے۔ میری زندگی لوٹ آئی۔ اپنی زندگی کے [illegible] اور ستارے [illegible] سے نہ روکئے..." رضوانہ [illegible] کے ساتھ بولی۔ جریر نے آگے بڑھ کر رضوانہ کو بانہوں میں لے لیا۔ [illegible]

وہ [illegible] جیسے پھول کی ہر ایک پنکھڑی
رو رہا ہے کون تھام کے دامن بہار کا!!!

ان کے گرد پیار کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اور خدا نے ان کی مقدس محبت کی چاروں طرف اپنی سچی بندگی کا ہالہ کھینچ دیا تھا۔

کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے چند مشورے

- کامیاب ازدواجی زندگی میاں بیوی کی مکمل ذہنی ہم آہنگی کا نام ہے اس ہم آہنگی میں کبھی کبھی اختلاف پیدا ہونا بہت ضروری ہے
- میاں بیوی ایک دوسرے سے اپنے مسائل اور دوسرے معاملات پر آزادانہ بحث کریں تو ان کی ازدواجی زندگی کسی بڑے حادثے سے محفوظ رہ سکتی ہے روٹھنا اور روٹھنے کے بعد مان جانا یا دوسرے ساتھی کو منا لینا ازدواجی زندگی کے خوشگوار تجربات ہوتے ہیں اگر چھوٹی موٹی لڑائی نہ ہو اور لاوا اندر ہی اندر پکتا رہے تو بالآخر یہ بڑے زور سے پھٹتا ہے اور اس کے دھماکے کی آواز ساری زندگی سنائی دیتی ہے۔

اس بڑے دھماکے سے بچنے کے لئے چھوٹی موٹی لڑائیاں ضروری ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ لڑائی کے لئے ہر وقت تیار رہیں اگر گھر میں کسی قسم کی کوئی بات ہو تو دوسرے رشتہ داروں سے ذکر کرنا غلط فہمیوں کو جنم دیتا ہے۔ شوہر و بیوی کو چاہئے کہ بہترین زندگی گزاریں۔

مرسلہ: بیگم ہوشیار جنگ (ممبئی)

- خط و کتابت کرتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

سفرِ لکھنؤ کے تاثرات

عفت موہانی

لکھنؤ کے سفر اور سب سے ملنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ۱۹۵۷ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک پورا عرصہ ایک تاریخی اور یادگار لمحے میں سمٹ کر رہ گیا ہو۔ میرے لئے وہی زمانہ واپس لوٹ آیا۔ جب میں نے شروع میں ماہنامہ کلیاں میں لکھنے کا آغاز کیا تھا اور اپنے بھائی جان محترم نسیم انہونوی صاحب سے ملنے کی خواہش شدید تر تھی لیکن زمانہ جوانوں کے درمیان گردش بدلتا رہتا ہے۔ اس نے میرے حالات زندگی میں بھی ایسی گڑبڑ پیدا کی کہ ملاقات کی تمنا دل کی گہرائیوں میں بدستور رہی لیکن ملنا نہ ہو سکا۔ ویسے میں نے بھائی جان کو ہمیشہ مادی طور پر دور اور روحانی طور پر اپنے سے قریب سمجھا تھا۔ وہ میرے بھائی میرے کرم فرما میرے سر پر شفقتوں کا سائبان تو ہیں ہی۔ لیکن میں نے انھیں اپنا باپ ناتا اور سمجھا ہے۔ اور اپنا تایہ سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ مجھے خورشید سلطانہ سے عفت موہانی جس نے بنایا! اور ایک خاص معتبر و شریف حلقے میں مجھے ادبی حیثیت سے روشناس کرایا۔ وہ صرف بھائی جان کی مہربان و مخلص ہستی ہے۔ اور میں ہی ربع صدی سے ان کی ہستی سے وابستہ وہ ناچیز شخصیت ہوں جس سے ملنے کا دل ان کا بھی چاہتا تھا۔ اور بالآخر ان کے دریائے خلوص کو عبور کر کے میں اور خالد ۳۰ اپریل کو لکھنؤ کے ساحل سے لگ گئے! جس پر محبت اور گرمجوشی سے بھائی، محترمہ عزالہ بھابی، محترمہ ناہید باجی اور پیاری سی نجم سحر نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ وہ میرے لئے باعث فخر و مسرت ہے۔ بھائی جان باوجود اپنی مصروفیات اور بے پناہ دوسری مشغولیات کے بنفس نفیس مجھے لینے کے لئے اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ مجھے ضعیف سا اندیشہ تھا کہ شاید میری خرابی صحت مجھے اتنے سفر کی اجازت نہ دے! لیکن بہرحال میری محبت انھیں کشاں کشاں لے آئی۔ ان کے ساتھ [illegible] سلیم میاں اور نجم سحر [illegible] کے [illegible]

کے اصلی روح رواں فہیم میاں بھی تھے۔ جنھوں نے اپنی خفگی کی خوفناک دھمکی دے کر مجھے کھینچ بلایا تھا۔ میں الفاظ میں اپنی مسرتوں کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ جن ہستیوں سے میں ایک عرصے سے وابستہ رہی ہوں۔ آج انھیں پہلی دفعہ دیکھ رہی تھی۔ اور جب میں امڈتے دل کے ساتھ اپنے بھائی جان کے سینے سے لگ گئی تب مجھے معلوم ہوا کہ یہ خواب نہیں! حقیقت ہے کہ میں بھائی جان کے پاس لکھنؤ آپہونچی ہوں۔!

اتوار ۲ مئی ۱۹۸۳ء کو عزیزی فہیم میاں کی شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا۔ بارہ دری قیصر باغ میں خواتین کا ہجوم تھا۔ بھائی جان کے خلوص کی آہنی زنجیر نے کہاں کہاں سے مہمانوں کو کھینچ بلایا تھا۔ میں ہر لب پر ان کی محبت و شفقت اور خلوص کی تعریف دیکھی وہ ہستی ہی ایسی ہے لوگ ان کی تعریف و مدح پر مجبور ہیں۔ شادی بڑی پیاری سادی لیکن بڑی پُر وقار تھی۔ مجھے اس لئے بہت پسند آئی کہ بے جا دھوم دھام فضول رسمیں اور خواہ مخواہ کا شور و غوغا نہ تھا۔ دلہن بڑی پیاری لگی!۔ خدا کرے کہ وہ مثالی بہو ثابت ہو۔ جو سسرال کو سسرال نہیں۔ بلکہ اپنے ماں باپ کا گھر سمجھے۔ نیک دل ساس سسر کو اپنے ماں باپ ان کی رضا جوئی اور خدمت کو اپنی زندگی اور شوہر کی محبت و خوشنودی کو اپنا ایمان اور حاصل زندگی خیال کرے۔ اس کی آمد اس گھر اور اس کے مکینوں کے لئے عمدہ شگون اور فال نیک ہو۔ آمین۔

میں لکھنؤ پہلی دفعہ آئی تو کیا۔ میرا خمیر تو یہیں کا ہے۔ لہٰذا یہاں کی صاف ستھری ادبی بولی سن کر مجھے اپنے بزرگوں کی بولی یاد آگئی جو فی الحال ہمارے شہر حیدرآباد میں بھولے سے بھی سننے کو نہیں ملتی! مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور اسی لئے میں نے سب سے گفتگو کم کی اور سب کی گفتگو زیادہ سنی!

شادی کے بعد صرف چھ سات دن میرے قیام کے اور باقی تھے۔ اس عرصہ میں ناہید باجی اور نجم سحر نے [illegible] اپنے ساتھ گھمایا۔ یہاں کی سڑکوں پر بھی خاص [illegible] کی کثرت نظر آئی۔ ہمارے ساتھ محترمہ آپا [illegible] خورشید [illegible] بھی تھیں۔ ان کا اخلاق [illegible] سے بات چیت کرنے کا خاص انداز مجھے بڑا پسند آیا۔ [illegible] اور سلیم میاں کی تہذیب، اخلاق اور [illegible] نے مجھے [illegible]

ملاقات ہوئی۔ سب نے مجھے لکھنؤ آنے کی دعوت دی ہے! اور میرا ارادہ ہو رہا ہے کہ ایک بار پھر محترمہ آپا صاحبہ کی گفتگو سننے کی سعادت حاصل کی جائے!

فرزانہ بھابی اور ناہید بھی بڑی مخلص، خوش مزاج اور ملنسار ہیں۔ بادجود اپنی جسمانی تکلیف اور بے پناہ مصروفیت کے ان کے چہرے پر مسکراہٹ جدا نہیں ہوتی۔ مجھے نجمہ نکہت سے ملنے کی بڑی آرزو تھی جتنی وہ حسین ہے اتنی ہی سیرت کی بھی پیاری ہے! ۔ خداوند کریم اسے دنیا بھر کی خوشیاں عطا کرے۔ بے حد پیاری بچی ہے! شادی میں نسیم بکڈپو کے منیجر جناب نسیم الحسن صاحب کی اہلیہ محترمہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ عرصہ دراز کی غائبانہ شناسائی نے کوئی پردہ تکلف یا اجنبیت کا باقی نہ رکھا تھا۔ چنانچہ وہ بھی بہت زیادہ اپنائیت اور محبت سے ملیں۔ اور دیر تک گفتگو کرتی رہیں۔ محترم جمیل الحسن صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت مخلص اور پر محبت انسان ہیں۔ نسیم بکڈپو کے استحکام اور ترقی کے ضامن۔ بھائی جان کے دست راست اب منیجر سے زیادہ بھائی کی طرح ہیں۔

نسیم بکڈپو دیکھا۔ ہزاروں کتابیں دیکھ کر دل بہت مچلا۔ کئی کتابیں لے بھی لیں۔ لیکن کتابوں کے سلسلہ میں میرا حال بچپن کا سا ہے۔ جس نے کہا تھا کہ میں یا تو اپنے وطن میں مروں یا کتب خانہ میں۔ کتابوں سے میرا جی نہیں بھرتا۔ اب جو کتابیں لائی ہوں وہ پڑھ رہی ہوں ———

۱۰ رمئی کو محترمہ چیزہ وقار کی خاطر خواتین بزم ادب نے ایک نشست رکھی تھی۔ جس میں مجھ سے ایک افسانہ سنانے کی درخواست کی گئی۔ مجھے گمان نہیں تھا کہ میری بے حقیقت ہستی بھی کسی قابل بھی جائے گی۔ ورنہ میں اپنے طور پر تیاری کرتی یا کوئی بیان ادا کر سکتی ——— میں تو اس نشست ہی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ تو علم و ادب کی بڑی ماہر شخصیتیں تھیں۔ میں کیا اور میری کیا مجال کہ ان کے قابل ہوں۔ لیکن بہر حال مجھے سب کی مخلصانہ فرمائش پوری کرنی تھی میں نے ایک افسانہ پڑھ کر سنایا۔ ادب شناس خواتین سے تھوڑی دیر تک بھی گفتگو ہوئی۔ سب سے محترمہ چیزہ وقار محترمہ صدیقی صاحبہ اور محترمہ صاحبہ نے تعارف کرایا۔ مجھ جیسی

کم گو اور کم آمیز کے تعارف نے خواتین نے کیا تاثر قبول کیا، یہ مجھے پتہ نہیں!

لکھنؤ کے دس روزہ قیام میں بہت سی خواتین سے ملی۔ محترمہ فیروزی قسیم اشرفی، ستارہ آپا صاحبہ، نور جہاں بیگم۔ اور نام میں بھول رہی ہوں۔ فیروزی بہن بہت ہی با اخلاق اور سیدھی سادی ہیں۔ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں۔

۸ رمئی کی رات کو ڈاکٹر شمیم انہونوی صاحب نے دلہن کے ساتھ ساتھ مجھے بھی مدعو کیا تھا۔ کچھ دیر ان کے یہاں بھی نشست رہی تھی۔ ایک دفعہ محترمہ زیبا صلاح الدین صاحب کے دولت کدہ پر بھی گئے۔ وقت کم۔ یادیں اور باتیں بہت سی ہیں لہ اور جب دل میں سمٹنے کو بہت کچھ ہو تو قلم کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ محسوسات کو الفاظ کا جامہ پہنانا بھی ناممکن ہے۔

مجھے قیام لکھنؤ کی اپنی پڑوسن فرزانہ صاحبہ بھی یاد آتی ہیں۔ جن کا دو چار دن شب و روز کا ساتھ رہا تھا۔ وہ مجھ سے بہت پہلے چھپنہ چلی گئیں۔ ان کے ساتھ رونما ہونے والے لطیفے ابھی تک یاد آتے ہیں اور تنہائی میں بھی ہنسی آجاتی ہے! ——— اس سلسلہ میں بھائی جان کے دوست جناب طفیل احمد صاحب ایڈوکیٹ کی بھی شکر گذار ہوں جن کی کوٹھی میں میرا قیام تھا اور جہاں مجھے ہر آرام ملا۔

وقت کبھی کسی کے اچھے برے محسوسات کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ بس پاس سے نکلا چلا جاتا ہے۔ بالآخر روانگی کی گھڑی بھی آگئی۔ ۱۱ رمئی کی صبح مجھے بہت اداس تھی۔ دل میں سوچ رہی تھی کہ پتہ نہیں پھر کب یہاں آنا نصیب ہوگا۔ زندگی وفا کرے گی کہ نہیں! ۔ اب دل بوجھل تھا۔ اور بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے دس یادگار دن گزارے تھے۔ بھائی بھاوج بہن بھانجیوں اور اپنے بھتیجیوں کے درمیان۔ ان سب کی بے پایاں محبت اور خلوص کے درمیان ——— بہترین جو ایک دوسرے کو آپس میں ملتی ہی ہے جدا بھی کرتی ہے۔ حد ہے کوئی بھی نہیں ساتھ بھائی جان، امی ناہید صاحبہ فیروزی بہن محمد میاں اور نسیم اور امی کاشف بھی تھے۔ ندیم صاحب اور سہیل بھی۔ لیکن مجھے احساس ہی نہ تھا کہ میں نے کس سے کیا کہا اور کس طرح ملی۔ میرا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میری میں آنسو ... کوشش کرتی تب بھی ...

میں اور خالہ سب سے تاقدِ لا خواستہ رخصت ہوئے۔ بھائی جان اپنے دل سے مجبور ہو کر ڈبے میں میرے پاس آکر بیٹھ گئے۔ ان کی طرف دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے ان سے کچھ کہا بھی نہیں۔ بس ان کے سامنے سر جھکا دیا۔ اور انھوں نے اپنا شفیق ہاتھ جو اس وقت زبان بن گیا تھا جو کچھ دعائیں دے رہا تھا میرے سر پر رکھ دیا۔

وہ ٹرین جو ہمیں ایک روز لکھنؤ کی طرف لے جا رہی تھی۔ اب پھر واپس حیدرآباد پہونچانے لگی تھی۔ ہم خاموش تھے۔ کیونکہ ہمیں احساس تھا کہ لمحہ بہ لمحہ ہم اپنے چاہنے والوں سے اور دور ہوتے جا رہے ہیں!۔

گھر پہونچے تو دل سے ایک ہوک اٹھی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک میرے بھائی جان کا خاندان ہمیشہ ہرا بھرا خوش و خرم رہے۔ بھائی جان کو خداوندِ کریم صحت و زندگی اور عمرِ طویل عطا کرے۔ اور مجھے جلد از جلد ایک بار پھر ان کے پاس پہونچا دے!۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ

فتنہ و فساد اور خوں ریزی سے بچنے کے لئے آپؓ نے جامِ شہادت نوش کیا

تحریر: جمیل احمد صدیقی جمالی، ایم اے، بی ایڈ

حضرت عثمان غنیؓ ان اصحابِ رسولؐ میں سے ہیں جنھیں آنحضرتؐ سے خاص قربت رہی ہے۔ آپ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ یعنی ان کی زندگی ہی میں جنت کی بشارت دی [illegible]

حضرت عثمان بن عفان اپنا اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ آپ مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ ہیں۔ بحیثیت امیر المومنین اور [illegible] [illegible] اسلام [illegible]

دینی و دنیاوی خدماتِ جلیلہ کے علاوہ آپ کے فضائل احادیث مبارکہ میں منقول ہیں۔ قرآنِ حکیم میں بھی کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتے بھی ان سے شرم کرتے ہیں تو میں کیوں نہ ان سے شرم کروں۔ آپ کامل الحیاء والایمان ہیں۔ حضرت امام حسنؓ سے روایت ہے کہ حضرت عثمان اس قدر حیادار تھے کہ دروازہ بند کر کے کپڑے اتارتے حتیٰ کہ اس دوران آپ اپنی پیٹھ بھی سیدھی نہ کرتے۔ امیر المومنین علی مرتضیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت رسالتمآبؐ کا ایک خطبہ سنا ہے جس میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے عثمانؓ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت عثمانؓ نے دو مرتبہ جنت خریدی ہے۔ ایک مرتبہ کنویں کی کھدائی کے وقت دوسرے جب تبوک کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بیعت الرضوان کے موقع پر حضور نبی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک کو حضرت عثمان کا دست مبارک قرار دیا۔

حضرت عثمانؓ نبی کریم کی دعوت پر ایمان لانے والوں میں چوتھے مسلمان تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں آپ کے عقد میں آئیں اسی فضل و شرف کی وجہ سے آپؓ ذوالنورین کہلاتے ہیں دنیا میں یہ شرف بھی حاصل ہوا۔

[illegible] ہی نے مسجد کے لئے زمین خریدی اس کی تعمیر [illegible] آپ نے خود بھی [illegible] ایک مرتبہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مدینہ منورہ میں مسجد کے لئے زمین خریدی [illegible] [illegible] [illegible] روایت کے مطابق آپؓ نے [illegible] غلاموں کو آزاد فرمایا۔ وہ سب سے زیادہ [illegible] [illegible] کرنے والوں میں سے تھے۔ [illegible] [illegible] آپؓ ہی نے [illegible]

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تحریک پر مسلمان ہوئے آپ تمام صحابہ کرام میں سب سے زیادہ صاحب ثروت تھے۔

آپ نے مال و دولت بھی [illegible] آپؓ [illegible]

زیادہ فرماتے محنت و مشقت اور فاقہ کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں خوشی محسوس کرتے رزق حلال پر گذر بسر کر کے انہماک سے یادِ الٰہی فرماتے۔

اسلام کے ہر آڑے وقت میں کام آئے مسلمانوں کو تکلیف و رنج و غم سے نجات کے لئے ہر وقت کوشاں رہے۔ حضرت عثمان بن عفانؓ اپنی زندگی نہایت سادہ طرز پر گذارتے صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مالدار ہونے کے باوجود نہایت سادہ غذا پر گذر بسر کرتے آپؓ کا پیرہن بھی سادہ ہوتا تھا مسلمانوں کی خاطر مدارات میں کبھی کمی نہ فرماتے۔ نہایت لذیذ و قیمتی کھانے کھلاتے خود شہد یا روغن زیتون سے گذارہ کرتے کبھی گوشت اور سرکہ بھی آپ کی غذا کا عنصر ہوتا تھا۔ لوگوں کے ساتھ نہایت تواضع اور خوش اخلاقی سے پیش آتے۔

حضرت امام حسینؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ حضرت عثمانؓ ایامِ خلافت میں سر کے نیچے چادر رکھ کر آرام فرماتے تھے لوگ آپؓ سے ملنے آتے اور جگا دیتے۔ آپؓ اٹھ کر ان سے ضروری گفتگو فرماتے۔ جیسے وہ چلے جاتے تو دوبارہ لیٹ جاتے یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ لیکن میں نے آپ کے ابرو پر کوئی شکن نہیں دیکھی۔

عہد خلافت میں آپؓ نے اپنے کو کسی مسلمان سے برتر و افضل نہیں سمجھا آپ ہمیشہ دوسروں کی عزت و تکریم میں خوشی محسوس کرتے جس دن آپؓ نے شہادت پائی تھی۔ ابو سہلہؓ نے آپؓ سے فرمایا کہ آپ فکرمند نہ ہوں۔ ہم باغیوں سے لڑیں گے۔ حضرت عثمانؓ نے ابو سہلہؓ سے فرمایا نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجھے وصیت ہے میں اس پر صابر و شاکر ہوں حضور کی وصیت یہ ہے کہ ہر نبی کا ایک رفیق ہے میرا جنت میں رفیق عثمان ہے۔ اسی لئے میری تمنا ہے کہ میں اپنے محبوب و رفیق سے جلد مل جاؤں۔

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں بہت علاقے فتح ہو کر سلطنت اسلامیہ میں شامل ہوئے آپ کے دورِ حکومت میں روم اور ایشیائے کوچک کو مسلمانوں نے فتح کیا۔ ہمکند رہ ہمدان اور بائیجان میں باغیوں نے سر اٹھایا تو ان کو ختم کر دیا ——— تیونس و طرابلس الجزائر مراکش میں اسلامی فتوحات ہوئیں۔ مسلمان شیراز تک جا پہنچے ایران میں فتح پانے کے بعد کابل اور کرمان تک مسلمانوں کو رسائی حاصل ہو گئی شاہ کابل کے مسلمان ہونے کے بعد مسلمانوں کو ہندوستان کے مغربی ساحل پر پہنچنے کا راستہ مل گیا۔ مغیرہ بن شعبہ کی سرکردگی میں مسلمان کابل کٹ تک جا پہنچے۔ یہاں کے راجہ نے اسلام قبول کیا۔ کچھ فتنہ پرور لوگوں نے آپؓ کی نرم مزاجی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر فتنہ پروری اور سینہ زوری شروع کر دی۔ آپؓ نے یہی مناسب سمجھا کہ مسلمانوں میں فتنہ و فساد مزید نہ پھیلے۔ آپؓ کے جذبِ ایثار و قربانی کو بروئے کار لا کر اپنی زندگی پر امت مسلمہ کی زندگی کو ترجیح دی فتنہ و فساد اور خانہ جنگی سے بچنے کے لئے آپؓ کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔

جب مدینہ میں اصحابِ رسول کو بلوائیوں کی ان حرکتوں کا علم ہوا۔ انھوں نے چاہا کہ اس فتنے کو بزور طاقت ختم کر دیا جائے تو آپؓ نے انھیں منع فرمایا۔ بلوائیوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ مگر آپؓ نے سختی سے سب کو منع کر دیا تھا مسلمانوں کو ممانعت کر دی گئی تھی کہ میری خاطر کوئی تلوار میان سے نہ نکالے۔ چالیس روز تک آپ بلوائیوں کے محاصرے میں رہے حتیٰ کہ مسجد میں نماز کے لئے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بہ اصرار نوجوانانِ جنت کے سرداروں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو آپ کے مکان کے دروازے کی نگرانی پر مقرر فرما دیا مگر بلوائیوں نے دیوار پھاند کر ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کو آپ کو شہید کر دیا۔ جس وقت آپؓ شہادت کے مرتبے پر فائز ہوئے آپؓ اس وقت قرآن شریف کی تلاوت میں مشغول تھے۔

إنا لله وإنا إليه راجعون۔

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کی مرسلہ صرف ایک اپنی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف اور مختصر ترین الفاظ میں لکھی جائے اور نمبر خریداری و پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ اس طرح بھیجی جائے کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر پہنچ جائے۔ ۲۰ کے بعد آنے والی خبر ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہے۔ خبر کی اشاعت میں کسی غلطی کا ذمہ دار ادارہ حریم نہ ہوگا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے۔ ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

● شاہدہ اختر (کوٹھی۔ رسڑا) میری چھوٹی نند شمیم آرا کو اللہ پاک نے ۱۶ اپریل ۱۹۸۲ء بروز جمعہ پہلی بار ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور فخر نسواں بنے۔

● انجم فاروقی (جھنجانہ) میری پیاری باجی سیما فاروقی (نام صحیح پڑھا نہ جا سکا) اختر عزیز کو اللہ پاک نے ۳ مارچ ۱۹۸۲ء بروز بدھ بوقت چار بجے شام ایک بیٹی عطا فرمائی۔ اللہ پاک عمر طویل دے اور صاحب نصیب بنائے۔

● بدر الزماں صاحب (بہار شریف) کی دختر نیک اختر ناہید سلطان اور خویش محمد ابو الکلام کو اللہ پاک نے ۲۰ مارچ ۱۹۸۲ء کو صبح ۸ بجے ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد شاداب کریم قرار پایا۔ اللہ پاک عمر طویل عطا فرمائے اور فخر خاندان بنے۔

● توحید الحق صاحب سب پوسٹ ماسٹر یو۔ پی گورنرس کیمپ لکھنؤ کی صاحبزادی تنویر عذرا کو اللہ پاک نے ۲۰ اپریل ۱۹۸۲ء بروز جمعہ ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر خضری عطا فرمائے اور صاحب نصیب بنائے۔

● بیگم حمید الدین (سیتاپور) میرے بھائی محمد دین کو اللہ پاک نے ۲۴ اپریل ۱۹۸۲ء بروز پیر بوقت صبح ۸ بجکر ۱۵ منٹ پر اللہ تعالیٰ نے تیسری بار ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک عمر دراز کرے۔

● حفیظہ، سائرہ شاہینہ (آمبور) ہماری بھتیجی راحیلہ اور دولہا بھائی اسد اللہ کو اللہ پاک نے ۲۸ اپریل ۱۹۸۲ء کی شام کو پانچ بجے پہلی بار ایک دختر عطا فرمائی۔ اللہ پاک عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب کرے۔

● پروین فاطمہ لاری (کانپور) میرے بھیا نفیس احمد اور بھابی پروین بانو کو اللہ تعالیٰ نے دوسری بار ۴ مارچ ۱۹۸۲ء بروز سنیچر ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام ذیشان اقبال قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے۔

● سمی نیرہ شاہین و نہالہ نسرین (آمبور) "میری خالہ ریحانہ تاج اور خالو شاہ الرحمٰن کو اللہ پاک نے ۱۷ اپریل ۱۹۸۲ء بروز ہفتہ، صبح دس بجکر ۵ منٹ پر تیسری بار جڑواں بچے عطا فرمائے۔ لڑکے کا نام کاشف محمد اور لڑکی کا عروسہ تحسین رکھا گیا۔ اللہ پاک انہیں عمر طویل بخشے۔

● نگار سلطانہ انصاری (جہانگیر) میری چھوٹی بہن طلعت کو (پورا نام پڑھا نہ جا سکا) اللہ پاک نے پہلی بار ۲ مئی ۱۹۸۲ء کی شام کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ عمر طویل پائے اور بلند اقبال ہو۔

● نغمہ اسلم عارفہ حسنین، فاکہہ ابرار، ہلال فاطمہ، ریحان شارمین ابرار (بھاگلپور) میرے ماموں مظہر اختر شکیل کو اللہ پاک نے ۱۱ مئی ۱۹۸۲ء بروز منگل بوقت ۹ بجے دن ایک فرزند عطا فرمایا۔

پیغامات نشاط

● عزیزی ایم حسین سرکھوت سلمہ (پسر جناب غلام محی الدین سرکھوت مرحوم) کے چھوٹے بھائی شفیق احمد سرکھوت سلمہ کی شادی عزیزی مہر النسا سلمہا کے ساتھ ۹ مئی ۱۹۸۲ء بروز اتوار بمقام جوہانسبرگ، جنوبی افریقہ، بحسن و خوبی انجام پایا۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک عزیزی شفیق احمد اور مہر النسا سلمہا کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔ (نسیمہ ...)

● سید واجد حسین اے سید صاحب اور بیگم ... (...) کی دوسری صاحبزادی نصرت سلطانہ ... عزیزہ ... سلمہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس (فرزند جناب سید شمس الدین) کے ہمراہ

[illegible] کو بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔
(نسیم انہونوی)

• ۔ مارچ ۸۲ء کے شمارہ میں اس خبر کی اشاعت میں کچھ غلطی ہو گئی تھی۔ تصحیح شائع کی جا رہی ہے۔ فضیلت جہار رحانی (بجاگلپور ۔ بہار) میرے ماموں زاد بھائی محمد احتشام اختر عظیم سائنٹسٹ (پسر جناب ڈاکٹر چودھری محمد عظیم اللہ صاحب ۔ بجاگلپور ۔ بہار) کا عقد نکاح ہمراہ فلک جبیں پروین بنت سید منظور الحق صاحب، مزرنگ دوار ۔ [illegible] سمستی پور بخیر و خوبی انجام پذیر ہوا۔

منگنی کی خبر شائع نہیں کی جاتی صرف شادی کی ہی چھپ سکتی ہے۔

• نشاط سلیم (دربھنگہ) میری بہن یاسمین اختر (دختر عبدالحفیظ شرصدیقی صاحب مرحوم) کی شادی ابرار الیقین (فرزند جناب اظہار الیقین نجاتی مرحوم) کے ساتھ ۴ اپریل ۸۲ء بروز اتوار بمقام دربھنگہ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• نیاز احمد پاشا (منڈیا) طلعت شاہجہاں اور آفتاب احمد کی بہن یاسمین جہاں عرف سائرہ بانو دختر محمد بشیر عرف ماجان [illegible] صاحب روز مسلم بلاک، منڈیا ۔ میسور کی شادی ریاض احمد خاں (فرزند ستار خاں صاحب مرحوم) کے ساتھ ۲ مئی ۸۲ء کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• علی خلیل (آمبور) میرے چچازاد دیور اکبر پاشا و بی ٹاک فرزند چیا انور پاشا ۔ آمبور) کی شادی رضیہ سلطانہ (بنت الحاج محمد بشیر احمد ۔ بنگلور) کے ساتھ ۱۴ مارچ ۸۲ء بروز اتوار بمقام بنگلور بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• خسرو تاج نازلی (پرتاپ گڑھ) میرے ماموں زاد حبیب اللہ خاں عرف انجم خاں کی شادی میری ماموں زاد آنسہ نازجبیں بنت جناب حبیب الحفیظ خاں مرحوم) کے ساتھ ۹ مئی ۸۲ء بروز [illegible] بمقام بنگلور بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• [illegible] نسیم جہانگیر (الٰہ آباد) میری چچازاد بہن ہمایوں کی شادی [illegible] کے ہمراہ [illegible] ۸۲ء کو بمقام [illegible] بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• میرے کرمفرما اور اردو کے مشہور ادیب و محقق جناب جناب عبدالقوی دسنوی کی صاحبزادی عائشہ دسنوی سلمہا کی شادی محمد نعمان صاحب (فرزند حکیم مولانا محمد سلیمان صاحب ۔ بھوپال) کا عقد نکاح یکم جون ۸۲ء کو مابین عصر و مغرب موتی مسجد بھوپال میں ہوا۔ اللہ مبارک کرے اور عائشہ سلمہا و نعمان سلمہ ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔ (نسیم انہونوی)

• جلیل احمد شاہ (موتی لال بوس روڈ ۔ لکھنؤ) کی صاحبزادیاں رخسانہ پروین اور رشادہ پروین سلمہ اللہ تعالیٰ کی شادیاں ہمراہ محمد ندیم سلمہ (خلف غلام حسین صاحب ایڈوکیٹ ۔ لکھنؤ) اور محمد مغیث سلمہ (فرزند جناب محمد حنیف صاحب ایڈوکیٹ ۔ ٹونڈلہ) ۲۲ مئی ۸۲ء بالترتیب عمل میں آئیں۔ اللہ مبارک کرے۔ نسیم انہونوی

• فیروز سلطان سرجکر (اندھیری ۔ بمبئی) میری بہن عابدہ عباس قاضی کی شادی میرے پھوپھی زاد بھائی محمد علی بابا میاں قاضی کے ساتھ ۱۱ مئی ۸۲ء منگل بمقام نور باغ بمبئی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• اقبال احمد حکیم سلمہ (ابن نذیر احمد حکیم) کی شادی شہلا نرگس سلمہا (بنت نذیر احمد انصاری) سے منصور احمد حکیم سلمہ (ابن نذیر احمد حکیم) کی شادی غزالہ پروین سلمہا، ایڈوکیٹ (بنت شیخ محمد حسین صاحب ریٹائرڈ جج) سے ۱۶ مئی ۸۲ء کو، اور رخشندہ حکیم سلمہا ...... (بنت نذیر احمد حکیم) کی شادی کامران احمد صدیقی سلمہ (ابن ڈاکٹر سلیم احمد صدیقی مرحوم) سے ۱۷ مئی ۸۲ء کو بمقام مالیگاؤں عمل میں آئی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• اظہر علی عمرانی صاحب مالک کتابی دنیا لکھنؤ کے فرزند محمد خالد سلمہ کی شادی شبیحہ سلمہا کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اس سلسلہ میں اظہر صاحب نے ۱۶ مئی ۸۲ء کو ریلوے انسٹیٹیوٹ لکھنؤ میں اپنے اعزہ، اقربا اور معززین کو شاندار دعوت ولیمہ دی۔ اللہ مبارک کرے۔
(نسیم انہونوی)

• اہلیہ محترمہ الحاج منیر احمد صاحب مرحوم کی پوتی [illegible] سلمہا دختر بشیر سلمہ کا عقد مسعود احمد سیف اللہ سلمہ (فرزند الحاج محمد سید عبداللہ صاحب) سے ۲۳ مئی ۸۲ء بروز اتوار بمقام [illegible] علاقہ [illegible] آباد بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• سید فخرالدین حسینی قادری (مالک اشفود نفس بک ہاؤس) کے فرزند سید محی الدین حسینی عرف یحییٰ پاشا سلمہ کا عقد مسعود محمد یوسف قریشی صاحب میڈیکل آفیسر وجے واڑہ کی دختر نیک اختر سے ۵ راپریل ۱۹۸۳ء کی شام کو شاہ علی بنڈہ روڈ حیدرآباد میں بخیر و خوبی انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (شمیم انہونوی)

• مسز فاطمہ خانم صاحبہ (زوجہ مولانا حکیم فضل الرحمٰن صدیقی مرحوم) کے فرزند شفیق الرحمٰن صدیقی سلمہ کی شادی فریدہ خانم سلمہا (دختر جناب [illegible] خاں مرحوم) سے ۸ رمئی ۱۹۸۳ء کو سجد [illegible] علی محمد [illegible] والا روڈ بمبئی میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

سہرا

بتقریب شادی خانہ آبادی
سید محمد فہیم انہونوی سلمہٗ

مہ جبینوں کے اشارے ہوگئے سہرے کے پھول
چاند سے رُخ پر ستارے ہوگئے سہرے کے پھول

حسن و الفت کے سہارے ہوگئے سہرے کے پھول
اور دلکش اور پیارے ہوگئے سہرے کے پھول

دم بخود ہے حسن نوشہ کی تجلی دیکھ کر
حسن کہتا ہے ہمارے ہوگئے سہرے کے پھول

آرسی مصحف میں نوشہ پر پڑا عکسِ عروس
اور پیارے اور پیارے ہوگئے سہرے کے پھول

مصحفِ رُخ کی تجلی دیکھ کر نوشاہ کی
نور سے معمور سارے ہوگئے سہرے کے پھول

چاند سے رخسار نوشہ کی جو قربت مل گئی
ہو کے نازاں ماہ پارے ہوگئے سہرے کے پھول

ماہ کی صورت حجاب گل میں چھپ گئے فہیم
[illegible] ہوگئے سہرے کے پھول

[illegible] عشرت جی
[illegible] کے نظارے ہوگئے سہرے کے پھول

[illegible]

آج وہ دن ہے کہ مہک اٹھا ہے گلزارِ نسیم
نورِ محبت کے نظارے ہوگئے سہرے کے پھول

کس ادا سے ہنس کے کہتے ہیں عزیز الرحمٰن نسیم
کچھ ہمارے کچھ تمہارے ہوگئے سہرے کے پھول

روحِ سرور آرا جنت میں ہے مصروفِ دعا
حسرتیں ان کی اشارے ہوگئے سہرے کے پھول

گل محبت کی دعاؤں کے لٹاتے ہیں شمیم
عرشِ الفت کے ستارے ہوگئے سہرے کے پھول

مسکراکر کہتی ہیں ناہید اور نجم السحر
چاند سے نوشاہ ہمارے ہوگئے سہرے کے پھول

دیکھ کر آسی کا شوقِ دید ماہ و نجمان کا
روئے پر روشن کے کنارے ہوگئے سہرے کے پھول

ساجدہ، مسرور، قاسم بھائی دل سے نثار ہیں
سب کی الفت کے نظارے ہوگئے سہرے کے پھول

حق یہ ہے منصور کی الفت بھی ہے ذکرِ جمیل
اس محبت کے نظارے ہوگئے سہرے کے پھول

مسکراتے ہیں نسیم اور شاد و خرم ہیں ندیم
ان سبھوں کو دل سے پیارے ہوگئے سہرے کے پھول

دعوتِ نظارہ ہے چشمِ تماشا کے لئے
حسنِ فطرت کے نظارے ہوگئے سہرے کے پھول

آج تو رنگینیِ اشعار کوکب دیکھ کر
کیف میں رنگین سارے ہوگئے سہرے کے پھول

نتیجۂ فکر سرکار عالم کوکب ابن خدا آل لکھنوی
۲ رمئی ۱۹۸۳ء

انتقال پر ملال کی خبریں

• لکھنؤ کے مشہور تاجر عطریات مولانا عبدالجبار مرحوم کے فرزند [illegible]

نماز جنازہ لکھنؤ میں مولانا سید ابوالحسن ندوی صاحب نے پڑھائی۔

(نسیم انہولوی)

• افسوس کہ دیوگاؤں، فیض آباد کے ہر دل عزیز راجہ یاور حسین صاحب کرمانی ۲۳ اپریل ۸۳ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم کی ساری زندگی، دینی اور سماجی کاموں میں گذری۔ مرحوم ہمارے ماہنامہ کے قدیم خریدار تھے اور اسے بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔ (نسیم انہولوی)

• دیپالا طاہرہ ترنم، تصیرہ تبسم (آمبور) افسوس میرے خالو نثار احمد ۱۸ مارچ ۸۳ء بروز پیر اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو اپنے دیار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر دی جا رہی ہے کہ مرحوم جناب راجہ صاحب سلیم پور کی بڑی صاحبزادی جو بڑی بٹیا صاحبہ کے نام موسوم تھیں نے بتاریخ ۹ مئی ۸۳ء یوم یکشنبہ بوقت ۳ بجے دن بمقام سلیم پور ہاؤس قیصر باغ لکھنؤ انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ بڑی دیندار، پابند صوم و صلوٰۃ، مخیر اور حریم نواز بہن تھیں۔ خدا مغفرت فرمائے۔ تمام حریمی بہنوں سے گذارش ہے کہ ایک سورۂ فاتحہ سے مرحومہ کی روح پر فتوح کو ایصال ثواب فرمائیں۔

(نسیم انہولوی)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ہر ماہ صرف ایک ایسا شعر شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ موزوں اور معیاری ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح روانہ کیا گیا ہو کہ ۲۰ تاریخ سے پہلے دفتر پہنچ جائے۔

رفتار زمانہ کو ذرا دیکھ رہا ہوں
خود میں نے حیات اپنے قدم روک لئے ہیں

مرسلہ: تبسم سلطانہ (چھپرہ)

ایک حلقے پر اگر قائم تری رفتار ہے
میری گردش بھی مثالِ گردش پرکار ہے

مرسلہ: احمدی عظمت (آمبور)

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

مرسلہ: بی عظمت فاروق (آمبور)

وقت نے چھین لیا ساق بلوریں سے گداز
اب میں وہ شوخیٔ رفتار کہاں سے لاؤں

مرسلہ: عصمت آرا (یا نکا)

• ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

مرسلہ: مسز عالیہ خلیل (بڑودہ۔ گجرات)

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار ہیں ہم
بیخودی کچھ تو بتا کس کے طلبگار ہیں ہم

مرسلہ: راحت (کرنول)

آشکار گو ناؤں ہے تیرے زود و لیوار سے
جنبش ہے مگر پیدا میری رفتار سے

مرسلہ: شیریں سحر (سدا ئے دھیدہ)

تمھارے دو بچے ابھی نہیں ہونے تھے" غضنفر نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اس نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑائے اور اور ناک چڑھا کر بولی ۔

"واہ کیوں نہیں ہونے تھے"

"تم ابھی خود بچی ہو ۔ بھلا انیس سال بھی کوئی عمر ہوئی ۔ امی اسی طرح سب کو جلدی جلدی پیک کر دیں گی" یہ کہہ کر وہ بدحواس ہوئے ۔ خواہ مخواہ بات شادی کی ڈگر پر چل نکلی ہے ۔ اب امی یا نزاکت گھٹنے تلے دب کے تقریر شروع کر دیں گی ۔ مگر ایسا نہیں ہوا ۔ وہ گیلی دیکھ سے چونے کے کی کٹیاں صاف کرنے میں اتنی غرق تھیں کہ انھوں نے صاحبزادے کی بات نہ سنی ۔

"مجھے شاپنگ کرنی ہے" نوشینہ بولی "چلیے نا ۔ ایک گھنٹے میں واپس آ جائیں گے ۔ وہ تین والیں لینی ہیں اور کیا نام وہ کنجیوں کا چاندی کا چھلا معلوم ہوتا ہے کہ حمید بھائی کی جیب سے مار مار کے خوب کالا دھن اکٹھا کر لیا ہے" غضنفر نے کہا " ورنہ تمھارے پاس بھلا تارون کا خزانہ کہاں سے آیا ۔ جیسے قفل کنجی میں بند کرنا ہے"

"واہ میں کیوں چوری کرنے لگی" نوشینہ بگڑ گئی " وہ مجھے خود ہر ماہ الگ سے پیسے دیتے ہیں ۔"

"یعنی تمھاری ہاتھ کی صفائی کے علاوہ ۔ اب میں حمید بھائی کو خبردار کر دوں گا"

"آپ کو چلنا ہے میرے ساتھ کہ نہیں؟"

"چلو بھائی" وہ کھڑے ہو گئے ۔ (باقی آئندہ)

چبھن

○

عفت موہانی

قیمت مجلد

ناشر
نسیم بک ڈپو - ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ
ٹیلیفون:- ۲۲۵۰۹ - ۴۵۳۳۲

نسیم انہونوی نے .... پریس میں چھپوا کر نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کیا

چھن

کیوں نہ کریں ؟ بے حد بزرگانہ انداز میں نوشی نے اپنی تائید کی ، پھر لڑکی کو فکر رہتی ہے کہ اس کا ہونے والا میاں کیسا ہے ؟

ارے کلموہی ۔ ایسا لہجہ مت اختیار کرو ۔ غضنفر نے ہنستے ہوئے کہا ۔ اور آئندہ تم حضور بن ہوا اور نانی نوشی کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں مت سنا کرو ۔ ویسا ہی بولنے لگی ہو لیکن میں نے سنا ہے کہ تمہارا ہونے والا میاں کالا کالا ہے اور اس کی ایک آنکھ بھی بند ہے ۔

وہ ہنستی ہوئی بھاگ گئی ۔ غضنفر نے اٹھ کر کپڑے بدلے ۔ اور بالوں پر برش پھیرا ۔ پھر باہر نکلے ۔ عجیب طرح طبیعت اچاٹ تھی حالانکہ ان کی چھوٹی بہن نوشینہ اپنے دونوں بچوں یاسر اور ناصر کے ساتھ ان دنوں ان کے یہاں آئی ہوئی تھی ۔ گھنٹوں غضنفر دونوں بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے ۔ یاسر پیاری پیاری باتیں کرنے لگا تھا اور اس مہینے کا ناصر تو بالکل کاغذ کا گڈا لگتا تھا ۔ سرخ و سفید شیشے کی طرح جھلکتا ہوا ۔ اس وقت بھی دالان ان کی قلقاریوں سے گونج رہا تھا ۔ نوشینہ اپنی مترنم آواز میں لوری دے رہی تھی ! ۔ لیکن غضنفر کو ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ آوازیں ، یہ اجسام ، یہ شور و غل سب کچھ کہیں پس منظر میں ہو رہا ہے ۔ ان کے سامنے بیمار کی ایک چارپائی تھی ۔ چھوٹے سے کمرے کی محدود فضا ۔ اور کہیں سے ابھرتی ہوئی دبی دبی سسکیاں ۔ اور وہ سناٹا ہولا ۔ جیسے چکدار دھوئیں کا کوئی پیکر جو بار بار ابھرے بار بار تحلیل ہو جائے ۔

بیٹھے بھیا ۔ اب کون سے آسمان پر پہنچ گئے ؟ نوشینہ نے ان کے بال بکھرا کے اور کھلکھلا کے ہنس دی ۔

چینی کے پیارے سے گڈے
انصار احمد عامر
کے نام
عفت موہانی

١٧

چینی

[illegible] کی زبان میں اگر بریکس یا سائیلنسر لگا دیا ہوتا تو میں ان کی تخلیق
[illegible] مان جاتا! محیار یہ معاملہ کیا ہے۔ قاعدے سے انھیں
پہلے تمہاری فکر کرنی چاہیے تھی۔ اللہ رکھے گیارہ برس کی ہو چکی ہو۔"
"چلیے چلیے۔ بالکل حضور ان بوا کے لہجہ میں بولتے ہیں آپ۔ ابھی
تو ہم [illegible] ہیں" وہ ٹھنکی۔
"میں بھی تو چھوٹا ہوں۔ فقط چوبیس سال کا بچہ"
"تو کیا۔ گھر بھر میں سب سے بڑے تو ہیں آپ!"
"اچھا سنو۔"
"ہوں۔ ہوں۔"
"وہ تمہاری [illegible] مطلب یہ کہ۔ بھائی کالی کلوٹی تو نہیں ہیں۔
[illegible] ایک دن کہہ رہی تھیں کہ ناک بالکل بیٹھی ہوئی ہے
[illegible] جانے ان کی ناک؟" [illegible] بگڑ گئی "اتنی اونچی کھڑی
کھڑی ناک ہے اور آپ سے زیادہ گوری ہیں وہ۔ کبھی کبھی تو آپ
بالکل [illegible] لگتے ہیں۔ جب گھنٹوں منہ نہیں دھوتے!"
یار، حلوے کی رشوت [illegible] معلوم ہوتی ہے"
"اچھا اچھا۔ یہ چاہیے۔ اب جو وہ مجھ سے پوچھیں گی کہ تمہارے
[illegible] دن بھر کیا کرتے ہیں تو میں کہہ دوں گی کہ آپ کی غیبت کیا کرتے
[illegible] آپ سے [illegible] لیں گی" [illegible] آنکھیں نکال کر دھمکی دی۔
[illegible] کہا "تو کیا وہ تمہارے
[illegible] کیا کہتے ہیں [illegible]"

"اے لیجئے۔ ارے وہ تو اب ساری عمر کے لیے آپ کے پیچھے پڑنے والی ہیں امی نے شاید آج ان سے کہا بھی تھا کہ بس آپ کا یہ ایم ایس سی کا آخری سال ہے۔ امتحان کے بعد وہ آپ کے سر سہرا لپیٹ دیں گی"

"ہنہ!"

نوبی نے ڈھارس بندھائی "آپ کو ان موٹی خالہ سے کیا لینا دینا ہے میں نے دیکھ رکھا ہے۔ تسیما باجی ایسی نہیں ہیں وہ بہت اچھی ہیں۔ دبلی پتلی گوری گوری نازک۔ میں اس دن امی کے ساتھ گئی تھی نا۔ انھوں نے اپنے کمرے میں بلا کے مجھے گاجر کا حلوہ کھلایا تھا۔ اس میں خوب سا ناریل کھویا اور بادام"

"پھر باتیں کرتے کرتے تم دوسرے چورا ہے پر نکل گئیں" غضنفر نے شکایت کی۔

نبیلہ ہنس پڑی "مطلب یہ کہ حلوؤں کے مزے رہیں گے۔ اگر وہ میری بھابی بن کر آگئیں"

"اچھا اگر میں خدا کے فضل و کرم سے امتحان میں فیل ہو جاؤں تو پھر" غضنفر نے پوچھا۔

نبیلہ کی ہنسی تیز ہو گئی "تب تو آپ کو بیکار سمجھ کر اور بھی جلدی ہر آج کر دیا جائے گا"

غضنفر کو ہنسی آگئی "یہ بھی ٹھیک ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کہ شاید خلا میں اڑتا ہوا جہاز تھم جائے۔ پٹریوں پر دوڑتی ہوئی ریل رک جائے مگر امی کی زبان ان چیزوں سے زیادہ زور دار ہے۔ وہ نہیں رک سکتی ہیں"

آوارہ گردی فرما کر آئے۔ پکا پکایا نوش فرمایا اور لمبی تان لی۔ اماں باوا نے اگر کچھ پوچھ لیا تو انھیں کوئی جھانسہ دے کر چپ کرا دیا:

"دوست کے پاس تھا، پڑھ رہا تھا۔ کتابیں آج اسی کے پاس رکھ دیں۔" امی کے لیکچر کے جواب میں غضنفر نے کہا۔ اور لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے اپنے کمرے میں آئے۔ دماغ تپ رہا تھا۔ اور سارے جسم سے بھاپ اٹھ رہی تھی! لباس تبدیل کیے بغیر کرسی پر گرے اور سر تھام لیا۔

دالان سے ابھی تک آواز آ رہی تھی۔ رہ رہ کے ٹیپ کے بند کی طرح ابا جان کچھ سمنا اٹھتے۔ شنوائی ان کی بھی کب تھی۔

پھر آہستہ سے دروازہ کھلا اور چھوٹی بہن دکھائی دی۔ اندر آنے کے بعد اس نے پردہ پھیلا دیا۔ گھر بھر میں صرف یہی ایک ان کی دل داز دار و دمساز تھی!

بڑے بھیا۔ چائے نہیں پی آپ نے:

"پی کے آ رہا ہوں۔ یہ امی کو کیا ہوا ہے:"

کون سی نئی بات ہے۔ آج تو ان کو اس لیے بھی غصہ ہے کہ دوپہر کو خالہ جان آئی تھیں۔ دونوں میں نجانے کیا کھسر پھسر ہوا کی۔ پھر خالہ جان نے آپ کو پوچھا۔ امی نے جواب دیا کہ بس آ ہی رہے ہوں گے۔ خالہ جان آپ سے ملنے کی بہت مشتاق تھیں۔ دیر تک آپ کا انتظار کرتی رہیں۔ مگر آپ کس طرح آتے ابھی تک۔ بس امی کا پارہ چڑھ گیا:"

کوئی تو پھر بتاؤ کہ ان منحوس خالہ جان سے میرا پیچھا چھوٹے: غضنفر نے بھاسا منہ بنا کر کہا۔ جواب بہن نے مسکرا کر نہیں دیا۔

گھر بھر میں ابھی تک کانوں کان کسی کو خبر نہیں تھی کہ صاحبزادے نے کیا گل کھلایا تھا؟ وہ حسب معمول روزانہ اپنے وقت پر کالج جاتے تھے۔ واپسی پر تھوڑی دیر اپنے باپ کی اس دکان پر بیٹھتے جسے اس علاقہ کا سب سے بڑا اور شاندار جنرل اسٹور ہونے کا فخر حاصل تھا۔ جس میں سوئی سے لے کر شہتیر تک سب چیزیں مل جاتی تھیں۔ لیکن کچھ دنوں سے انھوں نے دکان پر حاضری اور اس سے دلچسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ ابا جان کے پوچھنے پر امتحان کا بہانہ کر دیا تھا۔ ابا جان جو اپنے ذہن اور جسم کی تمام تر صلاحیتوں اور طاقتوں کے ساتھ دولت کی افزودگی میں لگے تھے۔ یہ نہیں سوچ سکے کہ عین موسم سرما میں کوئی سے اہم امتحان نہیں ہوتے!

وحشت اگر تھی تو امی سے تھی۔ وہ ابا جان کے برعکس تھیں غصہ ناک پر دھرا رہتا۔ آنکھوں سے سرخی چھلکتی اور بات بات پر لبوں سے زہر ٹپکتا۔ ان کا ناقابل برداشت سلوک صرف ابا جان برداشت کرتے تھے اور آہستہ آہستہ تمام عزیزوں نے کنارہ کر لیا تھا۔ گھر والے ڈرتے رہتے تھے۔ محلے والے گریزاں تھے! وہ سب کے برتاؤ کو محسوس کرتی تھیں لیکن اپنا سلوک انھوں نے نہیں بدلا۔ مزاج کی تلخی اور لب و لہجہ کی تندی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ اگر چاہتی بھی تھیں تو مجبور تھیں!

اور یہ بالکل خلاف توقع رونما ہونے والا حادثہ۔ جس نے بجائے

غضنفر کے جسم کا سارا خون سکھا ڈالا تھا۔ اگر اس کی خفیف سی بھنک
بھی اماں کو مل جاتی تو پھر۔۔؟

تھوڑے ہی عرصہ کی تو بات تھی۔

وہ یونیورسٹی سے واپسی پر ہمیشہ کی طرح اس صاف ستھرے کیفے میں
میں چائے پینے آ بیٹھے تھے۔ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ ان کا معمول تھا اس
روز چائے پینے اور اپنا پسندیدہ گیت سننے کے بعد وہ اٹھنے ہی والے تھے
کہ ایک چھوٹا سا لڑکا ان کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور ان کے استفہامیہ انداز
میں دیکھنے پر بولا۔

"آپ کا نام غضنفر ہے؟"

ہاں کیوں۔ کیا بات ہے؟"

آپ کو سامنے والے گھر میں بلا رہے ہیں" لڑکے نے بتایا۔

کون بلا رہا ہے؟"

میں انھیں بڑی باجی کہتا ہوں۔ اہ

کیا؟" غضنفر کا ماتھا ٹھنکا۔

"ان کے ابا بہت بیمار ہیں۔ دو دن سے ڈاکٹر صاحب بھی نہیں آئے۔
اس لیے انھوں نے مجھے بھیجا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے آپ میرے ساتھ چلیے"۔
غضنفر نے اس پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ مگر لڑکا تو بس ایک ہی رٹ
لگائے گیا۔

"ان کے ابا بہت بیمار ہیں۔ انھوں نے آپ کو بلایا ہے"
[illegible] غضنفر نے سوچا تھا۔ پتہ نہیں کون بیمار ہے۔ اسے

ان سے رخصت ہو کر وہ باہر نکلے۔ اور کیفے سے چند ہی کیک
خریدے۔ بوائے کو چائے بھجوانے کی ہدایت کی اور پھر گھر کا
رخ کیا۔ جوں جوں گھر قریب آ رہا تھا ان کا دم سا لبوں پر
آ رہا تھا۔ روز کی سی ابا اور امی کی جنگ زوروں پر ہو گی۔ چھوٹے بھائی
بہنوں کی شامت۔ ان کی اپنی عافیت کی بربادی۔ اعصاب تو
دماغ میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ پتہ نہیں۔ یہ ساعت بیمار اور
بے بس لڑکیوں پر کیا قیامت بن کر گزرے گی۔

صحن میں قدم رکھا ایک کراہ کی آواز سنائی دی۔

"آ گئے ولی عہد بہادر۔ میں کہتی ہوں۔ کیا آج پھر بجلی گرے
سینما میں منہ دیا تھا۔ کتابیں کہاں ہیں؟"

کتابیں۔ یا خدا۔ انھیں یاد آیا۔ کتابیں کیفے ہی میں رہ
گئی تھیں۔

کیا میں سینما کے علاوہ اور کہیں جاتا ہی نہیں" غضنفر شدید
جھلاہٹ میں مبتلا ہو گئے۔ دوگونہ عذاب۔ ضروری ہی کیا تھا
کہ تقدیر کسی اندھے سیدھے معاملہ میں انھیں کو تاک لیتی۔

سینما کے علاوہ کہاں جاتے ہو۔ آج مجھے بتاؤ" امی کا [illegible]
جرح پر اتر آئی تھیں" میں سچ کہتی ہوں کہ تمہارے ابا سے
کہہ کر یہیں اگلی پڑھائی بند کرا دوں گی۔ ہم نہیں سہہ سکتے [illegible]
روش دوسرے بچے بھی اختیار کر لیں۔ کوڑی کا ہے کے نہیں [illegible]
بادامر چھوڑ کے کماتے ہیں۔ [illegible]

کہتی رہتی تھی چپکے سے بولی۔
"آپ کا بہت بہت شکریہ غضنفر صاحب۔ بڑی تکلیف دی
[illegible]
نہیں۔ کچھ کہا نہیں آرہا تھا۔ اس لیے:
"مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے کام آسکا" غضنفر نے جواب دیا۔
"انسان پر انسان کا حق ہے۔ آپ اس طرح مت سوچئے کہ مجھے
زحمت ہوئی ہے۔!"
"شاید ابا سو گئے ہیں" اس نے کہا۔
"ڈاکٹر صاحب نے آپ سے کیا کہا؟ غضنفر بھائی؟" ڈولی نے
پوچھا۔
"ڈاکٹر کو بتاتے کہاں ہیں بہن؟" انھوں نے کہا اور دل ہی
دل میں گھبرا گئے۔ بڑی دیر ہو چکی ہے۔ نجانے امی کے طیش کا پارہ
کون سے آسمان پر ہوگا۔ گوارہ نہیں کرتیں کہ لڑکے غیر ضروری سیر
سپاٹے کرتے پھریں۔
"ہم ... میں۔ انشاء اللہ صبح کو پھر آؤں گا" وہ گھبرا کر بولے۔
"جائیے تو جائیے" ڈولی نے کہا۔
"پھر بھی اس وقت مجھے اجازت دیجئے"
"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ غضنفر صاحب!" ڈولی بولی۔
"صاحب؟ یہ کیا۔ ابھی تو بھائی کہہ رہی تھیں!" وہ مسکرا دیا۔
ڈولی بے ساختہ ہنس دی۔

"سچ سچ طبی امداد کی فوری ضرورت تو نہیں ہے۔؟"
اپنی کتابیں انھوں نے ایک شناسا دکاندار کے پاس رکھوائیں اور لڑکے کے ساتھ
آگے بڑھ گئے۔
ایک متوسط مکان تھا صاف ستھرا۔ صحن میں خوشنما چھوٹا سا باغیچہ تھا۔
ایک طرف کثرت سے زرد، خاک اور سفید گلاب کھلے تھے۔
"ادھر۔ اس طرف" لڑکے نے کہا۔
ہزار طرح کے اندیشوں کے ساتھ غضنفر نے کمرے میں قدم رکھے۔ لڑکے نے
غلط نہیں کہا تھا۔ دیوار سے لگا ایک پلنگ بچھا تھا۔ اس پر جو مریض
لیٹا تھا وہ سچ مچ لمحوں کا مہمان لگ رہا تھا!
پلنگ کے پائینتی ایک چوکی پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ایک سسک
سسک کے رو رہی تھی۔ دوسری چپ چاپ مریض کو دیکھے جا رہی تھی۔
غضنفر کو دیکھ کر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دبلی پتلی چھریرے سی تھی
رنگت، جامہ زیب۔!
غضنفر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کہنا چاہیے۔ لڑکیاں واقعی ان
کی مدد کی طالب تھیں۔
پھر انھوں نے جلدی سے کہا: "یہ تو۔ مجھے بے ہوش معلوم ہوتے ہیں"
"جی ہاں" پہلی دفعہ لڑکی نے کہا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی: "صبح سے
یہ حالت ہے۔ ایک بار بھی ہوش نہیں آیا"
"کیا ہوا ہے۔ یہ کیا بیمار ہیں"
"ہسپتال میں گردوں کا آپریشن ہوا تھا۔ کامیاب نہیں ہوا۔ بڑے

ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر ڈسچارج کر دیا کہ اب انھیں گھر پر اپنوں کے درمیان رکھیے۔ ہم نے محلے کے ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تھا۔ وہ دو تین دفعہ آئے۔ اور دوائیں دیں۔ مگر۔!"

"مگر؟!۔"

"پتہ نہیں کل اور آج کیوں نہیں آئے۔!" لڑکی نے آنسوؤں میں گھلی ملی آواز میں بتایا: "دو تین مرتبہ ڈولی گئی بھی تھی۔! ابا کے سوا ہمارا کوئی نہیں ہے۔! ہم لوگ اکیلے ہیں۔" ڈولی نے کہا کہ۔ "وہ روز آپ کو کیفے میں دیکھتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے اسے کوئی کتاب بھی دی تھی۔ آپ کو اگر تکلیف دی جائے تو۔"

"ہاں ہاں ضرور۔ اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ میں ڈاکٹر کو لے کر ابھی آتا ہوں۔"

انھوں نے ڈولی پر ایک نظر ڈالی۔ وہ سچ مچ کوئی جانی پہچانی سی لگتی تھی۔!

اور پھر ڈاکٹر کے لانے اور دوائیں پہونچانے میں انھیں خاصی دیر لگ گئی۔ ڈاکٹر نے ان سے کہہ دیا تھا کہ "بس! اب بات ہی کے کسی لمحے میں بڑے میاں ختم ہو سکتے ہیں!"

پھر وہ بچانے بیمار کے خیال سے یا تیمارداروں سے متاثر ہو کر دیر تک وہاں بیٹھے رہے!۔

لڑکیوں کو کچھ ڈھارس بندھی۔! بڑے میاں اب بھی بیہوش تھے۔ ڈولی نے انھیں اپنے مختصر سے حالات سنائے تھے۔ نسل اور ذات

پات کے فرق نے انھیں تمام خاندانوں سے جدا کر رکھا تھا۔! ابا گھر سے بےگھر تھے۔ انھوں نے اپنی پسند سے پٹھان لڑکی سے شادی کر لی تھی چنانچہ دادا جان نے انھیں عاق کر کے جائداد سے بےدخل کر دیا تھا۔ وہ انھیں بیوی اور دو کم عمر بچیوں سمیت سب سے الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے۔ دو سال پہلے ان کی امی داغ مفارقت دے گئی تھیں۔ اور اب۔ ان کے والد موت و حیات کشمکش میں گرفتار تھے۔

دادا جان اب اس دنیا میں نہیں تھے لیکن چچا اور پھوپھیوں کا بڑا بھاری کنبہ تھا۔ لیکن کوئی پرسان حال نہیں۔! ابا نے کہہ رکھا ہے کہ اپنی آن اور خودداری کسی حال میں ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہے جو کچھ ہو۔ غیروں سے بے شک کچھ۔ اسے رکھو مگر اپنوں سے نہیں۔

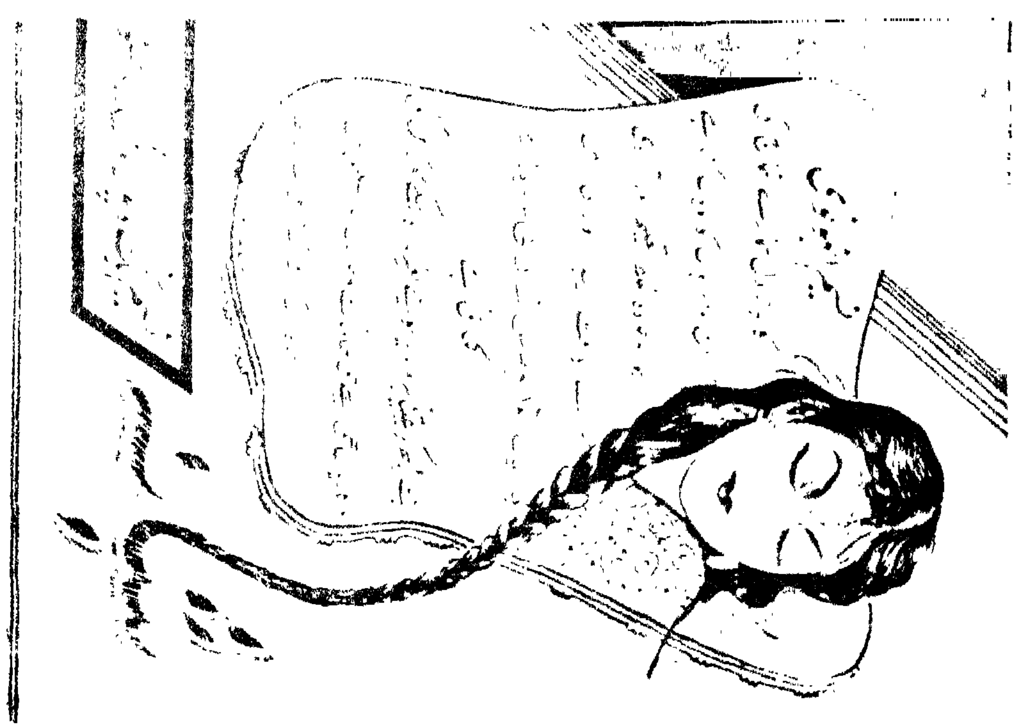
ڈولی بار بار ہچکیاں لیتی رہی تھی۔ رہ رہ کر آنسو اس کی آواز بند کر دیتے تھے۔ غضنفر کا دل ڈوبنے لگا۔ ان لڑکیوں کا کیا حشر ہوگا اگر بڑے میاں واقعی چل بسے؟!

ان بےچاریوں کو معلوم نہیں کہ ڈاکٹر نے جواب دے دیا تھا۔ وہ دونوں تو امید و بیم کی کیفیت سے گزر رہی تھیں۔ انھیں کیا بتایا جائے گا۔ ان کا سہارا ٹوٹنے والا تھا!

اس عرصہ میں ڈولی کی بڑی بہن خاموش رہی تھی!

شام ڈھلنے لگی تھی۔ اور گہرا کہرا صحن میں اتر آیا تھا۔ خنکی بڑھ رہی تھی۔!

غضنفر نے بےچینی سے پہلو بدلا۔ تب ڈولی کی بہن جیسے وہ جاگ



THE AREEM

July 82

Rs. 1|40

ایڈیٹر

گذشتہ ۵۲ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا

سب سے پرانا رسالہ

ماہنامہ حریم لکھنؤ

تمام حریمی بہنوں اور بھانجیوں
کی جانب سے

عید مبارک

(ادارہ حریم)

اڈیٹر و نگراں

نسیم انہونوی

معاونین

شوکت جہاں بیگم غزالہ

جانی بیگم ردولوی

قیمت فی پرچہ:- ایک روپیہ چالیس پیسے
قیمت سالانہ- منی آرڈر سے -/۲۲ روپیہ
قیمت مخصوص -/۲۵ روپیہ
قیمت اعزازی -/۲۷ روپیہ
وی پی سے منگوانے پر چار روپے پچاس پیسے زائد
غیر ممالک سے -/۴۵ روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی میل
ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

ناشر:- نسیم انہونوی

جلد (۵۲)	فہرست مضامین ماہ جولائی ۱۹۸۲ء	نمبر (۷)

آفس و ترسیل زر کا پتہ:- نسیم بک ڈپو- لاٹوش روڈ لکھنؤ- فون آفس:- ۴۳۵۵۹ - رہائش:- ۴۵۲۳۳
نسیم انہونوی نے ... پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

لمحات

حال ہی میں یہ خبر اخبارات میں نظر سے گذری کہ بمبئی کی مشہور [illegible] انجمن کے ارباب حل و عقد نے انجمن کے اسکولوں میں تعلیم پانے والی مسلم لڑکیوں کے لئے ساڑھی پہننے، فیشن کرنے، افزائش حسن کے طریقے معلوم کرنے، بالوں کو سنوارنے اور یوگا وغیرہ کے کورس شروع کئے ہیں۔ منتظمین کا خیال ہے کہ اس سے مسلم لڑکیوں کو ملازمت حاصل کرنے میں آسانی ہوگی۔

اول تو مسلم لڑکیوں کو ملازمت کی ترغیب دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ ملازمت تو لڑکیوں کو بدرجہ مجبوری ہی کرنا چاہیے اس لئے کہ قدرت نے اس کے لئے مردوں کو پیدا کیا ہے۔ عورت کے فرائض منصبی میں سب سے اہم گھرداری ہے اور پرورش و تربیت اطفال اور یہ کام معمولی نہیں۔ اگر پوری ذمہ داری کے ساتھ کیا جائے تو ایک خاتون خانہ کو صبح سے رات گئے تک مشکل ہی سے فرصت مل سکتی ہے۔ اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ عورت لونڈی نہیں کہ گھر بار سنبھالے اور چولہا پھونکتی رہے۔ مرد خود یہ کام کیوں نہیں کرتے۔ کیوں انھوں نے عورت ہی کو اس کے لئے موزوں سمجھا۔ کیا مرد کھانا نہیں پکا سکتے، کیا وہ سلائی نہیں کرسکتے کیا وہ گھر کی آرائش و زیبائش کی خدمت انجام نہیں دے سکتے۔

آخر درزی مرد ہی تو ہوتے ہیں جو کپڑے سیتے ہیں، باورچی مرد ہی تو ہوتے ہیں جو کھانا پکاتے ہیں۔ پھر وہی یہ ذمہ داریاں کیوں نہیں سنبھالتے۔ اس طرح کی بات سوچنے والی خواتین سے اول تو میں یہ کہوں گی کہ فطرت نے خصوصیت کے ساتھ گھرداری کا سلیقہ عورت ہی کو بخشا ہے۔ اگر آپ نے کسی ایسے مرد کا گھر دیکھا ہو جو تنہا ہو، میرا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی عورت نہ رہتی ہو تو آپ دیکھیں گی کہ اس گھر کی کوئی چیز سلیقے کے ساتھ رکھی نظر نہ آئے گی۔ بلکہ خواتین میں بھی ایسی [illegible] کم ہی [illegible] ملازمت کرنے والی ایسے گھر میں اتفاق ہے تو [illegible] ہے۔ [illegible] کو باقاعدہ [illegible] کے [illegible] جگہ دیتی ہے۔ دوسری چیزوں کو بھی سلیقے سے رکھ کر ایک ایسا حسن پیدا کر دیتی ہے کہ [illegible] رہ جاتا ہے۔ مجھے خود اعتراف ہے کہ دفتر آنے سے پہلے میں اپنی کتابیں، رسالے، اخبار، میک اپ کا سامان، شال، چادر اور لباس وغیرہ جس حالت میں چھوڑ کر آتی ہوں، واپس پر وہ سب چیزیں سلیقے کے ساتھ اپنی جگہ پر ہوتی ہیں، حالانکہ میری ہدایت رہتی ہے کہ میری چیزوں کو کوئی نہ چھوا کرے، لیکن [illegible] سے ان کی بے ترتیبی دیکھی نہیں جاتی۔ بہرحال اگر میں یہ مان لوں کہ مرد بھی یہ سب کام کرسکتے ہیں۔ اور [illegible] مشہور رہی ہے۔ کوئی بھی کام کرنے کو اس کی رفت بڑھاتی ہے لیکن اس تبدیلی سے عورت کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچے گا۔ گھر کے باہر کی دنیا میرے خیال سے زیادہ سخت اور محنت و مشقت طلب ہے، موازنہ کیا جائے تو گھریلو کام اتنے محنت طلب نہیں، جتنے باہر کے کام ہوتے ہیں جو مرد انجام دیتے ہیں، جنھیں قدرت نے ایسے ہی قوی بھی دیئے ہیں جو محنت طلب کاموں کے لئے موزوں ہیں۔ اور بفرض محال ایسا عملی تبادلہ بھی ہو جائے تو اس عمل میں کیسے تبدیلی ہو سکتی ہے جو افزائش نسل کے سلسلہ میں عورت سے متعلق ہے۔ بلاشبہ مرد بھی اس سلسلہ میں شریک ہے، لیکن اس کی شرکت وقتی اور ضمنی ہی کہی جا سکتی ہے۔ چند منٹوں کے تفریحی اشتراک کے بعد اس پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی لیکن عورت نو ماہ تک طرح طرح کی تکالیف جھیل کر بچے کو جنم دیتی ہے اور بچہ کی پرورش و پرداخت کے سلسلہ میں اپنا خواب و خور حرام کر لیتی ہے اپنا سکون چین اس پر قربان کر دیتی ہے۔ اگر غائر نظر سے عورت کے اس زمانہ کا مطالعہ کیا جائے جب وہ حاملہ ہوتی ہے، جب وہ بچے کو جنم دیتی ہے اور جب وہ اس کی ابتدائی پرورش و پرداخت کرتی ہے تو کیسی صبر آزما گھڑیاں گزارتی ہے۔ کیسے درد و کرب و تکلیف سے دوچار ہوتی ہے اور کتنے ایثار سے کام لیتی ہے [illegible] اس قابل بیان ہے کہ وہ کتنی [illegible] اور [illegible] ۔ حاصل بات یہ ہے کہ فطرت نے یہ ساری ذمہ داری عورت ہی کے سر رکھی

رکھو۔ شاید اس لئے کہ ضبط و صبر اور ایثار و قربانی کی طاقتیں اسی کو بخشی گئی ہیں جو گھریلو ذمہ داریاں ہے کہ عورت کو باہر کی دنیا میں بھیج سکتے ہیں لیکن ان فرائض کو مرد کیسے ادا کر سکیں گے جن کا تعلق پیدائش اطفال سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک رات بھی کوئی مرد اپنی نیند قربان کر کے بار بار بچے کے رونے پر اٹھ کر [illegible] پورا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح اگر عورت قانون فطرت کے مطابق بچوں کی پرورش و نگہداشت کرے تو اسے کافی عرصہ تک گھر ہی میں رہنا پڑے گا۔

اعتراض کرنے والیاں کہہ سکتی ہیں کہ اس وقت جو خواتین ملازمت کر رہی ہیں۔ وہ کیا کرتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ملازمت کرنے والی پچاس فیصدی خواتین تو شادی ہی نہیں کرتیں۔ پچیس فیصدی ایسی ہیں جن کے گھر میں ساس اور کوئی ایسی ہستی ہوتی ہے جو بچوں کو سنبھال لے۔ کچھ انھیں آیاؤں اور نوکروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آفس جاتی ہیں۔ اور یہ سب ہی صورتیں مناسب نہیں۔ خود ماں اپنے بچے کی جتنی اچھی طرح پرورش کر سکتی ہے۔ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ ایسے بچے عموماً ڈبوں کے دودھ پر پلتے ہیں، جن کے متعلق اب تو فیصلہ کن طریقے پر یہ کہا جاتا ہے کہ ڈبہ کا دودھ ماں کے دودھ کا بدل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ماں کا دودھ بچے کی شکم پروری کے لئے کافی ہو سکتا ہے تو ہرگز ڈبے کا دودھ بچے کو نہ دینا چاہیے۔ البتہ اگر ماں کا دودھ ناکافی ہو تو دوسرا کوئی دودھ دیا جا سکتا ہے۔

اسلام نے انھیں وجوہ سے عورت کو گھریلو دنیا کی حکمرانی تک ہی محدود رکھا تھا۔ یہ مثال دینا کہ غزوات میں عورتیں اسلامی مجاہدین کے ساتھ رہا کرتی تھیں اور ان کی خدمت کیا کرتی تھیں کوئی کلیہ نہیں۔ ایسی چند ہی مثالیں ملتی ہیں۔ عام طور پر مسلم خواتین نہ میدان جنگ میں جاتی تھیں اور نہ فوجیوں کی خدمت کرتی تھیں۔ اسلامی جنگوں کے علاوہ بھی جنگ و جدل کی تعلیم کسی دور میں بھی خواتین کو نہیں دی گئی۔ سرفروشی مردوں کا ہی کا حصہ رہی۔ جس کی شاہد تاریخ ہے۔ کسی بھی قوم کی فوجوں میں عورتیں مردوں کی طرح میدان جنگ میں نہیں گئیں اور آج بھی نہیں جاتیں۔ بڑے بڑے ترقی پسند ملکوں کی خواتین بھی جنگ و جدل میں عام فوجیوں کی طرح شریک نہیں ہوتیں، حالانکہ ان ملکوں میں عورت و مرد میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں شریک ہیں مگر میدان میں جنگ و جدل نہیں کرتیں۔ البتہ یہ کہ اس میں بیشتر عورتیں ہی ہوتی ہیں جو نرسوں کی طرح زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے ان کی [illegible] ہیں لیکن وہ میدان جنگ سے دور رہتی ہیں۔

اسلامی جنگوں میں خواتین کی شرکت کی جو مثالیں دی جاتی ہیں وہ بھی زیادہ تر اسی طرح کی تھیں۔ لیکن برائے نام اس لئے انھیں مستثنیات میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اسلام نے کبھی مرد و زن کا اختلاط پسند نہیں کیا۔ حد ہے کہ عبادت میں بھی انھیں علاحدہ رہ کر عبادت کی ہدایت دی اور اس کا ثواب زیادہ بتایا۔

اس حقیقت سے انکار ہٹ دھرمی کے مترادف ہی ہے کہ مرد و عورتیں آفسوں وغیرہ میں ساتھ ساتھ کام کریں اور ان کے اخلاق میں گراوٹ نہ پیدا ہو۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جو ازل سے قائم ہے اور ابد تک قائم رہے گا۔ اختلاط مرد و زن سے معاشرہ ویسا پاکیزہ اور صاف ستھرا نہیں رہ سکتا، جیسا اسلام چاہتا ہے۔ گناہ یہی نہیں ہے اسلامی نقطۂ نظر سے کہ عورت و مرد میں ناجائز جنسی تعلق پیدا ہو، بلکہ گناہ یہ بھی ہے کہ عورت نامحرموں کے سامنے بے پردہ ہی نہیں۔ مجسم فیشن بن کر بیٹھے اور ان سے بات چیت کرے، ہنسے بولے۔ اس لئے کہ یہی بنیاد ہو سکتی ہے بڑی تخریب کی۔

اسلام نے عورت کو فیشن کر کے گھومنے پھرنے کو بھی جائز قرار نہیں دیا۔ ہمارے اسلاف لڑکیوں کو شادی سے پہلے بالکل سادہ اور معمولی لباسوں میں رکھتے تھے، انھیں فیشن قسم کی کوئی بات کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ کیا یہ سب کچھ غلط تھا۔ ٹھنڈے دل سے غور کیجئے ــــ اب اگر فیشن کرنے کی تعلیم دی جائے گی تو ظاہر ہے کہ نتائج کیا ہوں گے۔ ایک انجمن کے اسکولوں میں، جس کے ساتھ اسلام کا بھی لفظ لگا ہے ایسی تعلیم لڑکیوں کو دی جانا مناسب نہیں، نہ ہی ایسی تحریک اچھی ہوگی کہ لڑکیوں میں ملازمت کا شوق پیدا ہو، لڑکیوں اور خواتین کی ملازمت جذبہ مجبوری ہی اچھی سمجھی جا سکتی ہے۔ وہ بھی میرے خیال سے صرف زنانہ تعلیمی اداروں ہی میں۔ مسلم خواتین کا ملازمت کرنا اسلامی تعلیم کی روح کے بالکل منافی ہے۔

ڈیڑھ سو فی صدی اضافہ

گرانی کی ایسی مثال شاید تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی کہ کسی چیز کی قیمت میں ایک دم سے ڈیڑھ سو فی صدی کا اضافہ ہو گیا ہو۔ لیکن ہماری حکومت نے اخبار و رسائل کی ترسیل کے محصول میں یکم جون سے اتنا ہی اضافہ کر دیا ہے۔ جو نہ صرف گراں ہے بلکہ حیرت ناک بھی ہے۔ اسی طرح کتابوں پر جو محصول لگتا تھا وہ بھی دوچند ہو گیا ہے۔ جس سے ہر اخبار و رسالے کی قیمت میں اضافہ ہو جائے گا اور خریداری پر اثر پڑے گا۔ اسی طرح کتابیں منگانے والوں کو بھی زیادہ محصول ادا کرنا پڑے گا، جس سے تعلیم کو نقصان پہنچے گا۔ حکومت کو اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنا چاہیئے۔ تعلیم کا ہندوستان میں جو فقدان ہے، وہ محصول کے اس اضافے سے اور بڑھے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اخبارات، رسائل اور کتب پر محصول کم سے کم لیا جائے۔ موجودہ صورت میں اگر کوئی دس روپیہ کی کتاب وی۔ پی سے منگائے تو اسے پانچ روپیہ سے زائد محصول ادا کرنا پڑے گا۔

محکمۂ تار و ڈاک کی بدنظمی

اس حقیقت سے اب کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس وقت محکمۂ تار و ڈاک کی حالت اتنی خراب ہے کہ عوام پریشان ہیں۔ تار معمولی خطوط کی طرح آتے ہیں، خط اب بھی آ جائیں۔ وی۔ پی اور رجسٹری پارسل مہینہ مہینہ بھر بعد خریداروں کو ملتی ہیں اور اکثر وی۔ پی پر یہ رپورٹ لکھ کر واپس آ جاتے ہیں کہ نوٹس تقسیم کیا گیا۔ لیکن خریدار لکھتے ہیں کہ انہیں نوٹس نہیں ملا۔ پوسٹمین جھوٹی رپورٹ لکھ کر واپس کر دیتے ہیں جس سے وی۔ پی بھیجنے والے کو محصول ڈاک کا غیر معمولی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ محکمۂ ڈاک ہندوستان کا کسی زمانہ میں دیانتدار ترین مستعد محکمہ تھا، لیکن افسوس کہ اب بدترین محکمہ ہے۔ ہر ماہ حریم کے تقریباً دو سو پرچے خریداروں کو نہیں ملتے۔ انہیں دوبارہ روانا کرنا پڑتے ہیں جو نقصان عظیم ہے۔ اس سلسلہ میں خریداروں کو جو زحمت ہوتی ہے وہ علٰحدہ ہے۔ انہیں شکایتی خط لکھنا پڑتے ہیں اور زحمت انتظار اٹھانا پڑتی ہے۔ لطف یہ کہ کوئی داد فریاد نہیں۔

حکومت کا اسٹیٹ بینک ہے

ڈاک خانوں کے ساتھ ہی بینکوں کی کارگزاریاں بھی کچھ کم نہیں۔ نسیم بکڈپو نے ایک ریلوے رسید [illegible] وصول کرکے کلکتہ سے ایک تاجر کو دینے کے لئے اسٹیٹ بینک آف انڈیا کلکتہ اسٹریٹ کلکتہ روانا کی تھی۔ تاجر نے رسید رقم ادا کرکے وصول کر لی اور بینک نے اس کا ڈرافٹ نمبر 195208 ۱۳ مئی کو بنایا لیکن ۱۵ جون کو رجسٹری نمبر 6818 کے ذریعہ روانا کیا۔ اس طرح پندرہ روز تک یہ رقم بینک کے صرف میں رہی۔ اگر ہمارے پاس یہ رقم پندرہ روز قبل آ جاتی تو ہم اس سے فائدہ اٹھاتے۔ کیا کوئی جواب ہے بینک کے پاس کہ اس نے ہماری رقم اتنی تاخیر سے کیوں روانا کی کیا حکومت کا متعلقہ محکمہ بازپرس کرے گا۔

فہیم سلمہ کی شادی کا ضمیمہ

جون کے حریم میں فہیم سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں جو تفاصیل میں نے شائع کی تھیں۔ ان میں ان صدہا کرمفرماؤں، حریمی بہنوں اور بھانجیوں کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا تھا، جنھوں نے ممالک غیر اور ہندوستان سے اس سلسلہ میں مبارکباد کے تار کارڈ یا خطوط روانا کئے تھے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل غلطیوں کی بھی درستی کرنا چاہتا ہوں جو کاتب یا پروف ریڈر سے سہواً ہو گئی ہیں۔

۱۔ صفحہ ۲۸ کالم نمبر ۱ سطر ۲۶ پر عزیزی جتا الزماں کے بجائے عزیزی بدر الزماں ہونا چاہیئے تھا۔

۲۔ اسی صفحہ کے پہلے کالم کی سطر ۳۱ پر چودھری محمد عظیم الدین شرف کے بجائے چودھری محمد عظیم الدین اشرف ہونا چاہیئے۔

۳۔ صفحہ ۳۱۔ کالم دو سطر ۱۸ میں قسیم کے بجائے نسیم شائع ہو گیا ہے۔

مہاراشٹر میں اردو کے ایک غیر مسلم شیدائی

مہاراشٹر کی ریاست میں اردو والے ہمیشہ سے کھلی ہوئی اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۲۴ یا ۲۵ مئی کو وہاں کے مقام ایوت محل سے ایک شخص

غیر مسلم کرمفرما امیش چندر ترویدی کی طرف سے ان کی صاحبزادی کی شادی خانہ آبادی کی تقریب کا دعوت نامہ [illegible] سے آخر تک صرف [illegible] رسم الخط میں خوشنما [illegible] عبارت بھی کم [illegible] اردو فارسی کی اچھی استعداد رکھنے والے مسلمانوں کی شادی کے دعوت ناموں میں عموماً ہوتی تھی۔ زیر دعوت کے [illegible] میں اردو کا یہ شعر درج ہے!

قدم حضور نے رکھا میرے نصیب کھلے
جواب قصر سلیمان غریب خانہ ہوا

نیچے عبارت میں صاحبزادی کے نام سے پہلے نورچشمی اور اس کے [illegible] عربی لفظ درست ہے اور ساتھ ہی سلمہا بھی اور نورشاہ کے نام سے پہلے عزیزی سلمہٗ اور بعد میں ابن کا لفظ آخر میں دام سے پہلے "المتداعی" کا عربی لفظ (معروف باللہ) درج ہے۔ اور دعوت نامہ کے آخر میں یہ نوٹ بھی ہے کہ

خواتین کیلئے پردہ کا معقول انتظام رہے گا

اس زمانہ میں جبکہ لکھنؤ اور دہلی وغیرہ میں بھی مسلمانوں کے [illegible] کی شادی کی دعوتوں میں تجدد روشن خیالی کے زیر اثر پردہ کا انتظام بس برائے نام ہی رہ گیا ہے ایک غیر مسلم کے یہاں خواتین کے پردہ کا یہ اہتمام (جو غالباً مسلم مہمانوں ہی کی رعایت سے ہے) یقیناً مسرت انگیز ہونے سے زیادہ حیرت انگیز ہے!

بشکریہ صدق جدید لکھنؤ

زکوٰۃ

اسلام کے معاشی نظام کی بنیاد ہے

اسلام کے بنیادی فرائض پانچ ارکان پر مشتمل ہیں، ایمان اور نماز کے بعد زکوٰۃ کا درجہ ہے۔ زکوٰۃ اسلام کا تیسرا اہم رکن ہے۔ اسلامی معاشی نظام کا زیادہ تر انحصار زکوٰۃ پر ہے۔ ایک مالدار مسلمان سال بھر کے مال یا رقم مقررہ نصاب کے مطابق خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے اس طریقے سے مال میں سے ایک حصہ مستحق اور ضرورت مند لوگوں کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کی وجہ سے دولت کی منصفانہ تقسیم ہو جاتی ہے۔ زکوٰۃ معاشی سماجی برائیوں کا حل پیش کر کے صحت مند معاشرہ قائم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ زکوٰۃ ایک مالی عبادت ہے جس کے ادا ہونے سے معاشی مساوات و اخوت کا جذبہ فروغ پاتا ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت کا اندازہ احکامات خداوندی سے ہوتا ہے۔ قرآن شریف میں ارشاد ربانی ہے۔ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ۔ یعنی نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو اور مسلمانوں کی پہچان اور لازمی صفت یہ بیان کی ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ (ترجمہ) وہ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں

زر فتنہ و فساد کی جڑ ہے اور مال کی مثال سانپ کی سی ہے جس میں زہر ہے اور تریاق بھی۔ جب تک زہر کو تریاق سے الگ نہ کیا جائے۔ اس کی اصلیت و حقیقت کا علم نہیں ہوتا۔ زکوٰۃ مال و دولت کو دفینہ کی شکل میں نہیں ہونے دیتی بلکہ ہر سال زکوٰۃ نکالنے سے دولت گردش میں رہتی ہے۔

مال و دولت عطا کر کے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ مومن کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے بڑھ کر کوئی شئے عزیز نہیں ہونی چاہیئے لیکن مال کی مقناطیسی کشش انھیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ان کے لئے یہ آزمائش کی کٹھن گھڑی ہوتی ہے کہ کس کو فوقیت دی جائے۔

زکوٰۃ نہ دینے کو مشرکوں اور کافروں کی پہچان بتلائی گئی ہے۔ (ترجمہ) "ان مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے اور ان کا انجام بہت برا ہونے والا ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے وہ آخرت کے منکر اور کافر ہیں"

زکوٰۃ نہ دینا غریبوں ناداروں کا حق مارنا ہے۔ یہ اسلامی اصول کے سراسر منافی ہے۔ اس لئے زکوٰۃ نہ دینے والوں کو اللہ تعالیٰ نے سخت تنبیہہ کی ہے۔ سورۂ توبہ میں ارشاد فرمایا ہے: "اور جو لوگ سونا چاندی (مال و دولت) جوڑ کے رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (زکوٰۃ ادا نہیں کرتے) اے رسول تم ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو جس دن کہ تپایا جائے گا ان کی اس دولت کو دوزخ کی آگ میں پھر داغی جائیں گی۔ اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کی کروٹیں اور پیٹھیں (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ مال و دولت جس کو تم نے جوڑا تھا اپنے واسطے پس مزا چکھو اپنی جمع کی ہوئی دولت

کاہد

.بخل خوشنودیٔ خدا سے محروم کر دیتا ہے۔ زکوٰۃ فیاضی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور بخل کا خاتمہ کرکے دل کی سیاہی کو دور کرتی ہے دولت کی حرص و طمع سے دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح عبادت میں جسم کی صفائی و طہارت لازمی ہے پانی ظاہری نجاست کو دھو ڈالتا ہے اسی طرح زکوٰۃ دینے سے مال پاک ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس مال میں برکت عطا کرتا ہے۔

زکوٰۃ کی ادائگی خدائے بزرگ و برتر کے شکر بجالانے کا ایک اظہار ہے۔ مال دنیوی نعمت ہے جو مسلمان کے حق میں دنیا و آخرت کی راحت کا باعث ہوتی ہے۔ زکوٰۃ وہ شکر ہے جو نعمتِ مال پر ادا کیا جاتا ہے۔ زکوٰۃ مسلمان کے جان و مال کا صدقہ ہے۔ خدائے کریم کا یہ احسان ہے کہ اس نے زکوٰۃ اور صدقہ کا بڑا اجر و ثواب مقرر کیا ہے حالانکہ زکوٰۃ دینے والا جو کچھ دیتا ہے اسی کے عطا کئے ہوئے مال و دولت میں سے دیتا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والوں کیلئے سورہ (البقرہ) میں بڑے ثوابوں کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ان کے اس خرچ کرنے کی مثال اس دانہ کی سی ہے جس سے پودا اُگے اور اس سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے۔ وہ بڑی وسعت والا ہے اور سب کچھ جانتا ہے"۔

صحابۂ کرام کو اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں پر پورا پورا یقین تھا جب آنحضرتؐ پر صدقہ کی فضیلت اور ثواب کی آیتیں نازل ہوئیں اور انھوں نے رسول خدا سے ان کا بیان سنا تو ان میں جو غریب تھے اور جن کے پاس صدقہ کرنے کے لئے پیسے بھی نہ تھے تو وہ بھی صدقہ کرنے کے ارادہ سے مزدوری کرنے کے لئے گھروں سے نکل پڑے۔ انھوں نے محنت مزدوری کرکے پیسے کمائے اور راہ خدا میں صدقہ کیا۔ (ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تین باتیں ہیں جس شخص نے ان کا اہتمام کر لیا اس نے ایمان کا مزہ پا لیا۔ ایک یہ کہ صرف اللہ کی عبادت کرے اور سمجھے کہ لا الٰہ الا اللہ پر اس کا حقیقی ایمان ہے۔ تیسرے یہ کہ ہر سال دل کی پوری

خوشی سے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے۔ تو جس کو یہ تینوں باتیں حاصل ہو جائیں اس کو ایمان کی لذت اور چاشنی حاصل ہو جائے گی۔"
(ابوداؤد)

زکوٰۃ کے مستحقین یہ ہیں (۱) فقراء ۲۔ مساکین ۳۔ عاملین زکوٰۃ ۴۔ نومسلم لوگ ۵۔ غلام ۶ مقروض ۷ مجاہدین ۸ مسافر۔

زکوٰۃ دیتے وقت اس کے آداب بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ زکوٰۃ ادا کرنے میں جلدی کرے اور پیشتر اس کے وہ لازماً اس پر واجب ہو جائے ــــ سال کے دوران ہی دیا کرے اس سے بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔ مستحق لوگوں کو امید سے پہلے رقم ملنے سے جو ناگہانی خوشی ہوگی اس سے وہ اور بھی زیادہ اخلاص کے ساتھ اس کے حق میں دعائے خیر کریں گے۔ محتاجوں اور غریبوں کی دعا تمام دنیوی آفات سے محفوظ رکھنے کیلئے حصار کا کام دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ زمانہ کے حادثات سے بچ جائے گا۔

زکوٰۃ دینے میں نام و نمود کا شائبہ نہ ہو یعنی زکوٰۃ پوشیدہ طور پر دی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ داہنے ہاتھ سے یوں دے کہ بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو تاکہ ریاکاری غالب نہ آنے پائے اخلاص قائم رہے یہ بات الگ ہے کہ زکوٰۃ اس لئے برملا دی جائے کہ دیکھ کر دوسرے لوگ اس کی پیروی کریں۔

قرآنِ پاک

ماہ رمضان المبارک میں

از سید فضل الرحمٰن جعفری

تلاوتِ قرآن پاک کے بڑے فضائل ہیں یہ کتاب ہدایت ہے اور آخرت کا ذخیرہ۔ یہ زنگ آلود دلوں کے لئے صیقل ہے حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ان کی درخواست پر نصیحت فرمائی: "اے ابوذرؓ تقویٰ کا اہتمام کرو کہ یہ تمام امور کی جڑ ہے" پھر ابوذرؓ نے عرض کیا کچھ اور بھی ارشاد فرمایئے تو ارشاد ہوا کہ تلاوت قرآن پاک کا اہتمام کرو کہ دنیا میں یہ نور ہے

اور آخرت میں ذخیرہ ، تقویٰ وہ صفت ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے غیب سے سامان پیدا کرتا ہے اور ایسی جگہ سے روزی پہنچاتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا ۔ حضور اکرمؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جن گھروں میں قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے وہ آسمان والوں کے لئے اس طرح چمکتے ہیں جیسے زمین والوں کے لئے آسمان پر ستارے ۔"

احادیث میں کلام الٰہی کو اچھی آواز سے پڑھنے کا حکم آیا ہے ۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ قرآن شریف کو اچھی آواز سے مزین کرو اور اچھی آواز سے کلام پاک کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے ۔ لیکن آواز بنا بنا کر موسیقی کے اصولوں پر قرآن پڑھنے کی سخت ممانعت آئی ہے ۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مشہور کتاب غنیۃ الطالبین میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ایک دفعہ کوفے کے قریب جارہے تھے ۔ انھوں نے ایک گھر سے ایک گویّے کے گانے کی آواز سنی وہ سارنگی پر گانا گا رہا تھا ۔ حضرت ابن مسعودؓ یہ فرماتے ہوئے راستے سے گھر آگئے کہ " کیا ہی اچھی آواز تھی اگر قرآن شریف کی تلاوت میں ہوتی " گویّے نے ان کی بات سن لی تھی ۔ اس نے لوگوں سے پوچھا " یہ کون تھے ؟" نام بتایا گیا تو اس پر اس بات کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ اس نے اپنے سب آلات موسیقی توڑ ڈالے اور ابن مسعودؓ کی صحبت میں پہنچ گیا ۔ وہ گویا پھر بہت بڑا عالم دین بن کر دنیا میں مشہور ہوا ۔ قرآن پاک کی تلاوت کے فضائل بھی ہیں اور آداب بھی اور حقوق بھی ۔

بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت عبیدہ ملیکی نے رسول اللہؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ " قرآن والے ! قرآن شریف سے تکیہ نہ لگاؤ اور اس کی تلاوت شب و روز ایسی کرو جیسا اس کا حق ہے کلام پاک کی اشاعت کرو اور اسے اچھی آواز سے پڑھو ۔ اور اس کے معنی میں غور و فکر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ اور اس کا بدلہ دنیا میں طلب نہ کرو کہ آخرت میں اس کا بڑا اجر ہے "

یہ بات دل نشین کرلینی چاہیئے کہ یہ بادشاہ کا فرمان ، اور محبوب کا کلام ہے ۔ بادشاہ کا فرمان اور محبوب کا کلام لوگ بڑی توجہ سے سنتے ہیں ۔ اس سے زیادہ توجہ اور غور اور انہماک اللہ کے کلام میں ہونا چاہئے ۔ کلام الٰہی کی اشاعت و ترویج کی بھی تعلیم دی

گئی ہے خواہ وہ تقریر کے ذریعے ہو یا تحریر کے ذریعے ۔ جو لوگ قرآن کی تعلیم پر دنیا کی تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں وہ سخت نقصان اور خسران میں ہیں ۔ یہ بڑے وبال کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا سخت مواخذہ ہے ۔ تلاوت قرآن کا مواخذہ لینے کی بھی ممانعت کی گئی ہے اس لئے کہ آخرت میں بہت بڑا معاوضہ ملے گا ۔ حضور اکرمؐ نے فرمایا کہ جب میری امت درہم و دینار کو اہمیت دینے لگے گی تو اسلام کی ہیبت دل سے جاتی رہے گی اور جب معروف اور منکر چھوڑ دے گی تو قرآن کے فہم سے محروم ہوجائے گی ۔

قرآن پاک کی تلاوت اسلاف اور بزرگان دین کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے ۔ وہ اس کثرت سے تلاوت کرتے تھے کہ اس کا تصور کرکے حیرت ہوتی ہے ۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ ایک رات میں پورا قرآن شریف پڑھا کرتے تھے ۔ حضرت سعید بن جبیرؓ نے ایک مرتبہ کعبہ کے اندر دو رکعت نماز میں پورا قرآن شریف پڑھا ۔ حضرت امام شافعیؒ اکثر اوقات عشاء کے بعد قرآن شریف کھولتے تھے اور فجر کی نماز کے وقت بند کرتے تھے ۔ امام اعظمؒ رمضان شریف میں ۶۱ بار قرآن شریف پڑھتے تھے ۔

امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ قرآن شریف کا حق یہ ہے کہ کم از کم سال میں دو بار ختم کیا جائے ۔ غرض قرآن پاک کی تلاوت کے فضائل اور فوائد بے شمار ہیں ۔ کلام الٰہی دین کی روح ہے ۔ شفاعت کا ذریعہ ہے اور قلب کے لئے سکینہ ہے ۔ چنانچہ سعیدؓ بن سلیم حضور اکرمؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ " قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے زیادہ کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا ۔ نہ کوئی نبی نہ کوئی فرشتہ "

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو وحی الٰہی کی برکتوں سے سعادت اندوز ہونے کی توفیق عطا فرمائے ۔ اور رمضان المبارک میں تلاوت کی کثرت سے اپنے قلوب کو منور کرنے کی سعادت سے محروم نہ رکھے کہ یہی مہینہ نزول قرآن کا ہے ۔ یہی مہینہ تجلیات الٰہی کی بارش کا ہے ۔ اسی مہینہ میں ابر رحمت جھوم جھوم کر برستا ہے ۔ یہی مہینہ مغفرت کا ہے اور اسی مہینے میں جہنم سے نجات ملتی ہے ۔ یہی مہینہ تزکیہ نفس کا ہے ۔ حضرت ابراہیمؑ کو آسمانی صحائف اسی مہینے کی پہلی یا تیسری تاریخ کو عطا ہوئے ۔ اسی مہینے کی ۱۸ تاریخ کو حضرت داؤدؑ کو زبور ملی ۔ اسی مہینے کی چھ تاریخ کو حضرت موسیٰؑ کو توریت عطا کی گئی اور اسی ماہ کی ۱۳ تاریخ کو حضرت عیسیٰؑ کو انجیل سے نوازا گیا ۔

نیا سبق

(عفت موہانی)

الف سے انار ب سے بکری اور ت سے تارہ۔ اچھا؟۔ باجی نے پیار سے کہا اور سامنے بیٹھے ہوئے ناک سرسراتے گندے بچوں پر ایک پیار بھری نظر بھی ڈالی پھر ان کے میلے کچیلے سروں پر ہاتھ پھیر کر کہا: اب تم لوگ اپنا سبق دُہراؤ۔"

دس گیارہ موٹی دُبلی آوازوں نے ایک آواز ہو کر سبق دہرا لیا۔ اور دالان میں اپنا مکتب کھولے بیٹھی باجی نے بے حد اطمینان سے سر ہلا لیا۔ انھیں پیسے یقین ہو گیا۔ بس ان کے شاگرد جلد ہی کانووکیشن میں اپنی سند لینے ہی والے ہیں۔ شریف گھرانے کے بچے بچیوں کو گھر کا حساب کتاب کرنے اور ٹوٹا پھوٹا خط لکھنا آجائے۔ بس، بڑی بات ہے یہ۔ بعضے تو خاصے ہڑبونگ ہو جاتے ہیں اور ان سے نام لکھواؤ تو اس طرح سر جھکائیں گے کہ بے اختیار جی چاہے گا کہ کس کے ایک ہاتھ گال پر دیا جائے۔ لہٰذا باجی نے یہ نیک کام" ازراہ فلاح عامّہ" خود سے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ دوپہر کو ادھر ادھر کے بچے بچیاں ان کے پاس آجاتے۔ آکیا جاتے۔ ان کی چڑچڑی مائیں انھیں ادھر ہنکا دیا کرتی تھیں۔ بلا سے وہ بھی کچھ کمر سیدھی کر لیں اور یہ شیطان ذات بھی حروف آشنا ہو جائے۔ سو یہ مکتب خواہ مخواہ دالان میں کھل گیا اور پورے زور و شور سے جاری تھا تقریباً تین چار مہینے سے۔

برآمدے میں بیٹھی نزہت نے سخت اُلجھ کر اپنے ہونٹ سکوڑ لیے۔ وہ دیر سے ایک دل چسپ جاسوسی ناول پڑھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر جہاں کسی سسپنس کا موقع آتا۔ اس حصہ پر فوراً ب سے بکری چلانے لگتی اور اس کا جی چاہتا کہ کتاب ان سب گندے طالب علموں پر کھینچ مارے!! اس واہیات مخلوق کو بھی اسی گھر میں آکر مرنا تھا!

مگر اس نے سوچا۔ وہ بھی تو آخر مجبور ہی تھیں۔ کیا کرتیں۔ تین آدمیوں کا کھانا اس زمانے میں آسان نہیں رہا۔ پہلے صرف صمد خانصاحب سارے گھر کی کفالت کا ذمہ دار ہوتا تھا مگر اب۔ نزہت نے سوچا بھی۔ یہاں تو اللہ میاں نے سرے سے کسی صمد خاندان کی صورت ہی نہیں دکھائی۔ ابا میاں دو سال ہوئے آنتوں کے دق میں مبتلا ہو کر ختم ہو چکے تھے۔ اماں اپنے زمانے میں ہائی اسکول کی ٹیچر رہ چکی تھیں۔ انھیں ایک قلیل سی پنشن ملتی۔ باجی نے صرف میٹرک کیا تھا اور تھوڑے دنوں کسی پرائمری اسکول میں جھک بھی مارا تھا لیکن وہاں کے ہیڈ ماسٹر صاحب اچانک ان پر سخت مہربان ہو گئے تھے۔ ایک دفعہ گرمی کے موسم میں انھوں نے صرف باجی ہی کو اپنے اجلاس پر طلب کرکے آئسکریم کھلائی تھی جب کہ دوسری ماری پیٹی ٹیچرس بھی گرمی کے جھلسا دینے والے موسم میں ہلکان ہو رہی تھیں!۔ باجی نے سوچا تھا کہ شاید یہ وہ نئی ہیں لہٰذا یہ ضیافت دی گئی ہے۔ پھر دوسری مرتبہ صدر صاحب نے انھیں اپنے کمرے میں بلایا اور اسکول کے متعلق غیر ضروری باتیں کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ کتنی خوبصورت ہیں آپ۔ کون سے پرستان سے آئی ہیں؟۔

اور تب۔ باجی کے ذہن میں وہ دریچے جھٹکے سے کھل گئے تھے جن سے خطرے کی گھنٹیاں بجنے کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں۔ یہ تو انھیں روز ہی آئینہ بتا دیتا تھا کہ وہ کسی پرستان سے یا کوہ قاف سے براہ راست اُتر کے نہیں آئیں!۔ یا پھر صرف جوانی ہی کو پرستانی حُسن کہا جائے تو ویسے ہر استانی پری تھی۔ اماں نے دونوں بیٹیوں کو شروع ہی سے سمجھا دیا تھا۔ چاہے جان پر بن جائے مگر آبرو پر نہ بنے!۔ ان دونوں ہی کو اماں کی نصیحت یاد تھی۔ اور پھر ادھر ادھر کے المناک ہولناک قصے سن سن کے ان کے بھی کان ہو چکے تھے۔ مردوں کی جھوٹی لُبھانے والی باتوں پر ریجھ کر اپنی دنیا اور عاقبت برباد کرنا ایسی دانش مندی نہیں جس پر بڑھاپے میں فخر کیا جاسکے بلا سے۔ جوانی یونہی دیوانی بنی سر پٹختی پھرا کرے۔ رہے گی تو جسم کے محدود صحرا کے اندر ہی۔ بعد کو بے شک اس بات پر سب کے سامنے سر اٹھا کر کہا جا سکتا تھا کہ اس بوڑھے کوبے پنڈے پر کسی نگوڑے بدنظر کی نہ تو نظر پڑی اور نہ پاک بدن کو کسی نے ہاتھ لگایا۔ جوانی کا بڑا مختصر سا طوفانی دور اگر ضبط کے بند باندھ کر روکا جائے تو دنیا میں بڑے سے بڑا فتنہ دب جائے!۔

اور باجی نے پھر اسکول کو تو الوداعی سلام کیا اور گھر میں مکتب کھول لیا۔ اتنی آمدنی تو ہو ہی جاتی تھی کہ اماں کی پنشن ملنے میں دیر ہو یا نزہت کی کالج کی فیس بھرنی ہو تو وقت پر

چھوٹی کی درمی کام آئے۔ اس لئے نزہت نے دل پر صبر کی سل رکھ کر دیکھا۔ بس خیر پر اوڑھی رکھ کر اماں کے پاس باورچی خانے میں چلی گئی۔

بھیل بھر کے باورچی خانے میں جو دھوئیں سے کالا ہو رہا تھا اماں شامی کے کباب بنا رہی تھیں۔ چولہے میں لپکتے شعلوں کا عکس ان کے جھریوں بھرے گالوں پر کانپ رہا تھا اور وہ خود بھی نجانے کس خیال سے منہ ہی منہ میں مسکرا رہی تھیں۔ اماں کی ہنسی دونوں لڑکیوں کی فکر نے بہت عرصہ پہلے چھین لی تھی۔ وہ تو ہر وقت آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر آہیں بھرنے اور زیرِ لب دعائیں مانگنے کی عادی تھیں لہٰذا ان کے معنی خیز تبسم کو نزہت نے بڑے تعجب سے دیکھا۔ مگر اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اماں نے کہا۔

"وہ ادھر ٹکی میں قیمہ رکھا ہے۔ دو تین پانی سے دھو کے اسے ذرا بھون تو بیٹی۔ پر دیکھیو۔ اتنا موں مرچیں نہ ڈال دیجیو کہ بے چارہ منہ پیٹتا ہوا دسترخوان سے اٹھ کھڑا ہو!"

کون بے چارہ؟" نزہت کے منہ سے بات ہی نہ نکل سکی۔ اس پر تو حیرت کے ہمالیہ ٹوٹ پڑے تھے۔ یہاں تو دس دس کوس تک کسی بے چارے کا نام و نشان نہ تھا۔ پھر اب یہ ہے کون۔ جس کی ضیافت کے لئے اماں نے قیمہ منگوانے کو تھیلی کا منہ کھولا تھا۔ وہ کسی موہوم سی امید پر جہیز کے نام پر ایک ایک چیز جوڑ رہی تھیں۔ ان کا مقولہ تھا چاہے پیٹ میں روٹی نمک ہو۔ پر اوپری حیثیت ایسی ہو جو دیکھنے والے اس گمان میں جلتے رہیں کہ پیٹ میں بھی پلاؤ ہی ہوگا وہ "بے فضول اور بن ناحق" کو خواہ مخواہ ڈھائی روپئے کا قیمہ کبھی نہ منگوائیں۔ تو پھر یہ بے چارہ یقیناً کوئی چارہ دار ہوگا!۔

اب میرا منہ کیا تکے ہے بٹیا؟" اماں نے نزہت کو گم دیکھ کر کہا۔ "رات مولانا بھائی کہہ گئے ہیں کہ اللہ رکھے اب یوسف میاں کچھ دنوں کے لئے گاؤں سے یہیں آ رہے ہیں۔ کوئی سا امتحان انھیں دینا ہے۔ چار بجے تک آجائیں گے۔ بھوکے پیاسے ہوں گے۔ ان کے سامنے اب دال روٹی تو رکھی نہیں جا سکتی۔ سو میں نے سوچا کہ ———!

"کون یوسف میاں؟" نزہت نے قیمہ دھوتے دھوتے بے حد بے دلی سے پوچھا۔

"اے ہاں تم کیا جانو" اماں تو بس کھلی جا رہی تھیں۔ "تم بالشت بھر کی تھیں تب وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ دور گاؤں سے آگے کسی گاؤں میں چلے گئے تھے۔ اب ماشاء اللہ وہ کوئی سا امتحان دے کر شہر میں سرکاری نوکری کریں گے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ساری عمر کھیتی باڑی کیا کریں ان کے کئی بیگھے زمین اور ———!"

ٹکی اس کے ہاتھ سے لے کر اماں نے مزید کہا۔ "وہ تمھارے پھوپھی زاد بھائی کے چچیا سسر کے ماموں ان کے سوتیلے بیٹے کے جو داماد تھے ان کے یوسف میاں ———!"

اماں کچھ اور بھی آسان سا رشتہ بتائیں مگر نزہت کا سر گھوم گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کڑھائی چولہے پر چڑھا دی اور اچھا اچھا کہہ کر اماں کی فرنٹیئر میل روک دی۔!

"میں ذرا باہر کا کمرہ درست کر دوں" اماں اٹھ گئیں۔ "نام چار کا دیوان خانہ ہے نگوڑا آج تک کوئی مرد وا اس میں تمھارے باوا کے بعد رہا ہی نہیں"

اب نجانے ان حضرت یوسف کی کیا کیا خدمت انجام دینی ہوگی" نزہت نے خاک ہوتے ہوئے سوچا۔ انھیں بھی آمرنے کیلئے ہمارے ہی گھر میں جگہ نصیب ہوئی۔ وہ قطعی کھری سی لڑکی تھی۔ اللہ میاں نے اس کے خمیر میں جمالیاتی حس، محبت اور نرمی نام کی کوئی چیز رکھی ہی نہ تھی۔ بڑے سے بڑا اپری پیکر اس کے سامنے سے گزر جائے۔ اسے متاثر ہونا آتا ہی نہ تھا۔ نہ اس نے کبھی رومانی افسانے یا ناول پڑھ کر خود کو خواہ مخواہ کے سوگ میں مبتلا کیا تھا اور نہ میر و غالب کے شعروں نے اس کی نیندیں چھینی تھیں۔ وہ اکنومکس پڑھ رہی تھی اور اپنے نصاب ہی کی سی خشک بھی تھی۔ لہٰذا وہ یوسف صاحب کی آمد کے تصور سے باغ باغ ہونے اور اس باغ میں رومان انگیز گل گشت کرنے کی بجائے اس طرح جھنجھلا رہی تھی کہ اس کے بس میں ہوتا تو وہ یوسف میاں کو اپنے گھر کی چوکھٹ بھی پھلانگنے نہ دیتی۔

مگر اس کی باجی۔ ثروت نے بہن کی بھناہٹ پر ناگواری سے کہا تھا۔ ارے مہمان ہے بھئی۔ آئے گا تو ایک دن چلا بھی جائے گا۔

مگر وہ مہمان جو بن بلائے آگیا تھا۔ چلا نہ گیا۔ پرائیوٹ گریجویشن کی تیاری کی تھی۔ اب امتحانوں کے سامنے شہر میں نازل ہوئے تھے

کچھ کچھ مواقع کامیابی کے ہاتھ لگتے ہی ہیں۔ رات رات بھر پڑھتے اور ان کے لئے کافی یا چائے بنا کر تھرماس میں رکھنی پڑتی تھی گوشت کے بغیر نوالہ ان کی حلق سے نہ اترتا۔ کھانے کے بعد وہ کوئی میٹھی چیز خرمدنوش فرماتے تھے۔ یوں بھی مردوں کو منہ کا مزہ بدلنے کی عادت ہوتی ہے۔ نزہت تو اماں کے بار بار آنکھیں دکھانے اور دبی دبی گھڑکیاں دینے کے باوجود اپنی کتابیں چھوڑ کر نہ اٹھتی۔ صاف کہہ دیتی۔ گاؤں کے پہلوان کے سترہ نخرے ہم سے نہیں سہے جائیں گے۔ سنا اماں آپ نے۔ ہمارا خود امتحان ہے۔ آپ کا کیا منشا ہے ان دماغ دار کی خاطروں میں ہم فیل ہو جائیں؟"

"اے بدعقل۔ تجھے پڑھا بھی دیا کریں گے یوسف میاں۔ بات سمجھتی تو ہے نہیں" اماں دانت پیستیں۔ مگر نزہت نے ان کی ایک مان کے نہ دی۔ ایسے زبردستی کے استاد کس طرح سبق پڑھاتے ہیں۔ نزہت کو معلوم تھا!۔

اماں تو یوسف میاں پر واری واری جاتیں۔ اماں باوا نے کیا نیک تربیت کی تھی۔ صدقے ان کے۔ پچیس چھبیس ۲۶ سال کے مونچھوں دار ساٹھ ہاتھ کے لمبے چوڑے مردوے کو پانچ برس کا بچہ بنا رکھا تھا۔ اماں کا یہی خیال تھا!۔ اے اور کیا۔ بے چارے منہ سے بولنا نہ جانیں۔ نرم سے مسکرائیں۔ نظریں نیچی کر کے باتیں کریں۔ حلق پھاڑ کے قہقہہ نہ لگائیں۔ اور کیا مجال کہ ان کی لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھ تو لیں۔ فرشتہ ہے پورا۔ اور اس فرشتہ پر صد فی صد بھروسہ کر کے اماں نے ثروت بی بی کو ان کی خدمت پر لگا دیا۔ اور کیا کرتیں بے چاری۔ نزہت مگری بجا گر پر اماں کا زور نہ چلتا تھا۔ وہ اس وقت کو کوسنے دیتیں جب بڑی بہن نے ماسے اماں کے بہن کا منہ کالج میں ٹھونس دیا تھا۔ کالج کی نمارت گی تعلیم ہی کا تو نتیجہ تھا کہ نزہت آفت کی ماری ایک تنکا توڑ کے دو نہ کرتی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ ثروت بی بی نے کالج کی صورت نہیں دیکھی۔ تبھی تو یہ حال تھا کہ صبح نماز کے بعد سیدھے باورچی خانے میں گھس جاتی تھیں۔ اور پھر دیکھ لو بھائی۔ یوسف میاں کے دسترخوان پر ایک سے ایک نعمت۔ مرغ پلاؤ، بھنا گوشت ملائی دار، کرارے پکے ہوئے انڈے۔ شامی کباب لعد تجانے کیا کیا چاٹ خانہ۔۔ اخیر میں ملائی کی کھلی ہوئی کافی!۔

ماما بھری باجی جب دسترخوان پر یوسف میاں کے سامنے بیٹھ کر انھیں زبردستی ایک ایک چیز کھلاتیں تو ایسا لگتا کہ کھایا پیا سب باجی ہی کے پیٹ میں جا رہا ہو۔

"آپ نے بھنے ہوئے گردے تو چکھے ہی نہیں" یہ باجی کہتیں یوسف میاں کے نوالہ زدہ منہ سے اور بھی موٹی آواز نکلتی: "چکھے ہیں۔ واہ۔ بہت خوب ہیں۔ اور یہ چیز۔ یہ تو بے حد مزے دار ہے کیا چیز ہے یہ پلپلی سی۔ مگر ہے بے انتہا لذیذ!"

باجی ہنس پڑتیں "بھیجہ ہے!"

"اچھا اچھا" وہ بھی ہنستے۔ اور معلوم ہوتا کہ ہارمونیم کا موٹا چپٹا سا سُر اور باریک سُر یکبارگی بج اٹھے ہوں۔

"آپ کے ہاتھوں میں جادو ہے" یوسف میاں کہتے "اور۔ نہ صرف ہاتھوں میں۔ ب۔ بلکہ آپ میں خود بھی۔ مطلب یہ کہ آپ اتنی۔ اچھی۔۔" وہ باجی کو گلابی ہوتے دیکھ کر جان بوجھ کر خود بھی گڑبڑا جاتے!۔

ادھورے الفاظ بھی کبھی کبھی پوری کہانی کہہ دیتے ہیں۔

"ہٹئے بھی۔ آپ مجھے بناتے ہیں!" باجی بے چاری سچ مچ شرماتی تھیں۔

"نہیں نہیں۔ واللہ۔ سچ کہتا ہوں۔ آپ کی بات ہی کچھ اور ہے کیا آب و نمک ہے آپ میں!!"

"آب و نمک! اور مجھ میں؟!" باجی کی بے اختیار ہنسی رکنے کا نام نہ لیتی۔ وہ کھسیاتے "اب دیکھئے نا۔ آپ کے حسن اور نزاکت کی تعریف کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ میں آپ کی کون کون سی چیز کی تعریف کروں۔ یہ آپ کا رنگ۔ جیسے دودھ میں کسی نے گلابی گھول دی ہو۔ یہ نیبو کی پھانکوں کی سی آنکھیں۔ اور یہ آپ کے سنگترے کی قاشوں کے سے لب!"

چونکہ وہ صرف کھانے پینے کے جن تھے۔ لہٰذا تشبیہیں بھی انہیں کھانے پینے والی چیزوں ہی کی سوجھتی تھیں۔ بعض سفید جھوٹ اتنے پختہ انداز میں بولے جاتے ہیں کہ سچ لگتے ہیں۔ لیکن بے چاری ثروت جس نے اپنی زندگی کے اکیس سال [illegible] گزار دیے تھے انھیں یہ الفاظ شہد کی بوندیں معلوم ہوتے۔ [illegible] چیز کو بھی بھاتے ہیں۔ دل ہی دل میں۔ چوری چوری۔ خود سے چھپا کے۔ اور یہ تو

بیچاری کی آدمی تھا۔ ان کی زندگی میں بے موسم کی بہار کی طرح آگیا تھا۔ اس لئے انھوں نے یہ راز خود سے بھی پوشیدہ رکھا کہ کوئی چور ان کے خیالوں میں گھس کر ان سے پاک ارمانوں بھولی تمنائیں اور ان چھوٹی آرزوؤں کو لوٹے لئے جا رہا ہے۔ وہ اپنے دیوتا کی پجارن بن گئیں۔ خدمت کے پردے میں عبادت۔ لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ ثروت کے جذبات کیا تھے۔ ان کا تو روز کا معمول تھا گھر کے آگ لگا دینے والے کاموں سے فارغ ہو کر وہ پچھلے بورے پر آ بیٹھتیں۔ اور روز کے سے بچے آ جاتے۔ اپنے ساتھ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بھی لگا دیتے !۔

ثروت باجی پڑھائی۔

الف زبر ان ۔ ب دو زبر بن۔

چھوٹا سا گھر۔ بچوں کی آوازیں ایک لئے ایک آہنگ میں گونجتیں۔ اور پھر گھر کے ہر گوشے میں پہونچتیں۔ یوسف میاں ایک مرتبہ ثروت کے پاس آ بیٹھے۔

" آکسفورڈ کی یہ یونیورسٹی آپ نے کب کھولی ؟ "

ثروت کو پھر ہنسی آگئی : چھ مہینے ہو چکے !"

" دیکھئے " یوسف نے ایک صاحبزادے کی طرف اشارہ کیا " سنئے !۔

ثروت نے اس کی طرف دیکھا۔ لڑکا جھوم جھوم کر جیسے گا رہا تھا۔ الف سے الو۔ ب سے بندر۔ ت سے تیتر۔ یوسف کے چہرے پر نظر کی تو اور ہنسی آئی۔ یوسف نے بھی دانت چمکائے۔

" سچ کہتا ہوں۔ میرا تو سر گھوم جاتا ہے۔ نجانے آپ ان سب سے کس طرح سر کھپاتی ہیں۔ روز وہی پرانا سبق۔ اب انھیں کوئی نیا سبق پڑھائیے !"

" کیا پڑھاؤں !۔

کچھ اور ——— سمجھیں !۔

کچھ اور ——— مگر کیا۔ ثروت کھو گئی۔

یہ بھی سچ تھا کہ اب اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ مگر مجبوری۔ اماں نے سچ بدن کی تک کما کما کے جو رقم بچائی تھی۔ وہ اب گھو گھلی ہونے لگی تھی!۔ روز روز کے پراٹھے اور ملائی اماں کے بدن کی چربی بھی پگھلا رہی تھی۔ لیکن انھیں کچھ آس تھی بیٹوں کی

طرح بیچارے بچے کی طرح منہ کھولے رہتی ہے۔ شاید کہیں سے کوئی پھل خود بخود منہ میں کھنچ آئے۔ یوسف تو کسی رشتے سے ان کا بھتیجا تھا وہ ایک دن اپنے ماں باپ سے کہے گا کہ پھوپھی اماں نے اس کی کتنی خاطریں کی تھیں۔ اور پھر وہ ثروت کی خدمت بھی تو دیکھ رہا ہے۔ کیا پھوپھی اماں نمک کا احسان اُتارنے کے لئے یوسف کا رشتہ ثروت سے نہ کر نہ آ جائیں گی ؟۔ دیکھا بھالا لڑکا۔ اتنا بے زبان شریف۔ وہ خدا کا شکر ادا کرتے کرتے نہ تھکتیں جس نے گھر بیٹھے بیٹی کا بُرا اُتار دیا تھا!۔

انھوں نے جہیز کے کپڑے نکلوائے۔ انھیں دھوپ دکھائی اور معائنہ کیا کہ کیڑوں نے تو انھیں خراب نہیں کیا۔ ان کی نیکلس پر ملمع کروایا۔ پازیب اور چھلے صاف کروائے۔ اور سوچا کہ وقت پر چھوٹی موٹی چیزیں منگوا لیں گی۔ پنشن میں سے ان کا ارادہ تھا کہ دو روپے بچ دیں گی۔ یوسف " کھاتا پیتا " لڑکا تھا۔ لڑکی کی چوکی تو معقول ہونی چاہیئے !۔ اچھے برکی مسلسل دید نے اماں کے گالوں کی جھریاں بھر دیں۔ وہ بے حد خوش نظر آتی تھیں۔

خواب بھی بہت تسلیاں دیتے ہیں۔

مگر نزہت کو یوسف پھوٹی آنکھ نہ بھائے۔ لوے کوئی حد ہے۔ مرد کو مرد کی صورت کا تو ہونا چاہئے۔ یہ کیا گوری ستواں ناک، سگریٹ اور پان سے لال ہونٹ، ہونٹوں پر ابابیل کی جھونجھ، گردن تک بکھرے ہوئے بال، کھیت کی دھوپ سے پکی ہوئی رنگت۔ مگر بھائی وہ بہرحال مرد تھے۔ اس جنگل کے راجہ اندر جہاں فقط انجارِ صورت عورتوں ہی کی بستی تھی۔ لہٰذا دُھندلی لالٹین کی جگہ گیس کا ہنڈہ لگ گیا تو اس پر پروانے بھی گرے!۔

نزہت اکل کھری تھی تو کیا۔ کالج کی ہوا کھا رہی تھی۔ اس نے اپنی دل پھینک سہیلیوں کے محبت کے قصے سن رکھے تھے۔ اور یہ بھی جانتی تھی کہ کس طرح مردوں کی دزدیدہ نگاہ ہی ایک دن بھرپور پیغام بن جاتی ہے۔ جو اس کی سہیلیوں کے تجربے کے مطابق سیدھی دل میں اُتر جاتی ہے۔ اور وہ یوسف میاں کی کنکھیوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ حد تھی۔ لیعنی خدمت تو کریں باجی، ان کے گیت گائیں باجی۔ انھیں اپنی رگ رگ میں خون اور زندگی بنا کر رکھیں باجی اور وہ خود انتقال کریں نزہت پر۔ اس کے تن بدن میں چلا دیا

سی خشک اٹھیں۔ آخر باجی کی آنکھیں کیوں بند ہیں۔ اماں کیوں خوابِ غفلت میں پڑی ہیں۔ اگر ان کی ساری تمنائیں منہ چڑھا کر بھاگ جائیں تب۔ فرض کیا کہ یہ یوسف کا بچہ کھا پی کے اُڑنچھو ہو گیا تو پھر!۔

اس نے جھلّا کر ثروت سے کہا: ”کیا ضرورت ہے آپ کو دھوئیں میں آنکھیں پھوڑنے کی۔ آئینہ دیکھا ہے کبھی۔ رنگت جھلس رہی ہے۔ پیاز ترکاری کاٹتے کاٹتے انگوٹھوں میں خراشیں پڑ گئی ہیں۔ اس مردے نکلے کے موٹے موٹے کپڑوں پہ استری کرتے کرتے انگلیوں میں گھٹے پڑے جا رہے ہیں۔ ہوٹل نصیب نہیں تھا اُسے۔ یہاں باپ کی جاگیر رکھی ہے نا!“

”اماں کے بھتیجے ہیں“ باجی نے کہا: ”اب ان کی خاطر مدارات تو ہوگی ہی۔ آخر گھر جا کے وہ ـــــ!“

”گھر جا کے وہ آپ کے ساتھ پیغام بھجوا دیں گے“ جل کر نزہت بولی ”کیا عمر۔ اس موٹے کی شادی وادی ہو بھی چکی ہوا؟“

”نہیں تو“ باجی یوسف کے تکیہ غلاف پر ریشم کاڑھتے کاڑھتے دلہنوں کی طرح سر جھکا کر مسکرائیں ”اماں نے پوچھا تھا کہ میاں تمھارا بیاہ ہوا کہ نہیں۔ تو انھوں نے شرما کے سر جھکا لیا تھا۔“

نزہت نے اور بھی جل کے پوچھا: ”سچ! وہ بھنگا آپ کو پسند ہے؟!“

”اے لو۔ میرا کیا تذکرہ“ جان بوجھ کر وہ کھسیائیں۔ نزہت نے تو سمجھ ہی لیا تھا۔ باجی جو بالکل اُجڑی اُجڑی رہتی تھیں۔ انھیں سنگھار پٹار کا قطعی شوق نہ تھا۔ سو اب وہ بہت بن ٹھن کے رہنے لگی تھیں۔ پھولدار شرٹ، باریک ڈوپٹے حباب کی سی ساڑیاں۔ سرخی، کاجل، توبہ۔ بچی کے لئے ایسا لاسہ بھی لگتا ہے۔

دوپہر کو ایک طرف یونیورسٹی جاری تھی۔ مطلب یہ کہ تشنگانِ علم بڑی شد و مد سے لا آم للا۔ یہ میرا کوٹ ہے کی گردان کر رہے تھے۔ اُدھر سے یوسف اپنی یونیورسٹی سے آئے!۔ ثروت نے نزہت سے کہا!۔

”اللہ۔ ذرا تم ان کا کھانا نکال دو۔ آج دوسری تاریخ ہے۔ تابش جیسوں سے فیس وصول کر لوں ذرا۔ کوفتے گھی ڈال کر گرم کر لینا کچھ“

فیس کا معاملہ نہ ہوتا تو ثروت ہرگز نہ اٹھتی مگر صرف سو ڈیڑھ سو کی خاطر اٹھ گئی۔ جل بھن کر کوفتے گرم کئے۔ کھانا لگا کے باہر لے گئی۔ یوسف نے دانت نکال دئے۔

”اوہو۔ آج تو ٹھیک دوپہر میں چاند نکل آیا ہے۔ بیٹھو بیٹھو۔ تم تو کبھی نظر ہی نہیں آتیں۔ آج یہ کدھر مجھ پر ترس آ گیا؟“

نزہت نے شیرنی کی نگاہ سے انھیں دیکھا: ”آپ کی بکواس کا مطلب میں نہیں سمجھی!۔ میں آپ کو کیوں نظر آؤں؟؟“

وہ کرسی پہ آ بیٹھے۔ اور میز کا جائزہ لیا: ”مطلب یہ کہ تمھیں دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے گلاب کے تختوں پر نظر پڑی ہو۔ سر سے پاؤں تک گلاب ہی تو ہو تم۔ سچ کہتا ہوں ثروت۔ جب میں پہلی بار یہاں آیا ہوں تو تمھیں دیکھ کر میرے دل نے صدا دی تھی کہ یہی ہے وہ ہستی۔ جو میرے خوابوں میں بستی ہے جو میری آمند ہو۔ اسے کھاؤ نا ایک کوفتہ۔ میری قسم۔ چکھو تو ذرا!“

”باجی کی جاں نثاری کا یہ انعام؟“ نزہت غصے کے مارے کانپنے لگی۔

”باجی۔ باجی۔ لاحول ولا قوۃ“ یوسف نے ناک سکوڑی: ”ایسے مجھے کیا باورچن سے شادی کرنی ہے۔ یا تو باورچی خانے میں گھسی کھانا پکا رہی ہیں یا پھر محلے بھر کے گندے لونڈوں کے بیچ بیٹھی دماغ خالی کر رہی ہیں۔ ان سے مجھے کیا ماتھا پھوڑنا ہے نزہت۔ مجھے تو۔ تم پسند ہو۔ تمھاری قسم۔ شادی کے بعد۔ جب ہم ہاتھ میں ہاتھ دئے ـــــ!“

نزہت نے اپنی تعریف سنی ہو یا نہ سنی ہو۔ مگر اس سے باجی کی برائی نہ سنی گئی۔ اس نے آپے سے باہر ہو کر چاولوں کی قاب پر رکھا چمچہ اٹھایا اور کھٹ سے ان کے ماتھے پہ دے مارا۔ پھر وہ غصیلی لڑکی جس نے کبھی کوئی گدلا خواب نہ دیکھا تھا جو سخت اکل کھری تھی۔ بے تحاشہ چیخنے چلّانے لگی!۔ اور جو کچھ اس کے منہ میں آیا بکتی بھی گئی!۔

بعد کی داستان یہ ہے کہ یوسف میاں بحفاظت اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور کھانے بغیر گھر سے چلے گئے۔ اماں سکتے میں تھیں۔ باجی کی آنکھوں سے بے تعبیر خواب ٹکڑے ٹکڑے گر رہا تھا۔

روبینہ نے سب کچھ کہہ دیا تھا سب کچھ۔ اور اماں کے گلے لگ کر خوب روئی تھی: اماں۔ میری باجی۔ میری باجی نے۔ یہ کیا کیا۔ اماں!؟

مگر باجی کے سب پیار بھی نہ آنکھ میں آنسو!۔

سارا کا سارا آدھے گھنٹے میں ختم ہو گیا۔

پہر گزر گیا۔

تانتا ابھی تار رہا تھا۔

اور اب پھر وہی ٹھیک تھی۔ جہاں دوپہر کی اُتار کی دھوپ پھر ڈھلنے رہی تھی۔

بچے چٹائی دری پر بیٹھے تھے۔

باجی ان کے پاس آبیٹھیں۔ اور بولیں۔

"پڑھو بچو۔ آج ایک نیا سبق پڑھو!"

الف سے اللہ۔

ب سے بندہ۔

اور ت سے تقدیر۔

پھر انھوں نے گھٹنوں میں سر دے لیا!! و۔

مہمانوں کی ریل پیل

عبدالمجیب سہالوی

اگر آپ شہر کے آس پاس کسی دیہات کے رہنے والے ہیں اور آپ کو اتفاق سے شہر میں نوکری مل گئی اور آپ نے اپنی نادانی سے مکان شہر کے بیچ و بیچ میں مارکٹ میں لے لیا تو آپ یقین کیجئے کہ آپ کو اپنے مکان میں ریلوے پلیٹ فارم کا مزا آئے گا۔ جہاں بلا ٹکٹ مسافر مہمان کی شکل میں آپ کے گھر کو بڑی بے تکلفی سے اپنے گھر کے طور پر استعمال کریں گے۔

ان میں بھانت بھانت کے لوگ ہوں گے۔ کوئی شغل میں کا غذات کا استغاثہ مقدمہ کے سلسلے میں آئے گا۔ جو ناشتہ آپ کے یہاں کریگا دن بھر کچہری کی خاک چھانے گا اور شام کو جائے پلا کر اپنے گھر سدھار جائے گا۔ کوئی اپنی لڑکی کا جہیز خریدنے کی غرض سے مع بیگم کے بالبستر آئے گا اور آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو اپنے گھر میں مسافر کی طرح پلیٹ فارم پر رہنے کے لئے مجبور کر دے گا۔ اور خود آرام سے بستر پر لیٹے گا۔ ناشتہ کر کے دوپہر تک بازار میں خریداری کرے گا پھر کھانا کھا کر آرام کرے گا اور چار بجے چائے پی کر تازہ دم ہو کر خرید و فروخت کی مہم پر روانہ ہو جائے گا۔ واپسی پر تھوڑے سے کباب اور بے لگے پان لئے مسکراتا ہوا آئے گا اور بازار میں دوڑ دھوپ سے چور چور ہونے کی شکایت کرکے جلد ہی پرواز ہو جائے۔ یہ مہمان جب تک رہے گا گھر والوں کو اس کے ناشتے کھانے کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ خریداری میں اس کی ہمراہی بھی کرنی ہوگی۔ اور گھر آ کر اس کی خریدی ہوئی ہر چیز کی تعریف بھی کرنی پڑے گی۔ اس قسم کے مہمان کا قیام کم سے کم ایک ہفتے رہتا ہے۔ اس کی میزبانی سے گھر والے اتنے چور چور ہو جاتے ہیں کہ روانگی کے وقت ان کے اندر اتنی بھی سکت نہیں رہتی کہ کہہ سکیں۔

اب کب آئیے گا!

کچھ مہمان اپنی بیوی یا بچے کے علاج کی غرض سے آتے ہیں جو بستر وغیرہ سے پوری طرح لیس ہو کر آتے ہیں اور مریض کو دکھانے کے بعد آپ سے کرایہ کا کوئی مکان تلاش کرنے کی فرمائش کرتے ہیں جس کو پورا کرنا آپ کے بس سے باہر ہوتا ہے اور آپ بلا کرایہ اپنے یہاں ٹھہرانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

کچھ مہمان یکہ و تنہا ایک اٹیچی ہاتھ میں لئے تلاش روزگار میں آتے ہیں۔

بے چارے غم روزگار میں تھوڑا بہت ناشتہ کرکے گھر سے نکل جاتے ہیں اور دن بھر دفتروں کے چکر لگاتے رہتے ہیں معلوم نہیں دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں کہ نہیں خیال ہے کہ صرف چائے پر ہی گذارا کرتے ہیں کیونکہ واپسی پر اتنے نڈھال ہوتے ہیں کہ بات کرنے کے بجائے درخواستوں اور ڈگریوں کے فائل سرہانے رکھ کر چارپائی پر لیٹ جاتے ہیں اور اس طرح سو جاتے ہیں کہ کھانے کے وقت جگانے سے بھی بڑی مشکل سے اٹھتے ہیں۔ ہم ان سے ہمدردی رکھنے کے باوجود ان کی کوئی مدد نہیں کر پاتے اور وہ یہ خیال کرکے کہ تلاش روزگار کے لئے ہفتے دو ہفتے کیا مہینے بھی کم ہیں بیچارے دو ایک دن رہ کر بے نیل و مرام جیسے آئے تھے ویسے ہی واپس جاتے ہیں۔ اور اپنے ساتھ میزبان کو بھی غمزدہ کر جاتے ہیں۔

نصیب

(الکوکب کاظمی)

عائشہ سالگرہ پارٹی سے واپس آئی تو بہت تھکن محسوس کر رہی تھی اس لیے وہ کپڑے تبدیل کئے بغیر ہی لیٹ گئی تھی اور لیٹے لیٹے سوچ رہی تھی اگر اس کی بھی شادی ہوئی ہوتی تو اس کا بھی پیار کرنیوالا شوہر ہوتا، چاند جیسے بچے ہوتے، اپنا گھر ہوتا اور وہ بھی اپنے لڑکے کی خوب دھوم سے سالگرہ مناتی۔ کتنا اچھا ہوتا! مگر یہ سب خوشیاں اس کے نصیب میں کہاں تھیں؟ اس کی ساری خوشیاں تو ماں کی ضد پر قربان ہو گئی تھیں۔ ان کا کہنا تھا: میں اپنی بیٹی کی شادی ایسے لڑکے سے کروں گی جو میری لڑکی سے زیادہ پڑھا لکھا ہو گا یا کم سے کم میری لڑکی کے برابر ایم اے۔ بی۔ ایڈ۔ میری ایک ہی لڑکی ہے۔ میں نے اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا ہے۔ جب تک ایسا لڑکا نہیں ملے گا، ہرگز اپنی بیٹی کی شادی نہیں کروں گی"۔ مگر انھوں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کی یہ ذرا سی نادانی بیٹی کی زندگی برباد کر دے گی۔ دن آہستہ آہستہ برس بنتے گئے۔ بہت سے پیغام آئے مگر انھوں نے ہر پیغام کو ٹھکرا دیا۔

ایک دن عائشہ نے ڈرتے ڈرتے جاوید کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ ایم اے تک اس کا کلاس فیلو رہ چکا ہے۔ ایم اے کے بعد مجبوراً اس نے پڑھائی اس لئے چھوڑ دی تھی کہ اس کے والد بوڑھے ہو گئے تھے اور چاہتے تھے کہ بیٹا ان کا کاروبار سنبھال لے۔ مگر ماں نے اس رشتے کو بھی نامنظور کر دیا تھا انھیں کیا پتہ تھا کہ جاوید ان کی لڑکی سے بے حد پیار کرتا ہے اور لڑکی بھی جاوید کو دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہے اور دونوں نے مستقبل کے بڑے خوبصورت خواب سجا رکھے ہیں۔ عائشہ نے ماں کا جواب سنا تھا تو اس کے ارمانوں، خواہشوں اور تمناؤں پر بجلی سی گر پڑی تھی اور پھر اس نے سوچ لیا تھا کہ ماں کے جیتے جی ایسا کوئی رشتہ نہیں آئے گا جو انھیں پسند آ گئے۔ اس سے بہتر تو یہی ہوتا کہ وہ اتنی تعلیم ہی حاصل نہ کرتی جس نے اس کی خوشیوں اور خوابوں کے مستقبل کو تاریک کر دیا تھا۔ پھر وہ اندر ہی اندر ٹوٹ کر بکھر رہی تھی لیکن اس کے درد کو محسوس کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنے تمام ارمانوں کو اپنی ماں کی ضد کا کفن پہنا کر مایوسیوں کے مقبرے میں سُلا دیا تھا۔ اور صبر کی چادر اوڑھ لی تھی۔

عائشہ نے جب جاوید کو ماں کا فیصلہ سنایا تھا تو وہ پریشان ہو گیا تھا اور اس نے کہا تھا: "تم کب تک اپنی ماں کے فیصلے کا انتظار کرو گی؟ کیا تمھاری اپنی کوئی رائے نہیں؟ تم پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہو، اب تمھیں اپنی زندگی کے بارے میں کچھ سنجیدگی سے سوچنا چاہئے تم چاہو تو میں تمھیں آج ہی اپنا بنا سکتا ہوں"۔

مگر اس نے جاوید کی بات کو ٹھکرا دیا۔

"نہیں جاوید، میں تم سے محبت ضرور کرتی ہوں مگر میں اپنی محبت پر اپنے خاندانی وقار اور عزت کو قربان نہیں کروں گی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ساری زندگی کرتی رہوں گی مگر میں کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جو میرے خاندان، میرے بزرگوں کی عزت کے لئے باعثِ ذلت ہو۔

وقت دبے پاؤں گزرتا رہا تھا۔ اسی طرح آٹھ سال اور بیت گئے تھے۔ عائشہ کی جوانی بڑھاپے کی منزل کی طرف بڑھنے لگی تھی۔ سیاہ بالوں میں چاندی کے تار چمکنے لگے تھے۔ عارضوں کی سرخی، آنکھوں کی شوخی، چہرے کی تازگی باسی پھول کی طرح کملا کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی حسرتوں کی لاش اپنے کاندھوں پر اٹھائے زندگی کی خاردار راہوں پر بھٹک رہی تھی۔ وہ اپنے اندر ایک ایسی گھٹن محسوس کر رہی تھی جس کا کوئی نام نہ تھا۔ وہ زندگی کی طویل تنہائی سے گھبرا گئی تھی، اس لئے اس نے ماں کی مرضی کے خلاف اسکول میں نوکری کر لی تھی اور اس طرح اس نے اپنی تنہائی کو اسکول کی دیواروں میں قید کر دیا تھا۔

اسکول میں اس کی ملاقات فرزانہ سے ہوئی تھی جو بہت جلد اس کی دوست بن گئی تھی۔ فرزانہ، عائشہ کی کربناک زندگی سے واقف تھی، اس کے درد کو سمجھتی تھی۔ اس نے عائشہ سے کہا: "عائشہ اب تمھیں شادی کر لینا چاہئے۔ میں خالہ جان سے بات کروں گی"۔

"نہیں فرزانہ" عائشہ کی آواز درد میں ڈوب گئی تھی "نہیں

میری بہن تم نہیں جانتیں۔ میں نے اپنے تمام ارمانوں کو کب کا سُلا دیا ہے پھر اب تو میری عمر بھی اسی مقام پر ہے جہاں شادی کے بارے میں سوچنا بھی مناسب نہیں!"

"سب بکواس ہے"، فرزانہ نے غصہ سے کہا "یہ سب تمہارے سوچنے کا منفی انداز ہے"

ایک ہفتہ عائشہ کے لئے ایک بھولا بھٹکا پیغام آ ہی گیا لڑکے کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کا ذاتی کاروبار ہے اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے، یہ اس کی دوسری شادی ہے کیونکہ پہلی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ وہ جس لڑکی سے پیار کرتا تھا اس لڑکی نے کسی مجبوری کے تحت اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب کبھی شادی نہیں کرے گا۔ پھر والدین کی ضد سے مجبور ہو کر اس نے شادی تو کر لی لیکن وہ اپنی بیوی کو وہ پیار نہ دے سکا جس کی وہ مستحق تھی۔

چھ مہینے تک وہ اس بے رخی کا زہر پیتی رہی اور جب زہر برداشت سے باہر ہو گیا تو اس نے طلاق لے لی۔ پیغام لانے والوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ لڑکے کی تعلیم ایم اے ہے۔ اس لئے عائشہ کی امی نے تھک ہار کر یہ رشتہ قبول کر لیا، اور عائشہ نے بھی ماں کے فیصلے پر خاموشی اختیار کر لی، کیونکہ فرزانہ کی باتوں نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ یہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ اس کی ماں کی زندگی چراغ سحری کی طرح ٹمٹمانے لگی ہے۔ پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟ کیا وہ تنہا زندگی گزار سکے گی؟ کیا وہ ظالم سماج اور حالات کا مقابلہ کر سکے گی۔

شادی کا دن آ گیا۔ عائشہ کی سہیلی فرزانہ نے اسے دلھن بنا کر ڈولے میں بٹھا دیا اور وہ بابل کا گھر چھوڑ کر پیا کے دیس پہنچ گئی... انجان پیا کے گھر۔

آدھی رات کو جب عائشہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں تو حجلۂ عروسی میں کسی کے قدموں کی چاپ نے اسے چونکا دیا۔ اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

آہستہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا کوئی اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ وہ شرم سے کانپ اٹھی۔ اس نے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا اور جب اس نے اپنا چہرہ اوپر کیا تو وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

اس کے سامنے اس کا جاوید بیٹھا تھا۔ اس کا محبوب جاوید۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اور دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا سر جاوید کے سینے سے لگا دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ وقت کے فیصلے پر حیران تھی کیونکہ وقت نے اس کے حق میں جو فیصلہ کیا تھا، وہ اس کی سوچ سے بہت دور تھا۔

حریمی دسترخوان

مزیدار میٹھی چٹنی

سامان۔ شکر ایک کیلو۔ کشمش ۲۵۰ گرام۔ چھوارے ۵۰ گرام۔ سیب ایک کیلو۔ پیاز ۱۰۰ گرام۔ سرخ مرچ ۲۵ گرام۔ ادرک ۱۰۰ گرام۔ لہسن چار آنڈی۔ کچے آم کی کیریاں ۵۰۰ گرام۔ نمک اندازے سے۔

ترکیب۔ سیب چھیل کر باریک باریک قاشیں بنا لیں۔ اسی طرح کچے آم چھیل کر ان کے گودے کی قاشیں کر لیں۔ ادرک باریک باریک تراش لیں۔ لہسن کے جوئے چھیل کر رکھ لیں۔ پیاز کے لچھے کاٹ لیں۔ سرخ مرچ کوٹ کر شامل کریں۔

چھوارے کی گٹھلیاں نکال کر سروتے سے باریک باریک کاٹ لیں کشمش دھو کر صاف کر لیں۔

شکر کو دو لٹر پانی میں ڈال کر جوش دیں پہلے آم اور سیب کی قاشیں ڈال کر پکائیں جب وہ گل جائیں تو بقیہ چیزیں ڈال کر پکائیں۔ جب قوام گاڑھا ہو جائے تو اتار کر ٹھنڈی کریں اور مرتبان میں رکھ لیں سرکہ بھی ایک دو تل شامل کر لیا جائے تو چٹنی اور لذیذ و مفید ہو جائے گی۔ سرکہ ڈالیں تو اسے بھی ابتدا ہی میں ڈال کر پکائیں۔

سیدہ خانم (دہلی)

حریمی دسترخوان

کھانا پکانے کے فن پر اس صدی میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب۔ مرتبہ ادارہ حریم خانہ داری سے دلچسپی رکھنے والی ہر بہن کو یہ کتاب ضرور اپنے پاس رکھنا چاہیے۔

قیمت نو روپیہ

ناشیبہ

[illegible]

بہت ہوتا ہے۔

اور پھر اس افواہ کے پھیلنے میں [illegible] کا وقت صرف ہو گیا تھا۔ ویسے تو دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ لوگ تو منتظر ہی رہتے ہیں کہ بات کب ہونٹوں سے نکلے اور کانوں پہ چڑھے.....

احمد حسن کا شمار محلے کے معززین میں ہوتا تھا۔ اور یہ حقیقت تھا کہ ان محلوں میں ابھی تک عزت کا معیار [illegible] تھا۔ [illegible]

احمد حسن کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی...... اور سب سے پیاری تھی...

خاندان بھر میں صورت، سیرت [illegible] مشہور تھی..... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بہت [illegible] کے پاس دولت تھی۔ عزت تھی۔ [illegible]

[illegible]

کہ جب اس کی اس حرکت پر اسے طعن کرنا چاہا تو اس [illegible] سے [illegible] جاتی ... اس میں رسوائی کی کیا بات ہوگئی ... [illegible] ... پہلے بھی آئی تھی ... سب گھر سے ہم غصہ آئے تو کیا کرسکتے ہیں ...

اصلیت بھی کیسی بری تھی ... اور کیوں لے جائی گئی تھی ... اس کا [illegible] ... وہ نکل آیا تھا۔ حاجی رحیم الدین نے دونوں [illegible] کی صلح کروا دی۔ جائداد کی تقسیم پر بھی دونوں متفق ہوگئے ... اور دونوں گھروں میں صلح بھی ہوگئی تھی ...

حاجی رحیم الدین کی زبان میں کچھ ایسی ہی تاثیر تھی ... کہ لوگ ان کی باتوں کو ٹال نہ سکتے تھے ... وہ دھیمے دھیمے سے لہجے میں اس طرح باتیں کرتے کہ لوگوں کے دل میں اتر جاتیں ...

احمد حسن اور مرزا محمد کی صلح کی خبر بھی سارے محلے میں پھیل گئی ... لوگ حاجی صاحب کی اور زیادہ تعریفیں کرنے لگے ... ان کے عمل کو قابل ستائش سمجھنے لگے۔ اور حاجی صاحب اپنی تعریفیں سن سن کر اور بھی زیادہ عاجزی سے پروردگار کا شکر ادا کرنے لگے ...

مگر ایک مسئلہ اب ایسا پیدا ہوگیا تھا۔ کہ جس کا حل حاجی صاحب کے پاس بھی نہ تھا ... اور یہ تھا ... کہ بیٹی کے اس طرح جانے اور آنے کی وجہ سے اس کی سسرال والے شک میں مبتلا ہوگئے تھے ... انہوں نے بغیر سوچے سمجھے منگنی توڑ دی ... اور منگنی کیا ٹوٹی کہ سارے محلے ... خاندان اور برادری والوں کو نئی نئی باتیں بنانے کا موقع مل گیا ... جس کے منہ میں جو بات آئی کہہ دیتا ... روکنے والا بھی کون تھا۔ لوگ تماشا دیکھنے والوں میں تو آگے ہوتے ہیں ... کسی کی عزت بچانے میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے ...

احمد حسن تو جائداد کے ملنے کی خوشی بھی نہ منا سکا۔ جائداد اتنی منحوس ثابت ہوئی تھی ... کہ اس کے ملتے ہی انھوں نے عزت کھو دی تھی ... بیٹی کا رشتہ کھو دیا ... اور بدنامی کے دروازے ان کے گھر کی طرف کھل گئے ... وہی لڑکی جس کی گھر گھر تعریفیں کی جاتی تھیں۔ اب اس کی عزت بھی مشکوک سمجھی جانے لگی ...

محلے بھر سے اگر کوئی کبھی کبھی ہمدردی کرنے آتا تو وہ حاجی رحیم الدین کی بیوی تھی۔ جو رشتے میں ان کی بہن تھی ... وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ [illegible] ہے ... مگر لوگوں کی زبان کیسے پکڑتی ... پھر بھی دونوں بہن بھائی [illegible] دنیا سے [illegible] رہے تھے ... اس لئے حاجی رحیم الدین کے گھر والوں کی

خوشیاں عروج پر تھیں۔

ان کے نئے اور سب سے خوبصورت [illegible] والے مکان پر نئے سرے سے رنگ و روغن کیا جا رہا تھا ... [illegible] فرنیچر بھی خریدا گیا تھا ... نئے پردے لگوائے جا رہے تھے۔ یوں تو حاجی رحیم الدین کا کئی بار ارادہ ہوا کہ اب چونکہ وہ بہت پیسے والے ہوگئے۔ اس لئے انھیں بھی شہر سے باہر کسی جدید کالونی میں کوٹھی بنوا لینی چاہئیے ... مگر مشکل یہ تھی کہ وہ اسی علاقے سے کونسلر منتخب ہوئے تھے ... اپنی عزت چھوڑ کر وہ کسی اور جگہ کیسے چلے جاتے ... اس لئے اسی مکان پر زیادہ سے زیادہ پیسہ خرچ کرتے رہتے۔

[illegible] وقت میں بھی وہ رفاہ عام کے کام نہیں بھولتے تھے ... اور پھر احمد حسن وغیرہ جو ان کی بیوی کے بھائی ہوتے تھے ان سے ہمدردیاں بھی قائم تھیں ... اور اسی لئے وہ اپنے ہر ملنے جلنے والے سے احمد حسن اور اس کی بیٹی کی ہر ممکن تعریف ضرور کرتے ... بدنام کرنے والوں پر بھی لعن طعن کرتے رہتے ...

بیٹوں کے آ جانے سے وہ بہت زیادہ مصروف ہوگئے تھے۔ لوگ ان کی دعوتیں کر رہے تھے ... اور حاجی صاحب ہر جگہ اپنے بیٹوں کے ساتھ بڑے فخر سے جاتے ... بلکہ [illegible]

بلکہ انھیں دنوں میں وہ ان دونوں کے رشتوں کے لئے بھی بڑے بڑے گھروں کی تلاش میں تھے۔

ان کے ایک دوست ڈاکٹر تھے ... جنھوں نے اپنی پریکٹس کے دوران بڑی دولت اور شہرت کمائی تھی ... [illegible] تھی ... شہروں کی کئی جگہوں پر ان کی جائداد بھی بن گئی تھی ... حاجی صاحب دراصل انہی کی بیٹیوں سے اپنے کسی بیٹے کی شادی کرنا چاہتے تھے ... ان کو صرف اپنے بیٹوں کے بولنے کا انتظار تھا ... آج کل وہ ادھر کچھ زیادہ ہی آ جا رہے تھے ... ابھی بات پکی تو نہ ہوئی تھی ... مگر حاجی صاحب خوش تھے کہ اتنے بڑے گھرانے والے ان کے سوال پر غور کرنے کی حامی تو بھری تھی۔

انہی دنوں احمد حسن کی علالت کی خبر انھوں نے سنی ... عیادت کو گئے ... تو احمد حسن پر بڑا ترس آیا ... اس سے ہمدردی بھی کی ... گھر آ کے بہت سے پھل وغیرہ اس کے لئے بھجوائے ... بیوی کو بھی ہدایت کی ... کہ وہ روزانہ نہ سہی ہفتے میں دو چار بار ضرور ہو آیا کرے ... اب انھوں نے احمد حسن کی ہمدردی میں کوئی ٹھوس قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا ...

[illegible] کے بعد اہل محلہ ان کے یہاں جمع ہوا کرتے تھے۔

جب میں وہ محلے بھر کے مسائل حل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ مسائل کیا حل ہوتے... یہ تو دراصل ایک طریقہ تھا... جس سے لوگ ان کی طرف متوجہ رہتے تھے... ان کے یہاں چائے بھی اور دعوت چلتے تھے... اور ان کی مدح سرائی کرتے تھے... آخر کو وہ اس علاقے کے [illegible] تھے... تمام لوگوں سے ان کا رابطہ بھی ضروری تھا... اور یہ بڑا خوبصورت طریقہ تھا...

اس بار حاجی صاحب نے سوچا تھا کہ اس محفل میں صرف احمد حسن اور اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ذکر ہوگا۔ لوگ کہتے تھے کہ حاجی صاحب کی زبان میں بڑی تاثیر ہے... اب تو انہیں بھی اس تاثیر کو آزمانے کی ضرورت ہے۔ کہ اس سے ایک گھر کی روٹھی ہوئی خوشیاں واپس آسکتی ہیں۔ ایک لڑکی کی کھوئی ہوئی عزت بحال ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے اچھا رشتہ آنے کی امید ہو سکتی ہے... اور اس سے بڑی اور کیا خدمت خلق ہوگی؟ بلکہ اس جلسہ کے متعلق حاجی صاحب نے خاص طور پر بیوی کو ہدایت دی تھی... کہ چائے کا انتظام خاص طور پر اچھا ہونا چاہیئے... آج میں نے زیادہ لوگوں کو بلا رکھا ہے"۔

بیوی نے دبے لفظوں سے کہا...

"لوگ کہیں گے... یہاں دو دو لڑکے ہیں... لائق شریف بھی ہیں۔ خاندان برادری بھی۔ ایک ہے... پھر خود کیوں نہیں کر لیتے...؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...؟ کہاں احمد حسن کا معمولی گھرانا اور کہاں میرے بیٹے... بی بی کچھ تو جوڑ میل کرو..." حاجی صاحب کو غصہ آتے آتے رہ گیا...

"خود ہی کہتے ہو غریب امیر کا فرق مٹ جانا چاہیئے اور خود ہی..."

"بیوی! ایسی باتیں نہ کرو... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں... میں نے بڑی مشکل سے یہ عزت بنائی ہے۔ میں چاہتا ہوں بڑے گھروں میں بیٹوں کی شادیاں کروں۔ انسان کو ترقی کرنا چاہیئے نہ کہ پستیوں کی طرف جائے... یہ ٹھیک ہے۔ تاکہ اپنے گھر کی بیٹی ہے... اس کے لئے کوشش تو کر رہا ہوں... انشاءاللہ اچھا رشتہ مل جائے گا..." حاجی صاحب نے بیوی کی بات کاٹ دی... بیوی بیچاری کیا کہتی چپ ہو رہی... پھر حاجی صاحب [illegible] ہو چکی ہے... ورنہ ہم خود کر لیتے... [illegible] ڈاکٹر رفیق کا گھرانہ بہت بڑا ہے۔ آج میں نے ان لوگوں کو بھی بلایا ہے۔"

سننے کی تاب [illegible] ساتھ ہی [illegible] گے... میں [illegible] ہوں... وہ بھی [illegible] واقف ہوں... حاجی صاحب [illegible] تصور سے ہی [illegible] ہو گئے۔ مگر بیوی زیادہ خوش نہ تھی... اسے اپنے بھائی کا [illegible] خیال آرہا تھا... اور وہ افسردہ سی دعوت کی تیاریوں میں لگ گئی...

حاجی رحیم الدین کی بڑی سی بیٹھک میں بہت بڑا اجتماع تھا۔ انہوں نے آج کہہ کہہ کر لوگوں کو بلوایا تھا... باہر صحن میں چائے کی میزیں لگی تھیں... اور حاجی صاحب مسرور انداز میں لوگوں سے اپنے مخصوص لہجے میں حال احوال پوچھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے... ان کے بیٹے بھی بڑی سعادت مندی سے اُن کا ہاتھ بٹا رہے تھے... ڈاکٹر صاحب بھی حاجی صاحب کے ساتھ ہی آئے تھے... اور لوگوں سے ان کی تعریفیں سن سن کر بہت خوش نظر آرہے تھے۔

جب سب لوگ آچکے... تو حاجی صاحب نے اپنے مخصوص لہجے میں پہلے تو چند مسائل پر لوگوں کی توجہ دلائی... رائے پوچھی... اور پھر اپنے مطلب پر آگئے... اور بڑی توجہ اور بڑے گہرے لہجے میں احمد حسن کے مقدمے سے لے کر بیٹی کے رشتے تک تمام معاملہ لوگوں کے گوش گزار کر دیا... لوگ دم بخود اُن کے دھیمے دھیمے لہجے میں دل میں اترنے والی باتیں سن رہے تھے۔ کچھ لوگ جنہوں نے اس بدنامی میں حصہ لیا تھا... نادم ہو رہے تھے... جنہوں نے حصہ نہ لیا تھا وہ دل میں بُرا بھلا کہہ رہے ہوں گے... مگر بظاہر سب ہمہ تن گوش اور حاجی صاحب کے ہم خیال تھے... اور ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے... سارا مسئلہ گوش گزار کرنے کے بعد آخر میں حاجی صاحب نے آنسو بھری آنکھوں سے سب حاضرین [illegible] کر ڈالا...

"تو میرے بھائی! ہم سب کے یہاں بیٹیاں ہیں... اور محلے کی ہر بیٹی سب کی بیٹی ہے... ہماری ایک بیٹی کی خواہ مخواہ میں بدنامی ہوئی ہے سب جانتے ہیں کہ وہ بے قصور ہے... مگر [illegible] ہم اپنے بیٹوں کے لئے [illegible] کا رشتہ [illegible] نہیں [illegible] جب دوسرے لوگ [illegible] کے لئے آجاتے ہیں ان کو شکوک [illegible] ڈال دیتے ہیں... [illegible] کیا قصور ہے...؟ [illegible] آپ سب [illegible] جو اس کی مدد کرنے میں پہل کرے گا... [illegible] ہے... ہمارا فرض ہے کہ اپنے بھائی کی مشکل حل کریں... وہ ہم سب کی

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... سے رہے تھے۔ پھر

[illegible] صاحب کی [illegible] سنائی دی۔۔

"حاجی صاحب! ہم دونوں آپ کی اور آپ کے بیٹوں کی [illegible] ہیں۔۔۔ [illegible] بیٹے ہم اپنے دل میں بسا کر رکھتے ہیں۔"

[illegible] صاحب نے جانب قلب کی۔

[illegible] اجازت دی گئی ... کہ [illegible] حاجی صاحب نے اپنے قدموں سے چل کر آنے کی کوشش [illegible] ... ان کے بیٹے ہی انہیں سہارا دے کر [illegible] رہے تھے۔ شور بھی اتنا [illegible] حاجی صاحب کا بیٹا تھا ... ایک نے [illegible] کی [illegible] جن کی قسمت مکمل ہو گئی تھی۔۔۔

[illegible] اور بے ہوشی کی درمیانی کیفیت میں تھے۔ [illegible] ... کہہ دیا ... عمر کا یا [illegible] میں بہت عمر میں ہو جاتا ہے۔ جلدی ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔

[illegible] ... جب سب لوگ چلے گئے ... تب حاجی [illegible] ... نہیں تھی ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب نے [illegible]

[illegible]

آپ کے بیٹے [illegible]

[illegible]

[illegible] مدد کرتے۔

دوسرے [illegible] نہیں کرتے [illegible] آپ کی عزت رکھ لی۔ : بیوی نے سمجھانے کی کوشش کی۔

[illegible]

[illegible] حاجی [illegible] کا غصہ بڑھ گیا [illegible]

ابا! آپ کے بعد [illegible] ... اتنی وقت تھی ... [illegible] لگ کر رہ گئے ... پھر جب آپ نے پوچھا اور کوئی [illegible] ... اس پورے [illegible] ... اور [illegible] کر آپ کی بات [illegible] حاجی صاحب [illegible] باپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم نے کبھی [illegible] کر دیکھا۔؟" حاجی صاحب نے اسی [illegible] میں پوچھا۔

"نہیں ابا ... وہ تو پردہ کرتی ہے۔!!"

"بس تو پھر بیٹا تو نے وہ مقام پا لیا ... جسے پانے کی میں کوشش کیا کرتا تھا ... اور [illegible] وہ مقام پا گیا ... لیکن [illegible] کے بارے میں [illegible]": حاجی [illegible] نے کہا ... لیکن پھر [illegible] ایسی [illegible] ... [illegible] سے [illegible]۔

[illegible] بہت [illegible] ہے ... ہماری قسمت کی خوبی ہے کہ وہ ہمارے گھر میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

بالآخر

تحریر: [illegible] — کراچی

"تمہیں کیوں چپ لگ گئی ہے آخر؟"

"کچھ نہیں ——— بس یونہی!"

"ہاں ہاں ——— یونہی تو کبھی کوئی بات نہیں ہوتی ہے۔ ——— اب یہ سامان پٹخنا چھوڑ دو اور ڈھنگ سے بیٹھ کر بات کرو ——— سمجھیں!" ——— میں نے اپنے بڑے پن کا استعمال کیا ——— اور وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی ——— پھر کافی دیر کی تکرار کے بعد اس نے چپکے چلانے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

"بات صرف اتنی ہے آپا ——— میں دور رہ کر دیکھنا چاہتی ہوں کہ وقار کے بدلتے مزاج کے باوجود ہم دونوں اس گھر کی چھت کے نیچے ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے ہیں یا نہیں!"

بات یہی تھی کہ جس سن سی ہو گئی۔ ایسے میں ننھی سنبل نے جاگ کر رونا شروع کر دیا اور سمن لپک کر اس کی طرف دوڑی۔

سمن نے اپنے رونے سے آج پھر مجھے چونکا دیا تھا ——— یہ اس کی بچپن کی عادت تھی۔

چار بھائیوں کی لاڈلی چھوٹی بہن ہونے کے ناطے اس کے مزاج میں ایک ضدی پن پیدا کر دی تھی۔ جس بات کی وہ ضد پکڑ لیتی ——— اس کی اس عادت سے سب ہی واقف تھے [illegible]

[illegible]

اس کی اسی [illegible] عادت نے انہیں اکثر پریشان کیا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس وقت [illegible] کیا جیسے [illegible]

[illegible] ساتھ اعلان کیا کہ وہ ایک [illegible]

اس موقع پر اپنے چہیتے بھائیوں کی [illegible] تھی ——— [illegible] بھائیوں پر [illegible] ——— وہ انہیں بڑا روشن خیال سمجھتی تھی ——— لیکن وہ بالکل ہی [illegible] اس میں بھی اپنے دادا [illegible] کی [illegible]

اور تب اس نے بڑے سوچ بچار کے بعد سب کے سامنے ایک تجویز رکھی۔

"آپ لوگ میری [illegible] بالکل [illegible] اگر کام نہ بنا تو [illegible] اور [illegible] ہو جائے تو [illegible] بات کو [illegible] کے لئے اس کی یہ تجویز مان لی گئی۔ [illegible]

اس نے [illegible]

[illegible] ——— اور پھر اس کی [illegible] کے [illegible]

گھر میں [illegible] خاموش ہو گئے کہ حالات اسے اپنے فیصلے پر [illegible] مجبور کر دیں گے۔ اور جب وہ گھر سے نکلی تو [illegible] کرنا پڑا ——— [illegible]

اپنی ذات کو منوانے اور [illegible] ایک [illegible] کے چہرے [illegible]

——— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ایک دن وہ بھی آیا کہ ثمن کے آگے اس کے خواستگاروں کی قطاریں لگ گئیں ———

اس نے مجھے خط لکھا۔

"مجھے ان سے کوئی مطلب نہیں!"

سننے والے حیران رہ گئے۔

اور مجھے حیرت ہوئی کہ آنکھوں میں بہت تشویش کے ذرے بن کر ابھری۔ ——— ایسے میں نگاہ انتخاب مجھ پر پڑی کیونکہ ثمن بچپن ہی سے مجھ سے بے تکلف رہی تھی۔

ایک طویل نشست کے بعد آخر میں اس نے کہا تھا۔

"جب میری نظر میں کوئی اور نہیں ہے تو پھر زید ——— بکر ——— سے کیا فرق پڑے گا ——— اس لئے تصویروں سے انتخاب کرنا میرے خیال میں بے اعتمادی کی دلیل ہے ——— آپ سب کا انتخاب ہی میری پسند ہوگا۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ ایک لمحے کو مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا۔

لیکن جب میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو سچ ہی سچ لکھا تھا ——— اس لمحے مجھے اپنی ذات بہت چھوٹی لگی اور میں سوچنے لگی کہ کسی کو سمجھنا کتنا مشکل ہے کہ ہم اپنی اپنی عینک سے دوسروں کو دیکھتے ہیں اور ان کی شخصیت کا تعین کرتے ہیں۔

یوں ایک بار پھر ثمن نے مجھے چونکا دیا تھا۔

پھر ایک مدت آئی۔

اک مدت بیتی۔

اور ثمن ایک ذمہ دار افسر ——— ایک فرض شناس بیوی اور پھر ایک شفیق ماں بن گئی ——— لیکن ادھر کچھ عرصے سے وہ جھلائی جھلائی سی نظر آتی۔ کئی بار وقار نے بھی اس بات کا مجھ سے ذکر کیا تو میں اسے سمجھاتی رہی کہ سنبل کی وجہ سے پریشان ہوگی۔ سوچا تھا کسی روز وقت نکال کر ثمن کے پاس جاؤں گی تفصیل سے بات چیت ہوگی۔ میں ارادہ ہی کرتی رہ گئی اور ایک روز صبح ہی صبح وقار آ پہنچے۔

وقار کو غیر متوقع طور پر پریشان دیکھ کر میرے ہاتھ ہی پھول گئے۔

"خیریت تو ہے وقار آج دفتر نہیں گئے؟"

"جی نہیں!" ——— اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میرا دل اور بھی پریشان ہو گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ تیزی سے بولا۔

"جاتا بھی کیسے ——— آپ کی بہن صاحبہ نے جینا حرام کر رکھا ہے میرا ——— میں تو پچھتا رہا ہوں یہ شادی کر کے ——— اس نے تو گھر کو بھی اپنا دفتر سمجھ لیا ہے ———" وہ پھنکارتا ہوا بولا۔

"آخر ہوا کیا؟ ——— کچھ بھی تو ——— بات کیا ہوئی؟"

"کیا کیا بتاؤں ——— وہ تو آج کل ذرا ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے ——— آج صبح ہی کا میرا موڈ خراب کر دیا ——— مجھے آفس کو دیر ہو رہی تھی کہنے لگی جب تک میں تیار ہوتی ہوں آپ بچی کو سنبھالئے ——— میں نے صرف اتنا ہی کہا کہ یہ میرا کام نہیں ہے ——— بس یہ کہنا غضب ہو گیا۔ وہ تو شیرنی بن کر میرے پیچھے پڑ گئی ——— اور بجائے شرمندہ ہونے کے نکلے جانے کی دھمکی دے دی ——— کچھ بعید نہیں کہ اب تک گھر سے نکل بھی چکی ہو۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ جو سما جائے اس کے دماغ میں کر بیٹھتی ہے ———" میں نے بے اختیار کہا۔ اور جس طرح بیٹھی تھی اسی طرح میں وقار کے ساتھ گاڑی میں جا بیٹھی۔

گھر پہنچے تو وقار نے گاڑی ہی میں بیٹھے رہنا پسند کیا۔ میں نے بھی گھر چلنے پر اصرار نہ کیا۔

کمرے میں داخل ہوئی تو ثمن چہرے پر اک جامد سکوت لئے تیزی سے ضروری چیزیں بیگ میں ٹھونس رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑی تو چونک گئی ——— اور ایک جبری استقبالی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولی ———

"آئیے ——— آئیے!"

میں دو قدم بڑھا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے میرے سراپے سے بھانپ لیا تھا کہ بلا ارادہ نہیں اٹھ آئی ہوں بلکہ لائی گئی ہوں ——— اسی لئے وہ بے نیازی سے سامان سمیٹنے میں لگی رہی۔

مجبوراً میں خاموش بیٹھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرنے لگی اور ثمن تھی سنبل کو سلانے کی کوشش میں مصروف ——— پھر میرے کہنے پر اس نے بچی کو آیا کے سپرد کیا تو میں نے موقع غنیمت جانا اور بات چھیڑ دی۔

"میں نے سوال کیا کہ آخر یہ نوبت کیوں آئی؟" اور پھر اس نے جائزہ لینے کے انداز میں کمرے میں نظریں دوڑائیں اور مطمئن سی ہو کر بیٹھ گئی۔

اب تو حاتی بن آئی ــــ وقار پہلے تو کچھ میری بات سمجھ جاتے تھے ــــ ہر معاملے میں تعاون کرتے تھے اب جبکہ تعاون کی زیادہ ضرورت ہے تو ان کے مزاج ہی نہیں ملتے !ــــ

"یہ تم کیسے کہتی ہو ؟"

"اب یہی دیکھئے تاکہ سنبل کی بیماری کی وجہ سے میں نے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی ــــ لیکن بار بار تو نہیں لے سکتی۔!ــــ ان سے اتنا نہیں ہوتا کہ کم از کم میری موجودگی میں ہی بچی کو دیکھ لیں۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتے، انھیں اپنے فیشن سے ہی فرصت نہیں ملتی تو بچی سے کیا مطلب رکھیں گے ٹھیک ہے میری بچی ہے میں خود سنبھال لوں گی مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے"

وہ پورے جوش سے اپنی وکالت کر رہی تھی۔ اور جب وہ اپنے دل کا غبار نکال چکی تو ممی نے بڑے تحمل سے کہا۔

"ممن !ــــ آج تو تمہاری [illegible] کا کوئی سر پیر ہی میری سمجھ میں نہیں آ [illegible] کی دیکھ بھال کے لئے وقار دفتر چھوڑ کر گھر میں بیٹھ جائیں ــــ کیا اس کا یہی مطلب ہے ؟"

"میں کب کہتی ہوں وہ دفتر چھوڑ دیں !" اس نے تیزی سے جواب دیا۔

"تو پھر ؟"

"تو پھر ــــ وہ یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں دفتر چھوڑ دوں!" بے ساختہ ممن کی زبان سے نکلا ــــ اور وہ یوں گھبرا گئی جیسے کمان سے تیر نکل گیا ہو !!

والدین توجہ کریں

از بیگم جنگ

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں اگر ذرا بھی فرق آجائے تو گھر کا نظام خراب ہو جاتا ہے۔ مرد اگر گھر کا محافظ ہے تو عورت گھر کی چوکیدار ہے۔ جس گھر میں میاں بیوی کی نااتفاقی ہو وہ گھر دنیا ہی میں دوزخ کا نمونہ ہوتا ہے۔ اچھے ساتھی کے ساتھ ہر کوئی گزارہ کر لیتا ہے۔ برے انسان کے ساتھ نباہ کرنا بڑی بات ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی اولاد کی تباہی کا بھی باعث بنتی ہے۔ جو گھر لڑائیوں کی آماجگاہ ہو وہاں بچوں کی ذہنی صلاحیتیں تباہ ہو جاتی اور انھیں ابھرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اولاد کا مستقبل سنوارنے اور ان کو زندگی کی درست راہیں دکھلانے میں ماں باپ کا برابر کا ہاتھ ہونا چاہیئے جن والدین کے خود رات دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہیں گے اور ان میں اختلافات رہیں گے تو بچے کیسے درست ہو سکیں گے بچے اسی لئے باغی ہوتے اور گھر سے دور بھاگتے ہیں بچوں کو سارے سبق گھر ہی سے ملتے ہیں۔ اگر ماں صرف یہ سوچ کے اس کا کام کھانا پکانا کپڑے دھونا اور رشتا ہے اور باپ یہ سوچ لے کہ مجھے صرف کمانا ہے۔ دونوں بچوں کی نگہداشت نہ کریں تو بچے کیسے درست ہو سکتے ہیں۔ بچے کی پہلی درسگاہ ماں کی گود اور مدرسہ گھر ہے۔ اگر اس گھر کی بنیادیں ہی کمزور ہوں تو یقیناً بچے تباہ ہو جائیں گے۔ جن میاں بیوی میں اختلافات رہتے ہیں ان کے بچے ہمیشہ ذہنی الجھن میں گرفتار رہتے ہیں صرف ماں تنہا اپنے بچے کی تربیت نہیں کر سکتی جو والدین بچوں کے سامنے جھگڑتے رہیں گے۔ ان کے بچے کبھی ان کی عزت نہ کریں گے۔ بچوں کو سچ بولنے کی تلقین کی جاتی ہے اور ماں باپ برابر جھوٹ بولتے ہیں تو بچے کیسے سچ بولیں گے۔ بچے اپنے وطن کے سپوت ہیں قوم کے معمار ہیں اگر ان کی تربیت صحیح طور پر نہ ہو تو اس کے نتائج خطرناک برآمد ہو سکتے ہیں

[illegible]

[illegible]

[illegible] رہنا پڑا ہو گی۔ وہ اس طرح کہ ایک دفعہ ہمارے ہاں ایک جوان
خاتون تشریف لائیں۔ والدہ صاحبہ نے ان کو [illegible]
[illegible] کا کام [illegible] تک
[illegible] تمام وقت
وہ خاتون ہمیں دیکھ کر مسکراتی رہیں [illegible]
کوئی دو پہر [illegible] ہمارے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] آواز
[illegible] نکلتی [illegible]
[illegible] خود [illegible]
[illegible] بلند ہوا۔ [illegible]
[illegible] انھیں ہماری دماغی صحت
مشکوک نظر آنے لگی تھی۔

وہ خاتون [illegible] کر رخصت ہوئیں اور ہم والدہ
صاحبہ کے [illegible] تسلیم ہو گیا تھا، [illegible] زور
سے [illegible] ہم نے سر جھکا لیا۔
[illegible] ایسا [illegible] کیا [illegible] کو روتا ہوا
[illegible] ہنسی آیا [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] اس سے پہلے [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔ دلہن نے
[illegible] سامنے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کی
بے ہنگم آواز کے ساتھ [illegible] کے دو
اسکوٹر اسٹارٹ ہو گئے [illegible] ہم اس
غیر متوقع پروگرام کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ ایک دم چونکے۔
پھر ہمارے [illegible] عجیب سی آواز نکلی [illegible] ہم نے نہیں
سنی [illegible] معلوم ہوا کہ [illegible] کے آگے جو ہم
نے بند باندھنے کی کوشش کی تھی اس کی وجہ سے نئی قسم کی آواز
پیدا ہو رہی تھی۔

بزرگ خاتون نے شاید ہمیں دلہن کی عزیز دوست سمجھا۔ پہلے
انھوں نے دلہن کو ایک ہاتھ سے پیچھے کی بائیں طرف لیا اور پھر دوسرا
ہاتھ ہمارے گھٹنوں میں حائل کر کے ہمیں دائیں کندھے سے لگانے کی
کوشش کی۔ ہم نے گھبرا کر اپنا رخ اور گھٹنوں میں دے لیا۔ اور منہ
[illegible] گستاخانہ [illegible] ہنسی کی [illegible]
[illegible] مصروف ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد جب پٹرول ختم ہوا اور
دونوں کے اسکوٹر رکے تو ہم نے بھی رفتہ رفتہ اپنی سانس پر قابو
پاتے ہوئے سر اٹھایا [illegible] پر نظر پڑی تو [illegible]
[illegible] ہم نے گھبرا کر [illegible] جائزہ لیا [illegible]
[illegible] سال [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جب آپ کے بچے مہم جو ہو جائیں

بیگم عطیہ ہدایت اللہ

ایک بچہ جب اپنی عمر کا پہلا سال مکمل کرے تو سمجھ لیجئے کہ وہ مہم جوئی کے دور میں داخل ہو گیا ہے اپنا گھر اس کے لئے دنیا سے کم نہیں وہ اس دنیا کو سر کرنے کا بیڑہ اٹھا لیتا ہے۔ نئے نئے راستے دریافت کرنا چاہتا ہے اس کی بے چینی اور تجسس کا جذبہ انتہا کو پہونچ جاتا ہے اس کی مہم جوئی کی انتہا نہیں رہتی اسی پر بس نہیں وہ اپنی ہر حرکت اپنی ماں پر جتانا چاہتا ہے کہ وہ زمانے لد گئے جب وہ ایک کھلونا تھا ماں نے جہاں چاہا بٹھا دیا۔ جو چاہا کھلا دیا۔ اب وہ رنگ برنگی دنیا کو اپنے ننھے منے قدموں سے تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ ہر چیز کو چھو کر اور اٹھا کر محسوس کرنا چاہتا ہے۔ وہ ماں کو یہ بھی باور کراتا ہے کہ اس کی اپنی ایک شخصیت اور حیثیت ہے۔ اس کے اپنے احساسات اور پسند ناپسند ہیں۔

اس عمر میں بچے کی غذائی عادات میں بھی تبدیلی آنے لگتی ہے۔ ناپسندیدہ کھانے پر ناک بھوں چڑھا لیتا ہے۔ اُسے احتجاج کرنا آجاتا ہے۔ وہ اپنے پسندیدہ مشغلے، پسندیدہ جگہ اور پسندیدہ شخص کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ اچھی بُری بات اور لوگوں کے رویوں کے متعلق خوش ہونا یا احتجاج کرنا جاننے لگتا ہے۔ جو حرکت یا چیز اور شخصیت اُسے پسند نہ ہو اس کے متعلق وہ زبانی یا جسمانی حرکات و سکنات سے اظہار کر سکتا ہے۔ بیچارہ یہ اس کی متوازن افزائش کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ بچے کی مرضی کا اظہار اس کی دماغی صلاحیتوں کے بڑھنے کی طرف اشارہ ہے۔

اگر ماں باپ اس دوران بچے کا حد سے زیادہ خیال رکھیں۔ کسی بھی چیز کے چھونے یا کام کرنے پر نہیں، نہیں کی آوازیں نکالیں خود چوبیس گھنٹے اس کی مدد پر کمر بستہ رہیں اس کے پیچھے پیچھے پھریں تو بچہ نارمل شخصیت اختیار کرنے کے بجائے ایک پالتو جانور کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے۔ بچے کو تجربات کرنے دیجئے لیکن اس کے ساتھ اس کو خطرات سے بچانا والدین کا فرض ہے اگر مائیں تھوڑی توجہ دیں تو اپنے مہم جو بچے کو خطرناک قسم کے حادثات سے بچا سکتی ہیں ایک ناتجربہ کار ماں یہ جاننے کہ بچے کو نقصان پہونچانے اور بعض اوقات جان لیوا حادثات کون کون سے ہیں تو وہ ایک بہت بڑے خطرے سے بچ سکتی ہے۔ اپنے بچے کو گھٹنوں چلتے یا پاؤں پاؤں چلتے دیکھنا ایک دل خوش منظر ہے لیکن چند ہی دن بعد ماں بچے کی توڑ پھوڑ اور ہر چیز میں ہاتھ ڈالنے کی عادت سے پریشان ہو کر چلّانے لگتی ہے۔ ہر بات پر مت چلائیے پہلے ان چند حادثات سے واقفیت حاصل کیجئے جو عمر کے اس مرحلے میں آپ کے منے کے لئے متوقع ہیں۔

سر فہرست بجلی سے چلنے والی چیزیں ہیں جو جان لیوا حادثات کا پیش خیمہ ہیں۔ بچے اکثر سوئچوں میں انگلی ڈالتے یا تاروں کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں اس لئے دیواروں پر نیچے بنے ہوئے سوئچ ہولڈروں، بٹنوں، بجلی کی چیزوں وغیرہ پر سلوشن ٹیپ لگا دیں۔ ایسے بلب ہولڈر جو بچوں کی رسائی میں ہوں انھیں خالی مت چھوڑ دیں۔ ان میں فوراً بلب لگا دیں۔ لیمپ، استری ہیٹر وغیرہ اونچی جگہ پر رکھیں سوئچوں کے سہارے بھاری فرنیچر گھسیٹ کر ڈال دیں۔ دوسری بات یہ کہ بچے کو اونچی کرسی یا میز وغیرہ پر اکیلا مت بیٹھنے دیں تجوری کی طرح ہمیشہ اس کی پہونچ سے دور رکھیں۔ جس میز یا کارنس پر نیچے کو لٹکتے ہوئے میز پوش پڑے ہوں، انھیں وہاں سے ہٹا دیں اکثر بچے چیزوں کی کھوج میں میز پوش کا کونہ کھینچ کر چیزوں کو اپنے اوپر گرا لیتے ہیں۔ کچھ عرصے کے لئے ڈریسنگ ٹیبل پر سے نیل پالش، نیل پالش ریموور، سینٹ کلون، کاجل، مسی، لپ اسٹک اور تیل کی شیشیاں ہٹا دیں۔ ان میں ایسے کیمیائی اجزا شامل ہوتے ہیں جو بچے کے منہ میں ڈالنے پر مضر ثابت ہو سکتے ہیں اکثر گھروں میں دوسری منزل پر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوتی ہیں۔ والدین کو چاہئے بچے کو کسی حادثے سے بچانے کے لئے فی الفور اوپر اور نیچے چھوٹے گیٹ بنوا لیں۔ جہاں تک ممکن ہو انھیں بند رکھیں۔ اگر اوپر کی چھت پر کھڑکی ہو تو اس پر فوراً سلاخیں لگوا لیں۔

ایک ہوشیار اور جیدار مصروف ماں کھانا پکاتے یا گھر والوں کے

کے لئے [illegible] لگواتے وقت بچے کو باورچی خانے یا کھانے کی میز کے اطراف میں کبھی اکیلا نہیں چھوڑا۔ [illegible] میں پیار سے رغ ہونے پر پانی ڈالتے وقت [illegible] وقت بچے پر گرم کھی کے چھینٹے پڑ سکتے ہیں۔ [illegible] آپ کے باورچی خانے میں چولہے نیچے بنے ہیں تو بچہ اس پر دھری ہانڈی یا دودھ یا چائے کا پانی اپنے اوپر انڈیل سکتا ہے۔ بچہ کر [illegible] ہاتھ بڑھانے جاتا ہے کہ آپ تصور نہیں کر سکتے اس لئے جب [illegible] پتیلیاں، فرائی پان اور کڑاہی وغیرہ رکھیں تو اسکے ہینڈل دیوار کے رخ پر پھیر دیں۔

بہتر ہو گا کہ باورچی خانے میں کام کرتے وقت بچے کو اس کی کرسی یا کاٹ میں مقید کر دیں یا کسی کی نگرانی میں دے دیں۔ ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھیں جب بھی میز پر چائے یا کھانے کے برتن لگائیں۔ اور بچہ کہیں آس پاس موجود ہو تو چائے دانی اور سالن کے ڈونگے میز کے بالکل درمیان میں رکھیں۔ اسی طرح جلتی ہوئی موم بتی، لالٹین، تیل کے چولہے اور لیمپ بھی ہمیشہ اونچی جگہ پر رکھیں۔ چھوٹا بچہ ہر چیز اٹھا کر منہ میں ڈالنے کا شوقین ہوتا ہے چاہے وہ کتنی ہی بد ذائقہ اور کڑوی کیوں نہ ہو اس لئے کھیلنے کے لئے اسے بٹن، کانچ کی گولیاں، سوئیوں کا ڈبہ، لوبیا یا مٹر کے دانے، موتی یا پھولوں، سبزیوں کے بیج وغیرہ بھول کر بھی نہ دیں۔ کھانے کے لئے جوار کے دانے، مونگ پھلی، چلغوزے یا کانٹے والی مچھلی بھی مت دیں۔ کیونکہ یہ چیزیں بڑی آسانی سے سانس کی نالی میں اٹک کر جان لیوا ثابت ہو سکتی ہیں۔ بچے کے منہ میں پنسل، قلم یا کوئی بھی نوکیلی چیز دبی ہو تو بھاگتے دوڑتے یا چلتے وقت وہ کسی چیز سے ٹکرا کر اس کے حلق میں گھس سکتی ہے۔ کسی بہانے سے نوکیلی چیز اس سے لے لیں۔

بچے کو کھلی ہوا میں کبھی مت نہلائیں۔ بند غسل خانے میں موسم کے لحاظ سے پانی کا درجہ حرارت دیکھ کر اسے نہلائیں۔ اس وقت بٹنگ والا [illegible] وغیرہ ہٹا دیں۔ پانی کی گرمی کو اپنی انگلیوں سے محسوس کر لیں [illegible] ٹھیک [illegible] اٹھائیں اور دیگر پانی کی بالٹی فرش پر کھلی چھوڑیں۔ ہو سکتا ہے پانی بہت گرم ہو اور [illegible] کی نازک [illegible] جلس جائے۔ جب [illegible] باورچی خانے میں کام ختم کریں تو چاقو، چھری، ماچس اور [illegible] کو اونچی جگہ پر چھپا کر

رکھ جائیں۔ کیونکہ چھوٹے بچے تو اپنی جگہ رہے بڑے بچے بھی ان چیزوں سے کھیلتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔

اگر گھر میں کنواں، تالاب یا جوہڑ ہو تو اسے ڈھکنا مت بھولیں شیشے یا چینی کے برتن ٹوٹ جائیں یا کھی کے کنستر پر سے ڈھکنا کاٹیں تو اسے ادھر ادھر ہرگز پڑا نہ رہنے دیں۔ فوراً ضائع کر دیں اسی طرح استعمال شدہ بلیڈ بھی پھینک دیں۔ اتنے چھوٹے بچے کو کبھی بھی پالتو یا آوارہ کتے یا بلی کے نزدیک مت جانے دیں بچے جانوروں سے والہانہ پیار کرتے ہیں۔ وہ اس کا اظہار ان کے منہ میں ہاتھ ڈال کر آنکھوں میں ناخن چبھو کر یا دم اور بال کھینچ کر کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں جانور ان کو پنجے مارتے یا کاٹ کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بچے کی زندگی کے دوسرے سال میں ہر پانچ حادثوں میں ایک حادثہ زہر خوردنی کے نتیجے میں پیش آتا ہے بچہ ہر چیز کا مزہ چکھنا اپنا فرض اولین سمجھتا ہے اس ضمن میں اس کے ہاتھ گولیاں، طاقت کی دوائیں، گرائپ واٹر، بھوک بڑھانے والی ادویہ، کھانسی کی دوا اور شوگر کوٹیڈ گولیاں لگتی ہیں۔ بچے سگریٹ کے ٹوٹے اور ماچس کے مسالے چوسنے میں بھی مزہ لیتے ہیں۔

یہی وقت ہے جب ایک سمجھدار ماں اپنے گھر کا جائزہ لیتی ہے ہر طرح کی دوائیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھتی ہے۔ برتن دھونے فرش صاف کرنے پودوں اور مچھر، مکھی پر چھڑکنے والے محلول کو محفوظ جگہ پر رکھتی ہے۔ برتن چمکانے والے لوشن، بوٹ پالش، روشنائی کی دواتیں، سگریٹ کے پیکٹ، تمباکو وغیرہ کو بھی حفاظت سے رکھتی ہے۔ دواؤں کی شیشیوں پر لیبل لگوالیں تاکہ بچے کو دیتے وقت جلدی میں کسی غلطی کا امکان نہ رہے۔ علاوہ ازیں بچے کو کھیلنے کے لئے دوا یا گولیوں کے سربمہر ڈبے یا بوتلیں دینے سے گریز کریں چاہے وہ کتنی ہی سخت بند کیوں نہ ہوں۔

ماں کو ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے بچے کی عمر کے اس خطرناک عبوری دور میں گھر میں ڈی۔ ڈی۔ ٹی۔ [illegible] گولیاں، [illegible] وغیرہ کی گولیاں ڈالنے سے چوکی رہیں۔ اکثر گھروں میں چوہوں کو مار بھگانے کے لئے کالی خطرناک دوا (جو تیز ترین زہر ہے) اور گولیاں وغیرہ کھانے کی چیزوں میں ملا کر کونے کھدروں میں ڈال دی جاتی ہیں۔ اکثر چھوٹے بچے ان کو اٹھا کر منہ میں ڈال لیتے

بچا اسی طرح ان دوسری خالی شیشیاں اور ڈبے وغیرہ ادھر ادھر مت پھینکیں۔ اس کے علاوہ پیٹرول، مٹی کا تیل، موبل آئل، تارپین کا تیل، سرسوں کا تیل، کسٹرآئل، دواؤں، کھرکیوں کے پینٹ، وارنش وغیرہ بھی بچوں کی پہونچ سے دور رکھیں۔ میزوں پر سے ایش ٹرے، گلدان، آرائشی اشیاء وغیرہ ہٹا دیں۔ نچلے خانوں میں سے قیمتی کتابیں ہٹا کر بے کار رسالے کتابیں رکھ دیں تاکہ بچہ انھیں پھاڑ کر اپنی خوشی پوری کر لے اور آپ کا نقصان نہ ہو۔ باورچی خانے کی نچلی درازوں اور سائیڈ بورڈوں سے کھانے پینے کی چیزیں، ڈبے اور چینی کے برتن اوپر کے خانوں میں رکھ دیں۔ نچلے خانوں میں پتیلے، کڑاہیاں، فرائی پان اور ڈھکنے، کٹورے وغیرہ رکھ لیں۔ تاکہ بچہ ان کے ساتھ کھیلے، انھیں نکال کر باہر بکھیرے۔ اس کی تسکین بھی ہو اور آپ کو کلفت نہ ہو۔ ڈریسنگ ٹیبل اور الماریوں کی نچلی درازوں اور خانوں میں پھٹے پرانے کپڑے کھلونے خالی ڈبے اور کاغذ وغیرہ بھر دیں۔ تاکہ بچہ انھیں نکال سکے۔ دوبارہ ٹھونس سکے۔ اور اس کھیل میں بہت دیر مشغول رہے۔ اس طرح وہ اپنے تجسس اور مہم جوئی کے جذبے کی تسکین بھی کرے گا اور آپ کو کسی قسم کا تردد نہیں کرنا پڑے گا۔

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہو سکتی ہے جو ولادت، شادی اور انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اور نمبر خریداری کے ساتھ روانہ کی جائے۔ جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع کی جاتی۔ یہ خبر کی اشاعت میں کسی بھی غلطی کا ادارہ حریم ذمہ دار نہ ہوگا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کر دی جائے گی۔

ولادت اطفال کی خبریں

• سائرہ انور۔ نسیرہ انور (آمبور) ہماری آپا نسیرہ اختر اور بھائی اختر حسین (ویلور) کے گلشن حیات میں ۱۱ مئی ۸۳ء اللہ تعالیٰ نے ایک چاند سی بیٹی عطا فرمائی۔ نام سمیرا نشاط قرار پایا۔ اللہ پاک عمر دراز بخشے۔

• مس ماجرہ یوسف (بنج۔ کچھ) میرے چاچا آدم صاحب اور چاچی شیریں صاحبہ کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۵ مئی ۸۳ء بروز پنجشنبہ ۱۰ بجکر ۴۰ منٹ پر دن میں ایک بیٹی عطا فرمائی۔ نام مہرین آدم رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے۔

• شاہدہ نسیم (کلکتہ) میری پھوپھی زاد بہن تنویر شاہ عالم کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۳ جولائی ۸۳ء کی شام کو ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر دراز بخشے۔

• شاہدہ ناز (آمبور) ہماری بڑی بہن راحیلہ اسد کو اللہ پاک نے ۲۲ اپریل ۸۳ء کو ۸ بجے شب میں ایک چاند سی بیٹی عطا فرمائی۔ نام فرین اسد قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل عطا فرمائے۔

• میرے بھیا ڈاکٹر لقمان پرویز اور بھابھی ڈاکٹر بلقیس ریحانہ کو اللہ پاک نے ۲۰ مئی ۸۳ء کو ایک خوبصورت بیٹی عطا فرمائی۔ نام نصرت امین تاند رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر دراز بخشے۔

• فضیلت بیا رحمانی (حیا گھاٹ۔ بلاسپور) میری نند فرحت آرا اور نندوئی محمد بلند اختر کو اللہ پاک نے دوسری بار ۱۹ اپریل ۸۳ء کو دن میں ۹ بجکر ۱۰ منٹ پر ایک چاند سا لڑکا عطا فرمایا۔ نام محمد سفیان اختر عرف کاظمی قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر خضر عطا فرمائے۔

• ناز مسعود (کلکتہ) میرے بھائی منصور احمد اور بھاوج ماجرہ منصور کو اللہ پاک نے ۲۴ مئی ۸۳ء بروز اتوار بوقت ۹ بجے شب پہلی بار ایک چاند سی بیٹی عطا فرمائی۔ نام غنچہ منصور قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے۔

پیغامات نشاط

• محمد حنیف صاحب مالک حنیف بکڈپو (ناگپور) کے فرزند انصاری اصغر جمیل سلمہ اور ناظم انصاری صاحب کے فرزند فضل احمد فضلی کی شادیوں کے سلسلہ میں دعوت ولیمہ اور خورشید انور انصاری سلمہ (فرزند محمد حنیف صاحب) و کنیز فاطمہ سلمہا (بنت محمد علیم الدین انصاری صاحب) کے عقد سعید کی تقاریب ۲۰ مئی ۸۳ء بوقت ۸ بجے شب بحسن و خوبی انجام پائیں۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• سیدہ اختر النساء بیگم اور محمود النساء بیگم (بڑودہ) ہمارے سب سے چھوٹے بھائی وقار احمد عبد القادر پیرزادہ کی شادی خانہ آبادی نور جہاں سلمہا (بنت سید شوکت علی صاحب مرحوم) کے ساتھ بمقام لہری پورہ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• حور جبیں (رہت۔ نوادہ) میری پیاری آپی خریدار حریم رعنا خاتون صاحبہ کی شادی سید فصاحت حسین صاحب (فرزند جناب سید سعادت حسین) کے ساتھ ۲۴ اپریل ۸۳ء کو نہایت سادگی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• فریدہ الطاف (آمبور) میری چچازاد بہن بتول سلمہا (بنت سی محمد اکبر صاحب) کی شادی میرے چچازاد بھائی امتیاز احمد سلمہ، بی ٹیک (فرزند جناب سی محمد خلیل الرحمٰن) ۱۱ مئی ۸۳ء کو بمقام آمبور بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• عبد الجبار (عابد منیر صاحب) اسلام پور۔ آسنسول کے فرزند ثانی خورشید انور سلمہ کی شادی ہمراہ عزیزی عشرت جہاں سلمہا (بنت عبد الحفیظ انصاری صاحب ساکن بیتل جیبی۔ مدھوپور) ۱۱ جون ۸۳ء کی شب میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• بہن مسز عظیمہ اکرام کے فرزند ڈاکٹر محمد مرتضیٰ سلمہ (فرزند ڈاکٹر حکیم محمد اکرام صاحب مرحوم) کی شادی توصیف سلطانہ سلمہا ایم۔ اے (دختر

نیک اختر بر دخیر ایم. ایم فضل اللہ صاحب مرحوم) کے ساتھ ۱۲ جون سنہ ء کی شام بمقام ہوٹل اٹلانٹک مدراس، بحسن و خوبی انجام پائی۔ بہن عظیمہ صاحبہ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ (نسیم انہونوی)

• جانکی ناتھ اہلووالیا مالک اہلووالیا بکڈپو۔ دہلی کے فرزند راکیش کی شادی سیلا (دختر جناب دیا بھوشن) ۹ جون سنہ ء کو بمقام بناری داس اسٹیٹ مارکیٹ دہلی بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

انتقالِ پرملال کی خبریں

• میرے پڑوسی حاجی عبدالکریم صاحب، جو عرصہ سے قلبی مرض میں مبتلا تھے۔ ۲۱ جون کی صبح انتقال فرما گئے۔ مرحوم بڑے متقی پرہیزگار اور پابند صوم صلوٰۃ تھے۔ مرحوم کا شمار محلے کے معتبر اشخاص میں تھا۔ ایک کنبے کے سرپرست تھے اور کنبہ پروری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے اللہ پاک ان کی مغفرت کرکے اور ان کی بیگم، تمام بیٹوں بیٹیوں اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

• نزہت سیدہ بانو صاحبہ نے حیدرآباد سے اطلاع دی ہے کہ ان کے والد محترم میر سجاد علی صاحب ۱۵ مئی سنہ ء بروز ہفتہ مطابق ۲۰ رجب، بوقت ۹ بجے صبح انتقال فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم متعلقین کو صبر جمیل دے۔ محترم بہن مسز سجاد علی صاحب کی خدمت میں بصد افسوس تعزیت کرتا ہوں۔ اللہ پاک انھیں اس صدمہ کو برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (نسیم انہونوی)

• عائشہ تسنیم (گرگشوری) افسوس ہمارے ماموں جناب عبدالقادر (ایم۔ ایس۔ سی علیگ) ۲۷ مئی سنہ ء بروز جمعرات حرکت قلب بند ہو جانے سے کراچی میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم پاکستان کے مشہور صحافی تھے۔ طلبا کی صحت سے بڑی دلچسپی تھی۔ گرگشوری میں بھی مرحوم نے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی بنیاد رکھی تھی۔ جو ترقی پر گامزن ہے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو غریق رحمت کرے اور متعلقین کو صبر جمیل دے۔

• مسز ثریا حمید (میسور) افسوس میرے بہنوئی محمد یونس صاحب ۶ مئی سنہ ء کو اچانک قلبی دورے کے سبب اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• کشور مصباح (کانپور) افسوس میرے میا سسر کے لڑکے محفوظ احمد ولد مسعود احمد یتیماہ کی علالت کے بعد ۹ جون سنہ ء پونے گیارہ بجے شب میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کی شادی کو ابھی صرف دو ہی سال ہوئے تھے۔ ان کی نشانی دس ماہ کا ایک بچہ ہے۔ اللہ پاک ان کی جوان بیوہ فرزانہ بہن والدین اور دیگر متعلقین کو صبر دے اور مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔

• ضمیر الحق شمسی سلمہٗ ایڈوکیٹ (چھم چھم گلی۔ آگرہ) کی تحریر سے علم ہوا کہ ان کے والد الحاج انوار الحق صاحب، جون سنہ ء کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مرحوم انوار الحق صاحب سے میرے بھی تعلقات تھے۔ آگرہ میں ان کی شخصیت اکابرین میں شمار ہوتی تھی۔ میں بھی مرحوم کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ (نسیم انہونوی)

آزمائش کیجئے

مرسلہ: بیگم ہوشیار جنگ

۱۔ لیموں کے رس میں شہد ملا کر پینے سے موٹاپا کم ہوتا ہے۔

۲۔ لیموں کے رس میں بالائی شامل کرکے لگانے سے آنکھ کے نیچے کی سیاہی دور ہوتی ہے۔

۳۔ لیموں کے رس میں خشک آملہ کا سفوف ملا کر بالوں میں لگانے سے بال گھنے اور دراز ہوتے ہیں۔

۴۔ تولہ بھر شہد میں دو ماشے سونٹھ کا سفوف ایک ماشہ سیاہ مرچ کا سفوف ملا کر صبح شام چاٹنے سے بلغمی کھانسی دور ہوتی ہے۔

چار نئے پاکستانی ناول

نسیمہ	بیگم معشوق علی	۲۴/-
گورے کالے لوگ	مینا ناز	۲۴/-
نسرا	خمیسہ نقوی	۲۲/-
انا گھر	یاسمین صوفی	۲۳/-

عوام کا اقتدار

غریب اب بے سہارا نہیں رہے

اتر پردیش کی ترقی کی گذشتہ دو برسوں کی کہانی بھر کھنڈا گاؤں کے دینو جیسے غریب ہریجن اور اسکے جیسے کروڑوں غریبوں کی ترقی کی کہانی ہے

آج سے دو سال قبل بھر کھنڈا گاؤں میں دینو اور اس کا خاندان بے روزگاری سے پریشان تھا۔ ڈاکوؤں کا دور دورہ تھا اور اس کی روزمرہ کی ضرورتوں کی چیزیں، جیسے مٹی کا تیل اور چینی مہیا نہ ہوتی تھیں۔ چینی تو اس کے گاؤں کا دوکاندار حاصل کرکے شہر میں ہی فروخت کر دیتا تھا۔ اس کے گاؤں کا ٹیوب ویل بند پڑا تھا۔ بجلی نہ ہونے سے گنے کی کاشت گاؤں میں بند کر دی گئی تھی کیونکہ حکومت نے گنے کی کم قیمت کا اعلان کر دیا تھا۔ جس کے نتیجہ میں کاشتکاروں کو کافی گنا جلانا پڑا، کیونکہ اس کا کوئی خریدار نہیں تھا۔

اس کے گاؤں کو صرف ایک پگڈنڈی جاتی تھی اور اسپتال کے متعلق کوئی بات ہی نہیں کرتا تھا۔ اس کے گاؤں کے بچوں کی تعلیم میں دشواری تھی، کیوں کہ شرپسند لوگ اسکول چلنے ہی نہ دیتے تھے۔ اس کے گاؤں کا ایک لڑکا گذشتہ دو سال سے امتحان نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی درجے میں تھا۔

دو سال کا وقت مختصر ہے، لیکن دینو کی حالت اب بدل رہی ہے اس کے گاؤں میں حال ہی میں پردھان کا چناؤ ہوا ہے۔ دس برسوں بعد گاؤں کے منصوبہ کے بارے میں دیہی ترقی افسر نے اس سے معلومات حاصل کی ہیں، کیونکہ منصوبہ اب ضلع میں ہی بنے گا۔ اس کی امیدوں کے مطابق بھر کھنڈا امداد باہمی نے اسے اب چینی اور مٹی کا تیل دینا شروع کر دیا ہے۔ اس کے ٹیوب ویل کو بجلی مل رہی ہے، کیونکہ بجلی کی پیداوار کا نشانہ، صوبے میں جولائی ۱۹۸۱ء

میں ۲۷ فی صدی تھا اور اب بڑھ کر فروری ۱۹۸۲ء میں ۴۰.۷ فی صد ہو گیا ہے گذشتہ سال صوبے میں جو ساڑھے پندرہ سو ٹیوب ویل بنے ہیں، ان میں سے دینو کے گاؤں میں بھی ایک لگا ہے۔ ۸ ہزار کلومیٹر سڑکیں اور ۱۲۲ نئے پل صوبے میں تقریباً گذشتہ دو برسوں میں تعمیر ہوئے ہیں۔

دینو کے گاؤں کی سڑک پر بھی تعمیر کا کام شروع ہو گیا ہے اور اس کی نامزد آراضی اس کو پھر مل گئی ہے۔ ناجائز قبضہ کرنیوالے لوگوں پر مقدمے چلائے جا رہے ہیں سنا ہے کہ اس میں ان کو نئے قانون کے تحت دو سال تک کی سزا ہو سکتی ہے۔

دینو کے گاؤں میں گنا پھر بویا جانے لگا ہے، کیونکہ گنے کی قیمت اب ۱۷ روپیہ پچاس پیسے فی کوئنٹل مل رہی ہے۔ جبکہ ۱۹۷۹ء میں ۱۳ روپیہ تھی۔ گنا اب ملیں بھی خرید رہی ہیں اب اسکا خاندان رات کو سو سکتا ہے۔ کیونکہ صوبائی حکومت کی کوششوں سے سبھی بڑے ڈاکوؤں کے گروہ، جیسے چھوی رام، مستقیم، ارجن پاسی، رادھے، سنتوشا، صاف ہو گئے ہیں اس کے گاؤں کے لڑکے ایک بار پھر تعلیم حاصل کرنے میں لگ گئے ہیں، کیونکہ تعلیمی اوقات میں اب باقاعدگی ہو گئی ہے۔

اس کے گاؤں میں دیہی ترقی منصوبے اور مشترکہ دیہی ترقی منصوبے کے تحت نئے روزگار کے مواقع فراہم ہیں یہ کہانی دینو کے گاؤں بھرکھڑا کی ہی نہیں، بلکہ صوبے کے کروڑوں عوام کی کہانی ہے۔ صوبائی حکومت کی گذشتہ دو برسوں کی کوششوں کے نتیجے اب ملنے شروع ہو گئے ہیں۔

غریبوں کی موافقت ہمارا نصب العین ہے

شائع کردہ:- محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش سرکار

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم کے سالانہ خریداروں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے بشرطیکہ شعر ہمارے عنوان کے تحت ہو، موزوں اور معیاری ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح روانہ کیا جائے کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں وصول ہو جائے۔ ۲۰ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے اشعار شامل نہیں ہو پاتے۔ ہر ماہ کا شعر علیحدہ علیحدہ کاغذوں پر لکھا جانا ضروری ہے اگست کے لئے عنوان ہے دوست اور ستمبر کے لئے موسم۔ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

مرسلہ:۔ عصمت آرا (بانکا)

کیسے کریں شکایتیں ہم آسمان کی

سر پر گری ہے اینٹ خود اپنے مکان کی

مرسلہ:۔ قرۃ العین (نندیال)

ہلال عید سر آسماں نظر آیا

سرور و عیش و طرب کا نشاں نظر آیا

مرسلہ:۔ ایس فہمیدہ (کرنول)

وہ قیامت اٹھائے پھرتے ہیں

آسماں آج زیر پا نہ ہوا

مرسلہ:۔ نجم السحر (کرنول)

ہوئی ہم سے یہ نادانی تری محفل میں آبیٹھے

زمیں کی خاک ہو کر آسماں سے دل لگا بیٹھے

مرسلہ:۔ خالد حسین قریشی (بیتول)

خاک کے ذروں میں حسن کہکشاں پیدا کرو

اس زمیں کی پستیوں میں آسماں پیدا کرو

مرسلہ:۔ ایس۔ ایم امجد (بھٹکل)

نہ میں زمیں کے لئے ہوں نہ آسماں کے لئے

مرا وجود ہے پرواز لامکاں کے لئے

مرسلہ:۔ محمد رضا رضا (بھٹکل)

زمیں کی راحتیں تم کو مبارک   مرسلہ:۔ کشور سلطانہ

نظر میری تو سوئے آسماں ہے   (دال باغ۔ لکھنؤ)

آسماں نے ستاروں کے موتی لٹائے

حضور ہیں، دنیا میں تشریف لائے

مرسلہ:۔ شہناز بیگم (بنگارا پیٹ)

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

مرسلہ:۔ سرمدی خانم (میسور)

مرسلہ:۔ کوثر جہاں (پٹنہ)

خریدار نمبر ۱۴۱۰۔ نمبر ۱۲۷۳ اشعار موزوں نہیں تھے۔

کے اور بھا سے لڑ جھگڑ کے وہ پانچ چھ سیر کے برتن خریدے تھے۔!"

"یہ میں کچھ نہیں جانتی۔" بیگم نے بدستور کرارے لہجے میں کہا۔ "میرے برتن مجھے مل جائیں شام تک۔ جیسے دیے ہیں اس سے واپس لیجیے۔ ورنہ سنبھالیے اپنا گھر۔ میں چلی بھائی میاں کے پاس۔ لو صاحب ہم تو تن من کا پسینہ جوڑ کے گرہستی جوڑیں۔ اور گھر کے مالک گرہستی پر جھاڑو پھیریں۔ آپ کو تو کوئی فقیرنی ہی ملتی جو خود بھی ہتھیلی پر رکھ کر چاٹتی اور آپ کو بھی پتے ہی میں چٹاتی تبھی مگن رہتے! اب دھری اٹھائی چیز اچھی نہیں لگتی گھر پھونک تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ بڈھے ہو گئے۔ مزاج کی نوجوانی نہ گئی۔"

"ارے قسم کھاتا ہوں بھائی تمھیں یقین کیوں نہیں آتا۔ مجھے ایسا کیا گزرا سمجھتی ہو کہ بن تمھاری کوئی چیز اٹھا کے کسی اور کو بخش دوں گا۔ نوشینہ سے پوچھا۔ شاید وہی لے گئی ہو۔ کہہ رہی تھی کہ امی یہ گول گول چمکدار پتیلی مجھے دے دو۔ چائے کے لیے دودھ اسی میں گرم کروں گی۔"

"بس جی بس۔" بیگم زیادہ چیخ گئیں۔ "میری بچی کا نام نہ لینا۔ وہ آپ کی چیز کی بھوکی نہیں ہے۔ خدا رکھے حمید میاں خود ہزاروں کما رہے ہیں۔ وہ خود پچاس پتیلیاں خرید کے خیرات کر دیں۔ آپ کی ایک پتیلی پر میری بچی کی نیت کیوں بدلتی۔!"

"تو پھر اب میں چپ رہوں۔" ابا جان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کہو تو حلف اٹھا لوں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

اسی وقت جیلہ نے ایٹم بم ان پر پھینک مارا: "ابا جان ہمارے گھر میں فرزند کو ... کر دیا تھا۔ ... ریڈیو ... ٹرانسسٹر ... کوئی ..."

(باقی آئندہ)

کیا اسی طرح قمیص پاجامے میں؟"

"اتار کے چلوں؟!" انھوں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"دوسرے کپڑے پہنیے۔" وہ بھنائی۔

"ارے میں اسی طرح ٹھیک ہوں۔ تم البتہ تھوڑی سی کالک منھ پر مل لو چمک رہی ہو۔ ہر ایک گھورتا ہے۔"

"اچھا بس۔ خوشامد نہیں۔ مجھے فی الحال اپنی ہی چیزیں خریدنی ہیں۔ آپ کے لیے شرٹ کے ایک پیس کی بھی قیمت نہ نکال سکوں گی۔"

اور دوسرے دن صبح سویرے کیفی کے سامنے پہونچتے ہی پتہ چل گیا کہ صورت حال کچھ اور تھی!۔

دروازے پر شاید محلے ہی کے چند افراد کھڑے نیچی آوازوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ دیوار سے لگا گہوارہ رکھا تھا۔ دو تین آدمی آخری مراسم کی تکمیل کی خاطر دوڑ دھوپ کر رہے تھے! غضنفر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس پر افسوس یا تعجب کرنا بیکار ہے لیکن اب ان دو لاوارث لڑکیوں کا کیا حشر ہوگا۔ کیا وہ اپنے مرحوم باپ کی وصیت فراموش کر کے اپنے ددھیالی عزیزوں کے یہاں چلی جائیں گی۔ ان کی گزر بسر کا کیا ذریعہ تھا۔ یہ تو انھوں نے پوچھا ہی نہ تھا!

ایکا ایکی صاحب ان کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ چہرہ بجھا افسوس زدہ

بنا رکھا ہے۔ لہذا غضنفر کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بولے۔

" بڑے خود دار اور غیور تھے سید صاحب۔ مرتے مر گئے مگر کیا مجال کر اپنی بانی ہاتھ سے دی ہو۔ کسی کا احسان لینا تو انھیں گوارا ہی نہ تھا۔ اجی صاحب۔ ایک حد تک یہ خود داری بھی پسندیدہ چیز ہے۔ مگر اعتدال سے گزر کر وہ صفت بھی مرض بن گئی تھی۔!"

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا جناب: غضنفر نے کہا۔

میرا آنا جانا تھا سید صاحب کے یہاں: وہ حضرت بولے: ان کا دبست بہا تھا میں۔ ہزاروں سے کہا کر جناب اس خانگی نیکٹری کی ملازمت سے آپ کو گنتی بوٹی پے تھوڑے کے سوا حاصل کیا ہوتا ہے۔ آپ کو میں اپنے آفس میں سرکاری ملازمت دلوا دوں گا۔ مگر کہنے لگے کہ نہ تو مجھے آپ کا مرہون منت ہونا پسند ہے اور نہ اس جگہ کی سرکاری نوکری۔ وہاں ان کے چچا زاد بھائی ڈائریکٹر تھے۔!"

" دوسری کوئی جگہ سرکاری نوکری نہیں تھی؟"

آپ کی باتیں صاحبزادے۔ ارے کیا پچاس برس کی عمر میں بھی سرکاری ملازمت ملتی ہے۔ وہ تو ان کے چچا زاد بھائی کی مروت تھی مگر سید صاحب نے ایک نہ مانی۔ بس دو سو روپلی پر پڑے رہے یہ تک مرحوم نے خیال نہ کیا کہ سامنے دو دو لڑکیاں ہیں۔ آخر ان کے مستقبل کے لیے بھی تو کچھ چاہیے اب معلوم نہیں۔ ان کے پاس کچھ اندوختہ ہے کر کڑا وقت آ گیا ہے۔ خدا جانے۔"

اسے کبھی اصغر صاحب۔ ایک چکر قبرستان کا اور لگا لیا۔ کسی نے

کیا ہوگا۔ گھر میں تھوڑی اس کے پر لگ جاتے؛

لونڈے سے پوچھو: ابا جان چیخے۔

اوپر کے کام کے لیے ہاتھ بھر کا لڑکا۔ نیا نیا نوکر رکھا گیا تھا۔ اس سے خوب کس کے پرسش ہوئی۔ وہ قسمیں کھا گیا۔ رو یا چیخا۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ بیگم کی عدالت سے فیصلہ صادر ہو گیا۔ نگوڑا ابھی فوراً سے نکلا چور ہے۔ نکالو گھر سے۔

اور غریب ہانک دیا گیا۔ تیس روپے تنخواہ اور دو وقت کے کھانے سے مارا گیا۔ غضنفر کے ضمیر نے پہلے پہل بہت احتجاج کیا۔ پھر بے چارہ چپ ہو رہا۔ کہاں تک پہنچے جاتا۔ اس کے بعد گھر میں ایک اور قیامت ٹوٹی۔ امی کو اپنے اسٹیل کے چمکیلے برتن کم دکھائی دیے۔ انھوں نے زمین آسمان ایک کر دیے۔ صاف اپنے میاں کو چور ٹھہرایا۔

میں تھوڑی دیر کے لیے اندر کمرے میں مر گئی ہوں گی۔ آپ کو موقع ملا بس کسی جھاڑ پھونکے کو دے دیے ہوں گے۔ وہ آتا ہے نا ایک فقیر۔ صورت موا منحوس۔ کیا نام فتح اللہ خاں، اس پر ان کی بہت جان جاتی ہے۔ وہی لے گیا ہوگا۔ بیٹے کی۔ میں کہے دیتی ہوں۔ میرے دو بھگونے اور رکابیاں اور گول چائے کی چمکدار پتیلی شام تک نہ ملی تو پھر دیکھنا۔ پھونک دوں گی یہ غارت گیا سامان بھی؟

ہائے ہائے۔ خدا سے ڈرو بیگم: ابا جان گھگھیائے تھے: میں نے تمھارے برتن دیکھے بھی نہیں۔ انھیں چھونا تو درکنار۔ بھلا میں تمھارے شوق کی چیزیں کسی کو کیوں اٹھا کے دے دیتا۔ کیا میں جانتا نہیں کہ تم نے پیسہ پیسہ جوڑ

دوسرے ان صاحب کو مخاطب کیا۔

دیکھ آیا ہوں۔ مولانا۔ ظہر کے وقت تک قبر تیار ہو جائے گی۔ اصغر صاحب نے جوابی ہانک لگائی۔ پھر وہ کچھ دیر تک اور دھوپ کھایا کیے۔ جب ان میں کچھ گرمی آ گئی تو دوسرے حاضرین میں جا بیٹھے۔ مختصر سے لوگ تھے۔ اور نجانے محلہ پڑوس کے خیال سے اپنے کون کون سے کام حرج کر کے جمع ہو گئے تھے۔ بہر حال وہ سب باہر بیٹھے تھے۔ اور انہی میں غضنفر بھی آ ملے۔ ان کا رہ رہ کر دل چاہ رہا تھا کہ وہ گھر میں گھس کے ان دونے بس بہنوں کا حال دیکھیں انھیں تسلیاں دیں۔ ان کے آنسو پونچھیں۔ مگر وہ دل پر جبر کیے بیٹھے رہے۔ لوگ رائی سے پہاڑ بناتے ہیں۔ کسی نے اگر پوچھ لیا کہ جناب آپ ہیں کون۔ کسی نے کچھ الٹا سیدھا سوچ لیا تو پھر۔ پھر انھیں خیال آیا ہو گا۔ کیا انھوں نے ایک موہوم سی آرزو بھی نہ کی ہوگی کہ کاش۔ اس وقت رات والا اجنبی ہمدرد ہمارے پاس ہوتا؟ مگر ان کی ہمدردی اور اپنائیت کا وقفہ کتنا چھوٹا سا تھا۔ جو بے شک ان کے دل پر لازوال نقش چھوڑ گیا ہے مگر۔ ان لڑکیوں پر۔؟ کون جانے۔ آدمی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جو وہ دوسرے کے دل کا حال جان سکے۔! اور آدمی تو وہ مجبور اور خود فریب مخلوق ہے جو خود اپنے دل کا حال بھی نہیں جانتا۔

سردی کے دن تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دن ڈھل گیا پھر جنازہ اٹھنے کا پر ہول شور گونجا۔ کچھ لوگ جنازہ باہر لائے۔! سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ غضنفر نے بھی جیب سے رومال نکال کر سر پر لپیٹا اور آگے بڑھے۔!

بھی ان کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ ڈولی تو دہلیز تک چلی

نے ابھی تک جتنے کام کیے تھے۔ وہ سب ایسے ہی تھے جیسے کوئی ناسمجھ بچہ اس غبارے میں ہوا بھرے جس میں سوراخ ہو چکا ہو۔

مسجد میں ان کا نکاح کہکشاں سے ہوا تھا۔

انھوں نے اس کے پرانے محلہ کو خیرباد کہا۔

اپنے ایک دوست کے مکان میں ایک کشادہ کمرہ کرایہ پر لیا اور مع بیگم اور سالی کے اس میں آباد ہو گئے!۔ بہت خوش تھے۔ کہکشاں کے لیے کسی قسم کا خطرہ باقی نہ رہا۔ انھیں ذہنی آسودگی ملی۔ اگر جہنم نما گھر سے نجات گھبراتا تو کہکشاں کی محبت بھری آغوش بہشت بریں سے کیا کم تھی۔ وہ صحیح معنوں میں مثالی لڑکی ثابت ہوئی۔ اس کی ادھوری تعلیم ہی نے اس کے ذہن کو جلا بخش دی تھی۔ نہایت سنجیدہ، شگفتہ اور ذہین باتیں کرتی۔ خانہ داری میں اسے کمال حاصل تھا۔ ایک ہی کمرہ اس نے پورا گھر بنا رکھا تھا۔ ہر چیز صاف ستھری، ہر جگہ پر موجود۔ آنکھ بند کر کے اٹھا لو۔ غضنفر نے باپ کے گھر میں چھوٹی موٹی چوریاں کی تھیں۔ اپنا ٹرانسسٹر، ٹیپ ریکارڈ، ابا جان کا تھرموس، امی کے رکھے اٹھائے برتن سب آہستہ آہستہ اپنے نئے گھر میں پہنچا دیئے تھے!۔ پہلے تو کسی کو پتہ تک نہ چلا۔ پھر ایک روز ابا جان نے ہلڑ مچایا۔ بیوی سے بولے۔

"دو دو دکانیں کیتلی میں چائے بھجواتی ہو۔ مجھے وہاں دوبارہ گرم کروانی پڑتی ہے۔ آخر تھرماس کون نگل گیا؟"

میں کیا جانوں۔ بیوی نے بھی گرم ہو کر جواب دیا۔ بھول آئے ہوں گے دوکان پر۔ ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ نظر بچا کے کوئی موٹا پٹیا اٹھا لے

تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مگر اس کی بڑی بہن پردہ تھامے کھڑی خاموش اپنے باپ کو ابدی سفر پر روانہ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی دو موٹی موٹی خوشنما سیاہ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ان سے آنسو ابل ابل کر اس کے کھلتے ہوئے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ لب نیم وا تھے۔ دور ہی سے ان دو پتیوں کی کپکپاہٹ دیکھی جا سکتی تھی!۔

اس نے صرف ایک نگاہ غضنفر پر ڈالی تھی۔ اور وہ نگاہ ایک راز تھی، بھرے ہوئے حسرت واندوہ، آرزو اور رحم طلبی کے انبوہ درانبوہ سا نز غضنفر کے دل کی منزل تک آ پہنچے اور ہمیشہ کے لیے ڈیرے ڈال دیے۔ کلمۂ تعریف، بارعب گونج میں جنازہ اٹھایا گیا اور عدم کا راہی آگے بڑھ گیا۔!

لیکن گورستان میں کون کون سے مراحل طے ہوئے۔ کس نے کیا کیا۔ قبر کا ڈھکنا کب بند ہوا غضنفر کو کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ ایک خزاں رسیدہ درخت کے نیچے کھڑے خالی خالی نظروں سے دور و نزدیک دیکھا کیے۔ آل حیات، بے ثباتی کے مرثیے، بوسیدہ و ریختہ مٹی کے مختصر سے گھر! سناٹا، ٹھٹھرا ہوا زرد زرد دن، لرزتی ہوئی دھوپ کی یہاں وہاں آنکھ مچولی۔ زندگی کی ساری حیات کا بارونق شور کہیں دور رہ گیا تھا۔ یہاں تو منجمد آنسوؤں کا عجیب نظارہ تھا!۔

شہر تک آتے آتے شام ہونے لگی!۔

انھوں نے ڈولی کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اور وہ فوراً ہی آ گئی۔! غضنفر پر نظریں پڑی ہی تھیں کہ اس کی معصوم آنکھوں سے لاوا ٹوٹنے لگا۔

گئی ہوگی۔ وہ شاید صرف میٹرک پاس ہے۔ اور یہ بہرحال اس سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے۔ بات کرنے کا سلیقہ اور شعور رکھتی۔ اس میں تعلیم کی تہذیب ہے۔ یہ اچھی ساتھی ثابت ہو سکتی ہے۔

رہا معاش کا معاملہ۔ تو کیا۔ چھ ماہ کسی طرح گزر جائیں گے اس کے بعد انھیں کہیں نہ کہیں ملازمت مل جائے گی۔ اب کون سا والد صاحب خزانہ بخش دیتے ہیں۔ ماہانہ سو روپے جیب خرچ ملتا ہے۔ وہ بھی نصیحتوں کے طومار کے ساتھ۔ ہُنہ!۔ ارے تب کون سی گردھی لٹ جائے گی۔ نہ دیں وہ یہ سو روپے بھی۔

ڈولی نے کچھ بڑبڑا کر کروٹ بدلی اور ان کی محویت ٹوٹ گئی!۔

پھر ایک اداس شام آہستہ آہستہ زمین پر اترنے لگی تھی۔ سرد اور زرد دھوپ کے دھبے صحن کی بوسیدہ اور سیلی دیوار پر کپکپا رہے تھے۔ ناگوار ہوا گلاب کے تختوں پر سرسرا رہی تھی۔ اندرونی چھوٹے چھوٹے کمروں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ ماحول یک بارگی بہت افسردہ کن ہونے لگا تھا۔

اور اب۔

صاحبزادے محمد غضنفر کی بیٹی گم تھی! ان کا سفینۂ حیات ساحل مراد پر پہنچنے کے بجائے بیچ بھنور میں چکرانے لگا تھا۔ اچھی بری قسمت کے زعم میں انھوں

اس اقدام پر مجبور نہیں کروں گا۔ لیکن۔ فی الحال۔ شانی۔ سچ سچ تم بہت جاذب نظر ہو۔ لوگ تم پر بری نظریں ڈال سکتے ہیں۔ کوئی تمہارا محافظ نہیں ہے۔ ایک دفعہ تم خطرے سے بچ نکلی ہو لیکن خطرہ ہنوز موجود ہے! شانی۔ کیا اپنی عزت و آبرو کی خاطر تم میری التجا مان لو گی؟:

وہ دیر تک چپ رہی۔!

ہاں ہاں۔ سوچ لو: غضنفر نے کہا: مجبوری کی کوئی بات نہیں۔

تم۔ مگر۔ آپ۔ آپ ہم دو نفوس کا بوجھ کیونکر۔"

ہاں۔ یہ مسئلہ واقعی سوچنے کا ہے۔ تم دو نفوس اور ہیں۔ گویا تین۔ نفوس ہو گئے: غضنفر نے جواب دیا۔ اس وقت ان پر گفتہ اور ناگفتہ جذبات کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ آگا پیچھا نہیں سوجھ رہا تھا انہیں اپنے اصول پسند باپ اور سخت گیر ماں کا کچھ خیال نہ تھا۔ ان کے سامنے ایک نوجوان خوبصورت لڑکی تھی جس کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ شاید اس کا حسن کبھی داغدار ہو جاتا۔ اس کا شباب اس کے لیے مشکلات پیدا کر دیتا۔ لہذا۔ وہی اس کے پاسبان بن جائیں تو کیا حرج ہے!۔

انہیں اپنی والدہ کی عادت نا پسند سے بڑی الجھن ہوتی تھی جن کی صاحبزادی سیما سے امی نے ان کی شادی کی بات چلا رکھی تھی۔ امی ان پر حاوی نہیں! امی ان پر اپنی پسند و مرضی حاوی نہیں کر سکیں!۔ یک وقت غصہ اور ہمدردی کے جذبات کی ایسی زبردست کاک ٹیل تیار ہوئی جس نے ان کا نشہ یک لخت دو آتشہ کر دیا۔ ایسا یقیناً اس لڑکی کی سی حسین نہ ہو گی۔ وہ ایک جاہل زبان دراز ماں کی بیٹی ہے۔ یقیناً ماں کی فطرت اس میں بھی سرایت کر

ان کی اپنی بہن نبیلہ بھی تو اس عمر کی تھی۔! اگر اس پر کوئی غم پڑتا تو کیا ہوتا!۔

غضنفر نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ مگر ان کی زبان سے تسلی یا دلاسے کا ایک لفظ بھی نہ نکل سکا بے ساختہ دل بھر آیا تھا۔ چند لمحوں بعد ڈولی ہی نے سنبھالا لیا اور چپکے سے گلوگیر آواز میں بولی: اندر چلئے۔ میں اور بڑی باجی صبح سے آپ کو یاد کر رہے تھے۔ وہ بھی بہت رو رہی تھیں اب ہمارا کوئی اپنا نہیں رہا غضنفر بھائی!:

غضنفر نے گرد و پیش نظریں دوڑائیں۔ چلتی ہوئی سڑک مصروف تھی لیکن سب اپنی اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔ غضنفر نے کسی کی پرواہ بھی نہ کی۔ ڈولی کے ساتھ اندر آئے!۔ عجیب سی ہیبت ناک سوگواری در و دیوار پر محیط تھی!۔ ایک ٹھنڈا دن اسی گھر پر منجمد ہو کر رہ گیا تھا!۔

ڈولی نے ان کے لیے کرسی سرکائی اور خود تخت پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی تخت ہی کا ایک گوشہ میں سر جھکائے بیٹھی تھی!۔

غضنفر نے کھانس کر گلا صاف کیا اور ڈولی سے پوچھا: تم لوگوں نے کچھ کھایا پیا بھی ہے نہیں؟:

وہ اپنی باجی کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گئی۔

سانحہ ناقابل برداشت اور ناقابل فراموش ہے: غضنفر نے کہا۔ لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اسے بہر حال انگیز کرنا ہے۔ اس طرح کی فاقہ کشی کسی بات کی تلافی کر سکے گی۔ ڈولی۔ تم کھانے کے لئے کچھ لا دو۔!

جی اچھا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی۔

"آپ اس طرح کی تکلیف مت کیجیے" لڑکی نے کہا "کھانا پینا بے غیرت زندگی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ ہم کب تک نہیں کھائیں گے۔! میں نے آپ کو بار بار زحمت دی ہے۔ میں شرمندہ ہوں۔ آپ نے نجانے کتنے ضروری کام چھوڑ ڈال کر ہماری مدد ــــــ!"

"اب تک تو میں نے کسی طرح کی کوئی مدد نہیں کی ہے" غضنفر اس کی بات کاٹ دی۔ "جس طرح آپ کے دوسرے ہمسائے آئے تھے۔ میں بھی چلا آیا تھا۔ نہ میں نے مرحوم کی کوئی خدمت کی۔ نہ دوڑ دھوپ کی نہ آپ ہی لوگوں کے کام آیا! اس کے لیے بار بار میرا شکریہ ادا کیجیے۔؟"

"غضنفر بھائی۔ لڑکا آیا ہے" صحن سے ڈولی نے آواز دی۔ انھوں نے لڑکے کو کئی ایک لوازمات اور کافی کا آرڈر دیا۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد آہستہ سے پوچھا۔

"بے بی تمھارا اور تمھاری بہن کا نام مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا"

"باجی کہکشاں ہیں اور میں افشاں!۔ ابا انھیں شانی کہتے تھے"

"اچھا اچھا"

اور پھر جب کچھ کھا پی کے لڑکیوں کے حواس درست ہوئے تب افشاں کو نیند آنے لگی۔ اس نے بہن کی گود میں سر رکھ کے آنکھیں بند کرلیں

وہ دونوں اکیلے تھے لیکن ان کے درمیان مغائرت اور بیگانگی کی کوئی خلیج حائل نہ تھی! کہکشاں نے کسی جذبے سے مجبور ہو کر وہ تمام باتیں زیادہ تفصیل سے کہہ سنائی تھیں جو غضنفر نے ہمسائے اصغر صاحب سے اجمالاً سنی تھی۔ پھر اس نے بے حد ملاوس لہجہ میں کہا "آئے دن آپ سمندر میں ڈوب

"آپ کی ہمدردی کا یہ اجر تو نہیں کہ آپ کو مزید پریشانیوں میں مبتلا کردوں!"

"میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔!"

"کہیئے۔!"

"وعدہ کرو کہ۔ مان لوگی۔!"

"کہیں اور لے چلیں گے ہمیں!"

"یہ سب میرے سوچنے کی بات ہے۔ تم بس وعدہ کرو۔!"

"اچھا!۔"

"بعد کو اپنے اور میرے لیے الجھن نہ نکالنا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی!" اس نے حیرت سے کہا "پلکیں اٹھائیں غضنفر کی نظریں کچھ کہہ رہی تھیں۔ جب وہ چیخنے لگیں تو کہکشاں نے پھر پلکیں جھکالیں۔

"میں تمھیں اس منجدھار میں چھوڑنا نہیں چاہتا۔ تمھارے چاروں طرف انسانی صورت کے درندے منڈلا رہے ہیں تم محفوظ نہیں ہو ــ تمھارا آخری چارہ کار بس خودکشی ہے!۔ ان حالات میں اگر میں تمھارا سہارا تمھارا محافظ بن جاؤں تو کیا تمھیں قبول نہ ہوگا"

کہکشاں کے لب ہلے۔ وہ پھر حیرت و خوف سے غضنفر کی طرف تکنے لگی جیسے اسے شبہ تھا اس نے جو کچھ سنا تھا۔ وہ خواب اور واہمہ کے سنگم پرستی ہوئی کوئی ناممکن سی بات تھی۔!

"ویسے تم کوئی اچھی تدبیر سوچ لوگی۔ کوئی مناسب اقدام کروگی تو بیشک تمھیں

مگر کہکشاں۔! بے ساختہ غضنفر کی زبان سے نکل گیا۔ اور یکبارگی وہ
عجیب سی بے چارگی سے رو پڑی: اب نامہربان زندگی ہے۔ ہم ہیں اور
بابا کی یاد ہے۔!"
کہکشاں۔!" دفعتہ وہ اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھے اس کی سسکیاں
تھم گئیں۔ اس نے آنچل برابر کر کے بدن چرا لیا۔
"کہکشاں! سنو۔ کیا میں تمہارا کوئی نہیں۔ آخر کچھ سوچ کر ہی تو تم نے
مجھے بلایا ہوگا۔ جواب تو دو۔ میری بات کا۔!"
"تب۔ تب میں بہت پریشان تھی"
"تمہاری پریشانیاں ابھی دور تو نہیں ہوئیں؟"
وہ چپ رہی۔!
کہکشاں؟
جی!: اس نے سر جھکا لیا۔
مجھے افسوس ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں۔ اس کا یہ وقت اور موقعہ
نہیں ہے۔ لیکن۔ مجھے بہرحال کہنا ہے کیونکہ یہ بات بہت ضروری ہے!"
"کہیئے۔!" اس نے کہا۔ چپکے سے اپنے آنسو پونچھے اور ان کے
بالوں میں انگلیاں الجھالیں۔
"تمہیں مجھ پر تھوڑا بہت اعتماد تو ہوگا۔!"
"بہت ہے!"
اس اعتماد کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنے دل کا سارا لاوا میرے سامنے
نکال پھینکو!"

کر مر جانے والوں کے قصے سنتے ہوں گے۔ وہ ہم ہی جیسے لوگ ہوتے ہوں گے
جن کا کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ جو اپنے بزرگوں کے ماضی کی قربان گاہ پر آہستہ آہستہ
بھینٹ چڑھتے رہتے ہیں۔ وہ اسی خطا پر مارے جاتے ہیں کہ ان کی کوئی
خطا نہیں ہوتی۔ ایک دن آپ اخبار میں خبر پڑھیں گے کہ دریا سے دو لاشیں
ابھر نکلی ہیں۔ آپ سمجھ لیجئے گا کہ وہ میری اور نوری کی ہوں گی"
"یعنی دنیا بھی دوزخ اور عقبیٰ بھی دوزخ" غضنفر نے کہا۔
"دنیا کے دوزخ سے آخرت کا دوزخ بہت بہتر ہے۔ وہاں صرف جلنا
ہے" کہکشاں نے زہریلے لہجے میں جواب دیا۔ "وہاں یہ اندیشہ اور خوف نہیں
لگا رہتا کہ ہمسایہ کب دیوار پھلانگ کر گھر میں گھس آتے ہیں۔ ایک دفعہ
ہو چکا ہے ایسا"
کیا! کیا ہو چکا ہے؟" حیرت سے غضنفر نے پوچھا۔
"جانے دیجئے۔ مجھے یہ گوارہ نہیں کہ میں آپ کی فکروں میں اضافہ کروں!"
لیکن آپ کے نہ کہنے سے بے شک فکروں کا اضافہ ہو جائے گا مجھے واقعہ
معلوم ہو جائے تو شاید میں کوئی تدارک کر سکوں!"
بیچارے میرے مجبور بابا کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر ہمسایے کے
مولانا صاحب نے میرے سلسلہ میں کوئی نامناسب مطالبہ کیا تھا۔ ابا کے انکار
سے برافروختہ ہو کر مولانا صاحب نے اپنے کسی مشٹنڈے شاگرد کو گھر میں پھندا دیا
کہ۔ وہ میرا منہ بند کر کے مجھے اٹھالے جائیں"
خدا کی پناہ۔ مولانا صاحب کی حرکت تھی یہ؟
جی ہاں۔ اب انھیں معلوم ہو گیا ہے کہ مجھ پر کس کی چھت [illegible] میرے سر پر

نہیں ہے" کہکشاں نے کہا "ہمدردی کے پردے میں نجانے وہ کتنی بے دردی کریں گے ہمارے ساتھ ۔!

"آپ اپنے کسی بزرگ عزیز کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟"۔

"میں آپ سے سچ کہتی ہوں غضنفر صاحب ۔ مجھے اپنے کسی عزیز کا پتہ نہیں معلوم ۔ ایک میری حقیقی خالہ البتہ تھیں ۔ امی کی زندگی میں ایک مرتبہ آئی بھی تھیں ۔ لیکن وہ بھی کہاں رہتی ہیں ۔ مجھے معلوم نہیں اس کے علاوہ وہ اتنی نادار اور بدحال ہیں کہ ۔ ہم ان پر بوجھ بنا پسند نہیں کرتے !"

تو پھر صورت حال کیا ہو گی؟"

پریشان ہو گئے نہ آپ؟" وہ اس ندرتگی سے ہنسی کہ غضنفر اس کی شکل تکنے لگے ۔

حد سے زیادہ پریشانی کی بات ہے! ۔ آپ تنہا ہیں ۔ آپ کا کوئی عزیز آپ کا پرسان حال نہیں ہے ۔ اور آپ کی گزر بسر کا ذریعہ ۔!"

آپ کو نہیں معلوم غضنفر صاحب کہ بیکار چیزیں ضائع کر دی جاتی ہیں غرق کر دی جاتی ہیں ۔ ان کے مٹ جانے سے کسی اچھی کارآمد چیز کے لیے جگہ خالی ہو جاتی ہے ۔ ہم دو بے بس لڑکیاں رہ گئی اور گھور رہ گئی تو ہیں آپ یقین کیجیے کہ ہمارے مر جانے سے دنیا کی شعیں کے کل پرزوں میں کوئی خرابی نہیں آئے گی ۔

بے ساختہ غضنفر نے پوچھا "آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟"

"دنیا بھی درسگاہ اور مصائب بہترین معلم ہیں!"

"پھر بھی!؟"

"بی ۔ اے کا آخری سال تھا ۔ چھ مہینے ہوئے تعلیم چھوڑ دی ۔ ابا مسلسل بیمار رہنے لگے تھے ۔ میں نے سوچا کہ جو رقم میری تعلیم پر صرف ہو رہی ہے وہ ابا کے علاج پر صرف ہو!"

"لیکن اگر آپ بی ۔ اے ہو جائیں تو کسی اسکول میں ملازمت ۔۔!"

انٹر کے بعد ایک اسکول میں ملازمت کی تھی ۔ جناب ۔ ہفتہ بھر بعد پرنسپل صاحب نے اپنے اجلاس پر طلب فرمایا اور ادھر ادھر کی کچھ باتیں کے بعد کہنے لگے کہ تم بہت حسین ہو ۔ میں نے ابا سے کہا ۔ انھوں نے کہا کہ ابھی کل مت جانا ۔! آہ ۔ میرے ابا ۔ کاش ان کے ساتھ ہم بھی مر جاتے! ۔ اب مجھے زمین آسمان میں اپنے لیے خلا ہی خلا نظر آتا ہے ۔ ؟ گھر میں چین نہ باہر کوئی جگہ حفاظت کی نہیں رہی؟"

"آپ کو اپنے عزیزوں کے نام تو معلوم ہوں گے؟"

"کیوں؟"

میں کوشش کروں گا کہ ان کی تلاش ۔۔!

"نہیں نہیں ۔ آپ نے انھیں تلاش کر بھی لیا تو میں ان کے رحم و کرم پر زندگی گزارنا پسند نہیں کرتی ۔ جنھوں نے میری امی کو دھکے دے دے کر گھر سے نکال دیا ۔ جنھوں نے آپا پر ہر قسم کی راحت و آرام کے در بند کر دیے وہ بھلا ہم سے کس طرح مروت برتیں گے ۔ غضنفر صاحب وہ لوگ مجھے اور میری بہن کو خادمہ سمجھیں گے ۔ مرحوم ماں باپ کی کرنی کے طعنے دے دے کر جگر چھلنی کریں گے ۔ اور مجھے ابا کی وصیت کا پاس بھی تو کرنا ہے ۔ وہ اپنے خاندان کا تذکرہ تک کرنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ آپ یہ خیال چھوڑ دیجیے ۔!"

THE HAREEM

Aug. 82

Rs. 1|40

ایڈیٹر

گزشتہ ۵۲ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا

لکھنؤ سب سے پرانا رسالہ

ماہنامہ حریم

بیادگار

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

جلد (۵۲) فہرست مضامین ماہ اگست ۸۲ء نمبر (۸)

ایڈیٹر و نگراں

نسیم انہونوی

معاونین

شوکت جہاں بیگم غزالہ

و

جانی بیگم ردولوی

قیمت فی پرچہ:- ایک روپیہ چالیس پیسے

قیمت سالانہ منی آرڈر سے ... /۲۲ روپیہ

قیمت مخصوص ... /۲۵ روپیہ

قیمت اعزازی ... /۲۷ روپیہ

وی۔پی سے منگوانے پر چار روپئے پچاس پیسے زائد

غیر ممالک سے ... /۴۵ روپیہ

یا اس کے بعد غیر ملکی سکے برائے سی۔ [illegible]

[illegible] سے مختلف ملک کے [illegible]

ناشر ... نعیم انہونوی

آفس و ترسیل زر کا پتہ:- نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ فون آفس ۲۲۴۵۹- رہائش ۲۵۳۳۴

نعیم انہونوی نے [illegible] پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

لمعات

لندن میں برطانوی وکلا نے عصمت فروشی کا پیشہ کرنے والی عورتوں کے ساتھ بہتر سلوک کئے جانے کا مطالبہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ پیشہ ور عورتیں مردوں کو رجھانے پر سزا یاب ہو سکتی ہیں تو ان مردوں کے لئے سزا کا قانون کیوں نہیں بنایا جاتا جو کاروں پر بیٹھ کر آتے اور ان عورتوں کو بہلا پھسلا کر لے جاتے ہیں۔

اس خبر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ لندن جیسے مقام میں بھی پیشہ ور خواتین موجود ہیں۔ حالانکہ وہاں عورتوں اور مردوں کو جس طرح کی آزادی حاصل ہے، اس کے تحت پیشہ ور عورتوں کی چنداں ضرورت نہیں رہ جاتی۔ لیکن ہوتا ایسا ہوگا کہ پیشہ نہ کرنے والی عورتوں سے تعلق پیدا کرنا اتنا آسان نہ ہوگا کہ جب چاہے کسی کو حاصل کر لے۔ اس کے لئے بہرحال پاپڑ بیلنا پڑتے ہوں گے۔ محبت کا جال ڈال کر ہوٹلوں وغیرہ میں لے جا کر خاطر مدارات کرنا ہوتی ہوگی اور اس کے بعد ہی مقصد برآری کی نوبت آتی ہوگی۔ اس لئے فوری یا وقتی طور پر شہوانی جذبات کو سرد کرنے کے لئے ایسی عورتوں ہی کو حاصل کیا جا سکتا ہوگا، جو عصمت فروش ہوں۔ لیکن یہ ولایتی عصمت فروش عورتیں ممکن ہے ہمارے ملک کی پیشہ ور خواتین سے مختلف ہوتی ہوں اور کسب زر کا آسان ذریعہ عصمت فروشی ہی کو قرار دیتی ہوں اس لئے کہ وہاں کی معاشرتی قدریں ہمارے ملک سے مختلف ہیں۔ یہاں آج بھی شادی بیاہ کے وقت چھان بین کا طریقہ رائج ہے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ کوئی نا کتخدا لڑکی کسی کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے تو وہ کتنی ہی پارسا کیوں نہ ہو، اس کے چال چلن کو مشکوک سمجھا جاتا ہے اور اس سے شادی کرنے میں تامل کیا جاتا ہوگا۔ [illegible] ہیں جن اس طرح کا گھومنا پھرنا کسی بھی لڑکی کے لئے معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

لندن کے وکلا کا مطالبہ بہت ہی مناسب ہے، لیکن ہمیں تو لگتا ہے کہ ہم سے کم ہندوستان میں تو مردوں ہی کا احترام چاہیے۔ اس لئے کہ یہاں کی پیشہ ور خواتین کی کہانیاں بڑی دردناک ہوتی ہیں۔ مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر یہاں جو ہائی کلاس پیدا ہو گئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کا شمار پیشہ ور عورتوں میں نہیں آتا۔ نہ ان کی کوئی مجبوری انھیں سوسائٹی گرل بننے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسا کرنا ان کا شوق ہوتا ہے مردوں ہی کی طرح وہ بھی رنگ رلیاں منا کر زندگی کی بہار لوٹنا پسند کرتی ہیں۔ انھیں آزادی بھی حاصل ہے۔ پولیس بھی انھیں نہیں چھیڑتی، اس لئے کہ ان کی کوئی مستقل دوکان نہیں ہوتی۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق شریف اور اونچے گھرانوں سے ہوتا ہے اس لئے اور بھی ان پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قسمت کی ماری وہ عورتیں جو پیشہ کرنے پر مجبور ہوتی ہیں ہر وقت یہی سوچتی رہتی ہیں کہ ان کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا۔ یہ بیچاری اپنی عزت فروخت کرتی ہیں اگر ان کی آپ بیتیاں سنی جائیں تو پتھر کلیجے بھی پگھل جائیں۔ ایک دو نہیں پچاسوں ناول اور صدہا افسانے ان کی داستانوں کو لئے ہوئے شائع ہو چکے ہیں۔ جنھیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] ان پر ظلم ڈھا کر انھیں ایسا بنا دیتے ہیں کہ عصمت فروشی کے سوا ان کے لئے کوئی اور راستہ نہیں رہ جاتا۔ [illegible] نوجوان لڑکیوں ہی کے ساتھ پیش آتے ہیں [illegible] ہیں اور پھر ان کے لئے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں کہ وہ خودکشی کر لیں لیکن یہ آسان کام نہیں [illegible] بھی کر آمادہ نہیں کر پاتی، اس لئے دوسرا [illegible] کرنا پڑتا ہے یعنی عصمت فروشی کا۔

مردوں کے جبر وستم کی ستائی لڑکیاں دنیا میں ایسی بے سہارا ہو جاتی ہیں کہ انھیں صرف چکلوں ہی میں پناہ ملتی ہے۔ اور یہ چکلے بھی ایسی ہی عورتیں چلاتی ہیں جو اپنی جوانی میں برباد ہو کر کسی بوڑھی نائکہ کی پناہ میں آئی ہوتی ہیں۔

ہندوستانی سماج میں بیوہ عورت دوسری شادی نہیں کر سکتی تھی، خواہ وہ سولہ برس ہی کی کیوں نہ ہو یا یہ کہ اس کا صرف رشتہ ہی ہوا ہو، گونا (رخصتی) نہ ہوا ہو۔ ایسی ہزاروں کمسن نوجوان اور جوان لڑکیاں بیوہ ہو کر سماج کی نظروں میں حقیر بن کر زندگی گذارتی تھیں۔ انھیں بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ نہ اچھے کپڑے پہن سکتی تھیں اور نہ بناؤ سنگار کر سکتی تھیں۔ ان سے ایسا وحشیانہ سلوک کیا جاتا تھا کہ اکثر راہ فرار اختیار کر کے اسی راہ پر لگ جاتی تھیں جو جسم فروشی کی منزل پر پہنچاتی تھی۔ بہت سے چکلے ایسی ہی بدقسمت عورتوں سے آباد ہوتے چلے گئے اور انھیں چلانے والیاں اپنا بازار گرم رکھنے کے لئے ایسی لڑکیوں کی تلاش میں رہا کرتی تھیں، جنھیں سماج نے ٹھکرا دیا ہو۔ اور جو نہ جانتی ہوں کہ خوشی کا بھی دنیا میں کوئی وجود ہے۔ نفس تو سب ہی کے پاس ہوتا ہے اور اس پر قابو پانا ہر ایک کے لئے آسان نہیں ہوتا، اس لئے گھر والوں کے تشدد اور غیر انسانی سلوک سے پریشان ہو کر لڑکیاں گھروں سے دور جا کر کسی چکلے میں اپنی عزت کا سودا کرنے لگتی تھیں۔ اس طرح چکلوں کی تعداد بڑھتی گئی اور چکلے چلانے والیاں ایسی لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے کر سماج کے ٹھیکے داروں سے انتقام لیتی رہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ ہندو سماج میں بھی اس طرح کی اصلاحات ہونے لگی ہیں اور اب پہلے کی طرح بیوائیں ساری زندگی راہبانہ طور پر بسر کرنے کے لئے مجبور نہیں ہیں۔ لیکن دوسرے طریقوں سے معصوم لڑکیوں کو اپنے دام فریب میں پھنسا کر مرد اب بھی انھیں برباد کرتے رہتے ہیں اور یہ بربادی کبھی کبھی انھیں ایسا مجبور کر دیتی ہے کہ چکلوں کے سوا انھیں اور کہیں پناہ نہیں ملتی۔ آپ نے فلم امراؤ جان ادا دیکھا ہوگا، جو مرزا رسوا کے ناول پر بنائی گئی ہے۔ اس میں خاندانی دشمنی کی بنا پر ایک شریف خاندان کی کمسن اور معصوم لڑکی کو طوائف کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح صدہا لڑکیاں بچپن میں چرا کر انھیں چکلوں میں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ انھیں علم بھی نہیں ہو پاتا کہ وہ کہاں پیدا ہوئی تھیں اور ان کے ماں باپ کون تھے۔ ایسا ظلم کرنے والے بھی بیشتر مرد ہی ہوتے ہیں۔

اگر چکلوں پر ایسے قوانین بن گئے ہیں کہ ان جسم فروشی کرنے والی عورتوں کو گرفتار کر کے عدالتوں میں پیش کیا جائے، جو میرے خیال سے بالکل بے قصور ہوتی ہیں۔ مجبوری میں ہر حرام حلال ہو جاتا ہے۔ ان سے زیادہ مجبور اور کون ہوگا جنھیں اپنے گھروں میں جگہ دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا، لیکن ان کے گھروں میں جا کر ان سے ملنے میں کوئی تکلف نہیں کرتا۔ میں کہتا ہوں کہ ان کو گرفتار کرنے کے بجائے ان مردوں کو کیوں گرفتار نہیں کیا جاتا جو ان کے جسم خریدنے ان کے ٹھکانوں پر جاتے ہیں۔ قانون انسداد عصمت فروشی میں مرد کو ہی زیادہ سزا ملنا چاہئے۔ یہی انھیں لوٹ کر جسم فروشی پر مجبور کرتے ہیں اور پھر یہی ان کی دوکانوں پر جا جا کر ان کی گرفتاری کے موجب بنتے ہیں۔ اگر حکومت انسداد عصمت فروشی کے قانون میں اتنی ترمیم کر دے کہ سزا صرف مردوں ہی کو دی جائے تو پھر انھیں ان کے یہاں جانے کی ہمت ہی نہ پڑے۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسی عورتوں کو جو جسم فروشی کر کے زندگی گذارتی ہیں، اچھے ہوم بنا کر ان میں آرام سے رکھے اور ان کی کفالت کرنے کے ساتھ ہی انھیں روزی پیدا کرنے کی مختلف صنعتوں میں لگا کر ماہر بنائے۔ کھانا کپڑا اور رہنے کی جگہ ملے تو شاید ہی کوئی بدنصیب عورت ان سہولتوں کو چھوڑ کر اپنے جسموں کو بھیڑیوں سے نچوانے کو پسند کرے۔

ڈاک کے نظام کی ابتری

کا یہ عالم ہے کہ معمولی ڈاک تو معمولی ڈاک ہوتی ہے، جس کے متعلق کوئی شکایت نہ کی جا سکتی ہے اور نہ ہی شکایت کرنے پر کوئی جواب ملتا ہے، حد یہ ہے کہ وی۔ پی۔ رجسٹری اور منی آرڈر بھی بے حد تاخیر سے ملتے ہیں۔ خریداروں کو ہمارا اطلاعی خط مل جاتا ہے مگر وی۔ پی نہیں ملتا۔ انتظار کے بعد شکایت لکھتے ہیں تو ہم انھیں وی۔ پی نمبر وغیرہ لکھ دیتے ہیں۔ ایک ایک ماہ بعد وی۔ پی خریداروں کو ملتے ہیں اور اکثر خریداروں تک گئے بغیر ہی واپس کر دئے جاتے ہیں اور وی۔ پی کی رقم دو دو ماہ بعد وصول ہوتی ہے اور کبھی وصول ہی نہیں ہوتی۔ اس وقت بھی ہزاروں روپے کے وی۔ پی [illegible] ہیں۔ اس سلسلہ میں یاد آتا ہے کہ اکثر [illegible]

اہلبیت سے محبت

______ محمد یوسف اصلاحی

خاندان بنو امیہ کے جلیل القدر خلیفہ ہشام بن عبد الملک اپنے عہد حکومت میں ایک بار فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے گئے بیت اللہ کا طواف کیا، طواف کے بعد حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے بڑھے مگر بیت اللہ کے پروانوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ کوشش کے باوجود ہشام حجر اسود تک نہ پہونچ سکے اور وہیں سے واپس ہو گئے۔ پھر جب وہ منبر پر کھڑے ہوئے تو اسی دوران حضرت زین العابدینؒ، نواسۂ رسولؐ حضرت حسینؓ کے لخت جگر تشریف لائے (جن کو حضرت حسینؓ پیار میں علی الاصغر کہا کرتے تھے) آپ نے نہایت صاف اور اُجلے کپڑے زیب تن کر رکھے تھے جو خوشبو سے مہک رہے تھے اور چہرۂ انور، ایمان ویقین کے نور سے چمک رہا تھا، کہ آپ کو رسولؐ کے لخت جگر حضرت فاطمہؓ سے نسبی نسبت تھی، آپ نے پہلے طواف فرمایا، طواف کے بعد جب آپ حجر اسود کی طرف بڑھے تو نواسۂ رسولؐ کے احترام میں سارے لوگ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ آپ نے نہایت اطمینان سے حجر اسود کو بوسہ دیا اور ہجوم عقیدت ومحبت سے سرشار آپ کے دیدار سے آنکھیں روشن کرتا رہا، اور جب تک آپ باطمینان فارغ ہو کر پیچھے نہیں ہٹے سارے لوگ پیچھے کھڑے انتظار ہی کرتے رہے۔

درباری قسم کے جو لوگ شام سے ہشام کے ہمراہ آئے تھے، انھوں نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ ہشام حجر اسود کو بوسہ دئے بغیر واپس آگئے اور کسی نے کوئی توجہ ہی نہیں دی اور حضرت زین العابدینؒ تشریف لائے تو ساری بھیڑ نہ صرف چھٹ گئی بلکہ عقیدت سے منتظر کھڑی رہی، یہ منظر دیکھ کر انہیں بڑی حیرت ہوئی چنانچہ ایک درباری نے کہا ______

حضور یہ نوجوان کون ہے؟ اس کی اس قدر تعظیم کیوں؟ خدا آپ کو سلامت رکھے وقت کے امیر المومنین آپ ہیں مگر ان لوگوں نے آپ کی ذرا پروا نہ کی اور ایک غیر معروف نوجوان کی آمد پر اس قدر عقیدت، تعظیم اور احترام کا اظہار کہ کسی اشارے کے بغیر بے اختیار ساری بھیڑ چھٹ گئی۔ امیر المومنین کے ساتھ یہ سلوک اور ایک نوجوان کا یہ غیر معمولی احترام!۔

میں تو اس نوجوان سے واقف نہیں، پتہ نہیں کون ہے۔ ہشام نے اپنی خفت مٹانے اور اپنی شکی پر پردہ ڈالنے کے لئے جواب دیا۔

آپ نہیں جانتے یہ نوجوان کون ہیں؟ فرزدق کی غیرت ایمانی جاگ اٹھی اور اس نے جوش میں کہا۔ میں بتاؤں یہ کون بزرگ ہیں اور فرزدق جو ہشام کے دربار کا تنخواہ دار، اس کی شان میں قصیدہ گوئی کرنے والا شاعر تھا، اس وقت اہل بیت کی محبت وعقیدت میں سرشار ہر خوف اور لالچ سے بے نیاز ہو کر بھرے مجمع میں بتا تا ہے کہ یہ کون ہیں اور فرزدق نے حضرت زین العابدینؒ کی شان میں فی البدیہہ چند اشعار کہے جو فنی اعتبار سے بھی ادب کا بہترین سرمایہ ہیں اور اہل بیت سے مثالی عقیدت ومحبت کے بھی آئینہ دار ہیں۔

(۱) یہ وہ عظیم ہستی ہے جس کے نقوش قدم تک کو وادی بطحا اور یہ خانۂ خدا، حرم اور حرم کے باہر کے علاقے سب ہی جانتے ہیں (تعجب ہے کہ تم ان کو نہیں جانتے) (۲) یہ خدا کے بندوں میں سب سے بہتر بندے کا فرزند ہے۔ یہ انتہائی پرہیزگار نہایت ہی پاکیزہ خصلت بالکل بے داغ نشان والا ہے۔ (۳) اگر تم ان کو نہیں جانتے تو سنو یہ فاطمہؓ زہرا کا لخت جگر ہے، یہ وہ ہے جن کے جد امجد پر انبیاء کرام کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے (۴) یہ وہ ہستی ہے جس کی روشن پیشانی کے نور سے گہری تاریکیاں اس طرح چھٹ جاتی ہیں جیسے خورشید مبین کے طلوع ہوتے ہی تمام اندھیرے کافور ہو جاتے ہیں۔ (۵) یہ وہ محترم ہیں جو شرم وحیا کی وجہ سے ہمیشہ اپنی نگاہیں نیچی رکھتے ہیں اور لوگ ان کے حضور میں ان کی ہیبت اور رعب کی وجہ سے نگاہیں اونچی کرنے کی ہمت نہیں کرتے ہیں اور جب بھی زبان کھولتے ہیں تو منھ سے مسکراہٹ کے پھول جھڑتے ہیں۔ (۶) یہ وہ ہیں کہ جب بھی ان پر قریش کی نگاہ پڑتی ہے تو ہر زبان پکار اٹھتی ہے کہ جود وسخا کے [illegible] بس انہی پر ختم ہیں۔ (۷) یہ عزت وعظمت کی اس [illegible] پر ہیں جہاں عرب وعجم کے مسلمانوں میں سے کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا ہے (۸) یہ وہ ہستی ہے جن کے جد امجد تمام انبیاء کے سردار ہیں اور جن کی امت تمام امتوں سے افضل ہے۔ (۹) یہ وہ مبارک ہستی ہے

کا علم نہیں جب وہ حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے بڑھے تو حجر اسود بھی اس کی خوشبو کو پہچان کر اس کے ہاتھ کو تھام لے۔ (۱۰) کیا ہی خوب ہیں ان کی پاکیزہ عادتیں جو سارے ہی شمائل و مناقب جو سارے کے سارے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ملے ہیں۔

(۱۱) یہ تمہارا کہنا کہ یہ کون ہے؟ (میں نہیں جانتا) ان کی شان کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا، جن کو جاننے سے تم انکار کر رہے ہو انہیں عرب و عجم کے سارے ہی لوگ بخوبی جانتے ہیں۔ (۱۲) ان کے دونوں ہاتھوں کا فیض عام ہے ہر دم بارش کی طرح عام ہے ان کی بخشش ہر وقت جاری ہے حتیٰ کہ سخت بدحالی میں بھی ان کی بخشش میں کوئی کمی نہیں آتی۔ (۱۳) ان کا فیضان و احسان تمام مخلوقات پر عام ہے اور انہوں نے مخلوق سے جہالت و ظلمت، تنگ دستی اور ناداری اور تاریکیوں کے بادل چھانٹے ہیں۔ (۱۴) یہ وہ لوگ ہیں جو اس وقت بھی عام بارش کی طرح برستے ہیں جب قحط اور تنگی میں لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور جو اس وقت بھی شیر ببر ہوتے ہیں جب جنگ کے لئے لوگوں کی آتش غضب بھڑک رہی ہو۔ (۱۵) یہ اس گھرانے کے چشم و چراغ ہیں جن کی محبت دین ہے اور جن سے بغض اور کینہ کفر ہے، جن کا قرب نجات دینے والا اور پناہ میں لینے والا ہے۔ (۱۶) اگر سارے نیک اور پرہیزگار لوگ گنے جائیں تو یہی ان کے امام اور قائد ہوں گے اور اگر یہ سوال کیا جائے کہ روئے زمین کے سب سے بہتر لوگ کون ہیں تو یہی جواب ہوگا کہ یہی لوگ ہیں۔ (۱۷) ان کا ذکر خدا کے ذکر کے بعد ہر جگہ سب سے مقدم ہے اور انہیں کے ذکر کے بعد قلم نے لکھنا بند کر دیا ہے۔

(۱۸) جو شخص خدا سے واقف ہے اس کو لازماً اسی ہستی سے واقف ہونا چاہئے اس لئے کہ امت کو دین اسی گھرانے کی بدولت پہونچا ہے۔

(۱۹) وہ کون سے قبیلے ہیں جن کی گردنوں پر ان کے یا ان کے بزرگوں کے احسان و بخشش کی نعمتیں لدی ہوئی نہیں ہیں؟۔

(یہ فرزدق کے عربی قصیدہ کے چند منتخب اشعار کا اردو ترجمہ ہے۔ عربی اشعار دیکھنے کے لئے شیخ علی ہجویری کی مشہور کتاب کشف المحجوب ملاحظہ فرمائیں۔)

فرزدق کی یہ جرات ایمانی اور پرجوش قصیدہ سن کر ہشام کے پسینے چھوٹ گئے اس نے اسی وقت حکم جاری کیا کہ فرزدق کو مسلمانوں کے قید خانے میں جو مکے اور مدینے کے درمیان ہے بند کر دیا جائے۔

حضرت زین العابدینؓ کو اس ایمان افروز واقعے کی خبر پہونچی تو وہ فرزدق کی اس بے باکی اور غیرت ایمانی سے بہت متاثر ہوئے اور اس [illegible] ان کی [illegible] بارہ ہزار درہم و دینار ان کو بھجوائے اور یہ پیغام دیا کہ ـــــ "ابو فراش! ہم معذرت خواہ ہیں اگر ہمارے پاس کچھ اور ہوتا تو ہم وہ بھی مزید تمہیں بھجوا دیتے۔"

فرزدق نے حضرت کی بھیجی ہوئی رقم واپس کرتے ہوئے عرض کیا۔

حضرت! میں نے یہ سب کچھ کسی دنیوی لالچ یا انعام و اکرام کی خاطر نہیں کیا ہے۔ دراصل بادشاہوں کی شان میں جھوٹے قصیدے اور ان کی بے سرو پا مدح سرائیاں کر کے میں اپنے گناہوں کا پلڑا بہت بھاری کر چکا ہوں کاش میری یہ کوشش کسی حد تک ان گناہوں کا کفارہ بن جائے، رسولؐ کے اہل بیت سے محبت و عقیدت تو محض اس لئے ہے کہ میں خدا ہی سے اس کے اجر کا طلب گار ہوں۔

حضرت زین العابدینؓ فرزدق کا یہ ایمان افروز پیغام اور جوشیلی ایمان کی باتیں سن کر بہت مسرور ہوئے اور وہ رقم فرزدق کو دوبارہ بھیجتے ہوئے یہ پیغام دیا۔

ابو فراش! اگر تم ہم سے سچی محبت رکھتے ہو تو جو چیز ہم نے بھیجی ہے اس کو قبول کر لو کیونکہ ہم نے یہ رقم خدا کی خوشنودی ہی کے لئے اپنی ملک سے نکال کر تمہارے پاس بھیجی ہے اب ہم اس رقم کو واپس نہیں لے سکتے۔

فرزدق نے وہ رقم رکھ لی اور دونوں جہان کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ (بشکریہ ذکری)

حریمی دسترخوان

چھولے بھٹورے

اس دور میں چھولے بھٹورے کو بڑی مقبولیت حاصل ہے یہ پنجابیوں کی مرغوب ترین غذا ہے اور شہروں میں جگہ جگہ فروخت ہوتے ہیں۔ آپ گھر میں بنائیں تو بازار سے زیادہ لذیذ ہوں گے البتہ تھوڑی محنت کرنا پڑے گی۔

چھولے

یہ بلا بھٹورے کے بھی کھائے جا سکتے ہیں۔ ایک قسم کی چاٹ ہوتے ہیں۔

سامان:۔ کابلی چنے ۲۵۰ گرام کالی مرچ ۱۰ گرام۔ بڑی الائچی ۳۔ تیز پتے ۲۔ ادرک ۳۰ گرام۔ نمک اندازے سے۔

چنوں کو پہلے کئی گھنٹے تک بھگوئے رکھیں۔ اس کے بعد اتنے پانی میں کہ وہ اچھی طرح گل جائیں ادرک کے علاوہ تمام مسالے ڈال کر دیر تک جوش دیں۔ صرف ادرک کے ٹکڑے کر کے ڈالیں بقیہ مسالے کھڑے ڈالے جائیں گے۔

اس کے بعد بھنا ہوا پسا دھنیا چائے کے چار چمچے، بھنا زیرہ پسا ہوا چار چمچے۔ ٹماٹر ۱۰۰ گرام۔ پسی کھٹائی چائے کے پانچ چمچے (ٹماٹر کاٹ کر ٹکڑے کر لیں) ایک بڑی انڈی پیاز کے لچھے کاٹیں اور تھوڑے گھی میں ڈال کر اتنی تلیں کہ گلابی ہو جائیں اس کے بعد دھنیا، زیرہ، کھٹائی اور ٹماٹر ڈال کر بھونیں، یہ مسالے بھن جائیں تو ابلے ہوئے چنوں میں سے تمام مسالے سوا ادرک کے نکال لیں اور بھونے ہوئے مسالوں میں ڈال کر زیادہ پیالی پانی جس میں چنے ابالے ہوں ڈال دیں اور تھوڑی دیر پکا کر سب چیزوں کو ایک جان کر لیں۔ نمک چکھ لیں۔ کم ہو تو تھوڑا اور ڈال دیں۔

سب سے آخر میں پیاز کا لچھا [illegible] تھوڑا ہرا دھنیا اور ایک بڑی انڈی پیاز باریک باریک کاٹ کر اوپر سے ڈال دیں۔ اگر زیادہ چٹ پٹا پسند کریں تو پسی ہوئی سرخ مرچ بھی حسب خواہش ملا لیں۔ دو تین لیموں لے کر ان کا رس بھی ڈال دیں۔ بس چھولے تیار ہو گئے۔ چھولوں میں میٹھی چٹنی بھی آمیز کر کے کھائیں تو لذت اور بڑھ جائے گی۔ میٹھی چٹنی ویسے بھی بنا کر کسی جار یا بوتل میں رکھ لیں اور جب چاہیں کھانے کے ساتھ یا دہی بڑوں میں ڈال کر استعمال کریں۔

میٹھی چٹنی بنانے کی ترکیب

گڑ ۲۵۰ گرام پکی املی ۲۵۰ گرام۔ املی کو پانی میں دھو کر پانی میں بھگو دیں۔ جب اچھی طرح پھول جائے تو اسے مسل کر چھان لیں۔ گڑ میں چار پیالی چائے کی پانی ڈال کر اچھی طرح پکائیں۔ جب ہلکا قوام سا بن جائے تو اتار کر اسے بھی چھان لیں اور املی کا چھنا ہوا آمیزہ شامل کر کے رکھ لیں۔

اس کے بعد کلونجی چائے کے ۲ چمچے، میتھی چائے کے چار چمچے زیرہ چائے کے چار چمچے۔ دھنیا چائے کے چھ چمچے۔ سرخ مرچ کھڑی ۸ یا جتنی آپ پسند کریں۔

ان سب کو تھوڑے تھوڑے اصلی گھی میں الگ الگ تل کر نکال لیں اور علیحدہ علیحدہ پیس کر ایک ہی میں ملا لیں اور گڑ املی کے آمیزے میں ڈال دیں۔ تھوڑا سا نمک بھی ملائیں اور تمام آمیزے کو جوش دے کر ٹھنڈا کر کے بوتلوں میں بھر لیں۔

بھٹورے کا سامان:۔ میدہ ۵۰۰ گرام۔ دہی ۵۰ گرام۔ آلو اوسط درجے کے دو۔ ڈرائی ایسٹ (یہ ایک قسم کا خمیر ہوتا ہے جو جنرل مرچنٹس کے یہاں ملتا ہے) چائے کے دو چمچے۔ اگر ایسٹ نہ مل سکے تو کھانے والا سوڈا چائے کا ایک چمچہ۔ نمک حسب خواہش۔ خالی چائے کا ایک چمچہ بھرا چمچہ کافی ہوگا۔ گھی یا ڈالڈا حسب ضرورت۔

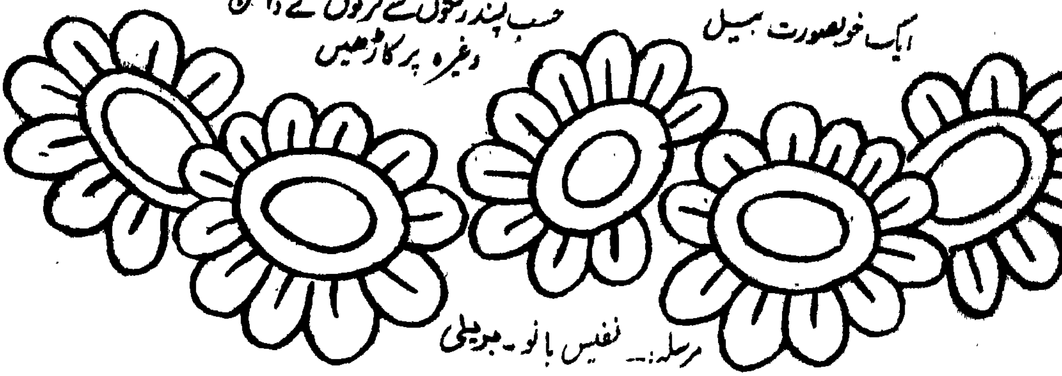
ترکیب:۔ ایسٹ کو تھوڑے سے گرم پانی میں بھگو دیں جب اچھی طرح پھول جائے تو دہی، نمک، ایسٹ میں ملا کر میدہ شامل کر لیں۔ جتنے پانی میں ایسٹ کو بھگویا ہو وہ بھی [illegible] ہو تو تھوڑا پانی اور ملا کر اچھی طرح گوندھیں۔ اور میدے کو کسی گرم جگہ پر اتنی دیر تک رکھا رہنے دیں کہ وہ پھول کر دوگنا ہو جائے۔ خیال رکھیں کہ میدہ سخت نہیں نرم رہے تاکہ بیلنے میں آسانی ہو۔

ایک نظر

عفت موہانی

کا نیا ناول ——— قیمت دس روپیہ

ڈوروں کو ابال کر چھلیں اور سِل پر باریک پیس کر بھنے ہوئے میدے میں ملا کر ایک جان کریں۔
گھی یا ڈالڈا گرم کریں جس میں ڈالڈا پکانے کی تیز ہونی چاہیئے میدے کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر انگلیوں سے دبا دبا کر پتلا کریں اور سنبھال کر کھولتے گھی یا ڈالڈا میں ڈال کر جلد ہی نکال لیں تاکہ سفید ہی رہیں۔



- عید الفطر مسرت و شادمانی کا تہوار ہے جس کا پیغام ہے ——— باہمی اخوت و محبت، یگانگت و یکجہتی، اتحاد و ہم آہنگی۔
- آج کے دن سب لوگ بلاتفریق مذہب و ملت گلے مل کر پیمان محبت کی تجدید کرتے ہیں۔
- قومی یک جہتی کی سچی تصویر ایسے ہی مبارک موقع پر دیکھنے کو ملتی ہے۔
- عید کا تہوار جہاں مسرت و شادمانی کا پیامبر ہے وہاں غریبی اور افلاس کے بوجھ تلے دبے کچلے ان افراد کے بارے میں فکر یہ بھی ہے جو ہمارے ہی بھائی ہیں اور اسی سرزمین پر خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرتے ہیں۔
- حکومت کے ساتھ ساتھ ہمارا بھی یہ اولین فرض ہے کہ ہم ان ہی کی فلاح و بہبود کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔
- ہمیں وزیر اعظم کے نئے بیس نکاتی پروگرام پر عمل درآمد میں بھی بھرپور تعاون دینا ہے کیونکہ یہ ۲۰ نکاتی پروگرام غریبوں اور ناداروں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔
- آیئے! ہم سب آج کے اس متبرک اور مبارک موقع پر تمام اختلافات و تنازعات کو پس پشت ڈال کر اور اخوت و محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر ایک دوسرے سے گلے ملیں۔

آپ سب کو عید مبارک ہو

جاری کردہ:۔ محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش

کہ آگ لینے کو جائیں....

زبیدہ خاتون صدیقیہ

زینت اپنے والدین کی تنہا اولاد تھی۔ ابھی وہ چھ ہی سال کی تھی کہ یتیم ہو گئی اور پھر اس کی ماں نے اُسے بہت مشکل سے پرورش کیا تھا۔ وہ تو اللہ کا کرم تھا کہ رہنے کا گھر اپنا تھا۔ تنگی کی حالت میں بھی ماں بیٹی سکون سے گھر میں بیٹھی رہتی تھیں۔ زینت بچپن ہی سے انتہائی حساس اور سنجیدہ لڑکی تھی۔ اسے اپنی کم مائیگی کا بہت احساس رہتا تھا۔ جانے کن پریشانیوں سے زینت نے جب آٹھواں درجہ پاس کیا تو اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ اس وقت ازراہ ہمدردی اس کی کلاس ٹیچر نے جو اس کی مالی و معاشی حالت سے واقف تھی۔ دوسرے محلے میں نئے کھُلنے والے ایک پرائمری اسکول میں کہہ سن کر اسے ٹیچر کی جگہ پر لگوا دیا تھا۔ اور یوں زینت خدا کا شکر ادا کر کے ننھے منے بچوں کو اپنے بھائی بہن سمجھ کر انھیں خلوص و محبت سے پڑھانے لگی تھی۔

گھر میں چار پیسے کی آمدنی بڑھ جانے سے اُس کی ماں نے آرام و سکون کی سانس لی۔ زینت اب انھیں کسی کام میں ہاتھ نہ لگانے دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں نے اس کی پرورش کرنے اور آٹھویں تک پڑھانے میں کیسی کیسی مصیبتوں کا سامنا کیا ہے۔... اکثر ایک وقت کھانا کھا کر آدھی آدھی رات تک سلائی، کڑھائی، اور بُنائی کر کے انھوں نے زینت کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ اگر اس کی ماں نے اتنی ہمت سے کام لے کر اسے پڑھایا نہ ہوتا..... تو اب وہ بھی انھیں کی طرح سلائی کرتی ہوتی۔ وہ اپنی ماں کی دور اندیشی اور علم دوستی کی دل سے مداح تھی اور اسکول سے آنے کے بعد اپنا سارا وقت انھیں کی خدمت میں صرف کرتی۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ کچھ لوگ بدنصیبی کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ وہی زینت کے ساتھ ہوا۔ ابھی اسے سروس کرتے دو سال بھی نہ ہوئے تھے کہ اچانک دو چار دن کی علالت کے بعد اُس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ زینت کی آنکھوں میں دنیا اندھیری ہو گئی۔ باپ کے نہ ہونے کا تو اسے کوئی خاص احساس نہ تھا مگر اب ماں کی جدائی نے اُسے اپنی بدنصیبی کا شدید احساس دلایا۔ ہفتوں ماں کے غم میں نڈھال وہ گھر میں پڑی رہی۔ پاس پڑوس کی عورتیں اور اس کی کلاس ٹیچریں جو سب اس کی میٹھی بولی سے دل سے ہمدرد تھیں، اسے سمجھاتیں۔ دنیا کی اونچ نیچ دکھاتیں، زمانے کا سرد گرم بتاتیں۔ زندگی کی قدر و قیمت کرنا سکھاتیں۔ اور یوں زینت کچھ دنوں بعد پھر اپنی پرانی دو ٹھیہ لوٹ آئی۔

وہ پہلے بھی بہت کم گو تھی۔ اور اب تو بالکل ہی گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔ صبح اٹھ کر وہ گھر کی صفائی کر کے اپنے لئے دونوں وقت کا کھانا پکا لیتی۔ پھر تیار ہو کر اسکول چلی جاتی۔ شام کو واپس آ کر ایک پیالی چائے بناتی اور صبح کا رکھا ہوا کھانا کھا کر لیٹ رہتی۔ یہی اس کی زندگی کے شب و روز تھے وہ سوچتی تھی کہ اس سے زیادہ پُرسکون زندگی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی؟

ایک روز اس کی محسن کلاس ٹیچر اس کے پاس آئیں اور ہمدردی بھرے انداز میں بولیں: "میرے مکان کے پیچھے جو انجینیر صاحب رہتے ہیں انھوں نے کئی بار مجھ سے اپنی بچیوں کو ٹیوشن پڑھانے کو کہا۔ مجھے تو فرصت نہیں۔ اگر تم مناسب سمجھو تو پڑھا دیا کرو۔ تم یہاں سے واپس جانے کے بعد تم گھر میں بیکار ہی تو رہا کرتی ہوگی"

"معقول سبب ہے آپا!" زینت بولی۔ "مگر مجھے کسی کے گھر پڑھانے جانا اچھا نہیں لگتا۔ یہاں کی بات اور ہے۔"

"اچھا میرے کہنے سے کچھ دن پڑھا دو" کلاس ٹیچر بولیں "پھر کسی اور سے کہوں گی۔ دو بچیوں کی ٹیوشن ہے کم سے کم سو روپے مزید ملیں گے۔"

"آپ کہتی ہیں تو کچھ دن پڑھا دوں گی" زینت نے لاپروائی سے کہا۔ "ورنہ تنہا میرے لئے اپنی تنخواہ ہی بہت ہے۔"

کلاس ٹیچر اسے خلوص بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئیں۔

انجینیر صاحب کے تین لڑکیاں تھیں اور دو لڑکے۔ سب سے بڑی لڑکی تھی جو عمر میں زینت سے کچھ بڑی ہی ہوگی۔ اس سال اس نے فائنل میں تھی۔ وہ دل کی انتہائی مخلص تھی اور زینت سے بالکل اپنوں کی طرح گھل مل کر باتیں کرتی تھی

جو چھوٹے بچے تھے وہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ سب سے چھوٹی پانچ سات سال کی دو لڑکیاں تھیں جن کو زینت ابتدائی تعلیم دیتی تھی۔

انجینئر صاحب کے ایک دوست کے لڑکے شوکت سے دو تین سال پیشتر سلمیٰ کی منگنی بھی ہو چکی تھی اور شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

انجینئر صاحب کے دوست رہنے والے اسی شہر کے تھے مگر پچیس تیس برس پہلے وہ کاروبار کے سلسلہ میں کلکتہ چلے گئے تھے۔ وہاں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ حال ہی میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ شوکت ان کا اکلوتا بیٹا تھا جو اپنی بیوہ ماں کا سہارا تھا۔

سلمیٰ بھی شوکت ہی کو اپنا منگیتر سمجھتی تھی، لیکن سال ہی میں اس کا ایک چچا زاد بھائی کراچی سے مکمل تعلیم حاصل کر کے واپس آیا تو اس کا مستقبل سلمیٰ کو زیادہ روشن نظر آیا، اس لئے وہ اسی سے شادی کرنے کی بات سوچنے لگی۔

ایک روز جب زینت بچوں کو پڑھا چکی تو گھر میں سلمیٰ کو نہ دیکھ کر اس کی ماں سے پوچھا انھوں نے قدرے غصے سے کہا اپنے کمرے میں ہو گی.... کم بخت کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ آج کالج بھی نہیں گئی۔ اگر تم ملنا چاہو تو وہیں چلی جاؤ۔

زینت جھجکتی ہوئی اس کے کمرے میں داخل ہوئی سلمیٰ منہ لپیٹے پڑی ہوئی تھی۔ زینت نے دھیرے سے پکارا سلمیٰ بی بی۔ کیا طبیعت کچھ خراب ہے؟

سلمیٰ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور پھیکی مسکراہٹ سے بولی آؤ زینت..... اس وقت بڑے موقع سے آئیں۔ میں سچ مچ تم ہی کو یاد کر رہی تھی۔

"کیوں خیریت..... " زینت اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی "سر میں درد ہو تو لاؤ تھوڑی دیر دبا دوں۔"

"سر میں تو نہیں" سلمیٰ معنی خیز لہجہ میں بولی: "ہاں دل میں ضرور کچھ درد ہو رہا ہے..... اور دیکھ لینا یہ دل کا درد مجھے قبر میں لے جا کر چھوڑے گا" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"خدا نہ کرے" زینت جلدی سے بولی: "یہ کیسی باتیں منہ سے نکال رہی ہو کیا ہو گیا ہے تم کو؟"

سلمیٰ تھوڑی دیر عجیب بجھی نظروں سے اس کو دیکھتی رہی پھر پراسرار انداز لہجے میں چپکے سے بولی: "تم میری مدد کرنے کا وعدہ کرو تو بتاؤں!"

"میں کیا مدد کر سکتی ہوں تمھاری" زینت حیران سی ہو کر بولی۔

سلمیٰ چند لمحہ سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی تم کو تو معلوم ہی ہے کہ میری شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

"ہاں ہاں" "ایک بار تمھاری ممی نے بتایا تھا" زینت نے جواب دیا۔

سلمیٰ تھوڑی دیر چپ رہی پھر افسردگی سے بولی "جس سال میں نے ہائی اسکول پاس کیا تھا تو پاپا نے میری منگنی اپنے دوست کے لڑکے شوکت کے ساتھ کر دی تھی اور کہا تھا کہ میرے بی۔ اے کرنے کے بعد شادی ہو گی..... مگر اب وہ رشتہ مجھے پسند نہیں

آخر کیوں.... زینت نے حیرانی سے پوچھا۔

بس سمجھ لو کہ میں نہیں چاہتی... یا... یہ کہ میرے دل میں کچھ اور ہے" سلمیٰ شرمیلے انداز میں چپکے سے بولی۔

زینت حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُس کو دیکھتی رہی... وہ غریب ان باتوں کو کیا سمجھتی؟۔ اس نے تو صرف آنکھیں کھول کر رنج و الم کی پرچھائیاں ہی دیکھی تھیں۔

ایک لمحہ رک کر سلمیٰ بولی پاپا کو میری خوشی سے زیادہ اپنی زبان کا پاس ہے.... کل میں نے ممی سے دبے لفظوں میں اس رشتے پر ناگواری کا اظہار کیا تھا.. مگر وہ میرے اوپر بہت خفا ہوئیں کہ شریفوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔ اب کیا تم اپنے باپ کی بات نیچی کرو گی۔؟ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ جب سے پاپا اور ممی نے عارف کو دیکھا ہے دونوں ہی کو اپنی اس جلد بازی پر دل ہی دل میں بہت افسوس ہے.... مگر اپنی بات کی خاطر خاموش ہیں۔

تو پھر تم کیا کر سکتی ہو۔ زینت نے سادگی سے پوچھا۔

یہی تو میں کہہ رہی ہوں سلمیٰ بولی۔ اگر تم تھوڑی سی ہمت کرو، تو شاید میری جان وہاں سے چھوٹ جائے وہ لوگ آج کل یہاں آئے ہوئے ہیں۔ اگر تم ان کی ماں سے جا کر کہہ دو کہ لڑکی اس رشتہ کے لئے تیار نہیں ہے... تو وہ سیدھے سادے لوگ ہیں مجھے یقین ہے کہ ضرور انکار کر دیں گے۔

لیکن اگر یہ بات پھیل گئی اور ان کی بھابی میں میری کرکری ہو گئی۔ تب کیا ہوگا؟ زینت سہمے ہوئے انداز میں بولی: "نہیں سلمیٰ بی بی ۔۔۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ میری مانو چپکے سے والدین کی پسند پر سر جھکا دو ۔۔۔ دنیا میں سبھی لڑکیوں کی شادیاں والدین کی پسند سے ہوتی ہیں۔

"نہیں زینت" تم مجھے مجبور نہ کرو۔ سلمیٰ خوشامدانہ انداز میں دھیرے سے بولی۔ میری بہن ۔۔۔ دیکھو میں عمر میں تم سے بڑی ہوں میرا اتنا سا کام کر دو۔ زندگی بھر تمھارا احسان مانوں گی۔

لیکن اگر میری بدنامی ہوئی، تو میں کیا کروں گی۔ زینت دل ہی دل میں ڈر کر بولی۔ وہ اتنی بے وقوف نہ تھی کہ اس بات کی اہمیت نہ سمجھتی۔

اوہ ۔۔۔ تم تو بڑی ڈرپوک نکلیں۔ سلمیٰ زیر لب مسکرا کر بولی۔ چلو میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر یہ بات پھیل گئی۔ تو میں خود ممی اور پاپا سے کہہ دوں گی کہ میں نے تم کو بھیجا تھا۔ بس اب اطمینان ہوا۔ کہو تو لکھ کر دے دوں؟

نہیں لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ زینت کسی قدر آمادگی سے بولی: "لیکن میں ان لوگوں کو کیا جانوں۔

سلمیٰ خوش ہو کر بولی: "تم نہیں جانتیں تو کیا ہوا، میں تو جانتی ہوں۔ کل کسی بہانے سے میں تمھارے ساتھ چلوں گی، اور دور سے ان کا گھر بتا دوں گی تم چلی جانا۔ ان کے گھر صرف اُن کی بوڑھی ماں ہوں گی تم ان سے سب باتیں بتا دینا۔ چاہے میری کچھ برائی بھی کر دینا مجھے کوئی دکھ نہ ہوگا۔ اور یہ منگنی کی انگوٹھی بھی واپس کر دینا۔ اس نے اٹیچی سے انگوٹھی نکال کر زینت کو دے دی اس سے انھیں کامل یقین ہو جائے گا۔

زینت نے دیکھا وہ ایک کشتی نما بیش قیمت انگوٹھی تھی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی: "دیکھو خدا کرے بات بن جائے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ اس کے لب و لہجے سے خوف عیاں تھا۔

سلمیٰ اس کے ساتھ گیٹ تک آئی اور تسلی آمیز لہجے میں بولی ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ بس زیادہ زور اس بات پر دینا کہ وہ غیض میں آ کر خود ہی اپنی طرف سے بات ختم کر دیں۔

دوسرے دن حسب وعدہ سلمیٰ اُسے گھر بتا کر چلی آئی۔ زینت جھکی جھکی سی ڈری ڈری سی جھجکتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ سامنے دالان میں تخت پر ایک ادھیڑ عمر کی پُر وقار خاتون چشمہ لگائے اخبار پڑھ رہی تھیں آہٹ پا کر انھوں نے سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اور اخبار ایک طرف رکھ کر نرم لہجے میں بولیں آؤ بیٹی ۔۔۔ تم کون ہو؟ میں نے پہچانا نہیں۔؟

زینت نے ادب سے سلام کیا اور تخت کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ وہ یوں ہانپ رہی تھی جیسے دوڑتی ہوئی آئی ہو۔ ذرا دیر لمبی لمبی سانسیں لے کر اس نے اپنے حواس درست کئے پھر دھیرے سے بولی۔ مجھے سلمیٰ نے یہاں بھیجا ہے۔

کون سلمیٰ ۔۔۔ انھوں نے قدرے حیرانی سے پوچھا۔

"آپ کی ہونے والی بہو" زینت نے ایک نظر انھیں دیکھ کر مدھم لہجہ میں کہا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر انھوں نے پوچھا تم نے بتایا نہیں کہ سلمیٰ نے تمھیں کیوں بھیجا ہے؟

جی وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ زینت نہ جانے کیوں ہکلانے لگی۔ وہ دراصل اتنی بڑی بات منہ سے نکالتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ لیکن چند لمحوں کے بعد وہ اپنی ساری ہمت یکجا کر کے چپکے سے بولی وہ آپ کے بیٹے سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔

"ہوں" کہہ کر انھوں نے کڑی نظروں سے زینت کو دیکھا اور ایک لمحہ بعد بولیں اس انکار کی کوئی وجہ تو ہوگی۔ انھوں نے سوالیہ انداز میں اُس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ زینت مارے ڈر اور خوف کے تھر تھرا رہی تھی۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ وہ اپنے چچا کے لڑکے سے جو حال ہی میں کینڈا سے اپنی تعلیم پوری کر کے آئے ہیں۔ شادی کرنا چاہتی ہیں۔

شوکت کی والدہ کا چہرہ کسی قدر پژمردہ ہو گیا۔ ذرا دیر سوچتی رہیں پھر سخت لہجہ میں بولیں جب اُن کی لڑکی کو یہ رشتہ پسند نہیں تو انجینئر صاحب کو خود ہی انکار کا خط لکھنا تھا۔ سلمیٰ کون ہوتی ہے انکار کرنے والی، شریفوں کا یہ چلن نہیں ہے۔

"ان لوگوں کو اپنی زبان کی لاج ہے" زینت نے کہا۔ وہ اپنی بات ہیٹی کرنا نہیں چاہتے۔

"تو میں کیا کروں" شوکت کی والدہ نے غصے سے بولیں [illegible]

[illegible]

نہ ملتا تو آپ کے بیٹے کی بہو تو نہ ہوگی۔ اس لئے آپ کو یہاں کر [illegible] زینت نے انھیں سمجھایا۔ دیکھئے تا [illegible] رشتے کبھی نبھتے نہیں یہ تو آپ بھی جانتی ہوں گی۔

"اچھا تم ہی انکار کر دوں گی۔ لیکن اس کا کیا ثبوت ہے کہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ سچ ہے؟"

زینت نے انگوٹھی ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "لیجئے یہ منگنی کی انگوٹھی خود سلمیٰ نے واپس کی ہے۔"

شوکت کی والدہ نے ایک نظر انگوٹھی کو دیکھا اور پھر بولیں "تم انجینئر صاحب کی کون ہو؟"

"کوئی بھی نہیں" زینت نے ایک نظر انھیں دیکھ کر جھکاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "میں ان کی لڑکیوں کو ٹیوشن دیتی ہوں۔"

"تمہارے والد کیا کرتے ہیں بیٹی۔" انھوں نے مزید دریافت کیا۔

"میرے والدین میرے بچپن میں ہی ماں باپ دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔" زینت نے نظریں نیچی کرتے ہوئے کہا "کوئی بھائی بہن بھی نہیں۔ میں اکیلی ہی تنہا ہوں۔" اس کی آواز بھر آگئی۔

"یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔" شوکت کی والدہ اسے تاسف بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "شادی تو ہو چکی ہوگی تمہاری۔"

مارے شرم کے زینت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے نظریں نیچی کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "جی نہیں۔"

شوکت کی والدہ کو نہ جانے کیوں اس سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو انھوں نے پسندیدہ نظروں سے دیکھا اور محبت بھرے لہجہ میں بولیں۔ "پھر بیٹی۔ ضروریات زندگی کا خرچ کہاں سے آتا... میرا مطلب ہے کہ کچھ تمہارے والد کی جائیداد وغیرہ..."

"کچھ بھی نہیں۔" زینت بات کاٹ کر افسردگی سے بولی "میرے والد کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ امی مرحومہ نے جانے کن مشکلوں سے جونیئر ہائی اسکول تک تعلیم دلوائی... اس کے بعد ایک [illegible] صاحب کی [illegible] کو پنشن ملنے پر پرائمری اسکول [illegible] میں لگی ہوں۔ پچھلے سال امی کا بھی انتقال ہو گیا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"صبر کرو بیٹی۔" شوکت کی والدہ شفقت سے بولیں۔ "اللہ تمہارے ساتھ ہے۔"

اتنے میں باہری کمرے کا پردہ ہٹا کر شوکت دالان میں آگیا۔ ایک لمحہ زینت کو اجنبی نظروں سے دیکھا پھر بولا "اماں جان یہ کون ہیں؟ انھیں پہچانا نہیں میں نے۔"

"یہ تمہارے انجینئر چچا کے یہاں سے آئی ہیں۔" انھوں نے افسردہ ہو کر کہا۔ "سلمیٰ نے ان سے کہلایا ہے کہ اُسے یہ رشتہ اب پسند نہیں ہے اس لئے ہم لوگ اپنی طرف سے انکار کر دیں۔"

"لاحول ولا..." شوکت ایک لمحہ کے لئے ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد کسی قدر غصہ سے بولا۔ "چچا صاحب انھوں نے خود کیوں نہیں انکار کیا؟"

"یہ انکار نہیں تو اور کیا ہے؟" اس کی والدہ سخت لہجہ میں بولیں۔ "والدین کو خبر بھی نہیں۔ اس لڑکی نے چپکے سے کہلوایا ہے تاکہ انکار ہماری طرف سے ہو جائے۔ اس نے منگنی کی انگوٹھی بھی واپس کر دی ہے۔"

"کمبخت بے غیرت کہیں کی۔" شوکت دل ہی دل میں تلملا کر بولا۔ "ان کے والدین کو خبر نہیں تو آپ بھی خاموش رہیئے۔ پھر شادی کے بعد دیکھوں گا کہ کس کی مرضی۔" مارے غصہ کے اس کا چہرہ تپ سا گیا۔ زینت نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور لرز کر رہ گئی۔ اب وہ یہاں تک آنے سے پچھتا رہی تھی۔

اس کی والدہ بگڑ کر بولیں "بے مرضی کی شادی کر کے مجھے اپنا گھر جہنم تھوڑی بنانا ہے۔ میں آج ہی انکار کا خط لکھ دوں گی۔"

زینت گھبرا کر جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شوکت کی والدہ خلوص سے بولیں۔ "بیٹھو بیٹی... ایک کپ چائے تو پی لو۔ دیکھو نوکرانی کب کی سبزی ترکاری لینے بازار گئی تھی۔ ابھی تک واپس نہیں آئی۔ لاؤ میں ہی ایک کپ چائے بنا لاؤں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئیں... شوکت اور اس کا غصہ دیکھ کر زینت ایسی ہراساں ہوئی کہ اس سے ایک لفظ بھی بولا نہ گیا وہ پھر بیٹھ گئی۔

شوکت طنزیہ مسکراہٹ سے بولا۔ "یہ صاحبہ انجینئر صاحب کی کون ہیں جو آپ ان کی اتنی خاطر کر رہی ہیں؟"

شوکت کی والدہ نے ایک نظر زینت کو دیکھا اور محبت سے بولیں یہاں کی چھوٹی لڑکیوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے اور......

اوہو شوکت بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔ تو یہ محترمہ پڑھی لکھی ہیں... مگر پھر یہ کٹنیوں والا کام کیوں کرنے لگیں... شاید اس سے زیادہ آمدنی ہوتی ہوگی... کیوں ___ شوکت نے اسے مخاطب کیا۔ یہاں سے انکار ہو جانے پر سلمیٰ نے تم کو کیا انعام دینے کو کہا ہے۔؟

خدا کی پناہ... کیسی ذلت نصیب ہوئی۔ زینت نے دل ہی دل میں تلملا کر سوچا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

شوکت کی والدہ کچن کی طرف جاتے جاتے رک کر بولیں نہ بیٹا... اسے کچھ مت کہو۔ یہ تو سلمیٰ کے کہنے پر چلی آئی بیچاری کے ماں باپ بھائی بہن کوئی بھی نہیں۔ انھوں نے دلی ہمدردی سے غریب لڑکی ___

شوکت نے ماں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اونہہ غریب لڑکی... شوکت نے اسے سر سے پیر تک گھور دیکھ کر مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ صورت ایسی اور کرتوت ایسے۔

زینت کے دل پر جیسے شوکت نے برچھی سی ماری، وہ تلملا اٹھی۔ دل ہی دل میں خود کو کوستے ہوئے اس نے سوچا اُف... اب یہ آدمی اس کی کتنی ذلت کرے گا... کاش وہ یہاں نہ آئی ہوتی۔

مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ اتنی ذلت تو اس کی قسمت میں لکھی ہی تھی۔

شوکت نے کچن میں جا کر اپنی ماں سے پوچھا "اماں بی! ... آپ نے دیکھی ہی انگوٹھی وہی ہے۔ کہیں بدل تو نہیں لی" "اب ایسی اندھیر بھی نہیں۔" اس کی ماں سنجیدگی سے بولیں "وہیں تخت پر پڑی ہے تم خود دیکھ لو" شوکت دالان میں لوٹ گیا۔ تخت پر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ اچانک اس کا چہرہ کھل [illegible] سے [illegible] ہوتے انتہائی خوش دلی سے بولا۔ محترمہ سلمیٰ کو یہ رشتہ پسند نہیں تھا... مگر ایسا لگتا ہے کہ آپ کو یہ رشتہ پسند ہے۔

[illegible]... سر

اٹھا کر گھورتی ہوئی نظروں سے اس نے شوکت کو دیکھا اور انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں بولی۔ ہوش میں رہیے آپکا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ہے۔ بات کرنے کی بھی تمیز نہیں... باقی الفاظ مارے غصہ کے اُس کی حلق میں پھنس گئے اور اپنی ذلت اور کم مائیگی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے

مجھے تمیز بعد میں سکھائیے گا شوکت دبی دبی مسکراہٹ سے بولا پہلے اپنا ہاتھ دیکھئے!

زینت دھک سے رہ گئی۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ مانو سربازار چوری کرتے پکڑی گئی ہو۔ جتنے غصے سے وہ شوکت سے مخاطب ہوئی تھی اتنی ہی شرمندگی سے وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

گھر سے یہاں تک وہ انگوٹھی مٹھی میں دبا کر لائی تھی اور شوکت کی والدہ سے بات کر کے اس نے انگوٹھی اُن کے سامنے تخت پر رکھ دی تھی۔ مگر پھر اچانک شوکت کے آجانے پر کچھ شرم اور کچھ اس کی طنز آمیز باتیں سن کر گھبراہٹ اور کھسیانے انداز میں وہ انگوٹھی اٹھا کر پہلے تو یونہی تخت پر ادھر اُدھر گھماتی رہی پھر نہ جانے کب اور کیسے اس نے وہ انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔

اللہ توبہ... وہ آخر شوکت کو دیکھ کر اتنی بدحواس کیوں ہو گئی تھی! اُس نے غم و غصہ سے سوچا اور جلدی جلدی انگوٹھی اتارنے لگی۔

شوکت ہنستے ہوئے زور سے بولا اماں بی... دیکھئے ان محترمہ کو یہ رشتہ منظور ہے۔ لائیے کچھ شکر وغیرہ سے ان کا منہ میٹھا کر دیجئے... آپ کو بہو مل گئی۔

خدا کی پناہ! کیسے جوتے پڑ رہے ہیں۔ زینت نے انتہائی شرمندگی سے دل ہی دل میں خود کو کوستے ہوئے سوچا۔ انگوٹھی اتار کر اس نے تخت پر ڈال دی اور رونے والے انداز میں بولی۔ معاف کیجئے گا میں نے بے خیالی میں انگوٹھی انگلی میں ڈال لی تھی اور......

میں کیا جانوں۔ شوکت بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولا ایسی [illegible] دل سے [illegible] جا سکتی ہے۔ بہرحال اب یہ انگوٹھی آپ کی ہے۔

لیجئے انشاءاللہ آپ ہی کے ساتھ میری شادی ہوگی۔

زینت کا دل چاہا کہ اس کی بوٹیاں اپنے دانتوں سے نوچ ڈالے۔ تلملا کر بولی۔ خدا آپ کو سمجھے۔ انسانیت کے جامے سے بالکل خارج ہی ہو گئے۔

سمجھ نہیں آیا آپ یہاں کیوں آئیں۔ شوکت اس کی بات ان سنی کرکے بولا۔ کیا میں آپ کو بلانے گیا تھا؟

وہ تو... وہ تو سلمیٰ کے رونے سے مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ زینت کسی قدر ہکلاتے ہوئے بولی۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔

اس سے ہمدردی تھی۔ شوکت دبی دبی سی مسکراہٹ سے بولا۔ مجھ سے ہمدردی نہیں جو میں کنوارا رہ جاؤں گا۔

غصہ کے باوجود زینت کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور شوکت زور سے ہنس پڑا۔ اس وقت شوکت کی ماں چائے کی ٹرے لے کر آتے ہوئے بولیں شوکت... کیوں اپنی بکواس سے بے چاری کو پریشان کر رہا ہے... لو بیٹی چائے... انھوں نے ایک کپ اسے تھما دیا۔

زینت کا جی ہو رہا تھا کہ انھیں سے لپٹ کر وہ خوب چیخ چیخ کر روئے۔ نہ جانے کن مشکلوں سے وہ اپنے آنسو روکے ہوئے تھی۔ اور دل ہی دل میں بے انتہا پشیمان تھی کہ دوسرے کے معاملے میں اُسے پڑنے کی کیا ضرورت تھی... خدا سمجھے اس بیچاری سلمیٰ کو... اسے دروازے تک پہونچا کر خود جانے کہاں جہنم ہو گئی۔ اور اسے اس ذلت میں پھنسا دیا۔

جلدی جلدی اپنے حلق میں چائے انڈیل لی۔ اور کپ تخت پر رکھ کر وہ بغیر دعا سلام کے جلدی سے باہر نکل گئی شوکت نے زور سے پکار کر کہا یاد رکھئے گا محترمہ... آپ کا منہ میٹھا ہو چکا اب آپ اس رشتہ سے مکر نہیں سکتیں۔

اس کی ماں نے کہا بس چپکے بیٹھو۔ کتنی پیاری لڑکی تھی ذرا دیر اس سے باتیں کرتی۔ تم نے اپنی فضول باتوں سے اُسے خفا کر دیا۔ ہر وقت تم کو مذاق ہی سوجھتا رہتا ہے بس۔

"مذاق کیسا امی بی" شوکت مسکرایا دیکھ لیجئے گا یہی آپ کی بہو ہوگی۔ یہ کتنی خراب بات ہے کہ اپنے سامنے کے ہیرے چھوڑ کر لوگ جہیز کے لالچ میں ٹھکر پتھر سمیٹ لاتے ہیں۔ اور پھر ان سے اپنا سر پھوڑتے ہیں۔ میں نے تو ٹھیک ہی کیا ہے آپ تو سلمیٰ کو بھی جا کر دیکھ چکی ہیں۔ ایمان کی کہئے گا کیا وہ اس سے زیادہ اچھی ہے؟

دونوں اپنی اپنی جگہ اچھی ہیں۔ اس کی ماں کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ سلمیٰ دبلی پتلی ہے۔ اور یہ اچھی خاصی صحت مند ہے جس سے رنگ روپ نکھرا ہوا ہے۔

تو پھر اللہ نے چاہا یہی آپ کے گھر آئے گی۔ شوکت دبی دبی مسرت سے بولا اس کی ماں نے بغیر کچھ کہے دوبارہ اخبار اٹھا لیا

آندھی پانی کی طرح زینت گھر میں داخل ہو گئی اور پلنگ پر گر گئی۔ غم و غصہ اور ذلت کے بھاری بوجھ کے تلے وہ دبی جا رہی تھی۔ پچھتاوے کا سمندر اس کے چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور پشیمانی کا احساس اس پر بری طرح حاوی تھا۔ وہ ایک سیدھی سادی نیک فطرت لڑکی تھی اور اس نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، جہاں ایک دل شکستہ بوڑھی ماں اور چاروں طرف دکھوں اور غموں کی پرچھائیوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے آج تک کسی گرے پڑے آدمی کو اپنے سے اتنا قریب نہ دیکھا تھا... نہ کہ شوکت جیسا قد آور خوبرو جوان جب اچانک اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ تو وہ اس کی پُر وقار شخصیت سے مرعوب ہو کر... اور اس کی طنز بھری دل آزار باتیں سن کر وہ ایسی گھبرائی کہ نہ جانے کیسے اور کب انگوٹھی اپنی انگلی میں ڈال لی۔ اللہ توبہ اسے یہ سب باتیں یاد کر کے جھرجھری سی آ گئی۔

رات اُسے مارے غم و غصہ کے خوب تیز بخار آ گیا۔ تین چار دن وہ انجینئر صاحب کے یہاں بھی نہ جا سکی اور پھر جب ان کا نوکر اسے بلانے آیا۔ تب مجبوراً وہ کسی طرح ان کے یہاں گئی۔ تھوڑی دیر وہ سلمیٰ کی والدہ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر سلمیٰ نے اُسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ زینت اندر آتے ہی بے ساختہ سلمیٰ سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے بولی سلمیٰ بی بی... آپ کا کام تو بن گیا۔ مگر میری بڑی ذلت ہوئی اور... اور باقی الفاظ اس کی سسکیوں میں دب گئے۔

ارے تم کو تو بڑا تیز بخار ہے۔ سلمیٰ گھبرا کر بولی کیا ہوا زینت

.... کیوں کیا ہوا ان کمبختوں نے تم کو مار پیٹا تو نہیں۔ زینت سسکیوں سے روتی رہی سلمیٰ بار بار گھبراہٹ میں پوچھتی رہی زینت کچھ کہو تو سہی کیا ہوا ایسا آخر پھوٹ پھوٹ کر رو کیوں رہی ہو؟۔

دو چار منٹ کے بعد زینت نے اپنی حالت پر قابو پا کر آنسو پونچھے اور پھر سلمیٰ کے اصرار پر اس نے کچھ غم وغصہ اور کچھ شرمیلے انداز میں وہاں کی کل باتیں بتائیں۔

سلمیٰ نے خوش ہو کر اسے لپٹا لیا اور دبی ہوئی مسرت سے بولی۔ اری نیک بخت.. تم واقعی بیوقوف ہو۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ کتنا خوش ہوتی مگر تم اتنی سی بات پر اس طرح رو رہی ہو، جیسے کہ تمہارے اوپر سینکڑوں ڈنڈے برسے ہوں۔ میں تو سچ مچ گھبرا گئی تھی اور ایک لمحہ رک کر چپکے سے شرارت آمیز لہجے میں بولی شوکت کتنا خوبرو ہے۔ تم کو تو خوش ہونا چاہئے۔

نا بی بی... زینت کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی میں غریب لڑکی.... یہ کہتے ہوئے اسے پھر شوکت یاد آگیا جس نے اس کی غریبی سن کر اس کے جسن پر چوٹ کی تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ وہ بگڑے لہجے میں بولی مجھے اپنی عزت پیاری ہے، دراصل تمہارے انکار سے انھیں جو غصہ آیا تھا اسے میری ذلت کر کے نکال لیا... ورنہ کون ایسے رذیلوں سے رشتہ جوڑتا ہے۔ میں ایسی خوش فہمی میں نہیں رہتی۔ یہ ان کا پیغام نہیں، میرا مذاق اڑانا تھا۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگا کرتا۔

اسے اپنی ذلت اور وہ پشیمانی جو انگوٹھی پہن کر ہوئی تھی کسی طرح نہیں بھول رہی تھی۔ سلمیٰ سے رخصت ہو کر وہ اپنے گھر آگئی۔ یونہی ایک ہفتہ گزر گیا۔ مسلسل بخار کی وجہ سے وہ اسکول بھی نہ جا سکی۔ اس کے شب و روز اسی خلش اور کوفت میں گزر رہے تھے۔

شوکت نے زینت کا مذاق اڑایا تھا۔ لیکن زینت کے جانے کے بعد اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کہ اس نے خود اپنا ہی مذاق اڑایا ہو۔ زینت نے اپنی باتوں سے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اس کی معصوم صورت اس کی نگاہوں میں گھومتی رہی دیر تک وہ خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کئی رسالے اور کئی کتابیں اس نے پڑھنے کے لئے اٹھائیں۔ لیکن کسی کی چند سطریں بھی نہ پڑھ سکا۔ پھر نوکر نے آکر کہا۔ بیگم صاحبہ کھانے پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں؟ شوکت اٹھ کر کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ لیکن اس کی بھوک بھی جیسے زینت کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ ماں کو دکھانے کے لئے وہ کچھ نہ کچھ کھاتا رہا۔ ماں غور سے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ آخر کار انھوں نے کہا۔ بیٹا! اس میں رنج کرنے کی ضرورت نہیں۔ سلمیٰ سے بہتر ہو تمہارے لئے لاؤں گی۔ لڑکیوں کی کمی نہیں۔ اور پھر منگنی ہی تو ہوئی تھی۔ منگنیاں تو ہوتی اور ٹوٹتی ہی رہتی ہیں۔

شوکت نے ماں کو کوئی جواب نہ دیا۔ نیپکن سے ہاتھ منہ پونچھ کر اٹھ گیا۔ اماں بی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ شوکت کو سلمیٰ کے طرز عمل سے افسوس نہیں۔ وہ زینت کو پسند کر بیٹھا ہے۔ کئی روز تک جب شوکت کی افسردگی کم نہ ہوئی تو اماں بی نے بہ اصرار اس کا سبب پوچھا۔ شوکت اب اپنا غم چھپانے پر قدرت نہ رکھتا تھا۔ اس نے صاف صاف اماں بی سے کہہ دیا کہ میں اسی غریب لڑکی سے شادی کروں گا۔ جس کی میں نے بے عزتی کی تھی۔

اماں بی نے متحیر ہو کر کہا۔ "بیٹے! وہ کون ہے، کیا ہے۔ ہم کچھ بھی تو نہیں جانتے۔ رشتہ برابر والوں میں کیا جاتا ہے۔ تمہاری خوشی بیحد پیاری ہے، لیکن ____

ماں! شوکت نے بلند آواز میں کہا۔ "لڑکی حسین ہی نہیں نیک اور شریف بھی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ ایسے کام کے لئے تیار نہ ہو جاتی جو اس نے کیا ہے۔

ماں نے بات کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔ لیکن ابھی تمہارے انجینئر چچا نے تو انکار نہیں کیا۔

"شادی انجینئر چچا سے نہیں، ان کی بیٹی سے ہوتی۔ اسی نے انکار کر دیا تو اب میں قیامت تک اس سے شادی نہ کروں گا اور یہ بھی سن لیجئے کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے جسے سلمیٰ نے بھیجا تھا۔

"تو پھر معلوم کرو۔ وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے۔" ماں نے کہا شوکت نے کہا یہ سب میں معلوم کر لوں گا۔

انجینئر صاحب کے نوکر کو ٹپ دے کر شوکت نے زینت کا پتہ معلوم کر لیا۔ لیکن اس نے خود اس کے گھر جانا مناسب نہ سمجھا اپنی اماں بی کو لے گیا۔

زینت کا [illegible] گیا تھا لیکن چند ہی سال میں رنج و الم اور [illegible] نے اماں بی [illegible] ہی بدل دی تھی۔ پھر بھی اسے اماں بی پہچانی سی لگیں۔ زینت نے انھیں پہچان لیا۔ جلدی سے ادب سے انھیں سلام کرکے کرسی پر بیٹھنے کیلئے کہا۔ قریب سے دیکھ کر اماں بی بھی اسے پہچان گئیں اور تاسف کے ساتھ بولیں۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ بیٹی تمھیں۔ کیا نصیب دشمناں طبیعت کچھ ناساز ہے۔

"جی ہاں۔ آپ کے یہاں سے آتے ہی مجھے بخار آگیا تھا۔ اب تو بہتر ہوں۔ کئی روز تو میرے ہوش وحواس ہی ٹھیک نہ تھے۔ پاس پڑوس کی ہمدرد عورتوں نے میری تیمارداری کی، ورنہ ....."

اماں بی نے زینت کی بات کاٹ کر کہا: "شوکت بے حد شرمندہ ہے کہ اس نے تمھارا مذاق اڑایا تھا۔ وہ ـــــ"

زینت نے نقاہت کے ساتھ کہا: "بیراجی نہیں، انھوں نے غریبی کا مذاق اڑایا تھا اور غریبی چیز ہی ایسی ہے کہ اس کا مذاق اڑایا جائے۔"

"نہیں، نہیں، بیٹی۔" اماں بی نے بڑے ہی پیار بھرے لہجہ میں کہا۔ "وہ باتیں ہی ایسی کرتا ہے۔ ہنسی مذاق اس کی گھٹی میں شامل ہیں۔ بچپن سے اسی طرح باتیں کرتا ہے۔ ویسے اسے بیحد افسوس ہے وہ تم سے معافی مانگنے کے لئے بےچین ہے معاف کردو اسے بیٹی۔ اور ـــــ اور"

اماں بی جو کچھ کہنا چاہتی تھیں کہہ نہ سکیں، اس لئے جھینپ کر پوچھا: "آپ اور کیا کہنا چاہتی ہیں اماں بی۔"

بات ایسی ہے بیٹی کہ کہتے ہوئے ذرا لحاظ ہوتا ہے کاش تمھارے کوئی بزرگ ہوتے اور میں ان سے تم کو اپنے بیٹے کے لئے مانگتی۔

زینت نے آنچل اپنے منہ پر ڈال لیا۔ وہ تو خود ہی شوکت کو چاہنے لگی تھی۔ فرط مسرت سے اس کا تنفس بڑھ گیا۔ اماں بی نے اس کے شرمانے پر کہا: "خدا تمھاری عمر دراز کرے اس زمانے میں بھی تم جیسی بیٹیاں ہیں، یہ بڑی خوشی کی بات ہے اب اقرار کرلو کہ تم میرے گھر کی رونق بننے کے لئے تیار ہو۔ شوکت تمھارے غم میں پاگل ہو رہا ہے۔ کھانا پانی بھی بس جیسے چھوٹ ہی گیا ہے۔ ہر وقت تمھیں رٹا کرتا ہے لالہ اب بس تمھیں لینے پڑا رہتا ہے۔

اماں بی نے زینت کے چہرے پر سے آنچل ہٹا کر اس کی بلائیں لیں تو زینت نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور فرط جذبات سے اماں بی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔

اماں بی نے کہا تو میں شوکت سے کہہ دوں کہ تم کو یہ رشتہ منظور ہے۔

"سوچ لیجئے" زینت نے بمشکل تمام گھٹے گھٹے لہجہ میں کہا۔ "کیا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگ سکتا ہے؟"

"تم ٹاٹ نہیں، مخمل سے بھی بہتر ہو بیٹی" اماں بی نے کہا "دولت آنی جانی شئے ہے۔ اس پر ناز کرنے والے پاگل ہوتے ہیں۔"

اور چند ہی روز بعد شوکت و زینت کا نکاح نہایت سادگی کے ساتھ ہو گیا۔ پاس پڑوس کی عورتوں کے سوا کسی اور کو علم ہی نہ ہو سکا۔ نکاح کے بعد شوکت کی ماں نے دعوت ولیمہ کے کارڈ تقسیم کرائے تو سلمیٰ کے والد کو بھی دعوت نامہ ملا۔ وہ اسے پڑھکر حیران رہ گئے۔ اسی وقت غصے کے عالم میں شوکت کی ماں کے پاس پہونچے تاکہ اس عہد شکنی کے سلسلے میں ان کا جواب حاصل کریں۔

شوکت کی ماں نے انھیں عزت واحترام کے ساتھ بٹھایا پیچ وتاب کھاتے ہوئے انجینئر صاحب نے کہا: "مجھے آپ سے ایسی امید نہیں تھی بھابی۔ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے بھی قابل نہیں رہ گیا۔ سارے خاندان کو علم ہے کہ سلمیٰ کی منگنی شوکت میاں سے ہو چکی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔"

شوکت کی ماں نے تمام واقعات بیان کرتے ہوئے یہ بھی بتادیا کہ منگنی کی انگوٹھی تک سلمیٰ نے واپس کردی تھی۔

بیٹی کی یہ حرکت سن کر انھیں اتنا صدمہ ہوا کہ ان پر ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ شوکت نے انھیں اسپتال میں داخل کیا بڑی دوڑ دھوپ ہوئی، روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔ انجینئر صاحب کا انتقال ہو گیا ـــــ بعد میں معلوم ہوا کہ کناڈا سے آئے ہوئے سلمیٰ کے چچازاد بھائی نے بھی سلمیٰ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

قلمی دوستی

رضیہ بٹ

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر میز پر پڑی۔ نیلے رنگ کا لفافہ گلدان کے نیچے پڑا تھا۔ کتابیں پلنگ پر پھینک کر وہ بے تابی سے لفافے پہ جھپٹا۔ یقیناً یہ شکیلہ ہی کا خط تھا۔ ہمہ شوق اس نے لفافہ ہاتھوں میں لیا۔ پتہ وہی تھا جو اس نے شکیلہ کو لکھا تھا۔

"مس عطیہ رحمان"! اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا اور پھر والہانہ شوق سے لفافہ چاک کرتے ہوئے قریبی کرسی پر آ کر اور پھاڑ کر خط نکال کر پڑھنے لگا۔ خط مس شکیلہ ہی کا تھا۔

پیاری عطیہ! سلامِ شوق۔

میں نے قلمی دوستی کے لئے رسالے میں اپنا پتہ دیا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے کئی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ لیکن آپ کی تحریر میں کچھ ایسا جادو ہے کہ سب سے پہلے آپ ہی کو خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے آپ یہ سلسلہ منقطع نہیں کریں گی اور یوں ہم ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔

اس کے بعد شکیلہ نے اپنے مشاغل لکھے تھے۔ اسے خط لکھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ نئے نئے لوگوں سے دوستی کی خواہش بھی شدید تھی۔ بڑی چاہت سے اس نے اس خط کا جواب طلب کیا تھا انتظار کی زحمت گوارہ کرنے کی تاب ہی نہ تھی اس میں۔

خط کو ایک بار نہیں کئی بار پڑھنے کے بعد اس نے تہہ کر کے جیب میں ڈال لیا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ تھی آنکھیں شوخ شوخ سی چمک لئے تھیں جو اس خط سے چھلکی پڑ رہی تھی پھوٹ رہی تھی اس کا جواب دینے کو وہ مضمون سوچ رہا تھا۔

چند دن ادھر کی بات تھی، وہ کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا عام رسالہ تھا۔ قلمی دوستی کے عنوان سے ایک پورا کالم تھا جس میں لڑکے لڑکیوں کے پتے مع ان کے مشاغل کے لکھے تھے۔ اسے جانے کیا سوجھی۔ شکیلہ احمد نام اچھا سا لگا۔ اس کے مشاغل بھی پسند آئے۔ پہلی فرصت میں اس نے اسے خط لکھنے کا سوچا اور پھر مس عطیہ رحمان کے فرضی نام سے خط لکھ دیا۔۔۔ یہ خط لڑکی بن کر لکھا۔ آج جواب متوقع تھا۔

کالج سے آتے ہی وہ سیدھا اپنے کمرے میں آیا۔ صبح ملازم کو تاکید کر گیا تھا کہ مس عطیہ رحمان کے نام کوئی خط آئے تو اماں کو بتائے بغیر اس کے کمرے کی میز پر رکھ دے۔

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اک انوکھی سی خوشی، اک انجانا سا سرور اس کے رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ کچھ اپنے پن کا احساس یوں آپ من میں ابھر رہا تھا شاید اس لئے کہ کسی لڑکی کی طرف سے اس نے یہ پہلا خط پایا تھا۔

اسی دن اس نے شکیلہ کو خط کا جواب لکھ دیا۔ بڑے محتاط انداز میں۔ لیکن اس کا جذبہ شوق ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا تھا۔ یہ خط بھی لکھا تو مس عطیہ رحمان بن کر لکھا، لیکن نفسِ مضمون یہی تھا کہ آپ کیسی ہیں شکل و صورت کیسی ہے، رنگ سپید ہے یا گندمی، بال سیاہ ہیں یا سنہرے، آنکھوں کی رنگت نیلگوں ہے یا تیرہ و تار رات کی سی۔ عجیب بیتابی سی تحریر میں تھی۔ ایک ایک لفظ کو زبان مل گئی تھی۔

خط پوسٹ کر کے وہ آیا تو انتظار کے لمحے اسی وقت سے کوفت دینے لگے۔ وہ بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔ تصور کی آنکھ سے وہ شکیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ اور پھر مستقبل آئینے کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ اس آئینے میں شکیلہ کا پیکر متحرک رہا تھا۔

رات بھر وہ بے چین سی کیفیت میں مبتلا رہا۔ سوتے جاگتے میں رنگین خواب بنتے بگڑتے رہے۔ پہلا خط تو اس نے محض شغلاً لکھا تھا لیکن دوسرے خط میں وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

حسبِ توقع چوتھے دن خط کا جواب آگیا۔ شکیلہ نے بھی کچھ اسی کی سی بے چینی کا اظہار کیا تھا۔ اسی کے الفاظ لوٹائے تھے۔ بڑی محبت سے لکھا تھا: "پہلے آپ اپنے متعلق بتائیے، پھر میں لکھوں گی۔ ویسے یہ کہہ دوں کہ میں بدصورت نہیں ہوں۔ دیکھنے والے تو بہت کچھ کہتے ہیں خدا جانے مبالغہ آرائی کرتے ہیں یا سچ!"

اس کے بعد کچھ رسمی سی باتیں تھیں اور آخر میں جواب کا اشتیاق اور بے چینی سے انتظار کا بار بار لکھا تھا۔

اس خط سے بات آگے بڑھ گئی۔ شکیلہ یقیناً بہت خوبصورت تھی۔ اس دفعہ تو اس نے اپنے خاندان کے متعلق بھی لکھا تھا۔ ایک باوقار خاندان سے تعلق تھا اس کا۔ طرزِ تحریر کی بھی معقولیت تھا۔ وہ تو خط پڑھ کر دیوانہ سا ہو گیا۔ اپنی قسمت پر آپ ہی آپ رشک

رات ایک بجے تک اپنے رائٹنگ ٹیبل پر جھکا وہ شکیلہ کو محبت نامہ لکھتا رہا۔ گو اب بھی خط مس عطیہ کی طرف سے تھا۔ لیکن آج تو اس نے کھل کر اظہارِ محبت کر دیئے تھے۔ چن چن کر اس نے لفظ [illegible] مذکر کے بجائے مونث تحریر کئے تھے۔ اندازِ تحریر بھی محتاط تھا۔ خط لکھ کر کئی بار پڑھا۔ مبادا کہیں مذکر مونث کی غلطی نہ ہو گئی ہو۔ پھر اس نے مطمئن ہو کر لفافہ بند کیا اور صبح پوسٹ کرنے کے لئے بش شرٹ کی جیب میں ڈال کر بستر پر آ گیا۔ وہ اطمینان سے سو سکا۔ ایک عجیب قسم کی کھلبلی سی من میں مچی تھی۔ زندگی کے اس حسین لیکن عجیب اتفاق سے وہ مسرور ہو رہا تھا۔

پھر تیسرے دن شکیلہ کا خط آیا۔ حسبِ سابق رعنائیاں شادابیاں اور دلفریبیاں لئے۔ صاف چھپے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں والی بات تھی۔ شکیلہ نے تو اپنی تحریر سے اس بار اس کا جذبہ شوق کچھ اس طرح ابھار دیا تھا کہ وہ بے پئے مدہوش ہو گیا تھا۔

اور پھر یونہی خطوط کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہر خط نامۂ محبت ہوتا۔ ہر خط میں بے چینی ہوتی۔ انتظار کی صبر آزما کیفیتوں سے دوچار دونوں ہی تھے۔

پھر اسے صبر کا یارا نہ رہا۔ کب تک وہ مس عطیہ رحمان بن کر اپنے جذبات کو دبائے رکھے گا۔ محبت کی جس منزل پر وہ تحریروں کے ذریعے پہنچ گیا تھا وہاں یہ راز راز رہنا نہیں چاہیئے تھا کیوں نہ وہ شکیلہ کو بتا دے کہ وہ مس عطیہ رحمان نہیں، آصف رحمان ہے۔

آصف رحمان جوان دیکھی شکیلہ سے محبت کی اونچی اونچی سرحدیں پھلانگ کر ملنے کا تمنائی ہے۔ شکیلہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہے جسے اس نے محبت کی شدتوں سے چاہا اور اپنا لینے کا عہد کر لیا ہے۔

مگر کئی دن سوچتا رہا۔ اس کے آخری خط کا جواب بھی اسی سوچ کی نذر ہو گیا۔ شکیلہ شاید اس سے بھی دو قدم آگے نکل چکی تھی۔ تیسرے دن پھر خط آ گیا۔ جس میں دو تہذیبی بے تابیاں چھپائے نہ چھپ سکی تھیں۔ جواب میں تاخیر آخر ہوئی کیوں؟ اس نے اس کیوں کا جواب طلب کیا تھا۔

وہ کشمکش کی حالت سے نکل چکا تھا۔ اس نے انکشاف کا تہیہ کر لیا تھا۔ قلمی دوستی حقیقت کے روپ میں سامنے آ گئی تھی۔ اب اسے مزید راز میں رکھا نہیں جا سکتا تھا۔

اور تو اور اس نے تو اماں سے بھی دل کی بات کہہ دی۔ ایک ہی بیٹا تھا۔ اپنی بات منوا لینے کی اسے عادت تھی۔

اماں۔ آپ کو بہو چاہیئے نا!۔

کیوں نہیں، تو جلدی سے امتحان دے لے پھر بہو بھی لے آؤں گی۔

"پسند تو امتحان سے پہلے بھی کی جا سکتی ہے نا!"

"کیوں نہیں!"

میری پسند آپ کی پسند ہو گی اماں۔

اور پھر اس نے پوری تفصیل کے ساتھ شکیلہ کے بارے میں اماں کو بتا دیا۔ اپنے بیان میں کچھ ایسی رنگ آمیزی کی کہ اماں بھی بنا دیکھے لڑکی کے حسن و جمال، اس کے باوقار خاندان اور اس کے بلند کردار سے متاثر ہو گئیں۔

اسی رات اس کے خط میں انکشافی لمحہ پھٹ پڑا۔ اس نے اپنے متعلق پوری تفصیل سے شکیلہ کو لکھ دیا۔ اپنے خاندان، اپنی مالی حیثیت، اپنی جائداد سب کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا۔ شکیلہ کے گھر جانے اور اپنی اماں سے اس کے والدین کا تعارف کرانے کا بھی شوق سے لکھا۔ اس خط میں اس نے اپنی ایک خوبصورت سی تصویر بھی ملفوف کی۔ اس تصویر کے جواب میں شکیلہ کی تصویر بھی مانگی اور پھر جتنے جملے وہ وضع کر سکتا تھا، جتنے الفاظ وہ تلاش کر سکتا تھا خط کے جواب کے ضمن میں اس نے لکھ دیئے۔

خط پوسٹ کرکے وہ انتظار کے ایک ایک لمحے کی کوفت سہنے لگا۔ حسبِ توقع چوتھے دن خط آ گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ لفافے پر جھپٹا جو میز پر مجسم انتظار کی طرح پڑا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ تین دن اس نے بڑی صبر آزما کیفیتوں میں گزارے تھے۔ کبھی امید جاگتی تھی۔ اور کبھی ناامیدی کے سیاہ دھندلکے چھا جاتے تھے۔ کہیں شکیلہ برا مان جائے۔ اسے دھڑکا تھا کہ جیسے لفظ نے توڑ کے اس کے حسین محل چکنا چور کر دے۔

خط کھولنے سے پہلے وہ دھڑکتے دل سے نفس مضمون کا قیاس آرائی کر رہا تھا۔ بند لفافے کو اس نے انگلیوں سے ٹٹولا۔ لفافے میں تصویر تھی۔ تصویر ـــــ شکیلہ کی تصویر۔

فرطِ مسرت سے اس کا جی چاہا ناچنے لگے۔ شکیلہ نے اگر چہ اسے مانا ہوتا تو کبھی اپنی تصویر نہ بھیجتی خط کا جواب ہی نہ دیتی۔

وہ کرسی میں دھنس گیا۔ دل اب بھی دھک دھک کر رہا تھا۔ چہرہ اندرونی مسرتوں کے پرتو سے چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں خمار تھا۔ اور انگ انگ عجیب سے نشیلی انگڑائی سے ٹوٹنے لگا تھا۔

کانپتے ہاتھوں سے اس نے لفافہ کھولا۔

تصویر نکالی ـــــ

اور

حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ تصویر کو الٹا پلٹا کرسی پر کھڑے کو جھک آیا۔ لفافے کو دیکھا اور پھر تصویر پر نظریں جما دیں۔ لفافے میں کوئی خط نہیں تھا۔ پیڈ کے نیلے کاغذ میں صرف تصویر تھی۔

کسی نوجوان کی تصویر۔

جس کی پشت پر صرف اتنا لکھا تھا۔

فقط شکیل احمد

اکبر الہ آبادی
اور تعلیم نسواں

ـــــــ رضیہ اسلام ایم۔ اے

مصلح قوم اور شاعرِ بے مثال جناب اکبر آبادی لڑکیوں کی تعلیم کے مخالف نہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ لڑکیاں جاہل نہ رہیں، لیکن انھیں ایسی تعلیم دی جائے جو ان پر جلا کر کے انھیں ایسی بنائے کہ وہ خاتون خانہ ہی رہیں سوسائٹی گرل نہ بن جائیں۔ پردہ اور تعلیم نسواں کے سلسلہ میں حضرت اکبر الہ آبادی کے چند شعر ملاحظہ فرمائیں۔

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

بیشک معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے

لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت

آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
ہو وہ طریق جس میں ہو نیکی و مصلحت

ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ

عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے
اور حسنِ عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

آج کی تعلیم یافتہ لڑکیوں میں کتنی ہیں جو پڑھ لکھ کر ان ہدایات پر عمل پیرا ہوں۔ آج کی تعلیم تو بس بے حجابی۔ آزادی فیشن اور دین کی قید سے فرار سکھاتی ہے۔ کیا خوب حضرت اکبر ہی نے کہا ہے۔

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید
بے حجابی جو ہوا اس میں تو قباحت کیا ہے

نورِ اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ
شمعِ خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

تِلک کا بوجھ

عابد ضمیر

کریم میاں نے وسیم صاحب کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر رُندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وسیم صاحب! خدا کے لئے بارات واپس نہ لے جایئے۔ میں آپ سے اپنی عزت کی بھیک مانگتا ہوں۔ مجھے اس طرح ذلیل نہ کیجئے۔ اگر آپ اس طرح بارات واپس لے گئے تو میری ایک اور معصوم بیٹی بدنام ہوجائے گی اور پھر کوئی اس سے شادی کے لئے تیار نہ ہوگا۔"

بوڑھے کریم میاں کی کمر کچھ اور جھک گئی۔ ان کا جھرّیوں بھرا چہرہ غم واندوہ میں ڈوب گیا اور ان کی سفید پلکوں پر دو آبدار موتی لرز اٹھے۔

شامیانے کے اندر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ حیرت زدہ سا بیٹھا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر خاموش ہوچکا تھا اور ہر طرف موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

"بیٹی کی شادی کا اتنا ارمان ہے تو پوری رقم کیوں نہیں نکالتے۔!؟"

شہر کے مالدار تاجر وسیم صاحب نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

وسیم صاحب! آپ تو جانتے ہیں کہ میرے گھر میں کہ میرا لڑکا ہی کمانے والا ہے۔ اس بے چارے نے ہر آسائش سے منھ موڑ کر اپنی قلیل تنخواہ میں سے روپے بچا کر اور کئی برسوں تک دن رات محنت کرکے کچھ روپے بچائے ہیں۔ آپ دو ہزار روپے قبول کیجئے اور قاضی صاحب کو نکاح پڑھانے کی اجازت دیجئے۔"

کریم میاں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دو ہزار روپیوں کی تھیلی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کریم میاں! میں تمہارے دروازے پر بھیک لینے نہیں آیا۔ تم نے شادی کے موقع پر پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں اس سے ایک پیسہ بھی کم نہیں لوں گا!"

وسیم صاحب کے اندر کا لالچی انسان شرافت کا لبادہ اتار کر سامنے آگیا۔ کریم میاں کو اپنے کانوں میں سیٹیاں سی بجتی ہوئی محسوس ہوئیں اور ان کے سینے میں غم واندوہ کا طوفان اُمڈ پڑا۔

"وسیم صاحب! خدا کے لئے اتنے سنگدل اور بے رحم نہ بنئے اور مجھے بھری مجلس میں اس طرح ذلیل نہ کیجئے۔ میں اتنے لوگوں کے سامنے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد مکان فروخت کرکے باقی تین ہزار روپے ادا کردوں گا۔"

"کریم میاں! میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی لڑکی کی شادی میرے لڑکے کے ساتھ ہوجائے اور آپ کو ایک تعلیم یافتہ داماد مل جائے تو وعدے کے مطابق پورے پانچ ہزار روپے نکالئے ورنہ کسی قیمت پر یہ شادی نہ ہوسکے گی۔"

کریم میاں وسیم صاحب کے قدموں پر گر کر گڑگڑانے لگے۔ لیکن پتھر کے اندر کوئی احساس پیدا نہ ہوسکا۔

"یہ شادی نہیں ہوگی۔

وسیم صاحب نے کھڑے ہوکر چیختے ہوئے کہا۔

ہمارے ساتھ فراڈ کیا گیا ہے۔ پانچ ہزار دینے کا وعدہ کرکے صرف دو ہزار دے رہے ہیں!" غیر متوقع طور پر یہ اعلان سنتے ہی براتیوں اور دوسرے لوگوں کے درمیان کانا پھوسی ہونے لگی۔

جب پانچ ہزار دینے کا وعدہ کیا ہے تو اب دیتے کیوں نہیں؟ ۔

"غیر مسلموں کی طرح تلک لیتے ہوئے شرم نہیں آتی،

لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ اسی وقت ایک بچے نے گھر کے اندر سے ایک سلپ لاکر کریم کی طرف بڑھادی۔ انھوں نے سلپ لے کر دیکھا۔ ان کی لڑکی شکیلہ کی تحریر تھی ——

"ابا حضور!

میں ایسے لالچی اور خود غرض باپ کے بیٹے سے شادی نہیں کرسکتی جو آپ کی اتنی بے عزتی ہونے پر بھی پتھر کی طرح خاموش ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح لالچی اور خود غرض ہے۔ میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی کس طرح گزار سکوں گی جو اتنا خود غرض اور کم ظرف ہے۔!؟

آپ کی بدنصیب بیٹی شکیلہ

خط پڑھ کر کریم میاں غم سے نڈھال ہو گئے۔ ان کی پلکوں پر بے بسی کے دو آنسو لرز اٹھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ایک نوجوان نے کھڑے ہوکر وسیم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"وسیم صاحب! آپ کو شرم آنی چاہیئے کہ آپ غیر مسلموں کی طرح امت محمدی میں تلک کا رواج قائم کرکے پورے اسلامی معاشرے کو زہر آلود کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر یہ مرض ہمارے معاشرے میں پھیل گیا تو غریبوں کی لڑکیاں تلک کے بھاری بوجھ تلے دب کر رہ جائیں گی اور ہاتھوں میں مہندی رچانے کا ارمان ان کے سینوں میں گھٹ کر رہ جائے گا۔ اور جس طرح بھرے ہوئے دریا کا باندھ ٹوٹ جانے پر ہر طرف تباہی اور بربادی پھیل جاتی ہے اسی طرح جب ان سسکتی ہوئی کنواریوں کے جذبات کا لاوا اُبلے گا تو ہر طرف شعلے بھڑک اٹھیں گے اور کتنے ہی لوگوں کے گھر ان شعلوں میں جل کر خاک ہوجائیں گے۔ اس لئے ان تباہیوں اور بربادیوں کو روکنے کے لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم تلک کے اس غلط رواج کو اپنا کر اپنے معاشرے میں برائی پیدا نہ ہونے دیں۔ بھائیو — کیا آپ لوگ اس کے لئے تیار ہیں!؟

"ہاں، ہم لوگ اس کے لئے تیار ہیں۔

ہم تلک لینے والوں کا سوشل بائیکاٹ کریں گے!" — نوجوان کے جذبات بھرے لہجے سے مسحور ہوکر اکثر لوگ چیخ اٹھے اور کچھ لوگ نفرت بھری نگاہوں سے وسیم صاحب کی طرف گھورنے لگے۔

"اب آپ لوگ یہ بتائیں کہ اس سنگدل اور خود غرض انسان کے لئے آپ لوگوں کا کیا فیصلہ ہے؟" اسی نوجوان نے سوال کیا۔

"اس کے لئے یہی بہتر ہے کہ یہ فوراً یہاں سے سلامتی کے ساتھ نکل جائے اور آئندہ کسی لڑکی کے مجبور باپ سے جہیز یا روپیوں کا مطالبہ نہ کرے ورنہ اس کے شایان شان اسے گدھے پر سوار کرکے اور چہرے پر کالک مل کے پورے شہر میں جلوس نکالا جائے گا!"

دوسرے نوجوان نے جوش بھرے لہجے میں کہا اور اکثر لوگوں نے تالیاں بجاکر اس خیال کی تائید کی۔ ماحول کی کیفیت کو محسوس کرکے وسیم صاحب اپنے لڑکے کو لے کر رخصت ہو گئے۔ براتیوں میں سے کچھ ہی لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔ اکثر براتی شامیانے ہی میں بیٹھے رہے۔

"اب میری لڑکی کا کیا ہوگا — !؟"

کریم میاں جو حیرت سے یہ واقعات دیکھ رہے تھے، بے حد پریشانی کے عالم میں چیخ اُٹھے۔

"کیا ہمارے درمیان کوئی ایسا نوجوان نہیں جو خلوص کے ساتھ بن بیاہی دلہن کو اپنا سکے۔!؟" پہلے نوجوان نے سوال کیا۔ لیکن لوگوں پر اس طرح خاموشی چھائی رہی جیسے انھیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہا جیسے کسی کے پاس کوئی جواب نہ ہو۔ نوجوان نے مایوس ہوکر چاروں طرف دیکھا۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ جب کچھ وقت گزر گیا تو کریم میاں نے بے چین ہوکر اس نوجوان کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسکی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم کسی خاص جماعت کے آدمی معلوم ہوتے ہو اور اپنے مخصوص نظریات کی اشاعت چاہتے ہو۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

"آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ میرے دینی بھائی ہیں۔ میں آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں کسی مخصوص جماعت سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ میں تو حضور صلعم کا پیروکار ہوں اور اسلامی معاشرے میں پھیلتے ہوئے تلک کے غلط رواج اور جہیز اور بڑی بڑی رقموں کے مطالبے کے خلاف ہوں۔"

نوجوان نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا آپ اس ایثار کے لئے تیار ہوں گے؟"

مجمع میں سے کسی نے چیخ کر کہا۔

"میں خوشی سے اس کے لیے تیار ہوں۔ ایک مومن کے قول اور فعل میں یکسانیت ہونی چاہیئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔ میں ایک مقامی آئی اسکول میں ٹیچر ہوں۔ اگر آپ میرے حالات معلوم کرنا چاہیں تو میں اپنا پتہ دیتا ہوں۔"

"ہم آپ کو جانتے ہیں۔ اب ہمیں کچھ معلوم کرنے کی ضرورت نہیں۔"

کریم میاں کے لڑکے نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

دوسرے دن جلال دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے قدموں سے حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ انجانی دلہن کی خوبصورت آنکھوں میں انتظار اور خلوص و محبت کی تیز چمک تھی۔
اس نے دلہن کو بے حد جذباتی انداز میں سلام محبت پیش کیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے چہرے سے گھونگھٹ الٹ دیا۔
یکایک چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور جلال کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

(ساغر، آسنسول، مارچ ۱۹۸۲ء)

اقوالِ زرّیں

- جب عزم کر چکو تو خدا پر بھروسہ کرو (قرآن پاک)
- مظلوم اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں (حضرت محمدؐ)
- حسن خلق خدا کا سب سے بڑا انعام ہے "
- جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، وہ بدلہ نہیں لیتا "
- مفلس خدا کے نزدیک سب سے زیادہ دولت مند ہے اور جو اپنے لئے خزانے جمع کرتا ہے سب سے زیادہ غریب ہے۔
(حضرت عیسیٰ)
- سخی حبیب خدا ہے اگرچہ فاسق ہو اور بخیل دشمن خدا ہے چاہے وہ زاہد ہو۔ (حضرت عمر فاروقؓ)
- حاجت مند غربا کا تمہارے پاس آنا خدائے پاک کا انعام ہے۔
(حضرت عثمان غنیؓ)
- آدمی کے چہرے کا حسن، اللہ تعالیٰ کی عمدہ عنایت۔
(حضرت علیؓ)
- والدین کے چہروں پر محبت سے نظر کرنا بھی خدا کی خوشنودی کا موجب ہے۔ (خواجہ معین الدین چشتیؒ)
- خالق خلق میں ہے، خدا کو پانا ہو تو خلق کی خدمت کرو۔
(گرو نانک جی)
- صرف اچھے اعمال ہی انسان کو خدا سے ملاتے ہیں۔
(گرو گوبند سنگھ جی)

مرسلہ:- سی عاصمہ تبسم و ناہید روحی، پریام بٹ

لطیفے

صاف گو فقیر

ایک مکان کے دروازے میں کھڑی ہوئی خوبصورت عورت کے آگے جب ایک فقیر نے ہاتھ پھیلایا تو عورت اس سے کہنے لگی دیکھو تم جوان ہو، تندرست ہو .... کام کاج کر کے کما سکتے ہو اور پھر بھیک کے ٹکڑوں کے لئے اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔
فقیر بولا بظاہر آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مگر خود ہی دیکھئے کہ آپ اتنی حسین ہیں کہ آسانی سے فلموں میں ہیروئن بن سکتی ہیں اور پھر بھی گھر آتی میں اپنی زندگی برباد کر رہی ہیں۔
عورت نے کہا ٹھہرو۔ میں ابھی تمہیں کچھ پیسے دوں گی اور کھانے کے لئے بھی۔

یاد آئے بہت

ایک عورت اپنی سہیلی کے ساتھ فلم دیکھنے چلی گئی جب واپس گھر آئی تو اپنے میاں سے مخاطب ہوئی آج آپ مجھے سینما میں بہت یاد آئے۔
میاں نے خوشی سے پھولتے ہوئے پوچھا اس فلم کے ہیرو کی شکل یقیناً مجھ سے ملتی جلتی ہوگی؟
جی نہیں۔ دراصل مقا بہت رد دی تھا اس لئے۔

افسوس

ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا "جب بھی آپ کسی آفت کی پرکالہ لڑکی کو دیکھتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ آپ شادی شدہ ہیں"
"بھولتا کہاں ہوں اس وقت تو یہ احساس اور بھی شدید ہو جاتا ہے"
شوہر نے جواب دیا۔

رشتہ

حنا فردوس

گھڑی نے چھ کا گھنٹہ بجایا اور سلمی کا پارہ بھی چھٹے آسمان پر پہنچ گیا۔ آج صبح ہی سے اس کا موڈ آف تھا۔ کیونکہ صبح ہی صبح شاہد سے لڑائی ہو چکی تھی۔ اس وقت تو وہ چپ رہ گئی تھی در اصل غلطی اسی کی تھی دیر سے جاگنے کی وجہ سے شاہد کو ناشتہ کرتے کرتے دیر ہو گئی تھی۔ شاہد کا موڈ آف ہو گیا تھا اور اس نے سارا غصہ سلمی پر اُتار دیا تھا اسی لئے سلمی کا موڈ بھی بگڑ گیا تھا لیکن وہ خاموش رہ گئی تھی۔

انسان اپنی غلطی تو تسلیم کرتا نہیں۔ شاہد کو بارہ بجے رات تک اپنے دوستوں سے فرصت ملتی گپ بازیاں ہوتیں۔ شو کا پروگرام بنتا۔ کبھی پتے کھیلے جاتے۔ اسی سب میں آدھی رات گزر جاتی۔ شاہد کے انتظار میں سلمی بھی آدھی رات تک جاگتی رہتی۔ اس کے بعد بھی غصے سے نیند نہ آتی۔ رات اتنی دیر تک جاگنے کی وجہ سے صبح اٹھنے میں ذرا دیر ہو جاتی تو ڈانٹ بھی اسے ہی سننی پڑتی۔ اپنا قصور تو جیسا یاد ہی نہیں رہتا۔

شاہد کے آفس جانے کے بعد وہ اکیلی ہو گئی تھی گڈو بھی اسکول جا چکا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اپنا کام تمام کیا اور دل بہلانے کی خاطر پڑوس میں چلی گئی لیکن وہاں بھی دل کیا بہلتا اور فکر بڑھ گئی۔ راشدہ کی امی نے ڈکیتی کا ایک تازہ واقعہ سنا دیا تھا کہ کس طرح ایک آدمی نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا اور اس گھر کے ہی فرد کا نام بتا کر گھر میں گھس آیا۔ اور سارا سامان لے گیا۔

یہ واقعہ سن کر سلمی پریشان ہو گئی تھی اسے فکر ہو گئی تھی کہ شاہد بھی تو آدھی رات گئے تک آتے ہیں اگر ایسے ہی کوئی آکر اس کا اور گڈو کا گلا دبا کر سارا سامان اٹھا لے جائے تو وہ کیا کر سکتی ہے۔

اسی پریشانی کے باعث اس کا غصہ تیز ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کا غصہ بھی بڑھ رہا تھا۔

وہ غصے سے مغلوب ہو کر خود سے ہی کہہ رہی تھی پانچ بجے تک تو سارے آفس بند ہو جاتے ہیں لیکن ان کا آفس بارہ بجے ختم ہوتا ہے۔ جب دوستوں ہی میں رہنا تھا تو شادی کیوں رچائی تھی سات سال شادی کے ہو گئے میں نے زبان نہ کھولی لیکن آج میں بھی فیصلہ کر لوں گی یا تو وہ آفس سے سیدھے گھر آجائیں یا مجھے میرے میکے پہنچا کر سارا دن ساری رات دوستوں کے جھرمٹ میں کاٹیں تب دیکھوں گی کہ کون دوست کتنے دن حق دوستی ادا کرتا ہے۔

اس کی باتیں سن کر چھ سال کا گڈو اس کے قریب آکر بولا "ممی" پاپا بہت خراب ہیں ہمیشہ دیر سے آتے ہیں۔ مجھے کہیں سیر کرانے بھی نہیں لے جاتے میرا دوست نور ہے نا اس کے پاپا اسے روز بازار لے جاتے ہیں اچھی اچھی چیزیں خریدتے ہیں۔ آپ کتنی اچھی ہیں مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاتیں۔"

گڈو اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور بڑے پیار سے بولا ممی میں تمہارا بیٹا ہوں صرف تمہارا۔

پاپا کا بیٹا نہیں ہوں۔"

اسکوٹر کی آواز سن کر بھی دونوں دروازے پر نہیں گئے۔ شاہد کے بہت آوازیں دینے پر اس نے دروازہ کھولا۔

سو گئی تھی۔ کیا۔ شاہد نے آتے ہی توپ چھوڑ دی۔

اں ہاں میں تو دن رات سوتی ہی رہتی ہوں میرے پاس سونے کے سوا کام ہی کیا ہے۔ لیکن آپ تو بارہ بجے رات تک جاگتے رہتے ہیں۔ دوستوں سے چھٹی ہی کب ملتی ہے کہ گھر کی فکر ہو خدا نہ کرے۔ ایک دن کوئی آکر ہم دونوں ماں بیٹے کی گردن دبا دے گا تبھی آپ کو چین آئے گا۔ پھر بیاہ لائیے گا انہیں دوستوں میں سے کسی کو۔

شاہد کا پارہ سلمی سے زیادہ اونچا چڑھ گیا۔ وہ چیخا۔ تم مجھ پر حکومت نہیں کر سکتیں۔ تم میری بیوی ہو استانی نہیں۔ میرا جب جی چاہے گا گھر آؤں گا۔ گھوموں گا تم کو اعتراض کا حق نہیں۔ اور کان کھول کر سن لو میں ابھی اور اسی وقت پھر جا رہا ہوں۔ تم مجھے روک نہیں سکتیں۔

اور شاہد بھنّاتا ہوا جیسے آیا تھا اسی طرح واپس جانے لگا۔ دروازے کے گیٹ کے پاس ہی تھا اسے گڈو ملا۔ گالوں پر آنسوؤں کے نشان تھے اور آنکھیں بھی آنسو سے بھری تھیں۔ وہ دوڑتا ہوا شاہد کے قدموں سے لپٹ گیا۔

بابا، بابا میں رو رہا ہوں۔ سسکیوں میں اس کی آواز ڈوب گئی، اس کی آواز ڈوب گئی۔ اس نے اپنے سر کو شاہد کے گھٹنوں سے ٹیک دیا اور بے آواز رونے لگا۔ کیوں بابا! اگر کوئی گھر میں ڈاکو آ گیا ہوگا۔ کیا آپ کو علم نہ ہوگا۔ اکیلی امی ڈاکوؤں کا مقابلہ کیسے کریں گی۔

ننھے گڈو کے ان الفاظ نے یا اس کے معصوم رشتے نے جادو کر دیا اور شاہد نے گڈو کو اپنے سینے سے لگا لیا پھر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

ماضی کے سائے

ـــــ حیات فاطمہ رضوی

"ڈاکٹر خورشید نے اپنا کام تمام کرکے، ایک طویل سانس لی رات کے بارہ بج چکے تھے۔ سینی ٹوریم میں ہر طرف خاموشی مسلط تھی۔ صرف دق کے مریضوں کی الجھی ہوئی سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ لگاتار ہیجم!

"ڈاکٹر نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ یہ دنیا کا سب سے موذی مرض ہے جو پیام موت لے کر آتا ہے! لیکن جن کے پاس دولت ہے وہ اس سے مقابلہ کرنے کے لئے بھوالی کا رخ کرتے ہیں۔ زندگی حاصل کرنے کے لئے جو مصائب سے بھری ہوئی ہے اور دنیاوی مصائب کا مقابلہ کرتے کرتے ٹی۔ بی ہو ہی جاتی ہے۔ ٹی۔ بی کے جراثیم کا دوسرا نام ہے غم! وہ غم جو دل میں ناسور بن کر رسنے لگے!!

"ڈاکٹر نے پھر ایک گہری سانس لی۔ وہ جب سے وارڈ نمبر ۹ کا انچارج ہوا تھا۔ اس کی زندگی میں بہت عرصہ کے بعد پھر تغیر شروع ہو گیا تھا وہ بہت خشک مزاج اور محنتی ڈاکٹر تھا۔ اس کو اپنے پیشے اور کام سے اتنی دلچسپی تھی کہ بعض اوقات وہ ماتحتوں کی سست روی پر ان سے بری طرح الجھ جاتا تھا۔ اس کے متعلق اس کے ماتحتوں کا خیال تھا کہ ڈاکٹر کو کام کا جنون ہے وہ صرف چیختے ہوئے اوزاروں کے لئے بنا ہے۔ وہ صرف ٹی۔ بی کے مریضوں کا خون ٹسٹ کرنا یا ایکسرے لینا ہی جانتا ہے اس کو اس کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے۔ سینی ٹوریم میں آنے کے بعد ہی سے ڈاکٹر کا صرف ایک اصول تھا۔ اپنا کام وقت سے کرنا اور دوسروں کو اس کی ہدایت دینا۔ اور یہی وقت کی پابندی سارے اسٹاف کے لئے ایک مصیبت بن گئی تھی۔ ذرا سی بے قاعدگی پر اس کا غصہ قہر آسمانی بن کر سب کو جھنجھوڑ دیتا تھا۔ اور جب ماتحتوں سے کچھ نہ بنتی تب ہی دل کی کدورت غیبت بن کر تنقیدی شکل میں نمایاں ہونے لگتی

میرا آئیڈیا ہے "لیڈی ڈاکٹر مکرجی کہتی سنائی دیتی ڈاکٹر کچھ جنونی ہے!!

"رادھا نرس روہانسے انداز میں بولتی۔ نہیں نہیں! یہ بات نہیں مکرجی! وہ ہم سب کو بے جان سمجھتے ہیں جانور بھی تو اس طرح کام نہیں کر سکتے۔

تم نہیں جانتی رادھا! اس ڈاکٹر کو میں نے پاگلوں کی طرح رات کو جاگتے دیکھا ہے وہ خود بھی رات بھر میں شاید ہی کسی وقت ریسٹ لیتا ہو مجھے تو وہ خبطی سا معلوم ہوتا ہے ورنہ کوئی بھی جوان.... آدمی جو اس جیسا حسین و خوبرو ہو جس پر ہزاروں... کی نظریں مایوس ہو کر افسردہ نظر آنے لگیں اور وہ محسوس..... نہ کر سکے!

کبھی کبھی اس قسم کی تنقیدیں کافی مترنم ہو کر سینی ٹوریم کے وارڈوں میں دلچسپی کا باعث بن جاتی تھیں۔

"لیڈی ڈاکٹر مکرجی کو جہاں ڈاکٹر کی خشک مزاجی سے شکایت تھی وہیں ان کو اس کا اعتراف تھا۔ ڈاکٹر بے قاعدگی کے وقت خفا ضرور ہوتا ہے لیکن جب وہ سنجیدگی کے موڈ میں ہوتا ہے تو بولتے وقت اس کی زبان سے نکلے ہوئے جملے شہد سے زیادہ میٹھے ہوتے ہیں جو سینی ٹوریم کے سسکتے ہوئے ماحول میں جان ڈال دیتے ہیں۔ اور اسی وقت کوئی تلاش ان کی آنکھوں میں جھلکنے لگتی ہیں۔ بڑی بڑی شربتی آنکھیں جیسے کچھ مانگنے لگتی ہیں اور اسی وقت ان کی چلتی ہوئی زبان احساس کمتری کا شکار ہو کر خاموش ہو جاتی۔ وہ حسرت و یاس سے اس خوبصورت تیس سالہ ڈاکٹر کو دیکھنے لگتیں جو جوان ہوتے ہوئے جوان دل کی دھڑکن کو نہیں سمجھ سکتا تھا جو دنیا کی کسی دلچسپی میں حصہ لینا پسند نہیں کرتا تھا۔!

لیکن جب سے وارڈ نمبر ۹ میں مس ورما جی نے داخلہ لیا تھا "لیڈی ڈاکٹر مکرجی" کی بے چینی نکتہ عروج پر پہونچ گئی تھی۔ ان کی آنکھیں ہر وقت متلاشی رہنے لگی تھیں۔

"مس ورما جی" ۲۷۔۲۸ برس کی دبلی پتلی لڑکی تھیں جو ایک دولت مند خاندان کی لاوارث بیٹی تھیں جن کو بھوالی میں کوئی کوئی ساتھ نہیں لایا تھا بلکہ وہ داخلہ لینے بھی تنہا ہی آئی تھیں وہ راستہ جوان کو زندگی کے موڑ سے ہٹائے لئے جا رہا تھا اور جب وہ تھک کر کھڑی ہوئیں تو وہ راستہ تھا بھوالی کے سینی ٹوریم کا!!

مس ورما جی کی گھنی گھنی پلکوں کے درمیان تیرنے والی آنکھیں

بڑی باوقار تھیں۔ ان کے پتلے پتلے پژمردہ ہونٹوں پر باتیں کرتے وقت ایک دلکش خم نمودار ہوتا تھا جو ان کے چمکدار دانتوں کے طلسم میں ظاہر ہوکر گم ہو جاتا تھا۔ ان کے سیاہ لمبے بالوں کی ایک لٹ کبھی کبھی بے پروائی کے عالم میں ان کی لمبی ستواں ناک پر جھولتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن ان تمام دلکشیوں سے زیادہ دل کو اپنی طرف کھینچ لینے والا ان کا حزن و ملال میں ڈوبا ہوا افسردہ چہرہ تھا۔

وہ زیادہ تر صبح کے وقت اخبار پڑھتے دکھائی دیتیں یا پھر خاموشی کے عالم میں کچھ سوچتی نظر آتیں اور اس خاموشی میں ایک معنی خیز گہرا سکوت جیسے سمندر کی انتہائی گہرائیوں میں کوئی چیز ڈھونڈتی چلی جا رہی ہو بڑی انمول سی قیمتی شے!

وارڈ میں داخل ہونے سے قبل ان کی حالت ایسی خراب نہیں تھی مگر دو تین مہینہ کے اندر ہی اندر وہ پلنگ سے لگ گئیں۔

ڈاکٹر خورشید کا تعیز بھی یہی مس ورما جی تھیں۔ سیٹی ڈریم کی دلچسپی کا مرکز بھی انہی کی ذات تھی۔ وہ جوان و حسین جو تھیں! کچھ قیاس آرائیاں تھیں کچھ معنی خیز باتیں۔

اور یہ بالکل سچ تھا۔ ڈاکٹر خورشید مس ورما جی کا گرویدہ تھا۔ اس کے خیالات و مزاج میں ایک انقلاب پیدا ہو چکا تھا۔

پہلے دن ڈاکٹر خورشید کی ملاقات "مس ورما جی" سے ہوئی تو ایک دوسرے پر نظر پڑتے ہی دونوں چونک پڑے ایک سکنڈ حیرت آمیز سکوت میں ڈوبی ہوئی آنکھوں نے خود ہی محجوب ہوکر حواس درست کر لئے لیکن ماتھے پر آجانے والے پسینہ کے ابھرے ہوئے قطرے پتہ نہیں کیا نشان دہی کرتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

ایک دبی ہوئی گہری لیکن بہت افسردہ سی سانس لے کر ڈاکٹر نے کرسی پر بیٹھتے ہی اپنا کام سنبھال لیا اور شاید خود اپنے آپ کو بھی!

اس نے ان کا خون ٹسٹ کیا ایکسرے لیا اور جب وہ ان سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ آپ فوراً وارڈ میں داخل ہو جائیے آپ کا داہنا پھیپھڑا خراب ہو رہا ہے:

اچھا — لفظ اچھا کو ادا کرتے وقت "مس ورما جی" کو بہت کوشش کرنا پڑی۔

ڈوبے ہوئے لہجہ کا لفظ "اچھا" ڈاکٹر کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گیا تھا۔ اس نے گھبرا کے مس ورما جی کی طرف دیکھا جس کی پیشانی پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی۔

گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے — آپ سے بھی خراب کنڈیشن کے مریض یہاں سے اچھے ہوکر گئے ہیں۔ ڈاکٹر نے گویا اپنے ہی آپ کو جھوٹی تسکین دی۔

پر میں تو یہ جانتی ہوں کہ ایسی حالت میں موت ہی علاج ہوتا ہے ڈاکٹر! مس ورما جی بمشکل بول سکی تھیں۔ ڈاکٹر نے مس ورما جی کا داخلہ لے لیا۔ وہ اپنے وارڈ میں جاتے جاتے بھی ڈاکٹر کی طرف دیکھتی چلی گئیں۔ اور ان کے چلے جانے بعد ڈاکٹر نے ستمبر کے سرد موسم میں بھی اپنے چہرے پر رومال کی ہوا دینا شروع کر دی۔ اور یہ دیکھ کر لیڈی ڈاکٹر مکرجی کے علاوہ اور لوگوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے حیرت کا اظہار کیا۔

اسی روز کے بعد سے ڈاکٹر بدل گیا تھا اس کی تمام تر توجہ وارڈ نمبر ۵ کی طرف مرکوز ہو گئی تھی۔ وہ کام کرتے کرتے کھو سا جاتا بیٹھے بیٹھے کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا اور اسی وقت کسی کمپاؤنڈر کی آواز اس کو چونکا دیتی۔ ڈاکٹر صاحب! اور کون کون سی دوائیں لینا ہیں۔

ہیں ہیں! وہ ایک دم بوکھلا کر ہوشیار ہو جاتا۔ ہاں! پھر وہ بہت تھکے ہوئے لہجہ میں کہتا۔ بیڈ نمبر ۲ کے لئے طاقت کے انجکشن کی ضرورت ہے مجھے اس کی حالت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی ہے!

اس قسم کی حرکتیں غیر ارادی طور پر اس سے سرزد ہونے لگی تھیں۔ لیکن اب تو "مس ورما جی" کی بگڑتی ہوئی حالت نے اس کو بوکھلا دیا تھا۔ اس وقت بھی ڈاکٹر خورشید نے کرسی سے کھڑے ہوکر اپنی نگاہیں ٹائم پیس پر مرکوز کر دیں بارہ بجا کر سوئی دوسری طرف بڑھ رہی تھی۔ گھڑی دیکھتے دیکھتے اس نے جھرجھری لی۔ آہ وقت گذر رہا ہے .... کتنے ہی مریض کسی آنے والے وقت کے انتظار میں .... ڈاکٹر نے گھبرا کر اپنا منھ پھیر لیا وہ بھاری بھاری قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اپنے کمرے کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

دوسرے دن صبح ہی صبح وارڈ نمبر ۵ میں معائنہ کی غرض سے داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ "مس ورما جی" آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھیں ان کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ وہ قریب آکر آہستہ سے بولا۔ مس ورما جی! رات کیسی گذری کھانسی میں کچھ فرق محسوس ہوا؟

ڈاکٹر کی آواز پر مس ورما جی نے آنکھیں کھول دیں۔ کمزوری سے

دگمگاتی ہوئی آنکھیں وہ اپنا کمزور سفید سفید ہاتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ رات بخار بھی تیز تھا اور کھانسی بھی بہت آئی۔

" ڈاکٹر نے ان کی نبض پر انگلیاں رکھ کر محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ آپ کی حالت یہ ہے کہ آپ سوچتی رہتی ہیں اور یہی آپ کے لئے مضر ہے۔

تو پھر کیا کروں ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

آپ کا پسندیدہ مشغلہ کیا ہے؟" ڈاکٹر نے" بڑی محبت سے سوال کیا۔

قدرت کی ہر چیز میں حسن تلاش کرنا۔ نیچر کی چھوٹی سے چھوٹی دلکشی مجھے اپنی جانب کھینچتی ہے مس ورما" کے لہجہ میں اضطراب سا تھا۔

بڑا اچھا آئیڈیا ہے! آپ کا پسندیدہ مشغلہ آرٹ ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے انجکشن نکال کر ان کے بازو میں لگاتے ہوئے بڑے ہی ملائم لہجہ میں کہا۔

" کبھی کبھی"۔ مس ورما جی" کے چہرے پر حسرت و نامرادی کے تاثرات تھے میں آپ کے لئے قدرتی چیزیں تلاش کروں گا۔! بڑی محبت بھری ہوئی نرم آواز تھی ڈاکٹر کی میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو تندرست ہنستا ہوا دیکھوں۔! اور تب ہی مس ورما جی نے کچھ عجیب سے لہجے میں رکتے رکتے کہا۔ ڈاکٹر! آپ کی آواز میں کیسی مٹھاس ہے آپ جس وقت بولتے ہیں میرا دل چاہتا ہے آپ کی میٹھی بولی میں اپنی پاک آتما کو گھول دوں! ڈاکٹر نے چونک کر ایک سکنڈ ان کی طرف دیکھا۔ مس ورما کی بڑی بڑی باوقار آنکھیں بند تھیں اور ان کے گوشوں سے آنسوؤں کے قطرے بہہ آئے تھے۔ اور یہ دیکھ کر ڈاکٹر کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ سے انجکشن بازو سے نکال لیا" ورما جی" نے آنکھیں کھول کر شکریہ ادا کیا۔ اور پھر آنکھیں بند کرلیں۔ ڈاکٹر ایک اضطرابی حالت میں اپنے دوسرے مریضوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

دوسرے دن صبح ڈاکٹر سینی ٹوریم میں داخل ہوا تو اس کے اسٹاف کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کہ وہ خشک مزاج ڈاکٹر جس کی پسندیدہ چیزیں اسپتال اور اسکے اوزار تھے آج اپنے ہاتھوں میں پھولوں کا خوش رنگ گلدستہ پکڑے ہوئے ہے وہ بہت خوش خوش وارڈ نمبر ۵ کی طرف جا رہا تھا۔

وہ وارڈ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہمراہ لیڈی ڈاکٹر مکرجی" کو بھی لے لیا اور مس ورما جی" کے بیڈ کے پاس کھڑے ہو کر اس کو آواز دی۔ ورما جی!

مس ورما جی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

" ڈاکٹر" نے بڑے چاؤ سے پھولوں کی ڈالیاں ان کے کمزور ہاتھوں میں پکڑا دیں۔ اور مسکرا کر کہا۔ میں آپ کی پسندیدہ چیز لے آیا مس ورما! شکریہ۔ یقیناً۔ یو! مس ورما جی کے رخساروں پر ننھے ننھے پھول رکھے تھے اور ان کے کمزور اور زرد چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔

" ڈاکٹر خورشید کی آنکھوں میں خوشیوں کے دیپ لیڈی ڈاکٹر مکرجی" کے دل میں آگ سی لگانے لگے۔ وارڈ سے واپس ہوتے ہوئے ڈاکٹر لیڈی مکرجی سے کہہ رہا تھا۔ ٹی۔ بی کے مریضوں کی خوشیاں پوری کر کے ڈاکٹر کو بڑی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے! میں ایک نیا تجربہ کر رہا ہوں مکرجی آپ ضرور کامیاب ہوں گے" ڈاکٹر مکرجی" کی ڈوبی ہوئی سی آواز سنائی دی لیکن وہ دل میں کہہ رہی تھیں۔ کیا یہ تجربہ صرف" مس ورما جی" کے لئے تھا۔ اور بھی تو مریض آپ کی ہمدردی کے مستحق ہیں ڈاکٹر!

اور اس دن ڈاکٹر نے اپنے پورے اسٹاف سے ہنس ہنس کر باتیں کیں اور ہر مسکراہٹ پر اس کا چہرہ فرط مسرت سے رنگین ہو گیا۔ لیکن اس کے برعکس لیڈی ڈاکٹر مکرجی نے یہ واقعہ نمک مرچ لگا کر سارے اسٹاف کو سنایا۔ بعض دوراندیشوں کو مستقبل کی فکر بری طرح ہونے لگی۔ ایک ہندو اور مسلمان کا یہ عاشقہ کیسے نبھ سکتا ہے۔

" ڈاکٹر خورشید" کی ایک دن کی تبدیلی نے ہر شخص کی نظریں گہری کر دی تھیں۔ اگرچہ دوسرے دن ڈاکٹر مس ورما جی کو دیکھ کر بہت گھبرایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کی ہر امکانی کوشش کے باوجود مس ورما جی کے چہرے کی زردی میں برابر کا اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں بے رونق ہو کر بجھنے سی لگی تھیں۔ لیکن ایک دن ایسا آیا کہ ڈاکٹر بالکل مایوس ہو گیا۔ وہ مس ورما کو دیکھنے پہونچا تو اس نے ان کو تکلیف کی حالت میں اپنے ہاتھ پیر پٹکتے ہوئے پایا۔ کھانسی کے اٹھتے ہوئے دورے سے ان کو بڑی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ "مس ورما جی! ڈاکٹر کی روح نے جیسے اس کو آواز دی۔

" ڈاکٹر! جیسے کہ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی کمزور آواز کے ساتھ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آنسوؤں کے سیلاب میں بہتی ہوئی آنکھیں اس نے اپنا کمزور ہاتھ ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیا۔ جس کو بیتابی کے ساتھ

ڈاکٹر نے تھام لیا۔ وہ کہہ رہی تھی "ڈاکٹر! جس وقت تم بولتے ہو تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ماضی کی گذری ہوئی کسی برسات میں ساون کی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ تمہاری نرم آواز میں حسن ہے ڈاکٹر! وہ حسن جو سب تلاش کرتے ہو تلاش کیا تھا۔ جو کھو جانے کے بعد آج پھر میری نظروں کے سامنے ہے۔

اور یہ کہتے کہتے مس ورما جی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ ان کی بند آنکھوں کے گوشے سے آنسوؤں کے قطرے لڑھک کر رخساروں پر آگئے پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔ وہ اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتا ہوا بولا

مجھے اجازت دو مس ورما جی! کہ میں آپ کو ایک بار نجمہ کہوں!

یکایک مس ورما جی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ کھانسی کے گولے سے پھنس گئے۔ مگر وہ ان سے جد وجہد کرتی ہوئی بولیں۔ اور میں ڈاکٹر کے بجائے آپ کو سریش کہوں گی!

پیار کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آیا وہ اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ مجھے منظور ہے نجمہ!

مس ورما جی کی بے رونق آنکھوں میں ملکوتی بجلیاں چمک اٹھیں وہ رک رک کر بولی۔ میں آپ کو اپنے ماضی کی ایک کہانی سنانا چاہتی تھی ..... مگر ..... خوخوخو کھانسی کا پھر ایک طوفان سا اٹھا اس کو سانس لینا مشکل ہو گیا۔ اتنی دیر ڈاکٹر اس کے بیڈ پر جھکا ہوا اس کے بکھرے ہوئے بال درست کرتا رہا۔ جب اس کو ذرا تسکین ہو گئی تو وہ اس کے قریب بیڈ پر ہی بیٹھ گیا۔ اس کے انداز ہارے ہوئے جواری کی طرح ہو رہے تھے۔

وہ بے قراری کے ساتھ بولا نجمہ! تم کچھ کہنا چاہتی تھیں؟

"ہاں! مس ورما نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا" پر اس وقت کہہ نہ سکوں گی میں کل آپ کو وہ چیز ضرور دکھاؤں گی جس کو دیکھ کر آپ بہت دکھی اور متعجب ہوں گے۔

"ڈاکٹر نے درد بھرے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔ میں بھی کل آپ کو اپنی ایک قیمتی چیز دکھاؤں گا، جو ماضی میں مجھ سے چھن گئی تھی ...... آہ جس کو آج میں نے پا لیا ہے ـــ آہ جو حال میں بھی کھوئی جا رہی ہے۔

اور یہ سن کر ورما جی نے ایک گہری سرد آہ بھر کے کہا۔ وہ بہت ہی خوشگوار وقت ہو گا۔

"ڈاکٹر! جب ڈاکٹر اور اس کا مریض اپنی اپنی خوشی کا سواگت کرے گا ...... میں زندہ رہنا چاہتی ہوں اس سمے تک کے لئے دعا کرو ..... میں زندہ رہوں!

کھانسی کا پھر ایک ریلا آیا مس ورما جی کی سانس رکتی ہوئی معلوم ہوئی بمشکل تمام وہ اپنی الجھی ہوئی سانس کو درست کر پائیں۔ یہ گنی چنی سانسیں ہی ڈاکٹر کی تسکین تھیں۔ وہ سرخ سرخ آنکھوں سے ورما جی کی طرف دیکھتا ہوا چلا گیا۔

آج سارے سینی ٹوریم میں یہ خبر گرم تھی کہ رادھا نرس نے اپنے کانوں سے "ڈاکٹر" اور "مس ورما جی" کی عشقیہ باتیں سنی ہیں۔ لیکن ان باتوں سے پرے ڈاکٹر تمام رات الجھتا رہا لیکن نہ تو اپنی ذمہ داریاں سنبھال سکا نہ ہی اسٹاف کو اصول اور کام کا سبق پڑھا سکا۔ وہ وقت کی پابندی بھی بھول چکا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں دیوانوں کی طرح خاموش ٹہلتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری تھی۔ جس کو وہ بار بار دیکھتا تھا۔ اس کو بے چینی کے ساتھ صبح کا انتظار تھا۔

رات تمام ہو چکی تھی اگرچہ ابھی کاذب ہی تھی لیکن وہ پریشان بحال وارڈ ۹ میں آگیا۔ وارڈ میں داخل ہوتے اس کی نظر "مس ورما جی" پر پڑی جو خاموش سیدھی سیدھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیوں پر جم گئے تھے۔ ان کی ستواں ناک پر اب بھی بالوں کی ایک آوارہ لٹ چمٹی ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت وہ اخبار نہیں پڑھ رہی تھیں بلکہ اپنے ہاتھوں میں سینہ کے پاس کوئی ڈائری مضبوطی کے ساتھ پکڑے ہوئے تھیں۔!

"مس ورما جی"! ڈاکٹر نے کانپتی ہوئی آواز میں ان کو پکارا۔ لیکن جواب نہ ملا۔ مس ورما جی نے آج اپنی حزن وملال میں ڈوبی ہوئی آنکھیں نہیں کھولیں۔ اور یہ دیکھ کر ڈاکٹر حلق کے بل چیخا "نجمہ"! پھر وہ چکرا کر ان کے بیڈ پر گرا اس کا سر مس ورما جی کے سینہ سے لگ گیا وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ میں نے تمام رات جاگ کر اس وقت کا انتظار کیا تھا۔ میں آج پھر تمہیں کھو کر لوٹنا نہیں چاہتا۔

نجمہ ....

لیکن جواب میں مس ورما جی کے خاموش ہونٹوں پر کوئی خم نمودار نہیں ہوا۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر خورشید کا جسم ایک زبردست تشنجی کیفیت کے بعد ساکت ہو گیا ـــ!

شبنم کے قطرے زمین پر خشک ہو چکے تھے۔ اور سینی ٹوریم کی گھڑیاں آج حیرت زدہ ہو کر چیخنے لگیں تھیں۔ لیڈی ڈاکٹر مسکر جی کی آواز میں کپکپاہٹ تھی کیونکہ انہی نے آج وارڈ ۹ میں مس ورما جی کے ساتھ ڈاکٹر خورشید کے

مردہ پایا تھا۔ ڈاکٹر خورشید کا سر ان کے سینہ پر جھکا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک روزنامچہ تھا۔ جس سے ایک لڑکی کا فوٹو برآمد ہوا تھا۔ جو مس ورما جی کا تھا۔ حسین اور تندرست مس ورما جی جن کی آنکھوں کا وقار ان کے چہرے کی دلکشی میں اضافہ کر رہا تھا۔ فوٹو کی پشت پر لکھا تھا۔ نجمہ عظمیٰ تو کیا مس ورما جی ہندو لڑکی نہ تھیں۔ سب کو حیرت و استعجاب تھا۔ لیکن جلد ہی ڈاکٹر خورشید کی ڈائری کے آخری صفحے نے یہ مشکل آسان کر دی۔ اس کی ڈائری پر نوٹ تھا۔ اس طرح بے ربط جملے جیسے لکھتے وقت وہ اپنے حواس میں نہ ہو۔

نجمہ! تمہاری مشابہت مس ورما جی میں کتنی ہے۔۔۔ تمہاری موت کے بعد میں نے ڈاکٹری پڑھ کر بے کار وقت ضائع نہیں کیا۔۔۔ خدمت خلق کر کے اپنے دل کو سکون دیتا رہا۔۔۔۔ میری سچی لگن اور کوشش نے تمہیں ایک بار پھر مس ورما جی کے روپ میں میرے قریب کر دیا۔۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ میں پھر اسی سایے تلے آ گیا ہوں جس میں تمہارے حسن کی ٹھنڈک تھی۔۔۔۔ آہ ماضی میرے کتنے نزدیک آ گیا ہے۔۔۔ ماضی کے اتنے قریب آکر جس میں مجھے اب تم نظر آ رہی ہو۔۔۔۔ آہ نجمہ میں پھر تم کو کھو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔۔۔۔

" لیڈی ڈاکٹر مکرجی " کا دل شرمسار تھا۔ ڈاکٹر پر رکھے ہوئے تمام الزامات سراسر غلط تھے۔ لیکن اس وقت جبکہ مس ورما جی کی ڈائری بھی سب کے سامنے تھی۔ تو ڈاکٹر خورشید کا فوٹو دیکھ کر سب حیرت زدہ تھے۔ اس فوٹو کی پشت پر لکھا تھا۔ سریش ورما۔

" مس ورما جی " کی ڈائری کے آخری صفحہ پر لکھا تھا " سریش جی "! تمہاری برتری اور غرور نے مجھے احساس کمتری کا شکار بنا کر ٹی۔ بی کا ہلک مریض بنا دیا۔ میری خودداری نے تمہارے غرور پر ٹھوکر ماری لیکن زندگی کی آخری سانسوں کی سواگت کر کے میری آتما کے سچے پریم نے آج تمہیں ڈاکٹر خورشید کے روپ میں میرے کتنے قریب کر دیا۔ کاش تم ڈاکٹر کا روپ ہوتے اور ڈاکٹر تمہارا تب۔۔۔۔ میں سینی ٹوریم میں نہ ہوتی اور ڈاکٹر میرا معالج نہ ہوتا۔۔۔۔ مگر آہ آج ڈاکٹر کی پیار بھری ہوئی نرم آواز پر میری گھٹی گھٹی ہوئی ہر سانس ٹھہر جانے کی کوشش کرتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ڈاکٹر کو اپنے ماضی کی وہ درد بھری داستان سناؤں لیکن دل ڈوبتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ آہ جیون ختم ہو رہا ہے میں کچھ نہ کہہ سکوں گی۔!

مس ورما جی کی ڈائری پڑھ کر ایک گہرا سناٹا چھا گیا سب کے دل متاثر تھے سب سوچ رہے تھے۔ ضرورتوں میں، تنا گر انصاد م کبھی کبھی اتفاقیہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور جب سینی ٹوریم کے بڑے ڈاکٹر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر چھائے ہوئے سکوت کو درہم برہم کر دیا۔ کہ یہ ایک نفسیاتی تجربہ ہے! ہم سب کے لئے ماضی کے سائے کتنے گہرے تاریک ہوتے ہیں جن میں اکثر ہم ڈوب بھی جاتے ہیں! ڈاکٹر خورشید اور مس ورما جی کی طرح۔ اور تب ہی سب کی پرنم آنکھوں نے ڈاکٹر خورشید اور مس ورما جی کی طرف دیکھا جو ان گہرائیوں میں ڈوب چکے تھے۔۔۔!

کچھ اچھے اچھے ناول

نسیمہ	〃	بیگم معشوق علی	〃	40/-
گورے کالے	〃	حیا ناز	〃	25/-
نیرا	〃	شمیمہ نقوی	〃	22/-
ناجیہ	〃	رضیہ بٹ	〃	25/-
آئینہ	〃	〃	〃	13/-
راضیہ	〃	〃	〃	22/-
شائستہ	〃	〃	〃	35/-
فاصلے	〃	〃	〃	30/-
شعاع	〃	نادرہ خاتون	〃	35/-
سنگھار	〃	سلمیٰ کنول	〃	40/-
بے مثال	〃	〃	〃	30/-
باجی	〃	رضیہ بٹ	〃	30/-
مینا	〃	〃	〃	24/-
شام و سحر	〃	سرور جہاں	〃	16/-
پچاخون	〃	〃	〃	14/-
دنیا	〃	یاسمین صوفی	〃	24/-
دل وحشی	〃	مینا ناز	〃	20/-
مہمان میرے دل کے		〃	〃	20/-
شمیم	〃	منشی فیاض علی	〃	25/-
الہ	〃	اے آر خاتون	〃	20/-
نورین	〃	〃	〃	25/-

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع ہوتی ہے جو ولادت، شادی اور انتقال سے متعلق ہو۔ خبر مختصر ترین الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے اور نمبر خریداری و پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ روانہ کریں۔ جو خبریں، نور تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے چھپتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کسی بھی غلطی کا ذمہ دار ادارہ نہیں ہوتا، البتہ اطلاع ملنے پر اسکی تصحیح شائع کر دی جاتی ہے۔

ولادت اطفال کی خبریں

• سید شبیر احمد (کرسی) ہمارے ماموں جان سید فائق احمد اور ممانی صوفیہ احمد صاحبہ کو اللہ تعالیٰ نے ۱۰ر جولائی ۱۹۸۲ء کو ۱۰ بجے شب میں پہلی بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد ..الدین احمد رکھا گیا۔

• شاہ ورمیس (کلکتہ) میرے چچا انور احمد مقیم لندن کو دوسری بار بھی اللہ پاک نے ۲۷ر اپریل ۱۹۸۲ء روز سہ شنبہ بوقت صبح ۹ بجے بیٹی عطا فرمائی نام عطیہ ربانی رکھا گیا۔

• رخشندہ تغزل (کانپور) میری بہن تنویر فاطمہ صدیقی کو اللہ پاک نے دو بیٹوں کے بعد ایک دختر عطا فرمائی۔ نام عائشہ رکھا گیا (تاریخ پیدائش تو لکھنا ہی تھی)

• زیبا مہدی (دھنباد) میری چچا زاد بہن نسو فیہ احمد اور بہنوئی فائق احمد کو اللہ پاک نے ۹ر جولائی ۱۹۸۲ء بروز جمعہ پہلی بار ایک فرزند عطا فرمایا۔

• ۰۰۹۵۱۰ خریداری نمبر خبریں بلا ٹکٹ کارڈ پر آئیں۔ دونوں خبریں علٰحدہ علٰحدہ کاغذ پر لکھ کر ایک روپیہ کے ٹکٹ کے ساتھ روانہ کریں پھر سے۔

• روحی اختر (آرہ) میرے چھوٹے بھائی اشعر رشدان و بھاوج نسرین بانو سلمہا کو اللہ پاک نے ۷ر جون ۱۹۸۲ء کی صبح ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام ریحان الہدیٰ تجویز ہوا۔

• سیدہ شاہین (منگلور) میری چاچی بجمہ حافظ، چچا سید حافظ کو اللہ پاک نے ۷ر جون ۱۹۸۲ء بروز پیر صبح ۹ بجے دوسری بار ایک دختر عطا فرمائی۔ نام سیدہ غوثیہ رکھا گیا۔

• شکیلہ پروین (بلند شہر) میرے بڑے بھائی شکیل احمد برنی اور بھابی نسیم کو اللہ پاک نے دو لڑکیوں کے بعد ۱۴ر جون ۱۹۸۲ء بروز بدھ بوقت ۳ بجے دن ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام فہد شکیل رکھا گیا۔

• نگار سلطانہ جلیلی (رامپور) میری باجی قمر لطیف اور بہنوئی نانا مونا عبد اللطیف، کو اللہ پاک نے دوسری بار ۲۲ر جون ۱۹۸۲ء بروز منگل بوقت دو بجے دن ایک بیٹی عطا فرمائی۔ نام مہ وش طابہ قرار پایا۔

• سی امتیاز احمد (رامپور) میرے بھیا کچکار اور بھابی کوثر ناز کو اللہ پاک نے ۴ر جولائی ۱۹۸۲ء بروز اتوار دو بجکر دس منٹ (دن) پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد یعقوب قرار پایا۔

• حسن آرا (راجہ پور سکرور۔ اعظم گڈھ) میرے منجھلے بیٹے شجاع الدین اور بہو شاہین کو اللہ تعالیٰ نے دوسری بار یکم جولائی ۱۹۸۲ء بوقت ۴ بجے شام ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام مصطفیٰ جمال رکھا گیا

• سید شبیر احمد (کیریل) ہمارے ماموں سید شائق احمد اور ممانی نازش احمد کو اللہ تعالیٰ نے ۲۵ر مارچ ۱۹۸۲ء کو پہلی بار بمقام سعودی عرب ایک دختر عطا فرمائی نام ام عمارہ رکھا گیا۔

• عزیزی علی باقر سلمہ اور عزیزی غزالہ سلمہا دختر جناب سید جمیل الحسن ردولوی منیجر نسیم بکڈپو) کو اللہ پاک نے ایک بیٹی کے بعد ۱۲ر جولائی ۱۹۸۲ء کو بوقت چار بجے شام ایک فرزند عطا فرمایا۔

• عزیزی جعفر رضا رضوی سلمہ اور عزیزی سہیلا سلمہا (دختر سید جمیل الحسن صاحب ردولوی منیجر نسیم بک ڈپو) کو اللہ پاک نے پہلی بار ۱۷ر جولائی ۱۹۸۲ء کو صبح ۴ بجے ایک دختر عطا فرمائی۔

• فاطمہ بالی قاسم (نسین) میری چھوٹی نند شیریں بانو اور نندوئی آدم بھائی کو اللہ پاک نے پہلی بار ایک دختر عطا فرمائی۔ نام مہرین سلمہ قرار پایا۔

پیغامات نشاط

• مسز ثریا حمید (میسور) میرے چھوٹے بھائی نجیب اللہ خاں بی کام (فرزند جناب جی۔ پی حمید رضا خاں مرحوم) کی شادی نور بیگم (دختر بی عبد الجبار صاحب مرحوم) سے ۱۶ر مئی ۱۹۸۲ء بمقام ملبا گل

بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

- نمبر خریداری ۹۶۶۳ نام صحیح پڑھے نہ جا سکے۔
- رفیعہ یاسمین (نمبر خریداری نہیں ہے۔ خط ۳۰ ر پیسہ کا بیرنگ ہوگیا تھا۔ پھر سے خبر مع ٹکٹ بھیجیں۔
- نمبر خریداری ۹۸۰۰ خبر بغیر ٹکٹ کے تھی پھر سے روانہ فرمائیں۔
- ذرین صادق (میسور) میری خالہ زاد بہن رخسانہ رحمت کی شادی عزیزی جاوید بنگلوری کے ساتھ بمقام الدور ۱۶ ر مئی ۸۲ء کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔
- مہرالنسا رنجا بہ (کولار) میرے منجھلے بیٹے نثار احمد سلمہ بی۔ ایس۔ سی (فرزند جناب عبدالرزاق) کی شادی صبیحہ بیگم مسلمہا بنت سید عبدالوہاب صاحب مالک فلور مل، سے ۲۰ مئی ۸۲ء بروز جمعرات، بوقت گیارہ بجے صبح بحسن وخوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

انتقال پُرملال کی خبریں

- میرے کرم فرما جناب منیر خاں صاحب، سابق ڈپٹی جنرل منیجر ویسٹرن ریلوے کی والدہ محترمہ کا ان کی کوٹھی جنت نشاں میرٹھ میں اچانک انتقال ہوگیا۔ منیر خاں صاحب بمبئی میں تھے خبر ملتے ہی روانا ہوئے لیکن افسوس کہ آخری دیدار بھی نہ کر پائے۔ اللہ پاک منیر خاں صاحب اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ شریک غم نسیم انہونوی
- فریدہ واحد (ہنسور) افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے والد محترم سید عبدالوہاب صاحب ۲۷ رجون ۸۲ء کی صبح ۴ بجے حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم پابند صوم و صلوٰۃ، غربا پرور اور صدہا خوبیوں کے انسان تھے۔ اللہ پاک انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور میری والدہ محترمہ اور ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
- حمیدہ بانو (بہرائچ) میری خلیہ ساس آفاق جہاں بیگم ۳۰ رجون ۸۲ء کو ۱۱½ بجے دن میں بعارضہ فالج بلرامپور اسپتال میں رحلت فرما گئیں۔ اللہ پاک مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
- شہناز بیگم (میسور) افسوس میری خالہ محترمہ وحیدہ بیگم صاحبہ ۱۴ رجون ۸۲ء کو ۱۲½ بجے شب میں اچانک انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ کریسنٹ ایجوکیشن سوسائٹی کی بانی تھیں۔ متقی پرہیزگار اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ اللہ مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام بخشتے ہوئے ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

بہتر ہے

مرسلہ:۔ بی عظمت ترنم — (آمبور)

۱۔ بے عمل عالم سے باعمل جاہل بہتر ہے۔
۲۔ برے ہم نشینوں سے تنہائی بہتر ہے۔
۳۔ دوسروں کے کام نہ آنے والے انسان سے حیوان بہتر ہے۔
۴۔ احسان کر کے جتانے والے سے احسان نہ کرنا بہتر ہے۔
۵۔ خوشامدی دوست سے صاف گو دشمن بہتر ہے۔
۶۔ استاد کی سختی باپ کی بے پروا الفت سے ہزار درجے بہتر ہے۔
۷۔ خاموشی فضول گوئی سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔
۸۔ محنت کی کمائی سے کم کھانا بھیک مانگ کر زیادہ کھانے سے زیادہ بہتر ہے۔
۹۔ باتوں کی ترشی سے کھانے کی ترشی بہتر ہے۔
۱۰۔ نادان دوست سے دانا دشمن بہتر ہے۔

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت ملک کی بہنوں کا مرسلہ ایک شعر شائع کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ہمارے عنوان کے تحت ہو سنجیدہ اور موزوں ہو۔ جو اشعار ۱۰ تاریخ تک مل جاتے ہیں۔ وہی شائع کئے جاتے ہیں۔ ستمبر کے لئے عنوان ہے۔ "وامن" اور اکتوبر کے لئے "ادا"

اس سے بڑھ کر دوست کوئی دوسرا ہوتا نہیں
سب جدا ہوتے ہیں لیکن غم جدا ہوتا نہیں

مرسلہ :۔ عذرا نقوی (بجنور)

بن آپ اپنے سفینے کا ناخدا اے دوست
بلند عزم ہواؤں کا رخ بدلتے ہیں

مرسلہ :۔ سیدہ مہ جبین فاطمہ عابدی

دہرائے گا جب کوئی افسانہ دنیا کا
بیساختہ یاد آئیں گے اے دوست تجھے ہم

مرسلہ :۔ فرح دیبا نکہت عابدی۔ بعراولی کہیں

ظاہر نہ کر سکا میں اسے اشک و آہ سے
اے دوست میرے غم کی حقیقت ہی اور ہے

مرسلہ :۔ قرۃ العین (سندیال)

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

مرسلہ :۔ سلمیٰ بی (رامپور)

مرسلہ :۔ طلعت فاطمہ لکھنوی (گونڈہ)

کون ہوتا ہے شریک غم ہستی اے دوست
شاخ بھی سوکھے ہوئے پتے گرا دیتی ہے

مرسلہ :۔ زیبا مہدی (رعنباد)

حیات سعی مسلسل کا نام ہے اے دوست
دل ونگاہ کی آسودگی میں کچھ بھی نہیں

مرسلہ :۔ عصمت آرا (بانکا)

اب ترا ہی کیا گلہ ہے اے دوست
ہم نے دنیا سے چوٹ کھائی ہے

مرسلہ :۔ نجمہ ایوب (علی گڑھ)

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانہ کا ذکر کیا
اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

مرسلہ :۔ راحت (کرنول)

مرے خلوص و وفا پر نگاہ رکھ ہر دم
تو میرے دامن صد چاک پر نہ جا اے دوست

مرسلہ :۔ نگار سلطانہ جلیلی قمر لطیف۔ (آمبور)

مرا وہ دوست جو کہتا ہے جان حاضر ہے
یہ سوچتا ہوں کسی دن میں آزماؤں اسے

مرسلہ :۔ بشریٰ خالد (گورکھپور)

وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

مرسلہ :۔ ریحانہ (سہارنپور)

بجز دل کے کوئی بھی عقدہ مشکل نہیں ملتا
کہ اس سے بڑھ کے کوئی دوست اور قاتل نہیں ملتا

مرسلہ :۔ نجمہ الصارمثا (بھٹکل)

آج کل کے دوست ہیں کاغذ کے پھول
دیکھنے میں خوشنما بوئے وفا کچھ بھی نہیں

مرسلہ :۔ ٹی عظمت فاروقی (آمبور)

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

مرسلہ :۔ مس ہوش شرافت (رامپور)

بہکی بہکی فضا یہ کہہ رہی ہے ندیم
تو کہیں آس پاس ہے اے دوست

مرسلہ :۔ طلعت پروین (کرنول)

کیا ہوگا؟ کہکشاں کا پرسان حال کون تھا۔ اسے کون سہارا دے گا؟ اسپتال میں اسے تنہا ڈاکٹروں اور نرسوں کے رحم و کرم پر چھوڑا تو نہیں جائے گا۔ کیا کرے گی وہ۔ اور پھر ناقابل گرفت اخراجات اُف خدایا۔ امی نے کچھ دنوں پہلے اپنے گمشدہ برتنوں کے سلسلے میں اتنی شاندار پرسش کی تھی کہ مزہ آگیا تھا۔ ظفر اپنی سخت گیری کے باوجود دہائی دینے لگا تھا! اور غضنفر کی تو گھگھی ہی بندھ گئی تھی! وہ تھے صرف بے جان برتن لیکن یہ تھا جاندار چیزوں کا معاملہ۔ سچ مچ سنکھیا اور زہر پر بات آجاتی۔

اب انھیں پیسوں کی سخت ضرورت تھی! جیسے تیسے یہ سات مہینے کسی دوا علاج یا احتیاط پرہیز کے بغیر گزر چکے تھے۔ پریشانیوں کے ہجوم میں اب تو غضنفر کو کہکشاں سے کبھی الجھن ہونے لگی تھی۔ مگر وہ جب کبھی اس کے پاس آتے۔ ہر فکر و غم سے آزاد پرواز کرتے!۔

کہکشاں البتہ مگن تھی۔ اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا! جو کچھ ہے بہت خوب ہے۔ اس سے زیادہ کون سا ہوس اور کفران نعمت، ایسی قربانی کون کرتا ہے! وہ تو اس طرح غضنفر کی محبت میں ڈوب گئی تھی جیسے پجارن اپنے دیوتا کی محبت میں تن من کو بھول چکی ہو۔

ڈولی کو چھوٹے سے اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ وہ اطمینان سے پڑھ رہی تھی! امداد و حتی الامکان سب کی امداد پر کمر بستہ رہتے تھے۔

ایک شام غضنفر آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کہکشاں کے پاس ایک خاتون موجود ہیں۔ وہ دروازے کے پاس ٹھٹھکے!

نرمل چہکی : آئیے آئیے۔ غضنفر بھائی۔ یہ خالہ جان ہیں آپ سے بہت تعریف کر رہی تھیں

(باقی آئندہ)

پرسوں نرسوں میری سہیلیاں آئی تھیں۔ میں نے ٹیپ ریکارڈ بجانے کے لیے سارے گھر میں ڈھونڈا۔ نہیں ملا:

ارے؟" ابا جان اس کی طرف گھومے۔

یہ کیا کہہ رہی ہے بٹیا" امی بھی ہکا بکا رہ گئیں۔

سچی۔ امی۔" نوبی نے پلکیں جھپکائیں۔

چور کب گھسا۔ میں تو رات دیر گئے تک جاگا کرتی ہوں" امی نے پریشان ہو کر کہا۔ "وہ خدا نہ کرے گھر میں گھستا تو کیا دھما کہ مجھے سنائی نہ دیتا"

پتہ نہیں امی" نوبی بولی۔

شاید غضنفر میاں لے گئے ہوں۔ اپنے دوستوں کو سنانے کے لیے" ابا جان نے کہا۔

کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ سخت متجسس نظریں باری باری ان سب پر ڈال کر امی نے کہا۔ "گھر سے یہ چیزیں پہلی دفعہ گئی ہیں میرے ساس سسر کی جوانی اسی گھر اسی محلہ میں گزری ہے۔ آج تک کوئی چور رذیل گھر میں نہیں گھسا۔ پھر اب کیا رنگ اٹھا ہے کہ"

بھائی وہ زمانہ اور تھا" ابا جان نے کہا "آج کل بے روزگاری کے ستائے ہوئے نوجوان ہر قسم کی ضمیر فروشی پر اتر سکتے ہیں"

آپ اپنی لن ترانی نہ سنائیے" امی نے تیوری بدل کر انھیں گھورا "کوئی آفت کا مارا نوجوان میرے گودام میں گھس کے قفل بند الماری اور غضنفر کے کمرے میں جا کر اس کی چیزیں نہیں چرا سکتا۔ یہ گھر کے کسی باشندے کا کام ہے۔ سینما کے واسطے مرے جاتے ہیں نا۔ میں پیسے نہیں دیتی۔ بس

اس لیے! میری چیزیں چرا کر سینما میں دفن ہونے گئے ہوں گے۔ اچھا اچھا۔ آنے دو۔ شام کو غضنفر اور مظفر کو۔ ان کی خطا اگر نکلی تو پیاسے مرغوں کی موت ماروا ڈالوں گی۔ بلا سے ایسی نابکار اولاد رہے کہ نہ رہے۔

میرے تھرماس کو بھی پوچھ لینا! ابا جان نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"آگ لگ جائے آپ کے تھرماس میں۔ یہ آپ ہی کی باگیں ڈھیلی کرنے کا نتیجہ ہے۔ غضب ہے خدا کا۔ چور گھر میں پل رہے ہیں۔" امی آپے سے باہر تھیں۔ ابا جان کھچڑی بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے اور کنکھیوں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے۔ امی دالان میں تخت پر بیٹھی اونچی آواز میں بڑبڑا رہی تھیں۔ ان کا غم برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

غضنفر نے ساری جنگ زرگری ملاحظہ فرمائی تھی۔ اور اب ان کا دل سینے سے نکلا پڑ رہا تھا۔ رات ہونے میں دیر کتنی ہے۔ ادھر سے وہ اور کالج سے بے چارہ مظفر آتا ہوگا۔ تب زندہ مردوں کی کھال کتنی مشکل سے کھینچی جائے گی۔

مظفر ان کا چھوٹا بھائی تھا۔ بیس اکیس سال کی عمر۔ بی کام کر رہا تھا۔! اس کی فطرت کچھ الگ تھی۔ اکھڑ بھی تھا اور غصہ ور بھی۔ چھوٹے بہن بھائی اس سے ڈرتے تھے اور اس سے بے تکلف بھی نہیں تھے۔

غضنفر کا وقت بڑا الٹا سیدھا کٹ رہا تھا۔ صبح سویرے نہ کوئی معقول بہانہ بنا کر گھر سے نکلتے۔ دس منٹ دکان پر ابا جان کو چہرہ دکھانا بھی ضروری تھا اور موقعہ پا کر ایک آدھ صابن کی ٹکیہ بسکٹ کا پیکٹ یا پاؤڈر کا ڈبہ بھی جیب میں اتارنا ضروری۔ اس کے بعد دس بجے تک

آنے جانے لگی تھیں۔ اکثر نوشینہ بھی آ نکلتی اسے اپنے بڑے بھیا کے بیاہ کی بہت خوشی تھی۔ وعدہ لے رکھا تھا کہ کنگن دھول کرے گی جس میں یاقوت کے نگینے جڑے ہوں گے!

دوپہر بھر چوادار برآمدے میں بڑی سی حصیر بچھتی اور ساری دوپہر خواتین چائے پی پی کر پان چبا چبا کر شادی بیاہ کے معاملات بے انتہا شوق۔ حد سے زیادہ دلچسپی سے سلجھایا کرتیں۔ امی نے تو قریب قریب بات پکی ہی کر دی تھی! انھوں نے اپنی بچی کی شادی خاصے کر و فر سے کی تھی اور ان کا داماد جتنی شاندار بارات لے کے آیا تھا وہ تو تمام خاندانوں میں مثالی روایت بن چکا تھا! اب ان کی مرضی یہ تھی کہ بیٹے کی بارات بھی اسی شان سے نکالی جائے!

غضنفر کو بس اتنا علم تھا کہ اگر والدہ محترمہ کو ان کی بہادری کا کارنامہ معلوم ہو جائے گا تو سچ مچ بڑی شاندار بارات سجے گی۔

غضنفر کا دل اشنڈی میں نہ لگتا۔ حالانکہ انھیں اتیازی شان سے کامیابی کی امید تھی۔ اب وہ امید سسکنے لگی تھی۔ شاید وہ ڈھنگ سے امتحان بھی نہ دے سکتے۔ اپنے سامنے کتاب رکھے وہ پہروں سر تھامے بیٹھے رہتے اور ایک لفظ بھی پڑھ نہ سکتے۔

کہکشاں کی دوسری کیفیت نے انھیں عجیب سے احساسات میں جکڑ دیا تھا۔ انھیں یقین نہ آتا۔ وہ سچ مچ باپ بننے والے تھے۔ کیسا متحیر کن خیال تھا۔ اگر کوئی چھ ماہ پہلے ان حالت کی پیش گوئی کرتا تو یقین نہ آتا۔ لیکن اس عرصہ میں کیسا انقلاب آ گیا تھا۔

"بیگرادہی رکھنا چاہتی ہو شاید۔!"
"ہتب۔ تین بہنوں سے! :" اس نے چہرہ چھپا لیا۔
"ارے میرے مولیٰ رحم۔!" بے ساختہ غضنفر کے منہ سے نکل گیا۔
"بس آ گیا قرار۔ اب آپ جائیے یہاں سے۔" کہکشاں انھیں دور
دھکیل کر اٹھی اور بھاگ نکلی۔
دیر تک غضنفر بدحواسوں کی طرح بیٹھے رہے۔ اور سر سہلاتے رہے۔
رفتہ رفتہ پھر تن ناتواں سے جان سرکنے لگی۔
سچ ہی تو ہے۔ جو مصیبت تنہا آتی ہے وہ محض مذاق ہوتی ہے مصیبت
تو یہ ہے جو اپنے ساتھ اپنی دوسری بہنوں کو بھی لے کے آئے ٹھاٹھ سے۔!

موسم گرما شروع ہو رہا تھا۔ سردیوں کا زور ختم ہونے لگا تھا پت جھڑ
کے دنوں کی ویرانی ہر طرف اپنا اثر پھیلاتی پھر رہی تھی۔ دن بڑے ہونے
لگے تھے اور خشک ہوائیں چلتی تھیں۔ کبھی کبھی آسمان مٹیالے بادلوں
سے ڈھک جاتا تو فضا زیادہ اداس ہو جاتی۔!
چھوٹے بڑے امتحانات ہر درسگاہ میں شروع ہونے والے تھے۔
ادھر تو وہ آخری امتحان تھا جس کے بعد شاید غضنفر کو حبس دوام
با مشقت کی سزا ملنے والی تھی۔
ان دنوں غضنفر کی امی کے یہاں ان کی آپا محترمہ بہت جلدی جلدی

کہکشاں کی رفاقت میں بیت گیا۔ اس کے بعد کالج کی مصروفیات۔ تین
بجے کے بعد پھر کہکشاں کی صحبت اور رات کو گھر پر اشد ضروری موجودگی!
انھوں نے اس عرصہ میں متعدد بار دوستوں کے ساتھ اسٹڈی کرنے
کے بہانے راتیں گھر سے باہر گزاری تھیں۔
چونکہ ان کی ذات سے کسی کو کوئی نامناسب شک نہ تھا لہذا ان
کے تمام بہانے سچ سمجھ لیے جاتے تھے۔ لیکن غضنفر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ
یہ لنگڑی گاڑی زیادہ دیر تک چلنے والی نہیں تھی۔! ایک نہ ایک
دن وہ بیچ راستے پر رُک کے گی۔ اور ضرور رُکے گی! لہذا اس بدترین
اندیشے نے ان کے دنوں کی بے فکری اور راتوں کی نیند اڑانا شروع کیا
رفتہ رفتہ ان کا چہرہ اس نادمی چور کا چہرہ ہو گیا جسے اپنی چوری کے
کھلنے کا کامل یقین ہو۔ ان اعمال و افعال میں توازن نہیں رہ گیا
یہ عالم ہو گیا کہ وہ باتیں کرتے کرتے گہری فکر میں کھو جاتے۔ یا تو مخاطب
کے چہرے کو اس طرح گھورتے جیسے اس کے چہرے کے اس پار کوئی چیز ڈھونڈ
رہے ہوں۔ ہر دم یہی ڈر لگا رہنے لگا کہ کہیں کوئی انھیں اس گھر میں آتے
جاتے دیکھ نہ لے۔ راستہ چلتے پیٹھ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے کہ اب
کسی نے پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھا کہ تب رکھا۔ چوری چوری گھر میں
داخل ہوتے تو دھڑکا رہتا کہ اب کنڈی بجی اور اب بجی۔ انھیں اختلاج
شروع ہو گیا۔ وہ گو نہ عذاب نے چہرے کی رونق چھین لی۔ مزاج کی وہ
شگفتگی اور شادابی رخصت ہوئی۔ جو دوسروں کی پسندیدہ صفت تھی!
عجیب سی بونق اور بوکھلائے ہوئے رہنے لگے۔! اس پر لطیفہ یہ کہ انھیں

اپنی مزاج کی تبدیلی کا احساس بھی نہ تھا۔ یہ تو دوسرے محسوس کرنے لگے تھے!۔

سب سے پہلے تو کہکشاں ہی نے پوچھا تھا۔ اور جواب میں غضنفر ہکلانے لگے۔

"ارے بات کچھ بھی نہیں" وہ بولے "میں تو پہلے کا سا ہوں، تمھاری نظروں کا قصور ہے!۔

مجھے معلوم ہے۔!

کیا معلوم ہے؟۔

آپ نے اپنے والدین سے چھپا کر اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے" کہکشاں کے لہجے سے اداسی برس رہی تھی "آپ کی ہمدردی اب آپ کے لیے مصیبت بن چکی ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کی امی اتنی نرم مزاج اور ایثار پسند نہیں ہیں۔ وہ ایک غیر اور ناپسندیدہ لڑکی کو اپنے قریب گوارہ نہیں کر سکتیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کو یوں دربدر کیوں ہونا پڑتا۔ اب مجھے اپنے لوگوں میں لے جا کے رکھیئے"۔

"مصیبت تو یہ ہے کہکشاں کہ تم لڑکی کم اور فلسفی زیادہ ہو۔ میں ہوں سائنس کا طالب علم، فلسفہ میرے پڑوس سے ہو کر بھی نہیں گزرا۔ تمھاری ہر بات ڈاک گاڑی کی طرح گزر جاتی ہے اور میں جواب ہی سوچتا رہتا ہوں"۔

"مگر میں نے کوئی غلط اندازہ تو نہیں لگایا نا؟"

اندازہ پانچ سو فیصد ٹھیک ہے" غضنفر نے بذلہ سنجی میں بات برابر کی "لیکن میں نے آپ کی خدمت میں تو کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اب گلہ کس

کی خود ہی تشہیر بنے جا رہے ہو۔ ایسی بھی پست ہمتی کیا؟"

کہکشاں سے پوچھنے پر عقدہ کھلا۔ وہ شرم کے مارے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔

آپ کو کیسے پتہ چلا؟" بڑی مشکل سے اس نے کہا۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔!" غضنفر کے سارے اندیشے کہیں رہ گئے تھے۔ اب تو وہ خدا جانے کیوں کھلے پڑتے تھے۔ انھوں نے اسے اپنی بانہوں میں گرا لیا۔

میں تو کبھی نہ بتاتی۔ آپ کو جب تک معلوم نہ ہوتا!" اس نے پلکیں جھکا لیں۔

واہ بھئی۔ ہمی سے رازداری۔؟" وہ بڑے مدبرانہ انداز میں ہنسنے لگے۔ غیر شعوری طور پر ابا جان کی نقل کی تھی۔

"یا اللہ۔ مجھے تو شرم آتی تھی"

"اچھا۔ شانی۔ کل چل کے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے تصدیق کروا لیں"

"واہ۔ مجھے ہوا کیا ہے"

ذرا اطمینان ہو جائے"۔

تو پھر اطمینان رکھیئے۔!

سلسلہ کب سے چل رہا ہے"

"ہٹیئے"

میری قسم۔؟!"

"اُف توہ۔ آپ کی ضد سے بھی ہارے۔ جائیے نہیں بتاتی"

اب۔ ب۔ اب کیا ہوگا۔ اور۔؟"

"لڑکا یا پھر لڑکی۔ اس کے سوا تیسری کوئی چیز نہیں ہوتی"

لیکن جب غضنفر کی آنکھوں میں دفعتہً آنسو بھر آئے تو دادر سنجیدہ ہو گئے بلکہ انھیں بھی خاصی پریشانی ہونے لگی۔

"اب میں خود زہر کھا لوں گا" غضنفر نے حد سے زیادہ بدحواس ہو کر کہا۔ "چار چینے میں نزع کا عالم طاری ہے مجھ پر۔ نہ صحت ہوتی ہے نہ جان ہی نکلتی ہے بس۔ یہی حال ہے ساری کم بختیوں کا۔ میں چلا"

"بیچارگی اس قدر گھبرائے جاتے ہو" دادر نے شکایت کی "کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ میری تشخیص صحیح نکلے۔ تم کہکشاں سے پوچھنا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بات کچھ اور ہو۔!"

"اور اگر تمھاری ہی تشخیص صحیح ہو تو پھر"

"بھیا اس طرح رو دھو کر طبیعت مت خراب کرو" دادر نے سمجھایا۔ "اس مصیبت سے نجات کا حل ڈھونڈھنا ہے۔ مردانہ وار ڈھونڈیں گے۔ تم تو رو دھو کر بیچاری کہکشاں کی ہمت بھی پست کر دو گے۔!"

"جاؤں؟" نہایت بے بسی سے بڑی معصومیت سے غضنفر نے پوچھا۔ بعد وقت دادر نے ہنسی ضبط کی ان کے چہرے سے نظریں ہٹا کر بولے "ہاں میں یہیں بیٹھا ہوں۔ جو کچھ گزرے۔ آکے بتا دینا"

"نہیں۔ اس کے بعد میں گھر جاؤں گا۔"

"اچھا اچھا۔ مگر دیکھو بھائی۔ ذرا ہوش قابو میں کرو۔ تم تو اچھے داز

بات کا ہے؟۔

مجھ سے آپ کی پریشانی جو نہیں دیکھی جاتی!"

"پریشانی۔ ہاں ٹھیک ہے۔ نصف درجن لڑکیاں لوکی کی بیل کی طرح بڑھ رہی ہیں۔ نصف درجن سے زاید لونڈے آوارہ گھوم رہے ہیں۔ نہ وہ تمھاری سنتے ہیں اور نہ میری۔ میں تو سوچتا ہوں کہ ان سارے نگوڑوں کو زہر دے کر سلا ہی دوں۔ کیوں۔ کیا خیال ہے۔ ہائیں۔ یہ کیا۔ تم کہ بیج بغیر برسے لگیں۔ شائی کیوں رو رہی ہو؟"

"مجھے سچ سچ بتا دیجئے۔ ہم لوگ آپ پر بوجھ بن گئے ہیں نا! پتہ نہیں۔ آپ کے والدین نے آپ سے کیا کہا ہے۔ دکھ آپ کے چہرے پر جم کے رہ گیا ہے؟" کہکشاں کو صدمہ تھا۔ وہ جاہل اور ناسمجھ نہیں تھی۔ اس نے غضنفر کے عاجلانہ اقدام میں جو ساتھ دیا تھا۔ وہ اب اس کے لیے سوہان روح بن کے رہ گیا تھا۔ حتی الامکان وہ یہی کوشش کرتی تھی کہ غضنفر کو سرور و تبسم رکھ سکے۔ ہر طرح کی فکریں خود لے لے۔ اور وہ کرتی بھی یہی تھی۔ اس کی محبت جاں نثاری کی حد کو پہونچی ہوئی تھی! وہ غضنفر کے ایثار و قربانی کی دل سے معترف تھی انھوں نے اسے اپنی محبت دی تھی۔ تحفظ کا احساس دلایا تھا! اب وہ تمام خطروں سے آزاد چین کی نیند سوتی تھی! اسے اس بات کی رتی بھر پرواہ نہ تھی کہ اسے عمدہ لباس، مرغن غذائیں اور اعلیٰ رہائش میسر نہیں تھی۔ اس نے کبھی اس بات کی خواہش بھی نہیں کی تھی۔ غضنفر اسے اپنا جیب خرچ

دے دیتے اور وہ نجانے کس انداز سے گھر چلاتی تھی کہ کبھی تنگی ترشی کی شکایت ہی پیدا نہیں ہوئی۔

داؤد ان کا رازدار اور غمگسار اکیلا دوست تھا۔ جس نے ان سے کمرے کا کرایہ لینا پسند نہ کیا۔! اس کے والدین کہیں ضلع پر تھے۔ داؤد یونیورسٹی کے قریب کی بنا پر شہر میں رہتا تھا۔! اس نے غضنفر کا پورا پورا ساتھ دیا تھا۔ اسے خیال رہتا کہ غضنفر کی غیر موجودگی میں ان لڑکیوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔!

اس روز تو غضنفر نے ٹال مٹول کر کے کہکشاں کو بہلا دیا لیکن جب داؤد نے ان سے سوال کیا تو انھوں نے اپنی پوری داستان انھیں سنا دی۔

"کیا تمھیں بالکل توقع نہیں ہے کہ تمھاری امی کہکشاں کو قبول کر لیں گی۔ کم از کم ان کے سامنے تم یہ سارے مسائل رکھ تو دیتے"

"تم انھیں جانتے ہو۔ داؤد۔ شاید وہ مجھے بھی گھر سے نکال دیں۔"

"ہاں نہیں؟"

"یقین کرو۔ ادھر تو یہ کھچڑی پک رہی ہے کہ امتحان کے بعد گرمی کی چھٹیوں میں امی اپنی بھانجی کو اپنی بہو بنا کر گھر میں لے آئیں تو سمجھو۔ میرا پوشیدہ نکاح گھر میں کیسی زبردست قیامت نہ برپا کر دے گا۔ ممکن ہے کہ اپنی بات کے گرنے پر امی کوئی خطرناک قدم اٹھائیں۔ تب کیا میں خود کو معاف کر سکوں گا؟"

"تم اگر کہو تو میں امی سے بات کروں۔" انھیں آہستہ آہستہ راہ راست

مجھ سے تو کچھ کہتی ہی نہیں۔ رات اسی طرح سارا کھانا بھی اگل دیا تھا چھی چھی چھی۔ نجانے کتنا ٹھونس لیتی ہیں؟"

داؤد نے بے تحاشہ چونک کر ڈولی کو اور پھر غضنفر کو دیکھا لیکن وہ سر جھکائے کافی کترنے میں لگے تھے۔ داؤد نے ڈولی سے کہا۔

"اچھا بیٹی تم جاؤ۔"

اس کے جانے کے بعد انھوں نے کہا "میاں تمھاری نفرت بھی ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں۔ دوسرا گل کھلا ہے!"

"کیا مطلب؟" غضنفر نے بھی چونک کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ کی خوش نما کھوپڑی پر اب شرف پدری کا تاج سجنے والا ہے۔"

"مذاق مت کرو۔" وہ بوکھلا کر گڑگڑائے۔

"مذاق؟ اماں سنا نہیں۔ لڑکی کیا کہہ کے گئی ہے۔ کھایا پیا ایک خاص وقت میں خواتین اگلتی ہیں۔ ورنہ بڑے سے بڑا مرد سکے ہوئے چھل لیں اور ڈکار نہ لیں۔ میں جانتا ہوں یہی علامتیں ہوا کرتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی بزرگ یا خاتون سے تحقیق کر ڈالو۔"

کافی چھلک کے غضنفر کے کپڑوں پر گری۔ اتنی شدت سے ہاتھ کانپا تھا۔ پھر انھوں نے اس کی پرواہ کیے بغیر پیالی میز پر رکھی اور اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ شاید سارا جسم ہی کانپ رہا تھا کیونکہ ان سے کھڑا نہ ہوا گیا وہ جلدی سے پھر بیٹھ گئے اور لرزتی ہوئی پھنسی پھنسی آواز میں بولے۔

"تو پھر اب کہاں ہیں وہ؟"

"اپنے والدین ہی کے پاس ہیں۔ جب مجھے پڑھائی سے چھٹی ملے گی اور ادھر ان کو بھی انشاء اللہ چھٹی جلد ہو چکے گی تب امی لے آئیں گی"

"ابھی تک تم نے یہ بات چھپائی۔ بہت گھٹے ہوئے ہو۔ اور میری سادگی دیکھو، نہایت خلوص کے ساتھ تم جیسے مکار آدمی کے سامنے آنسو بہا رہا ہوں" غضنفر نے خفا ہو کر کہا۔

داور نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "تم نے اچھا کیا۔ ایک ماہر پیراک ہی کسی اناڑی کو پیرنا سکھاتا ہے۔ سمجھے!"

"بھائی یہاں تو معاملہ ساحل سے لگنے کا ہے۔"

"لگ جاؤ گے۔ حوصلہ رکھو۔ پریشانی سے بھی کیا حاصل؟"

غضنفر کچھ سوچنے لگے۔

دونوں شام کے وقت باہر برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اتنے میں ڈولی کافی کے ٹرے سنبھالے آئی۔ اب وہ ہر فکر و غم سے آزاد خوب نکھری سنوری لگ رہی تھی! معصوم آنکھیں چمک رہی تھیں۔ گلابی گلابی لبوں پر مسکراہٹ تھی!

"لاؤ بی بی لاؤ۔ جیتی رہو۔ میں تمھیں پکارنے ہی والا تھا" داور نے نعرہ مارا۔

"تم لوگوں نے کافی پی؟" غضنفر نے پوچھا۔

"جی بالا۔ ہم نے تو پی" اس نے داور کو پیالی تھماتے ہوئے کہا "مگر باجی کو پتہ نہیں کیا ہوا۔ کافی ادھر ہی ادھر نکال دی" اس نے برا سا منہ بنایا

پر لاؤں گا" داور نے کہا

"راہ راست پر" غضنفر پژمردہ انداز میں مسکرائے "مگر اس حالت میں بھی انھیں دوبارہ منہ دکھانے کی ہمت کہاں سے لاؤں گا"

"کیا ابا بھی کچھ نہیں جانتے؟"

"توبہ کرو یار"

"مگر یہ تو واقعی بڑی نازک پوزیشن ہے۔ تم مجھے بیمار دکھائی دینے لگے ہو" داور نے کہا۔

"مجھے خود محسوس ہوتا ہے اگر بیمار نہیں بھی ہوں تو بہت جلد ہو جاؤں گا"

"ہمت کرو۔ مرد ہو۔ تمھاری یہ بزدلی اور پست ہمتی بے چاری تمھاری بیوی کو بھی لے ڈوبے گی۔ ایک بار اور آخری بار، پھر جلد فیصلہ کیا کیجے۔ اپنی والدہ محترمہ سے سب کچھ کہہ دو۔ پھر جو کچھ کریں۔ آر یا پار"

"نہیں داور۔ ایک دفعہ ایسا ہی کوئی معاملہ تھا۔ میں نے نوشینہ سے صرف اتنا کہا تھا کہ مجھے سینما پسند نہیں ہے۔ بچپن میں دیکھا تھا تب جھجڑے جھجڑے سے بال تھے۔ بس یار، اسی پر امی نے وہ بے بھاؤ کی سنائی ہیں کہ خدایا دا آگیا۔ خوب دھواں دھار تقریر فرما کے اخیر میں مجھے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ خبردار کہے دیتی ہوں۔ میری پسند میں مین میخ نکالو گے آپا کے سامنے گردن جھکاؤ گے تو کچھ کھا کے سو رہوں گی۔ بات کی سچی پکی ہوں۔!"

"ابھی سبھی مائیں پہلے پہل اسی طرح رعب جماتی ہیں" داور نے کہا "تم کہکشاں کو لے تو جاؤ ان کی جناب میں۔ بہت اچھی لڑکی ہے میں سمجھتا

ہوں ضرور قبول کرلیں گی:"

"تم انھیں نہیں سمجھ سکتے دادر۔ وہ قطعی جداگانہ ٹائپ رکھتی ہیں۔ ہرگز متاثر نہ ہوں گی۔ اور شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکوں کی بھی خودرائی اور سرکشی گوارا نہیں کرتیں۔ مجھے فوراً نکال دیں گی گھر سے۔" غضنفر تو گویا رو دیئے تھے۔

"اچھا تو نکل جاؤ گھر سے۔ اب کیا بُرے ہو۔ تھوڑے دنوں بعد جب تمہاری امی کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"مجھے یقین نہیں۔ انھوں نے قہر وغضب کے جوش میں واقعی کچھ کھا پی لیا تو خدانخواستہ پورے گھر ہی کی ناؤ کو ڈوبی سمجھو۔"

"تو پھر میرے بھائی مزے کرو۔ شرع میں تو چار کی گنجائش ہے ابھی تو تمہاری صرف دو ہی ہیں۔"

"اسی کو کہتے ہیں مرے پر سو دُرّے، ہنھ! یعنی کہ ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ معاف کرنا۔ بہت دماغ کھایا تمہارا۔" غضنفر نے سخت برا مان کر چہرہ پھیر لیا۔

"اچھا بھائی۔ کوئی راہ نکالوں گا۔ یکبارگی خفا ہو کر تم یار [illegible] ہاتھ پاؤں پھیلا دیتے ہو۔" دادر نے کہا۔

"اپنے سر پڑتی تو بچہ دن میں تارے دکھائی پڑنے۔ ہمارا مضحکہ اڑانے چلے ہو۔ خدا غارت کرے۔" غضنفر نے دانت پیس کر کہا اور اٹھنے لگے۔ مگر قہقہہ لگا کر دادر نے انھیں دبوچ لیا۔ اور مزید قہقہہ لگا کر بولے۔

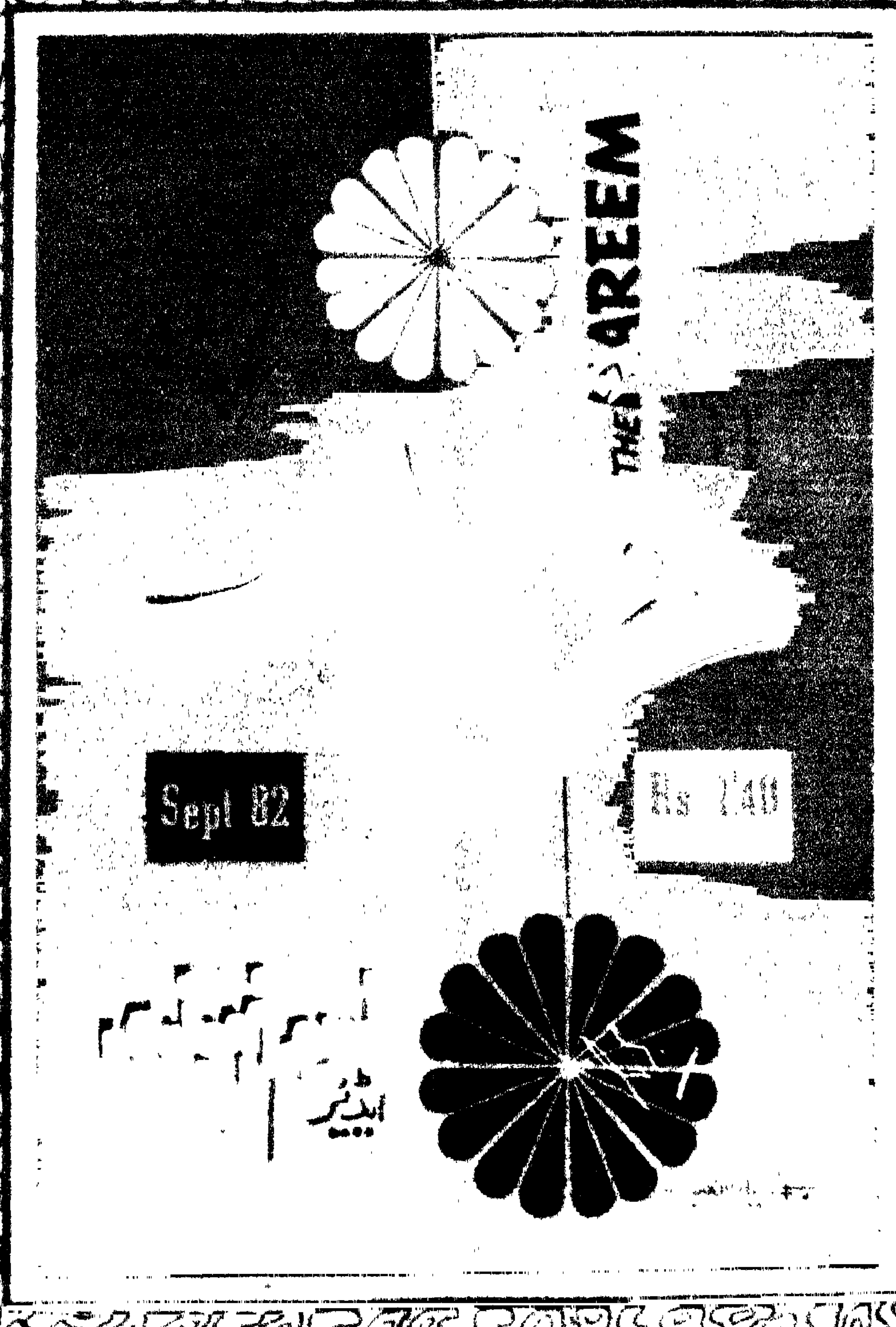
میرے سر پر تو یاں بڑی بھاری پڑی تھی۔ تمہیں وہ قصہ نہیں معلوم ہوا۔ دادا جان کو بستر مرگ پر میرا سہرہ دیکھنے کا ارمان ہوا تھا چنانچہ جھٹ پٹ اپنی دوسری پوتی سے میرا نکاح کر دیا گیا۔ خیال تھا سہرہ دیکھنے کے بعد حسب وعدہ وہ چل بسے۔ مگر جناب۔ چچا جان نے ضد پکڑ لی کہ دادر میاں کے برسر روزگار ہونے تک لڑکی کو رخصت نہیں کریں گے۔ لڑکی بھی ابھی ناسمجھ ہے۔ خیر بھائی۔ دو سال تک ہم نے صبر کی سِل سینے پر رکھی۔ ایک دفعہ اچانک کسی کی شادی میں ہمارا آمنا سامنا ہو گیا۔ اب آگے کیا بتاؤں۔ تم عقلمند تو نہیں ہو۔ مگر اشارہ کیے دیتا ہوں" وہ ہنسے اور غضنفر کے کندھے پر بھاری بھرکم تھپکی دے کر بولے: "کچھ دنوں بعد جب محترمہ کی چوری منہ سے بولنے لگی تب خاندان بھر میں مہابھارت مچ گئی۔ محترمہ نے غالباً کسی آئندہ کے خطرے سے ڈر کر بھائی جان سے اپنا راز کہہ دیا تھا۔ غنیمت ہوا میاں، اور اس کے علاوہ امی جان بھی اتنی سنگدل نہیں تھیں۔ ابا جان تو بہت ہنسے تھے کہنے لگے کہ نکاح کر کے اس طرح لڑکے لڑکی کو چھوڑنا سخت جہالت ہے۔ اچھا پھر...!"

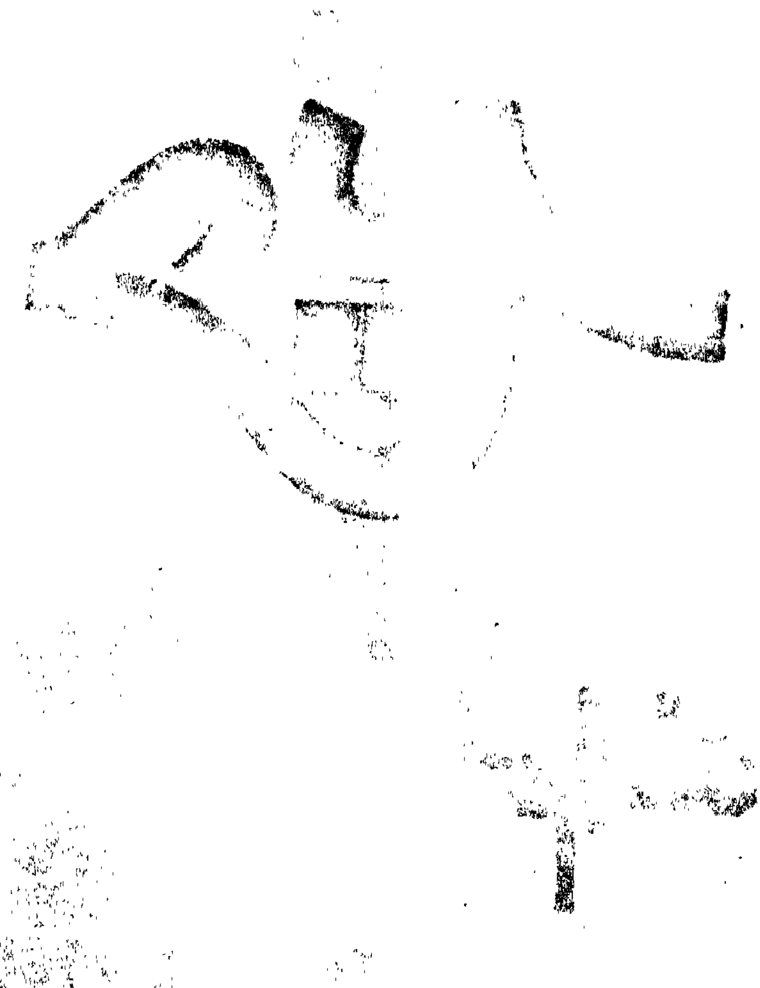
"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر بدمعاش ہو۔" غضنفر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے نکاح کے بعد کیا باقی رہ گیا۔ باقی رسمیں محض ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔" دادر نے کہا۔ "اور بھائی جیسے تم آپے سے باہر ہو گئے تھے میرا حشر تو تم سے بدتر ہوا تھا۔ اصرار و تکرار کا دامن مطلب پہ کر۔ وہ گھپلا ہو گیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لیڈی ڈاکٹر کے یہاں کے چکر شروع ہو گئے ہیں۔"

"واقعی؟" غضنفر نے بڑے زور سے آنکھیں نکالیں۔ "ہاں بھائی۔"

786


پچنول
ہمیشہ سے آزمائی ہوئی
پیٹ کے روز روز کے
جھگڑے سے بچیے
पचनोल
زیادہ اثردار
اور نئے پیکنگ
میں
کھانے میں بدپرہیزی ہو ہی جاتی ہے اور پیٹ کی گڑبڑ روزمرہ کا معمول بن سکتی ہے۔
لیکن گھبرایئے نہیں۔ پچنول ہمیشہ پاس رکھیے کیونکہ پچنول میں ایسے اجزاء شامل ہیں جو ہضم کی خرابی،
معدہ میں تیزابیت، اپھارا، کھٹی ڈکاریں اور پیٹ کی آئے دن کی خرابیوں میں فوری آرام پہنچاتے ہیں۔
کھانا کھانے کے بعد پچنول کی دو ٹکیاں ضرور کھایئے۔
پچنول پیٹ کی آئے دن کی شکایتوں کا زیادہ کامیاب اور فوری علاج
ہمدرد


THE QAREEM
Sept 82
ایڈیٹر



گذشتہ ۵۲ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا سب سے پرانا رسالہ

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیادگار

سید محمد سلیم اٹھونوی مرحوم
و
بیگم سلیم اٹھونوی مرحوم

ایڈیٹر و نگراں

نسیم اٹھونوی

معاونین

شوکت جہاں بیگم غزالہ
و
جانی بیگم ردولوی

قیمت فی پرچہ :- ایک روپیہ چالیس پیسے
قیمت سالانہ :- منی آرڈر سے ۲۲/- روپیہ
قیمت مخصوص ۲۵/- روپیہ
قیمت اعزازی ۲۷/- روپیہ
وی، پی سے منگوانے پر چار روپیہ پچاس پیسے زائد
غیر ممالک سے ۴۵/- روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی میل
ایر میل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں

ناشر - فہیم اٹھونوی

جلد (۵۲) فہرست مضامین ماہ ستمبر ۸۲ء نمبر (۹)

آفس و ترسیل زر کا پتہ :- نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ فون آفس :- ۴۴۵۵۴ - رہائش :- ۴۵۲۲۴

فہیم اٹھونوی نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

لمعات

"مرد ضروری ہیں یا عورتیں" کے مبحث پر کیمبرج یونیورسٹی میں ایک مباحثہ چند ماہ قبل ہوا تھا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ عورتیں ضروری ہیں، مرد غیر ضروری، لیکن جب یونیورسٹی کے ایک جلسہ میں اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو تجویز کی مخالفت میں ۲۲۲ ووٹ پڑے اور موافقت میں ۵۱۔ ۲۲ افراد نے ووٹ دینے سے اجتناب کیا۔ لیکن موافقت پڑنے کا مطلب نہیں سمجھا گیا کہ فیصلہ منصفانہ ہے" اس لئے کہ اس یونیورسٹی میں لڑکوں اور لڑکیوں کا تناسب سات اور ایک کا ہے۔ بہر حال اس مباحثہ میں شریک طالبات نے جو اس قرارداد کے حق میں تھیں یا مخالفت میں، سب نے مردوں کو "لڑاکو" گاودی اور نااہل بتایا۔

مورگا میکڈانلڈ نامی ایک طالبہ نے کہا کہ مردوں کے وجود کا غیر ضروری ہونا سائنس نے ثابت کر دیا ہے۔ پیدائش اطفال کا عمل مردوں کے بغیر بھی جاری رہ سکتا ہے، اگر تولیدی مادے کے بینک قائم کر دیئے جائیں، لیکن عورتوں کے بغیر سائنسی کوششوں سے بھی اطفال کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا۔ ایسی کوئی صورت ممکن نہیں ہو سکتی کہ مرد بچے جن سکیں۔"

مردوں کی وکالت لڑکیوں کی جانب سے بے دلی کے ساتھ کی گئی۔ ایک بیس سالہ طالبہ نے کہا کہ اس غیر تعمیری اور افتراق پیدا کرنے والی قرارداد کو ناکام بنانے میں مجھ سے تعاون کیجئے۔

ایک دوسری طالبہ نے سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ اکثر عورتیں مردوں کو پسند کرتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مرد ایک مسحور کن مخلوق ہے، اس کے بغیر عورتیں اس دنیا میں کچھ نہیں کر سکتیں۔ مرد عورتوں کے لئے اس لئے بھی ضروری ہیں کہ انہیں تفریح کرانے لے جاتے ہیں انہیں ہوٹلوں میں اچھے اچھے کھانوں اور مشروب سے ان کی تواضع کرتے ہیں، ان کی فرمائشوں کو پورا کرتے ہیں، سب سے آخر میں ایک مسٹر

مسٹر البرٹ فنی نے نہایت دلچسپ بات یہ کہی کہ یہ تحریک عورتوں کے دماغ کی پیداوار ہے اور میرے خیال میں یہ ان کے اس باطل دعوے کی ایک کڑی ہے کہ اب مردوں کا زمانہ گزر چکا۔

دیکھا آپ نے کہ مغربی ممالک میں کیسی کیسی لایعنی بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ ہنسی آتی ہے ان صاحبہ کے بیان پر، جنھوں نے کہا تھا کہ تولیدی مادہ کے بینک قائم کر کے ولادت اطفال کا عمل جاری رکھا جا سکتا ہے۔ غالباً ان محترمہ کا یہ بھی فیصلہ ہوگا کہ تولیدی مادہ مردوں کے بجائے جانوروں کا لے لیا جایا کرے گا۔ اس لئے کہ اگر مردوں کو اس حد تک بھی شریک رکھا گیا تو ان کی ضرورت بہر حال قائم رہے گی اور جب انھیں بیکار محض سمجھ لیا جائے گا تو وہ یہ زحمت بھی کیوں کریں گے کہ ایسے بینکوں میں اپنا تولیدی مادہ جمع کریں۔ اور ایسا ہوا تو کیا جانوروں کے تولیدی مادہ سے ایسے بچے پیدا ہو سکیں گے جو انسانی خو بو رکھ سکیں میرے خیال سے تو ایسا ممکن نہ ہو سکے گا، اس لئے کہ مادہ تولید تخم کی حیثیت رکھتا ہے، جیسا تخم بویا جائے گا ویسا ہی پھل بھی پیدا ہوگا۔ اور اگر یہ مفروضہ برتے کار لایا جا سکا تو آئندہ نسل کے انسان کم اور جانور زیادہ ہوں گے۔

البرٹ فنی نے واقعی چبھتی ہوئی بات کہی ہے کہ اکثر عورتیں، خصوصاً ترقی پسند عورتوں کا خیال ہے کہ وہ اب مردوں کی جگہ لے کر رہیں گی، یعنی جس طرح اب تک مرد ان پر مسلط رہ کر حکومت کرتے رہے ہیں، آئندہ وہ اسی طرح مردوں پر چھا جائیں گی کہ انتقام ہو سکے۔ اس میں شک نہیں کہ عورت ابتدائے آفرینش سے ہی مردوں کے جبر و استبداد کا شکار رہی ہے۔ اس کے ظلم و ستم سہتی چلی آئی ہے، اس لئے تعلیم اور آزادی حاصل کرنے کے بعد اس میں انتقامی جذبہ پیدا ہونا ہی چاہئے، لیکن انتقام اس طرح نہیں لیا جا سکتا کہ مرد کا وجود ہی ختم کر دیا جائے۔ یہ بہت ہی غیر فطری تصور ہے جو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مرد بہر حال گاڑی کا دوسرا پہیہ ہے

ابھی تک ایسی کوئی گاڑی نہیں بن سکی جو ایک ہی پہیئے پر چل سکتی ہو زندگی مرد و عورت کے میل سے ہی قائم رہ سکتی ہے ان میں سے کسی ایک کو بھی ختم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا ہی ختم ہو جائے گی۔ دونوں کا میل ملاپ، اتصال اور یکجہتی کے بغیر کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

عورت جنس کمزور ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ قدرت نے اسے بنایا ہی ایسا ہے۔ اس کی کمزوریاں کبھی دور نہیں ہو سکتیں، اس لئے مرد بہرحال اس پر غالب رہے گا۔ خواہ عورت کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے۔ اعلیٰ تعلیم اور سائنسی تعلیم بھی اسے اس کی کمزوری کی مدافعت نہیں کر سکتی جو فطری طور پر اسے دی گئی ہے اس لئے اس طرح کی باتیں سوچنا ایک تماشے سے زیادہ کچھ نہیں۔ نہ عورت مرد سے چھٹکارا حاصل کر سکتی ہے۔ نہ مرد ہی عورت سے دور رہ سکتا ہے، دونوں میں ایک دوسرے کے لئے ایسی کشش موجود ہے، جس سے انحراف کا عمل ہو سکتا ہے تو اسے ہم مستثنیات میں ہی شمار کر سکیں گے۔

مغربی تعلیم اور سائنسی اثرات سماجی حالات کے تحت جب سے خواتین نے تعلیم حاصل کر کے ملازمت کرنا شروع کر دیا ہے، اس وقت سے معاشرتی حالات میں غیر معمولی تغیر رونما ہونے لگا ہے۔ عورت پہلے کی طرح مرد کی دست نگر نہیں رہ گئی، اس لئے کہ بیشتر عورتیں جو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ وہ سو پچاس سال پہلے کی عورتوں کی طرح شوہر کی مطیع و فرمانبردار نہیں رہ سکتیں، پہلے وہ جانتی تھیں کہ اگر مرد کی نظر پھر گئی تو ان کی گذر بسر کیسے ہو سکے گی، لیکن اب تو یہ عالم ہے کہ اکثر گھرانوں میں مرد بھی عورتوں کی کمائی پر زندگی گذارتے ہیں۔ میں بہرحال عورت کی تعلیم کو تو پسند کرتا ہوں بشرطیکہ وہ نسوانی فضا میں حاصل کی جائے، لیکن خواہ مخواہ ان کا ملازمت کرنا پسند نہیں کرتا۔ مجبوری ہو تو بیشک سروس کرنا چاہئے، لیکن صرف شعبۂ تعلیم میں، اس لئے کہ وہ دوسرے آفس وغیرہ کی ملازمتوں سے نسبتاً بہتر ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ عورتوں میں ملازمت کا عام رجحان ہمارے معاشرتی حالات پر برا پڑے گا، گھریلو زندگی اور بچوں کی پرورش و تربیت اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ عورت کی دنیا اس کا گھر اور اس کے بچے ہوتے ہیں اور یہ محدود سی دنیا باہر کی عظیم دنیا سے کسی طرح کم نہیں۔ گھریلو فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے عورت کو کافی وقت صرف کرنا پڑتا ہے۔

مردوں کے لئے بھی میرا مشورہ ہے کہ زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے انھیں اپنے طرز عمل میں زبردست تبدیلی لانا ضروری ہے۔ موجودہ حالات میں عورت پہلے جیسے ظلم و ستم اب برداشت نہیں کر سکتی۔ وہ ملازمت نہ کرے تب بھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنا چاہے گی۔ وہ شریک زندگی بن کر رہ سکتی ہے، کنیز اور داسی بن کر گذر کرنا اب اس کے لئے ممکن نہ ہوگا۔

رضاعت کا ایک اہم فائدہ

میڈیکل ریسرچ کونسل انگلستان کے سربراہ پروفیسر آر ڈی می شارٹ نے "آبادی کے دھماکے" پر اپنی تحقیقات میں بتایا ہے کہ برطانیہ میں جتنے بھی مانع حمل ذرائع اختیار کر کے پیدائش اولاد کو روکا جاتا ہے، ان سب کو یکجا کر کے جو اعداد و شمار مہیا ہوئے ہیں ان کے مقابلہ میں چھاتی سے دودھ پلانے کے ذریعہ حمل روکنے کے اعداد و شمار کہیں زیادہ ہیں۔ ان کی مطابق اگر ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے تو کم از کم اٹھارہ ماہ تک اس کا حیض بند رہتا ہے اور اس کے تولیدی نظام پر ایسا اثر پڑتا رہتا ہے کہ اس کا حاملہ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت جو مانع حمل طریقے رائج ہیں ان میں سے کوئی بھی عورت کے نظام حیض پر ذرا بھی اثر انداز نہیں ہوتا اس لئے یہ سارے طریقے غیر قدرتی ہیں۔

پروفیسر مذکور نے یہ بھی کہا ہے کہ انسان نے ترقی و تہذیب کی دوڑ میں قدرتی ذرائع کو ترک کر دیا ہے حالانکہ وہ توازن قائم رکھتے تھے .... دانائی اس میں ہے کہ ہم قدرت کو گلے لگائے رکھیں صرف اس طرح ہم نہ صرف شرح پیدائش پر قابو رکھیں گے بلکہ چھاتی اور رحم وغیرہ کے کینسر سے بھی عورتوں کو محفوظ رکھیں گے۔

رضاعت مادری جس کو شریعت اسلامی نے اتنی اہمیت دی ہے اور جس کے احکام اور مدت کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے اس کی گونا گوں مادی مصلحتوں کا بھی اعتراف بالآخر میڈیکل سائنس کو اپنی تحقیقات سے ایک بار اور ہو کر رہا۔ (بشکریہ صدق جدید لکھنؤ)

جہیز کی رسم کے خلاف مظاہرہ

مختلف سیاسی پارٹیوں کی گیارہ ہندو خواتین ممبران پارلیمنٹ جہیز کے سلسلے میں ہونے والی اموات کی تعداد میں سنگین اضافہ کی جانب حکومت کی توجہ مبذول کرانے کے لئے ۱۹ اگست کو پارلیمنٹ کے سامنے ایک مظاہرہ کی قیادت کریں گی۔ یہاں آج ایک بیان میں انھوں نے کہا ہے کہ عورتوں کے خلاف غیر انسانی جرائم کی روک تھام کرنے میں موجودہ قوانین ناکام ہوگئے ہیں۔ پولیس اور مقامی انتظامیہ کی ساز باز نے جہیز لینے والوں کی ہمتیں بڑھادی ہیں۔ اس برائی کو روکنے کے لئے فوری کارروائی کی ضرورت ہے۔ اس مسئلہ کی چھان بین کرنے کے لئے پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی کا قائم کرنا کافی نہیں ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ صحیح طرز فکر رکھنے والے لوگوں کے ضمیر کو بیدار کیا جائے۔

ایسے مظاہرے روزانہ اور ہر جگہ کئے جانے کی ضرورت ہے اس لئے حکومت قانون بنا دیتی ہے، ان پر عمل کرانا نہیں جانتی۔ ایک یہی مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ جس پر قانون کے مطابق عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے۔ اردو ہی کو لے لیجئے، نہ جانے اردو کے لئے حکومت کی جانب سے کیسے اعلان ہوتے چلے آتے ہیں لیکن عمل درآمد ایک فی صدی بھی نہیں ہو پاتا۔

گذشتہ چند سال ہندو خواتین کے نہ جانے کتنے ایسے واقعات ہو چکے ہیں، جن میں بے گناہ عورتوں کو بے رحمی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتارا جاتا رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ان میں جاہل اور دیہاتی عورتیں نہیں ہوتیں۔ تعلیم یافتہ ہوتی ہیں، لیکن بدرسمی کے تحت انھیں اپنی جانیں دینا پڑتی ہیں۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ایسے واقعات جرم میں ساسیں وہ بھی ملوث ہوتی ہیں، مرد تو ہمیشہ سے ہی عورتوں میں تشدد کرنے کے سلسلے میں بدنام رہے ہیں۔ اگر وہ ایسے جرائم میں شامل نہ ہوں تو شاید کیا یقینی یہ سلسلہ ختم ہو سکتا ہے، در اصل مردوں سے زیادہ عورتوں کو جہیز کی فکر رہتی ہے ساسیں اور نندیں خصوصیت سے نئی دلہنوں پر جہیز کم لانے کی وجہ سے لعن طعن کرتی ہیں، جس سے اکثر خود دار عورتیں کسی نہ کسی طرح خودکشی کر لیتی ہیں یا پھر انھیں مار ڈالا جاتا ہے کتنی مظلوم ہے عورت کی جنس بھی کہ اسے مردوں ہی نہیں خود اپنی جنس کے ظلم وستم بھی سہنا پڑتے ہیں۔

آہ خدیجہ مستور

ہندو پاک مشہور افسانہ و ناول نگار خدیجہ مستور صاحبہ کا حال ہی میں لندن میں انتقال ہوگیا۔ خدیجہ مستور لکھنؤ کے محلہ جھوائی ٹولہ میں تقریباً ۵۵ سال قبل پیدا ہوئی تھیں خدیجہ مستور مرحومہ نے ۱۹۴۲ء کے قریب لکھنا شروع کیا تھا اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی۔ خدیجہ مستور بھی انھیں میں شامل ہوگئیں۔ ان کے افسانوں کے کبھی کئی مجموعے شائع ہوئے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلی گئی تھیں۔ ان کے علمی ادبی کارناموں میں سب سے زیادہ مقبولیت ان کے ناول آنگن کو حاصل ہوئی تھی۔

ایک اخلاقی فرض

ہر ماہ دس پندرہ حریمی بہنیں وی۔ پی واپس کر جایا کرتی ہیں۔ ہر وی۔ پی کی واپسی پر ہمیں چار روپیہ پچاس پیسے کا نقصان ہوتا ہے۔ اگر پندرہ پیسے خرچ کرکے خریداری ختم کرنے والی بہنیں ہمیں قبل از وقت اطلاع کر دیا کریں تو ہم چار روپیہ پچاس پیسے کے نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ ہمیں اس نقصان سے بچانے کے لئے ۱۵ پیسے بھی صرف نہیں کر سکتیں تو بلا ٹکٹ یعنی بیرنگ خط کے ذریعہ ہی ہمیں آگاہ کر دیں۔ نسیم انہونوی

فرعون اور اسکے لشکر کی غرقابی

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس دور کی سب سے بڑی طاقت کے مظہر فرعون کے واقعات کا تذکرہ کثرت اور تفصیل سے ملتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کی زندگی اُن کے کارناموں اور جدوجہد کا بیان بڑے دل نشیں انداز میں کیا گیا مختلف سورتوں میں مختلف انداز اور زاویے سے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سے فرعون کے عہد استبداد ظلم وجور طاقت کے استعمال اور مظلوم قوم بنی اسرائیل کے حالات اور ان کے کردار اور عمل واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں بڑی بصیرتیں اور سبق پوشیدہ ہیں۔

مصر میں بنی اسرائیل اقلیت میں تھے اور غلاموں کی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا کام مصریوں کی خدمت کرنا تھا اس کے بدلے ذلت و رسوائی اور بھوک و افلاس کے سوا ان کے حصے میں کچھ نہ تھا۔ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی رہنمائی اور ان کی نجات کے لئے تشریف لائے تو ایک طرف فرعون کی طاقت نے حضرت موسیٰ کی تحریک اور دعوت توحید کو دبانے کے لیے طرح طرح کے مظالم اور ہتھکنڈوں کا سہارا لیا۔ دوسری طرف خود قوم بنی اسرائیل صدیوں کی غلامی سے اس قدر کاہل اور قوت عمل سے محروم ہو چکی تھی کہ حضرت موسیٰ کی زیر قیادت متحد ہو کر جدوجہد اور قربانیاں پیش کرنے کے بجائے ان کی راہ میں مشکلات پیدا کرتی رہی لیکن حضرت موسیٰ اللہ کے برگزیدہ نبی تھے۔ انھوں نے دعوت و تبلیغ کا کام ہر حال میں جاری رکھا۔ اور فرعون اور اس کی قوم کو انسان پرستی اور انسانی اقتدار کے آگے سجدہ ریز ہونے کے بجائے خدائے واحد کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے رہے۔

حضرت موسیٰ کو معجزات بھی عطا ہوئے تاکہ ان معجزات کو دیکھ کر ہی لوگ ایمان لائیں اور خدائے واحد کی عبادت شروع کر دیں اور ہر طرح کے ظلم و ستم کا خاتمہ کر کے احترام آدمیت کے عہد کا آغاز کریں لیکن ان معجزات کا بھی ان پر اثر نہیں ہوا۔ فرعون نے لالچ اور دھمکیوں سے کام لے کر لوگوں کو حق کی راہ اختیار کرنے سے باز رکھا۔ گمراہ قوم پر مختلف صورتوں میں عذاب بھی نازل ہوتا رہا اس کے باوجود وہ حق کو اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے جب عذاب آتا تو معافیاں مانگتے اور حضرت موسیٰ سے عذاب کو ٹالنے کے لئے دعا کرنے کے لئے کہتے۔ جب عذاب ٹل جاتا تو وہی سرکشی شروع ہو جاتی۔ کیونکہ فرعون کی طاقت کا طلسم انھیں گمراہی سے نکلنے نہیں دیتا۔

حضرت موسیٰ کو جو معجزات دئے گئے اور جو عذاب کی صورتیں ہوئیں۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق ان میں عصا یعنی وہ چھڑی جو جادوگروں کے سامنے سانپ بن جایا کرتی تھی۔ ید بیضا، من وسلویٰ، بادلوں کا سایہ، پتھروں سے چشمے کا بہنا، پہاڑ کا اکھڑ کر سروں پر آجانا۔ عذاب کی صورتوں میں قحط، طوفان، پھلوں اور فصلوں کا ضائع ہو جانا۔ جوں اور مینڈک کی کثرت۔ (کہتے ہیں کہ ایک وقت ایسا آیا کہ جوں اور مینڈک ہر چیز پر چھا گئے۔ کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس اور برتن وغیرہ کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر وہ چھائے نہ ہوں۔ کھانا پینا حرام ہو گیا تھا اور ان کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔) خون کا عذاب جس کی صورت یہ تھی کہ بحر قلزم اور کنوؤں کا پانی اچانک خون آلود ہو گیا جس کو استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور ٹڈی دل کی مصیبت شامل تھی۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود فرعون اور اس کی مصری قوم اپنی سرکشی اور خدائے واحد سے بغاوت سے باز نہیں آئے اور بنی اسرائیل کے لئے عذاب بنے رہے۔ حضرت موسیٰ کو جو تعلیمات اور احکام عطا ہوئے تھے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کے مطابق یہ تھے۔ شرک نہ کرنا، زنا نہ کرنا، ناحق کسی کو قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جادو نہ کرنا، حکام رسی کے ذریعہ جرم سے پاک انسان کو قتل نہ کرنا، سود نہ لینا، پاک دامن پر تہمت نہ لگانا، میدان جنگ سے نہ بھاگنا۔ یہ تعلیمات اور احکام فرعون اور اس کے اقتدار کی مصلحت کے خلاف تھے اس لئے

وہ نہ تو خود ان تعلیمات پر عمل کرتا اور نہ کسی کو عمل کرنے دیتا بلکہ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف کارروائیوں میں مصروف رہتا لوگوں کو بھی سکھاتا کہ طاقت واقتدار کا سرچشمہ اس کے سوا اور کوئی ذات نہیں ہے۔ لوگوں کو اس کی اطاعت کرنا چاہئے۔ باقی موسیٰ جو معجزات دکھاتے ہیں۔ وہ سب شعبدہ بازی اور جادوگری ہے۔

اس سلسلے میں فرعون اور قوم فرعون کا جو رویہ تھا قرآن نے اسے یوں بیان کیا ہے۔ ترجمہ!۔

"اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور پھلوں کے نقصان میں تاکہ وہ نصیحت مانیں پھر جب پہونچی ان کو بھلائی کہنے لگے۔ یہ تو ہمارے لئے ہے ہی اور اگر برائی پہونچی تو اسے موسیٰ کی نحوست بتلاتے اور ان کے ساتھ والوں کی، سن لو، ان کی شومی تو اللہ کے پاس ہے۔ پر اکثر لوگ نہیں جانتے اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا، ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اس کی وجہ سے جادو کرے سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان۔ ٹڈی مینڈک اور خون، بہت سی نشانیاں جدا جدا دیں۔ (سورۃ الاعراف)

جب پانی سر سے اونچا ہو گیا کوئی عذاب اور معجزہ فرعون اور اس کی قوم کو راہ راست پر نہ لاسکا اور فرعون کا ظلم و ستم بڑھنے لگا تو ایک طرف اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ہدایت دی کہ اپنی قوم کو اس سرزمین سے نکال کر لے جاؤ دوسری طرف فرعون پر آخری عذاب نازل کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کو خفیہ ہدایتوں کے ذریعہ ہجرت پر آمادہ کر لیا اور ایک رات پوری قوم کو ساتھ لے کر مصر سے نکل گئے۔ اس قدر خاموشی اور عجلت سے نکلے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں نے دولت مند مصری عورتوں سے عاریتاً جو قیمتی زیورات لئے تھے وہ بھی واپس نہ کر سکیں۔ حضرت موسیٰ قوم کو لے کر بحر احمر کے راستے پر راتوں رات روانہ ہو گئے۔ لیکن سلطنت کے مخبروں نے فرعون کو بنی اسرائیل کے فرار کی اطلاع پہونچادی۔

فرعون نے فوراً ان کے تعاقب کا حکم دیا اور اپنی قیادت میں ایک لشکر جرار لے کر تعاقب میں روانہ ہوا، اور وہ تعاقب کرتا ہوا سمندر کے کنارے بنی اسرائیل کے سر پر پہونچ گیا۔ بنی اسرائیل نے فرعون کے لشکر کو دیکھا تو گھبرا اٹھے اور حضرت موسیٰ کو برا بھلا کہنے لگے کہ گھر بار سے اجاڑ کر خواہ مخواہ مصیبت میں پھنسا دیا، بروایت توریت وہ کہنے لگے کہ کیا مصر میں قبریں نہ تھیں کہ تو ہمیں مرنے کے لئے یہاں لے آیا ہے۔ تو نے ہمارے ساتھ یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا۔ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ نہ کہتے تھے کہ ہم کو وہیں رہنے دیں کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر تھا"۔

حضرت موسیٰ نے گھبرائے ہوئے بنی اسرائیل کو تسلی دی اور کہا کہ یہ سب اللہ کے حکم سے ہوا ہے اور اللہ تمھاری نجات کی بہتر صورت نکال دے گا۔ حضرت موسیٰ نے دعا کی اور اللہ کی طرف سے ان کو بذریعہ وحی ہدایت ملی کہ اپنا عصا دریا پر مارو اس سے راستہ بن جائے گا چنانچہ حضرت موسیٰ نے دریا پر عصا مارا۔ اچانک دریا بیچ میں سے پھٹ گیا اور خشک چوڑی شاہراہ بن گئی جس پر موسیٰ اپنی قوم کو ساتھ لے کر دوسرے کنارے پہونچ گئے۔

فرعون نے جو یہ صورت دیکھی تو اپنے لشکر کو حکم دیا بنی اسرائیل کے تعاقب میں اسی خشک راستے پر چل پڑو لیکن جیسے ہی بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارے پر پہونچ گیا اور فرعون کا لشکر ابھی راستے میں تھا کہ اچانک دریا کے دونوں حصے پھر مل گئے اور فرعون اور اس کا لشکر دریا میں غرق ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اس عذاب کے بعد فرعون کی لاش کو دیدۂ بینا کے لئے ایک عبرت بنا دیا کہ اس کی لاش کو دریا نے بھی قبول نہ کیا۔ وہ ساحل سے آلگی معتبر تحقیقات کے مطابق مصر کے عجائب خانے میں جس فرعون کی حنوط شدہ لاش [illegible] فرعون [illegible] ہے۔

قرآن مجید کی کئی سورتوں میں اس واقعہ کا ذکر ہے سورہ طٰہٰ میں یوں مختصر مگر جامع ذکر ہے۔ ترجمہ،

"اور پھر دیکھو ہم نے موسیٰ پر وحی بھیجی تھی کہ اب میرے بندوں کو راتوں رات (مصر سے) نکال لے جا پھر سمندر میں ان کے گزرنے کے لئے خشکی کی راہ نکال

نے تجھ سے تو تعاقب کرنے والوں سے اندیشہ ہوگا کہ کہیں وہ طرح کا خطرہ ہو پھر جب موسیٰ اپنی قوم کو لے کر نکل گیا (تو) فرعون نے اپنے لشکر کے ساتھ اس کا پیچھا کیا تو پانی کا ریلا جیسا کچھ ان پر چھا جانے والا تھا چھا گیا اور فرعون نے اپنی قوم پر راہ (نجات) گم کر دی۔ انھیں سیدھی راہ نہیں دکھائی۔"

سورۂ یونس میں کچھ اور وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ ترجمہ:

"پھر ایسا ہوا کہ ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر کے پار اتار دیا۔ یہ دیکھ کر فرعون اور اس کے لشکر نے پیچھا کیا، مقصد یہ تھا کہ ظلم و شرارت کریں۔ لیکن جب حالت یہاں تک پہونچ گئی کہ فرعون سمندر میں غرق ہونے لگا تو اس وقت پکار اٹھا۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں جس پر بنی اسرائیل ایمان رکھتے ہیں اور میں بھی اس کے فرماں برداروں میں ہوں، حالانکہ پہلے برابر نافرمانی کرتا رہا ہے۔ اور دنیا کے مفسد انسانوں میں سے (ایک بڑا ہی) مفسد تھا پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچا لیں گے تاکہ ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں (قدرت حق کی) ایک نشانی ہو اور اکثر انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں کی طرف سے یک قلم غافل رہتے ہیں۔"

فرعون کی غرقابی بڑا عبرتناک واقعہ ہے۔ اس نے اہل ایمان پر مظالم ڈھائے۔ ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا یہاں تک کہ اپنی طاقت و اقتدار کے نشے میں انھیں گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا لیکن اللہ نے اس کی طاقت کا سارا طلسم نہ صرف توڑ دیا بلکہ اس کی لاش تک کو سامانِ عبرت بنا دیا۔

شوہر اور چار دیواری

الاوی فگار

چار دیواری سے باہر جاری ہیں بیگمات
مرد کو اب چاہئے گھر میں رہے دن اور رات
دستِ قدرت کر سکے اب بھی جو کچھ رد و بدل
اب بھی بن سکتے ہیں ہم مضمون کے بدلے غزل
عورتوں کو گھر سے باہر کام کرنا چاہئے
گھر میں اب حضرات کو آرام کرنا چاہئے
شوق سے دفتر کو جائیں پندرہ بچوں کی ماں
ہم کچن میں جا کے ٹھونکیں گے توے پر روٹیاں
ہم وہ باورچی جو ہوں گے امتحاں میں کامیاب
کچھ بھی پکوا لو پراٹھا، کوفتہ، قیمہ، کباب
بیگمات اب گھر میں رہنے سے اگر بیزار ہیں
ہم کو گھر میں بند کر دو اس پہ بھی تیار ہیں
دوسرا چہرہ بھی چہرہ پر لگا سکتے ہیں ہم
رہ گئیں مونچھیں تو ان کو بھی منڈا سکتے ہیں ہم
بال کٹوانے پہ بیگم کو اگر اصرار ہے
سر گھٹانے سے یہاں کس مسخرے کو پیار ہے
شکل و صورت کیا ہوا اب بھی اگر مردانہ ہے
برقع اوڑھیں گے تو سب سمجھیں گے یہ "ریحانہ" ہے
ہجر میں بیگم کے ہم کیوں اپنے گھر میں روئیں گے
ہم سئیں گے اپنے کپڑے، ہم خود ان کو دھوئیں گے
شوق سے بیگم کریں تفریح بندر روڈ پر
ہم تو "پاکیزہ" پڑھیں گے اپنے گھر میں لیٹ کر
کام اگر سونپا گیا قسمت سے عورت کا ہمیں
یا ہمیں ہوگا خطر تا مردوں کی عصمت کا ہمیں
کاش کوئی ڈاکٹر تبدیل کر دیتا ہمیں
گھر کے تہہ خانے کے اندر سیل کر دیتا ہمیں
ساز آزادی کی کوئی لے تو ہونا چاہئے
ٹی وی اور بیوی کا جھگڑا طے تو ہونا چاہئے

بصرے کی حور

الحاج برق آشیانوی

بصرے کی حسین ترین دوشیزہ کو خرید کر بوڑھی قحبہ پھولی نہ سمائی تھی۔ اس کے قحبہ خانہ میں نہ صرف بصرے کی خوبصورت لڑکیاں تھیں بلکہ مصر، روم اور یونان کی حسین دوشیزائیں بھی موجود تھیں جن کے ذریعہ وہ اپنا سیاہ ترین کاروبار چلاتی رہی تھی۔ وہ اکثر اپنے گاہکوں سے کہا کرتی تھی کہ اس نے آسمان سے تارے توڑ کر اپنے قحبہ خانے میں جمع کر لئے ہیں۔ لیکن آج اس نئی دوشیزہ کو خرید کر تو ایسا محسوس کیا کہ اس نے آسمان سے چاند کو بھی توڑ لیا ہے اور اس چاند سے اپنے قحبہ خانے کو اس قدر روشن کر لے گی کہ اس کی روشنی سے سونے کی بے شمار کرنیں پھوٹ کر اس کے قدموں میں آگریں گی وہ نہ صرف سونے بلکہ ہیرے جواہرات کے بھی خواب دیکھنے لگی۔ اس نئی دوشیزہ کو دیکھ کر وہ مبہوت رہ گئی تھی۔ حسن صورت کے علاوہ دوشیزہ کے چہرے سے جو متانت و سنجیدگی اور وقار کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ آج تک کسی دوشیزہ کے چہرے میں نظر نہ آئی تھیں۔ دوشیزہ کو خرید لینے کے بعد قحبہ نے کہا — لڑکی میرے ساتھ چلو —

لڑکی چپ چاپ اس بوڑھی قحبہ کے ساتھ ہو گئی۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ اس کو کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل اکثر لڑکیاں سوال کیا کرتی تھیں۔

اب وہ قحبہ خانے کی خوبصورت عمارت میں داخل ہو رہی تھیں۔ لڑکی عمارت کے برآمدے میں پہنچ کر ایک لمحہ کے لئے رک گئی اور پلٹ کر آسمان کی طرف ایک عجیب سی نظر سے دیکھا اور پھر عمارت کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔ بوڑھی قحبہ نے کہا "لڑکی اندر چلو —" لڑکی نے بڑھیا کے چہرے پر ایک ایسی نظر ڈالی جس کی تاب لانے کی بڑھیا میں طاقت نہ تھی۔ وہ ایک جھکا کر دوسری طرف دیکھنے لگی لڑکی نے قدم اٹھائے اور بڑھیا نے جس سمت اشارہ کیا تھا اس طرف آہستہ آہستہ بڑھی۔ بڑھیا لڑکی کو لے کر ایک نہایت ہی سجے سجائے کمرے میں داخل ہوئی اور لڑکی سے کہا — "یہ تمہارا کمرہ ہے" لڑکی نے استعجاب کے انداز میں کہا "اچھا!" پھر بڑھیا مخاطب ہوئی۔ لڑکی کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ کونسا مقام ہے؟ اور تمہیں یہاں کیا کرنا ہوگا۔؟" لڑکی نے جواب دیا "میں کیا جانوں۔ تم ہی بتا دو" اس کے بعد بڑھیا نے لڑکی کے سر پر نہایت شفقت کے ساتھ ہاتھ پھیر کر وہ تمام باتیں بتا دیں جو اس قحبہ خانے سے متعلق تھیں۔ اور وہ تمام کام سمجھا دیئے جو لڑکی کو کرنے ہوں گے۔ اور آخر میں پوچھا۔ کرو گی نا یہ تمام کام خوش اسلوبی کے ساتھ —؟" لڑکی نے جواب دیا۔ مقدر میں جو لکھا ہے وہ کرنا ہی ہوگا" لڑکی کے ہاتھ میں ایک میلی سی تھیلی تھی جس میں غالباً پہننے کے کپڑوں کا ایک آدھ جوڑا ہوگا۔ بڑھیا نے کہا "لاؤ یہ میلی سی تھیلی اب کسی کام کی نہیں۔ یہاں تو تمہیں زرق برق لباس پہنایا جائے گا۔ اس تھیلی کو کوڑے پر پھینک دیں" لڑکی نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ تو میں اپنے ساتھ رکھوں گی۔ یہی تو میری کائنات ہے"

ایک ہفتہ اس بات کی تشہیر میں گذر گیا کہ قحبہ خانے میں بصرے کی ایک حسین ترین دوشیزہ آگئی ہے۔ جس کے حسن کے مقابلے میں دیگر تمام لڑکیاں ہیچ ہیں۔ قحبہ خانے کی اکثر لڑکیاں اس نئی دوشیزہ کے کمرہ میں چوری سے داخل ہو کر ایک جھلک دیکھ لیا کرتی تھیں کیونکہ بوڑھی قحبہ نے اس نئی لڑکی کو سب کی نظروں سے چھپا کر رکھا تھا۔ ایک جھلک دیکھ کر دوسری لڑکیاں ایسا محسوس کرتیں کہ وہ ایک سورج ہے جس کے سامنے وہ سب ذرات ہیں۔ رشک و حسد کا جذبہ بھی کروٹ لیتا لیکن وہ سب مجبور تھیں۔ کیونکہ وہ اس لڑکی کا کچھ نہ بگاڑ سکتی تھیں۔

آخر وہ دن آگیا جب بوڑھی قحبہ نے نئی دوشیزہ کے جسم کی ایک بھاری قیمت لگا دی تو بصرے کی متمول ترین آوارہ مزاج نوجوان نے ادا کر کے سودا کر لیا۔ اب یہ نئی دوشیزہ ایک نئے کمرے میں جو سب سے زیادہ شاندار پیمانے پر سجایا گیا تھا زرق برق لباس پہنے موجود تھی نوجوان کمرے میں داخل ہوا اور جب لڑکی کے چہرے پر نظر پڑی تو حیران رہ گیا۔ اتنی حسین دوشیزہ اس نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ لیکن یہ کیا اس لڑکی کے چہرے پر حسن صورت کے علاوہ ملکوتی تقدس جھلک رہا تھا۔ نوجوان نے ایسا محسوس کیا کہ شیطانی جذبہ پر سرد شبنم برسنے لگی ہے۔ وہ مبہوت بلکہ مسحور کھڑا رہ گیا۔ لڑکی قریب آئی۔ اور نوجوان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو نوجوان کے اعصاب شل ہو کر رہ گئے۔

ہاتھ پاؤں میں حرکت باقی نہ رہی۔ لڑکی نے نہایت ہی نرم لہجے میں کہا۔ "اے نوجوان میں جانتی ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو — یہ عمارت گناہوں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں جو لڑکیاں موجود ہیں وہ سب گنہگار ہیں اور جو نوجوان آتے ہیں سب گناہ اور صرف گناہ کرنے کے لئے آتے ہیں ——— میں بھی یہاں گناہ کرنے بیٹھی ہوں۔ تم بھی یہاں گناہ کرنے آئے ہو۔ اس کے لئے تم بھی تیار ہو کر آئے ہو اور میں بھی تیار ہوں ۔ ۔ ۔ لیکن تم میری ایک بات مانو تو کہوں —" اتنا کہہ کر لڑکی جواب کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر تک تو نوجوان جو سحر زدہ کھڑا تھا۔ جواب نہ دے سکا۔ آخر جب اس کی زبان میں کچھ بولنے کی طاقت آئی تو جواب دیا۔ "تم جو کچھ کہو۔ میں مان لوں گا۔" لڑکی خوش ہوگئی۔ اپنی سجی سجائی مسہری کی طرف لوٹی۔ بستر کے نیچے سے ایک میلی سی تھیلی نکالی جو وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی اس تھیلی میں سے ایک بوسیدہ سا مصلیٰ نکالا۔ اور نوجوان کے پاس آکر بولی۔ "اے نوجوان۔ گناہ تو ہم کو بہر حال کرنا ہے۔ تم نے اس کی قیمت بھی ادا کر دی ہے۔ اور مجھے اس کا معاوضہ ادا کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہم ذرا اللہ کو یاد کرلیں اور دو رکعت نماز ادا کرلیں تو بہتر ہوگا۔ اس کے بعد گناہ کے لئے تو ساری رات پڑی ہے۔" نوجوان میں اس تجویز سے اختلاف کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اس نے اسی طرح قبول کر لیا جیسے فوج کا کمانڈر کسی ادنیٰ سپاہی کو حکم دے تو سپاہی تعمیل کرتا ہے۔ لڑکی نے کہا۔ "ادھر حمام میں پانی ہے وضو کرلو۔" کمانڈر کے اس حکم کو سپاہی پوری اطاعت و تابعداری کے ساتھ قبول کرتے ہوئے حمام میں داخل ہوا۔ اور جب وضو کرکے لوٹا تو ایسا محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنی گذشتہ زندگی کے تمام گناہوں کو دھو دیا ہے۔ اور اپنے جسم کو دھلے ہوئے کپڑے کی طرح صاف و شفاف محسوس کیا۔ اتنی دیر میں لڑکی نے کمرے کے ایک گوشے میں مصلیٰ بچھا دیا۔ جیسے ہی نوجوان باہر آیا۔ لڑکی نے مصلے کی طرف اشارہ کیا۔ نوجوان اب لڑکی کے اشاروں کو احکام سمجھ کر تعمیل کر رہا تھا۔ مصلے کی طرف بڑھا۔ نماز کی نیت کی اور خاموش نماز میں منہمک ہوگیا۔ ادھر لڑکی ایک اور مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئی۔ اور دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر کہا — "اے اللہ۔ میں نے تیرے فضل و کرم سے تیرے ایک بندے کو تیرے حضور میں پہنچا دیا ہے۔ اب یہ تیرے ہاتھ میں ہے کہ اس کے دل کو پھیر دے کیونکہ تو ہی دلوں کا پھیرنے والا ہے اس کو گناہوں سے باز رکھ اور ایک ایسا انسان بنا دے جس کو سجدہ کرنے کے لئے تو نے فرشتوں کو حکم دیا تھا۔" جب نوجوان نے بھی نماز ختم کرکے سلام پھیرا۔ تو اس کے چہرے پر کچھ ایسا نور برس رہا تھا کہ ملائک بھی رشک کریں۔ لڑکی اٹھی اور نوجوان کے قریب آئی۔ اور کہا — "اے نوجوان۔ اٹھو۔ اللہ کو تو ہم نے یاد کر لیا۔ اب گناہ کرلیں —" نوجوان جو سحر زدہ کھڑا تھا اچانک لڑکی کے قدموں پر گر گیا اور آنسوؤں سے پاؤں کو تر کرتے ہوئے بولا۔ "بی۔ بی۔ آپ کوئی خاکی پیکر نہیں بلکہ آسمانی مخلوق ہیں۔ آپ نے میرے وجود میں سے ساری گندگی کو نکال کر ایسی پاکیزگی بھر دی ہے کہ اب گناہ کرنا تو کجا اس کے بارے میں سوچنے کا بھی سوال نہیں ہے۔ اب میری آیندہ زندگی خدا اور اس کے رسول کے احکام کی تعمیل میں گذرے گی —" لڑکی پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ لڑکی نے اس نوجوان کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور بولی — "اے نوجوان۔ اب تم جا سکتے ہو۔ لیکن میری ایک بات اور مان لو کہ اس واقعہ کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔" نوجوان اٹھا۔ آنسو صاف کئے اور خوشی سے سر جھکا یا اور کہا — "بی بی۔ آپ کے حکم سے انکار کرنے کی کس میں طاقت ہوگی جو مجھ میں ہو۔" یہ کہہ کر نوجوان پلٹا۔ اور جانے لگا تو لڑکی نے کہا۔ "نوجوان۔ خدا تمہیں ولایت کا منصب عطا کرے۔ آمین —"

نوجوان جب باہر نکلا تو بوڑھی قحبہ کو امید تھی کہ وہ اس سے مخاطب ہو کر کہے گا۔ "واقعی تم نے آسمان سے چاند توڑ کر اس مکان میں بسایا ہے۔" لیکن وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی کہ نوجوان کمرے سے نکل کر تیزی کے ساتھ چلا گیا اور ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ بصرہ کا ہر آوارہ نوجوان واقف ہوگیا تھا کہ قحبہ خانے میں بصرے کی ایک حسین ترین لڑکی آئی ہے۔ جوق در جوق نوجوان آنے لگے۔ بصرے کی نئی حور کے منھ مانگے دام ادا کر کے اس کا معاوضہ حاصل کرنے کے لئے کمرے میں جاتے اور جب باہر نکلتے، تو ان کے لبوں پر مہر لگی ہوئی ہوتی اور چپ چاپ چلے جاتے۔ کچھ عرصہ گذرنے کے بعد قحبہ خانے کی مالکہ یہ دیکھ کر پریشان ہوگئی کہ جو نوجوان بصرے کی حور کے پاس جا کر نکلتا ہے وہ پھر قحبہ خانے کا رُخ نہیں کرتا۔ بڑھیا نے سوچا کہ اگر یہی حال رہا تو اس کا کاروبار ٹھپ

کرنے کے بجائے جس کی اس کو بہت توقع تھی چند ہی دلوں میں ٹھپ ہوکر رہ جائے گا اور سونا و ہیرے جواہرات سمیٹنے کے بجائے اس کے ہاتھوں میں کاسۂ گدا گری آجائے گا۔

آخر اس نے ارادہ کیا کہ دیکھوں اس لڑکی کے کمرے میں ہوتا کیا ہے وہ ایسا کیا جادو کرتی ہے کہ اس کے پاس آکر نکلا ہوا گاہک پھر قحبہ خانہ کا رخ نہیں کرتا۔ اس نے لڑکی کے کمرے میں ایک خفیہ سوراخ کر لیا۔ جہاں سے اندر کا ہر منظر اور لڑکی کی ہر حرکت نظر آسکے۔ ایک نوجوان کو اس نے اندر بھیج کر کمرے میں جھانکا تو وہ منظر نظر آیا جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ نوجوان باہر نکلا اور خاموش چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد بڑھیا لڑکی کے کمرے میں داخل ہوئی تو لڑکی مصلّے سمیٹ رہی تھی۔ قحبہ کو دیکھ کر چونک پڑی۔ جیسے کوئی غیر متوقع واقعہ پیش آیا ہو۔ قحبہ آگے بڑھی۔ لڑکی کے قریب آئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی "بی بی معاف کرنا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس قدر نیک خیال دوشیزہ ہو۔ تمہیں میرے کاروبار کا اچھی طرح علم ہو چکا ہے۔ اگر میں تم کو یہاں رکھوں گی تو میرا کاروبار بند ہو جائے گا۔ یہ مقام تمہارے رہنے کا نہیں ہے۔ میں تمہیں آزاد کرتی ہوں اور گزارش کرتی ہوں کہ اب تم جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔ اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں" لڑکی نے کہا۔ اے بڑھیا۔ خدا کے واسطے مجھے یہاں سے مت نکال۔ یہاں رہ کر تو میں بصرے کی گلی گلی میں خدا کے حکم سے ایک ایک ولی بنا رہی ہوں۔ یہاں آکر جو جاتا ہے وہ ولایت کے درجے کو پہنچتا ہے" لیکن بڑھیا نے لڑکی کی بات نہ مانی۔ لڑکی نے یہاں سے نکل کر جس طریقے سے زندگی بسر کی اس کو دیکھ کر خواجہ حسن بصریؒ نے بھی کہا کہ۔

بی بی رابعہ بصریؒ خدا کے پاس آپ کا جو مقام ہے وہ میں حاصل نہ کر سکا۔

مجبوری

شکیل انصاری

ح — وہ شام کچھ عجیب تھی، یہ شام بھی عجیب ہے
وہ کل بھی پاس پاس تھی وہ آج بھی قریب ہے — مجروح

اس شام میں اچانک ہی تمھارے گھر چلا آیا تھا!۔

میں نے جونہی کال بیل دبائی۔ تم نے دروازہ کھولا۔ میں یہ سمجھ کر بہت ہی خوش ہوا کہ تم میرا انتظار کر رہی تھیں، مگر نہیں! تم تو نئی ساڑی میں ملبوس کہیں باہر جانے کے لئے تیار، کسی اور کی منتظر تھیں۔ میں تو بن بلایا مہمان تھا!۔

تم نے رسمی سے مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔ علیک سلیک کی۔ اور اپنے "ان" کے کسی ملاقاتی کی طرح مجھے بھی ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ میں حیرت کرتا رہا اور تب تک تم کچن میں چلی گئیں۔

تمھارے روکھے رویّے کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے ڈرائنگ روم پر اک طائرانہ نظر ڈالی، خوبصورت سجا ہوا کمرہ تمھاری سلیقہ شعاری کی داد مانگ رہا تھا اور اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ تم نے اسے ذاتی دلچسپی اور لگن سے سجایا سنوارا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر کچھ افسوس ضرور ہوا، کہ تم اپنے اس نئے سنسار میں مگن ہو اور مجھے بالکل یاد نہیں کرتیں

بک شیلف، ریڈیوگرام، صوفہ سیٹ، الماری، پردے، دیواروں پر لگی تصویروں، کارپٹ، تکیوں اور کشن کے غلاف سے ہوتی ہوئی میری نگاہ ڈرائنگ ٹیبل پر رکھی پورٹریٹ پر جم گئی۔ پورٹریٹ میں تمھاری اور تمھارے "ان" کی تصویر تھی شادی کے فوراً بعد اتاری ہوئی اس تصویر میں تم اپنے دلکش انداز میں مسکرا رہی تھیں۔ مجھے اس مسکراہٹ میں ہلکی سی بناوٹ کا شبہ بھی نہیں ہوا۔ تم میرے بغیر بھی مسکرا سکتی ہو! یہ یہ دیکھ کر میں اداس ہو گیا۔

صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر میں نے ایک سرد آہ بھری، اور سوچنے لگا کہ کیا تم نے مجھے بھلا دیا؟

کشن کے خوبصورت غلاف پر تم نے اپنا اور اپنے "اُن" کا نام بڑی فنکاری سے کاڑھ رکھا تھا۔ ناموں کی سجے میں کوئی بھی غلطی نہ پا کر مجھے عجیب سا لگا۔ میں پریشان ہو اُٹھا۔ کیا تمھیں میرا، تمھارا مشترکہ ماضی مطلق یاد نہیں۔

میں آہستہ سے اُٹھا اور بک شیلف میں تمھاری پسندیدہ کتابیں دیکھنے لگا۔ تم نے اپنے اس کتابوں کے ذخیرہ کو "بارہ دری" نام دیا تھا۔ مجھے یاد ہے، جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تب تم اپنی کتابوں پر میرا نام لکھ دیا کرتی تھیں.... اور ہمیشہ اپنے پسندیدہ شاعر ساحر لدھیانوی کا کوئی شعر لکھ دیا کرتی تھیں۔ میں نے بڑی امید سے ایک براؤن جلد والی کتاب اٹھائی اور جلدی جلدی اس کے صفحات پلٹنے لگا.... مگر کہیں کچھ نہیں تھا۔ نہ میرے نام کا کوئی حرف اور نہ ہی ساحر کا کوئی حسین شعر! کیا تم نے مجھے سچ مچ فراموش کر دیا؟ دل مانتا نہ تھا۔

تبھی تم چائے کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ میں نے افسردگی سے تمھیں دیکھا۔ تمھارے چہرے پر کسی بھی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ میں مایوس ہو اٹھا۔ تم نے بلا کسی آواز کے ٹرے گول میز پر رکھ دی۔ میں بغور تمھارا مطالعہ کر رہا تھا تم بالکل بھی نہیں گھبرائیں اور بغیر کسی جھجک کے چائے بنانے لگیں۔ جب تم نے میرے ہاتھ میں کپ تھمایا تو نہ تمھارے ہاتھ کانپے نہ ہی لب تھرتھرائے۔ میں خاموشی سے چائے کے گھونٹ اتارنے لگا۔ اف! مگر یہ کیا؟۔ چائے بہت میٹھی تھی۔ تم یہ بھی بھول گئیں کہ میں چائے بغیر شکر کے پیتا ہوں۔ دل کو دھکا سا لگا۔ اور تم میری کیفیات سے لاپرواہ گفتگو کئے جا رہی تھیں۔ مہنگائی، گھریلو مسائل، کام کاج، مصروفیات اور کتنے ہی خشک و سنساری موضوعات پر تم نے کہہ ڈالا مگر میں نے کچھ بھی نہیں سنا۔ میں تو بیٹھا سارا وقت بس تمھیں ہی دیکھا کیا۔ تم وہی تھیں... سانولی سی، گہری سیاہ آنکھوں والی، سیلیقے ہونٹ لئے۔ براؤن زلفیں جس میں کوئی بھی مہک نہیں... سب کچھ وہی تھا۔ تم کچھ بھی تو نہیں بدلی تھیں۔ مگر پھر بھی مکمل بدل چکی تھیں۔

تبھی گھڑی نے سات بجائے۔ تم چونکیں، اور مجھے بھی وقت کا احساس ہوا۔ بڑی دیر ہو گئی تھی! تمھارے "وہ" انتظار کے باوجود

ابھی تک نہیں آئے تھے۔ اور میں بلا انتظار اور بلا امید کے ہی چلا آیا تھا۔

میں واپس جانے کے لئے مڑا مگر تم نے آواز دے کر مجھے روک لیا۔ اور خود اندر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد تم لوٹیں۔ تمہارے ہاتھ میں سونف کی طشتری تھی۔ چائے کے بعد تم سونف دینا بھی بھول گئی تھیں۔ تم سونف صاف کرنے لگیں۔ ایک ریزہ اڑ کر تمہاری جھیل سی آنکھ میں ڈوب گیا۔ جھیل چھلک پڑی۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

تمہارے یہ آنسو، چاہے جس وجہ سے چھلکے ہوں مگر مجھے لگتا ہے یہ آنسو، میرے لئے، اور میری ہی وجہ سے چھلکے تھے۔ یہ آنسو، میرے لئے۔ میرے دکھی دل کے لئے سہارا بن گئے ہیں میں ان سے بہت حد تک مطمئن ہو چکا ہوں، تسلی پا چکا ہوں۔

بس مجھے اب تم سے کوئی شکوہ نہیں۔

ہاں نازیہ! تمہاری آنکھ کے یہ دو آنسو، مجھے زندگی بھر بہلانے اور رلانے کو کافی ہیں۔

بچے نعمت ہیں یا زحمت

مرسلہ۔ رضیہ اقبال

چاہے اپنی مطلب براری کے لئے استعمال ہوں۔ اپنی تمناؤں کی تکمیل کے کام آئیں، اس میں شک نہیں کہ بچے کام کی چیز ہیں۔ روزمرہ لین دین اور میل جول میں بھی پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بچوں کی سالگرہ، منگنی، شادی بیاہ وغیرہ کے ذریعے لین دین کا حساب خوب چلتا ہے۔ میل جول بڑھانے اور گھٹانے کا کام بچوں سے بخوبی لیا جا سکتا ہے۔ بچہ اگر اپنی تصویر ہے بلکہ تفسیر ہے تو یقین محکم رکھئے کہ ہر خوبی اسی میں ہے۔ دوسرے اس میں کوئی خامی بتاتے ہیں تو وہ آپ کی زندگی بھر کی پونجی سے جلتے ہیں۔ حسد کی آگ میں جلنے والوں کے دل سے پوچھو۔ دماغ کی بات اس لئے نہیں کہ ایسی صورت میں تو دماغ رہتا ہی نہیں۔ حاسد کو اپنے بدخواہ میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ اگر وہ اپنے بدخواہ کی کوئی خوبی بیان کرتا ہے تو اس میں بھی اسے نیچا دکھانے کا پہلو پوشیدہ ہوتا ہے۔ حاسد کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے بڑے بڑے طریقے ایجاد کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ حسد، حاسد کی اپنی خوبیوں کو کھا جاتا ہے۔ لیکن حاسد کہتا ہے کہ پرواہ نہیں، میں آپ کی باتوں میں نہیں آنے کا۔ بھاڑ میں جائیں میری خوبیاں۔ میں اپنے بدخواہ میں کیڑے ڈال کر ہی دم لوں گا۔

کسی ملاقاتی سے منہ چھپانا ہو، قرض خواہ کو ٹالنا ہو، ٹیلی فون پر دوست سے بات کرنے کو جی نہ چاہے۔ ان بھی امور کو نمٹانے کے لئے بچے کام آتے ہیں، اپنے بچے کے ذریعہ ہر طریقے کا جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔ بچوں سے ایسے ایسے جھوٹ بلوا سکتے ہیں کہ ان کے شاطر ذہن بھی حیران رہ جائیں۔ ایسے موقعوں پر اکثر بچے دل میں سوچتے ہیں اور کچھ تو منہ سے بھی کہہ دیتے ہیں کہ لو ہم تو اپنے ابو کو بڑا بیوقوف سمجھتے تھے، یہ بڑے استاد نکلے "آم کھانے سے غرض رکھئے۔ گٹھلیاں مت گنیئے۔ بچے آپ کے بارے میں جو سوچتے ہیں، اسے دل کو مت لگائیے۔

چند باتیں ان خوش نصیبوں کے بارے میں بھی ہو جائیں جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ نعمت سے محرومی عموماً بدنصیبی کی طرف اشارہ

کرتی ہے۔ لیکن یہ محرومی ایسی ہے کہ فرد کو خوش نصیبوں کے زمرے میں لاکھڑا کرتی ہے۔ جن کے بچے نہیں ہیں۔ ان کے مزے سوا ہیں۔ ان کا تن من دھن محفوظ ہے۔ بچوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش میں چیخ پکار کر کے ان کی صورتیں نہ بگڑیں۔ ناک اپنی جگہ برقرار رہے اور آنکھیں اپنی جگہ روشن۔ وہ اولاد کی نافرمانی کا رنج نہیں اٹھاتے، اس لئے سر کے بال دھوپ میں سفید ہوتے ہیں۔ دوسروں کے بچوں .... کی خامیوں پر نگاہ نہیں رکھتے۔ لیکن جب ادھر اُدھر سے کچھ سنتے ہیں تو اپنی بے دامنی پر خدا کا شکر بجالاتے ہیں۔ دبئی سے کما کر بھیجنے والی اولادوں کے گھروالوں میں روپے پیسے کی ریل پیل دیکھتے ہیں تو کبھی کبھی جی میں ہوک اٹھتی ہے کہ اے کاش ایک تو ہوتا جسے درآمد کر کے برآمد کا مزا چکھتے۔

درخت کے پھل کی خوبی یہ ہے کہ اسے بوتا ایک ہے، کھاتا دوسرا ہے۔ کسی حد تک اولاد کی کمائی کے پھل کی خوراک بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ لیکن والدین اپنی جانبازیوں سے جہاں تک ممکن ہو لوچ کھسوٹ کر ہی لیتے ہیں۔ مگر ان بے اولادوں سے کوئی یہ کہے کہ اولاد کی کمائی کا پھل کھانا کھیل نہیں ہے۔ پلے پلائے بچے درختوں پر نہیں لگتے۔ ان کو پالنا پوسنا پڑتا ہے۔ یہ رو ہی بات کرتی ہیں، دھن لٹانا پڑتا ہے اسکول میں داخلے کے لئے بھاگ دوڑ کرنی پڑے تو طبیعت صاف ہو جائے۔ علاج معالجے کے لئے ڈاکٹروں کے نخرے اٹھانے پڑیں اور ان کی فیس بھرنی پڑیں تو آٹے دال کا بھاؤ کسی سے پوچھنے کی نوبت نہ آئے۔ کبھی کسی بچے کو کالج میں داخل کروایا ہو تو پتہ چلے کہ کالج میں داخلہ کسے کہتے ہیں۔ بس حضرت اپنے وقتوں کا ایک ڈھول گلے میں لٹکائے پھرتے ہیں اور اسے پیٹتے رہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں ہر کام سہل تھا۔ اب بھی یہی کچھ ہوگا۔ جناب، آپ کے زمانے میں بچوں کو دبئی میں کمانے کے لائق بنانے کی صعوبت سے گزرنا نہیں پڑتا تھا۔ نہ ہی شادی کے رشتے کے ہر طلب گار کو ڈاکٹر یا انجینئر لڑکا اور جواں سال حسینہ کی تلاش ہوتی تھی۔ اپنے بچے ہوئے تو یہ سارے پاپڑ بیلنے پڑتے۔ تب جا کر پتہ چلتا کہ دبئی کی کمائی کھانا آسان نہیں ہے۔ پہلے اپنا گھر جلانا پڑتا ہے تب کہیں جاکر ہاتھ سینکتے ہیں۔

آپ ہمارے بچے کی شادی میں آئے۔ دعوت ولیمہ اڑائی۔ پلاؤ میں بوٹی کی کمی اور چاول کا دانہ گلنے کی شکایت کی اور چلتے بنے۔ یہ نہیں سوچا کہ ایسا رشتہ تلاش کرنے میں جو ہماری اولاد کی زندگی کو بنا سنوار دے، ہم پر کیا گزری۔

لیجئے والدین نے بچے کی شادی کر کے ایک گھر آباد کر دیا۔ اس سے زندگی کتنی بنتی اور سنورتی ہے۔ ایک راز ہے جسے کھوجنے والا ہی سمجھے۔ یہاں سے پھر وہی بچوں کی کہانی شروع ہوتی ہے تو کیا خوب چیز ہیں۔ اگر ہوں تو خوش قسمتی اور نہ ہوں تب بھی خوش قسمتی جانیئے۔

چوکیدار کی ضرورت

عبد المجیب سہالوی

ایک کمپنی کے منیجر کو ایک چوکیدار کی ضرورت تھی جو تندرست ہو، چالاک ہو، اور موقع پر لڑ بھڑ بھی سکتا ہو۔ اپنے ایک دوست سے انھوں نے کہا کہ اگر ایسا کوئی آدمی نظر میں ہو تو بھیج دو میں اسے فوراً رکھ لوں گا۔

ان کے دوست تھوڑی دیر تک سوچتے رہے اس کے بعد بولے آدمی تو ہے جو تندرست بھی ہے چالاک بھی ہے اور لڑنے بھڑنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور میں اسے بھیج بھی دوں گا۔ لیکن وعدہ کرو کہ رکھ لوگے، ہیچر مچر نہ کروگے، اس کے ملازم رکھ لینے سے تمہارا بھی فائدہ ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ میرا بھی۔

منیجر نے کہا تمہارا کیا فائدہ ہوگا؟ دوست نے کہا میں چین سے رات کو سو سکوں گا۔ یہ سن کر منیجر چکرایا اور اس نے کہا اس کا کیا مطلب میں سمجھا نہیں۔ اس کی ملازمت سے تمہارے سونے کا کیا تعلق؟

یہ سن کر دوست مسکرائے اور کہا تمہاری بھابھی یعنی میری بیوی میں یہ سب صفتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ تندرست بھی ہیں اور چالاک بھی اور لڑنے بھڑنے میں تو طاق ہیں۔ اگر تم انھیں چوکیداری کی جگہ پر ملازم رکھ لوگے تو میں رات کو چین کی نیند سو سکوں گا۔ یقین کرو جب سے شادی ہوئی ہے تمہاری بھابھی کی جھک جھک سے ایک رات بھی آرام سے نہ سو سکا۔

منیجر یہ بات سن کر مسکرایا اور کہا خوب صاحب! آپ اپنی بلا میرے سر پہ ڈالے دے رہے ہیں۔ بخشئے میں بے چوکیدار ہی بھلا۔ آپ کی چڑچڑی بیوی آپ ہی کو مبارک۔ آپ مناسب سمجھیں تو رات کو گھر میں مفت جاگتے رہنے کے بجائے ہمارے یہاں گیٹ پر بیٹھ کر جاگیے جس کا آپ کو معقول معاوضہ بھی ملے گا۔

اسی طرح ایک صاحبزادی کو ایک ایسے شوہر کی تلاش تھی جو پر مذاق ہو مزے دار لطیفے۔ دلچسپ کہانیاں سنا سکتا ہو۔ گانا بھی جانتا ہو اور ناچنا بھی۔ ساتھ ہی ساتھ ایسا فرمانبردار ہو کہ جیسے ہی چپ رہنے کو کہا جائے فوراً چپ ہو جائے۔

یہ صاحبزادی ایک تقریب میں گئیں، وہاں ان کی ایک پرانی سہیلی مل گئیں۔ انھوں نے سلام دعا کے بعد پوچھا بہن ترنم ماشاءاللہ سے کتنے بچے ہیں۔ ترنم نے مسکرا کر کہا کیا شادی سے پہلے بچے ہو جائیں گے۔ سہیلی نے تعجب سے کہا کیا ابھی تک یوں ہی بیٹھی ہو۔ اللہ نظر بد سے بچائے صورت شکل میں لاکھوں سے نہیں تو ہزاروں سے اچھی ہو، ایم اے پاس ہو، اعلا خاندان ہو اور کیا چاہیئے، پھر شادی میں دیر کیوں ہو رہی ہے؟

ترنم نے کہا دیر کسی اور وجہ سے نہیں ہو رہی ہے میری اپنی وجہ سے ہو رہی ہے۔ اسی کے بعد انھوں نے اپنے ہونے والے شوہر کی وہ سب خصوصیات بیان کر دیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ سہیلی نے جب یہ خصوصیات سنیں تو دل ہی دل میں مسکرائیں لیکن کوئی تبصرہ نہیں کیا اور بڑی سنجیدگی سے کہا میں ایسا شوہر تلاش کرنے کی پوری کوشش کروں گی اچھا یہ بتاؤ ذات پات رنگ ونسل کی تو کوئی قید نہیں ہے؟

ترنم نے کہا مجھے ذات پات کچھ نہیں چاہیئے مجھے تو دل پسند خصوصیات چاہئیں۔ سہیلی نے کہا تو پھر تیار رہنا میں شام کو آؤں گی اور تمہیں لے جا کر تمہاری پسند کا شوہر دکھاؤں گی۔ شام کو ان کی سہیلی آئیں اور اسی رکشے پر بٹھا کر انھیں شوہر دکھانے کے لئے چل دیں۔ تھوڑی دیر میں رکشا شہر کے سب سے بڑے بازار میں پہونچ گیا اور ایک بڑی دکان کے سامنے رک گیا۔ سہیلی نے کہا اترئیے اور اپنے دل پسند شوہر کو دیکھئے۔ دکان میں جا کر انھوں نے ایک سٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ ہیں مسٹر ٹیلی ویژن، یہ مزے دار لطیفے اور دلچسپ کہانیاں سنا سکتے ہیں۔ یہ گانا بھی جانتے ہیں اور آپ جب چاہیں انھیں چپ بھی کر سکتی ہیں!

تبصرہ

ہنستے ہنستے ۔ مزاحیہ مضامین جناب برق آشیانوی۔ صفحات ۱۲۸، سائز ۳۰×۲۰/۱۶ مجلد مع حسین گرد پوش۔ قیمت دس روپیہ۔ یہ کتاب ہندوستان کے مایہ ناز مزاح نگار، مضمون نگار اور شاعر جناب مولوی کلیم برق آشیانوی صاحب کے دس مزاحیہ اور طنزیہ مضامین کا مجموعہ ہے جسے اردو اکاڈمی آندھرا پردیش کے مالی تعاون سے خود برق صاحب نے شائع کیا ہے۔ ابتدا میں پوسٹ گریجویٹ کالج کے پروفیسر ... انہوں نے کا ایک مبسوط پیش لفظ بھی شامل ہے۔ جس میں ... کے فن اور خصوصاً ان مضامین پر روشنی پڑتی ہے جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

برق آشیانوی کی تحریریں شستہ مزاح اور دلوں میں اتر جانے والے طنز سے بھرپور ہوتے ہیں۔ زبان بڑی آسان عام فہم اور سلیس ہوتی ہے کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی موصوف کے مضامین پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

برق آشیانوی کے مضامین ہماری روزمرہ کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ وہ سیدھی سادی باتوں کو ایسے انداز میں اور ایسے الفاظ میں لکھ دیتے ہیں کہ معمولی سے معمولی بات پڑھ کر بھی قاری قہقہے لگانے اور مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دس روپیہ میں برق صاحب کے یہ دس مضامین کا مجموعہ گراں ہوتے ہوئے بھی اس اعتبار سے سستا ہے کہ انھیں ... پڑھتے وقت آپ ان غم و آلام سے وقتی چھٹکارہ حاصل کر سکتے ہیں جو موسمی تغیرات گرانی، پوسٹ آفس کی بدنظمیوں، ریل کی ... آمد و رفت، حادثات، دنگے اور قتل و غارت گری کی خبروں سے ہمہ وقت ہم پر مسلط رہتے ہیں۔ کتاب آپ برق آشیانوی صاحب سے براہ راست منگا سکتے ہیں۔ پتہ ہے۔ 375/4-5-8، مشیر آباد۔ حیدرآباد ۲۰ اور چاہیں تو نسیم بکڈپو۔ ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ سے بھی طلب فرما سکتے ہیں۔

آئینے ۔ مصنف مردم شناس۔ سائز ۳۰×۲۰ صفحات ۲۰۸۔ قیمت دس روپیہ۔ ناشر مکتبہ البدر کاکوری۔ لکھنؤ ۲۲۷۱۰۷۔

" مردم شناس " قلمی نام ہے۔ اصل نام صیغۂ راز میں ہے اور اسے ادارہ البدر ہی جانتا ہوگا۔ مردم شناس طنز و مزاح لکھتے ہیں۔ موصوف کے مضامین البدر کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

آئینے میں ۲۷ طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہیں۔ ساتھ ہی عرض ناشر، خود مصنف کا مقدمہ اور مجھ سے ملئے کے عنوان سے تعارفی مضمون بھی شامل ہے۔ مردم شناس کی تحریر میں شگفتگی ہے۔ روزمرہ میں لکھتے ہیں اور ایسا لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا مسکراکر پڑھتا رہے" مقدمہ کی چند سطریں نقل کر رہا ہوں، اس سے مردم شناسی بآسانی ہو جائے گی۔

" قارئین! میں اپنے مضامین اور آپ کے درمیان حائل ہو کر زیادہ دیر تک آپ کو انتظار کی زحمت میں ڈالے نہیں رکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ آپ نے کتاب غالباً اپنے قریب کی کسی لائبریری سے یا پھر کسی " بد ذوق " سے مطالعہ کے لئے عارضی طور پر حاصل کی ہوگی۔ (یہ بات میں آپ کی عقل پر اعتماد کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں کیونکہ عام طور پر ہر عقلمند آدمی کتابیں خرید کر پڑھنے کے سلسلہ میں بہت محتاط ہوتا ہے) اور ظاہر ہے کہ کتاب آپ نے اس کے مضامین کے مطالعہ کے لئے حاصل کی ہوگی، میری سرگذشت سننے کے لئے نہیں"

دس روپیہ میں اتنے ڈھیر سارے مضامین کی مجلد کتاب اس دور میں سستی ہی کہی جائے گی۔

افسانچہ

یہی زندگی ہے

نگار سلطانہ جلیلی۔ آمبور

زندگی سے عزیز ساجد۔!

سوگوار دل کے ساتھ بے لوث سلام الفت

تمہارے متواتر تین خط ملے۔ لیکن میں جب بھی جواب لکھنے کے لئے بیٹھتی ہوں تو غم کی بے پناہ شدّت سے آنکھوں سے آنسوؤں کی بوچھار شروع ہو جاتی۔ اور کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے قلم چھوٹ جاتا۔ میری سمجھ سے باہر ہے کہ کیا لکھیں۔ ہکس طرح اپنی داستان غم سناؤں۔ بہت مشکل سے میں اپنے حواس کو مجتمع کر کے یہ خط لکھ رہی ہوں میرا دل رنج و غم سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے۔ کوہ غم نے میرے ذہن کو ماؤف کر دیا ہے۔ صبر و ضبط کے دامن کو مضبوطی سے تھام رہی ہوں۔

ساجد! دنیا میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جنھیں ہم پسند نہیں کرتے۔ لیکن وہ ہمیں پسند کرتی ہیں تمہاری حسین یادوں کو دل میں سموئے کالج سے فارغ ہو کر گھر پہنچی تو گھر کا سارا ماحول سوگوار تھا۔ ممی پریشان سی تھیں کیونکہ پاپا کو کینسر ہو گیا تھا۔ وہ ایک ماہ تک اسپتال میں زیر علاج رہے۔ جب ان کی حالت ذرا بہتر ہوئی تو وہ ڈسچارج ہو کر گھر آگئے۔ مجھے بھی تسلی ہوئی۔ چند دنوں بعد فرصت ملی۔ میں نے تمہیں خط لکھنے کے لئے قلم اور پیڈ سنبھالا ہی تھا کہ پاپا کے کھانسنے کی آواز آئی۔ کھانسنے کی ایسی جان لیوا آواز کہ میرا دل ہی لرز اٹھا۔ قلم اور پیڈ چھوڑ کر پاپا کے پاس پہنچی۔ تو پاپا پریشان ٹہل رہے تھے۔ ڈاکٹر نے ٹہلنے کے لئے منع کیا تھا۔ ان کو ٹہلتے دیکھ کر میں گھبرا گئی کہیں طبیعت دوبارہ خراب نہ ہو جائے۔ میرے اصرار کے بعد وہ لیٹ گئے۔ پریشانی کی وجہ پوچھی صرف آہ بھر کر رہ گئے میں نے بے چین ہو کر دوبارہ پوچھا۔ کہ کیا بات ہے پاپا کیا آپ کو کوئی تکلیف ہے؟ نفی میں سر ہلا دیا پاپا نے۔ میرے مزید اصرار کے بعد بولے۔

بیٹی! جب تم چھ ماہ کی تھیں۔ تو تمہاری ممی کا انتقال ہو گیا تھا۔ مجھے تمہاری ممی سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کی یکا یک جدائی سے مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد میرے شب و روز کرب و بے چینی سے گذرنے لگے۔ لاکھ بھلانے کی کوشش کی لیکن نہ بھلا سکا۔

آخر کار تنہائی اور دکھ درد سے چھٹکارا پانے کے لئے ایک کلب پہنچا۔ وہاں شراب کا دور چل رہا تھا۔ اپنا غم بھلانے کے لئے ایک بوتل اٹھا کر پینے ہی والا تھا۔ کہ کسی نے میرا ہاتھ خلوص اور اپنائیت سے پکڑتے ہوئے کہا۔ آپ کے بشرے سے شرافت صاف طور پر عیاں ہے۔ ایسے شریفوں کے لئے شراب زیب نہیں دیتی۔

انھوں نے میرے ہاتھ سے شراب کی بوتل چھین لی۔ میری باتوں اور میرے چہرے سے انھیں پتہ چل گیا۔ میں کسی گہرے غم میں مبتلا ہوں۔ وہ لطیفے سنانے لگے۔ ان کے لطیفوں، دلچسپ باتوں اور بے تکلف سلوک سے میں کچھ مطمئن ہوا۔

مجھے بری عادتوں سے بچانے والا وہی تمہارا انکل احتشام ہے۔ مجھے تم سے بے پناہ چاہت تھی۔ میں دوسری شادی کر کے تمہاری زندگی کو جہنم بنانا نہیں چاہتا تھا! لیکن احتشام کے شدید اصرار کی وجہ سے راضی ہو گیا۔ اس نے اپنے ہی رشتہ کی ایک لڑکی سے جو نیک سیرت اور گھریلو ذمہ داریوں سے خوب واقف تھی۔ میری شادی کرادی۔ میرا برباد آشیانہ دوبارہ آباد ہو گیا اور میں پھر ایک ذمہ دار انسان بن گیا۔ تمہاری سوتیلی ماں نے تمہیں اتنی چاہت اور محبت سے تمہاری پرورش کی کہ تمہیں سوتیلی ماں کا گمان تک نہ ہو سکا۔ آج وہی میرا محسن اپنے بیٹے فراست کیلئے مجھ سے تمہیں مانگ رہا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے ہی، احتشام مجھ سے وعدہ لے کر چلا گیا۔

میں پاپا کی بات سنکر پریشان ہو گئی۔ اور شاید انھوں نے میری پریشانی کو محسوس کر لیا۔ انھوں نے کہا بیٹی میں نے آنکھ بند کر کے احتشام سے وعدہ نہیں کیا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور احتشام کے احسانات کو مد نظر رکھ کر ایسا کیا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ فراست نیک، مخلص اور تعلیم یافتہ لڑکا ہے۔ اس کے اخلاق و عادات بھی عمدہ ہیں۔ وہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے گا۔ اگر میں اس دنیا سے چل بھی بسا تو تم میرے وعدہ کا خیال رکھنا۔ تاکہ میری روح کو سکون ملے۔

ساجد! میں پاپا سے صرف اتنا کہہ سکی: خدا آپ کی عمر طویل کرے اور صحت کلی عطا فرمائے۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔ آپ اچھے ہو جائیے

پاپا پھر بھی مجھے پریشان ہی نظر آنے لگے ——— اور
دو ہی دن بعد وہ اپنی پریشانی کو دل میں چھپائے ہمیشہ کے لئے
مجھ سے بچھڑ گئے۔

اب پاپا کو اس دنیا سے رخصت ہوئے چار ماہ ہو چکے ہیں۔ گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ یوں سمجھو میری تمناؤں کا چمن لٹ رہا ہے۔ آرزوؤں کے محل مسمار ہو رہے ہیں امیدیں دم توڑ رہی ہیں اور دل و دماغ یاس کی تاریکیوں میں ڈوب رہے ہیں۔

ساجد! ہمیں کتنی تمنا تھی۔ محبت کی ایک حسین دنیا بسانے کی کیسی کیسی آرزوؤں سے میں نے تمہیں اپنا سمجھ لیا تھا ـــ لیکن اب وہ سب کچھ خواب و خیال ہو گیا۔ اور میں صبر کی سل سینے پر رکھے صرف آنسو بہا رہی ہوں۔ دیکھو میں کتنی مجبور ہوں۔ میری زندگی میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ شفیق پاپا ایک وعدہ لے کر چل بسے اور میں ان کی بیٹی ہونے کے ناطے ان کی روح کو صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ انھیں مجھ پر بھروسہ تھا، ورنہ وہ ایسا نہ کرتے۔ اب میرے لئے محرومیوں کے سوا اس دنیا میں کچھ بھی تو نہیں رہ گیا۔ کاش میں نے تم سے محبت نہ کی ہوتی اور کی تھی تو اپنے شفیق پاپا سے کہہ دیا ہوتا وہ کبھی میرا دل نہ توڑتے۔ لیکن انھوں نے چچا جان سے جو وعدہ کر لیا ہے۔ اس سے فرار ممکن نہیں۔ انھوں نے مجھے خاک سے پاک کیا۔ میں ان سے سب کچھ لیتی ہی رہی دے کچھ نہ سکی۔ پھر کیسے ان کی بات ٹال کر تمہاری بن جاؤں۔ نہیں ساجد! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم مجھے بھول جاؤ۔ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اسے خواب پریشاں سمجھ لو۔ ایک مشرقی بیٹی، اپنے باپ کے قول و قرار کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتی ہے۔ یہ میرا آخری خط ہے ساجد مجھے معاف کرنا۔ میں اب تم سے کبھی نہ مل سکوں گی۔ اور پھر اس نے اپنی روداد غم لکھ کر ساجد کو بھیج دی، جو مسلسل تین خط اسے بھیجنے کے بعد خاموش ہو گیا تھا۔ اس کا خط ساجد کو ملا تو ساجد کے رنج و غم کا مداوا بن گیا۔ کئی روز سے وہ سوچ رہا تھا کہ عذرا کو خط کیسے لکھے۔ نہ جانے عذرا اس کا خط پڑھ کر زندہ رہ بھی سکے گی یا نہیں۔ مرد اپنی بے وفائیوں کے لئے مشہور ہیں۔ حالانکہ سارے ہی مرد ایسے نہیں ہوتے اور خود اس نے جو کچھ کیا تھا وہ تو بڑا ہی شریفانہ فعل تھا۔ اسے انسانیت کا کارنامہ کہا جا سکتا تھا،

لیکن کیا عذرا بھی یقین کرتی کہ ساجد نے کچھ کیا ہے۔ سراسر دھوکا دیا ہے۔ عذرا کا خط پاکر گویا اسے دولت کونین مل گئی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب اس پر بے وفائی الزام نہ لگ سکے گا۔

اس نے عذرا کو لکھا۔

" بہن عذرا! ہاں آج سے تم میری بہن ہی ہو، تم نے جو کچھ لکھا۔ اسے پڑھ کر تمہاری عظمت میرے دل میں اور بھی بڑھ گئی۔ ہر بیٹی کو تمہاری ہی طرح اپنے ماں باپ کی عزت کا اسی طرح پاس و لحاظ کرنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ تم پر بے وفائی کا الزام لگاتا، اس لئے کہ میری جنس بے وفا ہوتے ہوئے بھی تمہاری جنس کو بے وفا سمجھتی ہے۔

تمہیں یاد ہوگا نعمان بھی میرا کلاس فیلو تھا۔ چند روز قبل وہ اپنی بہن کی شادی کا کارڈ لے کر آیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اس شادی میں اس کا ہاتھ بٹاؤں ـــ لیکن تمہارا خط نہ ملنے کی وجہ سے بے حد پریشان و مغموم تھا۔ دل ہی نہیں چاہتا تھا کہ کسی خوشی میں شریک ہوں۔ لیکن نعمان کی بہن کا معاملہ تھا اور اس نے بڑی لجاجت سے شرکت کی درخواست کی تھی۔ اس لئے میں چلا گیا۔

آج میں سوچ رہا ہوں کہ اگر میں نہ گیا ہوتا تو کیا ہوتا۔ عذرا بہن! یقین مانو زندگی وہی ہے جو دوسروں کے لئے گزاری جائے۔ زندگی صرف مسرتوں ہی کا نام نہیں۔ مسرتوں کے ساتھ ہی اگر غم نہ ہوں تو زندگی، زندگی ہی نہ کہی جا سکے گی۔ غم بھی زندگی کو نکھارتے ہیں۔ محبت زندگی ہے، لیکن محبت ایثار بھی چاہتی ہے۔ ماں سے زیادہ بچے کو کون پیار کرتا ہے۔ لیکن اس پیار کے لئے اسے کتنے ایثار کرنا پڑتے ہیں۔ سب ہی جانتے ہیں۔

میں جب نعمان کے یہاں پہنچا تو بارات آ چکی تھی۔ صرف نکاح ہونا باقی تھا۔ دولہا کے والد اور نعمان میں بحث ہو رہی تھی۔ دولہا کے والد ٹی۔ وی اور اسکوٹر کی فرمائش کر رہے تھے۔ نعمان کہہ رہا تھا۔ میرے پاس جتنے پیسے تھے شادی کی تیاریوں میں خرچ ہو گئے۔ جہیز دے سکتا تھا وہ آپ سب نے دیکھ لیا ہے۔ اب مجھے قرض بھی نہیں مل سکتا۔ یہ سب بھی میں نے مکان گروی کر کے فراہم کیا ہے۔

دولہا کے والد غصے سے بولے۔ ان باتوں سے کام نہ چلے گا۔ سب تو آج کل غریب سے غریب لوگ بھی دیتے ہیں۔ تمہیں یہ رشتہ

کرنے ہی کی کیا ضرورت تھی اگر تم اس قابل نہیں تھے۔ میں بارات واپس لئے جا رہا ہوں۔ دولہا کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن باپ نے اسے ایسی سختی سے ڈانٹ دیا کہ بیچارا کچھ نہ کر سکا۔ بارات واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر پہلے جہاں مسرتوں کی شہنائی بج رہی تھی، ماتم کدہ بن گیا۔ نعمان کی بے بسی مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ ماحول اتنا دلدوز تھا کہ میں تڑپ اٹھا۔ میرا ضمیر مجھے اکسانے لگا۔ اٹھو اس ماتم کدہ کو خوشی سے بدل دو۔ ایسے نیک بندوں سے خدا ہمیشہ خوش ہوتا ہے۔

عذرا! میں اس کے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔ آخری فیصلہ کر کے میں نے نعمان سے کہہ دیا۔ قاضی صاحب کو روک لو اگر تم پسند کرو تو میں ابھی تمہاری بہن سے نکاح کروں گا۔ مجھے تمہارے اس جہیز کی بھی ضرورت نہیں جو تم نے سجا رکھا ہے۔

نعمان کو شاید میرے الفاظ پر یقین نہیں آیا۔ وہ مبہوت سا ہو کر مجھے دیکھتا رہا تو میں نے کہا جو کچھ کہا ہے۔ اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں میرے دوست۔ اور یہ میں اللہ کی خوشنودی کے لئے کر رہا ہوں۔ سماج کی بدرسموں کو مٹانے کے لئے کر رہا ہوں۔ نعمان نے مجھے لپٹا لیا اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے، لیکن یہ آنسو مسرت کے آنسو تھے۔ مجھے معاف کر دینا عذرا۔ میرا یہ ایثار عورت کے لئے جو ماں بنتی ہے بہن بنتی ہے، بیوی بنتی اور بیٹی بنتی ہے۔ میرا خیال ہے تم میرے اس ایثار کو پسند کرو گی اور ہمیشہ مجھے بھائی کی طرح سمجھو گی۔

حریمی دسترخوان

نرگسی کباب

بیگم تسنیم اشرفی

کبابوں کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً شامی کباب، نرگسی کباب، گلاوٹ کے یعنی کچے قیمے کے کباب، بوٹی کے کباب، مچھلی کے کباب، ہلکی کے کباب وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ شامی تکے کے کباب، گلاوٹ کے کباب اور نرگسی کباب زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔ آئیے آج ہم آپ کو نرگسی کبابوں کے پکانے کی ترکیب بتاتی ہیں۔ آزما کر دیکھئے۔

سامان۔ قیمہ روکھا یعنی بلا چربی کا باریک کٹا ہوا اور چھنا ہوا۔ دھنیا، چائے کے چار چمچے۔ گرم مسالہ (یعنی لونگ، دارچینی، چھوٹی الائچی اور کالی مرچ) پسا ہوا چائے کے دو چمچے۔ پسی ہوئی مرچ دو تین یا حسب خواہش کم و بیش۔ نمک حسب ضرورت۔ دیسی مرغی کے انڈے دس عدد۔ گھی یا ڈالڈا حسب ضرورت تلنے کے لئے۔ کیوڑہ کا عرق اگر ممکن ہو تو چار پانچ چمچے چائے کے۔

ترکیب۔ آٹھ انڈوں کو ۱۰-۷ منٹ تک ابال کر ٹھنڈا ہونے کے بعد چھیل کر رکھ لیں۔ دو انڈوں کی سفیدی اور زردی کو پھینٹ کر ایک جان کر کے رکھ لیں۔

قیمہ کو پانی میں دھو کر اچھی طرح نچوڑ لیں، ہلکی آنچ پر پتیلی میں ڈال دیں۔ نمک، مرچ، گرم مسالہ اور دھنیا سب ملا کر بھونیں۔ جب سرخی مائل ہو جائے تو اتار کر اس میں زیرہ ملا کر سل پر خوب باریک پیس لیں اور کیوڑہ ملا دیں۔ قیمہ بھونتے وقت پانی قطعی نہ ڈالیں۔ قیمہ پیسنے کے بعد۔ اگر آپ کافی بڑے بڑے کباب بنانا چاہتی ہیں تو جو اکثر دعوتوں کے موقع پر بنائے جاتے ہیں۔ مسلم انڈوں پر احتیاط سے قیمہ کا آمیزہ لپیٹ کر گول یا بیضاوی بنا لیں۔ یعنی قیمہ انڈوں پر لپیٹ لیں۔

اگر چھوٹے کباب چاہتی ہیں تو انڈوں کے دو دو یا چار چار ٹکڑے کر کے ۱۶ یا ۳۲ کباب بنا لیں۔ کسی گہرے برتن میں ڈالڈا یا گھی ڈال کر گرم کر لیں پھر انڈوں پر ہلکا ہلکا پھینٹا ہوا انڈوں کا آمیزہ لگائیں۔ اگر کم پڑے تو مزید انڈے توڑ کر پھینٹ لیں، کباب جتنے چھوٹے ہوں گے انڈے اتنے ہی زیادہ صرف ہوں گے۔

کبابوں کو ہلکی آنچ میں تلیں۔ چمچے سے گرم گھی چاروں طرف سے کنارے پر ڈالتی رہیں۔ جب پک جائیں تو الٹ پلٹ کر اچھی طرح سرخ ہو جانے پر نکال لیں۔

نوٹ۔ قیمہ پیسنے کے بعد نمک چکھ کر دیکھ لیں۔ اگر نمک مرچ کم لگے تو اور ملا کر کباب بنائیں۔

• آپ کسی بات کا جواب چاہتی ہیں تو جواب کے لئے کارڈ یا ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں ورنہ جواب نہ ملے گا۔

نگاہیں

حنا فردوس

شمیمہ کے قدم سڑک کو روندتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس نے اپنے جسم کو ایک پھولدار ساڑی میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے اپنے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ دوکانوں پر بھیڑ لگی تھی۔ سڑک پر آدمیوں کے ریلے تھے۔ نوجوان بوڑھے عورت مرد سب اپنے قدم تیزی سے بڑھاتے ہوئے اسکے پاس سے گزر رہے تھے۔ لوگ ایک اچٹتی نظر اس کے چہرے پر ڈال کر آگے بڑھ جاتے۔ آج ان نگاہوں کا پتہ نہ تھا جو اس کے چہرے سے چپک کر رہ جاتی تھیں۔

بس آنے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ بینچ فل تھی۔ اس کے بیٹھنے کی کہیں گنجائش نہیں تھی۔ لوگ اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے کوئی اخبار لئے وقت گزار رہا تھا۔ وہ پاس ہی ایک پیڑ کے سائے میں کھڑی ہو گئی۔ کوئی بھی اس کی طرف دیکھ نہ رہا تھا۔ اور کوئی اس کی طرف نظریں اٹھاتا تو اس طرح تیزی سے نظریں پھیر لیتا، جیسے کہ اس نے کسی بھیانک چیز کو دیکھ لیا ہو۔ کھڑے کھڑے وہ اپنے ماضی میں کھو گئی۔ دنیا میں ماں کے علاوہ اس کا اور کوئی نہ تھا۔ تین سال ہوئے باپ نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ بی۔اے کرنے کے بعد اس نے نوکری کے لئے درخواست دی۔ پہلے تو کئی جگہوں سے ناامیدی حاصل ہوئی، لیکن آخر میں ایک اسکول میں اسے ٹیچر کی جگہ مل گئی۔ وہ روزانہ بس سے اسکول جاتی اور تمام راستے لوگوں کے تیر و نشتر جیسے فقرے سنتی البتہ یہ ضرور ہوتا کہ بس میں اسے آسانی سے سیٹ مل جاتی۔ ہر شخص چاہتا کہ وہ اس کے پاس بیٹھ جائے سیٹ خالی نہ ہوتی تو لوگ خود کھڑے ہو کر اسے اپنی سیٹ پیش کر دیتے۔ اور وہ سمجھ جاتی کہ اس کی یہ آؤ بھگت کیوں ہوتی ہے۔

وہ آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتی تو اس کی زبان سے نکلتا "تو یہی تو میری دشمن ہے، کاش میں حسین نہ ہوتی۔ راستہ چلنا دشوار ہو گیا ہے"۔

بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں پریشان ہو جاتیں۔ اس کا گورا رنگ غصہ میں سرخ ہو جاتا۔ وہ اپنے لمبے لمبے گھنے بالوں کی جیسی تیسی چوٹی کر کے اسکول کے لئے روانہ ہو جاتی۔ اور خود کو تیار کرتی ان فقروں کو برداشت کرنے کے لئے جو راستے بھر اسے سننا پڑتے۔

جدھر بھی نگاہ اٹھتی نگاہیں اس کے چہرے سے الجھی رہتیں۔ وہ جب آگے بڑھ جاتی تو آوازیں آتیں "کیا ناگن جیسے بال ہیں"۔ وہ اپنی چوٹی آگے ڈال لیتی۔ کوئی کہتا "کیا قیامت کی چال ہے"۔ وہ تیز تیز قدم چلنے لگتی۔ کوئی سیٹیاں بجانے لگتا کوئی لمبی ٹھنڈی آہیں بھرتا پاس سے گذر جاتا۔ اور وہ ان سب باتوں کو جھیلتی رواں دواں رہتی۔ بس اسٹاپ پر لوگ اسے اپنے قریب جگہ دینے کو بیقرار رہتے۔ ہر طرف سے آواز آتی ادھر آجائیے ادھر آجائیے وہ گھبرا جاتی۔

لوگ اسے دیکھ کر مسکراتے۔ اس کے قریب آکر سب کی رفتار دھیمی ہو جاتی اس کی نگاہ زمین پر گڑی رہتی۔ کیا کرے کہاں جائے۔ جہاں یہ نگاہیں نہ ہوں۔

دو مہینہ قبل اس کو نظر لگ گئی۔ اتوار کا دن تھا۔ وہ گھر میں بیٹھی کسی کتاب کے اوراق الٹ رہی تھی ـــــ چیخ پکار سن کر وہ باہر آئی سامنے گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ ایک عورت "میرا بچہ میرا بچہ" کہہ کر چیخ رہی تھی۔ شمو آگ کی لپٹوں کی پرواہ کئے بغیر شعلوں میں گھس گئی۔ سارے لوگ دنگ رہ گئے اور اس کی ماں۔ پاگلوں کی طرح دوڑنے لگی۔ لوگ پکڑ نہ لیتے تو وہ بھی شمو کو بچانے کے لئے اندر گھس جاتی ـــــ اور پھر ذرا ہی دیر بعد وہ بچے کو لیکر باہر آئی۔ ماں نے اپنے بچے کو لیکر چمٹا لیا۔ وہ کالی جل گیا تھا، لیکن مرا نہ تھا شمو کا چہرہ جیسے جھلس گیا تھا۔ لوگ ان دونوں کو اسپتال لے گئے اور وہ جب اچھی ہو کر گھر آئی تو آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر چیخ پڑی۔ پہلے تو اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر اپنے چہرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی یا خدا یہ کس جرم کی سزا ملی ہے۔ اس کی ماں تو چپ چاپ اپنی بیٹی کا چہرہ تکتی رہتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ترس اور پریشانی کے آثار ہوتے انھیں ہر وقت یہی فکر رہتی مری

شمتوں کا کیا ہوگا۔ جہیز دینے کے لئے تو کچھ تھا نہیں اس کا چہرہ ہی تو اس کی شادی کا سہارا تھا اس کے خداداد حسن کے طفیل اس کی شادی آسانی سے ہو جاتی، لیکن اب تو کوئی اسے نہ پوچھے گا۔

بس کا ہارن سن کر وہ چونکی۔ بس کی لیڈیز سیٹیں بھر چکی تھیں

اس نے ہر طرف دیکھا۔ مرد آرام سے بیٹھے گپ ہانک رہے تھے۔ آج کسی نے بھی اسے بیٹھنے کا آفر نہیں کیا ایک اچٹتی سی نظر اس کے چہرے پر پڑتی اور لوگ نگاہیں پھیر لیتے۔ وہ اسٹینڈ کا سہارا لئے کھڑی رہی۔ ہر اسٹاپ پر لوگ بڑی تیزی سے گزر کر آگے سیٹ بنا کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگتے، اس کی کوئی پروا نہ کرتا۔ اس کے ذہن میں کل کی باتیں گھومنے لگیں۔ کل اور آج میں کتنا فرق تھا۔ دنیا کی نگاہیں کتنی جلدی بدل جاتی ہیں۔

دنیا کی نگاہیں بدل گئی تھیں پھر بھی وہ خوش تھی مطمئن تھی۔ اس کے چہرے پہ تبسم کی جھلک تھی۔ اس نے سوچا کل تک جو شکل اس کے لیے مصیبت تھی۔ آج وہی سہارا بن گئی۔ مسکرا پڑی۔ اور مسکراتی ہی رہی کہ اب اسے گھورا نہیں جا رہا تھا۔ بلکہ اس پر نگاہ پڑتے ہی لوگ اپنا منھ پھیر لیتے تھے۔

• کسی ماہ حریم ۲۰ تاریخ تک نہ ملے تو دفتر کو اطلاع دیں۔ اگر ۲۰ تاریخ تک آپ نے اطلاع نہ کی تو دوسرا پرچہ قیمتاً روانہ کیا جائے گا۔

مردوں کا سلوک

(کشور ناہید)

کہا جاتا ہے حیا عورت کا زیور ہے۔

کہا جاتا ہے۔ بننا سنورنا، عورت کا پیدائشی حق ہے۔

کہا جاتا ہے، عورت کا فرض ہے، وہ مرد کی رضا کو اپنی زندگی کی معراج سمجھے۔

کہا جاتا ہے، عورت، مرد کا دل جیتنا چاہتی ہے تو اس کے معدے کے راستے، یعنی اچھے کھانے کھلا کر مرد کا دل جیتے۔

یہ سب کہا جاتا ہے اور بھی بہت کچھ کہا جاتا ہے مثال کیجئے تو لب لباب یہ نکلتا ہے کہ عورت، ثانوی درجے کی شہری اور انسان ہے اس کو زیور پہن کر بیٹھنا، کھانا پکا کر رجھانا اور بن سنور کر پھسلانا نہیں آتا تو گویا اچھی بیوی اور اچھی جیون ساتھی بننے کا سلیقہ نہیں آتا ہے۔

جہاں تک ان تمام صفات کا تعلق ہے جن کا اوپر بیان کیا جانا ضروری تھا۔ وہ تمام ایک باسلیقہ اور باصفات شخص کے لئے چاہے وہ مرد ہو یا عورت ضروری ہیں۔ یعنی مرد اور عورت دونوں کے لئے باحیا ہونے کی شرط، اسلام بھی عائد کرتا ہے اور دوسرے مذاہب بھی۔

بننے سنورنے کا مسئلہ یہ ہے کہ آج کل مرد تو عورت سے بھی زیادہ بنتے اور سنورتے ہیں۔ کولون اور آفٹر شیو تو خیر معمولات زندگی ہیں۔ نت نئے ڈیزائن کے لاکٹ، بوشرٹیں اور اب ڈوکرتے شلوار اس قدر اقسام کے ہیں کہ عورتیں شرمائیں۔

مرد کا دل جیتنے کی کوشش کرنے والی خواتین کی دو تہائی عمر باورچی خانے میں گزرتی ہے۔ مگر آمدنی کے مطابق دال، بھجیا، چپاتی، چاول اور سبزی پکانے والی کی ہنڈیا دھری کی دھری رہ جاتی ہے کہ صاحب تو شرک پر کھڑے کھڑے چار سموسے یا دو سیخ کباب کبھی، ایک پلیٹ دال چاول یا ایک یا دو بلا ڈ یا زردہ اور نہیں تو دہی بڑے یا مٹھائی کھا کر گھر تک پہنچے ہیں اور اب گھر میں یہ ظاہر کرتا ہے کہ بھوک نہیں یا موڈ خراب ہے اس لئے کھانا نہیں کھا رہے ہیں

بی بی بیچاری ڈر کے مارے کانپ رہی ہے کہ کہیں الٹا سیدھا منہ سے نہ نکل جائے اور صاحب اپنی چوری چھپانے کو نارافنگی یا طبیعت کی خرابی کے بہانے کو بہترین طریقے پر استعمال کر رہے ہیں۔

کبھی اگر اکیلے یا دوستوں کے ساتھ سینما جانے کا شوق عود کر آیا تو گھر بتا کر گیا۔ گھر والی نے ناراض ہونے کی کوشش کی تو دفتری فائلیں اس کے سر پر دے ماریں کہ تمہارا تو دماغ خراب ہے، لو چار فائلیں جن میں دماغ کھپا تا میں یہاں تک پہنچا ہوں اس کے بعد تمہارا لیکچر شروع ہو گیا ہے یہ نک کل صبح سینما کی ٹکٹیں جیب سے نکلیں مگر رات کے غصے سے ڈری بیوی ذرا نہیں بولے گی کہ گھر میں، بچوں کے سامنے لڑائی غلطبات ہے۔

ایسے مردوں سے ان رویّوں کا سبب پوچھو تو وہ بڑی صفائی سے جواب دیں گے کہ سارے گھر کے لئے بریانی یا کھانا کم از کم ۳۰ روپے جبکہ اکیلے تین روپے میں کھائی جا سکتی ہے۔ چونکہ ۳۰ روپے بجٹ میں نکل نہیں سکتے۔ اس لئے ۳ روپے کا خرچ درست۔ بی بی کو زیادہ منہ لگائیں دو اس طرح ان کو زیادہ سر پر چڑھاؤ تو وہ پھر آپ کی ہر بات کا حساب لیتی ہے

ایک اور طریقہ ہے، عورت کو راضی اور اپنی مرضی کرنے کا۔ اس کو ایک ساڑھی، ایک جوڑا، ایک زیور کا سیٹ لا دو اور سارا دن اپنی مرضی کے مطابق چاہے غائب رہو یا جہاں چاہو جاؤ، رہو اور آؤ، پوچھنے والا کون ہو گا کہ یہ سارا دن محنت تو بیوی کے نئے زیور اور کپڑے اکٹھے کرنے کے لئے کی جا رہی ہے۔ اور وہ بیوی کہ جو جانتی ہے کہ میاں کی اصل آمدنی میں یہ سب کچھ نہیں آ سکتا۔ وہ ان تحائف کو حاصل کرنے کے عوامل کو حقیقت کا رنگ دینے کو خاموشی کی دیوار کھڑی کرتی ہے۔ گویا یہ کہ منافقتیں دونوں طرف ہیں۔

مرد اپنے رویوں اور اختیارات کے بے جا استعمال کے لئے اپنے تئیں عرب اختیار کرتا ہے اور عورت اپنے تئیں، تو کیا ایک پرخلوص معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے اور کیا ایسے متضاد رویوں کے حامل افراد کی نگرانی میں پلنے والے بچے اچھے کردار کے مالک ہو سکتے ہیں۔

انحطاط پذیر معاشروں میں افراد کا یہی کردار ہوتا ہے۔ وہ اخلاق دوسروں کو سکھانے کا نام لے کر خود اخلاق باختگی کی ہر منزل عبور کر جاتے ہیں۔ وہ اپنے لئے ہر چیز کو روا سمجھتے ہیں۔ دوسروں کے لئے وہی بات عیب نظر آتی ہے۔ بہت سے لوگ تو میاں بیوی کے قریبی رشتے کو بھی بے شرمی کا نام دینے سے گریز نہیں کرتے۔ اور کچھ لوگ بہن بھائیوں کو آپس میں ملنے تک نہیں دیتے کہ اخلاقیات کی حدیں مجروح ہوتی نظر آتی ہیں۔

ہمارے ملک میں گزشتہ چند سالوں سے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں سال بھر میں پندرہ دن کی چھٹی مع پیسوں کے دی جاتی ہے تاکہ لوگ ذرا باہر جائیں۔ گھومیں پھریں، آرام کریں۔ بچوں کو سیر کرائیں اور پھر تازہ دم ہو کر نوکری پر حاضر ہوں۔

مگر ہوتا کیا ہے۔ اوّل تو وہ رقم بچوں کی سردی یا گرمی کی یونیفارم بنانے پر صرف ہو جاتی ہے۔ یا پھر کسی پچھلے قرضے کی ادائیگی میں کام آ جاتی ہے۔ اگر کہیں جانے کا پروگرام بنے بھی تو شوہر اپنے دوستوں کے ساتھ سیر کو چلا جاتا ہے ——— اب "سفر در سفر" ہی کو لے لیجئے اشفاق احمد اپنے دوستوں کے ساتھ سیر کو گئے تھے سنپنے۔ بیوی بچوں کے ساتھ نہیں کہ ذہنی آزادی چاہنے والے شوہر کی بیوی اور بچے بھی ذہنی آزادی چاہتے ہیں۔

مغرب میں ہر جمعہ کی شام کو گاڑیوں میں بھر کر بچے بیوی اور شوہر پارکوں، دیہاتوں اور تفریحی مقامات کی سمت روانہ ہوتے ہیں کہ چھٹی کے دو دن بڑے سکون اور اطمینان کے علاوہ صرف بیوی اور بچوں کے ساتھ گزاریں۔ مگر شاید وہاں رشتے کی نوعیت اس سطح سے بہتر ہو کہ "آج کیا پکانا ہے" "منے کی فیس کے لئے پیسے نہیں ہیں" "شام کو فلاں کے گھر دعوت پر جانا ہے۔ ذرا جلدی گھر آ جانا" یا "آج آپ نے فلاں مہمان کھانے پر بلائے ہیں۔ خود گھر آنا نہ بھول جانا" وغیرہ وغیرہ

<u>نسیم انہونوی</u>

کے وہ اصلاحی اور سبق آموز ناول جو بکتے ہیں

ارمان ۱۲/- • آخری تمنا ۶/- • مس طلعت ۱۴/- • طرز زندگی ۸/-

انجم السحر ۲۵/- • خاتون ۴/- • حسرت ۶/- • رحمت ۴/-

شبانہ ۲۰/- اور تمنا ۱۲/-

سچی کہانی

بیگم عطیہ

مختلف رسالوں سے جمع کئے ہوئے کٹنگز رجسٹر میں ترتیب سے رکھنے کے دوران ایک تصویر پھسل کر نیچے گر پڑی۔ یہ ایک جوان عورت کی شبیہ تھی۔ بھرے گال، چمکیلی آنکھیں اور ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ اس کا چہرہ ہی بتاتا ہے کہ وہ کتنی مطمئن، خوش اور صحتمند ہے۔ تصویر پلٹی اس کے پیچھے لکھے ہوئے مصرعے کو پڑھ کر میں چونک پڑی۔ تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

یادوں کا ایک کڑوا دھواں ہر سو پھیل گیا۔ یہ تصویر میری ہے۔ اس پر لکھا ہوا شعر بھی میں نے تحریر کیا ہے۔ آپ کہیں گی۔ میں تو جیتی جاگتی ہوں پھر اس وقت زندگی کی تلاش میں کہاں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ یہی تو میں آپ کو بتانے لگی ہوں۔

میری اس آپ بیتی میں کوئی رومانس نہیں کوئی شاعری نہیں، کہیں بھی الفاظ جادو نہیں جگاتے۔ بس میرے سر پر سے گذرنے والی ایک قیامت کا احوال ہے کہ کبھی کبھی یوں بھی قدرت کے امتحان لئے جاتے ہیں۔ دنیا بھی ایک اسٹیج ہے۔ کسی کے ہاتھ میں ایک بے فکر، آزاد منش، خوشیوں کے گہوارے میں جھولنے والے کردار کا مسودہ آتا ہے۔ کوئی ساری عمر تڑپتے سسکتے، غربت و افلاس کی چکی میں پسنے والے کردار کو ادا کرتے کرتے فنا ہو جاتا ہے۔ کسی کے لئے زندگی ایک حسین خواب ہے اور کسی کے لئے آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکنے والی تلخ حقیقت زندگی میں غربت، محرومیوں، بیماری یا کسی تشنگی کا سایہ جب تک قائم رہے ہم خدا سے عام طور پر نزدیک رہتے ہیں۔ لیکن جوں، جوں آسائشوں اور آسودگیوں کی رقاصہ ہمارے آنگن میں چھم چھم کرتی اترنے لگتی ہے۔ ہم خدائے ذوالجلال کی ہستی سے دور ہونے لگتے ہیں۔ ایسے میں ایک معمولی سی چوٹ ہمیں بے ساختہ اس بزرگ و برتر ہستی کے سامنے سر بسجود ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ تب ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ دنیائے رنگ و بو مستقل قیام کی جگہ ہرگز نہیں۔ ہماری حیثیت پانی کے بلبلے جیسی ہے جو پھوٹ گیا تو نشان ہی مٹ گیا۔

میری یہ کہانی شاید قابلِ اہمیت نہ ہو لیکن موت کے خطرناک پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن کر جو کیفیت میری ہوئی وہ کچھ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اس طرح کے ملتے جلتے حالات سے گذر رہے ہوں۔

تین سال پہلے میں اپنے شوہر اور چار بچوں کے ساتھ پرسکون زندگی گذار رہی تھی۔ میرے بچے خوبصورت صحتمند اور ذہین تھے۔ شوہر ہم سب پر جان چھڑکتے تھے۔ میں اپنی قسمت پر جتنا بھی ناز کرتی کم تھا۔ لڑ جھگڑ کر، منت سے پیار سے جس طرح بھی ہو میں نے اس گھر کے لئے اپنے شوہر کی جیب سے پیسے نکلوائے تھے، تاکہ اسے اپنی من پسند چیزوں سے سجا سکوں۔ ہمسائیاں کہتیں، تمہارے گھر کو دیکھ کر رشک آتا ہے۔ تم لوگ لڑتے نہیں، تمہارے بچے کتنے سمجھدار ہیں، تمہارے گھر کی آرائش کتنی خوبصورت ہے، تم قہقہے لگاتے نہیں تھکتیں، تمہاری عمر بڑھنے کی بجائے پیچھے کی طرف جاری ہے۔

یہ چھوٹے چھوٹے فقرے مجھے اکثر سننے پڑتے تھے۔ اللہ کی اس بے اندازہ رحمت پر میری آنکھیں جھکنے لگتیں۔

کچھ عرصے پہلے میرے یہاں کافی پیچیدہ آپریشن سے بیٹی پیدا ہوئی۔ میں خون کی شدید کمی کا شکار ہو گئی خون کی بوتلیں چڑھا کر یہ کمی پوری کی گئی۔ پھر میری ننھی بچی کا چھ ماہ کی عمر میں آپریشن ہوا۔ آپریشن سے پہلے اور بعد میں مجھے جتنی جسمانی اور ذہنی کوفت ہوئی۔ وہ بچوں والی ماں ہی جان سکتی ہے۔ لیکن طاقت کی دواؤں، اچھی خوراک اور پھل وغیرہ کے استعمال نے مجھے جلد ہی سنبھالا دیا۔

مجھے اپنے سجے سجائے گھر سے والہانہ محبت تھی۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر میں جھاڑن سنبھال لیتی۔ ایک ایک چیز کو جھاڑ پونچھ کر چمکا دیتی۔ مجھے ہمیشہ سے پھولوں گڑیوں اور جاذب آرائشی چیزوں کو جمع کرنے کا شوق تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر سے ڈھیروں چیزیں جمع کر رکھی تھیں۔ میں انھیں جان سے بھی عزیز رکھتی۔ جمعدارنی صفائی کر جاتی تو بعد میں میں فرش پر سے ایک ایک داغ ڈھونڈ کر رگڑتی۔ کھڑکیوں کے شیشے دروازے اسٹیج اور برتن صاف کرتے ہوئے میرے بازو دکھنے لگتے۔ لیکن میں تھکتی کہاں۔ میری چھوٹی سی جنت میں ذرا سی بھی گندگی ہو یہ میں کب برداشت کرتی

تھی۔ ایک دن معمولی شور مچانے پر میں نے اپنے چھوٹے بچے کے پھول سے گال پر جب تھپڑ مارا اس کی نگاہوں میں حیرت کے آثار دیکھ کر میں شرمندہ ہوگئی۔

لیکن اس کے بعد باوجود کوشش کے میں سنبھل نہ سکی۔ بچوں کو ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹنے لگی۔ اکثر پیٹ بھی ڈالتی۔ شوہر سے معمولی معمولی باتوں پر جھگڑا رہنے لگا۔ باورچی خانے میں نوکر سے روز تلخ کلامی ہونے لگی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرے اندر کوئی تبدیلی آرہی ہے۔ ساری ساری رات کروٹیں بدلتے گذرتی۔ صبح اٹھ کر بدن یوں ٹوٹتا جیسے ہل چلا کر آئی ہوں۔ اسی لئے گولیاں کیپسول وغیرہ کبھی نہیں کھائیں۔ چند دن سے کمر میں درد رہنے لگا۔ اٹھنا بیٹھنا دشوار ہوگیا۔ بڑا ضبط کیا لیکن جب برداشت سے باہر ہوگیا تو ڈاکٹر کے پاس گئی۔ انھوں نے ایکسرے تجویز کئے۔ کیونکہ بعض وقت ایک خاص ہڈی میں شدت کا درد اٹھتا تھا۔

دوسرے دن میں ڈاکٹر صاحب کے پاس ایکسرے لے کر گئی۔ اسکرین پر ایکسرے لگا کر جب انھوں نے بتی جلائی تو یکدم گھوم کر پر تشویش نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ چند سوال کئے اور پھر میرے شوہر کو ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا جو کچھ میں نے سنا اس سے بس میرے جسم سے جان ہی تو نکل گئی۔ دل کی حرکت رک سی گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے سکتہ ہوگیا۔ "مجھے افسوس ہے مسٹر آپ کی بیوی کو ٹی بی ہوگئی ہے۔ ہڈی کافی خراب ہے۔ اس کا طویل علاج کرانا پڑے گا۔ فی الحال یہ فوری طور پر کم از کم چھ مہینے بستر پر لیٹی رہیں گی۔ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگا سکیں گی۔"

میرے شوہر کو ہدایات اور دوا کی لمبی چوڑی فہرست پکڑا کر ڈاکٹر باہر آگئے۔ میں بھی کچھ ظاہر کئے بغیر باہر آکر کار میں بیٹھ گئی۔

راستے میں میں نے محسوس کیا کہ میرے شوہر کے ہاتھ اسٹیرنگ پر کپکپا رہے ہیں۔ چہرہ ستا ہوا ہے۔ وہ بار بار میری طرف دیکھتے ہیں ان کی نظروں میں اداسیوں کے سائے لہرا رہے ہیں۔ میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے آواز کو نارمل بنانے کی کوشش کی اور پوچھا۔ "ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔ مجھے کیا ہوا ہے؟" میرے شوہر نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے بولے۔

"بھئی تمہیں تو وہم ہوگیا ہے کہ تم بیمار ہو۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ صرف کمزوری ہے بس تم اچھی غذا اور دوا کا استعمال کرو مکمل آرام کرو، خوش رہو چند دنوں میں بھلی چنگی ہو جاؤگی۔ تم جو گھر اور بچوں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہو۔ سارا دن صفائی، جھاڑ پونچھ میں لگی رہتی ہو۔ گھر کو بنانے سنوارنے کا تو تمہیں جیسے جنون ہے سو دفعہ منع کرتا ہوں کام کم کرو لیکن تم مانتی کب ہو۔ اب تم بستر میں آرام کروگی سمجھیں!"

میرے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ دوسرے دن میری والدہ کو کراچی سے بلا لیا گیا۔ بچی کی دیکھ بھال کے لئے ایک عورت کا بندوبست بھی ہوگیا۔ اس طرح سارا دن ادھر سے ادھر دوڑنے بھاگنے والی عورت کو تختہ لگے پلنگ پر محصور کر دیا گیا۔ اسٹریپٹو مائسین کے انجکشن اور ڈھیروں دوائیں بھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔ آدھی رات کو اپنی بیماری کا خیال آتے ہی میں لرز کر اٹھ بیٹھتی۔ باقی رات گرم گرم آنسو میرا چہرہ بھگوتے رہتے، میں شدید نفسیاتی دباؤ کا شکار تھی۔ پہننے کو کپڑے اٹھاتی۔ پھر رکھ دیتی۔ کیا فائدہ اچھے کپڑے پہننے کا۔ دنیا میرے لئے ایک گھٹا ٹوپ اندھیری رات بن گئی تھی۔ میرا دل بجھ کر رہ گیا تھا۔

ایک شام میرے شوہر باہر سے آئے۔ چہرے پر بشاشت اور بے فکری کے آثار پیدا کرکے بولے "سنو آج میرا بہت پرانا دوست اچانک صدر میں مل گیا۔ اتنا موٹا تازہ اور خوبصورت جوان بن گیا ہے کہ پہچانا نہیں جاتا۔ پتہ ہے جب ہم اسکول اور کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ تو یہ پھونکنی کے دھکے سے دور گرنے والا سوکھا سا لڑکا تھا۔ بعد میں سنا نظریں نیچی اور گلا صاف کرکے ہاں اسے ٹی۔ بی ہوگئی تھی۔ بڑی بری حالت میں تھا۔ اس کے ایک مالدار چچا نے لگ کر علاج کروایا اب تو ان کا داماد اور کاروبار میں شریک کار ہے۔ تم اسے دیکھو تو یقین نہ کرو کہ اسے کبھی ٹی بی بھی تھی۔

میرے ہونٹوں پر دکھ بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس کے پردے میں درد کا کتنا بڑا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ "ہاں ہاں دیکھو نا اب ٹی بی کوئی لاعلاج مرض تو رہا نہیں۔ جیسے زکام کھانسی ٹائیفائڈ، خسرہ ہو، مغرب میں تو اس مرض کو ذرہ بھر اہمیت نہیں دی جاتی۔"

میں نے منہ پھیر لیا۔ اشاروں، کنایوں میں تم کتنی ہی تسلیاں دیتے ہو، میری بیماری کی چوٹ مندمل نہیں ہو سکتی۔ میں نے اداس ہو کر سوچا۔ میں مانتی ہوں کہ یہ مرض لاعلاج نہیں رہا۔ لیکن ہمارا معاشرہ ایسے لوگوں سے ایسا ڈر کر بھاگتا ہے ۔۔۔ اسے قدم قدم پر احساس دلاتا ہے ۔۔۔ اتنے کچوکے لگاتا ہے کہ مرض سے زیادہ لوگوں کا رویہ مریض کو اپنے آپ سے نفرت اور زندگی سے مایوسی پر مجبور کر دیتا ہے۔

چمکتے دمکتے چہروں والے میرے بچے کمہلا کر رہ گئے۔ شوہر کے لئے بیوی اور بچوں کے لئے ماں کتنی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مجھے اب اندازہ ہوا۔ الماریوں میں سے بے استری کپڑے باہر کو لٹکے رہتے۔ میلے کپڑوں کے ڈھیر جگہ جگہ دھرے رہتے۔ ایک ایک چیز پر مٹی کی دبیز تہیں جم گئی تھیں۔ پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ ڈرائنگ روم میں سگریٹوں کے ٹوٹے، راکھ، کاغذ کے ٹکڑے بکھرے ہوتے۔ پردے اور قالین مٹی، دھول سے اٹ گئے تھے۔ گھر کا یہ حشر دیکھ کر بےبسی کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اللہ یہ وہی گھر ہے جس کے چمکتے فرش میں چہرہ نظر آتا تھا۔

ڈیڑھ مہینہ پلنگ پر لیٹ کر جو ذہنی اور جسمانی تکلیف میں نے اٹھائی الفاظ میں اس کا بیان مشکل ہے، بے دریغ دوائیں استعمال کرنے کے باوجود طبیعت روز بروز گرتی گئی۔ چہرے کی ہڈیاں نکل آئیں۔ سارے کپڑے ڈھیلے ہو گئے۔

ہم نے ایک اور ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ اس نے ایکسرے نئے سرے سے کروائے اور فرمایا۔ "یہ ٹی بی نہیں کوئی اور معاملہ لگتا ہے۔ آپ کو بیاپسی (ایک ٹسٹ) کرانی پڑے گی۔ مجھے کینسر کا شک ہے۔"

دوپہر کا وقت تھا۔ میرے شوہر ستے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر آئے۔ میری والدہ سے باتیں کرنے لگے، ان کی گھٹی گھٹی سسکیاں سن کر میں آہستہ سے دروازے کے پاس آ کھڑی ہوئی میری ماں دھیمی آواز میں فریاد کناں تھیں۔ "ائے اللہ اب کیا ہوگا۔ بیٹے اس بڑھاپے میں میں جوان بیٹی کا سانحہ کبھی نہ سہار سکوں گی۔ میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔"

میں جان سے لرز گئی۔ کیا مجھے کینسر ہے اوہ خدایا یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ میں دونوں ہاتھوں سے دل کو تھامتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔

میری ماں باہر آئیں۔ میں لپک کر ان کے گلے لگ گئی اور ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئی جیسے یہ پُر شفقت گود مجھے پھر کبھی نہیں ملے گی۔

میرے شوہر اس ملک میں میرا علاج کرنے پر رضامند نہیں تھے۔ ہماری مالی حالت اتنی نہیں تھی کہ باہر جانا آسان ہوتا، پیسے، ویزا اور سفر کے باقی انتظامات کے لئے بھاگتے دوڑتے وہ بے چارے ادھ موئے ہو گئے۔ کاروبار سارا چوپٹ ہو کر رہ گیا۔ عیادت کے لئے آنے والوں سے گھر بھرا رہتا۔ کوئی کوئی صحیح معنوں میں غمگسار ہوتا۔ لیکن اکثر لوگ سارا دن کھاتے پیتے، میری صحت کے بارے میں میرے منہ پر خوفناک تبصرے کر کے ہنستے کھیلتے رخصت ہو جاتے۔

ایک ملنے والی نے کسی بہت ہی پہنچے ہوئے حکیم کا پتہ دیا جو زبان پر کاغذ رکھ کر کسوٹی گھماتا ہوا ہر مرض کا پتہ لگا لیتا ہے۔ میں کسی کو بتائے بغیر ان کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھی اور حکیم کے مطب پر گرتی پڑتی پہنچ گئی کہ جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو تنکے کے سہارے کو بھی غنیمت جانتا ہے۔ حکیم نے بیماریوں کی پلیٹ پر کسوٹی گھما کر بتایا۔ "بی بی تمہارے پھیپھڑے خراب ہیں۔ سینے پر بلغم کی تہہ جمی ہوئی ہے، کان خراب ہو چکے ہیں۔ بینائی ختم ہو رہی ہے، بدن میں خون خشک ہو رہا ہے، جگر، لبلبہ، تلی سب خراب ہے شوگر اور بلڈ پریشر کے بھی آثار شروع ہو چکے ہیں۔"

جب تک میرے جسم کے ایک ایک حصے کی تباہی کی خوشخبریاں بیان ہوتی رہیں میں لرزہ براندام بیٹھی رہی، حکیم صاحب سانس لینے کو رکے تو میں نے رقت سے کہا "حکیم صاحب جسم کا کوئی ایسا حصہ بھی ہے جو بیماریوں سے متاثر نہ ہو سکا۔"

"بیٹی فی الحال تو کوئی نہیں ویسے تم پرواہ نہ کرو اللہ بہتر کرے گا۔ یہ گولیاں، دو تین مہینے لگ کر علاج کرو۔ چینی، گوشت، دودھ، پھل، مچھلی، روٹی سب بند۔"

"حکیم جی میں تو پہلے ہی سے مر رہی ہوں۔ یہ ڈائٹنگ کروں گی تو یہ تھوڑی سی زندگی بھی لمحوں میں سمٹ آئے گی۔"

جو تھوڑی جان تھی حکیم جی کے اس جملے نے لے لی۔ ٹی بی کے بعد کینسر کا سن کر میرے اندر نفسیاتی طور پر سخت ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی تھی۔ موت کے فرشتے کی دھیمی دھیمی چاپ اپنے قریب آتی محسوس کر کے مجھ میں زندگی کی تمنا شدت سے جاگ اٹھی۔ خدایا۔۔۔ روٹھ کر جانے والی زندگی کو کیسے منا لاؤں۔

جب میں تندرست تھی) تو میرے بچے اسکول جانے کے وقت مجھے نچا دیتے تھے "۔ امّی میری ٹائی نہیں مل رہی، امی میری جرابیں نہیں مل رہی ہیں۔ امّی .... دیکھیں نا قمیض کا کالر پریس نہیں ہوا، پلیز جلدی سے استری کر دیں "

شوہر چیختے "ارے بھئی بیگم یہ بنیائن کمبخت کہاں غائب ہوگئی آکر ڈھونڈھ دو۔ ارے سنتی ہو وہ میرا گرے سوٹ جھٹ پٹ استری کر دو۔ اور سُرخ ٹائی نکالو۔ بوٹ کالے لانا۔ اُف توبہ یہ گھر ہے اب کنگھی غائب ہے۔

میں ایک ایک چیز ڈھونڈ کر ہر ایک کو پہنچاتی، سب چلے جاتے تو میں سکھ کا سانس لیتی۔ مگر اب ہر صبح اتنی دبے پاؤں آتی ایسے میکانکی انداز میں ہر کوئی اپنا کام نبٹاتا کہ میں حیران رہ جاتی ایک دن دل نہ مانا میں آہستہ آہستہ بچوں کے کمرے میں گئی۔ ایک بیٹا تولیہ لپیٹے جلدی جلدی پتلون پر الٹی سیدھی استری پھیر رہا تھا کریز جمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ چھوٹا بیٹا گلے میں لٹکی ٹائی سے الجھا ہوا تھا۔۔۔ آستینوں کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ قمیض اور پتلون میلی ہو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "۔ لاؤ بیٹا میں تیار کر دوں تمہیں "

" نہیں .... نہیں امی۔ پاپا کہتے ہیں امی بہت بیمار ہیں میں آپ کو تنگ نہیں کروں گا۔ دیکھئے نا کوشش تو کر رہا ہوں "

اس چھوٹے سے بچے کا صبر دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ اُف یہ میرا وہی لاڈلا بیٹا ہے جس کی تیاری سو نخروں سے ہوتی تھی۔ بیٹے لاؤ تمہارے بٹن ٹانک دوں۔ اور یہ قمیض بدل لو کتنی میلی ہو رہی ہے "

مجھے دیکھ کر اس کا ضبط ختم ہوگیا۔ بچہ تھا بکھر گیا "امی کوئی کپڑے ملتے ہی نہیں۔ آپ کب ٹھیک ہوں گی۔ اسکول میں مس مارتی ہیں۔ میرا ہوم ورک غلط ہوتا ہے۔ مس کہتی ہے تم نالائق ہوگئے ہو اور کہتی ہیں۔ تم گندے بچے ہو تمہارے کانوں میں میل ہوتا ہے کپڑے بھی گندے ہوتے ہیں۔ تم لیٹ آتے ہو میں کیا کروں امی اس کا ننھا سا سنہرے بالوں والا سر سینے میں چھپائے کتنی ہی دیر آنسو میرے زرد گالوں پر بہتے رہے۔

ایک دن اپنے سارے کپڑے نکال کر میں نے پلنگ پر ڈھیر کر دیئے۔ میں انھیں حسرت سے دیکھتی رہی نہ جانے یہ کس کس کے ہاتھ سے گذریں گے۔ انھیں بانٹ دیا جائے گا۔ ایک بہت خوبصورت ساڑھی جو میں نے حیدر آباد سے بنوائی تھی اسے میں نے ایک بار بھی نہیں پہنا تھا۔ اسے پہننے کو بے اختیار دل چاہا۔ اسے پہن کر میں کتنی ہی دیر اپنے آپ کو دیکھتی رہی کچھ دل میں ہوک سی اٹھی اپنے خشک بال پپڑی جمے ہونٹ پچکے زرد گال اور ویران آنکھیں دیکھ کر میرے دل پر گھونسا پڑا۔ ساڑی اُتار کر دور پھینک دی۔ میں یہ سب اپنے ہاتھ سے بانٹ دوں گی۔ یہ سب اب میرے نصیب میں نہیں ہیں، میں جا رہی ہوں بہت دور۔

لرزتے قدموں سے سارے گھر میں پھرنے لگی۔ ایک ایک چیز کو دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ اس گھر کی ایک ایک اینٹ میں میرے ارمانوں کی دنیا آباد ہے میرے تصور میں ایک دوسری عورت ابھر آئی جو اس سجے سجائے گھر پر قابض ہو جائے گی میرے بچے ادھر اُدھر ہراساں اور خوفزدہ پھریں گے۔ چھوٹی بچی سارے گھر میں امی امی پکارتی روتی رہے گی۔

دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر میں چیخ پڑی "۔ اے خدا رحم کر۔ مجھے بچالے اپنے بچوں کے لئے "

جمعدارنی اور کپڑے دھونے والی روز پیچھے پڑی رہتی تھیں کہ کپڑے دو۔ کوئی اچھا سوٹ دو، جوتے دو، اور میں ان کے ہر روز کے مانگنے پر جھنجھلا جاتی کہ تم تو پہنے کپڑے بھی اتروا لو، اس دن اپنے نئے نئے سوٹ اور جوتے ان میں تقسیم کیئے تو حیرت سے ان کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ دوسرے دن لندن کا ویزا اور ٹکٹ وغیرہ آگئے۔ جیسے شمع بجھنے سے پہلے تیز روشنی دینے لگتی ہے اسی طرح مجھ میں عجیب طاقت آگئی۔ چادر اوڑھ کر میں مختلف سڑکوں سے گذرتی ہوئی بازار میں آگئی۔ سڑکوں پر لوگوں کا اژدھام تھا۔ ہنستے مسکراتے بے فکر چہرے، کوئی بھی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میرا دل چاہا کہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی ہو کر چیخوں "لوگو دیکھو مجھ چراغ سحری کو میں تیز ہوا کے دوش پر رکھا چراغ ہوں جو بجھا ہی چاہتا ہے۔ مجھے الوداع کہو۔ میں پھر نہیں آؤں گی "

ایک ایک راستے، عمارت اور جانے پہچانے چہروں کو آنکھوں کے راستے دل میں اُتار کر میں نے بچوں کے لئے ڈھیروں کھلونے اور ٹافیاں لیں اور چپکے سے واپس آگئی۔ اس ساری شام کو میں بچوں

کو باہنوں میں سمیٹے بیٹھی رہی، ان کی چھوٹی چھوٹی فرمائشیں سنیں ڈھیروں نصیحتیں کیں۔ اس وقت دل چاہا کہ وقت کی گردش تھم جائے۔ صور اسرافیل پھونک کر دنیا اسی وقت ختم ہوجائے۔ لمحہ لمحہ نزدیک آتی موت کسی گہری کھائی میں غرق ہوجائے اور مجھے کوئی زندگی کے چند سال مستعار دے دے تاکہ میرے بچے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہوجائیں۔

"امی۔ امی میں راتوں کو اٹھ کر خدا سے آپ کے لئے دعائیں مانگتا ہوں۔ ہم سے اسکول کا کام کبھی نہیں ہوتا۔ ٹیچر سوال پوچھتا ہے ہمارا دماغ آپ میں اُلجھا رہتا ہے وہ غصہ کرتے ہیں اور لڑکے ہنسنے لگتے ہیں پر ہم کیا کریں"۔ اپنے آنسو سے بھیگے گال میرے منہ سے لگا کر میرا ننھا بیٹا سسک اٹھا۔ اسے تسلی دیتے ہوئے شدت ضبط سے میرا کمزور جسم لرزنے لگا۔

دوسرے دن ہم روانہ ہوگئے۔ اپنے شہر، اپنے وطن، اپنے عزیز، اپنے بچوں اور ماں باپ سے جدا ہوتے ہوئے نہ مجھے ضبط کا یارا نہ رہا۔ میں نے ہنسی کا جو کچا بند اپنے اندر اُبلتے جذبات کے لاوے پر باندھ رکھا تھا۔ ماں سے گلے ملتے ہی رنج و غم کے اس تیز طوفانی ریلے کو نہ سہار سکا۔ آگ کا سمندر چاروں طرف پھیل گیا۔ میری ہستی جھلسنے لگی۔ اور میں سسک سسک کر رونے لگی۔ جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ زندگی مسکراتی ہوئی محوِ رقص تھی۔ میں خوفناک طوفان کے تھپیڑوں تلے موت کے استقبال کو اکیلی، خالی ہاتھ تنہا رہ گئی تھی۔ جہاز سے اتری۔ روشنیوں سے نہایا یہ وہی ہیتھرو ایئرپورٹ تھا جہاں پہلی بار اتر کر خوشی اور اشتیاق سے میرا دل سینے کے باہر نکل آنے کے لئے مچلا تھا۔ یہاں تین سال پہلے گذرا وقت یاد آگیا۔ بڑے بڑے اسٹورز، سیرگاہوں اور سڑکوں پر رات گئے ہم دونوں مارے مارے پھرتے تھے یا پھر کسی پب میں کوک کی چسکیاں لے کر انگریز جوڑوں کی بے ہودہ حرکتوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ شاپنگ کے لئے آکسفورڈ اسٹریٹ کی بڑی بڑی دکانوں میں میں باؤلی ہوکر پھرتی تھی۔ شوہر کہتے "چھوڑو بھی اب کوئی آخری بار تو ہے نہیں، میں انشاء اللہ دوبارہ تمہیں لاؤں گا۔ تب خوب جی بھر کر میری جیب ادھیڑنا"!

اب میں آئی بھی تو بھربھری مٹی کا ڈھے جانے والا وجود لے کر دوسرے دن سے ہسپتالوں کے پھیرے شروع ہوئے۔ جب تک ٹیسٹ، ایکسرے، ڈیپ ایکسرے اور باقی چیک اپ ہوتے رہے، ہم دونوں میاں بیوی یقین اور بے یقینی کی ایک ایسی کشتی میں ڈولتے رہے۔ جو کسی بھی لمحے ہولناک طوفان کی خونیں موجوں میں ڈوب سکتی ہے۔ زندگی یا موت۔ مہیب اندھیروں میں گم ہونے کی سزا یا ہنستی مسکراتی صبح نو کی نوید، پندرہ دن گذر گئے۔ پھر اس روز ڈاکٹر کو آخری رائے دینا تھی، ساری رات ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں ملاتے رہے۔ اللہ کے حضور جھک کر میں نے آخری بار دعا کی اور فیصلہ اسی پر چھوڑ کر اپنا تھکا ہوا وجود بستر پر ڈال دیا۔ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہوئے میرے قدم ایسے لرز رہے تھے۔ جیسے قتل کا مجرم رحم کی اپیل کا فیصلہ سننے جا رہا ہو۔ "مسٹر آپ کی بیگم کو ٹی بی یا کینسر کوئی مرض نہیں۔ بس یہ خون کی شدید کمی کا شکار ہیں۔ اتنی مدت تک غلط علاج اور نفسیاتی دباؤ کا شکار رہ کر ان کی حالت مزید خراب کر دی گئی ہے۔ ہم ان کے لئے چند دوائیں، ورزش اور چند دن فزیو تھراپی کا علاج تجویز کریں گے"۔

میرے ذہن میں آتش بازی چھوٹنے لگی رنگ ہی رنگ، روشنی ہی روشنی۔ اپیل منظور ہوگئی تھی۔ قتل کا ملزم باعزت طور پر بری ہوچکا تھا۔ ڈاکٹر سے میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ بس ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ گرتی پڑتی ہانپتی کانپتی موٹر کی سیٹ پر گر کر میں لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ میرے شوہر آکر ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھے اور دونوں کی نظریں ملیں، پہلے کچھ سوچتے رہے گم سم مضطرب خاموش اچانک میرے شوہر سٹیرنگ پر سر رکھ کر سسکیاں لے لے کر رونے لگے۔ میں بھی آنسو بہانے لگی۔ پھر انھوں نے سر اٹھایا۔ اس دفعہ ہم دونوں اتنی زور سے ہنسے کہ دور جاتے مریض چونک کر ہماری جانب دیکھنے لگے۔

مجھے اچانک یاد آیا "ارے مجھے تو اپنے لئے سوئیٹر لینا ہے۔ تھوڑا میک اپ کا سامان بھی اور ہاں بچوں کے لئے مارک اینڈ اسپنسر سے ٹی شرٹس اور اسکول یونیفارم بھی"۔ میرے شوہر کی نظریں اپنی جیب کی طرف چلی گئیں اور اچانک سنجیدہ ہو گئے۔

• حریم کے لئے مضامین بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ مضمون پسند آنے پر ہی شائع ہوسکے گا۔ احتیاطاً واپسی کے لئے ٹکٹ ضرور روانہ فرمائیں۔

اسلام میں عورت کا مقام

بیگم ہوشیار جنگ

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام سے پہلے معاشرے میں عورت کو کوئی مقام حاصل نہ تھا۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں نہ صرف محکوم اور دست نگر تھی بلکہ اپنی ذاتی ملکیت پر تصرف تک سے محروم تھی۔

رومی قانون کی نگاہ میں عورت اس قدر حقیر تھی کہ باپ یا شوہر جب چاہتا تھا اس کو گھر سے نکال دیتا تھا حتیٰ کہ شوہر کو قتل تک کر دینے کی اجازت تھی۔

یہودی مذہب نے عورت کو اس جرم میں کہ اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا۔ مردوں کو محکوم بنادیا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم نے دھوکہ نہیں کھایا۔ بلکہ عورت کے فریب میں آکر گناہ کے مرتکب ہوئے۔ ہندو مذہب میں عورت کی حالت نہایت ابتر تھی وہ ہر حالت میں محکومانہ زندگی بسر کرتی تھی یہاں تک کہ عقد ثانی کی اجازت نہ تھی بلکہ شوہر کی نعش کے ساتھ ہی اسے بھی زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ بدھ مذہب نے عورت کو بدی کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ ایران میں عورت کی حیثیت ایک کنیز سے زیادہ نہ تھی اور عرب میں تو لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ ان پُر آشوب حالات میں جب آفتاب رسالت طلوع ہوا۔ اور حق کی روشنی پھیلی تو اس نے عورت کو مرد کے لئے ایک نعمت قرار دیا اور اس کے ساتھ حسن سلوک، حسن معاشرہ اور حسنِ اخلاق کی تاکید کی۔ ماں، بہن، بیٹی، بہو، اور بیوی کی حیثیت سے اس کے حقوق مقرر کئے وراثت میں بھی اس کو شریک کیا۔ اور مرد و عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا۔ میاں بیوی کے باہمی حقوق کے بارے میں واضح کیا کہ عورتوں کا مردوں پر اتنا ہی حق ہے جتنا کہ مردوں کا عورتوں پر ہے۔ حقوق کے اعتبار سے دونوں کو برابر کا رتبہ دیا اور مردوں کو خاص طور پر ہدایت فرمائی کہ ان سے نرمی کا برتاؤ کریں۔ رسول کریم نے فرمایا تم میں نیک آدمی وہ ہے جو اپنی بیوی سے بھلائی کرے اور حسنِ سلوک سے پیش آئے۔ تاریخ اسلام اس پر گواہ ہے کہ عورت نے آفتاب اسلام کی ضیا پاشیوں سے فیض حاصل کرکے زندگی کے علمی میدان میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قرآن کریم کی حافظ تھیں۔ اور تقریباً ۲ ہزار ۲ سو دس احادیث ان سے مروی ہیں حضرت جویریہؓ کے علم و فضل کا یہ عالم تھا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن عمر جیسے جلیل القدر اکابر آپ کی شاگردی پر فخر محسوس کیا کرتے تھے۔ حضرت آمنہ قرآن و حدیث و فقہ کی عالمہ تھیں۔ حضرت ام ربیعہ امام مالک اور حسن بصریؒ کی استاد تھیں۔ غزوہ احد میں ام سلیمہ اپنی پیٹھ پر پانی کے مشکیزے اٹھاکر زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں اور اسی غزوہ میں ام عمارہ رسول اکرم پر دشمن کے حملہ کو روکتی تھیں۔

پانچویں صدی ہجری میں فخر النسا رجامعہ بغداد میں تاریخ ادب عربی کا درس دیتی تھیں۔ حضرت رابعہؒ بصری اپنی علمی فضیلت کی وجہ سے تاج الرجال کے نام سے مشہور تھیں۔

عائشہ بنت احمد قرطبی اپنے زمانے کی بلند مرتبہ عالمہ تھیں اور شاہان اندلس سے براہ راست خطاب کرتی تھیں۔ اسی طرح خالدہ ادیب خانم وزارت تعلیم کے عہدے پر مدتوں فائز رہیں۔ مصر کی وہ خاتون بھی بھلائی نہیں جا سکتیں جو باوجود دونوں ہاتھ نہ ہونے کے اپنے پاؤں کی گرفت میں قلم پکڑ کر ایسا خوش خط لکھتی تھیں کہ حکومت مصر نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ اسکندریہ میں آج بھی ان کا مقبرہ موجود ہے۔ آج کی عورت بھی اسوۂ صحابیات کی سچی تصویر بن کر کچھ کرنا چاہے تو اس کے لئے گنجائش ہے۔ لیکن افسوس کہ مغربی معاشرے میں ڈوب کر وہ اپنی اہمیت کھو بیٹھی ہے۔ خداوند کریم ہم سب بہنوں کو نیک سیرت اور نیک کردار بننے کی توفیق دے۔ آمین

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی اور انتقال کے سلسلہ میں ہو۔ خبر کم سے کم الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے۔ نمبر خریداری اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ خبر کے ساتھ رکھکر روانا کریں۔ جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد دفتر میں وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کتابت کی غلطی کا ذمہ دار ادارہ حریم نہ ہوگا۔ البتہ اطلاع ملنے پر اس کی صحت شائع کر دی جائے گی۔

ولادت اطفال کی خبریں

• میرے عزیز اور پڑوسی جناب بشیر احمد صاحب کے فرزند عزیزی شبیر احمد سلمہٗ و مسز زینت شبیر احمد سلمہ کو اللہ پاک نے شادی کے دس سال بعد بتاریخ ۷ر جولائی ۸۲ء بروز چہارشنبہ بوقت صبح ۶ بجے ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام عمر احمد قرار پایا۔ اللہ پاک عمر دراز دے اور صاحب اقبال بنائے۔

• شا نور یٰس (کلکتہ) میرے تایا سید خورشید حسین کی بچی سلمیٰ سلطانہ کو اللہ تعالیٰ نے تین بیٹیوں کے بعد ۱۶ر جون ۸۲ء بروز چہارشنبہ صبح ۶ بجے ایک بیٹا عطا فرمایا۔ نام سید توحید حسین رکھا گیا۔ اللہ پاک عمر طویل عطا فرمائے اور فخر خاندان بنائے۔

• کشور مصباح (کانپور) میرے دیور نفیس عالم اور بہن نیلو کو اللہ پاک نے ۱۶ر اگست ۸۲ء بروز سوموار تین بجکر ۵ منٹ پر ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ اللہ عمر دراز کرے اور صاحب نصیب بنائے۔

• شمونہ روحی (حیدر آباد) میرے ماموں ڈاکٹر سید خواجہ عبدالوحید صاحب اور مامی ڈاکٹر افتخار زینب کو اللہ پاک نے ۱۰ر جولائی ۸۲ء بروز شنبہ ۵ بجکر ۲۰ منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام سید عبدالرشید عرف ریاض رکھا گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے عمر طویل عطا فرمائے اور فخر خاندان بنے۔

• آصفہ نزہت (کٹک) میرے پھوپھا ابو لطیف صاحب (خریدار حریم) اور پھوپھا ڈاکٹر فضل امین کو اللہ پاک نے ۷ر جولائی ۸۲ء کو ۱۱ بجے شب میں ایک دختر عطا فرمائی۔ نام عرشیہ ہاشمی قرار پایا۔ اللہ تعالیٰ عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

• شمیمہ نسیم درخشاں (آرہ) میری بیٹی عمبر فاطمہ تبسم (نام سمجھ میں نہیں آیا۔ جیسا لکھا تھا ویسا ہی لکھدیا گیا) اور میرے خویش ارشد سلمہٗ کو اللہ پاک نے پہلی بار ۲ر جون ۸۲ء کو صبح ۹ بجے ایک دختر عطا فرمائی۔ نام ماوری ترنم تجویز ہوا۔ دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور صاحب نصیب بنے۔

• نجم النساء پیرزادہ (کرلا۔ بمبئی) میری بھانجی نزہت سلطانہ اور داماد سعید راہی کو اللہ پاک نے ۱۴ر جولائی ۸۲ء کی شب میں ۱۲ بجکر ۱۰ منٹ پر ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر خضر عطا فرمائے اور صاحب نصیب بنائے۔

• رخشندہ تغزل (کانپور) میری آپی ناہید تبسم و بہنوئی عبدالحق علی خاں کو اللہ تعالیٰ نے ۱۲ر جون ۸۲ء کو دو بجے ایک فرزند سے نوازا۔ دعا ہے کہ عمر خضر پائے اور فخر خاندان بنے۔

• بعض خبروں میں وقت لکھا گیا۔ رات دن کی تخصیص نہیں کی گئی جو ضروری ہوتی ہے۔

پیغامات نشاط

• رفیعہ یاسمین (. . . .) میری پھوپھی زاد بہن شاہینہ پروین (دختر علی منظر صاحب) کی شادی شوکت علی (پسر علی رضا صاحب مرحوم) کے ساتھ ۸ر جون ۸۲ء کو بمقام بیلا۔ اور پھوپھی زاد بھائی آفتاب عالم منظری (پسر علی منظر صاحب) کی شادی نکہت جہاں (دختر علی رضا صاحب مرحوم) کے ساتھ ۱۲ر جون ۸۲ء کو بمقام ہرمہ انجام پائیں۔ اللہ مبارک کرے۔

• منور سلطانہ (گلن پیٹ) میری بہن فہیم سلطانہ خریدار حریم (دختر جی۔ کے عبدالوہاب صاحب مرحوم) کی شادی ۳ر جون ۸۲ء کو اعظم علی (ابن مولوی عبدالحمید) کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی اللہ مبارک کرے۔

• نجیبہ مسعود (چکبلاپور) میرے ماموں زاد بھائی سید یوسف عرف مصعب، مقیم جدہ (فرزند سید واسد اللہ) کا عقد لبنیٰ سلطانہ (دختر تاج پیران مرحوم رام نگرم) کے ساتھ ۲۰ رجون ۸۲ء بمقام بنگلور بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• صواتی صبیحہ ہاشمی (آمبور) میری سہیلی وبہن صابرہ بانو کی شادی (بی) کے جاوید احمد بی کام (فرزند ٹی۔ کے محبوب صاحب) کے ساتھ یکم اگست ۸۲ء بروز اتوار بمقام آمبور بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• ثمینہ رشعوانہ دغزالہ (آمبور) ہماری آنٹی فریدہ بانو (بنت جناب وجیندرم عبد الخالق) کی شادی انکل بی بشیر احمد سلمہ (فرزند پی عبد اللہ باشا صاحب) کے ساتھ ۳۰ رمئی ۸۲ء کو بمقام آمبور نہایت سادگی کے ساتھ انجام پائی اللہ مبارک کرے۔

• چیا عبد الجلیل صاحب (آمبور) کی دختر نیک اختر منور سلطانہ سلمہا کا عقد سعید دریا اکبر باشاہ سلمہٗ (فرزند دریا کلام صاحب رشی واندیم) کے ساتھ ۸ راگست ۸۲ء کو بمقام چھوٹی مسجد آمبور انجام پایا۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم امہنوری)

انتقال پُرملال کی خبریں

• میری رشتہ کی خالہ محترمہ وثیق صاحبہ متوطن خوش گڈہ (والدہ ڈاکٹر بدر الاسلام) ایک طویل علالت کے بعد بمقام جوہی کانپور ۱۱ راگست ۸۲ء کو انتقال فرماگئیں۔ مرحومہ بڑی خوبیوں کی مالک تھیں اور مجھ سے اتنی محبت کرتی تھیں کہ میں نے کبھی سگی خالہ سے محرومی کو محسوس نہیں کیا، اللہ پاک انھیں غریق رحمت فرمائے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (نسیم امہنوری)

• نسرین بانو (بیتیا) افسوس صد افسوس کہ میرے چھوٹے چچا سید لئیق احمد ہاشمی، ۱۳ جولائی ۸۲ء بروز منگل بوقت ۸ بجے صبح حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرماگئے ـــــــ اللہ سے دعا ہے کہ انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
(آپ نے جو ٹکٹ روانہ کئے ہیں ان میں ۴۰ پیسے کے ٹکٹ استعمال شدہ نکلے ہیں۔)

• اموات تو ہوتی ہی رہتی ہیں، لیکن بعض ایسی ہوتی ہیں جن پر اپنے تو اپنے غیر بھی آنسو بہاتے رہتے ہیں ایسا ہی دلدوز حادثہ ۳ اگست کو لکھنؤ میں ہوا۔ سید مصباح الدین صاحب مرحوم لکھنؤ کی ہر دلعزیز شخصیت تھے جو زمانہ دراز تک میونسپل بورڈ کے مستقل ایگزیکیوٹیو افسر رہے تھے۔ مرحوم کے ۱۷ سالہ نوجوان نواسے مسعود حسن علوی سلمہ اپنی خالہ زاد بہن کو اپنی اسکوٹر پر اسکول پہنچانے اس لئے گئے کہ رکشے والا نہیں آیا تھا۔ بچی کو اسکول پہنچا کر لوٹے تو اس جگہ ایک سرکاری اسکوٹر سے ٹکرا کر وہیں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ سر پھٹ گیا، ران کی ہڈی ٹوٹ گئی سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ حادثہ سے ایک شب قبل مرحوم اپنے والدین کو لینے کے لئے دہلی جانے والا تھا لیکن مقدر کا پروگرام کینسل ہو جانے سے نہیں گیا تھا، ورنہ یہ حادثہ رونما ہوتا۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مرحوم کے والد اقبال حسین علوی نائیجیریا سے روانہ ہو کر دوسرے ممالک تفریح کے سلسلہ میں چلے گئے تھے اس لئے انھیں اس حادثہ جانکاہ کی خبر بھی نہ مل سکی معلوم ہوا کہ اب مسعود حسن مرحوم کے والدین آنے والے ہیں۔ کیا حال ہوگا ان کا یہاں پہنچ کر جب وہ اس خبر کو سنیں گے۔ اللہ پاک انھیں اور ان کے تمام متعلقین کو صبر عطا فرمائے۔ (شریک غم نسیم امہنوری)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کا مرسلہ صرف ایک شعر ہر ماہ شائع کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ شعر ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ موزوں، پاکیزہ اور معیاری ہو، شعر کے ساتھ اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جو اشعار ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتے ہیں، شامل نہیں کئے جاتے۔ ہر ماہ کا شعر علیحدہ علیحدہ کاغذ پر لکھا ہونا ضروری ہے۔ اکتوبر کے لئے عنوان ہے "ادا" اور نومبر کے لئے "ندامت"

ہونٹوں کی مسکراہٹ بیچو خرید لوں گا
منظور ہو تو بولو انمول دام دوں گا

مرسلہ۔ کشور سلطانہ (لال باغ لکھنؤ)

صیاد بھی ہیں شاد عنادل بھی مطمئن
ہے کون زیر دام ابھی زیر غور ہے

مرسلہ۔ قرۃ العین (نندیال)

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا میں حلقۂ دام وفا لئے

مرسلہ۔ فیروزہ بی (اندور)

گلشن کی فضاؤں میں چہکتے ہیں عنادل
اک مرغ تہ دام غزل خواں نہیں ہوتا

مرسلہ۔ نجمہ انصار مٹا (کٹنگل)

خانقاہوں میں جو قالین سجا رکھے ہیں
دام ہمرنگ زمیں تہ میں بچھا رکھے ہیں

مرسلہ۔ عصمت آرا (بانسکا)

انمول سہی، نایاب سہی، بے دام و درم بک جاتے ہیں
بس پیار ہمارا قیمت ہے مل جائے تو ہم بک جاتے ہیں

مرسلہ۔ نگار سلطانہ خلیلی، قمر لطیف (آمبور)

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

مرسلہ۔ مسز فیروز قسیم اشرفی (کلکتہ)

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

مرسلہ۔ مس شاہینہ (دہلی)

دام دنیا نے ہم کو گھیرا ہے
دل میں مکر و ریا کا ڈیرا ہے

مرسلہ۔ نیلوفر فردوس (بیتول)

اب تک ہوں تیری زلف گرہ گیر کا اسیر
یعنی کسی کے دام میں آیا نہیں ہنوز

مرسلہ۔ بی عظمت فاروق (آمبور)

تیرے گیسو کے خم و پیچ معطر کی قسم
پھر مرا ہوش بنا حلقۂ صد دام بلا

مرسلہ۔ مسلمہ بی (رامپور)

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

مرسلہ۔ ریشماں۔ ہردوئی

بس ایک آہ جہاں سوز کے اثر تک ہیں
یہ خار، برق، قفس، دام آسماں صیاد

مرسلہ۔ راحت (کرنول)

تو اتنے دن تک اپنا سامنا نہ کر سکا:

معافی اس سے مانگئے جسے آپ سے کوئی شکایت ہو: کہکشاں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ اور ان سے نظریں چرانے لگی: آپ سے کیا شکایت۔ کچھ غلط تو نہیں کہا تھا آپ نے۔ حقیقت کے اظہار میں شرمندگی کیسی؟:

ہو گی ضرور ہی [illegible] کی بات: غضنفر نے [illegible] اٹھا کر زبردستی اپنی آغوش میں گرا لیا: جب تک تم یہ نہ کہو گی کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ تب تک میں نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔ فاقے کر دوں گا۔ حتیٰ کہ مر جاؤں گا بھوکا پیاسا۔ تم دیکھ ہی لینا۔!"

واہ یہ آپ کی اچھی زبردستی ہے۔ ماریں اور رونے نہ دیں: اس نے اوپری دل سے اور بڑے ناز سے جواب دیا۔ جبکہ دل خون ہو رہا تھا۔ دل بھر آ رہا تھا۔ اب یہ جو پچھلا اظہار محبت کا ڈھونگ سب کچھ بیکار ہے۔ حقیقت کو انھوں نے آئینہ دکھا دیا تھا۔ اب وہ نمایاں ہو چکی تھی۔ اب اس کی کوئی عزت کوئی وقعت نہ رہی تھی۔ وہ ان کے نزدیک ایسی لڑکی تھی۔ جس نے انھیں پھانس لیا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو کوئی اور ہوتا۔ آخر اس کی نظر انتخاب ان ہی پر کیوں پڑی تھی۔ وہاں تو صبح سے شام تک مختلف لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا [illegible]۔ چاہے سیل مصائب اس پر سے گزر جاتا۔ اس نے ایک غیر مرد کی مدد چاہی کیوں تھی؟۔ باپ کا جنازہ پڑا نہ رہتا۔ اور اسے بھی خدا بھول نہ جاتا۔ [illegible] [illegible]۔ وقت کسی کا ہوتا نہیں [illegible]۔ وہ اپنی [illegible]۔ (باقی آئندہ)

پتہ چلا کہ کہکشاں کی سگی خالہ تھیں۔ ان کے بیٹے کا بیاہ تھا وہ اپنی بہن کو نیوتہ دینے آئی تھیں۔ پچھلے گھر پہنچیں تو اس حادثہ کا علم ہوا۔ دیر تک روتی رہیں۔ سدھ بدھ نہ رہی۔

لیکن آپ کو اس گھر کا پتہ کیسے چلا؟: غضنفر کا اتنا کہنا تھا [illegible] سے آئی ہیں اور سیدھی اس جگہ آ دھمکیں۔ تو پھر اس شہر کے لوگوں کو اس گھر کا علم کیسے نہ ہو گا۔؟

ایک ٹھنڈی سانس لے کر انھوں نے جواب دیا: بٹیا کے ہمسائے میں جو کپڑے والے رہتے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا تھا کہ پھر بچیاں کہاں گئیں تب انھوں نے بتایا کہ اس محلے میں انھوں نے ایک دوکان اور کھولی ہے۔ اور انھوں نے تمہیں بیٹے اس گھر میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ سو وہ مجھے یہاں پہنچا گئے۔!"

جی: غضنفر نے کہا۔

پھر بڑی بی پچھلی باتیں کرنے لگیں اور غضنفر کی بہت تعریفیں کیں۔ انھوں نے بے سہارا لڑکیوں کو اتنا سہارا دیا تھا!۔ آخر کار بولیں۔

تم اجازت دو۔ بیٹے تو میں انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ مجھے تو تمہیں بھی نیوتہ دینا تھا۔ مگر وہی بات ہے کہ میرا دروازہ اتنا اونچا نہیں جس سے ہاتھی گزر سکے۔ ویسے گھر تمہارا ہے۔ تم ساتھ چلو گے تو میرے بھاگ کھل جائیں گے!:

میں ضرور چلتا: غضنفر نے دل ہی دل میں اطمینان کی سانس لی: لیکن میرا امتحان نزدیک ہے۔ آپ بصد شوق انھیں لے جائیے۔! لیکن پھر براہ کرم واپس جلد پہنچا جائیے گا:

کہکشاں کے چہرے پر [illegible] اور ناگواری کے آثار تھے۔ [illegible]

غضنفر سے کہا۔

"میں اُن سے الگ ہو کے چل پھر نہیں سکتی۔ اور آپ سے علیحدہ رہ بھی نہ سکوں گی۔ کہکشاں کو جانے دیجئے۔ گھر میں نہیں جاؤں گی۔ وہاں جی نہ لگے گا؛"

"مگر میں نے تو وعدہ کر لیا ہے؛" غضنفر نے اپنی جھلاہٹ پر ضبط کر کے کہا "تو کیا ہوا۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں اس زمانے میں کہکشاں کو شہر ہی میں رکھنا چاہتا ہوں!؛"

"لیکن تم چلی ہی کیوں نہ جاؤ۔ شانی۔ تمہیں خاص دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ اور یہاں ایسا تجربہ کار کون ہے۔ جو ان دنوں باقاعدہ تمہاری خبر گیری کر سکے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ تم چلی جاؤ۔!"

"آپ کو نہیں معلوم۔ خالہ جان اتنی خوشحال نہیں ہیں کہ میری کچھ دیکھ بھال کر سکیں۔ آخر اس سلسلہ میں کچھ زیادہ اخراجات تو ہوں گے ہی نا؛"

"تم چلی جاتیں تو میری ایک پریشانی تو کم از کم دور ہو جاتی؛"

"آپ چاہتے ہیں۔ میں کسی طرح اپنا بوجھ سمیٹے آپ کی نظروں سے دور ہو جاؤں؛"

"یہ مطلب نہیں تھا؛"

"تو پھر کیوں آپ بار بار زور دے رہے ہیں!"

"کیا تمہیں اتنا نہیں معلوم شانی کہ ان دنوں۔۔!"

کہکشاں نے ناخوشگوار انداز میں بات کاٹ دی؛ "مجھے سب معلوم ہے آپ کو کچھ کرنا نہیں ہے نا۔ کیا میں فرمائشیں کر رہی ہوں کہ مجھے خاص کر کے اچھی اچھی چیزیں چاہئیں!!"

رہا تھا۔ لب نیم وا تھے اور ہلکی ہلکی سانسوں سے لگتا تھا وہ بے اطمینانی کی نیند تھی۔ ملگجے سے سوتی لباس میں لپٹی۔ بال بکھرے ہوئے عجیب بسی ہوئی لٹی بکھری بکھری ہو رہی تھی!

کیا سوچتی ہو گی دل میں غضنفر کو دکھ ہونے لگا۔ چار دن ہو چکے۔ میں نے اس کی خبر نہیں لی۔ یہ بڑی ہی کمینگی ہے۔ یہ ظلم انہیں سزا دینا تھا اب تو وہ غریب انہی کے رحم و کرم پر تھی۔ یہ وقت تو عورتوں کا بڑے آرام اور ذہنی یکسوئی کا ہوا کرتا ہے۔ اس بے چاری کو ذرا بھر سکون نصیب نہیں۔

"شانی؛" انھوں نے اس کے بالوں میں انگلیاں الجھا کر بے حد پیار سے آواز دی۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ غضنفر کو ایک جہان آرزو ان آنکھوں میں ابھرتا نظر آیا۔

"اتنی بھی بے خبری کیا کہ میرے آنے پر بھی نہیں چونکیں؛" غضنفر نے پیار سے اس کے دونوں رخسار اپنے ہاتھوں میں دبا لیے۔ "کیسی طبیعت ہے سو کیوں گئی تھیں؟؛"

اس نے پلکیں بند کیں اور دو موٹے موٹے آنسو ادھر ادھر ڈھلک گئے۔ اس سے بہتر شکوہ اسے دوسرا کوئی دکھائی نہ دیا۔

"شانی!؛" غضنفر نے اپنا بوجھ اس کے کندھے پر ڈال دیا اور رقت پاش لہجے میں بولے؛ "معاف کر دو مجھے۔ نجانے اس دن کیا کچھ اول جلول باتیں میرے منہ سے نکل گئی تھیں۔ انہیں بھول جاؤ۔ میں تم سے بہت شرمندہ تھا اسی لیے

توشینہ کے سر پہ اپنا راز لاد کے وہ ہلکے ہوگئے۔ اس نے بھائی پر رحم کھا کے انھیں ہزار روپے گن دیے۔!

پیسا انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

غضنفر کے ہاتھ میں ایک قلیل رقم آئی تھی مگر وہ خود کو قارون سمجھ رہے تھے!۔ چھوٹی موٹی مشکلیں حل ہوسکتی تھیں!۔ اب پھر انھیں دنیا رنگین معلوم ہو رہی تھی۔ دل میں پھر تمنائیں مچلنے لگی تھیں۔ تقدیر نے جب ہر طرح کا سکھ دے رکھا ہے تو اس سے مستفید نہ ہونا کفرانِ نعمت ہی تو ہے۔!

یونیورسٹی میں لمبے لمبے فصل سے پریکٹیکل چل رہے تھے لہٰذا وہ ایک بجے کہکشاں کے پاس پہونچے۔ بہت سے خشک و تر پھل خرید لیے تھے۔ جام جیلی کے ڈبے لیے تھے۔ اور بڑے خوشگوار رعب سے گھر میں داخل ہوئے۔!

وہ اور نہیں تھے۔ ان کی طرف کا حصہ کھلا ہوا تھا اور جالی دار برآمدے میں دری بچھائے کہکشاں لیٹی تھی!۔ وہ چپکے سے اس کے پاس جا بیٹھے۔ اور کندھے پہ جھک کر اس کا چہرہ جھانکا!۔ ایک شریر خیال دل میں آیا تھا کہ ناک میں تنکا پھیریں اور کسی نہ کسی طرح اسے منالیں گے۔ لیکن اس کا چہرہ دیکھا تو ہنسانے میں رہ گئے۔ وہ کسی مردے کا چہرہ لگ رہا تھا۔ بے رنگ بے رونق اور پھیکا سا چہرہ سوکھے ہوئے گالوں پر آنسوؤں کے نشانات واضح تھے۔ شاید وہ روتے روتے سو گئی تھی۔ ابھی تک آنسو کا ایک آدھ ننھا سا تارہ پلکوں میں چمک

عجیب قسم کی باتیں کر رہی ہو کہکشاں؟" غضنفر اس کی تبدیلی کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ پھر بولے "تم زچا ہو تھیں۔ مگر میں تو اپنی جگہ چاہتا ہوں کہ تمھیں آرام ملے۔ ڈھنگ سے غذا اور دوا نصیب ہو۔ میں نے سنا ہے کہ ایسے حالات میں ہر فکر و غم سے آزاد رہنا چاہیے۔ ورنہ اس کا اثر خدانخواستہ بچے پر۔!"

"کچھ اثر وثر نہیں ہوتا" وہ تیوری بدلے رہی "جس نے ایسے حالات سے نوازا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تمھیں علاوہ غذا اور زود اثر دوائیں عمر بھر نصیب نہیں ہوسکیں۔ زندگی جب بیماری کی رات ہوگئی ہے تو پھر مرنا جینا سب برابر ہے"

"اچھا میں اب سمجھا کہ میری زیادتی کو تم نے اتنے دنوں بعد محسوس کیا ہے ورنہ ایسی جلی کٹی باتیں تو تم نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ آج کیا ہوا ہے؟"

"آپ کے لہجے سے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ اپنی جذباتیت کو آپ ان دنوں بہت زیادہ محسوس کرنے لگے ہیں"

"بخدا یہ الزام ہے مجھ پر۔ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا"

"تو پھر آپ اس قدر کھوئے کھوئے کیوں رہتے ہیں؟"

"وہ میری اپنی باتیں ہیں"

"اور آپ کی وہ باتیں مجھ سے راز رہیں گی۔؟"

"نہیں تو، مگر۔!"

میں ہمیشہ آپ کے سامنے شرمندہ رہا۔ مجھے شدید پچھتاوا رہا کہ میٹھے بچھانے

میں نے آپ کو کون سی مصیبت میں ڈالا ہے۔ ندامت نے مجھے آپ کا زیادہ سے زیادہ گرویدہ بنایا۔ میں نے آپ کی ہر فکر کو دور کرنے کی کوشش کی۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے لیے اچھے کھانے کی اچھے کپڑوں کی فکر مت کیجئے میں تو ادکی روٹی نمک کے ساتھ کھا کے بھی گزارہ کر سکتی ہوں۔ میں سڑک کے کنارے پھوس کے جھونپڑے میں بھی سر چھپا سکتی ہوں۔ مگر آپ۔!

مگر میں اتنا فقیر مفلس اور بے حوصلہ ہوں کہ بس تمہیں روٹی اور نمک اور پھوس کی جھونپڑی ہی دے سکتا ہوں۔ نہ میرے دن کبھی بدلیں گے اور نہ میں کوئی انتظام ایسا کر سکوں گا جو تمہارے شایان شان ہو۔ اچھی بات ہے کہکشاں یاد رکھنا کہ حالات پر اس طرح شاکر ہو جانا بھی ایک قسم کی شکایت ہی ہے!: غضنفر کی زبان بھی زہریلی ہو گئی۔

شکایت تو مجھے ہے ہی اور ہمیشہ رہے گی۔ آپ نے مجھے اتنا گرا ہوا کم ظرف سمجھا ہے کہ میں آپ کی پریشانیوں میں بھی حصہ نہیں بٹا سکتی!: کہکشاں نے جواب دیا۔

میں نے کہہ تو دیا کہ۔ وہ باتیں صرف میری ذات سے تعلق رکھتی ہیں!: غضنفر بولے۔

اور میری ذات سے آپ کو کوئی تعلق نہیں۔؟

وہ کچھ میرے والدین اور کنبہ خاندانوں سے تعلق رکھنے والی بات ہے تم وہ سب سن کے کیا کرو گی؟:

مجھے خوشی تو ہوگی کہ آپ نے مجھے کسی قابل تو سمجھا ہے کہ اپنی فکر و ملال کو

[illegible]

غضنفر کو اس پر پورا بھروسہ تھا۔ لہٰذا اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور ضمیر کی خلش دور کرنے کے لیے انھوں نے بسم اللہ سے لے کے والسلام تک پوری کتاب نوشینہ کے سامنے کھول کر رکھ دی۔!

نوشینہ کا یہ حال تھا جیسے جادو کے زور سے اسے کسی نے بت بنا دیا ہو۔ سفید پڑ گئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا اور ہونٹ منہ خشک ہو گئے۔

بڑے بھیا! بالآخر وہ پھولی پھولی سانسوں میں بولی: اب آپ امی کو کیا جواب دیجئے گا۔ آپ کو خبر تک نہیں ہے کہ امی نے پچھلے ہفتہ آپ کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی ہے۔ امی کو آپ جانتے ہیں۔ وہ جان دے دیں گی۔ اپنی آن گھٹنے نہ دیں گی۔ آپ کو تو معلوم تھا کہ سیما سے آپ کی شادی موت کی طرح اٹل ہے۔ پھر آپ نے یہ کیا قیامت ڈھائی ہے۔ اب آپ کیا کریں گے۔ کیا دو دو بیویوں کا بار اٹھائیں گے۔ آخر یہ راز کب تک راز رہے گا۔ اگر بھانڈہ پھوٹ گیا تو پھر۔!؟

اور پیشانی سے بہنے والا پسینہ پونچھتے ہوئے غضنفر نے جواب دیا: میں اسے بہلا پھسلا کر اس کے گاؤں بھجوا دوں گا۔ اور امی سے کہہ دوں گا کہ جب تک میں ملازم نہیں ہو جاتا۔ شادی نہیں کروں گا۔ شاید اس مدت میں کوئی صورت اللہ نکال دے:

ہاں ہاں۔ امی تو آپ کی بات ضرور مانیں گی: طنز سے نوشینہ بولی۔ وہ مطلق العنان ہیں۔ ابا جان کا کہا تو کوئی نہیں ہیں۔ آپ کس شمار میں ہیں!:

فی الحال اس عذاب کو ٹالنا ہے۔ میری بہن۔ وہ عذاب ابھی دور ہے اس کے بعد پھر دیکھیں گے۔! غضنفر نے جھنجھلا کے کہا۔

امی ابو بے تکلف تھے۔!"

آخر کار کیا ہے چبھن کا۔

تو تم نے کبھی ہاتھ اٹھا دیئے۔!"

لا کے دے سکتی ہوں سو روپے۔ میرے پاس زیادہ کہاں سے آئے!"

نوشینہ: غضنفر کی آواز بھرا گئی: "مجھے ایسی ہی شدید ضرورت ہے۔ ورنہ میں تمہارے سامنے ہاتھ نہ پھیلاتا۔ بہن مجھے پندرہ بیس دن کے اندر اندر ایک ہزار روپے کی ضرورت ہے!"

ایک ہزار۔؟" نوشینہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلا دیں۔

ہاں۔ بہن کسی طرح بندوبست کر دو۔ مگر کہنا مت کسی سے۔ میں تمہیں آہستہ آہستہ دے دوں گا۔ حمید بھائی نے اگر کچھ رقم رکھوائی ہو تو اس میں سے دیدو۔!"

نوشینہ سوچنے لگی۔ پھر غور سے ان کا چہرہ دیکھتی ہوئی بولی: "آپ کوئی بات تسمے کے کہنے والے تھے۔ وہ کیا ہے! مجھے بتایئے۔ ورنہ مجھے ایک بے چینی سی لگی رہے گی۔"

غضنفر ہونٹ چبانے لگے۔ اور نوشینہ ان کی طرف دیکھتی رہی۔

"نجانے تم کیا سوچو گی۔ نوشی!"

"کیا کیا ہے آپ نے!؟ کیوں اس قدر بدحواس ہو رہے ہیں۔ بڑے بھیا مجھے سب کچھ بتا دیجئے۔ آپ کو میری جان کی قسم!" نوشینہ نے کہا اور بے ضبط ہو کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نوشینہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ مگر ایک عمدہ اور پسندیدہ صفتیں اس کی ذات میں اکٹھا تھیں۔ وہ غضنفر کی ایسی چھوٹی بہن تھی جس نے ان کا ہمیشہ ساتھ دیا تھا

"نہیں شانی۔ مجھے مجبور مت کرو۔ تمہیں ان پریشانیوں میں حصہ بٹا کے خوشی نہیں ہوگی۔"

"میں سمجھ گئی۔ شاید آپ کے والدین نے آپ کو منع کر دیا ہے۔ میرے پاس آنے سے"

غضنفر بیدلی سے ہنس دیئے: "منع تو اس صورت میں کرتے جبکہ انہیں میری اس حرکت کا پتہ ہوتا!"

"آپ نے کسی کو کچھ نہیں بتایا؟" کہکشاں کے دل پر دھکا لگا۔

"نہیں!"

"کیوں؟" کہکشاں نے گلوگیر لہجے میں کہا: "آپ کو ڈر تھا کہ وہ لوگ مجھے قبول نہیں کریں گے۔ راہ چلتے آپ نے جس کا ہاتھ پکڑ لیا ہے! یہی بات ہے نا!؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے شانی!"

"تو پھر مجھے اپنے لوگوں میں لے چلئے نا۔ آپ مجھے ایک ناپسندیدہ بوجھ کی طرح خالہ جان کے حوالے کیوں کیے دیتے ہیں۔ مجھے اپنے گھر لے چلئے۔ کیا آپ کی پسند کو آپ کی امی قبول نہیں کریں گی۔ اگر میں ان کی بہو ہوں تو کیا وہ تھوڑے دنوں میں میری دیکھ ریکھ نہیں کریں گی۔ بتایئے نا۔ کیا وہ میری ماں نہیں بن سکتیں؟"

"آج تمہیں کیا سودا سوار ہوا ہے کہکشاں!" غضنفر کے دل میں لاوا پھٹنے لگا۔ انہیں غصہ آگیا: "وہ باتیں تم کرید کرید کے کیوں پوچھنا چاہتی ہو۔ جن سے تمہارے لیے دل خوشی کی نہیں ہیں!"

"تو پھر مجھے ایک غلاظت کے ڈھیر کی طرح آپ کب تک الگ تھلگ دوسرے کے گھر میں پڑا رہنے دیں گے۔ آپ کا گھر ہے کہیں، تو مجھے لے چلیے!"

"نہیں!" انھوں نے انکار کر دیا۔

کہکشاں نے سہمی ہوئی لہجے میں کہا: "تو پھر سن لیجئے کہ میں بھی خالہ کے ساتھ نہیں جاؤں گی اور اب یہاں بھی نہیں رہوں گی۔ میں کسی نہ کسی طرح پتہ پوچھتی پوچھتی آپ کے گھر چلی جاؤں گی۔!"

اس کی ضد اور اشتعال انگیز باتوں سے برافروختہ ہو کر بے ساختہ غضنفر نے کہا۔

"ضرور چلی جاؤ۔ ابھی تک کسی کو تمھارے بارے میں معلوم نہیں ہے اگر کوئی پوچھے تو کہہ دینا۔ میں آپ کی وہ بہو ہوں۔ جس نے اپنے باپ کی بیماری کا بہانہ بنا کر آپ کے بیٹے کو پھانس لیا ہے۔ تم میرے گھر ضرور جاؤ۔!"

یہ کہہ کر غضنفر نے قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ تو سناٹے میں رہ گئی تھی گمان تک نہ تھا کہ غضنفر اتنی بڑی بات کہہ گزریں گے! دوسرے لمحے وہ یکبارگی رو پڑی۔ لیکن غضنفر نے اسے منانے یا سمجھانے کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ کمرے سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے چلے گئے!۔

کہکشاں پر بے ہوشی سی طاری تھی! آج غضنفر نے اسے یکبارگی آئینہ دکھا دیا تھا۔ صدمہ اور اہانت کے جانکنی احساس نے اس کی رگ رگ میں شعلے بھر دیے تھے!۔ جو کچھ غضنفر نے کہا تھا کیا وہی سب کچھ دل میں سوچتے نہ ہوں گے؟۔ اب تک جو ان کا سلوک تھا۔ وہ سب تصنع ریاکاری اور دکھاوا نہیں تھا؟!۔

آج اسے صحیح معنوں میں اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ زمین و آسمان میں کوئی پناہ نہیں تھی آج اسے اپنا مضبوط سہارا ہمیشہ کے لیے چھوٹتا ہوا معلوم ہوا تھا۔ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس

"سالے مجھے حمید بھائی دیتے ہیں۔ پیار دیتے ہیں۔ تو حمید بھائی کی جیب سے الگ مارتا ہے اور کنجوس اتنا ہے کہ صرف پچاس روپے کا حساب پوچھتا ہے۔ اچھا اب مجھے کچھ نہیں کہنا"

نوشینہ ہنسنے لگی "بس اتنی سی بات کے لیے سر پر پاؤں ہاتھ رکھ کر دلداری کی قسمیں کھلوا رہے تھے!"

"اب کی ذرا دور کی بات ہے بے"

"یہ ابے تبے کیا۔ شرافت سے کہیے کیا بات ہے؟"

"تیرے پاس کتنے پیسے مرے ہوئے جمع ہیں؟" غضنفر نے پوچھا۔

"مرے ہوئے؟"۔ نوشینہ نے بھنویں تان لیں۔

"ہاں مطلب یہ کہ حمید بھائی کی جیب سے مارے ہوئے"

"بار بار ایسا مت کہیئے۔ اگر کوئی سن لے تو سچ سمجھے گا!۔ آپ نے کب دیکھا پیسے چراتے ہوئے" نوشینہ چڑ گئی۔

"میں کیوں دیکھتا۔ تو ہی ایک دن کہہ رہا تھا کہ وہ بے گنے ہوئے پیسے رکھتے ہیں۔ گنتے ہوئے میں گھٹنے تلے دس بیس کا نوٹ مار لیتی ہوں" غضنفر نے یاد دلایا۔

نوشینہ ہنس دی غضنفر بھی ہنسنے لگے۔ پھر نوشینہ نے پوچھا۔

"اب کتنے پیسوں کی ضرورت ہے۔ فی الحال میرے پاس بہت سے بہت سو ڈیڑھ سو ہوں گے"

"یہ تو اونٹ کے منہ میں زیرہ بن جائیں گے"

"بڑے بھیا آپ کو فضول خرچی کی بہت عادت پڑ گئی ہے" نوشینہ نے ڈانٹ دیا: "امی بھی کہہ رہی تھیں کہ آپ نے ان سے بار بار پیسے مانگے تھے۔ یہ آخر ہے کیا؟"

ہو گیا ہے نا۔ اب کچھ دیر سے آتے ہیں۔

تو تمہیں اعتراض ہے؟!

اللہ آیئے بیٹھئے۔ آپ کچھ بوکھلائے سے نظر آتے ہیں: نوشینہ نے ہاتھ پکڑ کر صوفہ پر بٹھایا اور خود پاس آ بیٹھی۔ کچھ دیر تک وہ خود کو نارمل کرتے رہے پھر مصالحت آمیز طریق پر مسکراتے ہوئے بولے: ابے۔ تجھ سے ایک کام آپڑا ہے:

کام ہی آپڑتا ہے تو شکل دکھاتے ہیں: اس نے منہ بنا لیا۔ یوں کبھی میرے کام سے نہیں آتے۔ اچھا بولیئے:

میں بڑی مصیبت میں پھنسا ہوں۔ یارو۔ تم سے کہنے آیا ہوں مگر میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ کہ میری بات کسی سے کبھی نہ کہو گی:

ہائے اللہ۔ کیا بات ہے۔ جلدی سے کہہ دیجئے۔ آپ نے تو میرا دل نکال لیا۔ نوشینہ گھبرا گئی۔

دل کو مٹھی میں دبوچ لو۔ ورنہ میں جو بات اب کہوں گا اسے سن کر تمہارا نازک نازک دل چڑیا کی طرح پھُر سے اُڑ کر [illegible] پر جا بیٹھے گا: غضنفر نے کہا اور خود کو سنبھالنے کے لیے مسکرائے۔

اچھا تو آپ کو فقط مذاق ہی کرنا ہے: نوشینہ ایک دم بگڑی۔ کہیں الگ چلو اپنے کمرے میں۔

یہاں کوئی سن رہا ہے؟ جلدی سے کہہ چلیے

یار مجھے کچھ پیسے۔ روپوں کی ضرورت ہے۔!

اچھا اس روز آپ نے [illegible] لیے تھے:

نے اب تک صرف غلطیاں ہی غلطیاں کی تھیں اور غلطیوں کے انبار تلے دب کر رہ گئی تھی۔ اب کہیں مداوا نہ تھا!۔ اس کے پچھلے حالات واپس نہیں آسکتے تھے۔ وہ بے شک شہر کے چوک میں جا بیٹھتی، جسم فروشی پہ اتر آتی۔ خودکشی کر لیتی۔ اس نے باپ کی بیماری سے گھبرا کر اس آدمی کی مدد کیوں چاہی تھی جو صرف اس کا صورت آشنا تھا۔ جو غیر تھا۔ اور اس کی وقتی جذباتیت سے متاثر ہو کر اس نے اپنی ساری امانتیں اس کے حوالے کیوں کر دی تھیں۔ نہ اس سے اس کے کنبہ خاندان کا حال پوچھا تھا نہ اپنا حسب نسب اسے بتایا تھا۔ یہ صرف بچوں کا کھیل تو تھا۔ مسجد میں دو نمازیوں کی گواہی میں نکاح ہوا۔ اور وہ گھر والے بن گئے تھے۔ اس کے بعد یہ بوجھ جو اسے بے چین کیے دیتا ہے۔ جیسے ایک پتھر ہو جو جسم میں ادھر ادھر لڑھکتا پھر رہا ہو اس سے کب نجات ہو گی۔!

اس کی گریہ وزاری شدید تھی!۔

ڈولی کمرے میں آئی۔ وہ خالہ کے ساتھ جانے پر بہت خوش تھی مگر کہکشاں کو روتے دیکھ کر اس کے جوش و خروش پر اوس پڑ گئی۔

کیا ہوا۔ باجی۔ غضنفر بھائی کب گئے!:

وہ کچھ نہ بولی۔!

باجی۔ تم روتی کیوں ہو۔ کیا خالہ کے ساتھ جانا نہیں چاہتیں۔

نہیں!:

تو پھر مت جاؤ۔ اس میں رونے دھونے کی کیا بات ہے؟

تم ان کے ساتھ جاؤ ہی ہو ڈولی!

ہاں باجی۔ میرا دل یہاں نہیں لگ رہا۔!
پھر تمہاری [illegible]
[illegible] یہاں نہیں لگتا۔ میرے ساتھ کی لڑکیاں مجھے دیکھ کر ہنستی ہیں کہتی ہیں۔ اتنی بڑی ہو کر پانچویں کلاس میں پڑھ رہی ہو تمہیں تو نویں دسویں میں ہونا چاہیئے تھا:
کہکشاں چپ ہو گئی۔

جیسے تیسے دو تین روز گزر گئے غضنفر نے ادھر کا رخ نہیں کیا۔ داور سے انہیں پتہ چلا کہ خالہ جان اختشان کو لے کر عادل آباد جا چکی تھیں۔
کہکشاں رک گئی تھی!۔

تم اس سے کیوں ناراض ہو بھئی۔ اس غریب کا کیا قصور ہے؟" داور نے پوچھا۔

محترمہ کے جوہر اب کھل رہے ہیں: غضنفر نے ناخوشگوار لہجے میں کہا میں کوس رہا ہوں اس گھڑی کو جب میں نے خواہ مخواہ پھانسی کا پھندہ گلے میں ڈال لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ارے بڑی زہریلی، سرکش اور ضدی لڑکی ہے کیا حرج تھا اگر اپنی خالہ کے ساتھ دفع ہو جاتی۔ میں ایک فکر سے بچ رہتا۔ مگر نہیں۔ میرے اصرار پر نامعقول بحث کرنے لگی۔ اصرار کرنے لگی کہ میں اپنے گھر لے چلوں۔ ابھی اس ناقص العقل کو اندازہ نہیں کہ اگر اسے اپنے گھر میں بسانا ہوتا تو میں اسے یہاں کیوں ڈالے رکھتا۔؟"

دیکھو غضنفر، تم دونوں کا حق ایک دوسرے پر ہے۔ اگر وہ کچھ نا سمجھ ہے کرتی ہے تو تمہاری محبت اور خلوص کے مرہم پر کرنا ہے نا۔ وہ [illegible]

تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اسے اس طرح حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دینا شرافت سے بعید ہے۔ میرے بھائی۔ تمہیں کیا پتہ۔ وہ دو دو روز سے مسلسل آنسو بہاتی رہی ہے۔ ان حالات میں اگر اسے کچھ ہو گیا تو پھر لینے کے دینے پڑیں گے نا۔ اتنا تو سمجھتے ہو؟"
کیا بتاؤں یار۔ مجھے بس غصہ آ گیا تھا: کچھ خفیف ہو کر غضنفر نے جواب دیا۔
اچھا تو آج شام کو ضرور آنا۔ وعدہ کرو۔!"
آ جاؤں گا:

داور سے رخصت ہونے کے بعد انہیں پھر فکروں نے گھیرا۔ جب نوشینہ کے یہاں حاضر ہوا تھا تب انہوں نے سنا تھا کہ پورے ہزار بارہ سو کا خرچ آیا تھا۔ تو اب انہیں بھی اسی قدر رقم درکار ہوگی۔ یہاں جیب میں [illegible] تھے۔ کہکشاں نے عجیب عذاب میں ڈالا تھا۔

پھر وحشت کے بادلوں سے نوشینہ امید کی کرن بن کر چمکی۔ وہ بہت اچھی بہن ہے۔ اگر حالات اس کے سامنے رکھے جائیں اور چپکے سے مدد مانگی جائے تو؟۔

اس کے سلسلے میں قطعی توقع نہیں ہے کہ وہ بلا عذر چپ چاپ صاحبزادے کے ہاتھ پر ہزار روپے رکھ دے گی۔ ناممکن۔!
نوشینہ بے موسم انہیں اپنے گھر پر دیکھ کر چونکی۔!
یہ آپ کیسے بھول پڑے۔ بیٹھیے۔ گھر میں تو سب خیریت ہے نا:
ہاں سب۔ تم کیا کر رہی ہو!۔ [illegible] بھائی کہاں ہیں؟
کیسے انجان بن کر پوچھ رہے ہیں: نوشینہ [illegible] ان کا تبادلہ [illegible]

The Hareem, Lucknow Sept. 1982 (Phones : 44559, 45334) Regd. No. LW/NP 32

THE HAREEM

Oct. 82

Rs. 1/40

گزشتہ ... سال سے ... کی رہنمائی ... ہندوستان میں اردو ...

ماہنامہ

حریم

بانی

... آہنوری مرحوم

... آہنوری مرحوم

نسیم آہنوری

جانی بیگم ... دہلی

صفحہ	فہرست مضامین ...	...

[illegible]

عورت

تھی وہ ملازمت۔ لڑکیوں اور عورتوں کو ملازمت کرنے میں اپنی صلاحیت سے زیادہ اپنے جسم اور خوبصورتی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ خوبصورتی اور جوانی پر بھی کوئی اختیار نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ باس یا افسر چاہے وہی پیش کرنا پڑتا ہے۔ دہلی کی ایک پبلسٹی فرم میں ایک ماڈل گرل کو اس وقت جواب دے دیا گیا جب اس نے سینہ کھولنے میں جھجک اور شرم محسوس کی۔ ماڈل فوٹوگرافر نے اس کو جھڑکتے ہوئے کہا کہ جو لڑکی اپنے سینہ کو کھولنے میں شرم محسوس کرے اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان کا تو کاروبار ہی عورتوں کے ننگے سینے کی نمائش ہے۔

ایک بہت باصلاحیت اسٹینو گرافر لڑکی کو اس لئے نوکری سے جواب دے دیا گیا کہ وہ اپنے باس کے ساتھ کشمیر کی سیر کرنے نہ جا سکی۔ یہ باس کشمیر [illegible] ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ مگر وہ وہاں [illegible] اسٹینو گرافر کے حسن و شباب سے کشمیر کی فضاؤں میں لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ ان دونوں لڑکیوں نے یہ نہیں پسند کیا کہ ان کا جسم [illegible] میں [illegible] جائے۔ پھر بھی یہ خیال بنا ہی ہے کہ [illegible] اور مختلف پیشوں میں عورتوں کی صلاحیت اور قابلیت کو ہم نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان کے حسن و شباب سے ان کی صلاحیت اور اہمیت پرکھی جاتی ہے۔ [illegible] ہندوستان یا [illegible] رکھنے والی [illegible] جا رہا ہے۔

[illegible]

کرنے والی خواتین پر دوہرے ہر کتنے پڑتے جاتے ہیں [illegible] سماجی اور معاشی سطح پر طرح طرح ملتے جاتے ہیں۔ [illegible] ساتھ کام کرنے والے [illegible] کسی ہوٹل یا کلب میں کھانا کھایا جائے گا یا خریداری کی جائے گی۔ اس طرح دونوں کے درمیان [illegible] اور لڑکی [illegible] آ جاتی ہے۔ [illegible] نوکری [illegible] پڑتی ہے۔ [illegible] قسم کی ہے اور باس کی جنسی ہوس کا شکار بننے پر تیار نہیں ہوتی پھر اس کی ترقی کے مواقع یا اس کی ملازمت کی مستقلی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

چھوٹے اداروں میں دوہرے ڈھنگ کا انداز چل جاتا ہے۔ ایک اسکول میں ایک ۱۰ سالہ [illegible] خوبصورت لڑکی کو [illegible] پرنسپل ماسٹر نے ایک ہی ہفتہ میں موقع نکال کر [illegible] اس کے ساتھ [illegible] اس کی [illegible] اٹھانے لگا۔ [illegible] سوشل سائنس کے [illegible] بتایا کہ ملک میں عورتوں کا [illegible] کرنے [illegible] بہت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ ایک بہت [illegible]

[illegible]

[illegible] ہو جاتی ہیں، وہ جلدی ہی جنسی کھیل کی عادی بھی ہو جاتی [illegible] اور بعد میں وہ صرف ملازمت سے دوسرے فائدے بھی حاصل کرتی ہیں۔ جیسے تنخواہوں کے علاوہ اپنی پسند کے کپڑے، کبھی کبھی زیورات، سیر و تفریح، ہوٹلوں میں کھانے وغیرہ کا [illegible] کا عادی بنا [illegible]

انھوں نے بتایا کہ سب سے زیادہ مجبور وہ لیڈی ٹیچر ہوتی ہیں جو پرائیویٹ [illegible] اسکولوں میں ملازمت کرتی ہیں۔ ان اسکولوں کا مالک [illegible] سبھی ملازم مردوں کا پاس ہوتا [illegible] سے ان کی برائی کے بعد بھی ان کا روزگار رہتا ہے [illegible] ہیں۔ ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ چھوٹے شہروں میں اور دیہاتوں میں لیڈی ڈاکٹروں اور نرسوں کی حالت جیسے خطرے میں رہتی ہے۔ [illegible] اسپتال کے [illegible] ملازم کی داشتہ بن کر رہتی ہیں۔ اور بارہا ان سے واقف رہتی ہیں [illegible] اگر کسی کی جسمانی پیاس بجھانے سے انکار کرتی ہے تو اس کی فوراً جانی شکایت کی جاتی ہے [illegible] ڈاکٹر وغیرہ بھی جب تک نرسوں کے جسموں سے نہیں کھیل لیتے ہیں ان کو مستقل نہیں کرتے یا ناراض ہو کر ان کا تبادلہ کر دیا جاتا ہے۔ اور دوسری [illegible] نرس لائی جاتی ہے۔ نرسوں کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ [illegible] ہر فرد کی جنسی پیاس بجھانا ان کی شرائط ملازمت میں داخل ہے۔

چندی گڑھ کی نرسوں نے بتایا کہ انگشت پہننے سے ان کا سینہ ابھر آتا ہے اور ان کی ٹانگیں عریاں ہو جاتی ہیں۔ چندی گڑھ کے ایک اسپتال کی [illegible] نے [illegible] کا استعمال شروع کر دیا ہے تاکہ ان کے جسم پر کسی کی نظروں کا فساد نہ ہو۔

[illegible] کا بھی [illegible] ٹیلیفون آپریٹر اور اسسٹنٹ کی بھی ہوتی ہیں۔ یہ لڑکیاں بڑی جلدی مردوں کے جنسی جال میں پھنس جاتی ہیں۔ [illegible] ان کی [illegible] ہوتی [illegible] لڑکیاں جنسی استحصال [illegible] کو [illegible] ان کو [illegible] کا [illegible] رہتا ہے اور [illegible] لڑکیاں زیادہ [illegible] ہوتی ہیں۔ [illegible] کرچکے

ہیں جیسے ہیں بالکل بیباک ہوگئے ہوتے ہیں اور [illegible] ہیں اور [illegible] ہیں اور [illegible] جنسی [illegible] بنائے ہیں۔

[illegible] بھی گئی دوسرے ملک میں اسی قسم کے حالات [illegible] جہاں [illegible] عورتوں کا کہنا ہے کہ ترقی کے مواقع پانے کو جنسی ہوس کا شکار بننا پڑا یا شکار بنانے کی کوشش کی گئی۔ ہندوستان کی حالت یورپ سے بھی زیادہ خراب ہے جہاں [illegible] عورتوں کے جسموں سے جنسی پیاس بجھائی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا تفصیلات و حقائق اس ڈکیا [illegible] کے مرتب کردہ نہیں ہیں جو کہا کرتا ہے کہ خواتین کا اپنی گھر کی دنیا چھوڑ کر آفسوں وغیرہ میں ملازمت کرنا، بالکل مجبوری کے مناسب نہیں ہے جو کچھ مندرجہ بالا مضمون میں بتایا گیا اس کو پڑھ کر ملازمت کرنے والی خواتین غور کریں کہ مشرقی خواتین، جن کی عفت و عصمت کے ڈنکے بجتے رہتے تھے۔ اب اوسطاً دفتروں میں ملازمتیں کرنے کے بعد بھی کیا ان خصوصیات کی حامل رہ سکتی ہیں۔

اسکولوں کے سلسلے میں صرف ایسے ہی اداروں کا ذکر کیا گیا ہے جو پرائیویٹ اور غیر تسلیم شدہ ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ گورنمنٹ کے گرلس اسکولوں اور کالجوں کی ٹیچرس وغیرہ کو بھی اسی طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کالجوں کی ٹیچرس ہیں، لیکن اسے کلاس افسران میں صرف چند ہی خواتین ہیں اس لئے انھیں مردوں سے سابقہ پڑتا ہے اور یہ مرد ان مردوں سے مختلف نہیں ہو سکتے جن کا ذکر مضمون میں کیا گیا ہے۔ مرد بہرحال مرد ہوتے ہیں، [illegible] ہے کہ سرکاری ملازم ٹیچرس میں جو اپنے کردار کی پاکیزگی کو قائم [illegible] ہیں۔ انھیں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے [illegible] رہتے ہیں۔ ان کی ترقیاں رکی رہتی ہیں۔ ان کے [illegible] کر دئے جاتے ہیں۔ ان کے [illegible] ان کے [illegible] وغیرہ کے حسابات [illegible] ملازمین [illegible] حسابات کا [illegible] اور [illegible] حسابات [illegible] مردوں سے [illegible] پڑتا ہے۔ کیا یہ [illegible] اس بات کی [illegible] کہ [illegible]

[illegible] اس کی صورت [illegible]
[illegible]
رکھی جائے [illegible]

ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ [illegible]
[illegible] دور دراز کے علاقوں اور قصبات میں
جاکر [illegible] قیام کرنا پڑے گا۔ [illegible]
[illegible]
سکے مگر ایسے دور دراز کے مقامات پر بھیجا جاتا ہے، جہاں نہ صرف
یہ کہ سفر کی دشواریاں ہوتی ہیں، بلکہ رہنے کی جگہیں بھی نہیں مل پاتیں۔
دوسروں کے گھروں میں ان کے رحم و کرم پر قیام کرنے میں بھی اسی طرح کے
خطرات سے سامنا ہو سکتا ہے جیسے اوپر بیان کئے گئے ہیں مرد موقع
کے متلاشی رہا ہی کرتے ہیں۔ عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا
ان کی فطرت ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔

اگر واقعی عفت و عصمت کی کوئی قیمت اب بھی باقی ہے تو ملازمت
کرنے والی خواتین کو غور کرنا چاہیئے۔ مستثنیات کو چھوڑ دیجئے تو ہر عورت
کو ایسی صورت حال سے دوچار ہونا ہی پڑے گا۔

عرب شیخوں کی عیاشیاں

ٹائمز آف انڈیا میں ایک خبر چھپی ہے کہ ایک ۶۰ سالہ عربی شیخ
نے ہندوستان کی ایک ۱۰ سالہ لڑکی سے نکاح کیا اور اسے اپنے
وطن لے گیا۔ اس سے دو بچے بھی ہو گئے۔ لیکن اسی عرصہ میں اس
شیخ کے کاروبار میں کام کرنے والے کسی ہندوستانی نوجوان سے لڑکی
کا معاشقہ ہو گیا اور شیخ کو پتہ چل گیا [illegible] کیس میں مقدمہ چلا۔
ظاہر ہے کہ اسلامی [illegible] اس کی سزا [illegible] ہے۔
[illegible] ہندوستانی [illegible]
[illegible]

[illegible]

اس لئے وہ ساری دنیا میں عیاشیاں کرتے پھرتے ہیں [illegible]
[illegible]
اس لئے کہ [illegible] رواج کی رسم
رسم بن گئی ہے۔ [illegible] لاکھوں لڑکیوں کی شادیاں [illegible]
[illegible]
کر پاتے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
اخبارات سے علم ہوا ہے کہ حکومت کچھ ایسے اقدام کرنے جا رہی
ہے۔ جس سے [illegible] شادیوں پر پابندی لگ سکے۔ [illegible]
[illegible] مسلمان سمجھتے ہیں [illegible]
نہیں کرتے لیکن یقیناً ان کی نیتیں خراب ہوتی ہیں اور وہ پہلے ہی
سے طے کر لیتے ہیں کہ چند دنوں [illegible] سے اپنے نفس کی [illegible]
[illegible] طلاق دے دیں گے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
طلاق دی جائیگی۔ [illegible]
[illegible]

[illegible]

قرآنِ پاک

میں عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت

پروفیسر وصی رضا

مشہور و مستند حدیث نبوی ہے کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے اہل کے ساتھ اچھا ہے۔ ایک اور موقع پر آپ نے عورتوں کو آبگینے سے تشبیہ دی ہے۔ یہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے کیونکہ سرور کائنات کی عظیم ہستی تہمت شعر سے بری ہے بلکہ اہل شعور کے لئے اس میں بڑی حکمتیں ہیں۔ وہ تان یہیں آکر ٹوٹتی ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی حدود متعین کریں اگر باپ، بھائی اور شوہر روح اسلام کو پیش نظر رکھیں تو نہ عورتوں پر زیادتی ہوگی اور نہ ان میں لایعنی آزادی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ ایک مثال ملاحظہ ہو کہ کلام پاک میں ترکے میں بیٹی کا حصہ بیٹے سے نصف مقرر کیا گیا ہے اور اس میں کسی کو کم و بیش کرنے کا حق حاصل نہیں ہے مگر بعض علاقوں میں بیٹیوں کو باپ کے ترکے میں حصہ دینے کا رواج ہے۔ اور انگریز کے بنائے ہوئے قانون میں رواج کو شرع پر فوقیت حاصل ہے۔ بیشمار بیٹیاں ترکہ پدری سے محروم ہو گئیں یا کسی طرح مہر، جہیز، طلاق اور خلع کے معاملے میں مرضی [illegible] کرکے عورت کو اس کے مناسب اور جائز حقوق سے محروم کرنے کی سازشیں صدیوں سے جاری و ساری ہیں۔

علماء اور فقہ مروجہ کا فرض ہے کہ وہ منشائے ربانی کے مطابق عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے احکام شرعی کی روح کو قوانین میں منطبق کرنے کی کوشش کریں۔ ہمارے ملک کے ازدواجی قوانین میں بہت جھول ہیں عدالتوں کے ذریعے عورت کو اپنا مہر، جہیز اور نفقہ لینے میں شدید پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور گواہی طلب کا ایسا چکر ہے جو غریب عورت کے بس کی بات نہیں ہے اگر وہ مرد کے مظالم سے تنگ آکر چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو یہ بھی بے حد دشوار گذار مرحلہ ہے۔ اس لئے تمام قانون داں اصحاب کو چاہیئے کہ وہ ایسے قوانین تجویز کریں اور موجودہ قوانین میں ایسی ترمیمات و اصلاحات پیش کریں جن کے مطابق عورت جسمانی و ذہنی مریض شوہروں سے بہ آسانی چھٹکارا حاصل کر سکے اور اس کا جہیز، مہر و نفقہ بھی بسہولت مل جائے اس کا بھی اندازہ ہے کہ بعض بری عورتیں اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گی مگر اس کا سد باب یوں کیا جا سکتا ہے کہ چھٹکارے کی صورت میں عورت کو مہر چھوڑنا پڑے گا۔ اور وہ نفقے سے بھی دست بردار ہوگی البتہ اس کا جہیز ذاتی ملکیت ہے جو اس کو ملنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے نکاح نامے میں تفصیل درج ہونا چاہیئے۔ اور تغیر و تبدل کی اطلاع باقاعدہ نکاح کے رجسٹرار کے یہاں سند درج کی جایا کرے۔

ایک نارمل مرد اور نارمل عورت ہر صورت سے گذارہ کر لیتے ہیں مگر جسمانی یا ذہنی مرض میں مبتلا مرد، عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ جہالت اور حماقت کی وجہ سے بھی بعض مرد اپنی بیوی کو لونڈی بلکہ اس سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔ آج بھی ہم یہ احمقانہ اور جاہلانہ جملہ سنتے ہیں کہ لڑکی پرایا دھن ہے۔ یہ ہندوانہ خیال ہے وہ لڑکی کو "دان" کرتے ہیں اور ہندوؤں کے یہاں شادی کا رشتہ اٹوٹ ہے چنانچہ ان کے ہاں صدیوں تک ستی کی وحشیانہ رسم قائم رہی۔ رومن کیتھولک فرقے میں بھی کچھ ایسا ہی تصور پایا جاتا ہے۔ یہ اسلام کا درخشاں انقلابی کارنامہ ہے کہ اس نے عقد کو ایک معاہدہ عمرانی قرار دیا ہے جس میں عورت اور مرد دونوں فریق ہیں۔ البتہ مرد کو نسبتاً برتری کا درجہ دیا گیا ہے تاکہ خانگی حکومت میں دو عملی کی کیفیت نہ پیدا ہو۔ ان کے حقوق و فرائض کی علیحدہ علیحدہ نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مرد کے [illegible] قوامیت اور اس کی تفسیر میں عدل و انصاف، راستی و دیانت سے کام نہیں لیا گیا اور مرد واضعین قانون نے عورت کو وہ تحفظات نہیں دئیے جو اس کو ملنا چاہیئے تھے۔ مثلاً شوہر کی دیوانگی کی صورت میں عورت طلاق کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ مگر عدم توازن ذہنی کی صورت میں وہ مرد کے جھگڑے میں جلنے اور جلنے پر قانونی طور پر مجبور ہے۔ اسی طرح عدم رجولیت کے سلسلے میں ہمارے بعض فقہاء نے جو نہایت انتہائی اور ناانصافی کی ہے وہ ارباب دانش و قانون اہل اصحاب سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں قانون داں خواتین کو چاہیئے کہ وہ عائلی قوانین کا بغور مطالعہ کر کے ایسی تجاویز قانون ساز اداروں کے سامنے پیش کریں جن سے عورتوں پر ظلم کا سدباب ہو سکے۔

بے شک وہ شوہر ہیں مگر بیٹیوں کے باپ اور بہنوں کے بھائی بھی ہیں۔ شوہر ہونے کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ وہ اپنی قوامیت کے زعم میں بیوی کی زندگی ناقابلِ برداشت بنائیں اور نتیجے میں خود اپنی زندگی کو خوشگوار نہ رہنے دیں کیونکہ مسرت کا زریں اصول یہ ہے کہ "اگر خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھو۔" اور دوسروں میں ماں کے بعد بیوی کا نمبر آتا ہے جو تمہاری شریکِ زندگی ہے لیکن ماں کی خدمت کے بہانے بیوی کے حقوق سلب نہیں کئے جا سکتے۔ اور بیوی کی خوشنودی کے لئے ماں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا ایک حل ہے "علیحدگی" یعنی دونوں ایک ہی جگہ رہنے کے لئے مجبور نہ کی جائیں اس ضمن میں قارئین کرام کی سہولت کے لئے کلامِ پاک اور احادیثِ نبوی سے ایسے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جن کی روشنی میں ان کو صحیح فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

اور اس کی نشانیوں میں ایک یہ ہے کہ اس نے تمہارے لئے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کئے ہیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

(الروم ۳۰)

" وہ (عورتیں) تمہارے لئے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس"

(بقرہ ۲۳)

" اگر آپس میں موافقت سے رہو اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے بچو تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے اور دونوں میں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں تو اللہ اپنے وسیع خزانۂ غیب سے ہر ایک کی کفالت کرے گا۔"

(النساء ۱۹)

" یا تو بھلے طریقے سے ان کو پاس رکھا جائے یا احسان (خوش اسلوبی) کے ساتھ رخصت کر دیا جائے۔"

(بقرہ ۲۹)

" یا تو بھلے طریقے سے ان کو پاس رکھو یا بھلے طریقے سے ان سے جدا ہو جاؤ۔"

(الطلاق ۱)

" اپنی بیویوں کے ساتھ اچھی طرح رہو۔" (النساء ۳)

" یا تو بھلے مانسوں کی طرح ان کو رکھو یا بھلے مانسوں کی طرح رخصت کر دو۔ محض ستانے کے لئے ان کو نہ روک رکھو کہ ان کی حق تلفی کرنے لگو اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے نفس پر ظلم کرے گا۔" (بقرہ ۲۹)

" اور آپس کے تعلقات میں فضل کو نہ بھولو یعنی فیاضی کا برتاؤ کرو۔"

(بقرہ ۳۱)

" اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔ (النساء ۱)

" پس ان سے تم نے جو تمتع کیا ہے اس کے بدلے قرارداد کے مطابق ان کے مہر ادا کر دو۔" (النساء ۴)

" پھر اگر وہ خوشدلی کے ساتھ مہر میں سے کچھ معاف کر دیں تو اس کو مزے سے کھاؤ۔"

(النساء ۱)

اور اگر تم قرارداد کے بعد اس میں سے کم یا زیادہ پر باہمی رضامندی سے کوئی تصفیہ کر لو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

(النساء ۴)

پس ایک ہی بیوی کی طرف پوری طرح نہ جھک پڑو کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو۔"

(النساء)

" پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو۔"

(النساء ۱)

" عورتوں کو بھی حسنِ سلوک کا ویسا ہی حق حاصل ہے جیسا کہ مردوں کو ان پر حاصل ہے۔"

آخر میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ایک فرمان ملاحظہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس کے ہاں بیٹی ہوئی اور اس نے نہ تو اسے زندہ درگور کیا، نہ ذلت کی حالت میں رکھا اور نہ اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا (ابوداؤد) یہ حدیث حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منسوب ہے۔

ماں باپ کا مقام اسلام میں

حکیم محمد سعید

اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے اس کی صفتِ ربوبیت سے ہر چیز نشوونما پاکر رنگ و روپ حاصل کرتی ہے۔ ربوبیت شفقت، کرم، عطا، مہربانی اور ساری چیزوں کا تقاضا کرتی اور جو رب ہے اس میں یقیناً یہ ساری چیزیں موجود ہیں۔

والدین خدا تعالیٰ کی انھیں صفات کا مظہر ہوتے ہیں، عالم وجود میں آنے کے ظاہری وسائل وہی ہوتے ہیں، تربیت، حفاظت اور کفالت کے فرائض وہی شفقت اور محبت کے ساتھ انجام دیتے ہیں کہ تعلقاتِ انسانی کے دوسرے شعبوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ شفقت مادری دولت بے بہا ہے، صلہ چہرہ محبت خلقی ہے اور دنیا کی کوئی چیز اس کا بدل نہیں۔ چونکہ والدین کو خداوند تعالیٰ نے اپنی صفتِ خلق و ربوبیت کا مظہر بنایا ہے اس لئے جب اس نے انسانوں کو انسانوں کے سامنے سر خم تسلیم کرنے سے روکا اور شرک کو گناہِ عظیم قرار دیا تو وہیں اس کے ساتھ یہ بھی اعلان فرمایا کہ انسانی روابط میں دو ہستیاں ایسی ہیں جن کی تعظیم و تکریم واجب ہے، ان کو راحت پہنچانے کے لئے اختیار کی ہوئی ہر حرکت سرفرازی ہے، ان کے سامنے تواضع اور انکساری عبادت ہے، ان کی شفقتیں خدا کی رحمتوں کی یاد دلاتی ہیں، ہم پر ان کے بے شمار احسانات ہیں، ہم اگر ان کی خوشی پر پریشان خاطر ہو کر ان نہ کریں، ان کے آرام و راحت کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیں تو بھی ان کے احسانات کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ انھوں نے تخلیق و تربیت کے ظاہری وسائل کی حیثیت سے ہم پر جو احسانات کئے ہیں ان کا کوئی صلہ نہیں، ہمارا ہر عمل ان کے لئے جذبات شکر سے معمور ہونا چاہیے۔ اور پروردگار عالم کی بارگاہ میں ان کے لئے دعائے مغفرت و کرم کرنا چاہیے۔

ہمارے دین اسلام نے جس طرح ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کی اساس رکھی ہے۔ یوں تو دنیا کے سارے مذاہب نے ان ہستیوں کو واجب الاحترام قرار دیا ہے لیکن اسلام نے ان کے حقوق اور ان کے مقام و مرتبے کی جس طرح وضاحت کی ہے اس سے ایک پاکیزہ اور مثالی معاشرے کی بنیاد پڑتی ہے۔

والدین کے مقام و مرتبے کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ان کی خدمت اور اطاعت کو اپنی عبادت کے ساتھ بیان کیا ہے، اور جہاں اپنی نعمتوں اور احسانات کو شکر کے قابل بتایا ہے وہیں والدین کے احسان کا بھی ذکر کیا ہے۔ ماں باپ کے حقوق اولاد پر بہت زیادہ ہیں۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو امامہؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ دونوں ہی تیری جنت ہیں یا پھر دوزخ۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی خدمت جنت میں لے جاتی ہے اور ان کی بے ادبی جہنم میں۔ والدین اپنی اولاد کے لئے قبلہ و کعبہ اور مصحف پاک کے ہم مرتبہ ہیں۔ بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو خدمت گزار بیٹا اپنے والدین پر رحمت و شفقت سے نظر ڈالتا ہو، وہ ہر نظر کے بدلے ایک حجِ مقبول کا ثواب پاتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ دن میں سو مرتبہ اسی طرح نظر ڈالے؟ فرمایا ہاں، سو مرتبہ حجِ مقبول کا ثواب پائے۔ اس کے خزانے میں کمی نہیں آتی۔

مشکوٰۃ کی حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں تو سب گناہوں کی سزا خداوند تعالیٰ قیامت تک مؤخر کر دیتا ہے، لیکن والدین کی نافرمانی کی سزا آخرت سے پہلے دنیا ہی میں دے دیتا ہے۔

والدین کی تعظیم اور خدمت کی راہ میں عقیدہ و مذہب کا اختلاف بھی حائل نہیں۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا مقام اتنا بلند فرمایا ہے کہ والدین کی خدمت کفر کے باوجود واجب قرار دی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ حضرت اسماءؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری ماں مشرکہ ہیں اور اکثر مجھ سے ملنے کے لئے آتی ہیں، کیا میرے لئے جائز ہوگا کہ میں ان کی خاطر مدارات کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "اپنی ماں کی خاطر مدارات کرو اور صلہ رحمی کرو"۔ (ترجمہ: سعید کراچی)

[illegible]

بچے زنجیر ہوتے ہیں

شمیم اختر

بچے کیا چیز ہیں؟ پہلے وقتوں کے لوگ سمجھتے تھے کہ بڑھاپے کا سہارا بنیں گے کہ یہ خوب چیز ہیں۔ بڑھاپے میں [illegible] اولاد کی تمنا اسی لئے کرتا ہے کہ آخری عمر میں کام آئیں گے۔ والدین کے بڑھاپے کا بوجھ اٹھائیں گے۔

جو لوگ ذات کو آفاق پر قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، وہ جواز پیش کرتے ہیں کہ بچوں سے خاندان کا نام چلتا ہے۔ یہاں بڑے چھوٹے سے کسی کو غرض نہیں۔ کنبہ پروری کا وسیع تر مقصد سامنے ہو تو چھوٹی موٹی باتوں سے حوصلہ شکنی ممکن نہیں ہے۔ ہر موجد کو پاگل کہا گیا، کس نے پتھر نہیں اٹھایا۔ اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے انسان شروع دن سے تن، من، دھن کی بازی لگاتا چلا آیا ہے۔

مقصد چاہے بڑھاپے کی لاٹھی کا حصول ہو یا خاندان کے نام کی بقاء کا مسئلہ، بشر کیسے کیسے اپنا تن، من، دھن نہیں لٹاتا۔ اس میں [illegible] کو کام نہیں، کبھی کچھ ہنسی خوشی کرتا ہے۔ بلکہ اپنی کم مائیگی پر کف افسوس ملتا ہے کہ کچھ کر نہیں پایا، اے کاش۔ جب بات اے کاش تک آن پہنچے تو سمجھئے کہ دنیا ابھی تنگ پڑ گئی۔ آسمان تو بہت دور کی بات ہے۔

بچے کیا چیز ہیں؟ بہتیرے کہتے ہیں کہ گھر کا چراغ ہیں، روشنی ہیں۔ [illegible] کہ روشنی آتی کم اور جالے زیادہ ہے۔ بتیاں ایسی ہیں کہ چار دن نہیں چلتیں۔ [illegible] کی چوڑی [illegible] میں دیر لگتی ہے۔ [illegible] پر چلنے والے بچوں کو ذرا آزما کر دیکھئے۔ [illegible]

[illegible] ہیں کہ [illegible] خاندان کے [illegible] ہے۔ [illegible] ہیں۔ [illegible] میں ہے بصورت دیگر [illegible] کے قتل [illegible] کرتے ہیں۔

بچے جس خاندان کا نام [illegible] ان کا نام ڈوبا [illegible] جب تک روشن ہے [illegible] آدمی میں بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے کہ [illegible] ایک کا اپنا قرینہ ہوتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ ہر فرد اپنے والدین [illegible] کا پرتو ہو۔ والدین کی حسرتوں اور ناکامیوں کو وہ کامرانی میں بدلے۔ اس شعور کے پیدا ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہر شخص کو یقین محکم ہے کہ وہ خوبیوں کا مرقع ہے۔ اس کا اپنا کردار مثالی ہے۔ اس لئے بچوں کو اسی مرقع اور کردار کا عکس ہونا چاہیے۔

بے شعور چیزوں کے ذکر میں شعور کا ذکر مناسب نہیں، کیجئے صرف بچوں ہی کی باتیں کریں۔ بچے والدین کے [illegible] کاموں میں بھی [illegible] کی کوشش کرتا ہے۔

صرف گھروں کا ہی کیا ذکر، [illegible] ہیں۔ شہروں کی [illegible] شہر کے [illegible] گھر آ [illegible] میں گے۔

[illegible]

[illegible] ہے۔ بچے ہو جائیں تو کئی گھرانے اور مجبور [illegible]
[illegible] کے کام کہاں کہاں نہیں آتی کہتے
[illegible] کی تحریر [illegible] کہنا چاہیے کہ رقص سے
[illegible] کا لطف ہی اور ہے کہ یہ
[illegible] کے اندر رہ کر ناچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ برنارڈ شا جو
[illegible] بادشاہ تھا۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ
[illegible] اپنے طریقِ حیات تبدیل کرنے کا اختیار
[illegible] دیا جائے تو دنیا میں شاید ہی کوئی شادی شدہ جوڑا بچے۔ بہرحال
[illegible] بیوی کو یکجا رکھنے کے کام آتی ہے۔ اسی نعمت کی بدولت
[illegible] شادیوں سے محفوظ رہتے ہیں اور میاں بیویاں گھروں
[illegible]

حریمی دسترخوان

(از فیروزی قسیم اشرفی لکھنؤ)

سموسے یا تکونے

تکونے اور سموسے ہر جگہ شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ عموماً یہ آلو کے یا قیمے کے بنتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان سموسوں یا تکونوں کو سردی میں ۲۴ گھنٹے اور گرمیوں میں بارہ گھنٹے کے بعد [illegible] کھایا جائے تو خراب ہو جاتے ہیں حال ہی میں ایک [illegible] نے ایسے تکونے کھائے جن میں آلو یا قیمہ کے آمیزے کے بجائے دالموٹ بھری تھی۔ دالموٹ ایسی چیز ہے جو دس پندرہ روز بعد بھی کھائی جائے تو خراب نہیں ہوتی۔ آپ بھی ایسے تکونے یا سموسے بنا کر کسی شیشے کی ایسی اچاری میں رکھ لیں جس میں ہوا جانے کا امکان نہ ہو تو جب جی چاہے مہمانوں کی خاطر کے لئے انھیں پیش کر سکتی ہیں۔

سموسے یا تکونے بنانا سب ہی جانتے ہیں۔ لیکن احتیاطاً میں اس کی ترکیب بھی لکھے دیتی ہوں۔ اس لئے کہ اکثر کمسن لڑکیاں اس کی تیاری کی ترکیب سے واقف نہ ہوں گی۔

[illegible] میدے کو اس میں اندازے سے ہلکا سا نمک ملائیں۔ نمک خوب باریک پسا ہوا ہو۔ بہت ہی کم مقدار میں نمک ملا کر ایک جان کرنے کے بعد تھوڑا سا گھی یا ڈالڈا ڈالیں۔ [illegible] گرام میدے میں [illegible] گرام گھی کافی ہوگا۔ گھی ملا کر دونوں ہاتھوں سے میدے کو خوب ملیں اور پھر ہلکے نام پانی ملا کر گوندھیں۔ خیال رہے کہ میدہ زیادہ سخت نہ گندھے۔ اس کے بعد ایک [illegible] بنا کر [illegible] چھری سے کاٹ کر دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔

دال موٹ کسی اچھی دکان سے خرید لیں، تو دبنا نا دشوار ہے۔ بعض دکانوں کی دالموٹ میں ترشی کم ہوتی ہے بعض میں زیادہ۔ دالموٹ چکھ لیں اگر ترشی (کھٹاس) آپ کو کم محسوس ہو تو بناتے وقت تھوڑا سا لیموں کا عرق دالموٹ میں ملالیں۔ اب بیلے ہوئے پیڑوں کے ٹکڑوں کو قیف کی شکل کا اور دالموٹ اس میں بھر کر اوپری حصّے کو ملا کر چپکا دیں۔ اسی طرح تمام تکونے بنا ڈالیں۔ کچھ دیر انھیں ہوا کھانے دیں۔ اس کے بعد گھی یا ڈالڈا میں تلیں۔

تکونے تلنے کے لئے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ کڑھائی میں گھی یا ڈالڈا اتنی مقدار میں ڈالیں کہ تکونے اس میں ڈوب سکیں۔ انھیں ہلکی آنچ پر تلنے کے لئے گھی یا ڈالڈا میں ڈالدیں کسی بڑے چمچے یا کفگیر سے ہلاتی اور پلٹتی پلٹتی رہیں جب اچھی طرح بادامی رنگت ہو جائے تو نکال لیں۔

یاد رہے کہ زیادہ گھی میدے میں نہ ملائیں کھاتے وقت انھیں کسی الٹے توے یا فرائی پین میں رکھکر ہلکی آنچ میں الٹ پلٹ گرم کرلیں تاکہ ان میں تازگی آجائے۔

اگر کسی ماہ حریم ۲۰ تاریخ تک نہ ملے تو دفتر کو اطلاع دیں۔ [illegible]
[illegible] آپ کی اطلاع ملی تو دوسرا پرچہ قیمتاً روانہ کیا جائے گا۔

میرا انتقال

زریں بارہ بنکوی

اگر میں آپ لوگوں سے کہوں کہ میرا انتقال ہو گیا تھا تو آپ کبھی یقین نہ کریں گے لیکن یہ حقیقت ہے اور میں وثوق کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرا انتقال ایک بار نہیں بلکہ دو بار ہوا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۶۲ء میں موت نے اپنا خون آلود آہنی پنجہ بڑھا کر آ دبوچا تھا جب میرا اپریشن ہوا تھا مگر وہ موت چند منٹ یا چند سیکنڈ کی تھی جس کے بعد پھر جی اٹھی۔ !! ایک جھٹکے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گئی چونکہ وہ موت کلوروفارم کی تھی لہٰذا حضرت عزرائیل نظر آئے نہ ان کے ساتھی موالیوں کی ہیبت ناکی مجھے دہشت زدہ کر سکی بس آپریشن سے پہلے مجھے کچھ گھبراہٹ تھی نرسیں مجھے سفید کفن سا پہنا کر نیم غنودگی کے عالم میں لے گئیں شاید میرے پیر بھی شرابیوں کی طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ میں نے ایک حسرت آلود نگاہ اپنے بھائی بہنوں پر ڈالی پھر ان کی تسکین کے لئے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگاتے ہوئے الوداعی طور پر خدا حافظ کہا۔ !! وہ سب مایوس کن نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے لیکن مجھے زیادہ احساس یا بے چینی نہ تھی کیونکہ مجھے خواب آور دوائیں دی جا چکی تھیں اور اب مجھے جمائیوں پر جمائیاں آ رہی تھیں۔ پھر اپریشن ٹیبل پر لٹا دیا گیا سرہانے کی طرف کوئی سیاہ سی چیز دکھائی دی اور مجھ سے زور زور سے سانس لینے کو کہا گیا یہ چیز میرے لئے انتہائی اذیت ناک و گھٹن پیدا کرنے والا تھا سامنے چند سفید پوش چہرے گھومتے دکھائی پڑے پھر ۔۔ پھر سارا کمرہ ناچنے لگا۔ الٰہی معبود! اب میرا دم گھٹ رہا تھا پھر گویا عمیق ترین غار میں گیا تھا اب غالباً موت سامنے تھی میں نے آیات قرآنی کے ساتھ سنبھالا لیا پھر بے خبر ہو گئی۔ مگر اس مرتبہ ۔۔؟ او خدا !!! اگر سوچ لیتی ہوں [illegible] رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کتنی ہیبت ناک۔ [illegible] والی موت تھی۔ ؟؟ کتنا تضاد تھا دونوں [illegible] ؟ پہلی موت میں [illegible] [illegible] کی صلاحیت

دکھائی بھی اندھیرا تھا کچھ [illegible] پر سکون [illegible] منتقل ہونے کے [illegible] دیکھ رہی تھی [illegible] رہی تھی مجھ میں بس رہی تھی سکت [illegible] گویائی سلب ہو چکی ۔ !! [illegible] پاس [illegible] فضا چھائی ہوئی تھی۔ سب چپ تھے۔ سب [illegible] چہرے اتنے [illegible] چمکتے ہیں [illegible] ان سب سے بے نیاز کسی نورانی مخلوق کے نرغے میں تھی وہ سب کون تھے؟ کیسے تھے؟ کہاں پیدا ہوئی آسمانی مخلوق تھی؟ [illegible] تحریر [illegible] میرے لئے ممکن ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ البتہ اتنا ضرور بتا سکتی ہوں کہ میری داہنی جانب جو گروہ تھا انتہائی خوش وضع و خوش لباس تھا ان کے جسموں سے سورج کی شعاعوں کی طرح بھینی بھینی مسحور کن خوشبوئیں پھیل رہی تھیں چودھویں رات کے مانند کھلے ہوئے شگفتہ چہرے ۔۔ لیکن بائیں جانب ۔؟؟ میرے اللہ۔ میرے خدا کس قدر تاریک سیاہ چہرے۔ جن کے بڑے بڑے جبڑوں سے باہر نکلی ہوئی ایک ایک فٹ کی زبانیں۔ خونخوار ناخن۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرا لہو چوسنے کو بے تاب ہوں۔ کتنے خونخوار تھے یہ عفریت !!! ان بائیں سب نے آستینیں چڑھائیں اور میرا باقاعدہ پوسٹ مارٹم ہو گیا۔ اچھے وہ سب مجھ پر جھکے پڑے تھے کتنی بد نصیب ہے یہ عورت۔ نیکیاں ہونے کے باوجود اس نے گناہ بڑھا لئے۔

وہ نیکی؟ کسی نے حیرت سے پوچھا۔ اسے اپنے [illegible] پر ناز تھا زبان پر [illegible] لئے عتاب الٰہی کا شکار ہو گئی [illegible] رہی بائیں طرف والے درندوں نے [illegible] بڑے [illegible] ناخن بڑھائے۔ میں نے خوف سے کراہ کر آنکھیں بند کر لیں [illegible] زبانیں باہر لٹک رہی تھیں خدا جانے کتنوں کا خون چوس کر آئے تھے اور ۔۔ اب ۔۔ اب میری باری تھی۔ میں چیخ رہی تھی [illegible] رہی تھی۔ لیکن بے آواز !! ابھی ٹھہرو [illegible] نے اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھے بچا لیا "ابھی [illegible]" بالکل نہیں وہ [illegible] تھی [illegible] خلاف ہے جب غصہ کم ہو جاتا تو [illegible] کے غصے سے مغلوب ہو کر خدا کے غضب [illegible] عدالت کے [illegible] نجات کا سبب [illegible] !! [illegible]

[illegible] سے میرا جسم رزگیا سکل دیکھی [illegible] نظر آرہا تھا۔

[illegible] کی کیسی ہی فکر کر رہا ہوں اس کے گناہ د [illegible] رہی ہے اس لئے تو ذرا ذرا سی بات نوٹ [illegible] ہے ۔۔۔۔۔!! اسی طرح میری نس نس کی پھر پھڑ [illegible] جب کبھی برائیوں کا ذکر زیادہ آتا اور وہ درندے نما مخلوق اپنے [illegible] ان کی شعلہ بار نگاہیں مجھے جھلسانے لگتیں اور [illegible] زیادہ ہو جاتیں تو رحمتوں کے فرشتے مسرور ہو جاتے [illegible] کے خزینے کھل جاتے، چہروں کی دلآویزی [illegible]!!!

میرا [illegible] سے تارا۔ اب میرا تمام جسم چھلنی ہو چکا تھا۔ جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ [illegible] ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شیشہ کی کرچیں [illegible] جاتی ہوں۔ آہ۔ اس اذیت۔ شدید اذیت میں کراہ بھی [illegible] ۔۔۔!! پھر مجھے نہلا دھلا کر سفید کپڑوں میں لپیٹ دیا گیا۔ میں حسرت و افسوس سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ سن رہی تھی کاش میری گویائی پھر لوٹ آتی اور میں کہہ سکتی۔ اللہ کے نیک بندو! مجھے زیادہ حرکت نہ دو۔ میرا زخم خوردہ جسم اب چھونے کی بھی تاب نہیں رکھتا۔ میں احتجاج کرتی لیکن بے آواز۔ کوئی نہیں سنتا تھا یا سننا نہ چاہتا تھا یا پھر میری گویائی ہونے لگ چکے تھے۔ مجھ حیرانگی سے سب کو بار بار [illegible] رہی تھی۔ آہ آج ۔۔۔ آج کسی کو میرے آرام کا خیال [illegible] تھا۔ تو پھر سسکتی ہوئی بولی اور پوری شفقتی سے [illegible] آہستگی سے میرے بے حس ہاتھوں کو چھو کر عقیدت اور محبت سے بوسہ دیا۔ میں نے چند گرم گرم آنسو ہتھیلی پر محسوس کیے آہ۔ [illegible] نہیں مجھ سے نہیں اٹھا سکتی وہ مجبور ہے [illegible] ہو چکے ہیں اب تمہارے برستے [illegible] نہیں۔ [illegible] کے ساتھ [illegible] ۔۔۔ سرخ سرخ آنکھیں [illegible] کر دہ چھپ چھپ کر رو رہی ہے۔ اب اس [illegible] قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا مجھے [illegible] کی بیتابی دیکھی نہیں جاتی تھی سارے مجمع پر ایک [illegible] چھایا ہوا تھا۔ جانے انجانے سبھی لوگوں کے

چہرے اترے ہوئے اور پھیکے پھیکے سے نظر آرہے تھے مگر آج مجھ [illegible] کی پرواہ نہ تھی۔ مجھے رخصت [illegible]۔ پہلی منزل آ چکی تھی۔ دوسری آنے والی تھی سب نے سسکیاں بھریں ۔۔۔!!! اور لوگ مجھے لے کر چلنے ۔۔۔!!! امی خدا حافظ ۔۔۔!!! خدا حافظ امی دو ان لڑکیاں [illegible]۔ امی میری پیاری امی [illegible] آپ کا نگہبان ۔۔۔!! [illegible] بیقراری سے رونے لگے۔ میں نے بے بسی سے ایک یاس انگیز اور آخری نظر چاروں طرف ڈالی ۔۔۔ [illegible] پھر میں بے حواس ہو گئی۔ بیگانہ از ہوش و خرد ۔۔۔!!! اب کیا ہوگا؟؟ اب کیا ہونے والا ہے؟؟؟ پلنگ کی ذرا سی جنبش سے ہزاروں شیشے کی کرچیاں جیسی سارے جسم میں چبھ جاتی مگر آج تو میں کراہنے سے بھی مجبور۔ او قادر مطلق آج کیسی شدت تھی۔ کیسی حالت تھی میری۔؟ نس نس میں دوڑتی ہوئی زہریلی سوئیاں۔؟ کاش اے کاش خدا میری سن لیتا میرے ساتھ ہجوم چل رہا تھا ایک انبوہ کثیر۔ ہم عمر مگر مجھ سے تو سب بیگانے تھے۔۔۔!!! پھر۔ پھر؟ زمین کی گہرائی میں۔ وہاں ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں لٹا کر مجھے بند کر دیا گیا۔ میں روتی رہی۔ چلاتی رہی۔ بلبلاتی رہی مجھے یوں بے سرو سامانی کی حالت میں تنہا چھوڑ کر نہ جاؤ۔ لوگو! آج اتنے بے رحم کیوں بن گئے ہو۔ تم سب کا خلوص کیا ہوا محبت کیا ہوئی؟ مگر ۔۔۔ میری آہ و بکا پر کسی نے دھیان ہی نہ دیا۔ اپنے و بیگانے سب بے تعلق ہو گئے تھے۔ کسی نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت بھی نہ کی شاید پیچھے کچھ ٹھہرتے بھی لیکن سب رخ انہیں بھی زبردستی لے گئے ۔۔۔!!! اب یہاں [illegible] وحشتناک ویرانی۔ ہیبتناک تاریکی خوفناک تاریکی۔ آہ۔ آہ کیسا عبرتناک مقام ہے یہ بھی سے

قبر میں پہنچا کے تنہا چھوڑ جانے کے لئے!
چار تن آئے دیکھا ایک اژدہام آیا گیا

تھا یا ۔۔۔ میرے ساتھ بھی تو اژدہام تھا۔ کہاں گئے سب [illegible] میرا جوڑ جوڑ زخمی تھا [illegible]

[illegible]

[illegible] سے پیشانی پر [illegible] رہی تھی جیسے [illegible] کسی [illegible] سے بیٹھی ہوں۔۔۔!!! اٹھو۔۔ اٹھو جا۔ کسی نے کہا اور بے دردی سے اٹھا کر مجھے بٹھا دیا۔ لوح جا ہو گیا۔ میں خوف سے چلائی۔ لیا اثر بصارت مجھ سے چھین لے۔ مجھے بہرہ کر دے مجھے گونگا کر دے۔ مگر مجھے بینائی دے۔ بس۔

بتا۔ بتا۔ تیرا رب۔۔ ؟ ؟ میں لرز رہی تھی۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بس دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جگر اچھل اچھل کر اب باہر آیا اب حلق سے باہر آیا۔ زبان گنگ ہو چکی تھی۔۔!!! ایک نے اپنے گرز سے خفیف سی جنبش دی اور میں بیچارگی سے چیخ پڑی۔ جلدی کر دے۔۔۔ دوسرے نے کہا۔ ابھی ہم نے اس کی زبان سے اللہ کا نام سنا تھا۔ بتا بتا۔ جلد بتا تیرا رب ؟ ؟

میرا۔ رب ! جو واحد۔ دیکتا ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ جو۔۔ خالق کائنات ہے۔ جو سمیع و بصیر ہے جو رحیم و کریم ہے میں اٹک اٹک کر۔۔ ہکلا ہکلا کر بول رہی تھی۔

ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تیرا رسول۔

سرور کونین۔ محبوب خدا جنھوں نے احکامات خدا وندی کو ایک نئے ڈھنگ سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جنھوں نے نیکی و بدی کی تمیز سکھائی۔ جنھوں نے ہم گنہگاروں کو مغفرت کا مژدہ سنایا جو سراپا رحمت ہیں شافع محشر ہیں۔ کالی کملی والے گنبد خضرا کے مکین۔۔!!!

بس۔ کافی کافی۔ اس کی زبان درازی ایک نئے رنگ میں اس کے کام آگئی۔ اگر اس وقت موت زدہ نہ ہوتی تو ابھی چھا دول [illegible]

[illegible] دکھن [illegible] سے آواز آئی۔۔!!! وہ آپس میں [illegible] ہوئے [illegible]۔۔!!! اب آرام سے سو جا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] سے پہلے۔۔۔ [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]

کا [illegible] ولی کو فرصت بخش [illegible] بس [illegible] [illegible] حقیقی۔ [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] ہے۔ ؟ ؟ [illegible] رب کریم۔۔!!! اچھا۔ [illegible] [illegible] ناقابل بے پناہ شور [illegible]۔ تھوڑی دیر کے لئے میرا جسم جلتا محسوس ہوا۔ چاروں طرف [illegible] [illegible] کے ساتھ [illegible] [illegible]۔ خوفناک [illegible] [illegible] آگ کی [illegible] چند [illegible]۔ [illegible] جا رہی تھیں۔ چیخ و پکار [illegible] کر کی جائے پناہ دی گئی۔!!! جلے ہوئے گوشت کی [illegible]۔۔ [illegible] سامنے۔۔!!! [illegible] ایک تنگ [illegible] [illegible] [illegible] ادھر لگی ہوئی دوزخ کی دہشت [illegible]۔ [illegible] [illegible] لگا رہی تھی۔ ایک کالے دیو نے آگ کا گولا پھینکا۔ شعلہ میری طرف بڑھا۔ اللہ رے میں نے چیخ ماری [illegible] قریب [illegible] کر نکل لے۔ [illegible] رو [illegible] گڑ گڑانے لگی !!! قادر مطلق۔ اے احکم الحاکمین۔ مجھے [illegible] شان کریمی کا واسطہ۔ بچا لے۔!!! ان شعلوں سے نجات عطا فرما۔ [illegible] غفور الرحیم ہے رحم فرما۔ پناہ دے اے رب العالمین۔ اپنے دامن رحمت میں چھپا لے۔ میں گنہگار سہی لیکن تیرے رسول کی امت کہلانے کا [illegible] ہے۔!!! میں نے ایمان رکھا تجھ پر تیرے رسول پر۔ تمام انبیا پر۔ تیری کتاب پر فاطمہ زہرا کے تقدس۔ پر۔ فرشتوں پر روز جزا پر۔ جنت و دوزخ پر۔۔!!! میں رو رہی تھی۔ [illegible] [illegible] آئی۔ نور کی بارش ہونے لگی خنک [illegible] [illegible] [illegible] ہواؤں کو جو [illegible] تحلیل کر دیا۔ پھر کسی کے نرم [illegible] نے [illegible] [illegible] [illegible] اور میں نے سکون کی ایک [illegible] [illegible] [illegible] سب [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دے رہی تھیں۔۔۔!!! [illegible] [illegible] سماعت سے ٹکرائی۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]۔!!!

عشق کیوں نہیں ہوتا؟

صالحہ خاتون

ہمارا مدیر کہتا ہے کہ افسانہ نگاری ہے۔ اختر کا خیال ہے کہ ہم واقعی فن افسانہ نگاری کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ دنیا کے جارے [illegible] افسانے پڑھنے میں جن کی عمومیت دار مصنف تارک ہے اور سے آپ مردوں کے استقلال کو آزمانے کے لئے ان سے ملن جذبے [illegible] تجویز فرماتی ہیں۔ شکر کیجئے کہ دور جدید کی [illegible] سے سر پر بہر سال پر نہیں چڑھائی کیا حشر ہو جاتا تھا۔ ہری کونپل جیسی کومل سیانی لڑکیاں یاد یاد بھر پیار حسین چپ رہی ہیں آنکھیں اور ناک بہہ رہی ہے۔ پسینے سے بھیگا ہوا ہے ——— مہندی بھرے ہاتھوں میں چوڑیاں کھنک رہی اور سل پر بٹہ چل رہا ہے دے دنا دن دے دنا دن کیا موسیقی تھی اور کیا ترنم تھا پیسنے والی کی خوشبو مسالے میں گھل جاتی تھی۔ مہندی کا رنگ اتر آتا تھا تبھی تو کھانا ذائقے دار تیار ہوتا تھا اور سالن خوش رنگ اترتا تھا سالن کا رنگ دیکھتے ہی کھانے والا ساری تکان بھول کر کھانے پر جٹ جاتا تھا۔ اس وقت عورتوں کو جاگنے کا دل نہیں لگتا تھا۔ اب تو نقلی [illegible] کے پھول پہ کھانا بیگم پکائیں تو برتن میاں دھوئیں۔ صبح صبح چائے بنانے کی ڈیوٹی شوہر صاحب کی اور انڈا ابالنے کا فریضہ۔ بیوی انجام دے۔ اتنے سارے حقوق قبول کروائے گئے ہیں پھر بھی آپ کی کہانیوں میں سارا ظلم و ستم عورت ہی پر ٹوٹتا ہے۔

اختر کا ہمیشہ کا [illegible] (میں نہیں مانتی کہ ابھی جا والے ہیں۔ آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ جائیں گے) سال بیتے کی مثال بھی افسوس مجھے بھی حریم کے تجربے سے اخذ کی ہوگی۔ ورنہ اب یہ نظارہ خواب و خیال ہوا۔ لیکن جب ایک مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں آخری بار [illegible] کی آئندہ وہ ایسے افسانے ہرگز نہیں شائع کریں گے جن میں عورت کا [illegible] ہو، عروج تک آئے اور انجام میں پھر ایک دوسرے کے گلے سے لگ جائیں یا [illegible]

عورتوں میں سے کسی ایک کی موت واقع ہو جائے۔ پڑھنے والے پھر غیر واضح انجام سے درد سر میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کا کہنا تھا کہانی پڑھنے والے فرصت میں تفریح چاہتے ہیں۔ دماغی کسرت سا [illegible] ہوتی رہتی ہے۔ ایسی کہانی پڑھنے سے بہتر ہے کہ دس روپے کا پرچہ خریدنے کی بجائے اپنی دوست کے ساتھ کوئی آئس کریم کھالی جائے۔ یک ایک میٹھا پان کھانے کے بعد بھی اچھی بات رہے گی۔ مدیر صاحب کے ان ارشادات پر ہم نے ان کے پان سے ابھرتا دانتوں کی طرف دیکھا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

مدیر صاحب ہمارے افسانے کے عنوان پر بھی معترض تھے کہ "اتنا مختصر عنوان تجویز فرمائی ہیں جیسے خفیہ [illegible] استعمال کر رہی ہوں اور تفصیل میں جانے سے راز کے افشا ہونے کا خطرہ لاحق ہو۔ مثلاً پائے اب یہ کس چیز کے پائے ہوتے؟ کرسی کے، میز کے، بکرے کے یا جیسے بھی؟ ایسی دسیوں مثالیں ہیں۔ آپ کو مجھ سے زیادہ یاد ہوں گی۔ ایسے مبہم، پُر اسرار قسم کے عنوان قاری کے لئے کوئی کشش نہیں رکھتے۔ وہ صفحہ پلٹ کر آگے نکل جاتے ہیں۔ مجھے بی بی! عنوان میں اتنا اختصار نہ فرمایا کریں۔ تھوڑے سے الفاظ خرچ کر دیا کریں۔ آپ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑیگا۔

پاس بیٹھی ہوئی نائب مدیرہ ہوتیں لیکن خواتین کے رسالے کی شہرت کے طور پر بحال کی گئی تھیں ورنہ ان کی کارکردگی اتنی ہی تھی جتنی کرسی شوکیس میں رکھے ہوئے حسین مجسمے کی ہوتی ہے۔ انھیں تحریری نہ سہی زبانی حسن کارکردگی دکھانے کا اس سے بہتر موقع بھلا کب نصیب ہوتا۔ گویا ہوئیں:

"خواتین کے ماہنامے میں آپ ایسی المناک باتیں مت لکھا کریں۔ موت، جنازہ، لاش پڑھ کر دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ اچھی اچھی ہلکی پھلکی باتیں ہوں تو دل [illegible]۔ آپ کی کہانی کے کردار [illegible] بھی محبت نہیں کرتے۔ [illegible]

اب ہم نہیں کہا چاہتے کہ خوش قسمتی سے انھوں نے ہمارا [illegible] نہیں دیکھا۔ ہم صدق دل سے کہنا چاہتے تھے کہ ایسے افسانے [illegible] سے کیا حسن نہ ہو گا کہ دوسری [illegible] اور پھر [illegible] کی [illegible] ہے۔ [illegible] کی عادت ڈال دی ہے۔ ہم [illegible]

دیا کرتے تھے۔ ایڈیٹروں کے آگے ناک رگڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ نہ جانے کب اللہ میاں ہماری جھولی کو چھپر پھاڑ کر بھر دیں گے اور ہم کس دن ایک معدوفانی رسالے کا اجرا کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ مگر قرین قیاس یہ ہے کہ ہم اس حسرت کو دل میں چھپائے ہوئے دارِ فانی سے کوچ کر جائیں۔

لکھا اس لئے جاتا ہے کہ پڑھا جائے اور پڑھا تبھی جا سکتا ہے کہ جب چھپا یا جائے۔ اپنا لکھا چھپوانے کے لئے ہمیں مدیر صاحب کا حکم ماننا پڑا۔ ہم نے سر کے بل کھڑے ہو کر ایک رومانوی افسانہ لکھ ہی ڈالا۔ اپنے تئیں ہم نے اس میں بارہ مصالحے کی چاٹ بھی شامل کی۔ اور اپنی فطرت کے برخلاف ہیروئن کو نہ صرف محبت بھرے مکالمے بولنے کی اجازت عطا فرمائی بلکہ چالو آئٹم کے طور پر خواب آور گیت بھی گوا ڈالا۔ چونکہ مدیر صاحب نے ہمیں اتنی چھوٹ دے دی تھی کہ ہم دونوں میں سے کسی کو مار سکتے ہیں لہٰذا ہم نے شیریں فرہاد اور سسی پنوں کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہیروئن کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اپنے دل میں ہم مطمئن تھے کہ اب میدان مار لیا ہے۔

ایک عشرے کے بعد مدیر اعلیٰ صاحب کا خط موصول ہوا۔ ہم اپنی پیٹھ ٹھونکے جانے کی اندرونی خوشی سے نہال ہوتے ہوئے تشریف لے گئے تو مدیر اعلیٰ اور نائب مدیرہ ہمارے افسانے کو میز پر بکھرائے یوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ جیسے خدانخواستہ تخریب کاروں نے کوئی طیارہ اغوا کر لیا ہو۔ اور وہ یرغمالیوں کو چھڑانے کی تدبیر کر رہے ہوں۔ ہمارا رخِ روشن دیکھتے ہی مدیر صاحب نے پان کی ڈبیہ میں سے ایک عدد پان نکال کر گلے میں دبایا اور چٹکی سے تمباکو پھانکتے ہوئے ہر طرح سے گویا لیس ہو کر مخاطب ہوئے۔

"بی بی! آپ کا افسانہ پڑھ کر تو ہم سر پکڑ کر رہ گئے۔"

"آپ نے افسانہ لکھا یا ہمارا منہ چڑایا ہے" نائب مدیرہ بولیں۔

— قرۃ العین کے کردار رسالوں سے سوچا کرتے تھے رسالوں سے بولا کرتے تھے۔ آپ کا ہیرو بہار چند ہیرو کو اپنی پیٹھ پر لاد کر رسالوں سے [illegible] رہا ہے۔ مدیر صاحب نے [illegible] میں کہا۔

"ہیروئن روٹی [illegible] رہی ہے راستے میں ہیرو کے [illegible] ہے اور وہ [illegible] ہے۔ اسے داد [illegible]

کی جھلک تک نہیں۔ [illegible] روٹی کھاتی ہے [illegible] چور دیکھی روٹی مانگ کر کھانے پر تل گیا۔ آج کل کوئی بھکاری بھی اتنا گیا گزرا نہیں ہوتا۔ جو دال کے ساتھ سالن طلب کرتا ہو [illegible] مدیر صاحب کا پورا پورا ساتھ دے رہی تھیں۔

پہاڑوں پر اتنی گرمی نہیں پڑتی کہ مشیار میں آکاش کرنے والے [illegible] تنور کی طرف بھاگی جائیں۔ یہ تو آپ جیسی شہر میں رہنے والیوں کے چونچلے ہیں۔ دنیا کہاں پہنچ گئی ہے۔ انسان خلائی گاڑیوں میں سفر کر رہا ہے آپ کے ہیرو کو ایک عدد اعلیٰ نسل کا اسپ عربی میسر نہیں۔ بڑے دکھ کی بات ہے۔ آپ سے اچھے تو فلم پروڈیوسر ہیں۔ زندہ گھوڑوں کی قطار لگا دیتے ہیں۔ واہ واہ کیا منظر پیدا کیا ہے۔ گھڑ سوار ہیرو آ رہا ہے۔ روٹی کی ڈلیا لے کر ہیروئن گھر جا رہی ہے۔ آپ کے رنگ کو داد دینے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ آپ کی طرز تحریر اتنی دلکش ہے کہ آپ چاہتیں تو یہی افسانہ بہت خوبصورت ہو سکتا تھا مدیر صاحب نے سرد مہری کی کڑواہٹ میں تھوڑی سی چاشنی ملاتے ہوئے کہا۔

"اب دیکھیں آپ کی ہیروئن یعنی ایک پہاڑن اپنے محبوب کے انتظار میں بے چین و بے قرار ہے، آجا سورے بالما تیرا انتظار ہے۔ جیسے کہ وہ گیت گانے کی بجائے کسی شستہ اردو کا گیت گا رہی ہے۔ جو آپ نے سراسر چرا کر لکھا ہے۔

نیند آ رہی ہے۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔
نیند آنے سے تیرے جانے سے جان جا رہی ہے
نیند آ رہی ہے مجھے نیند آ رہی ہے۔

مدیر صاحب نے آنکھیں بند کر کے جنبش ابرو و مژگان بغیر حرکت دست و بازو کے ساتھ سر کے ساتھ گیت سنایا تو دل گرفتہ ہونے کے باوجود ہم بے ساختہ ہنس پڑے۔ ان کے اس اعتراض پر ہم نے [illegible] سے کہنا چاہا کہ انہوں نے جس آزمودہ گیت کا حوالہ دیا ہے وہ بھی چھپا ہوا ہے۔ مگر ہم اپنی پوزیشن کا مکمل ادراک رکھتے تھے۔ زبان بندی ہی میں عافیت تھی۔

سبحان اللہ! محبوب کے فراق میں آپ کی ہیروئن [illegible] جب کہ دنیا کے سارے عاشقوں کا [illegible] کے [illegible] کیا جو کبھی [illegible] ہے۔ [illegible] نہیں [illegible]

[illegible] بنتا ہے۔ آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ محبت کیا کرتی ہے؟ کیا آپ نے کبھی محبت نہیں کی؟" نائب مدیرہ غالباً [illegible] ہیرو کے فراق میں ہیروئن کے لیے [illegible] محبت کی تپش کو محسوس کر رہی تھیں۔
"[illegible] میں بھی وہ انسان ہوں جو ہماری رگ رگ [illegible] ڈالی۔
"[illegible] آپ نے محبت!" مدیر صاحب بات کا نیا [illegible] ہمدردی میں بدل گئے۔ ہم نے ایک نظر ان کی [illegible] اپنی قسمت پر دوسری [illegible] نظر ڈال کر [illegible] سے [illegible] لی۔

"اپنے وطن سے۔ اپنے ماں باپ سے۔ بھائیوں سے۔ اپنے آپ سے۔" ہمارے [illegible] کی تندی نے مدیر صاحب کو بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا۔

"آپ ایک چیز بھول گئیں، اپنے مذہب سے!" نائب مدیرہ نے لقمہ دیا۔

"جی ہاں آپ نے محبت کے جتنے ارکان گنوائے ان سے محبت کی نہیں جاتی بلکہ خود ہماری رگوں میں دوڑتی ہے۔ ہاں یہ سوال کہ [illegible] ہے؟ اس سے آپ نے اگر واقعی محبت کی ہے تو پھر آپ کے افسانے میں [illegible] نظر نہیں آنی چاہئے تھی۔"

"جس [illegible] کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ میری زندگی کے قریب [illegible] کہیں دور دور نہیں پائی جاتی۔"

"ہا ہا آپ خفا ہونے لگیں۔ چھوڑیئے۔" انھوں نے لڑکے کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا۔

"آپ زحمت نہ کریں۔ چائے میں پی کر آئی ہوں۔" ہم نے معذرت چاہی۔

"کوئی بات نہیں۔ ہمارے ساتھ ایک کپ اور پی لیں۔" مدیر صاحب [illegible] زندگی میں شاید پہلی بار کسی [illegible] کو چائے پلانے پر آمادہ ہوئے تھے۔ [illegible] اپنے ادارے کو ہر قیمت [illegible] پہنچانے پر ادھار کھائے بیٹھے تھے۔

[illegible]

[illegible] کا دل لرزتا جاتا ہے۔ قدرتی طور پر وہ [illegible] خواہش ہوتی ہے کہ کوئی ایسی [illegible] کہانی پڑھنے کو ملے جس کو پڑھ کر جی [illegible] آ جائے کہ [illegible] زندگی کے حقائق کہانی میں بیان کر دیے گیا حاصل؟ وہ تو سب کے سامنے ہیں۔ سب ان کو جھیل رہے ہیں۔ اس سے دست بگریباں ہیں۔ اب آپ اپنے افسانے کے عنوان کو لیجئے [illegible] اور پہاڑی [illegible] کی داستانِ الفت":

"آپ ہی نے کہا تھا کہ مختصر عنوان نہیں ہونے چاہئیں۔ قاری کے دماغ پر زور پڑتا ہے۔ وہ عنوان کا مفہوم تلاش کرتے کرتے دردِ سر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔" ہم نے اپنے [illegible] عنوان پر مدیر صاحب کا اعتراض رد کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر کوئی شاعرانہ سا عنوان ہونا چاہیے۔ ہم نے یہاں بھی شادی محبت کی راہ میں [illegible] وغیرہ وغیرہ سینکڑوں عنوان مل جائیں گے۔ آپ ماشاء اللہ خود ذہین ہیں۔ پھر دیکھیں محبوب کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کر محبوبہ خودکشی کر لیتی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ایک شام مایوس ہو کر رانی نے پہاڑ سے چھلانگ لگا دی۔ اب اس میں یہ بات کھل کر سامنے نہیں آئی کہ رانی کی موت واقع ہو گئی یا وہ پہاڑ کی دوسری طرف بہتی کسی ندی میں جا پڑی۔ کسی ماہی گیر کے جال میں آ گئی اس نے اٹھا لیا وہ بچ گئی یا مر گئی۔ یہ گومگو والی بات نہیں ہونی چاہیے۔ قاری کے دماغ پر زور پڑتا ہے۔"

"جس پہاڑ کا میں نے افسانے میں بیان کیا ہے اس پر سے اگر کوئی بھی چھلانگ لگا دے تو اس کی ہڈیاں سرمہ بن جائیں۔ پہاڑ کے آس پاس کوئی آبشار یا چشمہ نہیں بہہ رہا ہے۔" ہم نے بڑے تحمل سے کہا۔ "بہت کچھ ہو سکتا ہے؟" مدیر صاحب [illegible] آپ کا تجربہ بالکل غلط ہے۔ آپ جیسی [illegible] [illegible]

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" ہم محبت سے زیادہ [illegible] ہو چکے تھے۔

[illegible]

نظریات کی کوئی جواب نہیں ! یہ ہمارا معذرت نامہ فلم پروڈیوسروں کا ہے وہی آپ نے بھی اختیار کر لیا ہے۔" ہم نے قطعی مایوسی سے کہا۔

"ہاں ہاں آپ ایسا کریں کہ اپنا ایک رسالہ جاری کریں پھر دیکھیں کیسے ناکوں چنے چبانے پڑتے ہیں !!

"رسالہ تو ہم جب جاری کریں گے تب کریں گے فی الحال تو ہم اپنا مجموعہ چھاپیں گے۔" ہم نے عزم سے کہا۔

افسانوں کا ؟" نائب مدیرہ بولیں۔

"نہیں مجنوں کا" ہم نے چڑ کر کہا۔

"آپ کو تو یہ بھی نہیں معلوم کے ڈھنگ سے محبت کیسے کی جاتی ہے ؟ آپ کے ہاں تجربہ سوار ہو کر گرم گرم روٹی کے ساتھ محبت شروع ہوتی ہے یہ پاک محبت تو نہ ہوئی۔ یہ پیٹ کی بھوک ہوئی۔

پیٹ کی بھوک سب سے زیادہ پائدار ہے۔ اور یہ بھوک لافانی عشق کی ایک علامت بن کر ابھرتی ہے۔ جو محبت روٹی کے ساتھ شروع ہو وہ اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک کہ روٹی کی خواہش باقی رہے گی خالی پیٹ آج تک کسی کو محبت کی سوجھی ہے؟ ہم نے اختصار سے گریز کرتے ہوئے صاف صاف اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔

"آپ کا فلسفہ پڑھنے کے لئے کوئی فالتو نہیں بیٹھا ہے۔" نائب مدیرہ نے جزبز ہو کر کہا۔

"کوئی نہایت بدقسمت پبلشر ہوگا جو آپ کے افسانوں کا مجموعہ چھاپنے کی غلطی کرے گا۔ ساری زندگی سر پہ ہاتھ رکھ کر روئے گا۔ کتابت کا خرچ بھی نہیں نکلے گا۔ مدیرہ صاحبہ نے چھنگلی سے تمباکو منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔"

"ہاں ہاں آپ پہلے عشق کرنا سیکھئے، عشق کرنا سیکھئے تبھی آپ کی تحریر جاندار ہو سکتی ہے۔ عشق کی کرامات اگر بھول گئی ہوں تو کلام اقبال کا مطالعہ کریں۔ اقبال کا عشق نہایت اعلیٰ و ارفع ہے کسی بھی مقصد کے حصول کے لئے وہ عشق کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ جذبہ موجود نہ ہو تو اس کا اظہار کیسے ممکن ہے ؟ آپ سے نہایت معمولی قسم کا غلطی آسان عشق بھی نہیں ہوتا ؟ بڑے افسوس کی بات ہے۔ بی بی محبت بڑی عظیم اور پاکیزہ شے ہے آپ اسے اتنا ہلکا کیوں سمجھتی ہیں ؟ لیلیٰ مجنوں ...

کو دنیا بھی تو نہیں یاد کرتی۔

ہم اس وقت سے سوچ رہے ہیں کہ محبت کی یہ قسم کیسے اختیار کی جاتی ہے ؟ کیسے کرائی جاتی ہے اپنے اس شوق کے ہاتھوں ہمارا یہ درگت بھی بنے گی خدا نہ کرے ہم جو صفحے کے صفحے سیاہ کر رہے ہیں تو کیا اس میں ہمارا خونِ جگر اور جذبۂ عشق موجود نہیں ؟

لطیفے

نفسیاتی مشورہ

ایک خاتون ماہر نفسیات کے پاس گئیں اور اسے بتایا کہ میرا شوہر مجھ سے زیادہ اپنی ماں سے محبت کرتا ہے۔

ماہر نفسیات نے پوچھا "آپ کو کیسے معلوم ہوا" !

خاتون نے جواب دیا، گزشتہ رات میں نے اس سے دریافت کیا تھا کہ اگر ایک ہی وقت میں اس کی ماں بھی ڈوب رہی ہو اور میں بھی ڈوب رہی ہوں تو ہم دونوں میں سے کسے ڈوبنے سے بچائے گا۔" ؟

پھر اس نے کیا کہا" ؟

"اس نے کہا کہ میں اپنی ماں کو ڈوبنے سے بچاؤں گا۔"

ماہر نفسیات نے سوچتے ہوئے کہا "ہاں یہ تو بہت ہی بری بات ہے۔"

خاتون بگڑ کر بولیں "میں آپ کے پاس یہ دریافت کرنے نہیں آئی ہوں کہ کون سی بات اچھی ہے اور کون سی بری۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیئے۔"

ماہر نفسیات نے دو تین ضخیم کتابیں دیکھیں پھر خاتون کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "موجودہ حالات میں بہتر ہوگا کہ آپ جلد از جلد تیرنے کی تربیت حاصل کرنا شروع کر دیں۔"

انگوٹھی

"میری انگلی میں تم جو انگوٹھی دیکھ رہی ہو یہ مجھے جاوید نے دی ہے۔ یہ میری انگلی میں بالکل فٹ ہے۔ کتنی خوبصورت انگوٹھی ہے۔"

"ہاں ! یہ انگوٹھی بے حد خوبصورت ہے لیکن جب جاوید نے یہ انگوٹھی دی تو یہ میری انگلی میں تنگ تھی۔"

میری ننھی باجی

شکیل انصاری

اب یہ سوچا ہے کہ پتھر کے صنم ہو جاؤں گا
تاکہ گھبراؤں تو ٹکرا بھی سکوں مر بھی سکوں

(صنم ثاقب)

"جو بھی حسین شے ہے ایسی باتیں بتلائے وہ خدا کا پیغمبر ہوتا ہے"
فہیم انہونوی

فاخرہ صنم صدیقی کا اسلامی گرلز ہائی اسکول میں پہلا دن تھا۔ وہ پانچویں جماعت کو انگریزی نظم اے بی سی ڈی پڑھانے میں مصروف تھی۔ کلاس کی ساری ننھی ننھی نظریں نئی ٹیچر کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں: "یہ میں مارنے پیٹنے والی تو نہیں نا!" معصوم ذہن اس سوال میں گم تھے مگر ان کی زبان ٹیچر کے ساتھ ساتھ نظم گنگنانے میں الجھی ہوئی تھی؟

ہی ہی وی شال بی
وہی وی کانرن اور اے بی سی

اسکولوں، تعلیمی اداروں وغیرہ میں گرمی کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں مگر ابھی تک موسم گرما کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ پہلا پیریڈ آدھے سے زیادہ گزر چکا تھا۔ صنم ابھی بھی پڑھانے میں غرق تھی۔ کہ اک مہین آواز نے اسے چونکا دیا۔

"مے آئی کم اِن مس؟"

ایک خوبصورت، موٹی سی، گول مٹول چہرے والی لڑکی سامنے کھڑی تھی۔ نیلی نیلی آنکھیں جھپکاتے ہوئے۔ جس کے بالوں میں سرخ ربن بندھا تھا۔ سیب کی طرح چھوٹے چھوٹے رخساروں پر پسینے کی بوندیں جیسے شبنم میں بھیگے بھیگے گلاب! البتہ پیلیٹ کرتے پر چڑھائے ہوا لیے نظروں سے نئی ٹیچر کو تک رہی تھی۔ ہائی اسکول یونیفارم میں وہ اک ننھی سی پری لگ رہی تھی جو پرستان کا راستہ بھول کر کلاس کے دروازے پر آ کھڑی تھی۔ اس کے سرخ ہونٹ ہلے۔ آ جا ؤ۔ صنم کی محبت پر

کلاس میں ہنسی و سرگوشی کا ملا جلا شور اٹھا۔ اس لڑکی نے بھی ہنستی ہوئی آنکھوں سے نئی ٹیچر کو دیکھا اور پھر وہ ہونٹوں کو ہلکا سا خم دیکر پوچھتے ہی والی تھی کہ صنم نے ہی پوچھ لیا: "آپ کا نام کیا ہے؟"

لڑکی جلدی سے ہونٹوں کے خم کو میٹھے میٹھے تبسم میں بدل کر بولی "صاعقہ! صاعقہ پروین فقیہہ!!"

"چلئے تو ما بیٹھئے" صنم کے کہنے پر وہ دوڑی ہوئی آئی اور جلدی سے پہلے ہی ڈیسک پر بیٹھ گئی۔ اس دوران پہلا پیریڈ ختم ہو چکا تھا۔ دوسرا پیریڈ بھی صنم کا ہی تھا۔ اس نے موٹی سی صاعقہ کو پر معنی نظروں سے دیکھا اور انگریزی کی کتاب سے دوسری نظم پڑھانے کے لئے منتخب کی۔ "آپ سب لوگ میرے ساتھ دہرائیے... ہاں پڑھئے۔

لیزی میری!"

"لیزی میری!" بچیاں ایک ساتھ بولیں۔

"لیزی میری، وِل یو گیٹ اپ؟"

دن پر لگا کر اڑنے لگے۔ صنم ننھی منی بچیوں کی جنت میں کھو گئی۔ وہ ان ناتراشیدہ انمول ہیروں کو تراش کر ایسے اصنام بنانا چاہتی تھی جنہیں ساری دنیا پوجے۔ اپنے فرض کی ادائیگی میں صنم نے اپنے آپ کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ "ارے صاعقہ! تم وہ بچی کہ آئیں آپ اور وہ بھی میرے فلیٹ پر؟ کوئی کام ہے؟"

صاعقہ کو سامنے دیکھ کر صنم خوشی سے پھولے نہیں سمائی۔

"مس میں تو ابھی آئی۔ آپ کتاب پڑھنے میں مشغول تھیں!"

"ہاں" کہتے ہوئے صنم نے اپنی پسندیدہ کتاب ... پروین شاکر کی خوشبو ٹیبل پر رکھ دیا۔

"مس آپ اس محترمہ کو جانتی ہیں؟"

"کہاں؟" صنم حیران تھی۔

"ہمارا شریف ہیں! آپ ہمارے گھر آیئے! اس محترمہ کو ہمارے گھر بلا شریف ... تفصیل بیان کی۔

کشن پر کہنیاں ٹیکے ٹیکے صنم نے اشتیاق سے پوچھا: "صاعقہ آج مجھے لینے آؤ گی؟"

"ہاں ہاں ضرور آؤں گی" وہ ہنسی پھر کچھ [illegible] ہوتی بولی۔

اس کی اس دلفریب ادا پر صنم کو بہت پیار آیا۔ اور اس نے جھک کر صاعقہ کی پلکوں کو چوم لیا: "صاعقہ تم میرا ایک کام کرو گی؟ ——"

"کیوں نہیں، ضرور کر دوں گی!"

"تم میری باجی ... تمہی باجی بنو گی؟" صاعقہ ہنستی ہوئی دور بھاگ گئی اور کھلکھلاتے ہوئے بولی "مس ... آپ کی کوئی باجی نہیں؟"

—— صاعقہ کے اس سوال نے صنم کو اداس کر دیا۔ اس کے سگے تو سب ہی مگر کوئی بھی نہ تھا اس کی پیدائش سے دو ماہ قبل اس کے ابا جان کے انتقال نے اس کی امی کو دہلا کر رکھ دیا تھا۔ اپنے چچا محترم کے سایۂ عاطفت میں صنم پرورش پانے لگی۔ اس کی امی کو نہیں تمہارے ابا جانی کو تمہیں پڑھانے کا بڑا شوق تھا، مگر چچا محترم کی زیر سرپرستی ہی کیا کیا تھا کہ صنم نے میٹرک کر کے دی۔ ایڈ کر لیا تھا۔ اور واقعی چچا محترم کی وفات کے بعد یہ تعلیم معمولی ہی سہی مگر صنم کے بڑے کام آئی۔ کیونکہ چچا محترم کی زندگی میں ہی ان کے دونوں بڑے لڑکے نیاز اور ریاض ملازمت کے سلسلے میں دوبئی چلے گئے تھے۔ دولت کی فراوانی نے انہیں مڑ کر دیکھنے بھی نہ دیا۔ انہوں نے وہیں شادی کر کے گھر بسا لیے۔ اور پلٹ کر گھر والوں کی خبر بھی نہ لی کہ چچا محترم، چچی امی اور ننھی نگہت کا کیا حال ہے۔

تب صنم نے حالات سے مجبور ہو کر نوکری کر لی تھی۔ اور اس کی قلیل تنخواہ پر گھر کا خرچ چلنے لگا تھا۔ بیٹوں کی بے وفائی نے چچا محترم کو جیتے جی مار ڈالا اور وہ وقت سے پہلے ہی چل بسے۔ چچی امی بھی بیمار رہنے لگیں۔ نیاز اور ریاض کی اس طوطا چشمی کی وجہ سے صنم دل ہی دل میں چچی امی اور نگہت سے شرمندہ رہنے لگی۔ حالانکہ [illegible] نے اسے کتنا [illegible] باجی نگہت تمہاری چچا زاد بہن ہے تم اس کی باجی ہو... [illegible] ریاض کی بہن ہی [illegible] اپنے [illegible] والدین کو بے سہارا چھوڑ دیا [illegible] کسے [illegible]

"[illegible] باجی بھی نہیں؟" [illegible] صاعقہ کے سوال نے صنم کو [illegible]

"کیا —— ؟" صنم کو شاک لگا۔

"یعنی انجم کی امی کے انتقال کے بعد پاپا نے [illegible] میری امی سے شادی کی؟" صاعقہ نے اسے بتایا۔

"یوں تو اسے سب کچھ پتا ہے۔ یہ صرف چھوٹی ہی نہیں ہوشیار نہیں بلکہ واقعی ذہین ہے!" صنم نے سوچا۔

"بس پھر آپ مجھے صاعقہ باجی کہیں گی نا؟"

"ہاں ہاں ضرور کہوں گی!" صنم نے ہنسی [illegible] مسکراتے ہوئے کہا اور [illegible] صاعقہ کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

"تھینک یو مس!" یہ کہہ کر صاعقہ تو [illegible] کر چلی گئی مگر جیسے صنم کے دل میں کچھ رکھ گئی ہو ——

دیکھتے دیکھتے ہفتہ گزر گیا۔ اور جمعرات کا دن آ گیا۔ مہینے کی آخری تاریخ کی وجہ سے آج اسکول میں آدھے دن کی چھٹی تھی۔ شام کو صنم اپنے فلیٹ میں کپڑے دھو رہی تھی کہ دروازہ کھلا "چلئے مس [illegible] پانچ بج گئے!"

صنم نے مڑ کر دیکھا، صاعقہ دروازے میں کھڑی تھی: "ہاں ہاں چلو میں تو چلنے کی تیاری کر رہی تھی!" کہتے ہوئے صنم اٹھ کھڑی ہوئی۔

—— صاعقہ کے ڈیڈی مسٹر اعجاز احمد فقیہ گورنمنٹ سروس میں تھے اور [illegible] کے عہدے پر کام کرتے تھے۔ وہ صاعقہ کو پیار سے صاقی پکارتے تھے... اسی لئے انہوں نے اپنے گھر کا نام بھی صاقی ہی رکھ چھوڑا تھا۔

خوبصورت دو منزلہ سفید مکان کے داخلی دروازے کے اوپر ایک چھوٹی سی لکڑی کی تختی لگی ہوئی تھی جس پر خوشنما سرخ حروف میں صاقی لکھا ہوا تھا۔ جس وقت صنم صاقی [illegible] مگر [illegible] ہوئی صاعقہ کے ڈیڈی اعجاز فقیہ نے [illegible] کا استقبال کیا اور صاعقہ کی امی [illegible] بیگم نے بھی [illegible] صاعقہ [illegible] تعریفیں کر کے پہلے ہی صنم کو [illegible] کر دیا تھا۔ صاعقہ کی امی بڑی نیک دل اور ملنسار خاتون تھیں۔ انہوں نے [illegible] صنم [illegible] کے کھانے پر [illegible] صاعقہ نے صنم کو سارا گھر [illegible]

قسم قسم کے پودے اور پھولوں کی کیاریاں دیکھ کر صنم کو جارج ایلیٹ یاد آگیا جب مکان میں چھوٹے چھوٹے ہوں، خوب بڑے پودے لگے ہوں اور اس کی کھڑکیاں کھلیں تو سامنے نکلے ہوئے سورج کی کرنوں سے چمکتی ہوئی پیڑوں کی پتیاں نظر آئیں تب ہی وہ ایک پرمسرت اور اچھا گھر بنتا ہے!"

صنم، سلمیٰ بیگم اور صاعقہ پھولوں کے کنج میں پڑی بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صاعقہ خس اور صندل کا شربت لانے اندر گئی تو صنم نے سلمیٰ بیگم سے پوچھا۔ "فہیم نظر نہیں آئے؟" ——— "بیٹی وہ دوسرے شہر میں پڑھتا ہے نا، ہوسٹل میں رہتا ہے۔" تبھی صاعقہ شربت کی ٹرے لئے ہوئے لوٹ آئی۔ جب وہ صنم کو زعفرانی رنگ کا گلاس تھمانے لگی تو صنم سے رہا نہ گیا۔ "صاقی تمہارا نام تو ساقی ہونا چاہیئے تھا" سلمیٰ بیگم مسکرا دیں صاعقہ بھی ہنسنے لگی پھر منہ دبا کر بولی "اللہ مس، آپ نے مجھے ساقی کہہ دیا؟" "اوہ سوری! صاعقہ باجی۔۔۔" صنم نے جلدی سے کہا۔ سلمیٰ بیگم نے حیرانگی سے آنکھیں گھمائیں "ارے یہ کیا۔ صاعقہ باجی کیسے؟"

"مس صاعقہ میری ننھی باجی ہے" صنم نے بتلایا تو وہ کہنے لگیں "واہ یہ خوب رہا وہ تو تمہیں مس کہتی ہے۔ اے صاقی اب تم انھیں دیدی کہوگی، صنم دیدی! سمجھیں؟" "جی امی!" صاقی کی فرماں برداری دیکھنے کے قابل تھی ———

——— اس طرح صاقی اور صنم ایک اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے۔ ہائی اسکول میں، لائبریری میں، شاپنگ سینٹر میں، پارک میں، دریا کے کنارے چہل قدمی کرتے ہوئے ہر جگہ صاقی اور صنم ساتھ ساتھ ہوتے۔ جب کوئی صنم کو نہ پہچانتا تو ہائی اسکول کی لڑکیاں جھٹ کہتیں "ارے وہ مس جو صاقی کے ساتھ میں رہتی ہیں!" اس طرح صنم اور صاقی ایک دوسرے کا تعارف بن گئیں۔

کئی بار صنم کو اس کی ساتھی ٹیچروں نے ٹوکا بھی کہ وہ اس ننھی سی بچی کے ساتھ کیوں رہتی ہے؟ مگر صنم پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے صاقی میں بڑی کشش محسوس ہوتی۔ سیدھی سادی صاقی، باغیچے میں پیڑ پودوں کے درمیان بیٹھنے والی، سبزہ زاروں میں دوڑنے والی، کتابوں میں کھوئی رہنے والی، معصوم تر گوشوں کی دوست کو صنم نے اپنا سہیلی بنا لیا تھا۔

معصوم صاقی ہمیشہ خوش رہتی۔ کتابوں کو لئے لئے باغیچے میں گھومتی۔ انھیں بار بار صاف کرتی۔ ایک الماری سے دوسری الماری میں منتقل کرتی۔ اپنی کتابوں میں سبز پتے رکھتی۔ اور پھولوں کی خشک پنکھڑیاں کو چومتی۔ اس کے چھوٹے سے کمرے کی کھڑکی سے پھولوں کی کیاریاں اور پودے اپنی جھلک دکھلاتے، کھلے دریچے بھینی بھینی خوشبو کی سوگندھ بن جاتے۔ اور درختوں کے پتے اپنی سرسراہٹ سے صاقی کو لوری سناتے۔

صاقی جتنی کمسن تھی۔ اتنی ہی حساس تھی۔ ہر آنکھ کا آنسو اُسے اپنے دل کا لہو محسوس ہوتا۔ ہر ایک درد دکھ اپنے جگر میں پاتی۔ اور کسی کا بے خلوص کا ہلکا سا تبسم اُسے مدتوں شاداب رکھتا۔ کسی بھی زندگی کا لمحہ بھر کا ساتھ بھی، وہ فراموش نہ کرپاتی۔ ہر اچھائی کو اپنی پلکوں میں چھپا لیتی۔

رویندر ناتھ ٹیگور نے کہا تھا کہ دنیا میں پیدا ہونے والا ہر بچہ خدا کا یہ پیغام لاتا ہے کہ اے انسان میں ابھی بھی تجھ سے مایوس نہیں ہوا ہوں..."

صاقی نے خدا کا یہ پیغام بڑی دیانتداری سے دنیا والوں کو پہونچایا تھا۔

صنم نے صاقی کی اس لاشعوری پیاس کو محسوس کیا جو نیکی اور محبت سے سیراب ہوسکتی تھی۔ صاقی کے معصوم احساسات اور بھولپن نے صنم کی روح میں گھر بنا لیا تھا۔ اور اب انجام یہ تھی کہ صنم کی روح صاقی کی معصومیت کا گھر نہ رہ کر خود بھی صاقی کی معصومیت میں پنہاں ہوگئی تھی ———

آخر ایک دن صنم کو صاقی کی دیدی بننے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ صاقی کی سالگرہ تھی۔ اور صنم نے اسے اس کی برتھ ڈے پارٹی میں ایک خوبصورت گلابی میکسی کا سوٹ دیا۔ صاقی نے اس تحفہ کو بہت بہت پسند کیا۔ میکسی پہنے پہنے وہ درختوں سے لپٹ گئی۔ معصوم پرندوں کو اپنا نیا سوٹ دکھلایا۔ سبزہ زاروں میں گھومتی پھری۔ دریا کے کنارے سیپ اور گھونگھروں کو میکسی کی سُرخی سے لالہ زار کردیا۔ درختوں کو میکسی کے دامن کی ہوا دی۔ ننھی پھری کو میکسی کی آستین میں چھپا لیا۔ میکسی پہنے ہوئے صاقی ایک بجلی سی گڑیا تھی۔ جب جب صنم اُسے دیکھتی صنم کا خون سیروں بڑھ جاتا اور صنم نہال ہو جاتی۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔ اس سے صنم بے خبر تھی۔

صنم صاقی کی محبت میں دنیا جہاں کو بھلائے ہوئی تھی۔ کبھی کبھار گھر سے نکہت کا کوئی خط آجاتا۔ جس میں گھر کی حالت اور کبھی امی کی بیماری کا مفصل حال درج ہوتا۔ صنم خط پڑھ کر چڑھ جاتی کہ اپنی ساری تنخواہ تو میں انہیں بھیج دیتی ہوں۔ برائے نام ہی اپنے لئے رکھتی ہوں پھر بھی یہ لوگ گھر کی حالت بڑھا چڑھا کر بیان کر کے خواہ مخواہ مجھ کو پریشان کرتے ہیں۔ صنم نکہت سے متنفر تو تھی ہی جواب خط میں ایسے الٹی سیدھی باتیں لکھ دیتی۔ مگر نکہت کے خطوط برابر آتے رہتے تھے۔ آج بھی نکہت کا ایک ایسا ہی خط آیا تھا۔ نکہت اسکول ٹرپ پر کہیں جا رہی تھی۔ اس کے لئے اسے سو روپے چاہیئے تھے۔ صنم کو بڑا غصہ آیا۔ وہ بغیر کچھ کھائے پیئے ہی اسکول کی طرف چل دی۔ اور وقت سے پہلے ہی پہنچ کر بور ہوتی رہی۔ گھنٹی بجی اور وہ پہلا پیریڈ لینے پانچویں جماعت میں داخل ہوئی۔ صاقی غیر حاضر تھی۔ اس نے تھوڑا انتظار کیا اور پڑھائی شروع کر دی۔ پیریڈ شروع ہوئے بیس منٹ ہو چکے تھے صاقی کا پتہ نہ تھا۔ صنم کو اس کی بڑی ضرورت تھی۔ بڑا انتظار تھا۔ وہ بار بار دروازے کی جانب دیکھتی۔ صنم کا پڑھانے میں بالکل دل نہ لگا۔ پیریڈ بھی ختم ہونے کو آیا مگر صاقی نہیں آئی۔ تبھی اسکول کا چپراسی دوڑتا ہوا آیا۔ اور ہانپ کے بولنے لگا۔ "مس صاحبہ آپ کو بلایا ہے۔" وہ ہانپنے لگا۔ صنم گھبرا گئی۔ "صاقی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے!!"

اس کے الفاظ کیا تھے گرم گرم سیسہ تھا جو صنم کے کانوں میں اترتا چلا گیا۔ پرنسپل سے کہہ کر صنم ——— اسپیشل بھاگی سول ہاسپٹل کے احاطہ میں کافی بھیڑ دیکھ کر صنم کا دل دہل گیا۔ صاقی کی امی سلمیٰ بیگم اور ڈیڈی اعجاز فقیہ ہچکیاں لے لیکر رو رہے تھے۔ صنم کسی کے بھی پاس نہ رکی اور تقریباً دوڑتی ہوئی صاقی کے وارڈ میں داخل ہوئی۔ پاس پڑوس کی عورتیں منہ میں آنچل دبائے رو رہی تھیں۔ ابھی ابھی تو تھی ...... لڑکی اپنے بھائی کو منی آرڈر کرنے گئی تھی۔ اس کا بھائی دوسرے شہر میں پڑھتا ہے ...... پوسٹ آفس جاتے جاتے ہی ٹرک نے اسے کچل ڈالا۔!.... اس سے آگے صنم کچھ نہ سن سکی۔ وہ چلی صاقی آکسیجن سے بندھی تھی۔ صنم اس کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اس کے سر کو اپنی گود میں لے لیا۔ صاقی نے تھرتھراتی پلکیں کھولیں۔ اور درد بھری نظروں سے صنم کو دیکھنے لگی۔ "پانی ....." اور وہ کراہی صنم نے جلدی سے پانی کا چمچہ اس کے سوکھے ہونٹوں سے لگا دیا۔

"مس ....." اس نے اپنے ہونٹ کاٹ لئے ... "نہیں صنم دیدی آپ؟" وہ ہولے سے مسکرائی۔ وہی میٹھا تبسم جو ہونٹوں کے پیچھے سے خم پیدا ہوتا تھا۔ "ہاں .... میں صاقی میں!" صنم قریب قریب چلا پڑی۔ "دیدی .... صاقی تڑپی "میری شمعی باجی، نہیں" صنم کی آواز لرز رہی تھی۔ اچانک صاقی کی گردن ڈھلک گئی۔ شربت کے جام پلانے والی صاقی کو ایک قطرہ پانی بھی نہ ملا۔ وہ تشنہ کام جلدی پیاسی کی پیاسی رہ گئی۔ اس کا شعور، لاشعور، جسم، دل و جان تشنہ رہا۔ پیاسا رہا۔ اور وہ اس خدا کے پاس چلی گئی جس نے اس کو دنیا میں اچھا پیغام بر بنا کر بھیجا تھا۔ نیکی سے اچھی بات بتلانے کو! انسان کو کہ تیرے انسان خدا ابھی بھی تجھ سے مایوس نہیں مگر افسوس دنیا والوں نے خدا کے قاصد کو بڑی بے دردی سے شہید کر دیا۔

صنم کو زوروں کی ہچکی آئی۔ اور سارے ہاسپٹل میں کہرام مچ گیا ...

صاقی ... چلی گئی۔ بہت دور۔ بہت دور کبھی نہ لوٹنے کے لئے

... دور! ———

— صاقی کے بعد صنم ٹوٹ چکی تھی۔ ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے دل کو سمیٹا اور اپنے فرائض کی طرف متوجہ ہوئی۔ جب کلاس میں بچے ایکساتھ پڑھتے ...

لٹل برڈ

دنس آئے سارے لٹل برڈ

کم ہوپ، ہوپ، ہوپ

صنم کی خاموش نگاہ سامنے کے خالی ڈیسک پر پڑ جاتی۔ پورا کلاس روم ویران سا لگ پڑتا۔ وہ کھڑکی سے خلاء میں تکنے لگتی جہاں سے ایک ننھی تیتری اپنے پر پھڑپھڑا کر دم سادھ گئی تھی۔

— ایک سہ پہر کا ارادہ صنم کے قدم صاقی کے گھر کی طرف چلے۔ اعجاز فقیہ دورے پر تھے۔ گھر میں سلمیٰ بیگم اکیلی تھیں۔ انہوں نے صنم سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ صنم صاقی کے کمرے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ سامنے کھلی کھڑکی سے درختوں کی شاخیں بے قرار ہو کر اشارے کر رہی تھیں اور سامنے ہی ہار لگی صاقی کی تصویر رکھی تھی۔ صنم ...

[illegible] اور جلدی سے نظریں بچاکر [illegible] میں کچھ بلیلیں کاغذ کے ڈھیر [illegible] تھے اس کے ڈھیر [illegible] ختم ہو چکا تھا۔ کتنی بڑے ہینگر پر [illegible] اس کے اندر کی صاقی ختم [illegible] ایک ڈھیر ری تھی۔ میری بھی... [illegible] کے لئے ... ایک خوابی تھی ایک لقاب [illegible] ایک پردہ [illegible]

صنم نے یونہی ٹیبل کی دراز کھولی۔ ایک فرا تراشی آرڈر فارم [illegible] اس پر صرف اتنا لکھا ہوا تھا "بخدمت بھائی فہیم اختر [illegible]"۔۔۔ صنم کے ہاتھوں میں ادھورا منی آرڈر فارم [illegible] بہت بہت قربان ہونے والی لڑکی تھی۔ [illegible] کے گھر کے کام کاج میں بہت مدد کرتی تھی۔ سکی بیگم نے سکول [illegible] شروع کیا۔ فہیم کو میٹرک میں ڈسٹنکشن ملا تھا۔ [illegible] نے وقت ماں باپ کی طرح کہا تھا۔ "کچھ نہیں بھائی جان [illegible]" صنم ضبط کئے سنتی رہی اور۔۔۔

اور یہ صاقی خود ہر ماہ اپنے جیب خرچ کی رقم اپنے بھائی کو بھیج دیتی تھی۔۔۔۔ سکی بیگم بولتی رہیں۔ مگر صنم تو آنسوؤں میں [illegible] ہو چکی تھی؛ ایک یہ صاقی ہے! اور میں؟ خواہ مخواہ معمولی باتوں پر گھر والوں پر بگڑتی ہوں۔ نجمت کو برا بھلا کہتی ہوں۔ [illegible] برتتی ہوں۔ فہیم تو صاقی کا سوتیلا بھائی تھا۔ سگا نہ تھا۔ کتنی سمجھدار اور قابل لڑکی تھی یہ! سوتیلے بھائی کے لئے اپنا جیب خرچ بھی قربان کر دیتی تھی۔۔۔ اور کیا وہ بھی خود صاقی کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔۔۔ نئے فراک، رنگین نیل پالش، [illegible] نیکلس اور بیسیوں چیزیں ہیں۔ مگر صاقی نے ہر وقت اپنے بھائی جان کے لئے ایثار کرتی رہی [illegible] اس کے لئے اپنی جان بھی دے دی۔

[illegible] میری [illegible]

صنم سکی بیگم کے پاس سے [illegible] [illegible] جب [illegible] اندر [illegible]

اس نے فہیم اختر نفیسہ کا ادھورا فارم پورا کیا۔ [illegible] رسید وصول کی۔ واپس جانے لگی پھر [illegible] پہنچ کر [illegible] منی آرڈر فارم خرچ اور [illegible] کے لئے [illegible]

[illegible] یہاں محبت ہے یہیں صدیقی میری نظمیں ناقص!!! ۔۔۔
کہیں دور دور پہاڑی کے دامن میں ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے گلاب کی کلیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کسی خرگوش جیسے [illegible] کی طرح کوئی چمکدار ستارہ ٹوٹا اور پاگل ہوا گلاب کی خوشبو کو نچے میں ضم نہ کر سکی بلکہ دیوانہ وار دوڑ کر اسے بکھیرنے لگی!!!

چاند کا جوڑا ہوا سرخ گلاب
تیری دیکھے تو پاگل ہو جائے

"شکیل انصاری"

مشرف تمیز

کا ایک مشہور ناول جو عرصہ سے نایاب تھا

صباحت

جس میں دکھایا گیا ہے۔ غیر خاندان میں شادی کرنے کے بعد کیسی خاندانی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں اور کس طرح ایسا اقدام کرنے والے کی لڑکی صباحت کو شرافت کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں کیسے کیسے پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں۔
پاکیزہ عشق و محبت کی ایک ایسی کہانی جو ہر گھر میں پڑھی جا سکتی ہے۔
قیمت [illegible] روپیہ

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]

ہاتھوں میں لے کر ہونٹوں سے لگا لیے۔ ان کے لمس کے [illegible]
[illegible] وہاں سے [illegible] وہ [illegible] [illegible]
[illegible] وہ کچھ اور قریب ہوگیا۔ اس کی گرم گرم [illegible]
لگتا ان سے اُبلتے ہوئے لاوے کی طرح میرا چہرہ جلانے لگی تھیں آنکھیں
بند ہونے لگیں۔ میں جیسے بالکل ہلکی ہو کر اوپر اوپر اور لطیف فضا
میں تیرنے لگی تھی۔ میرے چاروں طرف قوس قزح کے ساتوں رنگ
بکھر گئے۔ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔ اگر دفعتاً کسی کی کھٹ کھٹ اور دل پر چھائے
فسوں کو توڑ نہ دیتی۔ دفعتاً ہل کر جو ہٹ گیا تو میں [illegible] سنبھل چکی
تھی۔

فریب

عطیہ ہدایت اللہ

فائل بند کر کے حسنہ باجی ہولے سے مسکرائیں: ”تو وہ آگیا تمہارا
چہیتا۔ ہمارے کانوں موٹر سائیکل بہت پیٹا تا!“

اور میں نے بے اختیار رسٹ واچ کی طرف دیکھا اوہ چار بج گئے
[illegible] کام [illegible] جانے کر رہی رہے گا باجی۔

”تم کیوں جان مشکل میں ڈال رکھی ہے اس شاہ بیگم اس لیے بچوں کے
نیچے سے شادی رچاؤ اور اطمینان سے ہنڈیا میں ڈوئی چلاتی رہا۔“

میں کوئی جواب دینے ہی والی تھی کہ سہیل جا بیوں کا گچھا گھماتا
ہنستا مسکراتا اندر آگیا۔ ”ہیلو باجی کیسی ہیں آپ؟“ ”جیتے رہو بس گزر رہی
ہے۔“ حسنہ باجی سرد سے لہجے میں بولیں۔ سہیل کے ساتھ ان کا رویہ کبھی
حوصلہ افزا نہیں رہا۔ اسے دیکھ کر باجی کی آنکھوں میں ہمیشہ ناگواری کا رنگ
چھا جاتا لیکن میرے ساتھ پچھلے چھ ماہ سے بینک کی اس لڑکی میں ان
کا رویہ اتنا مشفقانہ اور حد درجے دوستانہ رہا کہ مجھے ان کے اس رویہ
کی ذرہ برابر پرواہ نہیں رہی۔ سہیل کو دیکھ کر حسب معمول میرا رنگ گلنار
ہوگیا۔

”ہوں.... تو آج پھر اس کے ساتھ کہیں باہر جانے کا پروگرام ہوگا
تبھی میں کہوں آج صبح سے اتنی خوش کیوں ہو، لباس میں اتنی سج دھج
اور لیس سینٹ کی خوشبو کیوں لپٹیں اڑا رہی ہے؟“ حسنہ باجی نے ہلکی
سی معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دے کر کہا اور میں بڑی جلدی میں غالب
بند کرتی فائل دراز میں ٹھونس ٹھانس کر بھاتی شرماتی باجی کو خدا حافظ
کہتی سہیل کے ساتھ چل پڑی۔

[illegible] کے [illegible] میں [illegible] کٹ سے [illegible]
[illegible] جا رہی تھی۔ سہیل کی والہانہ نظروں کا خمار اپنے چہرے
[illegible] میرے رخساروں میں [illegible] تھے۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

سہیل اب علیں جو بچ گئے ہیں۔ آج پھر اسی سے جھگڑے ہی پہلے
[illegible] ہیں گے۔

ہاں چلو۔ لیکن پرسوں پھر اسی جگہ ملاقات ہوگی۔

لیکن سہیل ابھی سے روز روز بینک کے کام میں زیادتی کا پہلو
کے میں تھک چکی ہوں۔

تم جاؤ اور تمہارے بہانے لیکن مجھے تمہیں پرسوں [illegible]
[illegible] یاد کرتے رہنا ہے ورنہ۔

ورنہ کیا سہیل؟

ورنہ تمہارا سہیل مر جائے گا۔ اپنی جان دے ڈالے گا!

آخر اس طرح کب تک کام چلے گا کچھ کرو نا ہم کب تک یوں
چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے۔ تم اپنا بندوبست کیوں نہیں کر لیتے ہیں،
[illegible] شرماتے [illegible] سہیل کے ساتھ [illegible] والے [illegible]
سے گزرتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

ہاں اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اچھا چلو اب گھر [illegible]
کچھ سوچا کریں گے۔

صبح میں بینک پہنچی تو حسنہ باجی [illegible] بالوں کی [illegible]
[illegible] کام میں [illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

...رہی ہیں۔ ارشد، شبل اور فاطمہ تو ٹھیک ہیں نا؟"
"سب خیریت ہے۔ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہوں گی۔ لیکن جب تم فرصت نکال سکو۔"

"کیوں۔ کیوں۔ کیا۔ بہت ضروری باتیں ہیں۔ اللہ باجی ایمان سے میرے پیٹ میں تو ابھی سے کھدبدی سی مچ گئی ہے۔"

"نہیں ایسی بھی ضروری نہیں۔ اچھا چلو اچھے بچوں کی طرح اب اپنی سیٹ پر چلی جاؤ اور شروع کر دو۔ اپنی ڈیوٹی۔ دیکھو لوگ آنے شروع ہو گئے ہیں۔" اور میں الجھی الجھی سی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

حنہ باجی کیا کہنا چاہتی ہیں۔ یہی سوچتی رہی۔ ویسے میں جانتی تھی کہ جو بات بھی ہوگی وہ میری ہمدرد بن کر کریں گی۔ ان کی ہستی تو میرے لئے قابل تکریم ہے۔ میرا اور ان کا ساتھ چھ ماہ سے ہے۔ بی۔ اے کے بعد نوکری کی درخواست دی جو مذاق مذاق میں منظور ہو گئی پہلے ہی دن ٹریننگ سے آکر جب یہاں پوسٹنگ ہوئی تو حنہ باجی نے اتنے پیار سے ہاتھوں ہاتھ لیا کہ میں اپنی تمام گھبراہٹ بھول گئی۔ انھوں نے مجھے حقیقی بہن سے زیادہ پیار دیا۔ ویسے انھوں نے اپنی شخصیت پر بڑے دبیز پردے ڈال رکھے تھے۔ انھوں نے باوجود کریدنے کے کبھی اپنے حالات تفصیل سے نہ سنائے۔ سوائے اس کے کہ ان کے شوہر نہیں ہیں اور ان کے تین بچے ہیں۔ صبح بچے اور وہ ایک ساتھ ناشتے دان سنبھالے خاموشی سے اپنی اپنی راہ لیتے۔ چونتیس پینتیس سال کی یہ خاتون مجھے برسوں کی شناسا لگتیں۔

سہیل سے میری ملاقات چھ ماہ پہلے ہی ہوئی تھی۔ اس وقت سے لے کر اب تک اس سے ملاقات کا رتی رتی حال میں حنہ باجی کو سنائے بغیر نہ رہتی۔ لیکن بس ان کی یہ عادت کبھی کبھی ناگوار گزرتی کہ وہ مرد کی محبت پر کبھی یقین کرنے کو تیار نہ ہوتیں۔ سہیل سے میرا میل ملاپ انھیں پسند نہ تھا۔ ڈھکے چھپے لہجے میں اعتراض بھی کرتی رہتیں۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود میں ان سے والہانہ پیار کرتی تھی۔ اور پھر سہیل نے جس شراب محبت کے ذائقے سے مجھے روشناس کروایا تھا۔ اس کا نشہ بھلا ان کی دبی دبی نصیحتوں کی ترشیوں سے کہاں اتر سکتا تھا۔ میں تو ایک سہانے خواب کے سحر میں گرفتار تھی جس کا آغاز نہایت خوبصورت تھا اور انجام سے مجھے فی الحال کوئی واسطہ نہیں تھا۔

دوپہر کے دو بج گئے حنہ باجی ٹفن اور تھرموس اٹھا کر میرے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھیں۔ "آپ واشروم جانے سے ٹھٹکا کر بولیں۔ "آؤ بھئی کچھ ہلکا سا کھانا ہو جائے کافی دیر ہو گئی تھی۔ کچھ کھائے پیئے بغیر کام کی تھی۔" آملیٹ والے سینڈوچ کھا کر تھرموس میں سے گرم چائے پی۔

"ہاں تو حنہ باجی آپ کیا بات کرنے والی ہیں؟" میں نے اطمینان سے میز کے نیچے پیر پھیلاتے ہوئے کہا۔ اس وقت وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

"شاید ہر انسان کو خدا نے اتنی سمجھ اور سوجھ بوجھ ضرور دے رکھی ہے کہ وہ اپنے لئے برے اور اچھے راستے میں سے بہتر راہ کا انتخاب کر سکے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی باجی۔"

"مطلب صاف ظاہر ہے تم جن شعلوں میں ہاتھ ڈالے دے رہی ہو۔ وہ تمہاری تباہی کا راستہ ہے۔"

"ارے باجی جب آگ میں کود ہی پڑے تو انجام کا کیا سوچنا۔ اور پھر سہیل پر مجھے اپنی سانسوں سے زیادہ اعتبار ہے۔ وہ میرے لئے از حد مخلص ہے۔ اس کا کوئی نہیں، وہ امی ابو بھائی کو راضی کر کے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"کیا واقعی وہ دنیا میں اکیلا اور سچا آدمی ہے؟" حنہ باجی کرسی پر آگے جھک کر میری آنکھوں میں جھانک کر رہ گئیں۔

"باجی میں سچ کہتی ہوں اس کا کوئی بھی نہیں وہ بڑا دکھی، بڑا اکیلا اور دنیا کا ٹھکرایا ہوا انسان ہے۔ باجی میں نے عرصے تک اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے سے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ بینک کے لئے بس سے اترتے ہوئے جب میرا پاؤں پھسلا اور مجھے دو مضبوط ہاتھوں کے حصار نے گرنے سے بچا لیا۔ اسی وقت جب میں نے سر اٹھا کر اس کی بھوری سحر انگیز آنکھوں میں جھانکا تو میں بڑی ہی آسانی سے اپنا دل ہار گئی۔ لیکن چھ ماہ تک میں نے اسے اپنے وضع کردہ اصولوں کی زنجیر سے ایک انچ بھی آگے سرکنے نہیں دیا تھا۔ آندھی آئے، پانی برسے، چمکیلی دھوپ ہو یا کڑکڑاتی سردی۔ [illegible] جب وہ بے چارا اسی بس اسٹاپ پر میری ایک نگاہ کرم کی بھیک [illegible] آخر کو میں بھی انسان تھی پتھر تو نہیں تھی نا۔ اس کی [illegible] آنکھوں کی التجا سے دل [illegible]

کے پیار میں اس حد تک ڈوب چکی ہوں کہ واپسی کا امکان نہیں۔ میرے لئے شدید ترین عذاب یہ کم نہ ہوگا۔ وہ تو میرا آئیڈیل ہے، وہ ٹھکرا دیا جاتا ہے، تحفظ دینا چاہتا ہے جو شجر ہے جس پر وفا کا مقام دیا جاتا ہے۔ وہ۔ وہ میں شدید جذباتیت کی زد میں تھی۔

"بالکل وہی باتیں، وہی احساسات، وہی جھوٹا اثر وہی پھنسانے والا جال" باجی خلاؤں میں گھورتی آہستہ سے بڑبڑائیں۔

باجی آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟

کچھ نہیں نوشابہ بہر حال تم [illegible] کسی دن ہمارے گھر ضرور آنا۔ میں تمہیں ایک کہانی سناؤں گی۔ پھر فاطمہ بھی تمہیں یاد کر رہی ہے۔

میں نے کہا کیا امی نے آپ کو میرے اور نادر بھائی اتفکین کے رشتے کے لئے مجھے پھنسانے کی التجا تو نہیں کی۔ ان کا آج کل یہی موضوع ہے۔ لیکن اگر ایسا ہے تو معاف کرنا آپ کو اپنے ارادوں میں ناکامی ہوگی۔

ایسی کوئی بات نہیں برتن سمیٹو اور کام کرو۔ اب باقی باتیں جمعہ کو ہوں گی سمجھیں۔ باجی نے مسکرا کر بات کا موضوع بدل دیا۔ دوسرے دن میں پھر شیراز کے گوشے والی میز پر بھاپ اڑاتی چائے کے گھونٹ بھر بھر کر سہیل سے ڈھیروں باتیں کئے جا رہی تھی۔ اچانک سہیل نے جھک کر بڑے رسان سے پوچھا۔ ڈشی بھلا بتاؤ تو کیا تم بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہو جتنا پیار میرے دل میں تمہارے لئے ہے؟

"سہیل دل چیر کر دکھانے کی چیز تو نہیں۔ میں منہ سے کہوں۔ تم میری آنکھوں میں جھانک کر پڑھ لو۔"

میں نے شرمائی شرمائی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

نوشابہ تم مجھے یاد کرو گی نا؟ سہیل نے پہلو بدل کر پوچھا۔

"بھلا آپ میری نظروں سے دور کہاں رہیں جو یاد کروں گی۔ ہر تیسرے چوتھے دن ملتے ہیں نا۔" میں دھیرے سے ہنس پڑی۔

میں نظروں سے دور ہی تو جا رہا ہوں۔ یعنی تو بچھڑ رہا ہوں۔

ہائے اللہ کہاں۔ کب۔ مارے گھبراہٹ کے [illegible] میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"ارے ارے اتنی ہی کیا گھبراہٹ۔ ڈشا بیگم" سہیل نے میرے [illegible] ہاتھ پر [illegible] ہاتھ رکھ دیا۔ اور میں [illegible] ہو گئی۔

میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ زمینوں سے متعلق [illegible] حساب کتاب کرکے تم کو بند و بست کرنا ہے اور پھر [illegible] ابھی کچھ پاؤں میں [illegible] جاؤں گا اور کہوں گا۔ یا [illegible] زندگی فوراً میرے حوالے کر دیں ورنہ

"ورنہ کیا سہیل؟" ورنہ آپ کا یہ [illegible] پستول کی ایک گولی [illegible] کام تمام کر دے گا۔ کیا وہ اتنی ظالم ہوں گی کہ میری التجائیں ان کا دل [illegible] سکیں میری جان"

"اف تم یہ سب کہو گے تو وہ لوگ کیا سوچیں گے؟"

کیا سوچیں گے۔ یہی سوچ جائیں گے کہ لڑکا پاگل ہو گیا ہے۔ کیوں [illegible] گردن پر [illegible] ایک معمولی سی لڑکی کا ہی تو سوال کرتا ہے [illegible] کر دے [illegible] تمام پر۔

اور میں ہنستی ہنستی دوہری ہو گئی۔

اس دن حسنہ باجی نے آفس سے چھٹی لے رکھی تھی اس لئے میں جلدی گھر آگئی۔ دوسرے دن جمعہ تھا نہا دھو کر گھر کے چند کام نمٹا کر میں امی سے اجازت لے کر باجی کے گھر گئی۔ چھوٹے سے صاف ستھرے مکان کے کچے آنگن میں باجی نے پر خلوص بانہیں پھیلا کر استقبال کیا [illegible] کی اور باجی گرم گرم سموسوں اور پکوڑوں کی پلیٹیں لئے درخت کی چھاؤں میں آ بیٹھیں۔

باجی آپ کل کہاں غائب تھیں [illegible] میں ذرا بھی دل نہ لگا۔ نصیب دشمناں طبیعت تو ناساز نہیں تھی نا۔

نہیں ڈشی کل میں کسی سے ملنے گئی تھی۔ [illegible] ضروری کام تھا۔ اچھا تم بیٹھو میں ابھی آتی ہوں چلو بچو تم کمرے میں جا کر اپنا ہوم ورک مکمل کرو۔ حسنہ باجی نے کمرے میں جاتے جاتے بچوں کو حکم دیا۔

جب وہ باہر آئیں تو میرے سامنے ایک خوبصورت البم کر دیا۔

"نوشابہ تم اسے دیکھو تو آج میں تمہیں اپنی زندگی کے [illegible] گوشے کی سیر کراؤں گی۔ میں نے ایک سال بڑی [illegible] میں گذار دیا میں نے کسی سے [illegible] نہیں [illegible] نہیں سناؤں۔ لیکن تم مجھے بہت [illegible] عزیز [illegible] زندگی بچانا چاہتی [illegible] کا انکشاف کرنے کے لئے بلایا۔

جب سے [illegible] میں نے چاہا ہے [illegible] شروع کی

[illegible] حسنہ باجی کی شکل بھی ایسی تھی اور تھیں ان کے [illegible] باجی جوانی میں [illegible] [illegible] کر دیکھ کر مبہوت ہو گئی۔ میں نے البم کا ورق پلٹا تو ایک نوجوان کی تصویر تھی۔ میں [illegible] کہ میں نے اس نوجوان کو کہیں دیکھا ہے۔

"کون ہے یہ باجی؟"

ابھی حسنہ باجی کوئی جواب نہ دے پائی تھیں کہ میں نے البم کا ایک اور ورق الٹ دیا۔ اس صفحے پر حسنہ باجی اور وہی نوجوان [illegible] ساتھ ساتھ تھیں۔ دونوں کے چہرے مسرتوں سے معمور تھے۔ پھر میں نے سوال کر دیا "باجی! آپ نے بتایا نہیں یہ کن صاحب کی تصویر ہے"

باجی نے مسکرا کر کہا "دیکھے جاؤ، تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے ایک ورق اور الٹا۔ وہی نوجوان حسنہ باجی کے ساتھ [illegible] بیٹھا تھا اور حسنہ باجی شرمائی شرمائی سی دلہن بنی بیٹھی تھیں۔

"ارے باجی۔ تو یہ دولہا بھائی ہیں۔"

"ہیں نہیں تھے" باجی نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔ میں فوٹو دیکھنے میں ایسی کھوئی تھی کہ حسنہ باجی کا جواب جیسے سن نہ سکی تھی۔ ایک [illegible] اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا "یہ تو بالکل سہیل لگتے ہیں باجی!" "سچ کہو باجی۔ کون ہیں یہ۔ کیا دولہا بھائی کے کوئی اور بھائی بھی ہیں؟"

"نہیں" حسنہ نے گلوگیر لہجے میں جواب دیا تو میری نظریں اٹھ گئیں۔ حسنہ باجی کی آنکھیں نم تھیں اور [illegible] اداس تھا، جیسا میں نے کبھی نہ دیکھا۔ میں گھبرا گئی۔ البم میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔

میں پریشان سی ہو کر حسنہ باجی کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے کر [illegible] [illegible] کیا بات ہے۔ مجھے بتاؤ [illegible] نہیں۔ کیا اسی لئے مجھے آج بلایا تھا۔

حسنہ باجی نے ایک [illegible] بھر کر [illegible] اسی لئے بلایا!

[illegible] غور سے اس تصویر کو دیکھو۔ یہ [illegible] شکل میں [illegible] کے اعتبار سے [illegible] بالکل [illegible] ایک [illegible] بھی اس کے لئے اسی طرح دیوانی ہو گئی تھی جس طرح آج تم ہو۔ پوری کہانی سنا کر کیا کروں۔ بس اتنا ہی کہنے پر اکتفا کروں گی کہ میں نے اپنے گھر والوں سے مخالفت مول لی، سب سے قطع تعلق کیا اور اس سے شادی کر لی۔ لیکن اس نے مجھے دھوکا دیا۔ [illegible] بچوں کا باپ ہو جانے کے بعد اس نے نگاہیں پھیر لیں۔ دوسری لڑکیوں کے پیچھے پھرنے لگا۔ آخر میں نے اس سے طلاق لے لی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں تعلیمی ڈگری رکھتی تھی اس لئے مجھے ملازمت مل گئی۔ اور اس کے بعد تم سے میری ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے تمہاری محبت کا علم ہوا تو میں نے ایک دن تمہارا تعاقب کیا تو پتہ چلا کہ وہ سہیل ہی ہے جس نے مجھے طلاق دی اور اب تمہیں اپنے جال میں پھنسا رہا ہے!"

باجی کی باتیں سن کر میں حیران رہ گئی۔ واقعی باجی کے شوہر کی تصویر سہیل سے ملتی تھی اور اسی لئے مجھے خیال ہوا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ میرا سہیل ہی باجی کا شوہر ہوگا۔

چند لمحے خاموش رہ کر باجی نے کہا "سہیل کے والدین اس کی شادی اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے کرنا چاہتے تھے اس لئے انھیں یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔ سہیل مجھے بیاہ کر گھر لے گیا تھا۔ میری سسرال والے ویسے ہی مجھے پسند نہ کرتے تھے۔ سہیل نے آنکھیں پھیریں تو وہ کھلی دشمنی کرنے لگے۔ اس لئے طلاق لینے کے سوا میرے لئے اور کوئی راستہ ہی نہ رہ گیا تھا۔"

"باجی! تم نے بروقت میری آنکھیں کھول دیں، ورنہ میرا بھی وہی حشر ہوتا جو آپ کا ہوا۔ اب میں شکیل ہی سے شادی کروں گی۔"

اور پھر میں گھر گئی تو میں نے شرما کر امی سے کہا "آپ ماموں جان کے یہاں کہلا دیجئے۔ مجھے آپ سب کا پسند منظور ہے۔"

امی سن کر ایسی جیسے نہال ہو گئیں۔

عبادت کا مفہوم

ایس۔اے۔ اسلفانہ صاحب۔ (بنگلور)

عبادت کے معنی ہیں اپنے معبود کی بندگی کرنا۔ ہمارا معبود ہے خدا اپنے معبود کی اطاعت میں جو کچھ کرے عبادت ہے مثلاً ہم لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے ان باتوں کے دوران میں اگر ہم نے جھوٹ سے، غیبت سے، فحش گوئی سے اس لئے پرہیز کیا کہ خدا نے ان چیزوں سے منع کیا ہے، اور ہمیشہ سچائی، انصاف، نیکی اور پاکیزگی کی باتیں کیں، اس لئے کہ خدا ان کو پسند کرتا ہے تو ہماری یہ سب باتیں عبادت ہوں گی، خواہ وہ سب دنیا کے معاملات ہی کی کیوں نہ ہوں۔ ہم لوگوں سے لین دین کرتے ہوئے بازار میں خرید و فروخت کرتے ہوئے، اپنے گھر میں ماں باپ اور بھائی بہنوں بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتے سہتے ہوئے اپنے دوستوں اور عزیزوں سے ملتے جلتے ہوئے، اگر اپنی زندگی کے ان سارے معاملات میں خدا کے احکام کو اور اس کے قوانین کو ملحوظ رکھا، ہر ایک کے حقوق ادا کئے یہ سمجھ کر کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے اور کسی کی حق تلفی نہ کی یہ سمجھ کر کہ خدا نے اس کو منع کیا ہے، تو گویا ہماری یہ ساری زندگی خدا کی عبادت ہی میں گذری۔ ہم نے کسی غریب کی مدد کی کسی بھوکے کو کھانا کھلایا کسی بیمار یا اپاہج یا یتیم کی خدمت انجام دی اور ان سب کاموں میں ہم نے اپنے کسی ذاتی فائدے یا عزت یا ناموری کو نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی کو پیش نظر رکھا تو یہ سب کچھ عبادت میں شمار ہوگا۔ ہم نے تجارت، صنعت یا مزدوری کی اور اس میں خدا کا خوف کر کے پوری دیانت اور ایمانداری سے کام کیا تو یہ بھی عبادت ہوگی۔ حلال کی روزی کمائی اور حرام سے بچے تو یہ روزی کمانا بھی خدا کی عبادت میں لکھا جائے گا۔ حالانکہ ہم نے اپنی روزی کمانے کے لئے یہ کام کئے تھے۔ غرض یہ کہ دنیا کی زندگی میں ہر قدم پر معاملات میں [illegible] اس کی خوشنودی [illegible] رکھنا، اس کے قانون کی پیروی کرنا، ہر ایسے فائدے سے انکار [illegible] کرنا جو اس کی نافرمانی سے حاصل ہوتا ہو، اور ہر ایسے نقصان کو گوارا کر لینا جو اس کی فرمانبرداری میں پہنچے خدا کی عبادت ہے۔ اس طرح کی زندگی سراسر عبادت ہی عبادت ہے۔ حتیٰ کہ ایسی زندگی میں کھانا، پینا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، بات چیت کرنا سب کچھ داخل عبادت ہوتا ہے۔

یہ عبادت کا اصل مفہوم ہے۔ اور اسلام کا اصل مقصد انسان کی پوری زندگی کو ایسی ہی عبادت گزار زندگی بنانا ہے۔ اسی غرض کے لئے اسلام میں چند ایسی عبادتیں فرض کی گئی ہیں جو انسان کو اس بڑی عبادت کے لئے ٹریننگ کورس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو شخص یہ ٹریننگ اچھی طرح لے گا وہ اس بڑی اور اصلی عبادت کو اتنی ہی اچھی طرح ادا کر سکے گا۔ اسی لئے ان خاص عبادتوں کو فرض عین قرار دیا گیا ہے اور انہیں ارکان دین یعنی "دین کے ستون" کہا گیا ہے۔ جس طرح ایک عمارت چند ستونوں پر قائم ہوتی ہے اسی طرح اسلامی زندگی کی عمارت بھی ان ستونوں پر قائم ہے۔ ان کو توڑ دو گے تو اسلام کی عمارت گرا دو گے۔

شیخ سنی مذہب بھائی و بہن کے لئے رشتہ درکار ہے

بھائی ایم بی بی ایس ہے۔ اس وقت ہاؤس جاب کر رہا ہے عمر ۲۸ سال ہے قبول صورت تعلیم یافتہ نیک سلیقہ شعار لڑکی کی ضرورت ہے۔

بہن تعلیم یافتہ (ایم ایس سی) قبول صورت نیک و سلیقہ مند عمر [illegible] سال اعلیٰ تعلیم یافتہ ملازمت یا آزاد پیشہ نوجوان سے رشتہ مطلوب ہے۔ یہ رشتہ الگ الگ بھی ہو سکتا ہے اور بدلے پر بھی۔ خواہش مند حضرات بھائی بہنیں مزید معلومات بذریعہ خط و کتابت حاصل کریں۔ [illegible]

حکمت کے موتی

- جو لوگوں کی زبانی تعریف اور برائی کا خیال رکھتے ہیں [illegible] ہے۔ جو فرائض کو اول وقت ہی ادا کرتا ہے [illegible] خدا تعالیٰ کے احکام کے مطابق کرتا ہے [illegible]
- جنت کی طلب بغیر عمل نیک کے گناہ ہے۔ [illegible] رحمت کی امید رکھنا نادانی اور جہالت ہے۔
- [illegible]
- تلاوت اور موت کے وقت [illegible]

(مرسلہ: [illegible])

"اپنی ہی قوم اور ملک کے کچھ لوگوں کو برابری کے ساتھ رہنے کا حق دینے سے انکار کر کے ہم مذہب اور خدا سے منہ موڑ لیتے ہیں"

——— بابائے قوم مہاتما گاندھی

بابائے قوم مہاتما گاندھی کے عقیدے

پر عمل پیرا ہو کر حکومت اتر پردیش، صدیوں سے نظر انداز کئے گئے تمام دبے کچلے اور غریبی کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزارنے والے لوگوں کو سماج میں برابری کا درجہ دینے اور انھیں ترقی میں حصہ دار بنانے کے لئے پُرعزم اور کوشاں ہے

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش نے جاری کیا

درد آشنا اور ایک قطرہ

کے بعد عفت موہانی کا ایک اور شاہکار

آفریں

ایک ایسی کہانی جس کا تاثر مدتوں تک پڑھنے والوں پر قائم رہیگا

قیمت مجلد اٹھارہ روپیہ

دیگر پاکستانی ناول جو ملتے ہیں

نائلہ	رضیہ بٹ	22/50
ریشم	〃	14/-
[illegible]	〃	15/-
وحشی	〃	20/-
دکھ سکھ اپنے	〃	15/-
عندلیب	سلمیٰ کنول	21/-
چہکے بہار آجائے	〃	25/-
لالہ	سلمیٰ کنول	25/-
سہاگن	〃	18/-
صدف	〃	22/-
بے مثال	〃	30/-
آبگینہ	رضیہ بٹ	30/-
ناجیہ	〃	25/-
ثانیہ	〃	35/-
رابطہ	〃	25/-
شمیعہ	〃	15/-
لگن	بشریٰ رحمٰن	45/-
سب [illegible]	بلقیس کنول	60/-
عفرہ	عابدہ [illegible]	35/-
آئینہ	[illegible] جبیں	25/-
نقش قدم	فردوس حیدر	10/-

کیا آپ کے گھر میں سب الگ الگ ذائقہ کھانا پسند کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب اگر ہاں میں ہے تو آپ [illegible] کی مرتب کتاب [illegible] ضخیم کتاب ہے [illegible] کھانے تیار کیجئے [illegible] سے زیادہ کوئی کتاب اردو میں بھی ہو۔ روزمرہ کے دودھوں کے کھانے اور دوسری تمام چیزوں کو تیار کرنے کی ترکیبیں ایسی وضاحت کے ساتھ [illegible] لڑکیاں بھی اسے پڑھ کر اچھے کھانے پکا سکتی ہیں۔ قیمت [illegible]

عادل رشید مرحوم

اب اس دنیا میں نہیں ہیں [illegible]

جب تک پڑھتے رہیں گے [illegible] زندہ رہیں گے۔

آپ بھی انھیں زندہ جاوید بنانے کے لئے [illegible]

لرزتے آنسو ۔ سرتاج ۔ جنگل کی راکھ

15/- ۔ 18/- ۔ 22/-

عفت موہانی کا لکھا ناول جو نایاب تھا اب مل سکتا ہے۔

پھول کنول

آج ہی طلب فرمائیں ـــ قیمت مجلد [illegible]

آشفتہ شوہر

[illegible] ایک [illegible] دوسرے [illegible]

بیوی اپنے پچھلے شوہر کے بارے میں [illegible]

دوسرے [illegible] نے جواب دیا [illegible]

بات نہیں ہے جس پر [illegible]

سے بھی کہیں زیادہ [illegible] ہے۔ کیونکہ وہ [illegible]

کا تذکرہ کرتی رہتی ہے!

سوز جاوداں	بیگم [illegible]	10/-

بزمِ حریم

[illegible] بہنوں کی ہر مسرت اپنی ایسی خبر [illegible] ولادت، شادی یا کسی سے متعلق ہو ادھر کم سے کم [illegible] ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہونے والی [illegible] خبر کے ساتھ پاس پورٹ سائز فوٹو اور [illegible] ضرور روانہ کریں۔ خبر کی اشاعت میں کسی غلطی کا انحصار ادارہ [illegible] اطلاع ملنے پر غلطی کی تصحیح شائع کردی جائے گی۔ ادارہ

ولادت اطفال کی خبریں

• [illegible] بڑی بہن شمیم باجی اور دولہا بھائی سعید پال صاحب [illegible] ۔۔۔۔ بریلی گورکھپور کو اللہ پاک نے [illegible] اگست سنہ [illegible] بروز [illegible] بوقت تین بجے شب ایک دختر عطا فرمائی نام [illegible] رکھا گیا۔ اللہ پاک عمر طویل بخشے۔

• محترم علی عزیز صاحب اور نسیمہ [illegible] مرحوم کو اللہ پاک نے [illegible] اپریل سنہ [illegible] بروز [illegible] ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام [illegible] رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے (نسیم امروہوی)

• [illegible] میری بہن صادقہ اور بہنوئی سید شفیع الرحمان صاحب [illegible] کو اللہ پاک نے پہلی بار تاریخ ۱۷ اگست سنہ [illegible] بروز جمعرات بوقت [illegible] ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر [illegible]

• [illegible] میری بہن [illegible] اور بہنوئی [illegible] حسن [illegible] بروز [illegible] بوقت [illegible] شب ایک [illegible] عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے۔

• [illegible] میرے [illegible] ظفر اللہ صاحب اور محترمہ نزہت [illegible] صاحبہ کو اللہ پاک نے [illegible] جولائی سنہ [illegible] بروز [illegible] بوقت [illegible] شب ایک فرزند عطا فرمایا۔ نام محمد کشور شہزاد عرف فہد رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے

• [illegible] میری خالہ [illegible]

صاحب کو اللہ پاک نے دوسری بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ عمر طویل پائے اور فخر خاندان بنے۔

عزیزہ [illegible] نسیم [illegible] لکھنؤ [illegible] اور دولہا بھائی [illegible] احمد صاحب انجینیئر کو اللہ پاک نے [illegible] اگست سنہ [illegible] کو [illegible] بجے دن میں پہلی بار ایک دختر عطا فرمائی [illegible] اسے عمر طویل دے اور صاحب نصیب بنائے۔

پیغامات نشاط

• مسعود خاتون (نالندہ) میرے بڑے بھائی سید محمد [illegible] حسین (فرزند سید انعام الحق مرحوم) کی شادی [illegible] صاحب) کے ساتھ [illegible] تاریخ اگست سنہ [illegible] بروز سنیچر بڑی دھوم دھام سے انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• طیبہ رحمٰن (نینی تال روڈ۔ بریلی) میری باجی صبیحہ رحمٰن (بنت [illegible] ادریس صاحب) کی شادی ذاکر حسین صاحب (فرزند جناب [illegible] حسین۔ [illegible] بھیت) کے ساتھ ۸ اگست سنہ [illegible] بروز اتوار بمقام [illegible] متصل جامع مسجد قلعہ بریلی بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک انہیں ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• نسیم بکڈپو کے کارکن سید شبیر الحسن زیدی صاحب کی دختر نیک اختر سیدہ سیرت الزہرہ عرف نسرین زیدی سلمہا کی شادی، سید شمیم حیدر رضوی سلمہ (پسر ایس علی حیدر رضوی صاحب) کے ہمراہ ۳ اکتوبر سنہ [illegible] کی شام کو [illegible] کاظمین۔ لکھنؤ میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے اور دولہا دلہن ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔ نسیم امروہوی

• نازنین سلطانہ، بے نگر: میری باجی شاہین سلطانہ بی۔ اے (دختر جناب [illegible] ایم جعفر علی) کی شادی فیاض احمد بی۔ اے۔ بی۔ ایڈ [illegible] (فرزند جناب عبد الوہاب صاحب) کے ساتھ ۱۶ مئی سنہ [illegible] کو بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• [illegible] کے رومانہ انجم و توصیف [illegible] (آنبور) ہماری آنٹی [illegible] صاحبہ [illegible] اشرف علی صاحب کی شادی [illegible] اگست سنہ [illegible] کو [illegible] محمد [illegible] صاحب مرحوم کی [illegible] (بنت [illegible] بادشاہ صاحب) کے ساتھ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• اختر النساء بیگم [illegible] بیگم [illegible] [illegible] مسرت سے گھر رہی ہیں کہ ان کے بھائی [illegible] احمد صاحب (پسر جناب عبد القادر [illegible] صاحب) کی شادی خانہ آبادی بھیانی نور جہاں بیگم (دختر حاجی سید شوکت علی صاحب) کے ہمراہ [illegible] کو بمقام لہری پورہ (بڑودہ) بحسن و خوبی انجام پائی۔ دعا ہے کہ اللہ پاک دلہا دلہن کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• مس فاطمہ (بہادر) [illegible] کی شادی [illegible] (پسر جناب جمال مرحوم) کے ساتھ [illegible] کو بمقام [illegible] شریف بخیر و خوبی انجام پائی۔ خدائے پاک ان دونوں کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

• مسٹر ایم عبید اللہ (بنگلور) کی صاحبزادی سیدہ شاہین سلمہا کی شادی محمد امام عرف بابو سلمہ (پسر محمد بشیر صاحب مرحوم۔ ای۔ بی) کے ساتھ [illegible] ستمبر ۱۹۸۲ء کو بوقت [illegible] بجے دن بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم امروہوی)

• مسٹر عبد المجن (کلکتہ) نے اپنے فرزند حافظ صدیق حسن سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں ۲۹ اگست ۱۹۸۲ء کی شب میں ایک شاندار دعوت ولیمہ دہلی کلب کلکتہ میں دی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم امروہوی)

• بیگم صاحبہ مرزا مہدی حسین صاحب نیشاپوری (لکھنؤ) نے اپنے فرزند مرزا محمد رفیع سلمہ کی شادی کے سلسلہ میں، جو شاہین فاطمہ سلمہا دختر نیک اختر سید آل رضا کاظمی صاحب کے ساتھ ۱۹ ستمبر ۱۹۸۲ء کی شب میں ہوئی تھی، ۲۱ ستمبر کی شب میں شاندار دعوت ولیمہ اپنے مکان واقع بارود خانہ لکھنؤ میں دی، جس میں اعزہ و اقربا اور معززین شہر نے شرکت کی۔ مس ناہید

• بیگم صاحبہ مرزا امام صاحب سابق ایم۔ پی [illegible] ڈاکٹر شہزاد امام سلمہ کی شادی [illegible] دختر نیک اختر ڈاکٹر شیخ الحق ملک صاحب) ۲۶ ستمبر ۱۹۸۲ء کی شام کو دہلی کے اشوکا ہوٹل میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم امروہوی) مس [illegible] فرزانہ بیگم (نسیم امروہوی)

• محترم یٰسین احمد ہاشمی صاحب کے فرزند عزیزی جاوید سلمہ کی شادی کے سلسلے میں جو ترنم سلمہا دختر نیک اختر جناب [illegible] کے ہمراہ ہوئی۔ [illegible] ستمبر ۱۹۸۲ء کی [illegible] صاحب [illegible] میں ایک شاندار دعوت ولیمہ [illegible] جس میں [illegible] نے شرکت کی۔ اللہ مبارک کرے۔ (نسیم امروہوی) [illegible] (نسیم امروہوی) [illegible]

• [illegible] احمد [illegible] بہنوئی [illegible] کی شادی [illegible] یعقوب صاحب مرحوم کی صاحبزادی [illegible] [illegible] اللہ مبارک کرے۔ [illegible]

• مس [illegible] شاہین [illegible] [illegible] ہماری [illegible] (بنت جناب [illegible] یعقوب صاحب مرحوم) کی شادی [illegible] ریحان جناب [illegible] کے ساتھ [illegible] انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• رابعہ جانہ [illegible] بہن [illegible] بیگم (بنت جناب عبد الستار، ریٹائرڈ پولیس انسپکٹر۔ [illegible]) کی شادی [illegible] احمد صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ اے [illegible] صاحب [illegible] ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء بروز [illegible] بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

انتقال پر ملال کی خبریں

• افسوس صد افسوس کہ [illegible] ممتاز ڈگری کالج لکھنؤ، ۳۰-۳۱ اگست ۱۹۸۲ء کی درمیانی شب میں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے کھانے سے فارغ ہو کر عشا کی نماز پڑھی۔ پھر کالج کا کام کرنے بیٹھے [illegible] ہو گئے۔ شریف بھائی اپنے نام ہی کی طرح بیحد شریف، نیک اور مخلص انسان تھے۔ ان کے انتقال پر بیحد رنج [illegible] اللہ پاک انھیں غریق رحمت کرے اور ان کی [illegible] فرمائے۔ (نسیم امروہوی)

• سید نسیم جعفری [illegible] [illegible] سید [illegible] علی سلمہ کا پہلا فرزند [illegible] ۲۲ ستمبر ۱۹۸۲ء کی شب [illegible] [illegible] [illegible] کا ایک سال کا معلوم ہوتا تھا۔ [illegible] [illegible] کی گود سونی ہو گئی ہے۔ اللہ پاک [illegible]

• [illegible]

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت ہر ماہ صرف بچوں کا مرسلہ صرف [illegible] شائع کیا جائے گا جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت [illegible] اور سنجیدہ ہو۔ ساتھ ہی شاعر کا نام [illegible] ۲۰ تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ نومبر کے لئے عنوان ہے۔ نعمت اور دسمبر کے لئے [illegible]

[illegible] تھی ان کی ادا سے پہلے
[illegible] دوا سے پہلے

مرسلہ۔ فیروز بی (ناندور)

[illegible] سبزہ کا [illegible]
[illegible]

مرسلہ۔ عصمت آرا (بانکا)

چہرے سے عیاں ہے ایک ایک ادا غم کی
[illegible] تصویر ہے ماتم کی

شہناز بیگم (بنگلہ پیٹ)

[illegible] کی ادا کون کہے
[illegible] تبسم [illegible]

مرسلہ۔ خالد حسین قریشی (بیتول)

[illegible] برق نے جل پھر کے عشق کی لیکن
[illegible] تیرے مسکرا کے آنے کی

مرسلہ۔ کشور سلطان (لال باغ کلکتہ)

مرسلہ۔ منیرہ عزیز (بھاگلپور)

[illegible] محبت کی
[illegible]

مرسلہ۔ جوش غوث (رامپور)

[illegible] اس نے [illegible]
[illegible] و دکھا نہ سکا

مرسلہ۔ رفعت پروین (بنگلور)

[illegible] کے [illegible] ادا کر رہے ہیں آپ
[illegible] کا خوب ادا کر رہے ہیں آپ

مرسلہ۔ نسیم [illegible]

ہمیں ہر چیز میں آئی نظر یا رب ادا تیری
وہ کیسے ہوں گے جو [illegible] نے تجھ کو [illegible] پایا

مرسلہ۔ قرۃ العین (خیال)

تیری انیا پسندی کی ادا بھی کیا قیامت ہے
[illegible] آرزو [illegible]

مرسلہ۔ مکرم راحت (آنول)

عشق کی خیر وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائی تسلیم و رضا بھی نہ سہی

مرسلہ۔ غفیر کرن (داعنباڑی)

شوخی شباب [illegible] تبسم حیا کے ساتھ
دل لے لیا ہے آپ نے کس کس ادا کے ساتھ

مرسلہ۔ بی عظمت فاروق (آمبور)

(صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

بوقت ۱ بجے شب بعمر ۴۶ سال اچانک انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے ایک لڑکا، دو لڑکیاں اور ایک بیوہ اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اللہ پاک انھیں اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

[illegible]دی۔ حمید بھائی بھی ابلیس اعظم اسپیشل کو الٹی نمبر نور لو ڈی سیکھنے لگے!

"بجا فرمایا آپ کو خدا ای کیسے سمجھتا ہے۔" فرخندہ جھلا گئی: "آپ بھی آج کل کے زمانے کے دھوکے باز مرد ہیں۔ ساری عمر اپنے سہول کو دھوکا دیتے رہیں گے۔ اِدھر اُس بے چاری کو، اُدھر بیٹا کو۔ آخر کب تک ایک کی خبر دوسری کو نہیں ہوگی؟ آپ عمر بھر کیا کیا بہانے کرتے رہیں گے۔؟"

"زندگی تماشہ بن گئی ہے۔ فرخندہ، یہی سوچ سوچ کر میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ نجانے مجھ پر ہمدردی کا کون سا بھوت سوار ہوا تھا کہ میں نے غیر کی ہمدردی میں اپنی ذات سے بیدردی کی۔ اب میں اسے بھگت رہا ہوں۔ شاید یہ بھی میری نیکی کی آزمائش [illegible]۔ خدا حفاظت کرے۔"

"ابھی کیا ہے۔" دانت پیس کر فرخندہ بولی: "ایک بچہ پر تھوڑی کا مہر لگ جائے گی۔ اِدھر ان کے ہوں گے اُدھر ان کے۔ چھ سال میں بارہ بچے۔ اللہ مبارک کرے!"

غضنفر کے چہرے پر دکھ منڈلا گیا: "یقین کرو۔ فرخندہ۔ میں اسے چھوڑ بھی تو نہیں سکتا۔ اس کا کوئی نہیں ہے دنیا میں۔ وہ کہاں جائے گی۔ کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھائے گی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا ہے جانے میں یا انجانے میں، اب میں اسے دھکا کیسے دے سکتا ہوں۔ اچھا سنو کیا تم [illegible] [illegible]
بہت ہو گیا اس سے بات کیجیے۔" (باقی آئندہ)

"بھول جاؤ سب کچھ۔" غضنفر نے کہا۔ اور اسے چور لڑکی کی طرح اپنے سامنے اس طرح بٹھا لیا جیسے پوجا کرنے والے پھول۔ پھر [illegible] اٹھا کے اس کے سامنے رکھ دیا: "اب میں اپنی غفلت کا ازالہ کروں گا۔ تمہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔ کھا پی لو تو پھر میں تمہیں لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ کچھ مقوی ٹانک لکھوا لائیں۔ کیا پکایا ہے؟"

وہ ہنسنے لگی۔ بڑی زہریلی ہنسی تھی لیکن غضنفر نے دھیان نہیں دیا۔ وہ بھی ہنسنے لگے!

"میرے لیے طاقت بہت ضروری ہے۔" وہ بولی۔

"ہاں تاکہ آگے کا مرحلہ آسانی سے طے ہو سکے!"

"نہیں!"

"نہیں؟؟ نہیں کیا۔"

"غم اٹھانے کے لیے بھی طاقت چاہیے!"

"پھر وہی!" غضنفر نے ذرا درشت گلہ کیا: "کہہ چکا ہوں کہ پچھلی بات کو بھول جاؤ۔ تم بار بار اس کا اعادہ کر کے مجھے مزید خجالت میں مبتلا کر رہی ہو شاید تمہیں اسی میں مزہ ملتا ہو!"

"آپ چار دن مسلسل نہیں آئے۔ میری کوئی خبر نہ لی۔ مجھ سے خفا ہیں۔ میری تنہائی کا خیال نہیں کیا۔ میں نے اس طرح بہت سے [illegible]؟"

"اوہ۔ میری شانی۔ میری زندگی۔ میری جان۔ بہت نادم ہے یہ!"

غضنفر نے سینے سے بھینچ لیا۔ اور [illegible] کہ اس سے التجا کرنے لگا کہ وہ اپنے دل کی ساری کدورتیں صاف کر لے!

"اگر تم اسی طرح خفا رہوگی تو میں سچ سچ کہتا ہوں کہ خودکشی کرلونگا۔"

"معاف کر دیجئے۔ پھر نہیں کروں گی۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ میری خفگی آپ کے لیے اتنی اہمیت رکھتی ہے۔" اس نے بڑی سادگی سے کہا اور اس کے لہجے میں چھپی جلن اور طنز کو غضنفر نے محسوس نہیں کیا۔ وہ تو یہ سمجھ کر خوش ہو گئے کہ کہکشاں کے دل کا غبار دور ہو گیا!۔

انھوں نے اسے اٹھا کر مسہری پر بٹھا دیا۔ دوڑے دوڑے گئے اور کچن سے پلیٹ اور چاقو لائے۔ اور بڑے اہتمام سے سیب چھیل چھیل کر اور انگور صاف کر کرکے اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے لگے!۔ بظاہر وہ بھی خوش اور مطمئن دکھائی دینے لگی! ہنس ہنس کے ان کی باتوں کا جواب دے رہی تھی!۔

"چائے بنالاؤں؟" غضنفر نے پوچھا۔

"آپ؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں۔ یا پھر دودھ گرم کرلاؤں اس میں بورنویٹا ملاکے پی لو۔ بہت طاقت آتی ہے۔" بالکل ریشہ خطمی ہو کر غضنفر نے کہا۔ ان کے لہجے کی مضحکہ خیزی نے کہکشاں کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

بہرحال چائے وائے سے فرصت کر کے دونوں پھر باتیں کرنے لگے۔ غضنفر نے اپنی جیب سے نوشینہ کے دیے ہوئے ہزار روپے نکالے اور نہایت فراخ شان دلی سے کہکشاں کو دے دیے۔ پھر لبوں پر زبان پھیر کر اور لہجہ رنگین بنا کر کہا۔

"بکھلی [illegible] بہت خوبصورت پڑے گی۔ تین چار دن بعد اور دونگا۔"

دیکھ کر اس انداز میں مسکرائے کہ اس کے آگ ہی لگ گئی۔

"میری تو کچھ ہی میں نہیں آتا۔ یہ پھانسی کا پھندہ آپ کے گلے سے کیسے نکلے گا۔ آخر کیا سوچ کے آپ اتنے آگے بڑھ گئے ہیں آپ کو خوف نہیں لگتا؟"

"خوف؟ ارے روز مرتا ہوں روز جیتا ہوں۔ تمھیں میرے دل کی حالت کا کیا اندازہ ہے؟"

"بڑے بھیا۔ آپ کو حالات کی سنگینی کا خیال نہیں ہے۔ ابھی تک آپ کا پردہ ڈھکا ہوا ہے۔ کل کو کیا ہوگا؟ ۔ آپ کی شادی امی نے بالکل پکی کر دی ہے۔ اب کل خالہ جان آئیں گی اور شاید پندرہ بیس ہی دن میں منڈپ لگ جائے گا۔ اس وقت کے لیے آپ نے کیا سوچا ہے؟"

غضنفر کی حالت ابتر تھی۔ "تم کوئی ترکیب بتاؤ؟"

"میں کیا بتاؤں۔ مجھے بھی آپ نے عجیب مصیبت میں مبتلا کر رکھا ہے اگر کل کلاں کسی کو پتہ چل گیا کہ میں بھی آپ کی چوری میں شریک تھی تو پھر ابا جان امی اور "وہ" کیا کہیں گے۔ کیا سوچیں گے۔ سسرال میں میری کیا عزت رہ جائے گی؟"

"جب میں کسی سے نہ کہوں گا تم نہ کہوگی تو بات خود بخود کسی کو کیسے معلوم ہو جائے گی؟"

"میں نہیں جانتی" نوشینہ بھی رو دینے پر آ گئی۔ "دہشت کے مارے میری نیندیں اڑنے لگی ہیں۔ میں تو ان سے سب کچھ کہہ دوں گی"

اب تک جو وقعت میرے سلسلے میں ان کے دل میں ہے [illegible]

کئی بار پیٹ ڈالے تھے ۔

میں سچ کہتا ہوں ۔ تمہاری حرکتیں اب ناقابل برداشت ہونے لگی ہیں
اچھا اب کریم الدین کی والدہ مر رہی تھیں ۔ کل کون مرا تھا ۔ تم بجے کے
بجے رات کے دس بجے آئے تھے ۔ پرسوں کون ذبح ہوا تھا تم پرسوں
رات بھی خاصی رات گئے آئے تھے غضنفر ۔ آج مجھے صاف صاف
بتاؤ ۔ تم کہاں جاتے ہو ۔ تمہارا باہر کا کیا مشغلہ ہے ۔ ورنہ میں فیصلہ
کر دوں گا کہ تم یہاں سے جاؤ اور اپنا بندوبست کہیں اور کر لو ۔
حد ہو گئی ہے ۔ تمہاری حرکتیں دوسرے لونڈے بھی اختیار کریں گے کیا
میں سب کے پیچھے لاٹھی لیے دوڑا ہی کروں گا ؟ ۔ تم نے دوکان پر بٹھایا بھی
چھوڑ دیا ۔ ظفر کہتا تھا کہ اس کا گریبان پکڑ کر تم نے اسے دھمکایا ۔
خوشامد کی اور ڈبے سے آدھے دن کی بکری نکال لے گئے :

کریم الدین صاحب کو پیسے بھی دے دیے ہوں گے : نوشینہ بولی ۔
ہاں : مجرمانہ طریقے کا اقرار کرتے ہوئے غضنفر نے کہا ۔ اور دل ہی
دل میں نوشینہ کی عقلمندی کو دعائیں دیں ۔ چھوٹی بے شک ہے مگر
پکی ہے ! ۔

کون ہے یہ کریم الدین : ابا جان نے پوچھا ۔ جھگڑا کیا ہے اس پر ۔
پتا ذرا تم بتاؤ ۔ تاکہ میں خود اس کے لیے کچھ کر سکوں :
پھر کبھی بتائیں گے ابھی آرام کیجیے گا : نوشینہ نے کہا اور ان کا
ہاتھ پکڑ کر لے جاتی ہوئی بولی : اب چل کے کچھ کھا لیجیے :
کمرے میں پہنچ کر غضنفر نے اطمینان کا سانس لیا اور نوشینہ کی طرف

کہکشاں کا چہرہ گلابی ہو گیا ۔ چپکے سے بولی : نیلے رنگ کی ایک ساری
خریدنے کا جی چاہ رہا ہے ۔ یہ کپڑے اب جسم پر نہیں آسکتے ! :
ابھی نہیں ۔ انشاءاللہ میں خود خرید دوں گا ۔
اچھا ! اس نے مرجھا کر کہا اور نوٹ اپنے گریبان میں رکھ لیے ۔ دفعتہً
دالان سے دادی نے آواز دی : جان عالم کے طوطے آپ ہیں !! :
دیکھا تم نے : غضنفر نے شکایت کی ۔ طوطا بنا رہا ہے مجھے ۔ تمہاری طرفداری
میں مجھ سے خفا ہے ۔
بہت اچھے آدمی ہیں : کہکشاں بولی ۔
آجاؤ ۔ ابھی چائے گرم ہے : غضنفر نے ہانک لگائی ۔
کہکشاں آنچل سے اچھی طرح بدن ڈھانک کر اور پھر دور سرک کے بیٹھ گئی ۔
سیٹی میں دھن بجاتے ہوئے دادا آئے ۔ بے حد خوش معلوم ہو رہے تھے ۔ ؟
چہرہ گوناگوں جذبوں کا آماجگاہ بنا تھا ۔
کیا ہوا : بے ساختہ غضنفر کے لبوں سے نکلا ۔
اور اسی بے ساختگی سے دادا نے جواب دیا : لڑکا : اور جیب سے تار
کا لفافہ نکال کر غضنفر کی گود میں پھینک دیا ۔
واقعی ! : غضنفر کے دانت بھی نکل پڑے ۔
ابھی کوئی گھنٹہ بھر پہلے تار ملا : پھر سے بیٹھ کر وہ بھی فرش ہی پر ٹک گئے !
دادا بھائی ۔ میں نہیں سمجھی ۔ کس کے لڑکا ہوا : حیرت سے کہکشاں نے پوچھا ۔
میرے ۔ بے حد سادگی سے دادا بولے ۔
آپ کی شادی کہاں ہوئی ہے : کہکشاں الجھن میں پڑی

اچھے نہیں لگے تھے ویسے ہو گئی تھی کئی سال پہلے" اور ہنسنے لگے۔

"تو اب تم جا رہے ہو شاید" غضنفر نے کہا۔

"ابھی نہیں۔ ایک ماہ بعد۔ پریکٹیکل تو ختم ہو لیں۔"

"بھابی کیسی ہیں، اور بھائی۔ نام کیا ہے" بے حد اشتیاق سے کہکشاں نے پوچھا۔

"اچھی خاصی ہیں" داور نے مسکرا کر کہا "سنا ہے کہ خوبصورت ہیں میں نے تو دیکھا نہیں۔ نشاط نام ہے غالباً۔"

"رعب حسن سے مبہوت ہو گئے تھے" کہکشاں بولی۔

"ایسے نہیں۔ وہ کچھ اور بات تھی" داور نے کہا۔ پھر کچھ جھینپ سے گئے۔

"اچھا میاں۔ اب میں جا رہا ہوں" غضنفر نے اٹھتے ہوئے کہا "کل شام کو لیڈی ڈاکٹر سے بات کر کے وقت لیا تھا اس نے آج ایک بجے کلینک پر بلایا ہے۔ ذرا انھیں دکھا لاؤں۔"

"ہاں ہاں ضرور جاؤ" داور اٹھ گئے "میں بھی امی کو خط لکھنے جا رہا ہوں۔ جلدی واپس آ جانا ساتھ کھانا کھائیں گے۔"

راستے بھر غضنفر مغرور چور کے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ خدا خدا کر کے کلینک کے اندر پہنچ کر سکون کی سانس لی۔

ایک نرس بڑے خلوص و ہمدردی سے کہکشاں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ اور غضنفر باہر بنچ پر سڑک کی طرف سے رخ پھیر کر بیٹھ گئے۔ انجانے ڈر کے کھل جانے کا انھیں خطرہ سا لگا رہتا تھا۔

[illegible] منٹ بعد کہکشاں باہر آئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے غضنفر کو

تھے۔ کہاں گئے تھے۔ وہ موئے بیراگی دوست کون ہیں جن کو نہ خود گھر میں چین ہے نہ دوسروں کو چین لینے دیتے ہیں۔ وہ بھی تو جم کے بیٹھے ہیں [illegible] بھلے لوگوں کو بھی خراب کر دینے میں۔ اچھی بات ہے۔ اب آئندہ پر کوئی آئے تمھارے نام کی ہانک لگائے گا تو دیکھنا اس کی کیسی گت بناتی ہوں۔ اور تم۔ میں کہتی ہوں۔ تم نے گھر کو ہوٹل سمجھ رکھا ہے۔ آئے۔ باپ کی کمائی؟ اماں کے ہاتھوں کا عمدہ ٹھونس لیا اور ٹانگیں پھیلا کے سو رہے۔ وہ گرجیں: "کہاں سے آ رہے ہو دن بھر کہاں رہے؟"

غضنفر کا دل تو نوشینہ کی شکل ہی دیکھ کر اپنی جگہ سے سرک گیا تھا۔ ان کی للکار سے تو حالت بری ہوئی۔ انھیں خبر تھی کہ آج وہ اس طرح نا نگ لیں گی۔ بے چارے سے کوئی ایسا بہانہ بھی گھڑتے [illegible] نہ بن سکا جو سو فیصدی سچ معلوم ہوتا!

"آپ کے انتظار میں سیخ کباب الگ راکھ ہو گئے" نوشینہ نے بیچ میں بول کر ماحول کا تناؤ ختم کرنا چاہا تھا مگر امی نے ہاتھ ہلا کر اور چلا کر کہا۔ "کتے کے آگے ڈال دو سیخ کباب۔ آج تو فاقہ کراؤں گی۔"

"امی۔ وہ" غضنفر نے تھوک نگل کے حلق تر کیا اور کھنکھار کر بولے۔ "کریم الدین کی امی پر کل رات ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ بے چارہ پریشان ہوتا پھر رہا تھا۔ اس کے والد اپنے گاؤں چلے گئے ہیں۔ اس کی والدہ کو دواخانہ میں شریک کرانا اور دوائیں لا کے دینے والے [illegible] وقت ہو گیا۔ بے چارہ بہت بدحواس تھا۔"

[illegible]

ہی الٹ پلٹ کر رہی۔ نوشینہ سوچنے لگی کہ بڑے بھیا نے جو خندق اپنے راستوں
میں کھود رکھا ہے۔ دیکھئے اس میں کب گرتے ہیں۔ اگر ان کی پول کھل گئی اور
انھوں نے کہہ دیا کہ ان کی بیوی دکھوں میں نوشینہ بھی شریک تھی تو پھر یہ
چاہنے والے ان آپ کیا سوچیں گے! نوشینہ نے دھوکا دیا۔ حمید کیا کہیں
گے۔ اگر بھائی کے کرتوتوں کا علم بہن کو تھا تو پھر وہ اب تک خاموش
کیوں رہی تھی؟

کھانا اس کے لیے زہر بن گیا۔ ہر لقمہ الٹ کر منہ میں آجاتا۔ مظفر مٹھائی
لایا۔ ابا جان چاہتے تھے کہ ساری مٹھائی اسی کو کھلا دیں لیکن اب نوشینہ
کی خوش مزاجی کافور ہو چکی تھی۔ اب وہ ابا پر اداس جا رہی تھی! ۔
فی الحال کوئی ایسا نظر میں تھا نہیں۔ اگر وہ حمید سے کہتی تو وہ غضنفر
سے تعلق قطع رکھنے کا نام کرتے۔ دوسرا کون تھا

وہ بے چینی سے غضنفر کا انتظار کر رہی تھی۔

اس نے مظفر سے چھوٹے بھائی ظفر کو اپنی بہن کے پاس بھجوا دیا تھا۔ نوشینہ
کی موجودگی میں بیاہ کی تاریخ مقرر کر لیں۔

نوشینہ اپنے بچے پاتر کے پہلو میں آ کے لیٹ گئی اور دل ہی دل میں دعائیں
مانگنے لگی کہ پروردگار مصیبتوں کے ان کالے بادل کو جلد سے جلد ٹال دے۔
پانچ بجے چائے پر غضنفر نے شکل دکھائی۔ دالان میں آ گئے تھے کہ امی
نے ٹوکا۔

بھیا۔ آج سارا دن کہاں تھے۔ میں پوچھتی ہوں کہاں تھے اب تک
[illegible] ایک پیالہ چائے پی کے بھاگے

بلا بھیجا۔

ان کا دل دھڑکنے لگا۔ نجانے کیا کہے گی۔

مسٹر غضنفر۔ لیڈی ڈاکٹر کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔ آپ کی مسز کا کیس کچھ
پیچیدہ ہے۔ مطلب یہ کہ مین وقت پر ایمرجنسی آپریشن کی ضرورت پیش آ
سکتی ہے۔ اور یہ بہت کمزور لڑکی ہے۔ جو ذرا سا اچھا ملا اور دیکھ بھال سے آپریشن
کرنا پڑے گا۔ کیا آپ کی مسز کسی وجہ سے خوش نہیں رہتیں؟

جی۔ جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ غضنفر کو اپنے سارے بدن میں
گرم گرم خون پھیلتا محسوس ہوا۔ اب کیا کوئی نئی آفت سر پہ ٹوٹے گی۔ ابھی
امتحانوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

ان کا معقول ٹریٹمنٹ کیجیے۔ لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی تھی: اور اس
ایک ماہ کے پیریڈ میں دو تین دفعہ انھیں میرے پاس اور لائیے۔ ورنہ میں
نہیں کہہ سکتی کہ کتنی پیچیدگیاں اور پیدا ہو سکتی ہیں:

اس نے ایک بڑے سے کاغذ پر خاصہ تفصیلی نسخہ لکھ کے ان کی طرف بڑھا
دیا اور بولی۔

نیکسٹ۔ باہر نرس کو دے دیجئے گا۔ اس کے بعد وہ دوسری عورت کی طرف
متوجہ ہو گئی۔

نیس ادھر کے دو کاغذ ان کے پاس آ گئے۔ وہ بھی خاص فکر مند دکھائی دے
رہی تھی۔ غضنفر کا منہ تکنے لگی۔ اور بہت چپکے سے بولی: کیا کہا انھوں نے آ
اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ زبان پھیر کر غضنفر نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر پھر
انھیں دوسرا دھیان آ گیا۔ جیب سے نسخہ نکال کر اسے دکھاتے ہوئے بولے۔

کچھ نہیں۔ صرف یہ کہنے کے لیے بلایا تھا کہ تمہاری خاص دیکھ بھال کی جانے
تم کمزور بہت ہو۔!"

"جی نہیں اماں سکتی۔ آپ کا چہرہ کہہ رہا ہے۔"

ارے۔ یہ جگہ ان باتوں کے لیے نہیں ہے۔" بڑی شکل سے غضنفر نے اپنی جھنجھلاہٹ چھپائی پھر بناوٹی انداز میں مسکرا کر بولے: "گھر چلو۔ بتا دوں گا کہ اس نے کیا کہا ہے۔"

آپریشن، آپریشن۔ ان کا ذہن چلا رہا تھا کیا ہو گا تب۔ اس وقت اس کے پاس کون رہے گا۔ وہ گرد وپیش سے بے خبر اندھا دھند سوچے جا رہے تھے کبھی وہ ہمت کرتے کہ سب کچھ اپنی اماں کو بتا دے۔ بلا سے۔ جو کریں گی سہ لیں گے۔ جو کہیں گی سن لیں گے۔ وہ انھیں قتل تھوڑا ہی کر ڈالیں گی۔ پھر بہت تکلیف جاتی۔ نہیں۔ امی متاثر ہونے والی نہیں۔ وہ بے شک خطرناک قدم اٹھانے والی ہیں۔ ان دونوں کو کیسی عجیب نظروں سے گھوریں گی۔ تب کیسی شرمندگی ہوگی۔ صاحبزادے نے پردے پردے میں گل کھلائے۔ بچے تک کی نوبت پہونچ گئی اور کسی کو ہوا نہ لگنے دی۔ وہ غضنفر جسے وہ سب کے سامنے سعادت مند، فرمانبردار، دنیا کی اونچ نیچ سے بے خبر، معصوم اور جانے کیا کیا کہتی ہیں۔ ایسا گہرا، اتنا فریبی اور دھوکے باز نکلا؟ نہیں نہیں۔ امی سے کہنے میں ہر قسم کا خطرہ ہے۔ راز کو راز ہی رہنا چاہیے۔ جب تک کہ وہ خود بے نقاب نہ ہو جائے۔

لیکن ان کی بیگم حاملہ تھی۔ اسے احساس تھا کہ لیڈی ڈاکٹر نے کسی خطرہ کی نشاندہی کی ہے مگر اس نے کچھ نہیں پوچھا۔!

تمہارے بچوں سے مجھے کیا سروکار۔" اباجان گرجے۔ "میں اپنی بیٹیا کے لیے مٹھائی منگوا رہا ہوں۔"

"ہم آپ کے بیٹے راجا نہیں ہیں اباجان!" مظفر نے کہا۔

"کیا چاہتے ہو۔ ادھر کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔" اباجان نے کہا۔

"پچیس روپیے۔ نئے نوٹ۔ سیر بھر مٹھائی لاؤں گا۔ سب کھائیں گے اچھی طرح۔" مظفر بولا۔

"دوکان سے روز ٹوکرے لاتے ہیں سینکڑوں۔" امی نے برا سا منہ بنایا۔

"مجھی کانی کوڑی کا حساب مجھے دیا۔ نہ کھلے دل سے بچوں پر خرچ کیا۔ وہی تھیلی کا رونا۔" چھا بمک بھر بولی۔ "آدھا گلاب جامن۔!"

"اچھا بھائی۔ لاؤ مٹھائی۔" اباجان نے گرہ لگائی اور کچھ نوٹ مظفر کو دے دیے۔ وہ ادھر مٹھائی لینے گیا۔ ادھر سب کھانے کے کمرے میں پہنچے حاضرین پر ایک نظر ڈال کر اباجان نے کہا۔

"آج پھر آپ کے دلی محبوب صاحبزادے غائب ہیں۔ یہ تماشہ کیا ہے؟ ادھر گرمی کے موسم میں بھی صاحبزادے کے جگری دوستوں کو ان کے بغیر چین نہیں بیگم! تم نے لگام ہاتھ سے دے دی ہے۔!"

"میں نے دے دی ہے؟" امی نے انھیں گھورا۔ "آپ کا کیا مطلب ہے؟ میں ان کے پیچھے اب باہر نکلوں گی؟ آپ ہی تنبیہ کیجیے۔ میں کہاں تک ٹانگ پکڑ کر کھینچوں گی۔؟"

"یہ چال چلن اچھا نہیں۔" اباجان نے اتنا کہہ کر کھانا شروع کر دیا۔ امی

نوشینہ کے دل سے ہوک اٹھی۔ ہائے بڑے بھیا۔ یہ تم نے کیا کیا۔ امی اور
بیگم دیکھیں مگر ننھا عامر رونے لگا۔ اتنے میں ابا بھی دوکان پر چھوٹے لڑکے
مظفر کو بٹھا کے کھانے کے لیے آگئے۔ بس عامر کو بہلانے اور کھانے دانے کی گڑبڑ
میں ان کی بات ادھوری رہ گئی۔

ابا نے بڑے پیار سے مسکرا کر نوشینہ کو دیکھا اور بولے: "مجھے معلوم
ہوتا کہ گھر میں میری جان میری روح آئی ہوئی ہے تو میں جلدی آجاتا اور
اپنی بٹیا شہزادی کے لیے قلاقند یا گلاب جامن لے کے آتا۔!"

"ابا جان اب منگوا لیجیے۔ اور سیخ کے کباب": نوشینہ اپنے ابا جان کے
حسب توقع ٹھنکی!۔

"ابھی۔ ابھی لو": انھوں نے جیب ٹٹولتے ہوئے ہانک لگائی: "غضنفر مظفر
ارے کوئی ہے گھر میں کہ نہیں۔ آؤ فوراً":

مظفر بھاگا بھاگا آیا: "جی ابا جان؟":

"آدھ پاؤ قلاقند اور کیا کہتے ہیں چار عدد گلاب جامن لے آؤ":

"کیا بھیا؟ ابا جان": مظفر نے بھویں تان لیں: "بھلا اتنی ساری چیزیں
بھلا کھائی جائیں گی۔ جسے یہ مٹھائیاں کھانی ہوں وہ میرے ساتھ چلے
اور لائے۔!"

"ابا جان آپ جو محبت مجھ سے کرتے ہیں نا۔ تو سب بڑے چھوٹے بھائی مجھ
سے جلنے لگتے ہیں": نوشینہ خفا ہو گئی۔

"آپ کی بھی عقل": امی اپنے میاں کو کاٹنے دوڑیں: "اللہ رکھے گھر بھر کے
بچے کھانے والے ہیں اور منگوا رہے ہیں۔ بس بھر مٹھائی۔!"

نوشینہ کے سر پر غضنفر نے بازداری کا جو کوہ ہمالیہ رکھ دیا تھا اس کا
ناقابل برداشت بوجھ غریب کو کچلے ڈالتا تھا۔ وہ زیادہ تر سسرال میں رہتی
تھی۔ ننھے ننھے دو بچوں کو سمیٹ کر بار بار آنا اسے کچھ دشوار بھی تھا۔ بہرحال
جب اس نے بھائی کی مدد کی تھی تب سے غضنفر نے اسے پھر شکل نہیں دکھائی
وہ خود گھر کی صورت حال سے واقف ہونے کے لیے ایک روز بھاگی آئی اس
کے چاروں بھائی، اور چھوٹی بہن اس کی اچانک آمد پر بے حد خوش ہو جاتے
تھے۔ امی ابا الگ نہال ہو جاتے۔ نوشینہ ان کے لیے لکشمی دیوی تھی۔ جب
اس کے قدم یہاں آگئے۔ ابا کا مرجھا مال تازہ ہو جاتا! امی تو اپنی
نصیبہ در بیٹی کی پوجا کرتی تھیں۔!

اس نے گھر آ کے دیکھا کہ ہمیشہ کی طرح غضنفر گھر سے غائب تھے۔ قید کے مارے
اس نے امی سے ان کے بارے میں کچھ پوچھا بھی نہیں۔ البتہ ناشتے کھانے سے
فارغ ہونے کے بعد امی نے خود کہا۔

"میں تو مظفر کو بھیج کر تمھیں بلانے والی تھی۔ آج یا کل شاید آخری بات
چیت کے لیے آپا آئیں گی۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ آنے والے مہینے میں تاریخ رکھا
دوں۔ گرمی کی چھٹیاں ہیں۔ اسکولوں کا بچوں میں بھی چھٹی ہوگی۔ [illegible]
آنے جانے میں آسانی رہے گی۔!"

"اچھا امی": وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ اور دل میں سوچنے لگی۔

نجانے اب بڑے بھیا کا کیا حشر ہوگا۔

میں نے دلہن کے لیے چڑھاوے کا جوڑا مع سیٹ گیارہ جوڑے خرید لیے ہیں: امی کی ڈاک گاڑی اڑی جا رہی تھی۔ کل ہی جا کے روز مرہ پہننے کے لیے چھ ہزار کا گلے کا نیکلس ساتھ میں بندے اور انگوٹھی لائی ہوں۔!

وہ بے حد خوش تھیں۔

دکھایئے امی! لپکا کے نوشینہ بولی۔

انھوں نے کنجیوں کا گچھا نکال کے نوشی کے آگے پھینکا: تجوری سے زیوروں کے ڈبے نکال لاؤ۔

بس۔ پاؤں میں پہننے کے لیے کچھ نہیں لیا امی: نوشینہ بولی۔ وہ چاہتی تھی کہ ان کی تعریفیں پاؤں سے لے کر دل بھیجان کو کسی طرح حد ور کر سکے۔

میری اتنی بھاری پاؤں زیب تھی ہے: امی نے جیلر کے ہاتھ سے کیس لے کر نوشینہ کو تھماتے ہوئے کہا: میں تو بڑھاپے میں پہنتی نہیں۔ اس پر نیا پالش پھروا کے اور گھنگھرو ڈلوا کے رکھ دے دو۔ دلہن کے لیے رکھی تھی۔ مگر ابھی امی کے لیے بہت دیر ہے ناشتہ اور دے گا!

اللہ امی۔ یہ نیکلس بے حد پیارا ہے: نوشینہ خوش ہو کر بولی: آپ نے ... والے۔ بھیا کو کیا دیں گی؟

... نہیں تھی: امی نے جواب دیا: ان کی کچی ہے۔ چاہے ... ... دیں۔ اب تو وہ ہماری نہیں ہے۔ ہماری ... پہنے گی ... آرزو پوری کرے۔ جس گھر سے دلہن بات بنا کر نکلتا تھا۔ میں ... ... اپنی خوشی نصیب کرے۔ میں اپنے بیٹے

کے سر سہرا باندھوں: وہ آبدیدہ ہوگئیں۔

نوشینہ کا دل پھر دھڑکا یا کٹ۔ صاحبزادے نے بارات اور سہرے کے بغیر گھر بسا لیا اور اللہ رکھے باپ بننے والے ہیں۔ اس کے گال گرم ہونے لگے وہ سر جھکا کر نیکلس کی بناوٹ دیکھنے لگی!

دوپہر بھر ان میں یہی باتیں ہوا کیں۔ بیچ میں امی نے شکایت کی۔

تمھارے بڑے بھیا کا طور عجیب ہوگیا ہے۔ پاؤں میں جیسے لنگڑا سنیچر گھس گیا ہے۔ کیا مجال کہ گھر پر ٹک تو جائیں۔

تمھارے ابا چیخ چلا کے چپ ہو گئے۔ میں بھینک بھینک کے بے غیرت ہو گئی۔ ایسے موئے کون سے دوست اجڑے ہیں۔ جوان باپ گھر بار بھی چاہیں سے زیادہ عزیز ہیں! عجیب رنگ دیکھ رہی ہوں۔ وہ پہلے والا لڑکا ہی نہیں۔ جی اچاٹ، نظریں بے قرار۔ اور خود وہ چکر گھنی۔ ارے۔ پہلے امتحان کا بھوت چڑھا تھا اللہ اللہ کر کے وہ اترا چھٹیوں میں تو گھر بیٹھیں۔ رات کو بھی دس بجے سے پہلے گھر نہیں آتے!:

اب چھوٹے بچوں کی طرح گھر میں گھسے کہاں بیٹھے رہیں گے امی: نوشینہ بولی۔ ایک دفعہ جب میرے پاس کمائے تو کہہ رہے تھے کہ ملازمت کی تلاش میں پھرتا ہوں۔! اس نے بے تکان جھوٹ بک دیا۔

خدا جانے بابا۔ میں تو دق ہی رہتی ہوں: امی نے بیزاری سے کہا: آج کل کے لڑکوں سے خدا بچائے۔ بیٹا دیکھ دیکھ کر جو کچھ نہ کریں وہ کم۔ پھر بھی ہم غریبوں سے یہی توقع نہیں۔ مگر سانس تولے رہے ہیں وہ بھی اس ... ... اصل خبر سے ان کا گھر بسے پھر میں ... کو سانس لوں گی!

THE HAREEM

Nov. 82

Rs. 1|40

ایڈیٹر

گزشتہ ۵۲ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا سب سے پہلا رسالہ

ماہنامہ حریم لکھنؤ

بیاد گار

سید محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

ایڈیٹر

نسیم انہونوی

نائبین

شوکت جہاں بیگم غزالہ

جانی بیگم ردولوی

قیمت فی پرچہ :۔ ایک روپیہ چالیس پیسے
قیمت سالانہ منی آرڈر سے ۔/۲۲ روپیہ
قیمت مخصوص ۔/۲۵ روپیہ
قیمت اعزازی ۔/۲۶ روپیہ
وی پی سے منگوانے پر چار روپیہ پچاس پیسے زائد
غیر ممالک سے ۔/۶۵ روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ برائے سی میل۔ ایر میل
سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔

ناشر نسیم انہونوی

جلد ۵۲ | فہرست مضامین | نمبر (۱۱)

آفس و ترسیل زر کا پتہ۔ نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ فون آفس ۴۵۵۹۰ رہائش ۴۴۳۳۵
نسیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپوا کر دفتر حریم سے شائع کیا۔

قتلِ حسینؑ اصل میں مرگِ یزید ہے

کوفہ شہر میں جبری بھرتی ہو رہی تھی۔ جو شخص فوج میں شامل ہونے سے
انکار کرتا تھا اس کی گردن مار دی جاتی تھی۔ گرد و نواح کے قبائل
کو زبردستی لایا جا رہا تھا۔ جنگ کی تیاریاں انتہائی عروج پر تھیں۔ نہرِ
فرات پر پانچ سو بہترین سواروں کا دستہ اس تاکید کے ساتھ متعین تھا کہ
ایک قطرہ پانی بھی فوجِ حسینی تک نہ جانے پائے۔ کربلا میں نامی گرامی سپہ سالاروں
کے لشکر کے پاس ایک ہزار سے پانچ ہزار تک کی فوج موجود تھی۔ [illegible]
پر چھ ہزار فوج تھی۔ وہ پوری کی پوری کربلا کی طرف منتقل کر دی گئی
تھی اور اس طرف دستے کے دستے بھیجے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ کربلا
کے گرد و پیش فوجوں کی تعداد پچاس ہزار سے اوپر ہو گئی۔ لیکن اس کے
باوجود مزید افراد دستے ترتیب دے کے بھیجے جا رہے تھے۔

نخیلہ، قادسیہ، خفان، قطقطانہ، لعلع۔ غرض حدود کی مکمل طور
ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔ تاکہ کوئی شخص اس گروہ کی مدد کو نہ پہنچ سکے۔ جس سے
جنگ کے لیے یہ زبردست تیاریاں کی جا رہی تھیں۔

یہ گروہ بہتر نفوس پر مشتمل تھا۔ جو صحرا کے جلتے ہوئے سورج کی تمازت
میں بے کس و بے یار و مددگار خیمے لگانے پر مجبور ہوا تھا جس کے ہمراہ عورتیں
اور کمسن بچے بھی تھے جو تین دن سے پانی کی بندش کے باعث ان تمام افراد
پر بالخصوص چھوٹے بچوں پر پیاس کا شدید غلبہ تھا۔

صلح کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ دشمن کے گھوڑوں کی ٹاپوں
سے زمین دہلتی اور فلک لرزتا تھا۔ تیروں کمانوں کے [illegible]
تھے صفیں درست ہو چکی تھیں۔ حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

اسی وقت اس بے سروسامان فوج کے سالار نے [illegible]
اور [illegible]۔ ان کے پیاس سے [illegible] ہونٹوں پر ویسی
ہی مسکراہٹ تھی۔ جو [illegible] ہے۔ انہوں نے [illegible]
[illegible] لشکر پر ڈالی اور اپنے شجاع اور خوبرو بھائی
سے فرمایا

عباسؑ! اگر ممکن ہو تو آج کی رات ان سے مہلت حاصل کرو۔ تاکہ آج
رات بھر ہم عبادت الٰہی اور استغفار میں بسر کریں۔ [illegible]
کریں اس کی نماز، عبادت، تلاوت قرآن اور دعا و استغفار سے [illegible]
کرتا ہوں۔

مہلت مل گئی اور صحرا کی [illegible]
دعا، شکر و التجا کے چراغوں سے جگمگا اٹھی۔

حسینؑ نے اپنے بزرگوں کے قول و عمل سے یہی تربیت پائی تھی۔
کسی غریب کو اٹھاؤ۔ کمزور کی مدد کرو۔ محتاج و بے کس کی دستگیری کرو۔ مظلوم
کو ظالم سے نجات دلاؤ۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

"ہم اہلبیت [illegible]
جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔" [illegible]

[illegible]
[illegible]

اس وقت حسینؑ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اور [illegible] وقت تک قابلِ احترام ہے۔ [illegible]
کے عظیم مقاصد کو فروغ دے رہی ہے۔
حسین علیہ السلام کی [illegible]

عوام کی امنگوں کی [illegible] تھی۔ جب تک وہ لوگ بیچ میں عوام کے بہترین حقوق کا پرزور مطالبہ [illegible] کیا تم نہیں دیکھتے کہ حق پر عمل نہیں ہوتا اور باطل سے علیحدگی اختیار نہیں کی جاتی۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ جو کچھ یزید کے پاس ہے وہ سب کا سب دوسروں کا ہے۔ خود اس کو کوئی استحقاق اس پر تصرف کا حاصل نہیں ہے۔

[illegible] کی اس آواز میں مزاحمت کی وہ قوت تھی۔ جس نے حکومت کو [illegible] دیا اور عوام ہمدردی کی اس لہر کو اپنے رگ و پے میں محسوس کرنے لگے۔ سینوں کی کچلی ہوئی آرزو کی ترجمانی کس نے کی تھی۔ یہ [illegible] موت جانتے ہوئے سر اٹھانے کا حوصلہ بخش حیات [illegible] دے رہا تھا؟ یہ کون اپنا تن من دھن لشکر ان کے مال و جان کے تحفظ کا [illegible] رہا تھا؟ یہ کون محبتوں کا امین بن کر نفرتوں کے مکروہ چہرے سے نقاب اٹھا رہا تھا۔

[illegible] جنگ کرنے نہیں نکلے تھے۔ وہ محبت بانٹنے [illegible] نکلے تھے۔ وہ رشتوں کا شعور عطا کرنے نکلے تھے۔ وہ انسانوں کو عزت سے سرفراز کرنے نکلے تھے۔ وہ محبت [illegible] قائم کرنے نکلے تھے۔ وہ عوام اور حاکم کے حدود سمجھانے نکلے تھے۔ ان کا قول و عمل ان کے عظیم مشن کی حقانیت کا اعلان تھا: امام کے معنی صرف یہ ہیں کہ کتاب خدا پر عامل ہو، انصاف کا پابند ہو۔ حق کو اپنا اصول زندگی قرار دے اور اپنی ذات کو خدا کی خوشنودی کے لئے وقف کر دے۔

[illegible] پیاسا لشکر۔ امام عالی مقام یہ نہیں دیکھتے کہ دشمن ہیں [illegible] خیال نہیں کرتے کہ اس ریتیلے صحرا میں پانی [illegible] پانی کا ایک [illegible] اور ان کے اپنے پاس پانی [illegible] ذخیرہ ہے۔ [illegible] معلوم ہے کہ ان کے ساتھ کمسن بچے [illegible] نہیں کرتے کہ وہ پانی کا سامان کریں۔ وہ [illegible] فرماتے ہیں کہ انہیں اور ان کے جانوروں کو سیراب کر دو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ دشمن کے سپاہی [illegible] صحرا میں بھٹکتے ہوئے پیاس سے دو—بے آب [illegible] جنگ کرنے آئے ہیں۔ اور یہی سالار لشکر—اپنے گذشتہ عمل پر نادم ہو کر حسینؑ کی پناہ میں آتا ہے تو وہ قدموں میں جھکتے ہوئے [illegible] محبت آمیز لہجے میں فرماتے ہیں: "حر! اس

بے سرو سامانی کے عالم میں ہمارے پاس کچھ نہیں، جو تمہاری تواضع کریں۔ [illegible] تمہیں جنت کی بشارت دیتے ہیں۔"

جنگ کی تیاریاں مخالف لشکر میں زوروں پر ہیں۔ دشمن کا ایک سوار لشکر خیموں کے قریب سے گزرا اور نہایت اشتعال انگیز نعرہ کیا۔ حبیب ابن مظاہر نے اسے تیر کی زد میں لیتے ہوئے کہا: مولا اگر حکم ہو تو اس گستاخ کو واصل جہنم کر دوں۔ لیکن امام عالی مقام نے ان کا ہاتھ روک لیا اور بردباری سے فرمایا: نہیں حبیب غصے میں مت آؤ۔ جنگ کی ابتدا ہماری جانب سے نہیں ہوگی۔

حسین علیہ السلام جنگ کرنے بھی نہیں آئے تھے، وہ شکوہ محبت کو عام کرنے آئے تھے۔ ان کی مصالحانہ کوششوں سے عمر سعد جیسا سالار لشکر بھی نے یزید کو لکھا: میرے نزدیک تو جنگ [illegible] کی کوئی وجہ نہیں۔ اب اس معاملے کو یہیں پر ختم ہو جانا چاہئے۔ حسینؑ صلح پر آمادہ ہیں۔ ان کی شرائط ایسی ہیں جنہیں قبول کرنے میں ہمیں عذر نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہونا تھا۔ حسینؑ عالی امام کو ابھی تاریخ کو ایک انوکھا موڑ دینا تھا۔ حسینؑ کو فتح و شکست کا مفہوم بدلنا تھا۔ حسینؑ کو جادۂ حق کی نشاندہی کرنا تھی۔ حسین کو ایثار و وفا کا سر غرور کرنا تھا۔

خود حسینؑ کی تنہا ذات کتنے رشتوں، کتنی محبتوں کا محور و مرکز تھی۔ وہ باپ بھائی اور شوہر تھے۔ انہیں اپنی اولاد سے بڑھ کر بہن اور بھائیوں کی اولاد پیاری تھی—وہ محبوب دوست تھے اور سب سے بڑھ کر ایک رہنما اور مصلح تھے۔ وہ انسانیت کے سچے خیر خواہ اور ہمدرد تھے۔ انہوں نے سسکتی ہوئی انسانیت کو سنبھالا دیا۔ انہوں نے ظلم و جور میں پستی ہوئی قوم کی نجات کا سامان کیا۔ وہ اپنے تمام محبت کے رشتوں کی قربانی دے کر انسانیت کو بچانے آئے تھے ان کے دامن میں جو کچھ تھا، انہوں نے راہ خدا میں لٹا دیا تھا۔ اور سر نیاز بارگاہ ایزدی میں خم کر کے فرمایا: "خدا کی خوشی وہی ہے جو ہم اہلبیت کی مرضی ہے۔ ہم اس کے امتحان پر صبر کرتے ہیں اور صابروں کے اجر کو حاصل کرتے ہیں۔"

مصائب کا ہجوم تھا اور حسینؑ تنہا تھے۔ [illegible] جنتیں بکھر رہی تھیں، جاگیریں لٹ رہی تھیں اور حسینؑ تنہا اس قیامت کو گزرتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس عالم میں بھی ان کے پائے استقامت کو لرزش نہیں تھی۔ انہوں نے اس ماحول و معاشرے میں جو ظلم کرنے اور ظلم سہنے کا عادی ہو چکا تھا، ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں ظلم و زیادتی

کا احساس سوا ہو گیا۔ ظلم کے خلاف احتجاج کرنے اور عزم و استقامت سے اس کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ انھوں نے اٹھارہ سالہ اپنے خوبصورت بیٹے کو خود گھوڑے پر سوار کیا اور ایک بار آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا: "خداوندا۔ گواہ رہنا ان لوگوں کے ظلم پر کہ اب جا رہا ہے، ان کی طرف وہ جوان۔ جو صورت و سیرت اور گفتار میں تیرے رسول کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ جب ہم تیرے پیغمبر کی زیارت کے مشتاق ہوتے تو اس کا چہرہ دیکھ لیتے تھے"۔

امام حسینؑ کے ننھوں کے پیارے بھائی عباسؑ نے جب فرات کے ٹھنڈے پانی میں گھوڑا ڈالا۔ مشک پانی سے بھر لی۔ پھر چلو میں پانی لیا لیکن اسے ہونٹوں تک لانے کے بجائے دریا میں واپس پھینک دیا۔ اور یہ کہہ کر گھوڑے کی باگ موڑ لی: عباسؑ کے لئے یہ ناممکن ہے کہ حسینؑ اور ان کے بچے تو پیاسے ہوں۔ اور وہ اپنے ہونٹوں کو اس سے تر کرلے۔ دریا میں جا کر پیاسا لوٹ آنے کی اس ادا پر محبت نثار ہوتی ہے۔

۱۰ دسالی کی گردش اس شب عاشور کو محو نہیں کر سکتی۔ جب حسینؑ نے چراغ بجھا دیا۔ اپنی بیعت اٹھا لی اور اپنے ساتھیوں سے بخوشی کہا کہ وہ جانا چاہیں تو اپنی جان بچا کر چلے جائیں ان پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔

رات کی تاریکی میں شمع محبت اس طرح فروزاں ہوئی کہ آج بھی عشق و وفا کا چہرہ اس روشنی سے منور ہے۔ عزیزوں کا کیا ذکر۔ اصحاب میں سے ایک بزرگ نافع بن ہلالؓ نے اٹھ کر کہا: "یا ابن رسول اللہ! بسم اللہ کیجئے اور چلئے ہم کو لے کر خیر و سلامتی کے ساتھ۔ چاہے مغرب کی طرف! !"

زہیرؓ نے اک عزم سے کہا: دنیا اگر ہمارے لئے ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی۔ مگر جدا ہوتا اس سے محض آپ کی نصرت و ہمدردی کی بنا پر ہوتا تو بھی ہم آپ کا ساتھ دینے کو دنیا میں ہمیشہ قیام پر ترجیح دیتے:

جب صبح طلوع ہوئی تو وہ اک انوکھی صبح تھی۔ اجلی اور روشن صبح جس کی مانگ میں محبتوں کی افشاں جھلکار رہی تھی۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے آراستہ کیا۔ اصحاب۔ اعزہ کی سپر بن گئے۔ غلام آقاؤں پر نثار ہو گئے۔ امام عالی مقامؑ نے ایک بار پھر پیغام محبت دینا ضروری سمجھا۔ اس سے پہلے کہ دشمن ہتھیار سنبھالیں۔ امام حسینؑ ناقے پر سوار ہوئے اور دشمن کی صفوں کے سامنے پہنچ کر سلسلۂ ان کو بھولی ہوئی نسبتیں یاد دلائیں۔ نفرت کی بادگرم میں ایک بار پھر محبت کے گلاب کھلائے۔ ان کی تمام تر زیادتیوں کے باوجود

انھیں پھر امن و محبت کی راہ دکھائی۔ انھیں فلاح کی دعوت دی۔ انھیں سلامتی کی طرف بلایا۔ انھیں اس فعل قبیح سے باز رکھنے کی پوری کوشش کی۔ جو اسلام کے اجلے دامن پر اک دھبہ ہے۔ جس نے اخوت و بھائی چارے اور عالمگیر محبت کے عظیم اسلامی تصورات کو گہنا کر رکھ دیا۔

حمد کے بعد امام عالی مقامؑ کے لب اظہار پر صلوات پیغمبرؐ تھی۔ وہ رحمت عالمینؐ جو عالمین کے لئے محبت و اخوت کا پیغام لے کر آئے تھے۔ وہ نبیؐ کہ جن کے قرابت داروں سے محبت بھی فرض کر دی گئی تھی۔ حسینؑ ان نسبتوں کا ذکر کر رہے تھے جو محبت ہی محبت تھیں۔

"ذرا میرے نام و نسب پر غور کرو اور دیکھو تو میں کون ہوں؟ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو۔ غور کرو کہ کیا تمہارے لئے میرے خون کا بہانا اور میری ہتک حرمت کرنا جائز ہے"؟

حسینؑ آنکھوں سے نفرت کے پردے ہٹا رہے تھے حسینؑ دلوں کی گرہیں کھول رہے تھے۔ حسینؑ نے ہتھیار سنبھالے ہوئے دشمن کو مخاطب کر دیا۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ میرے قتل پر تم کس لئے آمادہ ہوئے ہو۔ کیا کسی اپنے مقتول کا قصاص لینا چاہتے ہو جسے میں نے قتل کر دیا ہو یا کسی اپنے مال کا مطالبہ رکھتے ہو جسے میں نے تلف کیا ہو۔ یا کسی زخم کا بدلہ چاہتے ہو جو میرے ہاتھ سے کسی کو لگا ہو؟!

حسینؑ محبت کی وہ بھرپور قوت تھے۔ جس نے حق تنہا صد فطرت تک پھیلی ہوئی سیاہ نفرت کو ننگا کر دیا۔ حسینؑ کی گفتگو کے آئینے میں نفرت اپنا مکروہ چہرہ دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اس سراپا محبت سے نفرت کرنے کا جواز کیا ہو؟

سر ندامت سے جھکنے لگے۔ ہتھیاروں پر گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ کئی سرنگوں ہونے لگیں۔ محبت کے لئے اہدی فتح تھی۔ سربلندی اور سرفرازی تھی۔ دل بارگاہ محبت میں سجدہ ریز ہونے کو بیتاب ہونے لگے۔ محبت کے اس انقلاب نے نفرت کے نقیب عمر سعد کو بد حواس کر دیا۔ وہ گھبرا کر چلایا: "اے لوگو! تم پر۔ ان کو روکو۔ یہ تو اپنے باپ کے بیٹے ہیں۔ قسم خدا۔ اگر یہ اسی طرح یاس اور وعظ میں تمام دن تقریر کرتے رہیں۔ تب بھی نہ تھکیں گے اور نہ عاجز ہوں گے"۔

حسینؑ عالی مقامؑ نے محبت کا آخری پیغام بھی دے ڈالا تھا۔ انھوں نے محبت کی عظمتوں کا دبدبہ دلوں پر بٹھا دیا تھا۔ انھوں نے اس سخت ترین وقت میں بھی محبت و نفرت میں ایک ابدی حد فاصل کھینچ دی تھی۔ جب انھوں نے نفرت کو نفرت کے تمام تر شیوؤں سے مقابلہ کیا۔ ان کی فتح اک ایسی صداقت بن کر فضاؤں میں پھیل گئی۔ جس کی گونج قیامت تک محبت کی فتح کا اعلان کرتی رہے گی۔

یہ حق سے منحرف کرنے والی قوتوں کا مقابلہ کیا۔ جس جس کو بھی اپنے
مقصد سے ہٹانے کی کوشش کی گئی مگر ہر وقت ایک
دینی اہلبیت دیئے ہوئے ہو شاکر رہے۔ یہ سلسلہ وہ ہے جو کہ داعی حق ہے
جس نے قرآن پاک کو نازل کیا اور دین اسلام کو مکمل کیا جب حق کا اظہار
رہا اور اسلام کے لئے وہ سب سے بے نیاز ہو کر اس وقت جب ہمارے
لئے کوئی ... حضرت ابراہیم کی طرح آتش کدہ یزید کی طرف بڑھ رہے
تھے ... نام لیوا جو اس کا ذکر کرتے ہوئے ... قربت اور جوار
رشتہ قربان کرتے ہوئے وہ عشق الٰہی سے اس ذبح عظیم کی تکمیل کر نے مقتل گاہ
کی طرف بڑھے۔ زمین و آسمان حسینؓ کی مقدس آواز سے گونج رہے تھے۔
"خداوندا! میں تیرے سپرد کئے ہوئے ہوں۔ اپنے نفس کو اور تیری طرف
موڑے ہوئے ہوں اپنے رخ کو اور دیئے ہوئے ہوں اپنے کو تیرے ہاتھ
میں۔ ... کافی ہے"۔ اور پھر کیا ہوا۔ دنیا کا بچہ بچہ جانتا
ہے کہ میدان کربلا میں دنیا کا سب سے بڑا معرکہ حق و باطل ہوا۔ حق کی
مختصر جماعت باطل کے طوفان سے ٹکرائی۔ لیکن پھر حق پسندوں نے
ہمیشہ کے لئے ... حضرت عبداللہ بن مسلم سے جنگ کی ابتدا
ہوئی ... رفقائے حسین علیہ السلام اور خاندان رسالت
کے ... حضرت عبداللہ بن مسلم شہید ہوئے، حضرت جعفر بن
عقیل، حضرت عبدالرحمن بن عقیل نے جام شہادت پیا۔ فرزندان حضرت
زینب ... میں جان کو تسلیم ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن حسن،
حضرت قاسم بن حسن نے اپنی زندگیاں حق کے لئے قربان کیں۔ بازوئے حسینؓ
حضرت عباسؓ نے بھی فخر شہادت حاصل کیا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام
کے کڑیل جوان بیٹے اکبر نے باپ کے سامنے حق کے لئے جان، جان آفریں
کے سپرد کر دی۔ ننھے اصغر ... کو تیر مارا گیا۔ پانی سے کر تشنگی بجھانے
کے بجائے حلق پر تیر کھا کر جان دے دیا۔ اور پھر دنیا کے سب سے بڑے مجاہد،
رسول کے نواسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت بی بی فاطمہ کے جگر گوشے
حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی تحفظ اسلام کے لئے اپنی قربانی پیش کر دی۔
بظاہر حق کے پرستاروں کو شکست ہوئی۔ ... اور یزیدی فوج کو فتح
حاصل ہوئی۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ میدان کربلا میں بظاہر شکست کھانے والوں
نے دائمی فتح حاصل کی اور ... یزید کے حصے میں ابدی لعنت لکھی گئی۔ رہتی دنیا تک
مسلمان ... یزید اور اس کے ساتھیوں اور
... بھلا کہتے رہیں گے۔ اور شہدائے کربلا کو ہمیشہ اسی طرح یاد کیا جاتا
رہے گا، جس طرح آج تک یاد کیا جاتا ہے۔

یہ کربلا کی قربانی نہ ہوتا تو شاید اسلام ختم ہو گیا ہوتا۔ حضرت امام حسین
علیہ السلام کی اس قربانی نے جس کی نظیر دنیا کی کوئی تاریخ پیش نہیں کر سکتی،
اسلام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچا لیا۔

ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی خصوصی پیش کش

حضرت شیخ الحدیث نمبر

کے نام سے دسمبر ۱۹۷۳ء میں شائع ہوگا، جس میں حضرت شیخ الحدیث
مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ مرقدہٗ کی عالی شخصیت کے متعلق مندرجہ ذیل عنوانات
پر جامع مضامین شامل ہوں گے۔

- حضرت شیخ الحدیث کا نسبی سلسلہ اور اجداد کا مختصر تعارف
- حضرت شیخ الحدیث کی مشہور و معروف خود نوشت آپ بیتی کی تلخیص
- حضرت شیخ الحدیث بحیثیت محدث و مصنف
- حضرت شیخ کی مزاجی خصوصیات ۔ حضرت شیخ ایک عاشق رسولؐ
- حضرت شیخ اپنے اہل خاندان کے ساتھ ۔ حضرت شیخ کے چند بیوائی اشعار

مضمون نگار حضرات کے اسمائے گرامی

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، حضرت
مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہی۔ مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی
مولانا عتیق الرحمن سنبھلی ۔ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی، مولانا تقی الدین
ندوی مظاہری۔ اور دوسرے اصحاب علم و قلم۔

صفحات ۔۔۔ ۳۲۵، طباعت آفسٹ ۔ قیمت
اٹھارہ روپیہ ۔ مع محصول ڈاک ۔ اکیس روپیہ
شیخ الحدیث نمبر سے خریداری قبول کرنے کے خواہشمند حضرات
۳۳ روپیہ ارسال فرمائیں۔ نمبر رجسٹری سے بھیجا جائے گا۔ زیادہ تعداد
میں منگانا چاہیں تو خصوصی رعایتوں کی شرح جوابی خط لکھ کر معلوم
فرمائیں۔ وی۔ پی سے منگانے کے لئے چوتھائی رقم پیشگی آنا ضروری۔
مشتہرین نرخنامہ اشتہار طلب فرما کر جلد اپنا اشتہار روانہ فرمائیں

منیجر ماہنامہ الفرقان ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

کہ آگ لینے کو جائیں ......

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک جلیل القدر نبی تھے اور ان کی جوانی
زندگی میں بھی یہ خصوصیت نمایاں تھیں کہ وہ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کو
حوصلہ کر برداشت نہیں کر سکتے تھے اور کمزوروں اور مظلوموں کی حمایت
میں ہمیشہ پیش پیش ہو جاتے تھے۔ حضرت موسیٰ اسرائیلی تھے ان کی قوم مصر میں
حکمرانوں اور مظلوموں کی ذلت آمیز زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔ اسرائیلیوں
سے غلاموں بلکہ جانوروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ یوں تو حضرت موسیٰ
نے قدرت کے انتظام کے تحت مصری حکمران فرعون کے گھر میں پرورش
پائی اور شاہی ناز میں زندگی بسر کی۔ لیکن وہ اسرائیلیوں کے ساتھ
انسانیت سوز سلوک کے خلاف ہمیشہ برسرپیکار رہتے اور جب بھی موقع
ملتا وہ اسرائیلیوں کی مدد کرنے سے باز نہیں آتے۔

اسی سلسلے میں ان کے ہاتھوں ایک مصری کی ہلاکت کا واقعہ قابل
ذکر اور دلچسپ ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔ ہوا یہ کہ ایک دن وہ
شہر کے بازار سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک مصری ایک
اسرائیلی کو گھسیٹا ہوا لے جا رہا ہے معلوم ہوا کہ وہ اسے بیگار لینے کے
لئے لے جا رہا ہے۔ اس زمانے میں اسرائیلیوں کو بیگار کے لئے پکڑ کر
لے جانا عام بات تھی اور مصری اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ حضرت
موسیٰ نے یہ منظر دیکھا تو غصے میں آ گئے۔ وہ اسرائیلی کو مصری کی گرفت
سے بچانے کے لئے کوشش کرنے لگے اور جب مصری اسے چھوڑنے پر
آمادہ نہ ہوا اور بات آگے بڑھ گئی تو حضرت موسیٰ نے مصری کو ایک گھونسہ
مارا جو اتنا شدید تھا کہ مصری اس کی تاب نہ لا سکا۔ اور ہلاک ہو گیا۔

اسرائیلی تو اس کے چنگل سے نکل کر چلا گیا۔ لیکن حضرت موسیٰ
کو اس مصری کی موت پر بے حد افسوس ہوا [illegible]
تھے انہوں نے فوراً رب سے مغفرت طلب کی۔ چنانچہ اللہ کے حضور [illegible]
[illegible] میں تھا۔ وہ تو محض ایک مظلوم اسرائیلی
کو بچانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کشمکش میں مصری ہلاک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ
نے ان کی یہ دعا قبول کی اور انہیں معاف کر دیا۔

ادھر مصری کے قتل کی خبر سارے شہر میں پھیل گئی ظاہر ہے حاکم
قوم کے ایک فرد کا قتل معمولی واقعہ نہ تھا بات فرعون تک پہنچی اور وہاں

سے قاتل کی تلاش کا حکم جاری ہوا۔

ابھی قاتل کی تلاش جاری تھی [illegible]
کہ آج پھر وہی اسرائیلی ایک مصری سے جھگڑ رہا [illegible]
[illegible] ہے۔ حضرت موسیٰ [illegible]
[illegible]
[illegible] فرمایا [illegible] قرآن کی زبان میں انہوں نے
فرمایا کہ تو کھلا گمراہ ہے۔ [illegible]
محسوس کیا کہ اسرائیلی بھی خواہ مخواہ جھگڑ رہا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا
کہ [illegible]
کو پسند نہیں کرتے تھے۔

اسرائیل نے حضرت موسیٰ کو ہاتھ اٹھاتے دیکھا اور ڈر گیا
اس نے سمجھا کہ وہ اسے مارنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ کہنے لگا کہ جس طرح
تم نے کل ایک شخص کی جان لی تھی (مصری کی) اسی طرح مجھے قتل
کرنا چاہتے ہو)

مصری نے جو یہ سنا تو سمجھ گیا کہ کل ایک مصری کے قتل کی جو واردات
ہوئی تھی اور جس کے قاتل کی تلاش ہے وہ قاتل یہی موسیٰ ہے۔ چنانچہ
وہ بھاگ کر فرعون کے دربار میں حاضر ہوا اور بتایا کہ جس قاتل کی تلاش
ہو رہی ہے وہ تو موسیٰ ہے۔ فرعون یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا اور [illegible]
کا حکم صادر کر دیا۔

فرعون کے دربار سے وابستہ ایک نیک مرد مصری [illegible]
سے محبت رکھتا تھا۔ وہ فوراً موسیٰ کے پاس آیا اور بتایا کہ [illegible]
کا حکم صادر ہو چکا ہے اور اب تمہارے موت سے بچنے [illegible]
خاموشی سے کہیں فرار ہو جاؤ۔ حضرت موسیٰ نے حالات کے پیش نظر اس
کا مشورہ قبول کر لیا اور وہاں سے نکل کر مدین چلے گئے۔ [illegible]
موسیٰ [illegible]

حضرت موسیٰ نے جلد ہی [illegible]
کی تھی۔ اس لئے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

یہ دیکھ کر انھوں نے محسوس کیا کہ بہت کمزور ہیں اور پانی نہیں نکال سکتیں [illegible] اس وقت تک بھی دیکھو [illegible] تھا کہ [illegible] بااثر اور طاقت ور جب اپنی ضرورت کا پانی [illegible] بچا کھچا پانی بہتا تھا کمزوروں کو ملتا اور وہ [illegible] حضرت موسیٰ کے سامنے تھی کہ طاقت ور [illegible] لگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اور کمزور لڑکیاں دور کھڑی انتظار کر رہی تھیں۔ حضرت موسیٰ یہ دیکھ کر آگے بڑھے اور لڑکیوں سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ لڑکیوں نے بتایا کہ ان کے والد بوڑھے ہیں اور کمزور ہیں [illegible] ہمارے جانوروں کو پانی نہیں پلانے دیتے ہیں۔ جب اپنے جانوروں کو سیراب کر لیں گے تو بچا ہوا پانی ہم لوگ [illegible] ہمارا روز کا معمول ہے۔

یہ سن کر حضرت موسیٰ کو طیش آگیا اور وہ مجمع کو چیرتے ہوئے [illegible] کنویں کا بڑا ڈول لے کر خوب پانی کھینچا اور لڑکیوں کے جانوروں کو سیراب کیا۔ لوگوں کو حضرت موسیٰ کی یہ مداخلت ناگوار گزری لیکن [illegible] بالا شخصیت اور جسمانی طاقت دیکھ کر مرعوب ہوگئے۔

لڑکیاں جب اپنے جانوروں کو سیراب کر کے واپس ہوئیں تو [illegible] کو ان کے اس قدر جلد واپس آنے پر حیرت ہوئی چنانچہ پوچھنے پر انھوں نے سارا ماجرا سنایا کہ کس طرح ایک نوجوان نے مدد کی۔ حضرت موسیٰ لڑکیوں کے جانے کے بعد وہیں ایک درخت کے سائے میں [illegible] حالات پر غور کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ سے [illegible] [illegible] تھے۔

لڑکیوں کے والد نے ان سے کہا کہ ایسے نیک نوجوان کو ساتھ لانا تھا چنانچہ انھوں نے ایک لڑکی کو انھیں لانے کو بھیجا۔ لڑکی جب وہاں پہنچی تو اس نے دیکھا کہ وہ خاموشی سے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ لڑکی نے نیچی نظریں کئے ہوئے کہا کہ میرے والد آپ کو بلاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے یہ سوچ کر کہ شاید اللہ بہتری کی کوئی صورت نکال دے اس کے ساتھ روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچے تو لڑکیوں کے بزرگ والد [illegible] کی صورت دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے۔ اس بزرگ نے بڑی شفقت [illegible] اور پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ حضرت موسیٰ نے سارے حالات سنائے [illegible] انھیں تسلی دی اور فرمایا کہ خدا کا شکر کرو کہ تم ہماری [illegible] جان بچ گئی۔

وہ لڑکی جو انھیں لانے گئی تھی اس نے اپنے والد سے سفارش کرتے ہوئے کہا کہ کیا اچھا ہو کہ آپ انھیں مویشیوں کو چرانے اور پانی پلانے کے لئے اپنے گھر میں رکھ لیں۔ بہترین ملازم وہی ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔

لڑکی کے اس بیان سے حضرت موسیٰ کی اخلاقی عظمت بھی ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک نوجوان لڑکی تنہا ایک نوجوان کو لانے جاتی ہے اور وہ نوجوان اخلاق و شرافت اور پاکبازی کا مجسمہ نظر آتا ہے۔

موسیٰ کو مویشیوں کی نگرانی [illegible] بھی کہا کہ اگر تم آٹھ سال تک میرے پاس رہو اور بکریاں چراؤ تو میں اس کے عوض اپنی اس بیٹی کی تم سے شادی کردوں گا، اور اس میں دو سال کا اضافہ کردو تو اور بھی بہتر ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس شرط کو قبول کرلیا چنانچہ اس بزرگ میزبان نے اس مدت کو مہر قرار دے کر لڑکی کی شادی کردی۔ یہ میزبان بزرگ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ حضرت موسیٰ کی بیوی کا نام صفورہ بتایا جاتا ہے۔

معمول کے مطابق حضرت موسیٰ ایک روز بکریاں چراتے ہوئے مدین سے دور نکل گئے اس موقع پر ان کے اہل و عیال بھی ساتھ تھے، اس دوران رات ہوگئی۔ اور رات بھی بڑی سرد تھی اس لئے آگ کی جستجو ہوئی۔ سامنے کوہ سینا کا سلسلہ تھا۔ یہ جگہ بحر قلزم کے کنارے پر واقع تھی۔ حضرت موسیٰ نے چقماق استعمال کیا مگر شدت سرما کی وجہ سے آگ نہ نکل سکی۔ پھر سامنے وادی میں نگاہ دوڑائی تو دور ایک چمکتا ہوا شعلہ نظر آیا۔ بیوی سے کہا ٹھہرو میں آگ لے کر آتا ہوں۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

(ترجمہ) پھر موسیٰ نے [illegible] بیوی سے کہا، تم یہاں ٹھہرو، میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں اس میں سے کوئی چنگاری تمہارے لئے لاسکوں یا وہاں الاؤ پر کسی رہبر کو پاسکوں۔ (طہٰ)

وہاں پہنچ کر موسیٰ نے دیکھا کہ عجیب قسم کی آگ ہے درخت [illegible] نظر آتی ہے مگر نہ تو درخت کو جلاتی ہے نہ بجھتی ہے۔ وہ کچھ حیرت میں وہ آگے بڑھے لیکن گھبرا بھی رہے تھے۔ آخر واپسی کا ارادہ کیا تو ایک آواز سنائی دی۔ "اے موسیٰ میں ہوں اللہ جہانوں کا پروردگار"۔ اس کے بعد قرآن ہی کی زبان میں [illegible] ہوا۔

سمجھوتہ

عفت موہانی

شادی تو خوشی کا سودا ہے۔ یہ تو ایک مجبوری تھی۔ اظہر صاحب کی بیوی نے بڑا بے موقع ساتھ چھوڑا تھا۔ خاصی صحت مند تھیں۔ اگر بیمار ہو کے پلنگ پر لیٹتیں تو چھ مہینے تک نہ پگھلتیں۔ مگر وہ تو بہانہ ہوا۔ ایڑی میں زنگ آلود کیل چبھ گئی تھی۔ اسی نے پہاڑ سی زندگی کو گھلا دیا۔ زہرباد ہوا اور بے چاری چل بسیں۔ ان کے دم سے گھر کا شیرازہ بندھا تھا۔ اب تو یہ حال تھا کہ اگر اظہر صاحب سرِ شام تھکے ہارے دفتر سے آتے تو یوں لگتا کہ کسی دوسرے کے گھر میں گھس آئے ہیں۔ فرش پر منوں گھورہ کچرا، دیواروں پر گرد، کونوں میں جالے، میلے اور اُجلے کپڑے آپس میں اُلجھے ہوئے۔ اس پر تماشہ یہ کہ کوئی ایک پیالی چائے کو پوچھنے والا نہیں۔ صبح کو ہمسائی بڑی بی اپنے پاس سے بڑا بھلا ناشتہ دے جاتی تھیں۔ دو پراٹھے ایک حلوہ اور ایک پیالی چائے۔ مرتے کھپتے انھیں یہ نگلنا ہی پڑتا تھا۔ وہ بڑی بی کو ناشتے اور کھانے کے پیسے دے دیتے تھے۔ مگر وہ کھانا پانی زہر تھا۔ کیونکہ بے چاری بڑی بی وہی سب کچھ ان کے لئے بھی لاتی تھیں۔ جو خود ان کے گھر میں پکتا تھا۔ کبھی کبھی تو صرف چاول اور پانی کا سا شوربہ۔ ان کا گھر اللہ رکھے بچوں سے چھلکتا گھر تھا۔ وہاں قورمے کباب اور پلاؤ یا کسی عمدہ سی میٹھی ڈش کی گنجائش کہاں تھی۔ اظہر صاحب نے باورچی یا نوکر نہیں رکھا۔ ابھی تو سلیمہ کا لایا ہوا قیمتی جہیز ہی جوں کا توں رکھا تھا۔ دو سال کی گرہست زندگی کی کیا بساط تھی۔ کیا رکھتیں کیا اٹھاتیں۔ ابھی تو سنگار میز کے آئینہ پر ہلکا سا دھبہ بھی نہیں پڑا تھا۔ اظہر کو بیوی کی چیزیں بہت عزیز تھیں! وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی کوئی چیز ادھر سے ادھر ہو جائے!۔

لیکن اب یہ زندگی بڑی گراں بار ہو گئی تھی۔ انھیں بڑی شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اب وہ گھر کی بوجھل گاڑی اکیلے نہیں گھسیٹ سکتے!۔ یہ پریشانی انھیں سخت جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیتی۔ مزاج سخت چڑچڑا ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ آخر کیا کیا جائے۔ کھانا پکانا وہ نہیں جانتے۔ چائے کے ملیدہ رنگ کا انھیں پتہ نہیں۔ جھاڑو بھی نہیں دی تھی۔ ایک بچہ تک نہیں دھویا تھا۔ نہ یہ اندازہ رہا کہ بے ایمان دھوبی کتنے کپڑے مار رہا ہے۔ کتنے ہضم کر رہا ہے۔ غرضیکہ پورا ہی تختہ الٹ چکا تھا۔ کہاں تک نقصان برداشت کرتے۔ گھر بھی تباہ ہو رہا تھا۔ اور وہ خود بھی۔ ساری ساری رات ٹہلنے اور درجنوں سگریٹ پھونک ڈالنے سے بھی کوئی عمدہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

پھر ان پریشانیوں نے بخار کا روپ دھار لیا۔ وہ دفتر کا ناغہ کر کے صبح نو بجے تک بستر ہی میں پڑے رہے تھے۔ سارا بدن جیسے جوڑ جوڑ سے الگ ہو رہا تھا۔ سر کا درد تھا کہ طوفان۔

پڑوس سے لڑکا روز کی طرح ناشتہ لایا تھا۔ انھوں نے واپس کر دیا۔ کچھ دیر بعد ہمسائی بڑی بی احوال پُرسی کے لئے آئیں۔ اظہر صاحب کچھ کھسیائے سے ہنستے لبورتے بستر میں اٹھ بیٹھے۔ اور اپنی چڑچڑاہٹ کو بمشکل ضبط کر کے ان سے اپنا حال احوال کہا۔ بڑی بی نے پیش کش کی کہ وہ اپنے لڑکے کے ذریعہ کسی ڈاکٹر کو بلوا بھیجیں گی۔ پھر ڈاکٹر بھی آیا تھا۔ اس نے دیکھ بھال کے انجکشن دیا۔ نسخہ لکھا اور معمولی بخار قرار دے کر رخصت ہو گیا۔ بڑی بی نے ازراہ کرم ان کا کمرہ صاف کر دیا تھا۔ جھاڑو دی تھی اور بے چاری خود بازار جا کر دودھ اور بسکٹ لائی تھیں۔ اظہر صاحب ان کا شکریہ ادا کرتے کرتے تھکے جا رہے تھے!۔

دوا اور انجکشن سے یا پھر ایک انسان کی ہمدردانہ ہمدردی نے ان کی طبیعت میں کچھ تازگی پیدا کی تو وہ بستر سے اٹھ کر کرسی پر آ بیٹھے!۔

بڑی بی بھی کام سے فارغ ہو کر چھوٹے کھٹولے پر ٹک گئیں۔ وہ یکایک بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی تھیں۔

"میاں کچھ کم ہے بخار۔؟"

جی ہاں!۔ وہ شرمندہ ہوئے جا رہے تھے "بڑی مہربانی آپ کی۔ آپ کی وجہ سے میں ———!"

"اب تو یہ بخار آتا رہے گا!" انھوں نے پیشین گوئی کی۔

"آتا رہے گا" اظہر صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ "ملیریا کا بخار ہے شاید!"

"نہیں میاں۔ یہ تو تمہارے حالات کا بخار ہے" بڑی بی بولیں "

کیسا لاکھ کا گھر خاک ہوا ہے۔ میں تو سلیمہ بی بی کی یاد دل سے نہیں نکال سکتی۔ وہ سب کام تلپٹ کر گئیں۔ مگر میاں جانے والے جاتے ہیں۔ جو زندہ ہیں، ان کو تو قاعدے سے زندہ رہنا ہے نا۔ تمہارا یہ کارخانہ یوں کب تک چلتا رہے گا!۔ اور پھر اللہ رکھے ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ جیسے دیکھا کل اس محلّے میں آئے تھے۔ بیس برس کے لڑکے سے تھے! کیا میں جانتی نہیں۔!"

بارہ تیرہ برس گزر چکے۔ خالہ اماں " وہ مسکرائے۔

پچھلی باتوں کو دوہرانے کے بعد اور اظہر کو ہموار کر کے بڑی بی نفس مطلب پر آئیں " میاں برا نہ مانو تو میں کہوں کہ اب تم پھر سے گھر بساؤ۔ یہ کارخانہ یوں چلنے والا نہیں ہے۔

" ارے خالہ اماں۔ سلیمہ کی یاد سے میں بے وفائی نہیں کر سکتا۔! اب چلنے دیجئے۔ یہ کارخانہ جس طرح بھی چلے گا۔ گھر اور اب نہیں بساؤں گا۔ آپ سمجھیں، ایسے اگر بسنا ہی ہوتا تو یہ اُجڑتا کیوں؟"

" بچوں کی سی باتیں۔ الٹی مت۔" بڑی بی نے کہا ——"

" تمہیں سوچنا چاہئے۔ گھر بار، بیوی بچے سکون اطمینان خوشی اور کیا ہوگی زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ جب تم اگر کہو تو میں بات چلاؤں۔ ایک ہے بے چاری لڑکی میری نظروں میں ہے۔ میاں صاف بات یہ کہ تمہارا ہی سا حشر اس کا بھی ہے کہ شادی کے تیسرے ہی مہینے میاں موٹر سے کچل کر مر گیا۔ سسرال والوں نے اُسے گھر سے نکال باہر کیا ہے۔ ماں باپ اس کے ہیں نہیں۔ بھائی بھاوج کے سر پڑی ہے۔ نوکروں سے بدتر بے چاری کا حال ہے —— میں اس دن گئی تھی اس کے گھر۔ اکیلے میں بے چاری آٹھ آٹھ آنسو روئی کہ بھائی اچھے بُرے دو نوالے کو نہیں پوچھتا۔ بھاوج دنیا بھر کے کام لیتی ہے اور رکھ کے دیئے جاتی ہے۔ سچ جانو میاں۔ میں تو رو دی اس بدقسمت کے ساتھ "

جی ہاں۔ کوئی کسی کا نہیں ہے خالہ اماں " انھوں نے آہ بھری۔

نہیں ہوتا تو بنایا جاتا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ لڑکی تمہارے لئے بہت مناسب ہے۔ خالہ اماں نے بالآخر دل کی بات کہہ دی " منہ مری بے زبان گائے ہے۔ جوتے مارو کچھ نہ کہے گی۔!

لاحول ولا قوة۔ یہ جوتے چپل کیا۔!"

—" میرے کہنے کی دیر ہے۔ بھائی راضی ہو جائے گا۔ وہ تو کسی کی تلاش میں رہتا ہے کہ کندھے پر کا بوجھ اتارے۔ کسی ناقدرے کے ہاتھ تھمادے گا تو میاں ایک سیّد خاندان کی سلیقہ مند لڑکی ہاتھ سے جائے گی۔ سوچ لو۔ تم عمر بھر یونہی نہیں رہ سکتے، کبھی نہ کبھی آدمی کے تقاضے تمہیں ضرور مجبور کریں گے تو تم کبھی کیوں نہ اچھی ساتھی چن لو۔ اس کی بیوگی پر نہ جاؤ۔ مو ا تین مہینے کا سہاگ کیا۔ اٹھارہ انیس سال میں غریب نے سفید آنچل سر پر ڈال لیا ہے۔ ہائے ہائے۔ میاں میرا دل تو کچھٹ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے!"

" اٹھارہ انیس سال۔ عمر" اظہر میاں دھک سے رہ گئے "میں تو سمجھا تھا کہ شاید تیس چالیس سال "

لکھنا کی باتیں " بڑی بی نے منہ بنا لیا۔

" مم۔ مگر میں تو۔ تت تو۔ میں تو۔ آپ جانتی ہیں کہ اب کم و بیش پینتیس کا ہو رہا ہوں " وہ بالکل احمق ہوئے جا رہے تھے۔ انکار اقرار، ہاں یا نہیں کے بھنور میں چکراتے ہوئے۔

" مرد کی عمر کیا۔ بیٹے۔ اسے ساٹھ سال کی عمر میں پندرہ برس کی لڑکی مل جاتی ہے۔!"

اظہر نے اپنے گھر کی ویرانی پر نظر ڈالی۔ ہر طرف خس و خاشاک، الجھی بکھری چیزیں۔ باورچی خانہ کا بولٹ تو شاید بند رہ کر بگڑ ہی چکا تھا۔ اُف معبود برحق۔ مرد کی گرہستی کے لئے عورت کا ہاتھ ضروری ہے۔ مگر سلیمہ کی روح سے بے وفائی —— وہ چور سے بن گئے تھے۔

اور ایک بخار اترا تو دوسرا اسوار ہو گیا۔ فیصلہ کرتے بن نہ پڑا۔ اُدھر خالہ نے جان لے رکھی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible] شر کے کچھ ارمن بچی باندھ دی گئی —!

عذرا کا بھی یہ دوسرا نکاح تھا۔ ڈری سہمی سی اپنے دوسرے حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔ عجب عجیب سی کیفیات موج بلا خیز کی طرح اس کے دل پر سے گزر رہی تھیں۔ کبھی اسے اپنی پہلی شادی یاد آتی۔ کبھی مرحوم شوہر کا چہرہ لوح دماغ پر ابھرتا۔ کبھی اس کی وہ محبت اور والفت یاد آتی جو بے چارے نے ان تین مہینوں کی تھوڑی سی مدت میں عذرا کے دامن میں ڈال دی تھی۔ اُسے اب بھی مرحوم احسان کی یاد سے عشق تھا۔ وہ تو ساری زندگی اسی کی یاد کے سہارے کاٹ دینا چاہتی تھی۔ مگر بھیا اور اور بھابی کے بے جا ظلم۔ بھیا تو بھابی کی نا روا شکایت پر

اُسے مار لے دوڑتے تھے۔ مجبوراً اس نے خالہ اماں کے مشورے پر سر جھکا دیا تھا۔ جہنم سے گزر کر جنت میں پہونچ جانے کی آس میں۔ اسے کیا پتہ تھا کہ جہنم کے بھی کئی طبقے ہوتے ہیں!۔

لمحہ لمحہ رات گزرتی رہی۔ عذرا کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو کر بالآخر بند ہو گئیں۔

اور اظہر میاں ساری رات سلیمہ بیگم کی تصویر سامنے رکھے بیٹھے روتے رہے ان کی روح سے معافی مانگتے رہے۔ یہ جو جائز گناہ ان سے سرزد ہو گیا ہے۔ اب اس کا مداوا کیا تھا؟۔ بے رخی۔ سرد مہری، بے تعلقی وہ تو گھر گرہستی کی دیکھ بھال کے لئے اور اپنا بگڑا مستقبل سنوارنے آئی ہے۔ اظہر کی روح اور ان کے جسم پر حق جتانے نہیں آئی ہے۔!! ٹھیک ہے — لئے دیے رہنا چاہیئے۔ کون جانے کہ اس کے دل میں بھی مرحوم شوہر کی یاد اتنی ہی شدت سے موجود ہو۔ جتنی شدت سے ان کے اپنے دل میں مرحوم سلیمہ کی یاد موجود ہے!۔

"نو عروس" پر صبح طلوع ہوئی!۔

خالہ اماں نے اظہر کے گھر کا پورا نقشہ، گرہستی کا خاکہ، تباہ حالی کی داستان سب کچھ عذرا کو سمجھا دیا تھا۔ بے چاری جب بیدار ہوئی تو بہت شرمندہ تھی۔ ڈر بھی رہی تھی۔ کیا پتہ "وہ" آئے ہوں اور اسے سوتا سمجھ کے واپس چلے گئے ہوں — کیا سوچا ہوگا۔ عذرا نے ان کا انتظار بھی نہیں کیا۔؟

اس نے جلدی جلدی اپنے سرخ کپڑے اتارے۔ سادہ لباس پہنا۔ اور باہر نکلی۔ گھر ہی کون سا محل تھا کہ کہیں بھٹکنے کا ڈر ہوتا۔ تین کمرے۔ باورچی خانہ، اور دو پلنگ کا بھرپور ہریالی سے ڈھکا ہوا کچا آنگن!۔

اظہر سامنے بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ ان کے کانوں میں کئی برس بعد چوڑیوں کی جھنکار گونجی۔ دل یکبارگی دھڑک اٹھا۔ دیکھا کہ سامنے ان کی نئی ساتھی کھڑی تھی۔ دبلی پتلی۔ لچکیلی سی۔ مٹھی میں سما جانے والی کمر۔ پرکشش قامت، گندمی رنگت، کھنچی ہوئی کمان کی سی بھنویں۔ لمبی لمبی کالی پلکیں۔ قطعی نوعمر۔ پورے بیس کی بھی نہیں تھی!۔

یہ کیا کیا خالہ اماں نے۔ انھیں سخت جھنجھلاہٹ محسوس ہوئی۔ دیتی بچاری بھر کم حماقت کا انھیں بخوبی احساس تھا۔ اُسے

کوئی جوڑ بھی نہیں ان میں — کاش پہلے ایک نظر اسے دیکھ لیا ہوتا۔ وہ کہیں گم ہو گئے۔

عذرا نے ناشتہ کی بھری کشتی ان کے سامنے نیچی میز پر لا کے رکھ دیا بہت سی خوشبوئیں ان کی ناک سے ٹکرا گئیں۔

"تمہیں معلوم تھا۔ باورچی خانہ کہاں ہے؟" بڑی جلدی سے ایک احمقانہ بات اظہر کے منھ سے نکل گئی۔

جی ہاں" نرم و نازک سی آواز میں عذرا بولی "مجھے۔ خالہ اماں نے سب سمجھا دیا تھا۔" وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ شرم و حجاب کی کیفیتوں میں گم۔

اظہر نے اسے اپنے ساتھ ناشتہ کرنے کی دعوت دئے بغیر میز اپنے پاس سرکالی۔ وہ یونہی کھڑی رہی۔ خالہ نے کہا ہے کہ۔ آپ کو کافی پسند ہے" اس نے پھر کہا "مگر۔ باورچی خانے میں کافی نہیں ہے وہ ماردو گولی کافی کو۔ تم چائے ہی بنا لاؤ۔!" انھوں نے کہا اور بدستور گردن جھکائے ترتراتے پراٹھوں کو لذیذ آملیٹ میں لپیٹ لپیٹ کر کھانے لگے۔ عذرا نے خاموشی سے چائے انھیں تھما دی۔ خالہ اماں نے تو ہونے کے نام پر بخشش کا جو شاندہ اور کافی کے نام پر کافی کی تہمت چلائی تھی۔ لیکن چائے تو یہ تھی۔ لذیذ، گرم، خوشبودار —!

کھانے پینے کے بعد انھوں نے اطمینان سے کپڑے بدلے۔ اور دس بجتے بجتے جب آفس جانے لگے تب اپنی کنجیوں کا گچھا عذرا کی طرف اچھال دیا۔

"الماری میں پیسے رکھے ہیں۔ ضروریات کی چیزیں تو تمہیں منگانی ہی پڑیں گی۔ اور جو جی چاہے پکا لینا۔ کھا لینا۔ میں شام کو پانچ بجے آؤں گا!"

"آپ کو۔ رات کے کھانے میں کیا چیز پسند ہے؟"

"پسند و سند کیا" بے حد اکھڑے پن سے اظہر نے کہا "بس پیٹ بھرنا ہے" اور یہ کہہ کر چلے گئے۔

عذرا دیر تک وہیں کھڑی رہی۔ آہستہ آہستہ دل پھر دکھنے لگا۔ نہ تو اس کی خدمت کا اعتراف، نہ تو کھانے کی تعریف۔ یہ تک تو کہا نہیں کہ وہ ان کے گھر میں نئی ہے۔ کچھ تو آرام بھی کر لے۔ پیار محبت کی ایک بات بھی نہیں۔ اپنے ساتھ ناشتہ پر بھی نہیں بٹھایا۔ لیکن اسے اپنوں کے ظلم و ستم سے تو نجات مل گئی۔ یہاں

ملے تھے بھی کوئی کھوج تو نہ تھا۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ ایک گونہ احساس طمانیت نے اسے سنبھالا دیا۔ اس نے اظہر کا بچا کھچا ناشتہ کیا۔ اور پھر گھر کی صفائی میں جٹ گئی۔ مہینوں کا گرد و غبار لمحوں میں صاف کر دیا۔ اظہر کی خواب گاہ سنواری۔ اپنے ہاتھ کا کھانا تیار کیا اور جب نہا دھو کے اپنے کمرے میں آئی تو تھک کے چور چور ہو رہی تھی!

لیکن اس کے دل کی بے پناہ مسرتیں اور پذیرائی کی دل خوش کن امیدیں اس کی تھکن پر غالب آ گئی تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی۔ آج تو وہ انھیں تعریف ہی ستائیش پر مجبور کر دے گی!۔

شام ڈھلی۔ رات آئی۔ اظہر صاحب کا پتہ نہ تھا۔ اس کا نکھار پھیکا پڑ گیا!۔ امیدوں پر برف جم گئی۔ خوشیاں منہ کے بل آ رہیں!

وہ خاصی رات گئے آئے۔ گھر کے بدلے در و دیوار پر نظر کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ وقت بھی نہ تھا!۔ سرسری طور سے کہا کہ دوستوں میں بیٹھ گئے تھے۔ کھانا کھا کے آئے ہیں اور اپنی مہکتی ہوئی خواب گاہ۔ بے شکن بستر، معطر تکیوں، اور گلدان سے اٹھتی ہوئی جذبات خیز مہک سے یکسر بے پرواہ دیوار کی طرف کروٹ لے کے سو گئے!۔

اس نے دیکھا کہ وہ ساری رات جاگا کئے تھے۔ سلیمہ سے دانستہ بے وفائی ضمیر کا ڈنک ان کا نشان بن گئی تھی۔ اسا نحہ سا کچھ یہ فقرہ بھی دل کی رگیں کاٹ رہا تھا۔ عذرا کو بھی شاید اسی صورت حال کا سامنا ہو گا۔ اگر وہ بھی مرحوم احسان کو بھول نہ سکی ہو۔ تب۔ ان کی جذباتیت ان کے اور اس کے حق میں کتنی سوہان روح بن جائے گی!۔

عذرا سے نکاح کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ اسے سہارا ملا۔ انھیں گھر بار کا نگہبان ملا۔ اور بس! لیکن عذرا کی تو ہستی ہی بکھر کے رہ گئی۔ سچ مچ وہ بے زبان گائے ہی تھی!۔ نہ آہ نہ واہ۔ جیسے روح تھی متحرک مشین، جانے حالات سے کس طرح سمجھوتہ کیا تھا۔ لیکن غضب تو یہ تھا کہ اس کی خاموشی کو اظہر میاں پہلے شوہر کی یاد کی خلش پر محمول کرتے رہے!۔

ویسے یہ تکلف اور اجتناب بہت دنوں چل نہ سکا۔ اپنے جذبات کے سیلاب بلا خیز پر وہ اپنی لاپرواہی اور جانی بوجھی بے حسی کا بند نہ باندھ سکے!۔ اور پھر یہ ہوا کہ شرمندگی نے انھیں زیادہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔ بات بات پر بگڑ اٹھتے۔ خواہ مخواہ غصہ گرمی دکھا لے گئے!۔ عذرا نے بہت صبر کیا تھا۔ ایک روز اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا!۔

"میرا کچھ قصور بھی تو بتائیے۔ کیا کیا ہے میں نے۔ کون سی بات میری ایسی ہے جس پر آپ کو اتنا غصہ آ جاتا ہے!۔ صبح سے شام تک میں آپ کی دلجوئی اور خاطر میں لگی رہتی ہوں۔ اور پھر بھی محبت اور تعریف کے دو بول میری قسمت میں نہیں!۔ ازل سے میں بدنصیب ہوں۔ اب تو خدا مجھے غارت ہی کر دے۔!"

"ایسی کون سی مصیبت ٹوٹی ہے۔ موت ہی جس کی نجات ہو؟" اظہر نے کہا۔ دل میں قائل ہو گئے تھے مگر جواب نہ سوجھا۔

"اور پھر کیا۔ جو عورت اپنے شوہر کو خوش اور راضی نہ رکھ سکے۔ اس کا جینا نہ جینا برابر" عذرا کو تو رونا آیا جا رہا تھا۔ "کیا کہیں چین نہیں لے گا؟" میں تو کیا سوچ کر آئی تھی۔ میرے دکھوں کا مداوا ہو جائے گا۔ مگر کچھ نہ ہوا میرا سوچا"

"آخر تم چاہتی کیا ہو" وہ جھنجھلا گئے۔ "یہ آج کس قسم کی لن ترانی تم نے چھیڑ رکھی ہے۔ میں تو نہیں دیکھتا کہ تمہارے دکھوں کا مداوا نہیں ہوا ہے۔ ہر طرح آرام سے ہو۔ زندگی کی بنیادی ضرورتیں ہیں۔ روٹی کپڑا اور مکان۔ وہ تمہیں حاصل ہیں!"

"بس؟" عذرا نے بھیگی بھیگی پلکیں ان کی طرف اٹھائیں "آپ کے لئے یہی کافی ہے؟"

"اور کیا چاہیئے؟"

"آپ کی توجہ۔ آپ کی۔ آپ کا۔!" وہ محبت اور پیار کے لفظ بول نہ سکی۔ صرف رو پڑی۔

"سنو۔ عذرا" وہ ہنس کر آگے جھکے "ایک بات پوچھوں۔ وہ تمہارے۔ مطلب یہ کہ احسان صاحب سے تو تمہیں اس قسم کی کوئی شکایت نہ ہو گی!"

"اب گڑے مردے مت اکھاڑیئے!" عذرا بولی۔

"وہ تو میں سمجھتا ہی تھا" اظہر نے کہا۔ عذرا اٹھ کر چلی گئی۔

اس رات انھوں نے دیکھا کہ وہ کوئی ننھی سی تصویر لئے رو رو کر صاحب تصویر سے کچھ کہہ رہی تھی۔ اظہر نے صاف مردانہ چہرہ دیکھا۔ اور ان کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی!۔

اس رات وہ بھی سلیمہ کی تصویر آنکھوں سے لگا کر خوب روئے تھے۔

عجیب سے عذاب میں ان کے شب و روز گزر رہے تھے۔

وہ مرحوم بیوی کے گنہگار ـــ یہ مرحوم شوہر کی مردہ محبت کی یاد میں غلطاں!

بیوی پھر بھی شوہر کی بدچلنی برداشت کرلیتی ہے۔ لیکن شوہر مردہ رقیب تک کو برداشت نہیں کرسکتا! ـ اظہر کے دل سے یہ کانٹا نکلتا تو ان کی موجودگی میں ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ احسان کی تصویر کے سامنے آہ فغاں کرے؟ ـ ایسی عورت سے کون محبت کرے گا جو وفادار نہ ہوا۔

وہ عذرا کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے لگے! عجیب سی رہتی تھی کھوئی کھوئی ـ گری گری سی۔ جیسے کوئی مجبور کررہا ہوا یہاں رہنے پر۔!

وہ اسے آزماتے "کھانا کھاؤ۔ کبھی تو ساتھ بھی کھایا کرو۔!"

"جی نہیں چاہ رہا۔!"

"کافی تو پیو ساتھ میں!"

"ابھی نہیں لگتی!"

"میں جلدی آجاؤں گا۔ فلم دیکھنے چلیں گے!۔"

"آپ چلے جائیے کسی دوست کے ساتھ۔ فلم ولم سے مجھے دلچسپی نہیں!"

"ہو بھی کیسے سکتی ہے" اظہر کا پیمانۂ صبر چھلک گیا "تمہیں تو خواہ مخواہ اس منحوس بڑھیا نے یہاں جھونک دیا ہے۔ میرے پیروں میں بیڑیاں بھی اسی کم بخت نے ڈالی ہیں۔ تم اپنی جگہ ٹھیک تھیں۔ تم گالیاں کوسنے اور مار پیٹ ہی کھا کے مطمئن رہ سکتی ہو۔ یہ ماحول تمہیں سزاوار نہیں ہے۔ موری کے کیڑے کو میں نے مخمل کی ڈبیہ میں بند کر رکھا ہے۔ کوئی عورت ہو تم بھی؟ مسکراہٹ تمہارے لبوں پر نہیں آتی۔ سنگھار بناؤ سے تم کو دلچسپی نہیں۔ کہیں آنے جانے کا دل تمہارا نہیں چاہتا۔ چاہے بھی کیونکر۔ میں تو مارے باندھے کا شوہر ہوں۔ ابھی تمہارے دل سے پہلے ہی شوہر کی یاد کب نکلی ہے۔ تم اسی مردود کے نام پرستی ہو جاتیں۔ مجھ سے شادی پر حامی کیوں بھری تھی؟"

عذرا بس روتی رہی!ـ وہ اٹھ کر غصے کے مارے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں جاکر سلیمہ کی تصویر نکالی۔ اور بے حد بے بسی سے اس پر ہاتھ رکھ دیئے۔ لیکن آج ان کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلے۔ تن بدن پھنک رہا تھا!ـ وہ سلیمہ کی تصویر کو گھورنے لگے۔ اور جیسے اس کی مردہ آنکھیں انھیں ملامت کرنے لگیں!۔

"تم بھی وہی حرکت کر رہے ہو۔ جو عذرا کرتی ہے۔ پھر وہ گناہ اور وہ گناہگار کیوں ہے!"

تصویر انھوں نے رکھ دی۔! ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے!۔

دیر تک وہ تنہا بیٹھے اپنے خیالوں سے الجھتے رہے۔ پھر بوجھل قدم رکھتے ہوئے اندر پہونچے!۔ عذرا نے آنسو پونچھ لئے تھی مگر ابھی بھی اپنے سوٹ کیس میں کپڑے رکھتی رہی۔!

"کہاں جارہی ہو بھئی!" وہ کچھ گھبرا گئے تھے۔

روتے روتے سے لہجے میں عذرا بولی "گالیاں کھانے کوسنے بددعائیں سننے کے لئے۔ بھیا کے پاس!"

وہ پاس آئے اور جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ تبھی ٹرنک کے پاس پڑی ایک تصویر پر نظریں پڑیں!۔

خاصہ وجیہہ بارعب ایک معمر چہرہ تھا!ـ انھوں نے بے ارادہ تصویر اٹھالی۔

عذرا نے ہاتھ بڑھایا "اباجان کی تصویر دے دیجئے۔ میں جارہی ہوں!"

"یہ اباجان ہیں!" وہ دھک سے رہ گئے!۔

"ہاں۔ میرے اباجان ـــ یہی ایک تھے جو مجھے اتنا چاہتے تھے۔ تقدیر نے انھیں بھی جدا کردیا!" اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے چہرہ چھپالیا۔

اظہر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"بے وقوف تو میں تھا۔ عذرا۔ آئندہ یہ کچھ نہ ہوگا۔ مجھے معاف کردو!" انھوں نے اپنی جیب سے سلیمہ کی تصویر نکال کے پرزے پرزے کردی۔ اور عذرا کو اپنی طرف کھینچ لیا!!

افسانہ

خدمت اور لگن

زبیدہ خاتون صدیقی

ایک روز پیشتر خوب زور کی بارش ہو چکی تھی۔ اب صبح مطلع صاف تھا نکھری نکھری سی نرم نرم دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہ شہر کا نشیبی علاقہ تھا کچے راستوں میں جا بجا پانی بھرا ہوا تھا۔ اس علاقے میں زیادہ تر غریب مزدوروں، ٹھیلے داروں اور رکشے والوں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ شہر کا ہی ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی یہ علاقہ دیہات سے بدتر تھا۔ یہاں پڑھے لکھے صاحب حیثیت آدمی صرف الیکشن کے دنوں میں ہی دکھائی پڑتے تھے۔ ویسے کچھ دنوں سے یہ افواہ ضرور گرم تھی کہ یہ علاقہ بھی کالونی بنانے کے لئے گورنمنٹ اسکیم میں آگیا ہے۔ مگر صرف زبانی خبریں اور کاغذی گھوڑے تھے عملی قدم ابھی کافی دور تھا۔

ایک گلی کے سامنے چھ سات سال کا تندرست و توانا بچہ ایک چھڑی میں موٹا دھاگا باندھے اسی جگہ بھرے ہوئے پانی میں اس طرح چھپ چھپ کر رہا تھا مانو سچ مچ ہی مچھلی مار رہا ہو۔۔۔ صبح اس کے ساتھ کئی ایک ساتھی اس کھیل میں شامل تھے۔ مگر اب سب تھک کر اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ وہ صرف اکیلا ہی اس دلچسپ کھیل میں انتہائی مستعدی سے مشغول تھا۔

اچانک ایک طرف آٹھ دس چھوٹے چھوٹے بچے صاف ستھری ڈریس۔ سفید موزے کالے جوتے پہنے ایک ہاتھ میں بیگ دوسرے ہاتھ میں کھانے کا ڈبّہ لئے ہوئے اس گلی کے بعد والے میدان کے اس پار بنی ہوئی کالونی میں۔ کے ۔۔۔ اسکول جا رہے تھے۔ ویسے تو دوسری طرف سے پکی ڈامر کی سڑک بھی شہر سے کالونی تک آئی ہوئی تھی۔ مگر وہ دور پڑتی تھی۔ ان بچوں کے والدین نے اول تو راستہ کی نزدیکی اور ساتھ ہی ٹرافک کے خطرے کی وجہ سے اپنے بچوں کو ان گلیوں سے ہو کر اسکول جانے کی تاکید کر رکھی تھی ایک جگہ گلی میں خاصی دور تک پانی بھرا ہوا تھا۔ سب بچے ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔ بغیر جوتے موزے اتارے آگے جانا ناممکن تھا۔

سب نے جلدی جلدی موزے جوتے اتارے مگر اب انہیں اٹھا کر کہاں لے جائے۔؟ ان کے دونوں ہاتھوں میں تو بستہ اور کھانے کا ٹفن تھما ہوا تھا۔

اے لڑکے۔۔۔ ایک بچہ نے جو نسبتاً سب سے بڑا تھا اس کو آواز دی۔ سلیم سر گھما کر اسے دیکھنے لگا وہ روزانہ ہی ان بچوں کو ادھر سے اسکول جاتے دیکھتا تھا بلکہ کئی بار تو اس کے دل میں بھی اس آرزو نے سر اٹھایا کہ کاش۔۔۔۔ وہ بھی ان بچوں کی طرح صاف ستھرے کپڑے پہن کر اسکول جاتا۔

یہاں آؤ۔ لڑکے نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ سلیم ذرا دیر گومگو کی حالت میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ میں دبی ہوئی چھڑی اسی جگہ پھینک کر ان کے پاس چلا آیا اس لڑکے نے انتہائی نرمی سے کہا سنو۔۔۔ یہ ہمارے سب کے جوتے اٹھا کر تم ہمیں میدان کے اس پار تک پہونچا دو۔ ہم سب مل کر تمہیں پیسے دیں گے۔ سلیم نے ایک نظر جوتوں پر ڈالی اور پھر جھک کر تین چار جوڑ جوتے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لئے۔ مگر باقی اور جوتے۔۔۔ جو زمین پر پڑے رہ گئے تھے وہ کیا ہوں! سب بچے سوچ میں پڑ گئے

اچانک سلیم نے کچھ سوچ کر جوتے زمین پر رکھ دیئے اور اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگا۔ سب بچے اُسے دیکھنے لگے۔ دو تین منٹ کے بعد سلیم ایک چھوٹا سا کپڑا اٹھا لایا۔ زمین پر بچھا کر سب جوتے اس میں رکھے اور ایک پوٹلی سی بنا کر ہاتھ میں اٹھا لی۔

شاباش۔۔۔ تم بہت عقلمند ہو ایک بچے نے تعریفی انداز میں کہا۔ سلیم نے چمکتی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور آگے پانی میں چھپ چھپ کرتے چلنے لگا۔ ایک بچے نے اس سے پوچھا تم پڑھنے کیوں نہیں جاتے۔؟۔

سلیم نے اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا اور دھیرے سے بولا ہمارے باپو جو نہیں ہیں۔ کہاں گئے تمہارے باپو۔ دوسرے بچے نے پوچھا۔

اماں کہتی ہیں کہ مر گئے سلیم نے چپکے سے کہا اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ سب بچے تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ اسکول کے سامنے بنے ہوئے پارک میں جا کر جہاں ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا سب بچے رک گئے اپنے اپنے بیگ اور ٹفن بنچ پر رکھ کر سب ہاتھ پیر دھونے لگے۔ جو بچہ ہاتھ پیر دھو کر آتا۔ سلیم اس کے جوتے کپڑے سے صاف کر کے اس کے سامنے

رکھ دیتا اس کی اس خدمت گزاری کے جذبے سے سب بچے بہت خوش ہوئے۔ اپنے اپنے جیب خرچ سے کسی نے پانچ کا سکہ دیا کسی نے دس پیسے کسی نے مارے خلوص کے اپنے حصّہ کا کیلا اسے دیدیا۔ کسی نے آدھا سیب دیا اور کسی نے ایک پراٹھا۔۔۔ خدمت اور خلوص کے سامنے امیری اور غریبی کی حدیں ٹوٹ گئیں۔۔۔۔ سب بچے اسے اپنا انتہائی مخلص دوست سمجھ کر ٹاٹا۔۔۔ کہتے ہوئے اسکول چلے گئے۔

سلیم پارک میں گم صم کھڑا اپنے ننھے سے دوستوں کو روشن مستقبل کی طرف بڑھتے دیکھتا رہا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بھی ان سب کے ساتھ ہی پڑھنے جاتا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں میں دبے ہوئے پیسوں کو گنا سب چالیس پیسے تھے۔ اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ وہ مرے مرے قدموں سے گھر لوٹا اور مٹھی میں دبے ہوئے پیسوں کو ایک ڈبے میں رکھ دیا۔ پھر اپنی میلی بش شرٹ اتار کر طاق پر سے صابن اٹھایا اور اپنی عقل و سمجھ کے مطابق اسے دھونے لگا۔ ان سب صاف ستھرے بچوں کے سامنے اسے اپنی میلی شرٹ کی وجہ سے بہت ہیٹی محسوس ہوئی تھی۔ سلیم کا باپ ایک چکی پر مستری تھا مگر دو سال پہلے بجلی کا جھٹکا لگنے سے اس کا انتقال ہو گیا تھا اس وقت سلیم کی چھوٹی بہن چند ماہ کی تھی۔ جب سے اس کی ماں سکینہ بیگم سلائی بنائی کر کے یا چکن وغیرہ کاڑھ کر کسی نہ کسی طرح اپنے بچوں کو پال رہی تھی۔ وہ ایک نیک دل اور خوش خصلت عورت تھی قرآن شریف اور اردو وہ خود پڑھی تھی اور فرصت میں سلیم کو بھی پڑھایا کرتی تھی۔ شوہر کی زندگی میں وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو کسی نہ کسی طرح دسویں تک ضرور تعلیم دلوائے گی۔ مگر شوہر کی موت سے یہ سب خواب خیال ہو گیا تھا۔

سلیم نے بش شرٹ دھو کر چارپائی پر پھیلا دی اور خود نہانے لگا۔ اتنے میں اس کی ماں بھی آگئی۔ سلیم نے اسے دیکھ کر کہا اماں۔۔۔ ہمارا نام بھی میدان کے اس پار والے اسکول میں لکھوا دو۔

سکینہ نے حسرت کی ایک لمبی سانس لیکر کہا بیٹا! اس اسکول میں بڑے آدمیوں اور پیسے والوں کے بچے پڑھتے ہیں۔ تم جیسے غریبوں کا وہاں کہاں گزر ہے۔؟

نہیں اماں۔۔۔۔ میں تو اسی اسکول میں پڑھوں گا۔ سلیم نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔۔۔ ماں کا دل تڑپ اٹھا گلوگیر لہجہ میں بولی آج تمہارے ابو زندہ ہوتے تو ضرور تمہارا نام اسی اسکول میں لکھوا دیتے مگر ان کے نہ ہونے سے اب پیسے کہاں سے آئیں گے۔

سلیم منہ بسور کر ماں کو دیکھنے لگا۔ سکینہ بیگم نے انتہائی محبت سے اسے لپٹا لیا۔ اور پرمحبت لہجہ میں بولی تم کو پڑھنے کا ایسا ہی شوق ہے تو کچھ دن ٹھہرو۔ میں تھوڑے پیسوں کا انتظام کر لوں پھر سڑک کے اس پار والے اسکول میں تمہارا نام لکھوا دوں گی۔ وہاں فیس بھی نہیں پڑتی۔ بس کسی نہ کسی طرح کتابیں لے دونگی۔

سلیم کچھ سوچکر جلدی سے اندر گیا اور ڈبے سے پیسے نکال کر ماں کے پاس آیا اور خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا دیکھو اماں۔۔۔ آج اتنے پیسے مجھے ملے ہیں۔

یہ کس نے تم کو دئے۔۔۔ سکینہ نے کڑی نظروں سے اسے گھور کر پوچھا۔ کیا کسی کے چرا لائے ہو؟ نہیں اماں۔۔۔ سلیم کی ساری خوشی کافور ہو گئی سہمے ہوئے انداز میں بولا یہ جو میدان کے اس پار اسکول ہے نا۔۔۔۔ وہیں پڑھنے والے آٹھ دس لڑکوں نے مجھے دیئے ہیں۔

کیوں دیئے۔۔۔ سکینہ غصہ سے بولی کیا ان کے ساتھ گولیاں کھیلے تھے۔؟

نہیں اماں بالکل نہیں۔ سلیم ایک نظر ماں کو دیکھ کر بولا اس گلی سے میدان تک پانی کیچڑ کی وجہ سے ان سب کے جوتے لیکر اسکول تک گیا تبھی انھوں نے مجھے پیسے دیئے تھے۔

کیا تم نے ان سے مانگے تھے۔ سکینہ نے نرمی سے پوچھا۔۔

نہیں تو۔ ان سب نے خود کہا تھا کہ ہم سب کے جوتے اس اسکول تک پہونچا دو تمہیں پیسے دیں گے۔

سلیم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

خیر یہ اچھا کیا سکینہ نے ایک لمبی سانس لے کر کہا لیکن تم کو پیسے نہیں لینا تھے کسی کی مشکل یا پریشانی میں کام آنا بہت اچھی بات ہے۔

اماں۔۔۔ سلیم نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا ان سب نے مجھے اپنے کھانے میں سے کیلا سیب اور پراٹھے بھی دئیے تھے۔

جب تو تم کو اور بھی پیسے نہیں لینا تھے ان نے اس کو پیارے سمجھا مگر رکھے وقت ضرورت خلاف کر ساتھ اس کا کام کر دینے سے

اللہ خوش ہوتا ہے۔۔۔ اور جب تم سے اللہ خوش ہوگا تو وہ خود ہی تم کو دے گا کہ کسی اور کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اب اگر کل وہ لوگ پھر تم سے کہیں تو پیسے مت لینا۔

اچھا اماں۔۔۔ سلیم سعادت مندی سے بولا اور پیسے ماں کے آگے ڈالکر باہر چلا گیا۔ دوسرے دن صبح وہ جلدی ہی اٹھ گیا ہاتھ منہ دھوکر اپنی دھوتی پھٹی بشرٹ پہنی۔ اپنی پرانی چپل جو اب چھوٹی ہو گئی تھی، جوں توں کر کے پیروں میں ٹھونسی۔ رات کا بچا ہوا کھانا جلدی جلدی کھایا اور باہر گلی میں آکر اپنے ننھے منے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا۔

جونہی بچے گلی میں دکھائی پڑے سلیم دوڑ کر ان کے پاس پہونچ گیا۔ اس کی خوشی کی کوئی حد و انتہا نہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیسے ان بچوں پر اپنی جان نثار دے۔ پانی ابھی تک بھرا ہوا تھا، اس لئے آج وہ پھر سب کے جوتے اٹھا کر پارک تک لے گیا۔ مگر جب سب بچے اسے پیسے دینے لگے تو وہ دور ہٹ گیا اور چپکے سے بولا میں یہ پیسے نہیں لوں گا۔

کیوں۔؟ سب بچے حیرت سے ایک ساتھ بولے۔

اماں نے منع کیا ہے۔ سلیم دھیرے سے بولا انھوں نے کہا ہے کہ کسی کے وقت ضرورت کام کر دینے سے پیسے نہیں لینا چاہئے ۔۔ سب بچے جو نہایت خوشی سے پیسے دے رہے تھے کسی قدر اداس ہو گئے۔ مگر سلیم کی قدر ان سب کے ننھے دلوں میں دو چند ہو گئی۔ کئی دنوں بعد پانی تھوڑا تھوڑا ادھر ادھر سے خشک ہو گیا اور سب بچے جوتے موزے پہنے پہنے گلی سے جانے لگے۔ مگر سلیم مارے خلوص کے ان سب کے ساتھ پارک تک چلا جاتا۔ راستے میں کسی کا بستہ لیکر اپنے گلے میں ڈال لیتا۔ کسی کا ٹفن اپنے ہاتھوں میں لے لیتا۔ دو بچے بہت چھوٹے اور کمزور سے تھے۔ سلیم نہایت محبت سے انھیں جوں توں کر کے تھوڑی دور اپنی گود میں اٹھا کر پارک تک لے جاتا۔۔ سب بچے بلا ناغہ اسے اپنے کھانے میں سے کچھ نہ کچھ زبردستی کھلاتے بلکہ کچھ بچے تو گھر میں پکی ہوئی کوئی اچھی چیز بھی سلیم کا حصہ لگا کر لاتے اور اسے کھلا کر خوش ہوتے دو ایک بچے تو اس سے پوچھتے کہ سلیم۔۔ مگر تم پڑھنے کو کہو تو میں تمہیں اپنی کے۔ جی نرسری کی تصویر والی کتابیں لا دوں۔؟

کوئی بچہ کہتا کہ میں اپنی ممی سے اپنی ایک ڈریس مانگ لاؤنگا۔ کوئی بچہ اپنے جوتے دینے کی پیش کش کرتا۔۔۔ غرضیکہ وہ سب دل سے چاہتے تھے کہ سلیم بھی ان سب کے ساتھ ہی اسکول میں پڑھے۔۔۔ صورت اور سیرت میں وہ اتنا اچھا اور مخلص تھا کہ سب بچوں کے ننھے منے دل اس کی بہتری کے خواہاں تھے۔

ایک بچے نے تو اپنے باپ سے سلیم کا نام اسکول میں لکھانے کے لئے اتنی خوشامد کی کہ وہ بچے کی اس انسانی ہمدردی کے جذبے سے انتہائی متاثر ہو گئے۔ اور پھر ایک دن اسکول جا کر اپنی جیب سے کاپی کتابیں خرید کر اس کا نام اسکول میں لکھوا دیا۔ ٹیلر کے یہاں ناپ دلوا کر دو جوڑے ڈریس کے بنوا دیئے۔ ایڈمیشن فارم پر گارجین کے خانے میں اپنا نام لکھوا دیا۔ اور ساتھ ہی ٹیچروں کے سامنے سلیم کو لاکر اس کی سفارش بھی کر دی اور کہا کہ اگر ہماری اور آپ کی ذرا سی توجہ اور ہمدردی سے ایک غریب بچے کا تاریک حال روشن مستقبل میں بدل سکے۔۔۔ تو یہ بات ہمارے اور آپ کے لئے انتہائی فخر کی بات ہوگی۔ اسی طرح سلیم انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ اپنے ان ننھے دوستوں کے ساتھ پڑھنے جانے لگا۔ وہ اس قدر ذہین، خوش اخلاق اور خدمت گزار بچہ تھا کہ کبھی کسی ٹیچر نے اسے پڑھانے میں کوتاہی یا لاپرواہی نہ کی۔ اور نہ ہی کسی طرح کی کج خلقی کا اظہار کیا۔ اکثر اس کی تعلیمی ضرورت کا سامان اسکول کی طرف سے دلوا دیتے تھے۔ لنچ ٹائم میں جب سب بچے کھا پی کر ادھر ادھر کھیلتے کودتے تھے۔ سلیم اپنی ٹیچروں کی خدمت میں لگ جاتا۔ ۱۵ راگست یا ۲۶ رجنوری کے موقع پر سب ٹیچرس تھوڑے تھوڑے پیسے ملا کر اس کی نئی ڈریس بنوا دیتے جوتے موزے لے دیتے اپنی نیک نیتی اور خوش اخلاقی سے وہ اسکول میں انتہائی ہر دل عزیز ہو گیا تھا۔ ان سب باتوں کے علاوہ وہ پڑھائی میں بھی انتہائی تیز تھا۔ ابتدائی درجوں میں جہاں بچے اکثر دو دو سال لگا دیتے ہیں۔ اس نے صرف ایک سال میں امتیازی نمبروں میں پاس کر کے دکھایا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ذہانت کسی امیر یا غریب کی میراث نہیں۔

وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ عقلمند تھا۔ خوددار تھا۔ اور اپنی حیثیت سے اچھی طرح واقف تھا کچھ دنوں بعد۔ ہر سال اپنے اسکول سے فرسٹ پوزیشن سے کامیاب ہونے والا لڑکا۔ اپنی ٹیچرس کی آنکھوں کا تارا بن کر کامیابی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ سب ہی کو اس سے ہمدردی

تھے سب لوگ اس سے پیار کرتے تھے۔ اچھے نمبروں میں کامیاب ہونے کے باعث اسے وظیفے ملتے رہے، جس سے اس کی حوصلہ افزائی ہوتی۔ بورڈ کے امتحان میں بھی اس نے لڑکوں لڑکیوں میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ اس کا فوٹو اخبارات میں چھپا۔ اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا اب اس کی ماں سلائی کڑھائی نہیں کرتی تھی۔ سلیم کو کئی اچھے ٹیوشن مل گئے تھے جن سے اسے کافی روپیہ مل جاتے تھے۔ اسے رشک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اکثر والدین کی خواہش تھی کہ اسے اپنا داماد بنالیں۔ اس کی تحریکیں بھی ہوئیں، لیکن سلیم شادی کے لئے تیار نہیں ہوا۔ وہ تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کرنے کے بعد ہی کچھ کرنا چاہتا تھا۔ آخرکار وہ آئی۔ اے۔ ایس کے کمپٹیشن میں بیٹھا اور کامیاب رہا۔ اس وقت ایک جھونپڑی میں رہنے والا یتیم اور غریب بچہ حاکم ضلع ہے۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں پھرنے والا لڑکا، ایسی ترقی بھی کرسکتا ہے۔ لیکن لگن، محنت اور مسلسل جدوجہد نے سلیم ہی کی طرح بہتوں کو ترقی کی معراج تک پہونچایا ہے۔

کسی ماہ حریم ۲۰ تاریخ تک نہ ملے تو دفتر کو اطلاع دیں۔ اگر ۲۰ تاریخ تک آپ نے اطلاع نہ کی تو دوسرا پرچہ قیمتاً روانہ کیا جائے گا۔

نئی تعلیم اور خواتین

از [illegible]

جو ڈگری لے کے اسکولوں سے ہندی لڑکیاں نکلیں
مہذب ہو گئیں جس دم وہ تہذیب جدید سے
بزرگوں، شوہروں کا کچھ لحاظ ان کو نہ پردے کا
تماشوں، تھیٹروں، جلسوں کا ان کو شوق چرّایا
کہیں کرکٹ کہیں ہاکی، کہیں دوڑ اور کہیں پولو
نہ مذہب سے غرض مطلب نہ کچھ ارکان مذہب سے

بہن کیسی کہ [illegible] میں [illegible] بنیں
تو کرتی اپنی ان بہنوں پہ [illegible]
دماغوں میں وہ [illegible] آزادیاں [illegible]
ادھر ہو [illegible] ادھر ہو [illegible] پیدا [illegible]
غرض جس [illegible] کا چاہے [illegible]
تو تقلید یورپ کے [illegible]

نئی تعلیم کو پاکر بقول حضرت اکبر
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

بہو بیٹی

منو یاسمین قبا

ڈاکیے نے دروازے [illegible] آواز دی شکیلہ بی بانو دوڑتی ہوئی دروازے کے پاس گئیں اور [illegible] لفافہ کو اٹھا کر دیکھنے لگیں کہ کس کا خط آیا ہے امی [illegible] خالدہ نے باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے پوچھ لیا۔

"کس کا خط آیا ہے؟"

"سعدیہ کا" لفافہ پھاڑتے ہوئے شکیلہ بی نے کہا۔

بہو چپ چاپ کھڑی ساس کے چہرے کو دیکھتی رہی جو خط پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھلتا جا رہا تھا۔

"کیا لکھا ہے؟" جب شکیلہ بی خط پڑھ چکیں تو خالدہ نے دریافت کیا۔

"[illegible] سوموار کو سعدیہ حامد کے ساتھ آ رہی ہے اوہ کتنی خوشی ہو رہی ہے مجھے، شادی کے بعد پہلی بار آ رہی ہے دیکھو بہو سعدیہ اور حامد کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ رہنے پائے۔" خالدہ چپ چاپ کھڑی رہی وہ جانتی تھی ساس کی تقریر اب دیر تک جاری رہے گی شکیلہ بی کہتی رہیں "کھانا تو سعدیہ بناتی ہے کیا سالن بناتی ہے ایک بار تمہارے سسر کے دوست کلکٹر صاحب [illegible] گھر کھانے پر آئے تھے سعدیہ نے کھانا پکایا تھا کہنے لگے بھائی صاحب ایسا مزے دار کھانا تو بڑے بڑے ہوٹلوں میں بھی نہیں ملتا۔ آپ کی لڑکی تو بہت سگھڑ ہے، ابھی شکیلہ بی سعدیہ کی نہ جانے کتنی تعریف کرتیں لیکن اسی وقت کسی نے باہر سے پکارا تو شکیلہ بی اسی طرف بڑھ گئیں۔ اور خالدہ نے چین کی سانس لی۔ اسے سسرال آئے [illegible] دن ہوئے تھے کہ سعدیہ کی بھی شادی ہو گئی تھی اس لئے وہ اس کی صفات سے واقف نہ تھی۔ ہاں تھوڑی بہت بات چیت اس سے ضرور ہوئی تھی اکثر وہ سعدیہ کو خط بھی بھیجتی تھی چونکہ وہ سعدیہ سے اچھی طرح واقف نہیں تھی اس لئے اسے گھبراہٹ ہونے لگی کہ میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا حامد اور سعدیہ کو پسند نہیں آیا تو؟

سعدیہ کے آنے میں ابھی دو دن باقی تھے لیکن شکیلہ بی نے پورے محلے میں گھوم گھوم کر اس کے آنے کی خبر پھیلا دی تھی شام کو جب ان کے شوہر اختر علی اور بیٹا سلیم دفتر سے آئے تو انھوں نے فوراً ہی سب سے پہلے خط ان کے سامنے رکھ دیا۔ "امی یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ سعدیہ اور حامد آ رہے ہیں" سلیم اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

"ہاں تو اب دیکھنا ہے کہ تو بہن کی کتنی خاطر کرتا ہے ہماری سعدیہ سی لڑکی اللہ سب کو دے۔ کیا مجال جو میرے پیر دبائے بغیر وہ کبھی سوئی ہو اور ایک یہ بہو ہے۔ ارے اپنی بہو سے کہہ دینا کم از کم جب تک سعدیہ یہاں رہے اس کی خاطر اچھی طرح کرے۔"

"کیوں جھوٹ بولتی ہو سعدیہ کی ماں ابھی میں نے کل ہی تو دیکھا تھا بہو تمہارا پیر دبا رہی تھی" اختر علی بول پڑے۔

"اونہہ کبھی ایک دن چھو لیا تو وہ دبانا کہلائے گا؟" شکیلہ بی نے منہ بگاڑ کر کہا۔

"لیکن بہو کے ذمہ کام کتنا رہتا ہے یہ تو سوچو سعدیہ کے وقت تو نوکر بھی تھا اور تم بھی ساتھ میں لگی رہتی تھیں۔ اب تو اکیلے بہو کو ہی سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

اختر علی نیک انسان تھے بہو اور بیٹی کو ایک نظر سے دیکھتے تھے ہر وقت شکیلہ بی جو بہو پر طنز کرتی رہتی تھیں انھیں بالکل پسند نہیں تھا اب بیٹی تو اپنے گھر گئی اچھی یا بری بہو ہی ان کے گھر کی رونق تھی خوش قسمتی سے بہو بھی نیک اور اچھی ملی کبھی ساس کے سامنے منہ نہیں کھولتی تھی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ دن رات بیٹی کی صفات سے اس کا مقابلہ کیا جاتا رہے۔ ماں کی باتوں سے سلیم کا چہرہ اتر گیا لیکن باپ کو بولتے دیکھ کر وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سلیم باورچی خانے میں پہنچا تو اس نے خالدہ کو گم صم چولہے کے پاس کھڑا دیکھا چائے کا پانی بہت دیر سے ابل رہا تھا وہ چپ چاپ خالدہ کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا خالدہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی تو اس نے دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "خالدہ" خالدہ نے چونک کر چہرہ اوپر اٹھایا تو سلیم کو ایک دھچکا لگا۔ خالدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ سلیم کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"میں کیا کروں سلیم؟ تمہیں بتاؤ کیسے امی کا دل جیتوں؟"

"ہمت سے کام لو خالدہ" سلیم اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا "سعدیہ امی کی اکلوتی لڑکی ہے اور تم اکلوتی بہو [illegible] سعدیہ [illegible]

امی کے دل سے جدا نہیں ہوئی ہے دیکھ لینا خالدہ ایک دن امی تمہیں بھی سعدیہ کی طرح ہی پیار کریں گی اس میں ان کا قصور نہیں ہے ماں کی ممتا ہوتی ہی ایسی ہے۔ تمہارا کام ہے کہ تم ماں کے دل میں سعدیہ کی جگہ پیدا کرنا۔ جب جاؤ ۔ دیکھو پانی کب سے ابل رہا ہے۔"

دوسرے دن شکیلہ بی اپنا ایک سال پرانا سویٹر ادھیڑنے بیٹھ گئیں اچانک خالدہ نے پوچھ لیا۔ "امی یہ سویٹر تو اچھا تھا اسے کھول کیوں رہی ہیں؟"

"اگر کیا جاڑے میں مروں اتنے پرانے ڈیزائن کا سویٹر پہنے ہوئے اگر سعدیہ نے دیکھ لیا تو بہت ناراض ہوگی اس کے آنے کی دیر ہے دیکھنا دو دن میں ہی پورا سویٹر بن کر رکھ دے گی۔" اس کے بعد پھر شکیلہ بی شروع ہو گئیں کیا ہاتھ ہے سعدیہ کا سڑک پر کوئی نئے ڈیزائن کا سویٹر پہن کر گزرتا ہے تو سعدیہ فوراً اسے اپنے ذہن میں اتار لیتی ہے۔" بہو خاموش رہ گئی اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ سعدیہ کو لینے شکیلہ بی بھی اسٹیشن جانا چاہتی تھیں لیکن یہ سوچ کر چپ ہو گئیں کہ کہیں سلیم کے ابا یہ نہ کہہ بیٹھیں کہ بہو کو تو کبھی لینے نہیں گئیں۔ خالدہ صبح سے ہی باورچی خانے میں تھی شکیلہ بی نے سعدیہ کی پسند کی ایک طویل فہرست اسے بنا دی تھی سعدیہ کے انتظار میں شکیلہ بی بڑی بے چینی سے اندر باہر آجا رہی تھیں۔

ٹھیک سات بجے گھر کے باہر ٹیکسی رکنے کی آواز سنائی دی "آگئے لوگ" خالدہ نے سوچا۔ اسے بڑی گھبراہٹ ہو رہی تھی اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا سلیم، حامد کے ساتھ ہنستا ہوا اندر آ رہا تھا سعدیہ امی کے گلے سے لپٹ گئی تھی سلیم کے ابو ٹیکسی کا کرایہ دے رہے تھے۔

اچانک اس نے سنا سعدیہ پوچھ رہی تھی "امی بھابھی کہاں ہیں" اور اس کے ساتھ ہی خالدہ نے ہلکے قدموں کی چاپ باورچی خانے کی طرف آتی محسوس کی۔ اس نے سر کا آنچل ٹھیک کر لیا اور دیگچی میں چمچہ چلانے لگی۔

"واہ کیا خوشبو ہے یقیناً ہماری بھابھی کے ہاتھ کا کھانا بہت مزے دار ہوتا ہوگا" کہتی ہوئی سعدیہ باورچی خانے میں آگئی۔ اور بھابھی سے لپٹ گئی۔

"کیسی ہو سعدیہ؟" خالدہ نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک آپ ابھی سنائیں بھابھی بھیا سے لڑائی ہوتی ہے یا نہیں؟"

ابھی دونوں باتیں ہی کر رہی تھیں کہ باہر سے شکیلہ بی کا بلاوا آگیا "خالدہ چائے کا پانی گرم کر دو۔"

"کیوں امی ابھی تک کچھ نہیں دیا؟" سعدیہ نے جھٹ سے سوال کیا۔

"نہیں ابھی کہاں جھینپتے ہوئے شکیلہ بی بولیں۔

"اور بھر تو نہانے کا مزہ نہیں آتا" سعدیہ نے مسکراتے ہوئے کہا "نہ جانے کیوں" شکیلہ بی کا چہرہ کچھ اتر گیا۔

کھانے کی میز پر طرح طرح کی چیزیں سجی تھیں دسترخوان مہک رہا تھا حامد اور سعدیہ چٹخارے لے لے کر کھا رہے تھے۔

"واہ بھابھی آپ کو میری پسند کیسے معلوم ہوئی" سعدیہ نے کہا "تمہارے خط سے" خالدہ مسکرا کر بولی۔

"اوہ یہ بات ہے امی بھابھی تو کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں۔"

"تجھ سے اچھا تو نہیں پکاتی" شکیلہ بی جھٹ سے بول پڑیں۔

"بیٹا حامد اب تو جیسا جا رہے کھانا [illegible] مجھے معلوم ہے سعدیہ کے ہاتھ کا کھانا کھانے کے بعد تمہیں کسی اور کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں آئے گا"

"ٹھیک ہی کہا تھا نے تو ابھی تک سعدیہ کے ہاتھ کا کھانا ہی کھایا ہے [illegible] مجھے تو بھابھی کے ہاتھ کا کھانا بہت مزے دار لگ رہا ہے [illegible] آپ اور سلیم بڑے خوش قسمت ہیں جو اسے اتنی سگھڑ بہو اور آپ کو اتنی اچھی بہو ملی ہے۔"

"ارے بھئی میرا نام کیوں چھوڑے جا رہے ہو؟ میں بھی تو خوش قسمت ہوں جسے خالدہ جیسی بیوی ملی ہے" اختر علی مسکرا کر بولے تو سبھی ہنس پڑے خالدہ شرما گئی اور سلیم کے چہرے پر خوشیاں جھلکنے لگیں۔

شکیلہ بی نے دو دن ڈھونڈ کر سویٹر کہیں چھپا دیا تھا کہ سعدیہ کی نظر اس پر پڑ جائے اور وہی ہوا بھی جب سعدیہ کی نظر پڑی تو اس نے پوچھ لیا "یہ اُون ہے امی؟"

"سویٹر کا ہے اس سال تیرے جیسا [illegible] بن جائے گا"

"کیوں؟ بھابھی تو اچھا بنتی ہیں میں بھی اپنا ایک سویٹر بھابھی سے بنواؤں گی" شکیلہ بی خاموش کھڑی رہ گئیں [illegible] یہ کہہ گئی دیکھا امی میں تو آپ کی بہن بیٹی دونوں کی [illegible] ابھی پوری ہے [illegible] شکیلہ بی کی [illegible]

"[illegible] حامد نے سعدیہ سے کہا [illegible]"

"نہیں حامد ابھی تو سخت امتحان ہے [illegible] امید ہے میرے جانے کے بعد بھابھی کو میری کمی محسوس نہیں ہوگی"

"یہی ہونا بھی چاہیے ورنہ تمہاری بھابھی بے چاری پاگل ہو جاتیں"

[illegible] نہیں آتا اتنی اچھی بہو پاکر بھی امی ہر وقت تمہاری برائیاں کرتی رہتی ہیں۔

"[illegible] برداشت کرنے لگی ہوں حامد تمہیں تو معلوم ہی ہے [illegible] بھی ہو رہا تھا کہ تمہاری امی ہر وقت تمہارا ذکر کرتی [illegible] یہاں تک پہنچا دی ہے۔ [illegible] کہ امی کو مجھ سے کوئی شکایت نہ رہے۔"

"[illegible] نے جھٹ کہہ دیا کہ تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا [illegible] نے ابھی تک نہیں کھایا ہے ورنہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ میری [illegible] ہے۔" کہتے ہوئے سعدیہ کو حامد نے اپنے قریب [illegible]۔

"[illegible] بالکل نہیں۔" ہنستے ہوئے سعدیہ بولی۔ [illegible] سلیم سینما کے ٹکٹ لے آیا تھا پکچر دیکھنے کے بعد سلیم [illegible] اور سعدیہ اور حامد کو لے کر انھیں شاپنگ کروانے [illegible]۔

[illegible] ہوئی تو اس نے دیکھا شکیلہ بی بی [illegible] سعدیہ کہاں رہ گئی؟" بہو کو اکیلا آتا دیکھ کر [illegible]۔

[illegible] آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟" ساس [illegible] ہوئے خالدہ بولی "ارے آپ کو تو بخار ہے۔"

"[illegible] جائے گی۔" شکیلہ بی بی نے آہستہ سے کہا لیکن [illegible] پہلے جیسا زور نہیں تھا۔

"کیا ہوا؟" [illegible] جب سعدیہ لوٹی تو ماں کو لیٹا دیکھ کر پوچھ بیٹھی۔

"کچھ نہیں [illegible] تم لوگ جاؤ کھانا کھاؤ" سعدیہ [illegible] شکیلہ بی بی کو بالکل اچھے نہیں [illegible] تھا سا محسوس کر رہی تھیں انھیں امید [illegible] جائے گی۔

[illegible] تو خالدہ شکیلہ بی بی [illegible] آپ نے کچھ کھایا بھی نہیں ہے" [illegible]

[illegible]

[illegible] اٹھنے لگیں تو انھوں نے پوچھا "تم نے کھانا کھایا؟"

"آپ کے بغیر کیسے کھا لوں گی، تھوڑا سا کھا لیجئے۔"

شکیلہ کا دل رونے لگا، بہو تو اتنا خیال رکھتی ہے اور بیٹی کھانا کھا کر سو گئی انھوں نے خاموشی سے ایک روٹی کھا لی ان کے کھانے کے بعد خالدہ نے بھی اپنا کھانا نکالا اور کھانے لگی۔

دوسرے دن صبح سے ہی سعدیہ اور حامد باہر چلے گئے۔ شکیلہ بی بی کا بخار بڑھ گیا تھا ڈاکٹر آکر دوا دے گیا تھا سعدیہ اور حامد شام کو لوٹے تو شکیلہ بی بی نے پوچھا "کہاں چلے گئے تھے۔ تم سب؟ کھانا بھی نہیں کھایا؟"

"ان کے ایک دوست ہیں ان کے ہاں گئے تھے۔ ہم تو کپڑے بدلنے آئے تھے، پھر جا رہے ہیں۔ ہاں، آپ کی طبیعت کیسی ہے امی؟"

"ٹھیک ہے۔" کمزور آواز میں شکیلہ بی بی نے جواب دیا۔

"اچھا امی" کہتی ہوئی سعدیہ پھر حامد کے ساتھ باہر نکل گئی۔

شکیلہ بی بی کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا سعدیہ کا رویہ انھیں اندر تک ہلا گیا تھا خالدہ نے سہارا دے کر انھیں اٹھایا، دوا پلائی پھر آہستہ آہستہ سر دبانے لگی۔

گھر سونا تھا۔ شوہر اور بیٹا دونوں ابھی دفتر سے نہیں لوٹے تھے۔ اکیلی بہو ہی تھی جو ان کی خدمت کر رہی تھی اچانک خیال آیا سعدیہ ان کی اپنی بیٹی ہے پھر بھی اس نے اتنی خدمت نہیں کی جتنی بہو کرتی ہے۔ سعدیہ بیٹی ہے اس لئے اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی انھوں نے بڑھا کر دیکھا خود بہو خود ان کی آنکھیں بھر آئیں شادی کے بعد سعدیہ کتنی بدل گئی ہے بیمار ماں کو چھوڑ کر گھومنے چلی گئی ہے شاید ٹھیک ہی ہے بیاہ کے بعد تو ساس ہی اس کی ماں ہے پہلے بھی تو انھیں ماں کا درجہ دے رکھا ہے سعدیہ تو کئی بار ان کی بات کو ٹال بھی گئی ہے لیکن بہو نے آج تک ان کی کسی بات سے انکار نہیں کیا کبھی اس کے منہ سے شکایت کا لفظ کبھی نہیں نکلا ہے کتنی اچھی بہو ملی ہے انھیں وہ اب تک اس بے زبان پر کتنا ظلم کرتی رہی ہیں سلیم کے ابا ٹھیک ہی کہتے ہیں اب تو بہو ہی ان کی بیٹی ہے انھوں نے آہستہ سے بہو کا ہاتھ تھام لیا ان کا گلا رندھ گیا تھا بھرائی ہوئی آواز میں بولیں "بیٹی اب تم سو کر جاتے تو میرا سر [illegible] دنیا سب [illegible] تھوڑ نے لگی تھی۔"

"کسی مادھری ... [illegible] دے تو ہم کو اطلاع دیں۔ [illegible] آپ نے اطلاع نہ کی تو [illegible] پوچھتا ... [illegible]

افسانہ

زنجیرِ وفا

سیما قدوس

رات کے دو بج چکے تھے سردی اپنے عروج پر تھی وقت محوِ پرواز تھا۔ لمحہ لمحہ گزرتا جا رہا تھا آج اس کی تمام سوچیں یکجا ہو کر کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور تھیں۔ خوشی انسان کی زندگی میں دھیرے دھیرے اس طرح داخل ہوتی ہے کہ اس کا احساس بھی نہیں ہوتا اور غم تو اس پہاڑ کی مانند ہے جس کے نیچے دب کر انسان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔

آج صوبیہ پر بھی غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ ایک طرف اس کی پاک محبت تھی اور دوسری طرف اس کا اپنا مستقبل تھا آج رات میں اسے کوئی فیصلہ ضرور کرنا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور اس کے ذہن نے بند دریچوں کو کھول کر اس میں پرانے نقوش ابھارنے شروع کئے۔

صوبیہ نے جب بی اے کا امتحان پاس کیا تو ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی رشتوں کی بھرمار ہو گئی۔ وہ ہمیشہ انکار کرتی آئی تھی۔ مگر اسے کبھی نہ کبھی تو شادی کرنا ہی تھی۔ اس لئے اس نے امی کے بڑھتے ہوئے اصرار کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ آپ کو جو رشتہ پسند آئے مجھے منظور ہے۔ مگر ساتھ میں اس کی ایک شرط بھی تھی۔ وہ یہ کہ بے شک آپ رشتہ پسند کر لیں مگر شادی ایم اے کرنے کے بعد ہو گی۔

صوبیہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہونے کے باوجود بے حد سعادت مند تھی لہٰذا اس نے مستقبل کے فیصلے کو والدین کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ جمعہ کا مبارک دن تھا جب وہ غسل سے فراغت کے بعد نماز ادا کر کے لان میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ ابھی وہ مطالعے میں مصروف ہی تھی کہ امی کے بلاوے پر وہ ان کی خدمت میں پہنچ گئی۔

صوبیہ کی والدہ آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے اور سفید شال اوڑھے بستر پر نیم دراز تھیں۔ آنکھوں میں ممتا کے جذبات لئے اور چہرہ مسرت جذبات سے سرخ تھا۔ صوبیہ نے بڑھ کر سلام کیا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گئی اور بہت پیار سے انہیں مخاطب [illegible]

امی نے اس کے ماتھے پر پیار کیا اور آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکتے ہوئے مخاطب ہوئیں۔ صوبیہ تم ہماری اکلوتی اولاد ہو۔ ہمیں تم پر فخر ہے کہ تم ہماری اکلوتی اولاد ہو اور یہ خدا کی مہربانی ہے کہ تم جیسی سعادت مند بیٹی اس نے ہمیں عطا کی۔ تم بیٹی ہو اور بیٹیوں کو ایک دن رخصت ہونا ہے۔ بیٹی! تمہارے والد کے دوست بختیار کے بیٹے عامر کا رشتہ تمہارے لئے آیا ہے۔ ہمیں لڑکا پسند ہے۔ وہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہے۔ خوش اخلاق اور ذہین ہے۔ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ یہ گھرانہ ہم سب کا دیکھا بھالا ہے۔ وہاں تمہیں عزت و محبت ملے گی۔ تم اچھی طرح سوچ لو پھر فیصلہ منظور ہوگا۔ اب تم جاؤ اور آرام کرو۔

صوبیہ واپس لوٹی۔ وہ بالکل مطمئن تھی اسے یقین تھا کہ اس کے لئے جس کا انتخاب کیا جا رہا ہے وہ درست ہوگا۔ ابھی وہ یہ بات سوچ ہی رہی تھی کہ بوا نے آ کر بتایا کہ اس کی کزن عرشی کا فون آیا ہے۔ فون سنا تو وہ بے حد خوش تھی کیونکہ کل اس کی کزن عرشی کے گھر پارٹی تھی اور اس موقع پر اسے خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ وہ امی کو عرشی کا پیغام دینے چلی گئی۔

اگلے روز وہ شام چھ بجے ہی تیار ہو گئی۔ فیروزی رنگ کا سوٹ زیب تن کیا۔ بالوں کے گرد کلیوں کو آراستہ کیا گیا اور کانوں میں سفید نگینوں والا سیٹ پہنا اور کلائیوں کو خوبصورت کانچ کی چوڑیوں سے بھر اور تیار ہو کر امی کے کمرے میں پہنچی صوبیہ کو کل والی بات یاد تھی اور وہ چاہتی تھی کہ جانے سے پہلے امی کو اپنے جواب سے مطلع کر دے۔ اسی خیال سے وہ امی کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور امی کے پوچھنے سے پہلے ہی اس نے اپنا فیصلہ اقرار میں سنا دیا۔ امی نے فرطِ جذبات سے بھرپور پیار صوبیہ کے ماتھے پر کیا اور بے شمار دعائیں دے ڈالیں۔ صوبیہ اجازت لے کر عرشی کے گھر چلی گئی۔ جب سے صوبیہ کی بات پکی ہوئی تھی کوئی نہ کوئی مبارکباد دینے آ جاتا گھر میں گہما گہمی بڑھتی گئی۔ پھر ایک روز معلوم ہوا کہ لڑکے والے باقاعدہ رسم منگنی ادا کرنا چاہتے ہیں۔

آخر کار وہ دن بھی آ گیا جس کا سے انتظار تھا۔ آج پورا گھر [illegible] سے سجایا گیا۔ مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ ہر طرف [illegible] چوڑیوں کی کھنک [illegible] تھے۔ پھر اسی گہما گہمی میں منگنی کی تقریب انجام پائی۔

منگنی کے بعد وہ بے حد خوش رہنے لگی۔ انجانے احساس سے اس کا وجود مہکنے لگا۔ اور وہ خیالات کی دنیا میں عامر کی پرستش کرنے لگی تھی۔ وقت گزرتا گیا اور اس نے ایم اے میں داخلہ لیا تو وہ کچھ مصروف ہو گئی۔ عامر کے خیالات کے ساتھ ساتھ وہ پڑھائی پر بھی توجہ دیتی کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح ایم اے میں بھی اوّل رہے۔

ایک روز جب وہ یونیورسٹی سے واپس لوٹی تو گھر میں ہنگامہ بپا دیکھا۔ گھر کو خوبصورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ چائے کے لئے خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا۔ صوبیہ بے حد حیران ہوئی کہ یا الٰہی کیا ہونے والا ہے۔ ابھی وہ کھڑی ان سوچوں میں گم تھی کہ امی کی آواز پر چونک پڑی۔ پھر اسے پتہ چلا کہ عامر کے والدین شادی کی تاریخ مقرر کرنے آئے تھے۔ شام پانچ بجے کے قریب مہمان رخصت ہوئے۔ اس کے امتحان کے ایک ماہ بعد شادی مقرر کی گئی۔ پورے دو ماہ امتحان میں تھے اور تیسرے ماہ کے آخر میں شادی ٹھہرائی گئی۔ جب سے شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ صوبیہ کے والدین تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور وہ تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک کر پڑھائی میں مصروف ہو گئی اور وہ ... جس دن اس کا آخری پرچہ تھا۔ امتحانات سے فراغت پا کر وہ بے حد مطمئن ہو گئی۔

دن گزرتے گئے اور مہمانوں کی آمد بڑھتی گئی۔ روز کوئی مہمان آ جاتا۔ کیونکہ صوبیہ کی شادی میں اب صرف چند دن باقی تھے اور گھر میں رونق شروع ہو گئی تھی۔ ڈھولک کی تھاپ گیت لڑکیوں کی چیخ و پکار اور لڑکوں کا ہنسی مذاق۔ سب بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ صوبیہ کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ سب اسے تنگ کرتے۔ ہر کوئی آتے جاتے چھیڑتا تو وہ شرم سے سرخ ہو جاتی اور دھیمے دھیمے انداز میں مسکراتی رہتی۔ کبھی شاپنگ، کبھی اور نت نئے کھانے غرض بڑے چھوٹے سب انہی کاموں میں مصروف تھے۔ بہت عرصے بعد سب کو اکٹھے ہونے کا موقع ملا تھا۔

آج مایوں کا دن تھا۔ لڑکیوں کی تیاری ختم نہیں ہو رہی تھیں اور لڑکوں نے ان کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ہر طرف پھولوں کے گجروں کی بہار تھی۔ صوبیہ پیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھی۔ دوپٹے پر خوبصورت طریقے سے جال لگا ہوا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی کہ اچانک

اس کی کزن نے یہ خبر سنا کر سب کو بے چین کر دیا کہ عامر ... سے واپس آ رہے تھے کہ کار کا حادثہ ہو گیا ہے اور انہیں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ صوبیہ تو ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ لڑکیاں صوبیہ کو سنبھالنے میں مصروف ہو گئیں۔ سارا گھر سکتے میں آ گیا۔ بزرگ خواتین نے دعاؤں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

عامر کے حادثے کے بعد دونوں خاندانوں میں ایک اجنبیت کی دیوار حائل ہو گئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر کوئی ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہا ہے۔ سب اس بات کے منتظر تھے کہ اب آخر اس بندھن کا کیا ہوگا جو صوبیہ اور عامر کے درمیان باندھا جا چکا ہے۔

پھر ایک روز عامر کے والدین صوبیہ کے گھر آئے۔ ان کے چہروں سے پریشانی ظاہر تھی۔ انہوں نے بتایا کہ عامر کی ٹانگوں میں جو زخم آ گئے ہیں۔ ان کا علاج ڈاکٹروں نے یہ تجویز کیا ہے کہ اس کی ٹانگیں کاٹ دی جائیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ اسے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ ایسی صورت میں ہمیں قطعی افسوس نہ ہوگا، اگر آپ ہمارے فیصلے سے انکار کر دیں۔ آپ کو اپنی بیٹی کے مستقبل کا خیال کر کے ہی جواب دینا چاہیئے۔

یہ خبر صوبیہ کے والدین نے بڑے دکھ کے ساتھ سنی۔ انہیں بے حد تاسف ہوا۔ ایک اپاہج کے ساتھ بیٹی کا بیاہ کر دینا والدین کے لئے آسان نہ تھا۔ وہ خاموش رہے۔ کوئی جواب بن نہ پڑا آخر کار سوچ بچار کے بعد انہوں نے کہا۔ ہم صوبیہ سے مشورہ کر کے آپ کو کل جواب دیں گے۔

ماں نے صوبیہ سے صاف صاف بات بتا کر پوچھا۔ کیا ارادہ ہے تمہاری بیٹی۔

صوبیہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

ماں نے کہا بیٹی ہماری تو رائے ہے کہ انکار کر دیا جائے۔ صوبیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جیسے اپنے حواس میں نہ تھی پھر کچھ سوچ کے اسے ہسپتال پہنچا دیا۔ جہاں عامر پلنگ پر پڑا ہوا تھا اور اس کی دونوں ٹانگیں غائب تھیں۔ ایک عجیب سی بے بسی اور بے چینی اس پر طاری تھی۔ اس نے سوچا یہ اس کا عامر ہے۔ یہی عامر تھا کہ وہ کافی دنوں سے جس کے ... ہوئے تھی جسے اس نے اپنا جیون ساتھی تصور کیا تھا۔ مگر وہ اس کی زندگی میں آنے سے پہلے ہی معذور ہو گیا تھا۔ پھر اس کے تصور نے سہارا

یہ حادثہ عامر کے اس کی زندگی میں آنے کے بعد رونما ہوا ہوتا تو وہ کیا کرتی۔ کیا اس کو چھوڑ دیتی ـــ اور پھر اچانک ہی وہ جیسے ہوش میں آ گئی۔ اس نے ماں کی طرف دیکھا اور بولی شادی کے بعد ان کے ساتھ یہی ہوا ہوتا تو وہ کیا کرتی ؟

ماں نے گھور کر اسے دیکھا اور کہا اس وقت تو مجبوری ہوتی بیٹی۔

لیکن ـــــــ

لیکن، کچھ نہیں امی۔ اس سے زیادہ غیر انسانی فعل اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ہم اس حالت میں انکار کر دیں۔ میری قسمت میں جو لکھا تھا ہوا۔ میں انکار نہ کروں گی ـــ اور نہ ہی کسی اور کو ــــــــ

ماں حیران رہ گئیں۔ انھوں نے بہت سمجھایا لیکن صوبیہ نے ایک نہ سنی۔ وہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہی۔

صبح ہی عامر کے والدین آ گئے۔ انھیں صوبیہ کا فیصلہ معلوم کرنا تھا۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ صوبیہ عامر سے ہی شادی کرے گی، تو عامر کے والدین کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ اس سے بھی زیادہ خوشی صوبیہ کے والدین کو اس وقت ہوئی، جب عامر کے والد نے انھیں بتایا کہ ٹانگیں کٹنے کا پلاٹ عامر نے بنا کر صوبیہ کی آزمائش کرنا چاہی تھی۔ اس کی ٹانگیں بالکل ٹھیک ہیں، یہ خوش خبری صوبیہ تک پہنچائی گئی تو صوبیہ پر شادی مرگ کا سا عالم طاری ہو گیا۔

ایک گزارش

جن بہنوں کی سالانہ قیمت حریم دسمبر ۸۲ء تک ختم ہو جاتی ہے، ان سے درخواست ہے کہ اگر وہ اپنی خریداری کا سلسلہ قائم رکھنا چاہیں اور سالانہ قیمت منی آرڈر سے بھیجنا چاہیں تو ۱۰ دسمبر تک روانہ فرما دیں تاکہ ۳۰ دسمبر سے پہلے ہی دفتر میں وصول ہو جائے۔ آج کل کافی تاخیر سے منی آرڈر وصول ہوتے ہیں۔ اگر وی۔ پی سے ہی منگانا ہو تو کسی اطلاع کی ضرورت نہیں، حسب قاعدہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں وی۔ پی روانہ کر دیا جائے گا جو بہنیں کسی وجہ سے آئندہ خریداری قبول فرمانے کا ارادہ نہ رکھتی ہوں۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ ایک کارڈ لکھ کر ہم کو مطلع فرما دیں [illegible] وہ چاہیں کہ ان کے پاس جیسے کہ وی۔ پی [illegible] سے بچ جائیں۔ [illegible] چندہ بھیجے کا ارادہ نہ رکھتی ہوں صرف ذکر کرنا چاہیں تو بیرنگ خط [illegible]

سمجھا دیں، ہم اس عنایت و کرم کے لئے شکر گزار رہوں گے۔ یہ اطلاع ۱۵ دسمبر تک مل جانا چاہیے۔ اکثر بہنیں اطلاع دیتی ہیں لیکن وہ اتنی تاخیر سے کہ ہم وی۔ پی بھیج چکے ہوتے ہیں۔

جن بہنوں کو گذشتہ سال وی۔ پی سے حریم گیا تھا ان کی طرف سے اگر ۳۰ دسمبر تک کسی طرح کی اطلاع نہ ملی تو سالانہ وی۔ پی سے روانہ کر دیا جائے گا۔

جن بہنوں نے گذشتہ سال سالانہ قیمت منی آرڈر سے روانہ فرمائی تھی انھیں بھی۔ اگر ان کی کوئی اطلاع ۳۰ دسمبر تک نہ آئی تو انشاء اللہ وی۔ پی سے بھجوا دیا جائے گا۔ اس اطلاع کو غور سے پڑھ کر عمل فرمائیں۔

قابلِ غور نصیحتیں

- یہ زندگی ان اولادوں کے لئے دوزخ سے کم نہیں جو اپنے والدین سے وفا نہیں کرتے۔
- دنیا بھی ان کے لئے جنت سے کم نہیں جو والدین کے فرمانبردار رہ کر ان کی خدمت کرتے ہیں۔
- جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آتا اس سے خدا کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔
- جو اپنے پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا وہ خود اپنے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے۔

خواہش	وضیہ بٹ	35/-
ربط		20/-
ثمینہ		18/-
لگن	بشریٰ رحمٰن	40/-
سیب دو حصے	بلقیس کنول	60/-
عفرا	عابدہ نسرین	35/-
آئینہ	جمیلہ جبیں	20/-
نقش نیم	فردوس حیدر	14/-
سیتا بیاہ وال	بیگم رضیہ سلیم	14/-

• [illegible] ڈاک میں کھو سکتے ہیں [illegible] مہربانی [illegible] انتظار کر کے پھر لکھیے

بچے کے لئے

ماں کے دودھ کی اہمیت

مہدی عباس حسینی

آج کل یورپ اور امریکہ میں ایک شدید بحث چھڑی ہوئی ہے۔ ایک طرف بچوں کا دودھ تیار کرنے والی صنعت ہے، دوسری طرف صحت اور نفسیات کے ماہرین۔ یورپ اور امریکہ میں اکثر عورتوں نے بچوں کو اپنا دودھ پلانا بند کر دیا تھا اور ڈبے کے دودھ کا سہارا لیتا تھا۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ موجودہ نسل کی بے راہ روی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے ماں کا دودھ نہیں پیا ہے یا بہت کم مدت تک پیا ہے۔

ڈبے کے دودھ والوں کا کہنا ہے کہ ہم اپنے پاؤڈر میں نہ صرف دودھ بلکہ صحت و طاقت کی ساری دوائیں بھی ملا دیتے ہیں لہذا کمزور اور بیمار ماں کا دودھ پینے والا بچہ کمزور یا روگی ہو سکتا ہے لیکن ہمارا دودھ ہر لحاظ سے مکمل ہوتا ہے۔

نفسیات کے ماہرین کہتے ہیں کہ ڈبہ کبھی بھی ماں کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ممکن ہے کہ جسمانی طور پر ڈبے کا دودھ زیادہ صحت بخش ہو لیکن دماغی اور جذباتی اثرات کے لحاظ سے ماں کا دودھ کہیں افضل ہے۔

ہندوستان میں اس بحث کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہزاروں سال سے ہمارا یہ عقیدہ رہا ہے کہ ماں ایک دیوی ہے۔ ماں کے پیر کے نیچے جنت ہے اور ماں کا دودھ ایک ایسی نعمت اور بخشش ہے جس کے اجر میں ہمیں ساری عمر ماں کی خدمت کرنی چاہئے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہئے۔ مغرب کو کیا معلوم کہ دودھ بخشوانا کتنا عظیم تصور ہے اور ہم مشرق والے اس کو کتنی پابندی سے برتتے ہیں۔

جانوروں کی دنیا کو دیکھئے۔ ادنیٰ ترین مخلوق کیڑوں مکوڑوں کی ہے جو ہزاروں کی تعداد میں انڈے دیتے ہیں۔ پیدائش کے بعد ماں پر غذا پہنچانے کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ انڈوں میں سے ہزاروں سے بچے نکلتے ہیں ... کی صورت میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ان سے کچھ ترقی یافتہ مخلوق رکھتی ہے جن کی تعداد میں انڈے دیتی ہے اور کسی حد تک اپنے بچوں کو غذا بھی بہم پہنچاتی ہے مثلاً چڑیاں، بطخیں وغیرہ۔ ان سے زیادہ ترقی یافتہ وہ مخلوق ہے جن کے بچے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں اور ماں کے دودھ سے پرورش پاتے ہیں اور ان میں بھی اعلیٰ ترین مخلوق وہ ہے جو ایک کنبہ بنا کر رہتی ہے اور زیادہ مدت کے بعد بہت کم بچے پیدا کرتی ہے مثلاً شیر اور ہاتھی۔ اعلیٰ ترین مخلوق میں ماں اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیتی ہے اور ان پر ہر وقت نثار ہونے کے لئے تیار رہتی ہے۔

نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ طبی لحاظ سے بھی ماں کے دودھ کا کوئی بدل یا جواب نہیں۔ بوتل کا دودھ کیسے تیار ہوتا ہے۔ پہلے گائے کے دودھ کا پاؤڈر تیار کرتے ہیں پھر اس میں کچھ وٹامن اور دیگر دوائیں ملاتے ہیں۔ پھر اسے ڈبوں میں پیک کرتے ہیں۔ اس دودھ کو استعمال کیسے کیا جاتا ہے۔ پانی گرم کر کے دودھ کو گھولئے پھر بوتل میں ڈال کر بچے کو پلائیے۔ اب اس عمل میں جراثیم لگنے کے امکانات پر غور کیجئے۔ اگر گائے کو کوئی بیماری ہوئی تو اس کا دودھ خراب، اگر ڈبے میں کوئی خرابی ہو تو رکھے رکھے پاؤڈر خراب، اگر بنے دودھ پر کہیں مکھی بیٹھ گئی تو بیماری لگنے کا اندیشہ اور آخر میں اگر دودھ کی بوتل کے اندر یا نپل میں کوئی گندگی رہ گئی تو پھول سے بچے کی زندگی خطرے میں۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کو گائے کا دودھ راس نہیں آتا کسی کو بھینس کا دودھ نہیں پچتا کسی کو بکری کے دودھ سے بخار چڑھتا ہے۔

ماں کے دودھ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ حفظان صحت کے سارے اصولوں کے لحاظ سے محفوظ ہے۔ اس میں باہر کے جراثیم نہیں لگ سکتے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر ماں خود روگی ہے تو؟ اگر ماں خود روگی ہے تو اس کا روگ بچے میں اسی وقت منتقل ہو چکا ہے جبکہ وہ پیٹ میں تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بچے کی پیدائش اس کی ضامن ہے کہ ماں اور بچہ دونوں کے جسم نے اس روگ کا علاج بھی پیدا کر لیا ہے لہذا بچے کی پیدائشی یا پشتینی روگ تو ہو سکتے ہیں لیکن محض ماں کے دودھ کے باعث کوئی نیا روگ نہیں ہو سکتا۔ حفظان صحت کے علاوہ ماں کی گود میں بچے کو جو نرمی اور گرمی ملتی ہے جو حفاظت اور محبت کا احساس ملتا ہے وہ بوتل میں کہاں۔

نفسیات کے ماہرین کی رائے میں مغرب میں انتہائی مادی خوشحالی کے ساتھ ساتھ انتہائی بے اطمینانی کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ بچوں کو بچپن میں ماں باپ کی محبت اور توجہ نہیں ملتی۔ ماں باپ دونوں کام کرتے ہیں

خوب پیسے کماتے ہیں اور اسے اپنے وقتی مزے کے لئے صرف کر دیتے ہیں دونوں کو اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ بچوں پر توجہ دیں۔ البتہ بچے پر پیسے خرچ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ لیکن وہ بچہ جو اعلیٰ ترین گھر میں اعلیٰ ترین کپڑے پہن کر رہتا ہے اور مہنگے سے مہنگے اسکول میں جاتا ہے ڈبے کے دودھ پر پلتا ہے اور ماں باپ کی جگہ نوکروں یا (چائلڈ سسٹرس) یعنی اجرت پر بچے کی دیکھ بھال کرنے والوں کی نگرانی میں پرورش پاتا ہے۔ یہی بچہ آگے بڑھ کر نہ صرف اپنے بچوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے گا بلکہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو بھی پیسے دیکر اپنے سے الگ کر دے گا۔ امریکہ میں بوڑھا، غریب یا بیمار ہونا ایک بہت بڑا المیہ ہے کیونکہ وہاں کی حیثیت میں کسے رہ گئے کار سے نہ باشندہ وہاں سگا بیٹا بھی پلٹ کر ماں باپ کو نہیں پوچھتا۔

مشرق میں جب کوئی اچھا یا برا کام کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ ماں کے دودھ کا اثر ہے۔ بچہ ماں کی گود میں صرف دودھ ہی نہیں پیتا بلکہ ابتدائی تعلیم بھی حاصل کرتا ہے، بولنا سیکھتا ہے اور یہ بھی کہ کیا برا ہے کیا اچھا ہے۔ کیا کرنے میں فائدہ ہے کیا کرنے میں نقصان۔

مشرق میں کوئی بھی بچے کو روتا نہیں دیکھ سکتا۔ ہر عورت بلکہ مرد بھی اسے بہلا پھسلانے، منانے یا گود میں اٹھانے کی کوشش کرتا ہے جیسے وہ اپنے بچے کو گود میں لیتا یا لیتی ہے۔ مغرب میں عورت بازار جاتی ہے تو چھوٹے بچے کو بچہ گاڑی میں ڈال کر یا کمرے میں بند کر کے چلی جاتی ہے۔ پڑوسن کے یہاں نہیں چھوڑ سکتی۔ اب بچہ کتنا بھی چیخے چلائے۔ پڑوسی صرف شکایت کریں گے ہمدردی نہیں۔

مشرق میں بچے پر محبت کی جو بوچھار ہوتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا ہو کر معاشرے کو اپنا دشمن نہیں دوست اور ہمدرد سمجھتا ہے۔ اسے ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ دوسرے اس کے بارے میں اچھی رائے رکھیں۔

مشرق اور مغرب میں ایک غلط فہمی قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے کہ بچے کو دودھ پلانے سے ماں کی صحت بلکہ اس کے رنگ روپ پر برا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ پرانے زمانے میں امیر امراء کے گھرانوں میں بچوں کو دودھ پلانے کے لئے دایہ خدمتیں ملازم رکھی جاتی تھیں جن کے تقریباً اسی وقت بچے پیدا ہوئے ہوں جبکہ بڑے آدمیوں کے یہاں اولاد ہوئی ہو۔ ایک تو یہ بات سرے سے غلط ہے۔ نارمل حالات میں عورتوں پر ماں بننے اور دودھ پلانے کے دوران ایک نکھار آ جاتا ہے۔ چنانچہ مغرب کی بعض مشہور تصاویر ماں اور بچے کے موضوع پر ہیں، جن میں حضرت مریم کی گود میں حضرت عیسیٰ کو دکھایا گیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض عورتوں کی جن کے جلد جلد اور زیادہ تعداد میں بچے پیدا ہوتے ہیں، صحت ضرور خراب ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دودھ پلانے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

اگر وقفہ صحیح رکھا جائے یعنی بچے کو اس وقت تک دودھ پینے دیا جائے جب تک ماں کا دودھ ختم ہوتا ہے تو اس سے ماں کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا اور بچے کو دو تین سال تک ماں کا دودھ، اس کی گود اور اس کی بھرپور محبت اور توجہ مل سکے گی اور ایسا بچہ آگے چل کر یقیناً ایک تندرست اور صالح نوجوان بن سکے گا۔ جو نہ صرف ماں باپ کی محبت کا جواب محبت اور خدمت سے دے سکے گا بلکہ اپنے سماج اور ملک کا ایک مفید فرد اور اچھا شہری بن سکے گا۔

> اجل اس جہاں سے اٹھا کر رہے گی
> مقدم کسی کو مؤخر کسی کو

ایثار

روشن صبا رضوی (بی۔ اے۔ آنرز)

ابھی ابھی ساجد آکر راشد کے ہاتھوں میں تابش کی شادی کا کارڈ دے کر گیا تھا اور ساتھ ہی بم بھی برسا کر چلا گیا تھا۔ ساجد کے اس انکشاف سے راشد پر بم ہی گر گیا تھا۔ اس کی نظروں میں تو تابش کا بہت اعلیٰ مقام تھا۔ وہ تابش کو بچپن سے جانتا تھا۔ اس کی فطرت سے بخوبی واقف تھا پھر وہ ساجد کی کہی ہوئی باتوں پر کیسے یقین کر لیتا۔ اسکول سے لے کر کالج اور کالج سے لے کر انجینئرنگ کالج تک دونوں ساتھ ہی رہے تھے، دونوں گہرے دوست تھے ایک جان دو قالب۔ تابش بہت ذہین تھا۔ وہ ہمیشہ اول آتا تھا میٹرک میں تو اس نے بورڈ میں ٹاپ کیا تھا اسے میرٹ اسکالرشپ ملتا تھا۔ اس کی پڑھائی پر اس کے والدین کا کچھ خرچ نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ تابش غریب نہ تھا۔ گھر بہت شاندار تھا اس کے والد بھی بڑے بلند مرتبہ انسان تھے۔ یوں تو تابش کا پورا خاندان ہی خوبصورت تھا۔ اتنا پیارا اور اسمارٹ کہ اسے دیکھنے کے بعد ہی محسوس ہوتا تھا کہ خدا نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ راشد کو تابش کی ہر ادا پیاری لگتی تھی۔ وہ اپنی پڑھائی میں ہمیشہ اول آتا رہا اور اس نے اپنی محنت و لگن سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ تابش اور راشد جب اکثر ساتھ ہوتے تو جہیز کے موضوع پر خوب خوب بحث ہوتی۔ دونوں خوب الجھتے۔ راشد کا کہنا تھا کہ جہیز لینا کوئی جرم نہیں۔ اگر خوشی سے کوئی اپنی بیٹی کو دے رہا ہے تو لینے میں کیا حرج ہے۔ لیکن تابش کا نقطۂ نظر ہی دوسرا تھا وہ بڑے پرجوش الفاظ میں کہتا "جہیز لینا جرم ہے" اور ہماری نظروں میں یہ ایک گری ہوئی حرکت ہے اس سے کتنے ہی گھر اجڑ جاتے ہیں۔ کتنے والدین کے پاس جہیز کے لئے روپے نہیں ہوتے وہ قرض لے کر یا اپنا گھر فروخت کر کے جہیز دیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ بغیر جہیز کے کوئی بھی ان کی بیٹی کو قبول نہیں کرے گا اور پھر تابش کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ راشد اس کی اس جذباتیت کا مذاق اڑانے لگتا اور ہنس کر کہتا "ارے یار ہم تم خود بھی جہیز لو گے پھر اتنی ہمدردی کیوں دکھا رہے ہو" تابش کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ وہ فرط جذبات سے کانپنے لگتا: "میرے یار! ایسی بات نہ کر۔ میں جہیز کو ایک حرام چیز سمجھتا ہوں۔ میں تو اپنی سسرال سے ایک پیسہ نہ لوں گا اور اسی لڑکی سے شادی کروں گا جس کے والدین کے پاس جہیز کے لئے کچھ نہ ہو"۔ راشد تابش کے خیالات کو سن کر حیرت میں پڑ جاتا اور اس کے دل میں یہ خیال کروٹ لینے لگتا کہ آج بھی اس ظالم دنیا میں تابش جیسے انسان موجود ہیں۔ کاش! ہمارا معاشرہ تابش جیسے انسانوں سے بھر جاتا تو آج لڑکیاں اپنے والدین کے لئے بوجھ نہ بنتیں۔ لیکن آج راشد کے سارے خواب بکھر گئے تھے۔ تابش ایسا کر سکتا ہے یہ تو راشد کے خواب و خیال میں نہ تھا۔ جہیز کے خلاف نصیحت کرنے والا تابش خود اتنا بڑا جہیز لے کر شادی کرے گا۔ ابھی ابھی ساجد نے بتایا تھا کہ تابش کی شادی ڈاکٹر سجاد کی صاحب زادی سے ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر سجاد عرب میں ڈاکٹر ہیں انھوں نے وہاں کمایا ہے اس لئے وہ اپنے داماد کو تین لاکھ نقد، ٹی وی، فرج، ایک کلو وزن کے زیورات اور بہت سے کپڑے دے رہے ہیں یہ سن کر راشد پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا تھا۔ یہ بات اس کے تصور میں بھی نہیں تھی کہ تابش اتنا بڑا جہیز لے سکتا ہے۔ وہ تو تابش کو آج کے دور کا دیوتا سمجھتا تھا لیکن آج تو انہونی بات ہو گئی تھی ـــــ راشد کا دل تابش کی شادی میں شرکت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ اس لئے جانا چاہتا تھا کہ وہ اس موقع پر تابش کو پرجوش مبارکباد دے کر اسے شرمندہ کر سکے۔!

راشد جب تابش کی کوٹھی پر پہنچا تو باہر لان میں ہی تابش بیٹھا ہوا مل گیا ہمیشہ کی طرح اس نے مسکرا کر راشد کا استقبال کیا۔ راشد بڑے غور سے اس کے چہرے کو گھورنے لگا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ تابش کا گریبان پکڑے اور پوچھے جہیز کو حرام سمجھنے والے انسان تم خود اتنا بڑا جہیز کیوں لے رہے ہو؟ لیکن تابش کے والد موجود تھے وہ ان کی عزت اپنے چچا کی طرح کرتا تھا اس لئے اس نے اپنے کو قابو میں رکھا۔ برات کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ لیکن راشد حیران تھا کہ جہیز کے مطابق تیاریاں تو نہیں ہو رہی ہے بس جس طرح عام برات ہوتی ہے اسی طرح تابش کی بھی برات روانہ ہوئی۔ جب برات ڈاکٹر سجاد کی کوٹھی پہنچی تو راشد حیرت زدہ ہو گیا۔ پوری کوٹھی رنگ برنگے قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ طرح طرح کی آتش بازیاں شور مچا رہی تھی۔ اتنی چمک دمک تھی کہ تھوڑی

دیر کے لئے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ برات کا اتنا شاندار خیر مقدم کیا گیا کہ سب براتی خوشی سے سرشار ہو گئے۔ کھانے کا بھی شاندار انتظام تھا۔ شربت پینے کے لئے جب دولہا میاں اندر جانے لگے تو راشد بھی تابش کے ساتھ ہی تھا۔ دروازہ پر تابش کی سالیوں نے تابش کو گھیر لیا۔ وہ سب گھوڑا چکائی چاہتی تھیں۔ تابش نے جب سَو کا نوٹ اپنی سالیوں کی طرف بڑھایا تو ایک مغرور لڑکی نے آگے بڑھ کر نوٹ کے دو ٹکڑے کر دیئے اور دروازہ کی دوسری طرف ایک موٹی کالی سی عورت کھڑی کہہ رہی تھی "بیٹے تم لوگ دولہا میاں کو کیوں روکے ہوئے ہو؟ قیمت تو دے چکے ہیں جو خریدے نہیں جاتے۔ میں نے ان کو اپنی بیٹی کے لئے خریدا ہے پھر خریدی ہوئی چیز سے کچھ مانگنا کیسا؟" راشد یہ سن کر شرم سے گڑ گیا۔ اور جب اس نے اپنی نگاہوں کو اٹھایا تو تابش اپنے سر کو جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس وقت راشد کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بڑھ کر تابش کو جھنجھوڑ ڈالے۔ کہاں گیا تیرا ضمیر؟ اتنا کیوں مردہ ہو گیا؟ لیکن راشد خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پھر بہت طرح کی رسمیں ہوئیں۔ تابش کی سالیوں نے تابش کو خوب پریشان کیا اور تابش بھی لطف اندوز ہوتا رہا۔ راشد اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا کیا ہو گیا ہے تابش کو —— وہ اتنا بدل کیسے گیا۔ کیا دولت انسان کو اتنا بدل سکتی ہے۔ پھر رخصتی ہوئی اور دولہن کے ساتھ برات تابش کے گھر لوٹ آئی اتنا جہیز ملا تھا کہ چار ٹرک سامان تابش کے گھر بھیجا گیا تھا یہ سب دیکھ کر راشد بہت حیران تھا۔

دوسرے دن راشد نے تابش سے جانے کی اجازت چاہی۔ وہ تنہائی میں چند باتیں تابش سے کرنے کو بے چین تھا۔ تابش نے خلوص سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "کیا اپنے دوست کی شریک زندگی سے نہیں ملو گے؟" راشد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "ہاں کیوں نہیں؟ میں تو سوچ رہا تھا کہ تم دولت مند گھر میں شادی کر کے مجھے بھول گئے ہو" اور تابش یک بہ یک راشد سے لپٹ گیا "میرے دوست! میں نے تم سے کوئی بات نہیں چھپائی —— تم سوچ رہے ہو گے کہ میں نے جہیز لے کر شادی کیوں کی —— پیارے بھائی میری بھی کوئی مجبوری تھی" "کیا مجبوری تھی؟" راشد بیچ میں ہی بول پڑا تابش نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "بہت بڑی مجبوری تھا جس کو میں نے دولت کے لئے شادی کی ہے لیکن حقیقت کیا ہے وہ کسی کو بھی نہیں معلوم —— اس لئے کہ کون اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ نواب مشتاق زیدی غریب ہو گئے ہیں ان کی دو جوان بیٹیاں کنواری بیٹھی ہیں۔ ان کا گھر ایک لاکھ میں رہن ہو گیا ہے۔ تم ہی سوچو جس پر اتنی بڑی پریشانی ہو وہ کیا کر سکتا ہے میرے سامنے ایک ہی راستہ تھا کہ کسی دولت مند گھر میں شادی کر کے اپنے گھر کی عزت کو نیلام ہونے سے بچاؤں۔ مجھے خوشی ہے راشد میری زندگی سے میری دونوں بہنوں کی زندگی بن جائے گی، ورنہ ان کی شادیاں نہ ہو سکتیں بے شک میں جہیز کو ایک لعنت سمجھتا تھا اور آج بھی سمجھتا ہوں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں جہیز نہ لے کر کسی غریب اور حسین لڑکی سے شادی کر سکتا تھا لیکن اپنی بہنوں کے لئے ایسے لڑکے کہاں سے لاتا، جو بلا جہیز لئے، ان سے شادیاں کر لیتے۔ راشد یہ ایسی زبردست مجبوری تھی کہ مجھے اپنے ضمیر سے جنگ کرنا پڑی۔ اپنے خیالات سے روگردانی کرنا پڑی۔ میرے دوست! میرے خیالات آج بھی وہی ہیں جو میں ظاہر کیا کرتا تھا، لیکن افسوس کہ میں ان پر عمل نہ کر سکا۔ دراصل میں نے اپنی پیاری بہنوں کے لئے قربانی کی ہے۔ اس کا حقیقی علم تمہیں ابھی نہیں ہے، اس لئے آؤ میرے دوست اندر چلو —— اور اپنی بھابی کو دیکھ لو۔ میری قربانی کا صحیح علم تم کو اسی وقت ہو سکے گا، جب تم اپنی بھابی کو دیکھو گے۔ اور پھر تابش راشد کا ہاتھ پکڑے اندر گیا۔ شاندار مسہری پر ایک سیاہ فام موٹی سی لڑکی بیٹھی تھی جس کے اعضا غیر متناسب تھے۔ اس نے بہت گہرا میک اپ کر رکھا تھا اور اپنی زلفوں کو اپنے چہرے پر گرا رکھا تھا ہونٹوں پر گہرا لپ اسٹک تھا جو بہت برا معلوم ہو رہا تھا۔ تابش نے راشد کو مخاطب کر کے کہا۔ میرے دوست یہ ہیں میری شریک زندگی تمہاری بھابی۔" راشد کی حیرت کی انتہا نہ رہی —— کیا تابش نے اپنی پوری زندگی اپنے خاندان کے وقار کے لئے تباہ و برباد کر دی تھی؟ وہ تو بڑا حسن پرست تھا۔ تابش کا اتنا بڑا ایثار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

• خط وکتابت کے وقت حریم کے لئے تو فوراً نمبر خریداری کے ساتھ ذکر کریں۔
• کسی بات کا جواب چاہیں تو ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجیں۔
• کوئی صاحب [illegible] کریں تو اس پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔

شرط

عبدالمجیب سہالوی

دو دوست جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو یا تو دفتر کے بڑے بابو کی زیادتیوں کے متعلق بات کرتے ہیں یا پھر اپنی گھر والی کا رونا روتے ہیں۔

اتوار کا دن تھا دونوں دوست ناشتہ وغیرہ کر کے گھر سے نکلے گھومتے گھامتے ایک جگہ پارک میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے ایک نے کہا تم سے کیا چوری ایسی چڑچڑی بیوی ملی ہے کہ بات بات پر جھگڑتی رہتی ہے دفتر جانے سے پہلے ناشتے پر کام سے چور چور ہو جانے کا دکھڑا لے کر بیٹھ جاتی ہے دفتر سے جب تھکا ماندہ واپس ہوتا ہوں تو مسکراتے ہوئے ملنے کے بجائے رونی صورت بنائے گھر میں تنہائی کی شکایت کرنے لگتی ہے ایسی بھیل بیری بنی کہ منگنی ہوتے ہی میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ شادی کو ابھی ایک سال بھی نہیں بیتا تھا کہ والدہ اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دو بہنوں کی پہلے ہی شادی ہو چکی تھی، چھوٹی بہن بی اے میں پڑھتی تھی۔ اس نے اپنے لطف و کرم سے اس کا بی اے پاس کرنا مشکل کر دیا وہ بھی ایسی تھی کہ اس کے طعن تشنیع برداشت کرتی رہی اور کسی نہ کسی طرح مر کھپ کر بی اے پاس کر لیا۔

مگر کوئی بہن بھائی کی محبت میں دس پانچ روز کے لئے سسرال سے آ جاتی تو یہ جل بھن اس کا رہنا دشوار کر دیتی اور دو روز سے زیادہ ٹکنے نہ دیتی۔۔۔ میں نے جب اس کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو مجھے اپنی چھوٹی بہن کی فکر ہوئی پڑھائی کے بعد اب وہ چوبیس گھنٹے اس کلے دراز کے ساتھ کیسے بسر کرے گی۔ بہن بیچاری اتنی سیدھی ہے کہ سوائے رونے کے جواب دینا تو جانتی ہی نہیں۔ یہ چڑیل جب پیچھے پڑ کر دن رات اس کے پیچھے پڑی رہے گی تو اسے دق ہو جانا یقینی ہے۔ اس لئے میں نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے عزیزوں میں ایک لڑکے کے ساتھ شادی کر دی۔ زیادہ خوشحال نہیں مگر دو وقت دال روٹی کا انتظام ہے لڑکا ایک دفتر میں کلرک ہے۔ محنتی اور ذہین ہے امید ہے کہ ترقی کر جائے گا۔

دوسرا دوست بولا تم نے یہ بڑا اچھا کیا ورنہ تمہاری بیچاری بہن کا یہ کس نکال دیتی۔ میں نے تو اسی لئے پہلے بہنوں کی شادی سے فراغت کر لی پھر اپنی شادی کی مگر بیگم صاحبہ جو خود کو دیوتا سمجھتی ہیں اور سسرال والوں کی خاطر میں نہیں لاتیں انھوں نے آتے ہی چھوٹے بھائی کا رہنا دشوار کر دیا۔ میں نے لاکھ سمجھایا وہ تمہارے یہاں پڑا نہیں رہے گا پڑھائی کے لئے والد نے میرے پاس بھیج دیا ہے ایم اے کا آخری سال ہے پاس کرنے کا چلا جائے گا کہیں نوکری چاکری کرے گا۔

مگر وہ یہی رٹ لگائے رہی کہ نوکر ہو جائے گا تو مستقل طور پر سر پر سوار رہے گا۔ اور شادی کے بعد بیوی کو بھی لا کر ہمارے یہاں رکھے گا، نا بابا میں یہ جھمیلا نہیں پال سکتی۔ انھیں پڑھنا ہے تو ہوسٹل میں رہیں۔

میں نے کہا نیک بخت یہ نہیں سوچتیں کہ جو سنے گا تو کیا کہے گا کہ بھائی شہر میں رہ رہا ہے اور بھائی ہوسٹل میں رہے پھر اسے زیادہ سے زیادہ چار مہینے رہنا ہے کوئی سال دو سال تو رہنا نہیں۔ لوگ کہیں گے کہ بیوی کے آتے ہی بھائی کو گھر سے نکالنا پڑا۔ تمہاری ہی بدنامی ہوگی۔

بیگم صاحبہ ہٹ سے بولیں مجھے نام نہیں چاہیئے۔ میں ان عورتوں میں نہیں جو گھر پھونک کر تماشا دیکھتی ہیں۔ اپنے میاں بچے خود ہی بھاری ہیں آپ کو تنخواہ ہی کون بڑی ملتی ہے جو یہ تمہارے پالے رکھے ہیں۔ اس زمانے میں مشترکہ خاندان نہیں چل سکتا۔

میں نے کہا عقل کی کھوٹی یہ نہیں سوچتیں یہ سب غلہ گھر ہی سے تو آتا ہے وہ مفت میں تمہارے یہاں روٹی نہیں توڑتا۔ یقین کرو کہ یہ کہنا تھا کہ جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

اچھا میں عقل کی کھوٹی ہوں اور آپ بڑے عقل مند ہیں۔ بی اے کیا پاس کر لیا اپنے کو افلاطون سمجھنے لگے میرے چاروں بھائی ایم اے پاس دو بہنیں بی ایڈ ہیں۔

میں نے کہا اور آپ کیا ہیں۔ منہ نہ کھلوائیے میں سب کچھ جانتا ہوں، دو مرتبہ ہائی اسکول میں فیل ہوئیں، تین سال سے انٹر میں لڑھک رہی ہیں۔ بیٹی کا یہ حال دیکھ کر ماں باپ نے پیچھا چھڑانے کے لئے

پیسے کے بل بوتے شادی کر دی، چلی ہیں باتیں بنانے۔ یہیں تک کہہ پائے تھے کہ جھاڑی کے پیچھے سے آواز آئی خوب دل کھول کر برائی کریئے۔ اب ان دونوں دوستوں نے چونک کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ دونوں بیویاں جھاڑی کے پیچھے بیٹھی ہیں جو اس باغ میں ہو گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہیں اور کیا کریں

جو صاحب اپنی بیوی کی اس وقت برائی کر رہے تھے ان کی تو جیسی سٹی گم ہو گئی تھی کہ ان کے منہ سے تو کچھ نکل ہی نہیں رہا تھا۔ دوسرے صاحب بولے آپ لوگ خوب آئیں ہم لوگ اپنے ایک دوست سے چار آدمیوں کے لئے سینما کا پاس لے آئے ہیں راستے میں ذرا ٹھنڈی ہوا کھانے کے لئے پارک میں بیٹھ گئے۔ اچھا اب چلئے کھانا کھا کر سینما جانے کی تیاری کی جائے۔

بیویوں نے کہا نہ ہم سینما جائیں گے نہ گھر جائیں گے" تو پھر آپ کہاں جائیے گا" دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا ہم دریا میں جائیں گے اور یہ کہکر دونوں دریا کی طرف بڑھیں ان کا بڑھنا تھا کہ دونوں قدموں پر گر پڑے اور کہا خدا کے لیے معاف کر دیجئے۔

بیویوں نے کہا صرف ایک شرط سے معاف کیا جائے گا کہ سامنے شہید بابا کے مزار پر آپ لوگ وعدہ کریں کہ جو کچھ کہنا ہو گا منہ پر کہیں گے۔ پیٹھ پیچھے برائی نہیں کریں گے۔ دونوں نے ایک ساتھ نعرہ لگایا شرط منظور معافی دیجئے۔

بزم حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی یا انتقال سے متعلق ہو۔ خبر کم سے کم الفاظ میں صاف صاف لکھی جائے اور نمبر خریداری و پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ کے ساتھ روانہ کی جائے جو خبریں ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ خبر کی اشاعت میں کسی بھی غلطی کی ذمہ داری دفتر پر عائد نہ ہوگی، البتہ اطلاع ملنے پر اس کی تصحیح شائع کردی جائے گی۔

ولادت اطفال کی خبریں

• نسرین فاطمہ (کانپور) میری آپا نشاط فاطمہ اور دولہا بھائی سہیل اقبال صاحب کو اللہ پاک نے ۲ ستمبر بروز جمعرات ۸ بجکر ۵۴ منٹ پر پہلی بار ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

• جہاں آرا روحی (نرگیشوری) میرے ماموں فضل الحق صاحب ایڈووکیٹ اور مامی کریم النسا کو اللہ پاک نے ۵ اکتوبر بوقت ۲ بجے شب ایک دختر عطا فرمائی۔ نام زینب جہاں قرار پایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

• عرفت افضل۔ این (انباوڑی) میرے بھائی این محمد شکیل صاحب اور بھابی نازنین تبسم صاحبہ کو اللہ پاک نے ۱۷ ستمبر بروز جمعہ بوقت سوا پانچ بجے صبح ایک فرزند عطا فرمایا نام ذیشان رکھا گیا۔ اللہ پاک عمر طویل دے اور فخر خاندان بنائے۔

پیغامات نشاط

محترم مقبول احمد انصاری صاحب کی صاحبزادی تبسم ناز انصاری سلمہا کی شادی رضی الدین زبیر سلمہٗ (فرزند ایس۔ ایم نظام الدین صاحب) یوسف پلنہ۔ غازی پور) کے ہمراہ ۱۰ اکتوبر بروز اتوار بوقت ۱۱ بجے دن بمقام اقبال منزل، لکھنؤ بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔ محترم مقبول انصاری صاحب اور محترمہ بیگم صاحبہ انصاری صاحب نے اس سلسلہ میں اعزہ و اقرا کے ساتھ ہی صدہا معزز حضرات اور خواتین شہر کو بھی ایک شاندار لنچ دیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک دولہا دلہن کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

(نسیم انہونوی۔ غزالہ بیگم نسیم انہونوی)

ہمارے دوست اور کرمفرما مرحوم ڈاکٹر عبدالمنان خان صاحب دست راست، جناب ڈاکٹر زیدی صاحب مرحوم کی صاحبزادی نزہت سلمہا کی شادی، اعجاز احمد سلمہٗ (پسر جناب اے مجید خان صاحب فیض آباد) کے ساتھ ۹ اکتوبر بوقت ۸ بجے شب، ڈاکٹر خاں صاحب کی کوٹھی بالمرہ نشاط گنج۔ لکھنؤ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ بیحد مسرت ہوئی۔ قدرت کے بھی کیا کیا کارخانے ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر خاں صاحب کو سب سے زیادہ فکر اپنی علالت کے زمانہ میں یہی تھی کہ ان کی لڑکیوں کی شادیاں ہو جائیں، لیکن یہ خوشی وہ خود نہ دیکھ سکے آج مرحوم زندہ ہوتے تو شاید ان کی صحت بہتر ہو جاتی۔ بہرحال مشیت ایزدی میں کسے دخل ہے۔ جب وہ چاہتا ہے، تب ہی ہر کام انجام پاتا ہے۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ نزہت اور اعجاز ہمیشہ شاد و خرم رہیں۔ میری یہ بھی دعا ہے کہ اللہ پاک دوسری صاحبزادی کی بھی شادی جلد کرادے۔ نسیم انہونوی

• سید خاکسار احمد ہاشمی (پسر برادر زادہ رئیس فاطمی صاحب) کی شادی کے سلسلہ میں جو ہمراہ خدیجہ بیگم سلمہا (بنت۔ نیاز احمد بیگ آر۔ ٹی۔ او۔ لکھنؤ) انجام پائی۔ ۹ اکتوبر کو تاشیر کلا کینڈ ہال لکھنؤ میں سید وصی احمد ہاشمی کا اور سید ولی احمد ہاشمی صاحب کی جانب سے ایک شاندار دعوت ولیمہ دی گئی، جس میں معززین شہر نے شرکت کی اللہ مبارک کرے۔ (نسیم انہونوی)

• نرگس فرحانہ (آرہ) میری آپی عشرت جہاں صاحبہ دختر پروفیسر انیس (امام صاحب) کی شادی سمیع احمد صاحب انجینیر فرزند جناب صدیق احمد (سعودی عربیہ) کے ساتھ ۲۴ مارچ کو بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں کو ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• مس شگفتہ کرن (راشماؤہی) میرے چچازاد ماموں محمد حبیب احمد صاحب ایل۔ ٹی (فرزند جناب عبدالرؤف، پیش امام) کی شادی رضوانہ پروین دختر حافظ محمد غیاث الدین صاحب نور الحسن مرحوم کے ہمراہ ۱۰ اکتوبر کو بھوٹی مسجد، آنبور میں بخیر و خوبی انجام پائی۔

اللہ پاک انھیں ہمیشہ شاد و خرم رکھے۔

• شاہدہ تبسم، صبیحہ تبسم، نسرین دلشاد، اور فرحین نشاط (لکھی پور، بنگلور) ہمارے ماموں زاد بھائی عبدالمالک آزاد، ابن جناب حفیظ الرحمٰن عرف اکمل (بزرگی۔ آمبور) کی شادی نور جہاں (دختر عبدالقدوس صاحب مرحوم) کے ساتھ ۵ ستمبر ۸۲ء بروز اتوار بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• حفیظہ مہ ناز، مہ وش، طاہرہ دختران قمر لطیف صاحب (آمبور) ہماری سنتی منور سلطانہ (دختر چچا عبدالجلیل صاحب) کی شادی اور یا اکبر بادشاہ (پسر دریا کلام صاحب (رش و ندیم) کے ساتھ ۸ راگست ۸۲ء کو بمقام آمبور انجام پائی۔ اللہ دونوں کو ہمیشہ شاد آباد رکھے۔

• نگار سلطانہ جلیلی (آمبور) میرے بھیا چچا احمد بادشاہ (پسر چچا عبدالجلیل صاحب (آمبور) کی شادی مس ثمینہ بیگم عرف نادرہ بیگم (دختر این۔ ایس۔ ابراہیم صاحب۔ یاسین رامیشورم) کے ساتھ ۹ راگست ۸۲ء کو بمقام یاسین بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ پاک دونوں کو ہمیشہ خیر و شکر رکھے۔

• طفیل احمد صدیقی صاحب ایڈوکیٹ (ریٹائرڈ جوڈیشیل مجسٹریٹ۔ لکھنؤ۔) کی دختر نیک اختر عزیزی انجم فاطمہ سلمہا کی شادی ڈاکٹر محمد اعزاز علی سلمہ (فرزند محمد رفیق علی صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ) کے ساتھ ۹ راکتوبر ۸۲ء بروز سنیچر بوقت ۱۲ بجے دن بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

(نسیم انہونوی)

• نیاض حسین جعفری صاحب کی دختر ذکیہ شان جعفری سلمہا کی شادی سید تصور حسین کاظمی سلمہ (فرزند سید تنویر حسین کاظمی) کے ساتھ ۱۳ راکتوبر ۸۲ء کو ۸ بجے شب میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے (نسیم انہونوی)

• مہ ناز فریدی (مراد آباد) میری ماموں زاد بہن شاہانہ بیگم (دختر نیک اختر اصغر محبوب حسن صاحب) کی شادی انور آفاق (فرزند جناب آفاق احمد) بمقام مراد آباد ۱۱ راکتوبر ۸۲ء بروز پیر بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• خسرو تاجہ نازلی (پرنام بٹ) میری سہیلی ساجدہ پروین کی شادی امان اللہ صاحب کے ساتھ ۱۱ راکتوبر ۸۲ء بروز پیر بمقام پرنام بٹ بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

انتقال پر ملال کی خبریں

• یہ خبر بڑے ہی افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ سید مسعود الحسن صاحب ریٹائرڈ آئی اے ایس اپنے اعزہ سے ملنے کراچی تشریف لے گئے تھے، وہیں اچانک انتقال فرما گئے۔ مرحوم کی ایک صاحبزادی حمیدہ سلطانہ میرے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر شمس الحسن کے صاحبزادے عزیزی وحید الحسن سلمہ لکچرر یونیورسٹی سے منسوب ہیں۔ مسعود صاحب اپنی اس بیٹی کو بہت زیادہ چاہتے تھے۔ اسی کی وجہ سے وہ لکھنؤ سے باہر نہیں جاتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ آخری سانس لکھنؤ ہی میں نکلے اور یہیں تدفین ہو۔ لیکن مشیت کو ایسا منظور نہ تھا۔ اور وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کے تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (نسیم انہونوی)

• مسز کلیمہ قادر (بخاری) بڑے افسوس کے ساتھ لکھ رہی ہوں کہ میرے چوتھے بہنوئی حاجی محمد سجاد الدین صاحب ۲۶ ر ۲۷ راگست کی درمیانی شب میں دو بجے انتقال فرما گئے۔ مرحوم بڑے ملنسار اور نیک انسان تھے۔ خداوند کریم انھیں جنت نصیب کرے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ مرحوم نے اپنی یادگار ایک بیوہ، ایک بیٹی اور چھ بیٹے چھوڑے ہیں۔

• ایم اقبال تبسم، بی شہناز پروین اور بی نازنین کے ماموں، اور بی زینب، بی ترنم بانو اور بی نسرین کے بھائی، جناب بی ایم نثار اللہ صاحب ۲۳ ستمبر ۸۲ء بروز جمعرات بوقت شام اچانک انتقال فرما گئے۔ تجہیز و تکفین ۲۴ ستمبر کو بنگلور ہی میں ہوئی۔ مرحوم بڑے ہمدرد، عزیز اور نیک انسان تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔ مرحوم نے ایک بیٹا اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اللہ پاک انھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔

• بیگم سید خلیل اللہ حسینی صاحب۔ آپ کی مرسلہ خبر مکمل نہیں تفصیل سے لکھیں۔ آپ نے اپنا نمبر خریداری بھی نہیں دیا۔

• یہ خبر میں نے ایک مقامی اخبار میں بڑے دکھ کے ساتھ پڑھی کہ بمبئی کے ۷۰ سالہ صحافی جناب عبدالحمید بہت، ڈائرکٹر ماہنامہ صبح امید بمبئی انتقال فرما گئے۔ مرحوم بمبئی کے سیاسی اور سماجی حلقہ میں غیر معمولی مقبولیت رکھتے تھے۔ ہمارا اشتراک سے متعلق بڑے شاندار خاص نمبر صبح امید کے شائع کئے تھے۔ میرے بھی مرحوم سے ذاتی تعلقات تھے۔ جب بھی میں بمبئی جاتا تھا مرحوم سے ضرور ملتا تھا۔ بڑے خلیق، ملنسار اور ہمدرد عزیز انسان تھے۔ اللہ مغفرت کرے اور مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ بمبئی کی اردو صحافت کو بہت صاحب کے انتقال سے جو نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی مشکل ہی سے ہو سکے گی۔

(نسیم انہونوی)

• حریم کی قدیم سرپرست بہن شمس النسا محسن صاحبہ (مہلا تا کھینی۔ مدراس) نے تار کے ذریعہ اطلاع دی ہے کہ ان کے بھائی عرفان صاحب ۱۲ اکتوبر بروز بیجز بوقت شام انتقال فرما گئے۔ اللہ مغفرت کرے اور مرحوم کے تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (نسیم انہونوی)

• (امروز جہاں (آگرہ) افسوس میری پھوپھی قریشہ بیگم صاحبہ (پٹنہ) ۱۸ اگست ۶۲ء کی شب، ایک ماہ کی مسلسل علالت کے بعد انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ کی عمر ۰ ۷ سال کی تھی ان کے انتقال سے سارے خاندان میں غم و الم کے بادل چھا گئے۔ دعا ہے کہ اللہ ان کی مغفرت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

• ۹؍ ستمبر کو نینی تال میں ایک المناک حادثہ ہوا، جس کی تفصیل بہن نجیب فاطمہ صاحبہ نے لکھی ہے۔ سینٹ میری اور آور لیڈی آف فاطمہ اسکولوں کے ۱۱۳ بچے پکنک منانے کے لئے گئے تھے۔ یہ بچے ایک بجے رات تک واپس نہیں آئے تو والدین کو فکر ہوئی اور وہ اسکولوں میں گئے۔ پتہ چلا کہ ننگل ڈیم کے قریب گوبند ساگر میں بوٹنگ کے دوران بوٹ ڈوب گئی۔ جو بچے تیرنا جانتے تھے انھوں نے بہت سے بچوں کو بچایا۔ ایک ملاح نے آسٹھ بچوں کو پکڑ کر نکالا۔ دوسری مرتبہ میں پھر آٹھ بچوں کو نکال لایا۔ لیکن تیسری مرتبہ وہ خود ڈوب گیا۔

۱۱۳ بچوں میں سے ۲۲ بچے لاپتہ ہیں۔ بقیہ کو زندہ بچا لیا گیا۔ لیکن اس عرصہ میں والدین پر کیا بیتی۔ یہ سمجھنا دشوار نہیں۔ ایک صاحب کے دو ہی بچے تھے دونوں ڈوب گئے، ایک صاحب کو پچاس سال کی عمر میں اللہ نے ایک بچہ دیا تھا، وہ بھی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

نجیب فاطمہ صاحبہ کا بچہ بھی سینٹ میری اسکول میں پڑھتا تھا لیکن انھوں نے بچے کو پکنک کے لئے نہیں بھیجا۔ اپنے اس فیصلہ پر وہ کتنا خوش ہوں گی انہیں کا دل جانتا ہوگا۔ بہرحال جو بچے اس حادثہ میں ڈوب گئے، ان کے والدین سے ہمیں دلی ہمدردی ہے۔ نسیم انہونوی)

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت ہر ماہ حریم کی سالانہ خریدار بہنوں کا مرسلہ ایک ایسا شعر شائع کیا جاتا ہے جو ہمارے مقررہ عنوان کے تحت ہو۔ موزوں اور معیاری ہو۔ ساتھ ہی نمبر خریداری کے ساتھ اس طرح روانہ کیا گیا ہو کہ ۲۰ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جائے۔ دسمبر کے لئے مقررہ عنوان ہے "زلف" اور جنوری کے لئے "اجل"۔

آپ ہی اپنے تغافل پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو ندامت ہوگی

مرسلہ: مس روبینہ شمسی (آگرہ)

مرے احباب میرا حال کہہ دیتے ہیں کیوں جا کر
میں ان سے مل کے ہوتا ہوں خجل انکی ندامت پر

مرسلہ: قرۃ العین (نندیال)

آ ہی گئے وہ عرض ندامت کو اے شکیل
لعلیں لبوں پہ خندۂ گریاں لئے ہوئے

مرسلہ: کشور سلطانہ ( )

اس دل پہ خدا کی رحمت ہو، جس دل کی یہ حالت ہوتی ہے
اک بار خطا ہو جاتی ہے، سو بار ندامت ہوتی ہے

مرسلہ: عصمت آرا (بالنگا)

دل رہے آلودہ دامن اور ہم دیکھا کریں
آج اے اشک ندامت آ، تجھے دریا کریں

مرسلہ: راحت (منگرول)

مجھے رحمتوں سے شکایت نہیں
گنہگار ہوں کچھ ندامت نہیں

مرسلہ: مسرت واحد (پانی پت)

کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد بھی
ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد

مرسلہ: حسن بانو (محمود آباد)

"نوشی۔ میں ٹیلی گرام دے کے ابھی آتا ہوں:" وہ بگولے کی طرح باہر بھاگ گیا۔ نوشینہ نے قبلہ رخ ہو کر دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔

بعض دعائیں وہ قبول ہوتی ہیں۔ جن کی قسمت میں مقبولیت لکھی ہوتی ہے۔ ہر دعا باب اجابت تک نہیں پہونچتی۔ نوشینہ کی دعا بھی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

پھر اس نے غضنفر کو عجیب باولا سا دیکھا۔ چہرہ وحشتوں اور ہیبت کی جولان گاہ جسم لرزہ براندام۔ حواس گم۔

"بیٹے بھیا": نوشینہ نے تادیبی لہجے میں انہیں مخاطب کیا

"نوشی": وہ بیقرار ہو کر رونے لگے: "کچھ ہو رہا ہے اسے۔ میرا دل اس انداز سے کبھی نہیں دھڑکا تھا۔ نوشی۔ وہ مجھے یاد کر رہی ہے۔ اس کے پاس کون ہوگا بہن۔ اس کی بے تاب نظریں میری منتظر ہوں گی۔ میں نے اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اسے طرح طرح کے امتحانوں میں مبتلا کر دیا۔ نوشی۔ میں نے محبت کے نام پر اسے موت دی ہے:" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔ نوشینہ نے اس کا سر سینے سے لگا لیا: پھر وہ بھی ضبط نہ کر سکی!

گھر بھر میں ادھم مچا ہوا تھا۔ بڑی پرمسرت چہل پہل تھی۔ امی اپنی ساری رعب دار شخصیت سمیت نو عمر لڑکی کی طرح ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں۔ آج ان کی دیرینہ تمنا بار آور ہوئی تھی۔ خوشی کے مارے ان کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔ انہیں آرزو تھی کہ بہو آئیں ایک طرف چولہا سنبھال کے کھلائے وہ پوری گرہستی اس کے سپرد کر دیں۔ تھوڑا مارے پھر بچوں کی یکے بعد دیگرے پیدائش اور خانہ داری کے چکر نے انہیں روز سے ناز کا رکھا ہی نہیں تھا

(باقی آئندہ)

"ان سے بات کرنے کے بعد جو نتیجہ نکلے گا۔ وہ مجھے معلوم ہے:"

"آپ نے اس بے چاری سے بس نکاح کر ہی لیا۔ ارے۔ اسے کسی بہانے سے گھر میں لاتے۔ اس کی بپتا سن کر امی کچھ نہ کچھ انتظام اس کا کر ہی دیتیں تب آپ کو امی کی پرسش کا خوف نہیں معلوم ہوا؟"

"جو ہوا سو ہوا۔ نوشینہ۔ تم مجھے کسی طرح سیما سے بچاؤ:"

امی میری کیا سنیں گی! اور بلا کسی وجہ کے شادی کیوں رکے گی؟"

"پھر اب میں کیا کروں؟"

"کیا آپ کو کہکشاں سے بہت محبت ہے؟"

"مجھے صرف ہمدردی تھی اور رحم کے جذبے تھے۔ اب اس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھتے ہوئے محبت ہو گئی ہے:"

"خوبصورت بھی ہیں؟"

"جو تمہاری جیسی حسین بہن کو دیکھتا ہو۔ وہ کسی اور کی خوبصورتی سے متاثر نہیں ہو سکتا:" غضنفر نے کہا۔

"توبہ توبہ۔ کوئی بہن کے متعلق بھی بھلا ایسا کہتا ہے؟" نوشینہ گلابی ہو گئی۔

غضنفر ہنسنے لگے: "کیا کسی کتاب میں لکھا ہے کہ بہن کی خوبصورتی کی تعریف کرنا گناہ کبیرہ میں داخل ہے:"

"سنیئے:" نوشینہ دفعتاً بولی "کہکشاں کو پتہ ہے کہ آپ کی شادی ہونے والی ہے۔"

"نہیں۔ میں نے کبھی نہیں کہا۔ اس کا دل ٹوٹ جاتا:"

"اور سید محترمہ کو معلوم ہوگا تو وہ تو ادھم چوٹ دیں گی"
خدا اس عذاب سے مجھے نجات دے۔!"
بڑے بھیا۔ میں کہکشاں سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ بہانے بنانے میں اکسپرٹ ہیں۔ کوئی بہانہ کر دیجیے اور مجھے لے چلیے"
فلم ہی کا ایک چلتا ہوا بہانہ ہے" غضنفر بولے۔
"جی نہیں۔ فلم نہیں" نوشینہ نے جلدی سے کہا "فلم کے نام پر تو یہاں سبھی لپٹ لگنے والے ہیں۔ کچھ اور کہیے!"
کریم الدین صاحب کی والدہ محترمہ کی عیادت۔؟؟" وہ مسکرائے
نوشینہ کو ہنسی آگئی "کیا سچ مچ کوئی کریم الدین صاحب ہیں؟"
زبردستی انھیں پیدا کرنا پڑا!"
"یہی جھوٹ بکا آپ نے؟" نوشینہ نے مارے حیرت کے اپنے گال دونوں ہاتھوں میں دبا لیے۔
"کیا کرتا" غضنفر نے بے بسی سے کہا "اچانک جس طرح تمھارے والدین مجھ پر آن پڑے، کیا وہ موقع بوکھلا جانے اور جھوٹ بولنے کا نہیں تھا۔ اُف نوہ نوشینہ، ناخلف والدین بھی اولاد کے لیے بڑی مصیبت بن جاتے ہیں۔ آخر انھیں کیونکر ٹھیک کیا جائے"
"چپ رہیے" نوشینہ کو ہنسی آگئی۔
"سیخ کے کباب اور شیرمال کہاں ہیں؟"
"[illegible] کہاں کی۔ آپ کے خیال سے انگلی بھر کا کباب جس نے بچا رکھا تھا۔ وہ گرم کیے لاتی ہوں۔ ساتھ میں دستی پراٹھے"

پریشان مت ہو۔
اور اکیلے میں زار زار روتے۔ کہاں تک اور کب تک بے خبر لڑکی کو دھوکا دیا [illegible] گا؟ کہاں ہے ملازمت؟ یہاں تو منگنی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ وہ اس بیٹھی ہوگی۔ ملازمت ملے گی۔ گھر بار ہوگا اور وہ دونوں اپنے بچے سمیت ہنسی خوشی اپنے گھر میں رہیں گے۔ شاید تب تک غضنفر اپنے والدین کو ہموار کر پائیں
امیدیں جلاتی ہیں۔ امیدیں مارتی ہیں۔
شادی کا دن آ پہنچا۔ اس روز شور و غل زیادہ تھا!
دس بجے دن کو غضنفر نے اکیلے میں نوشینہ کو بلایا۔ اور دروازہ بند کر کے بولے"
"نوشی۔ مجھے پاگل ہونے سے بچاؤ۔ اُف!"
اب کیا ہوا بڑے بھیا" نوشینہ گھبرا گئی۔ غضنفر نے جیب سے تار نکال کر دکھایا۔ لکھا تھا "کیس بگڑ گیا ہے۔ فوراً آؤ"
نوشینہ کانپنے لگی "اس کا کیا مطلب ہے۔؟"
غضنفر کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ کانپتے ہوئے بیٹھے بیٹھے [illegible] پہلے لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ڈلیوری ایب نارمل ہوگی۔ شاید۔ وہ چل بسے اس کی زندگی۔ میرے خدا۔ اور۔ اور۔ بیچارہ بچہ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں؟"
"اسے آج ہی کے دن یہ بھی ہونا تھا۔ آپ کیسے جا سکتے ہیں بڑے بھیا۔ اماں جان نہ جانے دیں گی۔ بڑی بدنامی آ جائے گی۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں بھابی کی کیا حالت ہے۔!"

گئے اُنہیں پتا تھا کہ ایک دن بجلی کو ہوش لے۔ جس کہا کہ یہ کفن دیے دیتی چلی اب صورت دکھانا۔ مرادھلے۔ تڑپتے، بدتمیز باجی کہیں کا۔

بچے اُدھر اُدھر سے جھپٹے اور بوکھلا بوکھلا کر کپڑے پھینٹنے لگے۔ بیلہ چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ غضنفر نے ناخوشگوار لہجے میں کہا: "آپ نے کیا نیا ست اٹھائی ہے جیسے بیاہ۔"

اور غضنفر کا یہ حال کہ جیسے انھیں سانپ ہی سونگھ گیا۔ سانس رک گئی حلق بند ہو گئی۔!

رات کو ابا جان آئے انھوں نے بھی جھگڑا زبردست کھڑا کر دیا۔
امی صاف روٹھ گئیں۔

غضنفر کی بے چارگی۔ انھیں ہاتھ پاؤں پڑ کے اپنی ماں کو منانا پڑا ماں دونوں کی حالت مجرموں کی سی تھی جیسے کے درمیان۔ روح آوارہ ذہن غیر حاضر۔ لیکن اس وقت ملتا جب وہ کلثوم کو لمبے لمبے خط لکھتے۔ وہ ادھر کے خط بھی دو ایک دن آڑ کر کے آتے ہی تھے۔ انہی میں کلثوم بھی اپنے خط کا پرزہ رکھ دیتی۔ آپ بہت یاد آتے ہیں۔ آس پاس ایسی آہٹیں گونجتی ہیں جیسے آپ چل پھر رہے ہوں۔ نہ مجھے دن کو سکون ہے نہ راتوں کو آرام۔ کیا آپ میرے پاس نہیں آئیں گے۔ عجیب سی وحشت مجھے ہے۔ دو تین دن پہلے دادر بھائی کی امی یہیں تھیں ہو مرنے لگی تھیں۔ وہاں کی ڈاکٹرنے بھی مسز ہاتھر کی طرح کہا کہ بڑا کیس ہے مشکل ہو گی۔ میرے ہاتھ پاؤں سے جان نکل رہی ہے۔ نجانے کیا ہوگا کاش آپ سامنے ہوتے۔ کب آئیے گا!

اور جواب میں غضنفر لکھتے کہ ملازمت کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔ جلدی آؤں گا

امی کہہ رہی تھیں۔ آپ کو فاقے کرائیں گی۔!" نوشینہ اٹھتی ہوئی بولی "وہ آپ سے بہت خفا ہیں۔ ابا جان سے کہہ رہی تھیں کہ آپ کی دور تک کریں۔ سبھے۔!"

"یہ دونوں دوستوں اور سہیلیوں کی غلط صحبت میں بالکل چوپٹ ہو گئے ہیں" غضنفر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

نوشینہ جھنجھناتی ہوئی چلی گئی۔ غضنفر اس کے بچے کے پائنتی لیٹ گئے اور اس کے نرم نرم گلابی گلابی پاؤں اپنی آنکھوں پر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

جب وعدہ دوسرے دن غضنفر کی خالہ جان آدھمکیں!۔ غضنفر کی امی نے بہن کا خاصا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ سمدھن کا ناطہ تو تھا بڑی بہن کی حیثیت بھی تھی!۔ اسی روز انھوں نے اپنے میاں کو دوکان بھی جانے نہ دیا۔

رسمی سی علیک سلیک کے بعد سنجیدہ باتیں شروع ہوئیں۔ ماں کو رہ رہ کر اپنی اولاد پر غصہ آ رہا تھا۔ گھر پر غضنفر تو خیر ہمیشہ کی طرح موجود نہیں تھے ستم یہ تھا کہ نوشینہ بھی ان کے ساتھ شو پنگ کرنے چلی گئی تھی۔ امی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر لڑکی کو چیکے ہی میاں کے ساتھ شوپنگ کی کیوں سوجھتی تھی۔ اپنے میاں کے ساتھ کیوں سیر سپاٹے نہیں کر لیتی۔ مگر وہ بڑی پیاری دلاری بیٹی تھی اور بے حد کم سنی میں بیاہی گئی تھی۔ اور بقول امی کے اس کا کوئی

ارمان کیسے میں نکلواز تھا لہٰذا اب نوشینہ جو کچھ کرتی وہ سب اس کا حق تھا۔

اس روز وہ ناشتہ کے بعد یاسر اور عامر کو نبیلہ کے حوالے کر کے غضنفر
کے ساتھ تو کہکشاں سے ملنے نکل گئی تھی۔

غضنفر چپ چاپ رہے تھے "کیا دیکھو گی کیا کرو گی ان کے۔ بےچاری
کا حال زبوں ہے۔ تمہاری ہی دی ہوئی ساڑی پہنے ہوگی غریب"۔

"بڑے بھیا آپ کی ایسی ہی باتوں سے غصہ آتا ہے"۔ نوشینہ بگڑ گئی"
اب جو کچھ بھی وہ ہیں آپ سے وابستہ ہیں۔ میں انھیں ملکہ وکٹوریہ سمجھ کر
ملنے نہیں جا رہی"۔

"دادی اماں ملکہ وکٹوریہ کہتی تھیں"۔ غضنفر ہنسے۔ مگر وہ بھنائی ہوئی
گال پھلائے بیٹھی رہی۔

سب سے پہلے گھر پر دادا ملے۔ اور نوشینہ کو دیکھ کر بے حد حیرت
ظاہر کی۔ اور دعا سلام کے بعد تعجب سے پوچھا۔

"تم کیسے بھول پڑیں ادھر"؟

"راستے میں بڑے بھیا نے بتایا کہ میرے بھتیجہ ہوا ہے۔ مبارکباد دینے
آئی ہوں"۔ نوشینہ ہنس پڑی "آپ اگر بے مروتی برتیں تو کیا۔ بہن کا دل
پھر بھی بہت نرم ہوتا ہے"۔

"تو پھر آؤ۔ سب مل کے کوئی اچھا سا نام سوچیں"۔ دادا نے اوپری دل
سے کہا اور دل میں ہزار ہزار گالیاں کوستے غضنفر کو دینے لگے۔ سارے
کام یہ گدھا ایسے ہی اوٹ پٹانگ کرتا ہے۔

"دادا بھائی۔ ایک ذرا صبر کیجیے۔ میں لڑکے لڑکیوں کے ناموں کی ایک

بہت خوش مزاج تھے مصیبتوں میں بھی ہنستا مسکرانا ان کا شعار رہتا۔ لیکن
اب اتنے مغموم اور افسردہ رہتے کہ جیسے ہنسی ہمیشہ کے لیے ان کی طرف سے منہ موڑ
چکی ہو۔!

ایک روز گھر میں مہابھارت ٹھن گئی۔ امی نے ان کی مسلسل اداسی کی تاب
نہ لاکر وجہ دریافت کی تھی۔ جواب میں غضنفر نے کہا تھا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں۔ کیا کروں میں۔ چھوٹے بچوں کی طرح ناچوں کودوں؟
یہ شادی ہے یا حبس دوام۔ آپ نے مجھے اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہ ہونے
دیا۔ میری ذمہ داریاں بڑھیں گی۔ انھیں کون پورا کرے گا۔ شادی شادی
کوئی پسند کی ہو۔ تب کوئی بات تھی"۔

غصے کے مارے انھیں زبان پر قابو نہ رہا۔ بے ربط بکے گئے۔ اور اس جواب
نے امی کو بھی آؤٹ آف آرڈر کر دیا "سال بھر سے گھر میں شادی شادی
کا پکار رچ رہا تھا۔ تبھی کیوں نہ منہ سے پھوٹ دیے کہ تمھیں شادی کرنی ہی نہیں
ہے۔ کرنی ہے اگر تو اپنی پسند کی۔ اچھی بات ہے۔ ابھی سویرا ہے۔ میں رشتہ
توڑے آتی ہوں۔ کر لو پسند کی۔ مگر خبردار وہ چھل پائی چوٹی صورت حرام میری
چوکھٹ پر قدم نہیں دھر سکتی۔ اور تم تو جاؤ نکلو میرے گھر سے۔ معلوم ہوتا کہ
تم جیسی اولاد نصیب ہوگی جو کلیجے میں ناسور ڈالے گی تو تبھی میں پیٹ کو کھ
میں آگ لگا دیتی"۔ اور پھر وہ زخمی شیرنی کی طرح اپنی جگہ سے اٹھیں تھیں۔
ایک کیا رہ دو ہتھڑ غضنفر کی پیٹھ پر رسید کر کے ان کی الماری کھولی اور تمام قیمتی
ملبوسات نکال کر زمین پر پھینکنے شروع کر دیے۔

"نکل جا میرے گھر سے۔ اپنی پسند کی شادی کرنے اسی لیے تو اپنا خون پلایا تھا

غضنفر کا ایک ساز دادا دھر نوشینہ کی شکل میں کم ہو گیا۔ ادھر کہکشاں کو ساتھ لے کر دادر اپنے گاؤں چلے گئے۔ انھوں نے برملا کہہ دیا تھا کہ غضنفر کی دھوکے کی شادی میں وہ قطعی شرکت نہ کریں گے۔ یہ تین چار ماہ کی چھٹیاں وہ اپنے والدین کے پاس گزار دیں گے۔ اس کے علاوہ تعلیم ختم ہو چکی تھی اب ان لوگوں کو تلاش معاش کی خاطر دوڑ دھوپ کرنی تھی۔ سنہرے دن بے فکری کے شب و روز رخصت ہو چکے۔ اب ذمہ داریاں تھیں کٹھن زندگی کی انجام دہی کا جانگسل احساس تھا۔ لہٰذا سب جہاں کے تہاں ہو چکے تھے۔ کہکشاں جاتے وقت بہت بے ضبط ہو گئی تھی۔ اس کا سیل اشک تھا کہ کسی دلاسے کسی تسلی سے تھمتا ہی نہیں تھا۔ سب کے سامنے اس نے غضنفر کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔ اور پھوٹ پڑی تھی۔ نجانے کون کون سے جگر خراش احساسات اسے ستا رہے تھے پھر دادر کے ساتھ وہ بھی چل دی۔ اس طرح دور اندر دار غضنفر سے اور جدا ہو گئے۔

غضنفر باؤلے دیوانے ہو گئے تھے۔ گھر کے ہنگاموں سے انھیں الرجی تھی چیخیں مارنے کو جی چاہتا۔ مردوں کے قہقہے ہتھوڑے کی ضرب بن کے سر پر لگتے۔ عورتوں کی مترنم ہنسی تیز نشتر بن کر دل میں پیر جاتی۔ ہر وقت منہ لپیٹے اپنے کمرے میں پڑے رہتے۔ کہکشاں کے جانے کے بعد اس کی یاد میں شدت پیدا ہوئی۔ وہ تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر روتے۔ نجانے غیر لوگوں کے درمیان اس کا گزر کیسے ہوتا ہوگا۔ نجانے دادر نے اپنے والدین سے کیا بہانہ کیا ہوگا اور نجانے کہکشاں انھیں کتنا فریبی بزدل اور خود غرض سمجھتی ہوگی!۔

پچھتاؤوں نے ان کی زندہ دلی اور زندگی کا لہو نچوڑنا شروع کر دیا۔ وہ

فہرست بنا لوں پھر۔ آپ جا کے میرے لیے چائے بنا لیجئے میں تب تک بھائی صاحب قبلہ کی اہلیہ محترمہ سے تعارف حاصل کر آؤں :

ابے گدھوں کے جدا مجد: دادر نے غضنفر بر داشت پیسے: یہ کیا کیا اب تو تو نے چھلنی میں پانی ڈال دیا ہے :

جی نہیں۔ میں نہیں ہوں ایسی چھلنی : نوشینہ نے برا مانا :
میں اکیلی بھیا کی راز دار ہوں۔ منہ بند کر رکھا ہے۔ ورنہ اب تک قوال کی بوٹیاں اُڑ چکی ہوتیں: پھر وہ غضنفر سے مخاطب ہوئی :
ہاں جی لے چلیے مجھے ادھر۔ جلد ہی واپس بھی جانا ہے :

چائے پیتی ہوئی جانا۔ بنا رکھوں گا : دادر نے کہا۔ ایک ٹھنڈی سانس لی اور غضنفر پر ترحم انگیز نظر ڈال کر اندر چلے گئے۔

چلو۔ غضنفر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

قدرے طویل برآمدہ عبور کر کے وہ دوسری طرف آئے۔ ہمیشہ کی طرح کہکشاں گم صم سی ملی۔ اس نے غضنفر کے ساتھ ایک خوبصورت پیاری سی لڑکی کو دیکھ کر کسی تحیر کا اظہار نہیں کیا۔ جیسے وہ غضنفر کی مرضی پر پوری طرح قانع ہو چکی تھی!۔

مم۔ میری چھوٹی بہن: غضنفر نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہکشاں سے کہا: اسما نوشینہ ۔ اور یہ بیگ کہکشاں :

دونوں نے سلام کیے اور پھر وہاں خاموشی چھا گئی۔

میں۔ دادر کے پاس بیٹھتا ہوں۔ یہ کہہ کر غضنفر چلے گئے۔

بیٹھئے اسما بہن: کہکشاں نے کہا۔ اور پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔

نوشینہ نے بیٹھتے ہوئے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اور نچلا لب دانتوں میں دبا لیا۔ اس کمرے میں وہ سب چیزیں دکھائی دیں۔ جو امی ابی کے گھر سے دی تھیں تو گتا چوری ہو گئی تھیں۔ جب خاموشی ناگوار ہونے لگی تو نوشینہ بولی۔

"بڑا سناٹا ہے یہاں۔ تنہائی میں آپ کا دل کیسے لگتا ہے؟"

وہ ہولے سے مسکرائی۔ اور مستفسرانہ انداز میں نوشینہ کو دیکھتی ہوئی بولی: "کبھی انھوں نے آپ کا تذکرہ نہیں کیا۔ اور شاید۔ میرے بارے میں ان کے خاندان والوں کو کچھ معلوم بھی نہیں ہے۔ پھر آپ؟"

"مجھے بھیا ایسے ہی بدھو ہیں" نوشینہ بولی "انھیں آپ کا تعارف ہم سب سے کروانا چاہئے تھا۔ لیکن۔ مجھے بھیا اور میں بچپن کے رازدار ہیں۔ ان کی کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔! یہ تو میں ہی آج زبردستی کر کے آپ سے ملنے آئی ہوں"

"اچھا!" ایک ہلکی مسکراہٹ کہکشاں کے لبوں پر ابھری "آپ سے مل کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ لیکن مجھ سے مل کے آپ نجانے اپنے دل میں کیا سوچتی ہوں گی۔ آپ سے انھوں نے کہا ہو گا کہ میں خوامخواہ ان کی بے فکر زندگی میں چلی آئی ہوں"

"نہیں بھابی۔" بے اختیار نوشینہ کے لبوں سے نکل گیا "وہ تو آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کی بہت ہی تعریفیں کرتے ہیں۔"

"سچ؟ کیا آپ مجھے بھابی کہتی ہیں۔"

"رشتہ تو یہی ہے" نوشینہ بھی مسکرائی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

"پتہ نہیں پہلے کیا اوٹ پٹانگ چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی دھند سی چھائی ہے۔ اس دھند میں سے اچانک امی نکل کے آتی ہیں۔ پھر ایک طرف سے ابا آتے ہیں۔ زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ بس ادھر ادھر پھرتے ہیں اور پھر فضا میں بلند ہونے لگتے ہیں"

"لاحول ولا قوۃ" غضنفر نے کہا "یہ سب پریشان خیالی ہے۔"

"سنا ہے کہ مرنے والوں کو اس کے مرحوم لوگ خواب میں دکھائی دیتے ہیں مجھے تو بہت خوف محسوس ہوتا ہے" کہکشاں بولی "اگر میں مر گئی تو میرے بچے کا کیا انجام ہو گا؟"

"ارے کیسی بدشگونی کی باتیں کر رہی ہو" غضنفر نے اسے اپنے بازو میں سمیٹ لیا "میں جب بھی پریشان ہوتا ہوں۔ مجھے اپنے مرحوم نانا خواب میں ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ مگر دیکھ لو۔ میں تو ابھی تک نہیں مرا۔ دل مضبوط کرو۔!!"

شادی کی تاریخ مقرر کر کے بیگم صاحبہ نے ہنگامی تیاریاں شروع کر دیں۔ گھر میں بے تحاشہ چہل پہل شروع ہو گئی۔ بچوں کے لباس کی گوٹا کناری کا شور۔ دعوتی رقعوں کی روانگی۔ غرض کہ گھر میں طوفان بے تمیزی بپا تھا۔ نوشینہ شادی سے دو ہفتوں قبل آ جانے کا وعدہ کر کے اپنے گھر جا چکی تھی

زبردستی کا ہے ؛ کہکشاں کا لہجہ اداس تھا ؛ آپ نے ابھی تنہائی اور
سناٹے کا تذکرہ کیا تھا۔ اگر وہ چاہتے تو یہ سناٹا بھی نہ ہوتا یہ روح فرسا
تنہائی بھی نہ ہوتی۔ انھوں نے آپ سب سے مجھے ملانا گوارا نہیں کیا۔ میں
نے انھیں یقین دلایا تھا کہ میں غریب ضرور ہوں۔ مگر میرا تعلق ایک اونچے
سیّد گھرانے سے ہے۔ حالات کبھی حسب نسب پر تو اثرانداز نہیں ہوتے!
بھائی بھی ہمارے بھیا کو بالکل عقل نہیں ہے ورنہ وہ ایسے بے تکے
کام نہ کرتے۔ آپ کو نہیں معلوم۔ گھر میں بھی سب ان کی بدعقلی سے
نالاں ہیں۔ انھیں سارے کام ہم سب کے علم میں لاکے کرنے چاہیے تھے
یہاں میری جان سولی پر رہتی ہے ؛ کہکشاں نے کہا۔ آپ سے ان
کی کیا شکایت کروں یہ کچھ اچھا بھی نہیں لگتا۔ مگر کیا بتاؤں۔ میں
اکیلی رہتے رہتے بیمار ہوتی جا رہی ہوں۔ رات کبھی آپ کے بھائی نے
یہاں کوئی رات نہیں گزاری۔ میں ساری رات جاگا کرتی ہوں۔ ادھر
کے حصے میں داور بھائی رہتے ہیں۔ ان پر مجھے پورا بھروسہ ہے لیکن
وہ بھی آدمی ہی ہیں۔ یقین کیجیے کہ جب راتوں کو ان کے چلنے پھرنے کی
آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ میرا دم نکل جاتا ہے ؛
بھیا نے آپ کو کیسے جنجال میں ڈالا ہے ؛ نوشینہ ماتھے پر ہاتھ مار
کر بولی ؛ اچھا میں ان سے کہوں گی۔
نہیں نہیں۔ ان سے کچھ نہ کہیے ؛ کہکشاں نے خوف کے مارے نوشینہ
کا ہاتھ پکڑ لیا ؛ وہ بہت اچھے ہیں۔ انھوں نے مجھے اپنا لیا میری زندگی
خرید لی ہے۔ مجھے پناہ دی ہے۔ نہ جانے دنیا کا ادنیٰ شخص عورت اور

ہوا کہ صورت سے نفرت ہو گئی ہے ؛
مطلب یہ تھا داور کہ کسی طرح اس بے چاری کو تو دیکھو بھی پھر۔"
غضنفر نے جواب دیا اور کراہ کراہ کر اپنے بال برابر کرنے لگے۔
داور بھائی۔ نوشینہ نے دفعتاً ہانک لگائی ؛ ہمارے حصے کی
چائے تو ٹھنڈی نہیں ہو گئی۔ ادھر بھجوا دیجیے نا!"
بلاوہ ہے۔ پہیلی ہے۔ داور چیخے ؛ ادھر ہی آ رہا ہوں۔ چائے ابھی
بھجواتا ہوں ؛
نوشینہ ہنستی ہوئی آ کے بیٹھ گئی۔ داور کا اشارہ پا کر غضنفر اٹھ
کے چلے گئے! شاید نوشینہ کو یہاں تک چھوڑنے کے لیے کہکشاں صحن
میں آ گئی تھی۔ غضنفر کو دیکھ کر شرمائی اور جلدی سے کچن کی دہلیز پر بیٹھ
گئی۔ غضنفر بھی اس کے پہلو میں آ بیٹھے۔
آپ کی بہن بہت اچھی ہیں ؛ کہکشاں بولی۔
ان کے بھائی کے بارے میں کیا رائے ہے؟" غضنفر نے پوچھا۔
وہ بھی اتنا اچھا ہے کہ اس پر تن من سب نچھاور کر دیا ؛ کہکشاں
نے جواب دیا۔ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے بہلانے کے بعد غضنفر نے ڈرتے ڈرتے
داور کی تجویز اس کے سامنے رکھی۔ انھیں توقع تھی کہ کہکشاں بپھر اٹھے گی
لیکن اس نے اطمینان کی سانس لی اور بولی ؛ میں بھی چاہتی تھی کہ اس
ماحول سے نجات پا جائے۔ یہاں میں بہت ڈرتی رہتی تھی آپ کو پتہ
نہیں۔ میں مسلسل تین چار راتوں سے بس ایک ہی خواب دیکھ رہی ہوں
اب وہ دماغ میں چپک کے رہ گیا ہے ؛

ابرو تو چاہئی ہے انھوں نے:

"آپ کا کوئی اور عزیز کہیں نہیں ہے بھابی؟"

"بہت سے ہیں۔ مگر کہاں ہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم"

ان میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ نوشینہ پہلی ہی ملاقات میں اس کی گرویدہ ہو گئی۔ اسے کہکشاں کی حالت پر ترس آ رہا تھا جیسے کپکپی تھی جسم پھولا ہوا کہ اسے دو قدم چلنا دوبھر تھا۔ بات کرتے رہ رہ کر سانس پھولتی تھی۔ بکھرے بال۔ چہرہ اداس، میلے کچیلے کپڑے۔ اسے غضنفر پر بے تحاشا غصہ آنے لگا۔

اور ادھر غضنفر کی شکل دیکھتے ہی دادر نے آڑے ہاتھوں لیا۔

"صاحبزادے۔ کل راستے میں تمہارا چھوٹا بھائی جعفر ملا تھا خوب سنا رہا تھا کہ تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ بکار اعظم تم نے یہ بات مجھ سے چھپائی۔ خیر جو بھی بلا سے۔ مگر پھر اس بے چاری کا کیا کرو گے؟ تمہارے عیش تو گھر ہی پر پورے ہو جائیں گے؟"

"عیش" غضنفر نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "اگر یہ عیش ہے تو خدا دشمن کو بھی اس سے محفوظ رکھے۔ اور۔ اللہ کی قسم۔ فکر کے مارے میں کئی راتوں سے سو نہیں سکا ہوں۔ میرا زور کسی پر نہیں چلتا۔ ادھر والدین لٹھ لیے پیچھے پڑے ہیں ادھر یہ مصیبت گلے پڑی ہے۔ اب میں کیا کروں؟"

"یہی تو معقول علاج ہے شرافت کیا کر" دادر نے کہا "دو منگی سالے دغاباز۔ دل میں اللہ دیکھ رہے ہوں گے۔ ایک بیوی کا دل بہلانے کے

لیے گھر کے اندر۔ دوسری عیاشی اور ہوس پرستی کے لیے گھر کے باہر۔ تمہارے دونوں میٹھے۔ اور باتیں بنانے چلے ہو کر خودکشی کر لوں گا۔ تو پھر کر دو خودکشی لیٹ جاؤ فرش پر۔ میں ہی گلے پر چھری پھیرے دیتا ہوں"

دفعتاً غضنفر کے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو دادر سنجیدہ ہو گئے۔

"مجھے اس طرح ملامت نہ کرو۔ دادر۔ کیا میں نے سارے حالات تمہارے سامنے رکھ نہیں دیے۔ مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں" پھر انھوں نے جابر سخت گیر والدہ کے مظالم اور اپنی بزدلی پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

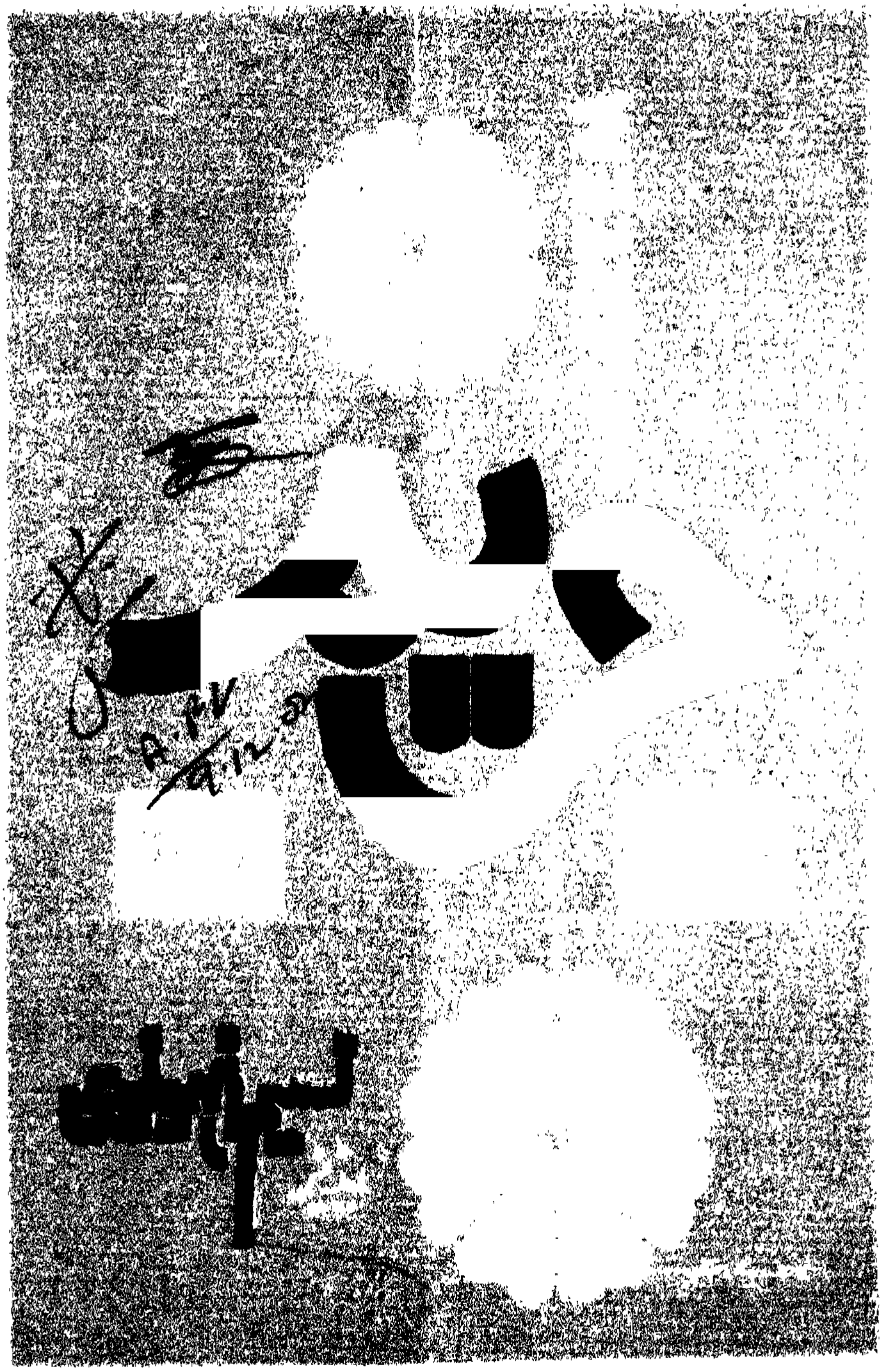
"تو پھر مجھے اجازت دو کہ میں کہکشاں کو لے کر عادل آباد چلا جاؤں اسے چھوڑ دوں اس کی خالہ کے پاس" دادر نے کہا۔

"وہ وطن جانا نہیں چاہتی" غضنفر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں جا رہا ہوں اپنے گاؤں۔ آخر مجھے اپنے بن بلائے صاحبزادے کو بھی تو دیکھنا ہے۔ تم اگر کہو تو میں کہکشاں کو اپنے ساتھ کریم نگر لے جاؤں میری والدہ تمہاری والدہ کی سی چنگیز نہیں ہیں۔ معاف کرنا۔ وہ بڑی خوشی سے ایک بے سہارا لڑکی کو پناہ دیں گی۔ میں تین چار روز میں نکل جاؤں گا۔"

"اگر وہ پسند کرے تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں" غضنفر نے کہا

دادر نے غصے کے مارے ان کے بال مٹھی میں جکڑے اور پیٹھ پر ایک گھونسہ رسید کیا "بس ہمیشہ چھچھوڑے ہو جوا بنے رہو۔ تمہاری مرضی اور رائے کوئی چیز نہیں۔ اماں جو کچھ کہیں گی وہ کرو گے۔ بیوی کی جو مرضی ہوگی اس پر سر جھکا دو گے تمہارے منہ سے تو دودھ ٹپک رہا ہے۔ قسم کھا کے کہتا



گذشتہ ۵۲ سال سے مشرقی خواتین کی رہنمائی کرنے والا ہندوستان میں اردو کا

لکھنؤ سب سے پرانا رسالہ

ماہنامہ

حریم

بیادگار

سیّد محمد سلیم انہونوی مرحوم

و

بیگم سلیم انہونوی مرحوم

ایڈیٹر و نگراں

نسیم انہونوی

معاون

شوکت جہاں بیگم غزالہ

و

جانی بیگم رودولوی

قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ چالیس پیسے
قیمت سالانہ منی آرڈر سے ۲۲/- روپیہ
قیمت مخصوص ۲۵/- روپیہ
قیمت اعزازی ۲۰/- روپیہ
وی پی سے منگوانے پر چار روپیہ پچاس پیسے زائد
غیر ممالک سے ۶۵/- روپیہ
یا اس کے بقدر غیر ملکی سکہ بزائے سی میل۔ ایرمیل سے مختلف ممالک کے لئے مختلف شرحیں۔

ناشر ...... فہیم انہونوی

جلد (۵۲) | فہرست مضامین ماہ دسمبر سنہ ۸۲ء | نمبر (۱۲)

آفس کا پتہ: نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ لکھنؤ۔ فون آفس: ۴۵۵۴۴ رہائش [illegible]

فہیم انہونوی پرنٹر و پبلشر نے نامی پریس لکھنؤ میں چھپواکر دفتر حریم سے شائع کیا۔

لمعات

ایک حریمی بھانجی نے نام و پتہ لکھے بغیر بڑے ہی مہذب پیرایے میں ایک خط مجھے لکھا ہے۔

محترم ماموں جان۔ آداب

حریم میرے گھر میں میری پیدائش سے بھی پہلے سے آرہا ہے۔ معافی چاہتی ہوں کہ مجھے آپ کے حریم کی پالیسی پسند نہیں۔ افسانے اور مسلسل ناول تو میں شوق سے پڑھتی ہوں، لیکن لمعات پڑھنا نہیں چاہتی، شاید امی کو یہ احساس بھی ہوگیا ہے کہ میں لمعات پڑھنا نہیں چاہتی، اس لئے وہ اب یہ کرتی ہیں کہ جب حریم آتا ہے تو لمعات مجھ سے پڑھوا کر سنتی ہیں۔

میں پردہ بھی کرتی ہوں، لیکن امی اور ابو کے مارے باندھے، دل سے میں پردے کی قائل نہیں ہوں اور میں ہی کیا، میں دیکھتی ہوں کہ روز بروز خواتین پردہ شکنی کرتی جارہی ہیں۔ لیکن آپ ہیں کہ وہی پردے کا راگ الاپے جارہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی اس یکی راگنی سے پردہ قائم رہ سکے گا۔ خدا کے لئے اپنا خیال بدلیئے۔ ہم عورتوں کی ترقی میں روڑا نہ اٹکایئے۔ ہوش میں آیئے۔ (ف۔ ج۔ ب)

یہ خیالات صرف تمہارے ہی نہیں، تمہاری ہم عمر لاکھوں لڑکیوں کا بھی یہی خیال ہے اور میں اس سے واقف ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ سیلاب یہ طوفان اب اس وقت تک رکنے نہ رکے گا جب تک کہ حالات رسوم اور رواج کی تباہی جیسے نہ ہوجائیں۔ پچھلے دور کے ان ترقی یافتہ مقامات کی لرزہ خیز تباہی کی داستانیں تاریخ کے صفحات میں درج ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ ان کی تباہی کا عورت کی آزادی سے کیا تعلق تھا۔ مجھے یقین کامل ہے کہ حریم کے لمعات آزادی کے طوفان میں ایک تنکے سے زائد حقیقت نہیں رکھتے۔

لیکن میں کیا کروں۔ میری حالت اس شخص کی سی ہے، جس کے گھر میں آگ لگ گئی ہو۔ سارا مکان شعلوں کی لپیٹ میں آگیا ہو اور وہ انتہائی اور بے قراری کے ساتھ بالٹیوں میں پانی بھر بھر کر اس آگ کو بجھانے کی ناکام کوشش کر رہا ہو، جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ وہ شخص خاموش ہوکر بیٹھ جائے گا۔ میرے خیال سے جب تک اس کے ہاتھ میں بالٹی ہوگی اور پانی مل رہا ہوگا وہ اپنی کوشش آگ بجھانے کے لئے جاری رکھے گا۔

کیا تم کو معلوم نہیں کہ ڈاکٹر سمجھ لیتے ہیں کہ مریض میں اب کچھ رہ نہیں گیا۔ چند سانسوں ہی تک اس کی زندگی رہ گئی ہے۔ لیکن وہ انجکشن دیئے جاتا ہے۔ مریض کا ہارٹ فیل ہوجاتا ہے۔ نبض کی حرارت بند ہوجاتی ہے، لیکن ڈاکٹر مریض کے سینے پر گھونسے مارتا رہتا ہے کہ شاید دل میں حرکت پھر پیدا ہوجائے۔

کینسر کے سلسلے میں کون نہیں جانتا کہ یہ پیغام موت ہوتا ہے۔ خود ڈاکٹر بھی سمجھتے ہیں، لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بڑے بڑے اسپتال کھلے ہوئے ہیں اور مریضوں کو ہر طرح کے ٹریٹمنٹ سے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیا کہیں ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کینسر ہوجائے اور اس کے اعزہ و اقربا اس کا علاج یہ سوچ کر چھوڑ دیں کہ اس کو تو کینسر ہے کیا فائدہ علاج کرنے سے۔ آخر تو مر ہی جائے گا۔

یہ سب کیا ہے۔ کیوں ہے۔ تم بھی سوچو۔ مجھے پردہ عزیز ہے۔ میں اسے مسلم خواتین کے لئے ضروری سمجھتا ہوں میرا یقین ہے کہ بے پردگی جو اکثر آزادروی کا سبب بنتی ہے اسلامی اصول و ضابطہ حیات کے منافی ہے اس لئے میں جانتے ہوئے بھی کہ میری یہ جدوجہد تباہی کی بے راہ روی کو نہ روک سکے گی، جو بھیانک آگ کی طرح مسلم سماج میں بھی لگ چکی ہے اور کینسر سے کم خطرناک اور لاعلاج نہیں۔ لیکن اس حقیقت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی اسی طرح جدوجہد کر رہا ہوں، جیسے اوپر کی مثالوں میں بیان کیا ہے۔

مشعلِ ہدایت

نائب صدر جمہوریہ ہند جناب محمد ہدایت اللہ نے جو اس وقت صدر ذیل سنگھ کی علالت اور اس سلسلہ میں ان کے سفر امریکہ کے باعث قائم مقام صدر بھی ہیں، ایک اسکول کی سالانہ تقریب میں تقریر کرتے ہوئے ملک میں بڑھتے ہوئے جرائم پر تشویش ظاہر کی اور اس کا علاج یہ تجویز کیا کہ شاہراہ عام پر کوڑے لگائے جانے کی جیسے متمدن حلقوں نے وحشیانہ سمجھ کر ترک کر رکھا ہے پھر بحال ہو جائے تو پرائی عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور ان کی بے حرمتی، چور بازاری اور غذائی اشیاء میں ملاوٹ وغیرہ کے جرائم میں نمایاں کمی ہو سکتی ہے اور اگر کسی لڑکی پر دست درازی کرنے یا فقرے کسنے والے لڑکے کو اس لڑکی کے یا اس کے کالج کے سامنے یہ سزا دی جائے تو آئندہ کوئی لڑکا اس طرح لڑکیوں کو چھیڑنے کی جسارت نہیں کر سکے گا۔

تازیانہ کی سزا بعض جرائم کے سلسلہ میں اسلام نے رکھی ہے اور متعدد اسلامی ملکوں میں ان اسلامی تعزیرات پر عمل بھی ہوتا ہے۔ اور ایسے ملکوں میں جرائم کا تناسب نام نہاد مہذب و متمدن ممالک کے مقابلہ میں کہیں کم ہے۔ ہندوستان، مشرقی ملکوں میں اپنی اخلاقی قدروں کے لئے ماضی میں نیک نام تھا افسوس ہے کہ آزاد ہندوستان میں طرح طرح کے جرائم میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور ساری قدیم اخلاقی قدریں تیزی سے مٹتی جا رہی ہیں۔

ہدایت اللہ صاحب اس سے قبل ہندوستان کے چیف جسٹس بھی رہ چکے ہیں۔ عقل اور تجربہ کی روشنی میں انھوں نے اسلام کی سزائے تازیانہ کی وکالت فرمائی ہے لیکن ملک کے موجودہ ماحول میں اس کا امکان بہت کم نظر آتا ہے کہ اس مشعلِ ہدایت سے جرائم کی تاریکی کو دور کرنے میں کچھ مدد ملے۔ بشکریہ صدق جدید لکھنؤ

طلبا کی بدامنی کا سبب بے روزگاری

جسٹس کھنا کی الہ آباد میں تقریر

الہ آباد ۔ [illegible] سپریم کورٹ کے سابق جج جسٹس ایچ آر کھنا نے کہا کہ طلبا کی بدامنی کا خاص سبب بے روزگاری ہے کیوں کہ طالب علموں کو تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملازمت نہیں ملتی۔

مسٹر کھنا نے کہا کہ جب طالب علم یونیورسٹی کی تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں تو ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بے روزگار افراد کی تعداد میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی یونین کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ بڑھتی ہوئی بے روزگاری سے طلبا تخریب پسندی کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اور سیاسی پارٹیاں ان کا استحصال کر رہی ہیں۔

یونین کے صدر مسٹر راکیش دت ترپاٹھی نے جلسہ کی صدارت کی۔

ملّی ہمدردی رکھنے والی بہنوں سے درخواست

لکھنؤ میں ایک "آنہ فنڈ" نام کا ایک دینی ادارہ پچاس سال سے بھی زائد عرصہ سے قائم ہے۔ ابتدا میں اس نے لکھنؤ کی خستہ حال اور ویران مساجد کی مرمت اور بحالی کا کام شروع کیا تھا اس کے بعد دینی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا۔ رفتہ رفتہ تعلیمی سرگرمی بڑھی۔ لڑکوں کے ساتھ ہی لڑکیوں کے لئے بھی دینی اور دنیوی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا، جو برابر ترقی کر رہا ہے لیکن ابھی تک اسکول کے لئے ذاتی عمارت تعمیر نہیں ہو سکی۔ زمین حاصل کر لی گئی ہے اور محترمہ بیگم صاحبہ مقبول احمد لاری صاحب نے ایک گرانقدر عطیہ بھی دیا ہے لیکن ابھی کافی روپیہ کی ضرورت ہے تعمیر بیحد گراں ہو گئی ہے۔ اس دور میں کسی عمارت کا بنوانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ بہت سے صاحب خیر حضرات نے بھی اس کار خیر میں حصہ لینے کے لئے عطیات دئے ہیں۔ حال ہی میں مسٹر قاسم اے حق باندرہ بمبئی نے پانچسو روپیہ اسی مقصد کے لئے آنہ فنڈ کو عنایت فرمایا ہے لیکن ابھی کافی روپیہ کی ضرورت ہے۔

حریمی بہنوں میں بھی بفضلہ تعالےٰ بہت سی صاحبِ حیثیت اور مخیر بہنیں ہیں اس لئے میں درخواست کروں گا کہ وہ بھی اس تعمیری کام میں حصہ لے کر میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشیں۔

روپیہ۔ کراس چیک یا بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر سے آنریری جنرل سکریٹری EX [illegible] آنہ فنڈ بیرونی خندق لکھنؤ [illegible] کے نام روانہ فرمائیں۔

حضرت عمرؓ

(کا دورِ خلافت تاریخ اسلام کا روشن باب ہے)

سید فضل الرحمٰن جعفری

خلافت راشدہ اسلام کا بڑا مثالی اور تابناک دور تھا ــــ حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ دوئم کی حیثیت سے دس سال تک مسند خلافت پر متمکن رہے۔ یہ دور تاریخ اسلام کا بڑا درخشاں باب ہے۔ اس عرصہ میں حضرت فاروق اعظمؓ کی مومنانہ فراست اور عرفان شریعت نے بڑے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔ اس عہد میں ایران و روم کی پُر شوکت سلطنتیں زیر نگیں آئیں اور شہنشاہیت کا جنازہ نکالا گیا۔ اور اسلام کا پھریرا عرب کے ریگزاروں سے نکل کر عجم کے مرغزاروں تک پہنچا۔ پھر وہاں سے نکل کر شمالی افریقہ تک پھیل گیا۔ دنیا اس بات پر حیران ہے کہ یہ معجزانہ کارنامہ کس طرح انجام دیا گیا۔ اور یہ واقعی تاریخ عالم کا بڑا انوکھا واقعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں کر ممکن ہوا۔ ان فتوحات میں کون سے عوامل کار فرما تھے۔ کونسا ذہن کام کر رہا تھا۔ اور حکمت و فراست کا کونسا پیمانہ تھا جو استعمال کیا گیا تھا۔ یہ حضرت عمرؓ کے جلال و دبدبہ کا کرشمہ تھا یا ان کی دینی بصیرت اور اصابت فکر کا نتیجہ تھا؟

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایران فتح کیا روم کو زیر نگیں بنایا۔ لیکن آپ کی دینی فراست کا یہ عالم تھا کہ کسی مرحلے پر بھی آپ نے احکام الٰہی سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ اسلام کا حکم ہے کہ خون ناحق کبھی نہ بہایا جائے اور تاریخ شاہد ہے کہ پوری فتوحات میں خون ناحق کی کوئی بوند گری نہیں دکھائی دیتی۔ اسلام کا حکم تھا کہ لہلہاتی کھیتیاں، شاداب اور بار آور درخت مرجھانے بھی نہ پائیں، اور واقعی حضرت عمرؓ نے اس حکم کی پوری تعمیل کی۔ اسلام کا حکم ہے کہ بوڑھے، بچے اور عورتیں مسلمانوں کی تلوار سے محفوظ رہیں۔ ان کی عزت و ناموس مجروح نہ ہونے پائے ان کی پوری حفاظت کی جائے اور دنیا نے دیکھا کہ اسلامی لشکر کے کسی سپاہی نے بھی اس حکم سے انحراف نہیں کیا۔

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں جہاں اسلامی لشکر کے قدم پہنچے محبت اخوت کا پیغام بھی پہنچا۔ اللہ کی وحدانیت اور اسلام کی حقانیت کا اعلان بھی پہنچا۔ وہاں عدل و انصاف کی برکتیں بھی پہنچیں۔ اس سرزمین پر محبت و مروت اور لطف و کرم کی کہکشاں بچھی اور وہاں سے ظلم و جفا کی تاریکیاں رخصت ہوئیں اسلام پہنچا تو اخلاق، عدل کی روح پرور روشنی بھی پہنچی۔ اخلاق ایسا کہ لوگ مسلمانوں کے گرویدہ ہونے لگے اور ان کے رفیق و دمساز بن گئے مسلمانوں نے ان کے جسم نہیں خریدے۔ انھوں نے ملک پر قبضہ نہیں کیا۔ بلکہ انھوں نے ان کے قلوب مسخر کئے۔ اس حکیمانہ طرز عمل کا یہ نتیجہ تھا کہ وہی لوگ اسلام کی آغوش میں داخل ہونے لگے اور وہی اپنے ملک کے حکمراں کہلائے۔

حضرت عمر فاروقؓ کی پوری زندگی میں جو نمایاں وصف اپنے پوری توانائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ ملتا ہے۔ وہ آپ کا عادلانہ نظام ہے۔ اس نظام میں قرآن و سنت کی روح سموئی گئی تھی۔ یہ نظام اسلام کے فکر و مزاج کا بڑا عکس رنگین تھا۔ اور اس نظام نے اسلام کو ابد تک کے لئے ناقابل تنسیخ منشور عطا کیا۔

اسلام کا نظام مشاورتی ہے اور حضرت فاروقؓ نے اسی بنیاد پر خلافت اسلامیہ کی داغ بیل ڈالی۔ یہ ایسا نظام ہے جس میں ریاست کے اہم مسائل اہل الرائے صحابہ کے مشوروں سے انجام پاتے تھے۔ خاص صورتوں میں عامۂ مسلمین سے بھی مشورت کی جاتی تھی۔

حضرت عمرؓ نے صاف یہ اعلان کر دیا تھا کہ میری حیثیت ایک متولی کی ہے۔ روزمرہ کے مسائل کے لئے آپ نے ایک مجلس شوریٰ مقرر کی تھی۔ جس کے ممتاز ارکان میں حضرت علیؓ حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف، حضرت معاذ بن جبل ــــ حضرت ابی بن کعبؓ حضرت زید بن ثابت شامل تھے۔ اس مجلس شوریٰ کے علاوہ ممتاز مہاجرین و انصار کی بھی ایک مجلس تھی اور ہر مسلمان کو پوری بے خوفی سے شکایت کرنے کا حق حاصل تھا۔

حضرت عمرؓ نے عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے کے لئے یہ طریقہ بھی اختیار کیا تھا کہ تمام عمال کو حج کے موقع پر مکے میں حاضر ہونے کا حکم دیا تھا۔ اور ان کی موجودگی میں عام اعلان کیا جاتا تھا کہ جس شخص کو کوئی شکایت ہو تو وہ بلا خوف و خطر پیش کرے۔ چنانچہ لوگ اپنی شکایتیں پیش کرتے تھے اور حضرت عمرؓ اسی وقت ان کا تدارک کرتے تھے اگر کوئی عامل بلا وجہ کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی کا مرتکب ثابت ہوتا تو اسے مجمع عام میں سزا دی جاتی تھی۔ چنانچہ عیاضؓ بن غنم عامل مصر کو بیش قیمت لباس کا استعمال کرنے اور شاندار محل تعمیر کرانے پر کمل کا کرتا پہنوا کر بکریاں چروائیں۔ پھر اس حقیقت کو بھی اکتشاف

چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص عامل کوفہ نے ایسا محل بنوایا جس میں ڈیوڑھی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ڈیوڑھی میں آگ لگانے کا حکم دیا۔ حضرت عمرؓ نے قضا یعنی عدالت کا ایک مستقل محکمہ قائم کیا اور تمام اضلاع میں عدالتیں قائم کیں۔ اور ایک فرمان کے ذریعہ قضا کے اصول و آئین بتلائے۔ فرمان یہ تھا:۔

اما بعد۔ قضا ایک ضروری فرض ہے۔ لوگوں کو اپنے حضور میں، اپنی مجلس میں، اپنے انصاف میں برابر رکھو، تاکہ کمزور انصاف سے مایوس نہ ہو اور [illegible] آدمی کو رعایت کی امید نہ پیدا ہو۔ جو شخص دعویٰ کرے۔ اس پر بار ثبوت ہے اور جو شخص انکار کرے اس پر قسم ہے۔ صلح جائز ہے۔ مگر وہ صلح جس سے حرام حلال، اور حلال، حرام نہ ہونے پائے۔ غور کے بعد اگر حق اس کے خلاف نظر آئے تو اس سے رجوع کر سکتے ہو۔ جس مسئلہ میں شبہ ہو اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر بار بار غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں پر غور کرو۔ ان پر قیاس کرو جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لئے ایک میعاد مقرر کر دو۔ اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق دلاؤ۔ ورنہ مقدمہ اس کے خلاف فیصلہ کرو ـــــــ ان اشخاص کے سوا جنھیں سزا میں درے لگائے گئے ہوں یا جھوٹی گواہی دی ہو۔ یا ولاء اور وراثت میں مشکوک ہوں۔ سب مسلمان ثقہ ہیں۔

پھر حضرت عمر فاروقؓ نے قضاۃ کو بھی خاص ہدایات دیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے۔

"مقدمات میں اول تو قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو اگر قرآن میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث کی جانب رجوع کرو اگر اس میں بھی نہ ہو تو اجماع سے ورنہ اجتہاد سے کام لو۔"

قضا کی خدمت بڑی اہم تھی اس لئے حضرت عمرؓ قضاۃ کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے اور ایسے ہی افراد کا انتخاب کرتے تھے جن میں علم فقہ، ذہانت، اور قوت فیصلہ کی صفات موجود ہوتی تھیں چنانچہ آپ نے مدینے میں حضرت زید بن ثابت کو قاضی مقرر کیا۔ اور کوفے میں عبد اللہ بن مسعودؓ اور قاضی شریح کو قضات سپرد کی۔ حضرت عمرؓ نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ دولت مند اور معزز شخص کے علاوہ معمولی آدمی قاضی نہیں بن سکتا اس کی وجہ یہ بتلائی کہ دولت مند رشوت کی طرف مائل نہ ہوگا اور معزز شخص فیصلے میں کسی کے رعب و دبدبہ سے متاثر نہ ہوگا آپ خود قضاۃ کو عدل اور مساوات کا درس دینے کے لئے کبھی کبھی خود فریق مقدمہ بن کر عدالت میں پہنچتے تھے۔

ایک بار حضرت ابی بن کعبؓ سے کچھ اختلاف ہوا۔ ابیؓ نے زید بن ثابتؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ جس میں حضرت عمرؓ بحیثیت مدعا علیہ پیش ہوئے۔ زیدؓ نے حضرت عمرؓ کی تعظیم کی آپ نے فرمایا: "زید! یہ تمہارا پہلا ظلم ہے۔" یہ فرما کر اپنے فریق ابی بن کعبؓ کے پاس بیٹھ گئے۔

حضرت عمرؓ کے ایوان عدل میں غریب امیر دوست دشمن کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ اور کوئی بھی قانون کی گرفت سے نہ بچ سکتا تھا۔ حکومت کے عمال کو علانیہ سزا دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ حج کے موقع پر عام مجمع میں لوگوں سے پوچھا کہ اگر انھیں کوئی شکایت ہو تو پیش کریں ایک شخص اٹھا اور عرض کیا کہ فلاں عامل نے مجھے بلا وجہ سو کوڑے لگائے ہیں۔ فرمایا۔ "اٹھو بدلا لو" عمر بن العاصؓ بھی موجود تھے۔ انھیں برسر عام عمال کی ذلت گوارا نہ ہوئی اور حضرت عمرؓ سے یہ عرض کیا کہ:۔

اے امیر المؤمنین! اس طرز عمل سے عمال میں بددلی پیدا ہوگی، فرمایا: "میں ایسا ضرور کروں گا!" اور مستغیث سے کہا کہ "تم اپنا کام کرو" آخر حضرت عمر بن العاصؓ نے مستغیث کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ دو سو دینار لے کر اپنا دعویٰ واپس لے۔

حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف کی مثالیں بکثرت ہیں۔ آپ نے "عدل" کا سچا تصور پیش کیا۔ اور کسی موقع پر رعایت نہیں کی۔ ابو شحمہ آپ کے فرزند تھے شراب نوشی کے جرم میں اسے آپ نے اسی کوڑے مارے وہ چند دن میں انتقال کر گئے۔ قدامہ بن مظعونؓ معزز صحابی تھے آپ کے سالے بھی تھے۔ وہ بھی شراب نوشی کے مرتکب ہوئے اور ان کی پیٹھ پر بھی کوڑے لگوائے گئے۔

غرض حضرت عمر فاروقؓ نے جو "نظام عدل" قائم کیا وہ ایک مثالی نظام ہے اور قابل عمل اور یہی نظام معاشرے کی اصلاح کا کارگر ذریعہ ہے۔

• کسی ماہ حریم ۔ہر تاریخ تک نہ ملے تو دفتر کو اطلاع دیں۔ اگر ہر تاریخ تک آپ نے اطلاع نہ کی تو دوسرا پرچہ قیمتاً روانہ کیا جائے گا۔

غسیلِ ملائکہ

الحاج برق آشیانوی

نوجوان بے حد پریشان تھا کہ کیا کرے۔ عرب کی کوئی لڑکی اس سے شادی کرنے کو تیار نہ تھی اور نہ ہی کوئی معمولی سے معمولی حیثیت کا آدمی بھی اپنی لڑکی کو اس سے بیاہنے کے لئے آمادہ تھا۔ کیونکہ وہ اس قدر بدصورت تھا اور اس کا چہرہ اتنا کریہہ المنظر تھا کہ ننھے بچے تو اس کو دیکھ کر ڈر جاتے تھے۔ وہ جوان تھا لیکن ایک طرف وہ نیک خیال، اتنا کہ کسی بے راہ روی کو گوارہ نہ کرتا تھا۔ دوسری طرف فطری تقاضے سے مجبور ہو کر شادی کا خواہش مند تھا۔ آخر اس نے سوچا کہ اپنے آقا کے پاس جائے جس کو وہ دل و جان سے چاہتا تھا اور اس کے ایک اشارہ پر اپنی جان تک قربان کر دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا "حضور میں شادی کرنا چاہتا ہوں آپ کی قلمرو کا کوئی فرد اپنی لڑکی کو میری زوجیت میں دینے پر تیار نہیں اور خود لڑکیاں مجھ سے اتنی نفرت کرتی ہیں کہ کوئی لڑکی میری بیوی بننے کے لئے آمادہ نہیں۔ آقا نے جب اس نوجوان کے چہرہ پر نظر ڈالی تو وہ بھی حیران رہ گئے۔ ایک طرف تو اللہ میاں فرماتے ہیں کہ خلقنا الانسان فی احسن تقویم

یعنی ہم نے انسان کو حسین ترین مخلوق بنا کر پیدا کیا ہے دوسری طرف ایسا انسان تخلیق فرماتے ہیں جس کی بدصورتی اور وحشت ناک صورت کو دیکھ کر بچے تو بچے بڑے بھی خائف ہو جاتے ہیں۔ آقا نے بہت دیر تک غور کیا۔ آخر کاغذ اٹھا کر اس پر لکھا کہ میں تمہارے پاس ایک ایسے نوجوان کو بھیج رہا ہوں جس کی نیکی اور پاکبازی پر فرشتے رشک کریں۔ اگرچہ وہ نہایت بدصورت ہے لیکن میرا حکم ہے کہ اس نوجوان سے اپنی لڑکی بیاہ دو۔" نوجوان خوش ہو گیا کیونکہ پورے ملک عرب میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کی مجال نہ تھی کہ آقا کے حکم کی تعمیل نہ کرتا۔

لوگوں سے پتہ پوچھتے پوچھتے وہ نوجوان اس محلہ میں پہنچ گیا جس میں وہ شخص رہتا تھا جس کو آقا نے اپنا حکم نامہ پہونچانے کے لئے دیا تھا جب کسی نے بتایا کہ سامنے والی شاندار حویلی میں وہ شخص رہتا ہے تو نوجوان کا دل بیٹھ گیا۔ نوجوان نے سوچا ہائے۔ اللہ تعالیٰ نے تو مجھے بدصورت بنا کر پیدا کیا ہی تھا۔ لیکن میرے آقا کو یہ کیا مذاق سوجھا کہ ایک ایسے شخص کے پاس بھیجا جو عرب کا ایک نہایت متمول آدمی ہے اور اتنی شاندار حویلی میں رہتا ہے۔ اس کی لڑکی سے شادی کرنے کو عرب ایسے رئیس زادے بھی تیار ہو جائیں گے جو شکل و صورت کے لحاظ سے بھی نہایت خوبرو ہوں۔ بھلا مجھ جیسے ایک معمولی حیثیت کے آدمی کو وہ شخص لڑکی کیسے دے گا بالخصوص ان حالات میں کہ نہایت بدصورت ہوں اور کوئی اپنی لڑکی مجھے دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ کچھ دیر تو وہ مبہوت بنا سوچتا کھڑا رہا۔ پھر اس خیال سے قدم آگے بڑھا کر چلو آقا کا حکم تو اس کو پہنچا دو۔ ویسے نتیجہ معلوم ہے کہ مایوسی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔" آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے وہ حویلی کے دروازے پر پہنچا تو وہاں دربان نے اُسے روک دیا۔ اور گرجدار آواز میں کہا "ٹھہر جاؤ اور یہ بتاؤ کہ تم کس سے ملنے کے لئے آئے ہو۔" نوجوان نے کہا کہ میں ان صاحب سے ملنے کے لئے آیا ہوں جو اس حویلی میں رہتے ہیں۔"

دربان نے پوچھا —— کیا کام ہے۔

نوجوان نے کہا۔ کام تو خود نہیں بتا سکتا۔ البتہ یہ چٹھی میرے آقا نے دی ہے وہ پہونچا دینے کے لئے آیا ہوں۔"

دربان نے کہا کہاں ہے وہ چٹھی۔ پہلے مجھے دکھاؤ۔" نوجوان نے بلا چوں و چرا وہ چٹھی دربان کے ہاتھ میں تھما دی۔ دربان نے چٹھی دیکھی تو اسے آنکھوں سے لگا لیا اور کہا —— "اب تمہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ کہو تو یہ چٹھی میں مالک کے پاس پہنچا دوں۔"

نوجوان نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا "ضرور پہنچا دو" چنانچہ دربان چٹھی اندر لے گیا تو تھوڑی ہی دیر میں دربان کے پیچھے ایک شخص تیزی کے ساتھ باہر آیا اور تجسس کے ساتھ پوچھا کہاں ہے وہ شخص جو چٹھی لایا ہے" دربان نے نوجوان کی طرف اشارہ کر دیا۔ صاحب خانہ نے جب نوجوان کو دیکھا تو پہلے ٹھٹک کر رہ گیا کیونکہ اس قدر بدصورت اور بدشکل آدمی اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آگے بڑھ کر اس نوجوان کو عزت کے ساتھ لے جا کر برآمدے میں بٹھایا اور اس کے سامنے خود بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس شخص کے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ وہ بار بار چٹھی کو پڑھتا تھا اور جب نوجوان کو دیکھتا تھا تو اس کا چہرہ فق ہوتا جاتا تھا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے

زبان کھولی۔ اور کہا: اے نوجوان۔ جس آقا نے یہ چٹھی لکھی ہے اس پر سے میں اور میرے ماں باپ قربان آقا نے حکم دیا ہے کہ میں اپنی لڑکی کو تمہارے نکاح میں دے دوں اگر آقا کا یہ حکم ہوتا کہ میں اپنی ساری دولت تمہیں دے دوں بلکہ اپنی جان بھی تمہارے واسطے قربان کر دوں تو میں بخوشی آقا کے حکم کی تعمیل کرتا۔ لیکن میں پریشان ہوں کیونکہ آقا نے اس سے پہلے ایک اور حکم جاری فرمایا ہے کہ نکاح کے لئے لڑکی کی رضامندی ضروری ہے۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ جب عرب کا کوئی شخص تمہیں اپنی لڑکی نہیں دے سکتا اور کوئی لڑکی تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی تو میری لڑکی کیسے تم سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو جائے گی؟"

وہ رئیس آدمی اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اندر سے آواز آئی ــــ

"ابا جان یہ آقائے نامدار کے حکم کے ساتھ میرا کیا ذکر ہو رہا ہے۔"

رئیس نے کہا: "بیٹی ذرا پردہ ہٹا کر پہلے باہر آ جاؤ پھر جو پوچھ ہے وہ میں بعد میں کہوں گا۔"

لڑکی نے پردہ ہٹایا تو سامنے ایک نہایت کریہہ المنظر اور بدصورت نوجوان بیٹھا نظر آیا جس کو دیکھ کر اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تب باپ نے کہا ــــ "بیٹی آقائے نامدار کا حکم ہے کہ میں تم کو اس نوجوان کے نکاح میں دے دوں۔"

اتنا سنتے ہی لڑکی غصہ کے مارے سرخ ہو گئی۔ اور سر سے پیر تک تھر تھر کانپتے ہوئے اس نے چلا کر کہا: "ابا جان آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ نے فوراً رضامندی کیوں ظاہر نہیں کی کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی بیٹی سرکار دو عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل سے انکار کر سکتی ہے ــــ سرکار دو عالم نے تو صرف اتنا حکم دیا ہے کہ میں اپنا جسم اس نوجوان کے حوالہ کر دوں اگر حضور یہ حکم دیتے کہ میں جان اس کے حوالہ کر دوں تو میں اپنی جان نوجوان کے قدموں پر نثار کر دیتی۔" یہ سنتے ہی وہب بن امر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اٹھ کر انھوں نے اپنی بیٹی کو سینے سے لگا لیا اور کہا۔ "بیٹی سلمیٰ تو نے آج میری عزت رکھ لی۔ میری آبرو بچا لی۔ اگر تو انکار کر دیتی تو میں دونوں جہاں میں برباد ہو جاتا۔ تو نے مجھے عاقبت کے عذاب سے بچا لیا۔ پھر سعد بن ربیع کی طرف دیکھ کر کہا: نوجوان۔ تمہیں مبارک باد دیتا ہوں کہ اب تمہاری کمزوری

تو جائے گی۔ جاؤ اب شادی کی تیاری کرو ــــ"

سعد بن ربیع خوشی خوشی حویلی سے نکلے اور بازار سے اپنی شادی کے لیے نئے نئے کپڑے خریدے۔ گٹھری سر پر رکھے حویلی کی جانب روانہ ہی ہو رہے تھے کہ اعلان جنگ ہو گیا۔ اُحد کی جنگ چھڑ گئی تھی۔ سعد بن ربیع نے گٹھری کو ایک طرف پھینکا اور سیدھے میدان اُحد کا رُخ کیا اور جنگ میں اپنی بہادری و شجاعت کے جوہر دکھلاتے ہوئے کئی کافروں کو تہ تیغ کرنے کے بعد بالآخر خود بھی شہید ہو گئے ــــ فرشتوں نے انھیں غسل دیا اس لئے ان کا لقب غسیل ملائکہ ہے۔

اللہ اللہ

(امین سلونوی)

دیار رسول انام اللہ اللہ
بہار دو عالم سلام اللہ اللہ
تقدس نظارے مہکتی ہوائیں
مدینے کے ہر صبح و شام اللہ اللہ
ملائک کے پہرے ہیں ہر ہر قدم پر
یہ دربار خیر الانام اللہ اللہ
یہیں کبر و نخوت کے بھی سر جھکے ہیں
یہی ہے یہی وہ مقام اللہ اللہ
طریقت سے واقف شریعت کے پیرو
مدینے کے سب خاص و عام اللہ اللہ
یہ حب محمدؐ کی سرشار باتیں
نہ مینا نہ ساغر نہ جام اللہ اللہ
مجھے خود بخود لوگ کہنے لگے ہیں
امینؔ اور ان کا غلام اللہ اللہ

نانی امّاں

نے مرغی پکائی

عفت موہانی

تم نے سنا کہ بجن کو ابھی حال حال میں یعنے چھ مہینے اُدھر اپنے آفس کے دفتر میں ترقی ہوئی۔ وہ بہت خوش خوش گھر میں آیا تھا اور اپنے باوا سے بولا تھا کہ ابا میں ترقی کرکے اونچی جگہ پے گیا ہوں۔
اس کے باوا منہ کھول کے ابھی خوش ہوہی رہے تھے کہ میں بیحد خوش ہوکے بولی۔

"سچ مچ۔ کیا تو لبس پٹرے کال ٹے ٹُل بنا ہے؟"

ان نے مجھے گھورا: "اماں کیسی ہولوں کی سی بات کرتی ہو۔ کوئی ترقی کرکے اونچی جگہ جاتا ہے کہ نیچی جگہ؟۔ اماں تم تو کچھ اور الّو ہوگئی ہو"

میں لال ہوگئی: "دیکھ لڑائی والی بات مت نکال۔ الّو تو ہوگا تیرا سارا ددھیال ہوگا۔ منہ سنبھال کے بات کر۔ نابکار کہیں کا"

"ددھیال۔؟" "تمہارے نانا لال پیلے ہوگئے: تم میرے لوگوں کو الّو بنا رہی ہو۔؟"

لو اماں پھر تمہاری اور ابا کی لڑائی چالو ہوگئی اور میری بات ادھ بیچ میں اٹک گئی۔ بجن بولا۔

"میں نہیں سننے کی تیری گدھوں کی سی بات۔ اپنے باوا ہی سے بول" میں تڑخ کر بولی اور بشان شہزادی سے اٹھ کر اپنے کمرۂ خاص میں آگئی۔ بجن کی بے تمیزی اور گستاخی پر بے حد ملال ہوتا ہے۔ اللہ صاحب اسے نیکی کی عقل دیویں۔ یہ اپنی عالی قابل اماں کے حضور میں بے دبی (بے ادبی) کرکرکے بالکل جہنم کا کوئلہ بنا جا رہا تھا۔ کوئی نصیحت فضیحت اس بجاگر کے کان میں نہیں جاتی۔ اللہ صاحب بچاویں میں لیٹی لیٹی ابھی افسوس کی ہائے بھر رہی تھی کہ دھڑاک سے دروازہ کھول کر وہ میری صورت مبارک پر نازل ہوگیا۔؟

"پیاری اماں"

"چل دور بے شرم" میں بولی

اب میں کیا بے شرمی کیا ہوں: وہ میرے پاس گھس کے بیٹھ گیا۔ اب میاں تم سے کیا ماجرا بیاں فرماؤں۔ میرا بان کا پلنگ ایک طرف چول میں سے الگ تھا اُسے یونہی اٹکا کے میں بڑی نزاکت سے اس پر آرام فرماتی ہوں۔
اب جو وہ ہاتھی کا ہاتھی موا دھڑام سے پلنگ پر گرا تو ہوا یہ کہ پٹی چول سے نکل گئی۔ اور ہم دونوں تلے اوپر بھداک سے نیچے زمین پر جا پڑے۔ وہ گینڈا میرے اوپر گرا تھا۔ میری تو ہڈی پسلی کا بھومر نکل گیا۔ ہم دونوں پر پلنگ تھا۔

ارے کمینے ذلیل مردے نکلے۔" میں نیچے پڑی پڑی چیخوں۔ بجن کی ہنسی رکنے کا نام نہ لے۔ وہ تو ہوا کہ مطابق اُٹھ کھڑا ہوا مجھے یونہی پڑا چھوڑ دیا۔

"اٹھا نے مجھے" میں چنگھاڑی۔

اماں قسم سے" وہ ہنسی کے بیچ میں بولا "تمہاری ہر بات اوندھی ہے اماں۔ یہ تم نے اتنا کیڑوں بھرا پلنگ کیوں بچھا رکھا ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ زمین ہی پر لیٹ جایا کرو۔!"

تیری زبان میں لوکا لگے۔ جہنم جلے مردے خور" میں بولی اور خود ہی اٹھ گئی۔ وہ تو دور کھڑا رہا تھا کہ میں جوتی لے کر اس پر پل نہ پڑوں۔ پھر میں آنکھوں میں آنسو بھر کے آبدیدہ ہوگئی۔

"کہاں چوٹ لگی ہے اماں تم رو رہی ہو؟"

"تو میرے لئے منحوس منحوس بولیاں منہ سے نکال۔ اور پھر پوچھ کہ کیوں رو رہی ہو اماں۔؟" ڈھل ڈھل میرے آنسو نکل گئے۔

"میں اب تو کچھ نہیں بولا۔" وہ بولا۔

تجھے تو دھیان ہے۔ اماں کسی طرح مریں تو تو انھیں زمین پر بچھونا بچھا کے لٹا دے" میں کھی کھی کرکے دانت نکالے اسی سے ولیس تھرتھر کانپ کے بولی۔

"او۔ اماں۔ مرنے سے اتنا مت ڈرا کرو" وہ ستیا [illegible] کا باپ ہاری تھوڑی اٹھا کے تو میرے سلگن ہوتی ہے۔ بے غیرتی کی بات کرکے اوپر سے بندروں کی طرح دانت بھی چمکائے گا۔

میں اٹھی۔ اس پر اللہ صاحب کی تالت بھیج کر اپنا پلنگ اٹھایا۔ تو یہ مصیبت آئی کہ ادھر سے دوسری پٹی بھی الگ ہوکے ہاتھ میں چلی آئی۔ بجن ہنسی کے مارے دوہرا ہوگیا۔ شرمندگی ہوکے کھیانی تو میں بھی ہنسی مگر پٹی اٹھا لے کے اسے مارنے دوڑی۔ وہ دو چھلانگوں میں باہر بھاگا۔ اور پٹی جا کے تمہارے نانا کے کندھے پہ پٹاخ سے لگی جو بھاری

دھاچو کڑی سن کر آ رہے تھے۔ انھوں نے پیٹی چھین کے پھینکی اور کندھا سہلاتے ہوئے بے حد غصّے سے بولے۔

"ہاں ہاں اور نھی منی چھٹ منوا بن جاؤ۔ لونڈے کے ساتھ چھول چھلیا کھیلا۔ مجھے مارا کیوں۔ اب اگر میں بھی دے مار دوں تمہاری کھوپڑی پر ڈنڈا تو۔ سیر سیر بھر کے ٹسوے نہ بہانا۔"

میں ان سے بڑھ کر چنگھاڑی "اپنی مٹی ملی اولیاد کو نہیں بولتے۔ ایک تو اس بھنگی نے مجھے گرا دیا۔ میرا پلنگ توڑ دیا۔ اوپر سے تم جلے پر پانی چھڑکنے آئے ہو۔"

اماں۔ جلے پر تیل کر کے بولتے ہیں!" بنجن دور سے بولا۔

میں فرفر اسے کوسنے بددعائیں دینے لگی۔ کیا کروں لاڈ دلار تو اس موچی پر آتا ہی نہیں۔

ارے بڑی دیر بعد یہ دھوم دھاڑ بند ہوئی تو سب درسانیت سے دالان میں آکے بیٹھے۔ اور قصّۂ چہار درویش۔ نہ توبہ۔ قصہ ترقی کا بنجن کا نکلا۔!

پھر سے اس اوڑ دلاؤ کا منہ پھیلا۔ آنکھیں چمکیں۔ گال لال ہوئے۔

"ہاں اماں۔ میں بڑے صاحب کا اسپشل اسٹنٹ بن گیا ہوں۔ تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے۔ اب میں پندرہ روپئے مہینے کی بجائے بیس روپئے دیا کروں گا۔ اور ــــ!"

نہیں رے" میں پریشان ہو کے بولی "بیس روپئے کا حساب مجھ سے نہیں بیٹھے گا۔ روز کے کئی آنے پڑے۔ پندرہ ہی ٹھیک ہیں۔ مزے میں حساب کر لیا۔ ایک دن کے آٹھ آنے۔"

نجانے میری ماقول بات پر بھی یہ باپ بیٹے کیوں دیوان پن سے ہنستے رہا۔ تمہی بتاؤ۔ بھلا یہ بات کوئی ہنسی کی تھی کہ بڑھے باوا نے بھی مسوڑھے نکال دئے۔ اور بیٹے نے بھی بتیسی دکھادی۔ اسی مارے تو میں جلتی ہوں۔ ایک ایک کو دیکھ کر میں غصے سے کہی۔

"کھوں۔ اب کیا ہوا۔ شیطان نے کہاں گدگدی کی کہ مارے ہنسی ہی نہیں رکتی ـــ!"

اماں میں خوش ہو کے ہنس رہا ہوں" بنجن بولا۔

میں بھی تمہاری بات پر خوش ہی ہو کے ہنس رہا ہوں ـــ" بڈھے میاں نے کہے۔

چلو خیر" میں نے جمائی لی۔

اماں تم تو پوری بات ہی نہیں سنتیں؟" بنجن بولا۔

"سنا۔!" میں اب چار کی طلب میں کچھ کچھ لٹکی پڑ رہی تھی۔

"اماں میرے دوست احباب کہہ رہے ہیں کہ خوشی میں درقی پر اٹھوں اور مرغ مسلّم کی دعوت کرو" بنجن بولا تو میں نے اسے نصیحت کی۔

"نہ بیٹا یوں نہیں بولتے۔؟"

کیا میں پھر کچھ غلط بولا ہوں ـــ" بنجن نے بڑے بھولپن سے پوچھا۔

"بیٹا کھانے پینے کے معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم کا ذکر مذکور نہ کیا کر۔ خدا صاحب نہ کریں۔ فقط ایک مرغی پر ہندو مسلمانوں کا جھگڑا بندھ جائے گا۔ سنا ہے کہ اب تو ہندو لوگ بھی مرغی چوزی کا گوشت کھانے لگے ہیں۔؟"

میں تو بڑی عالمانہ تقریر فرما رہی تھی۔ مگر ان دونوں پر پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ بڑے میاں تو اٹھ کے چلے ہی گئے۔

یہ بنجن خبیث میری صورت دیکھے اور ہنسے۔ میں جب بلبلا کے جوتی اٹھانے کو جھکی تو وہ ہنسی ضبط کر کے بولا۔

اماں۔ میں مرغ مسلّم کہہ رہا ہوں۔ یعنی کہ تم اگر مرغ پکاؤ تو اسکے ٹکڑے مت کرو۔ یونہی اسے دم کر دو مسالہ لگا کر۔ سمجھیں۔؟"

"تو کون سا باورچی ہے کہ تجھے ساری ترکیبیں معلوم ہیں"

وہ منہ کھینچ کے بولا "اماں۔ ایک مرتبہ ہوٹل میں کھایا تھا۔ پلیز۔ اماں۔ وعدہ کرو۔ پکا دو۔ تو پھر میں دوستوں کو دعوت دے دوں۔ آج جمعرات ہے نا۔ اتوار کو میں تم کو صاف کیا ہوا مرغا لا دوں گا۔ تم پکا دینا تو پھر اتوار کی رات کو بس سب کی دعوت کرا دوں۔! بہت نہیں۔ صرف چار دوست ہیں۔"

"اچھا۔ اور ہم بڈھا بڈھی کیا کھائیں گے" میں نے پوچھا

"ابا کو مرغے کی دم دے دینا اور تم اپنے لئے مرغے کی چونچ پکا لینا۔

اماں۔" وہ صورت حرام نے بولا۔

"چل پاجی بدمعاش۔ چونچ تو اتنی کڑی ہوتی ہے۔ گلے گی کیسے!"

میں ذرا شبے میں پڑ گئی۔

"گل کے حلوہ ہو جائے گی اماں" وہ منہ پھیر کے جاتا ہوا بول گیا۔

"تم نے آج تک کبھی پکائی بھی ہے!؟ ـــ"

اچھا بادا ـــ" میں کراہی۔

تین روز آفت کے مارے گزر گئے۔ اب لیو بھیا کو تھوڑا ملا العتبار

بھی آ گیا۔ مارم ماری کا دن تھا۔ نجن بدذات سو سو جا کے ایک صاف صاف مرغا لے آیا۔ میں حق دق رہ گئی۔

"سن رے کمینے اس کے بال وال کہاں ہیں —"

"جلالایا ہوں اماں۔ اب پکا دو بیٹھ کے" اس نے مجھے گھورا۔ "مسالے وسالے ڈال کے عمدہ سا پکانا۔ گوبر کی طرح تھوپ کے نہ رکھ دینا۔ ڈر لگتا ہے تم سے، کیونکہ تمہارے تجربے تو بہت بھیانک ہیں!"

میں ذرا پرمسرت خوشی کے موڈ میں تھی۔ کیونکہ پہلی دفعہ مرغ کی چوں چوں پکا رہی تھی۔ اس لئے اس حرام خور کو اف کر کے جلدی جلدی باورچی خانے میں آئی۔ نجن مرغا ایک لگن میں رکھ گیا تھا جانے کہاں گیا تھا۔

ہا۔ ہا۔ میں نے افسوس کی ہائے بھری۔ بیچارے کے گلے میں چھری پھیر دی۔ ظالم قصائی کی اولاد نے۔

بچھا۔ دن بوند بھر کا تھا۔ اور دعوت کا سامان زیادہ سو میں نے پہلے جلدی جلدی ورقی پراٹھوں کا آٹا گوندھ کے الگ دھر دیا۔

اب ڈھونڈ ڈھانڈ کے ڈبوں سے مسالے اکٹھے کئے۔ کیا نام ناریل، خشخاش، تیج پات کے پتے۔ زیرہ۔ کالا نمک، اور اللہ میاں تم کو نیکی دیویں۔ مرچیں۔ نمک۔ اوپر سے چھڑکنے کے لئے کیوڑہ

جلدی مجھے یوں بہت تھی۔ مسالے بھوننے میں دیری لگتی اس لئے میں نے یونہی مسالے پیس ڈالے۔ اور اس خیال سے کہ کہیں میں اوپر سے کیوڑہ ڈالنا بھول نہ جاؤں۔ سارے مسالوں کی یہ بہت ساری لگدی کیوڑہ میں سان ڈالی۔ اب جو اس گوبر کی ڈھیری کو سونگھوں تو عجیب سی خوشبو ناک میں بھکا بھک آئے۔ اونہہ!۔ میں نے سوچا۔ نجن مردے کھلے کو مرغا نگلنے سے غرض۔ خوشبو بدبو سے کیا لینا دینا۔ تو پھر میاں جانی۔ میں نے جلدی سے مرغا فقط ایک پانی سے دھویا اور اس بےچارے پر پورا مسالا یوں تھوپ تھاپ دیا جیسے کسی چوٹ کی جگہ لیپ لگاتے ہیں۔

اب بھگونے کی فکر پڑی۔ میں بھاگی بھاگی گئی اور نہانے کا پانی گرم کرنے والا بڑا بھگونا اٹھا لائی۔ اس میں مرغا رکھا اوپر سے خوب سارا گھی ڈال کے چولہے پر چڑھا دیا۔ چولہے میں دو ڈرم کی آگ بھڑکا دی کہ لگو ٹا جلدی سے ٹپک چکے!۔ بھگونے میں منہ تک پانی بھر دیا۔

تھوڑا سا مسالہ الگ نکال لیا تھا۔ وہ چونچ پر لپیٹا اور خوب پانی ڈھل کے چونچ بھی ایک چھلے اوپر سے بے جڑھا دی۔

میاں اب تو مارے کے پیسے لگی جا رہی تھی!۔ کام بھی تو کر دیا تھا بہت سا۔ اس لئے ذری کی ذری دیوار سے ٹیک کے اونگھائی آئی تھی کہ پھر دھڑام سے وہ بن مانس گھر میں آ گیا۔

"ہو ہو اماں۔ تم لاکھ برس اور جیو" وہ نعرہ مارا "آخر کو تم نے پکا لیا مرغ۔!؟"

"ہورتی پراٹھے" میں بے حد خوش ہو گئی۔

"مزید ایک لاکھ برس اور جیو اماں۔ آج تو تم نے سونے کا تمغہ پانے کا کام کیا ہے۔" وہ سورج مکھی پھول کی طرح کھلا تھا۔

"کب آ رہے ہیں تمہارے دوست۔!" میں پوچھی۔

"بعد مغرب!۔"

"تو پھر پراٹھے پکاؤں؟۔"

"ابھی نہیں۔ ٹھنڈے ہو کے خراب جائیں گے" اس نے شرافت سے جواب دیا: "پہلے وہ سب آ جائیں پھر۔ تم ایک ایک پکاتی جانا۔ میں آتا جاؤں گا۔ لیتا جاؤں گا۔!"

پھر وہ چلا گیا تو میں چولہے پاس آئی۔ اطمینان سے مرغا اتار کے الگ رکھا۔ اور چونچ کی پتیلی کھول چمچے میں چونچ لے کر دیکھی۔ غارت گئی ابھی تک نہ گلی تھی۔

"تیرا ناس جائے" مجھے غصہ آ گیا "جھوٹا کہہ رہا تھا کہ گل کے حلوہ ہو جائے گی۔ بڈھی اماں سے مسخریاں کرتا ہے۔" پتیلی اتار کے میں الگ دھر دی۔

شام پڑے نجن آ گیا۔ ساتھ میں بڑے میاں بھی گھوم گھام کے آئے۔ نجن کے ساتھ اس کے چاروں دوست بھی تھے!" وہ بھاگ کے میرے پاس آیا۔

"اماں۔ میں دسترخوان بچھا رہا ہوں۔ نکالو سالن۔ بڑی سی قاب میں پورا مرغ نکال دو۔ اور تم پراٹھے پکا دو اماں پلیز جلدی کرو۔"

اچھا اچھا۔ ابھی لے: میں خوشی کے مارے پھول کے غبارہ ہو رہی تھی۔ بڑی سی سینی میں پورا مرغا الٹ دیا۔ ادھر نجن کی نظر اس پر پڑی اور وہ گز بھر اچھل گیا۔ میں بھی اچھل پڑی۔

"کیا ہوا رے۔؟"

اماں۔ یہ کیا۔ تم نے اس کا پیٹ نہیں چاک کیا؟۔ یونہی

پکڑ دیا؟" وہ جلایا "جا رہا تھا۔ پیٹ میں کیا بھرا ہے اس کے؟"
میں کیا جانوں" میں جھینپ ہوئی "ہوں گی اس کی آنتیں دل گردہ
کلیجہ۔!"

" اُف اُف اماں۔!" وہ ناچنے لگا "اور اس میں سے بدبو کیسی آ رہی ہے؟
لگ۔کیوڑہ ہے کی؟" میں نڈھال ہوئی۔ اتنے میں مرے پر دس دتے
لگانے کو بڑے میاں بھی چلے آئے ـــــ میں پسینے میں نہانے لگی۔!
نجن نے ان سے سارا ماجرا بیان کر دیا۔
اے میرے خدا" بڑے میاں نے اپنا سر پکڑ لیا " غارت کر دیا۔
بیس روپئے کا مرغ۔!"
نجن نے جھپٹ کر آٹے کی لگن دیکھی اور چیخا" اماں تم نے آٹا بھی
ستیاناس کر دیا۔ اس میں تو ساری چیونٹیاں لگ گئی ہیں۔ ہائے ہائے۔
اب کیا ہوگا۔ میں تو اپنے دوستوں کو بھی لایا ہوں۔ اب انھیں کیا کھلاؤں
گا؟۔ اماں تم نے یہ کیا کر دیا؟"
بڑے میاں نے مرغ کا تھوڑا سا سالن چکھا اور ناچ ناچ کر تھوکنے
لگے ـــــ
مرچیں تیز۔ زہر۔ زیرے اور کیوڑے کی ملی جلی بدبو خوشبو۔ چھی چھی۔
آخ تھو ـــ؟"
ساری غارت لگ گئی۔؟" نجن روئے دیتا تھا۔
چوریج بھی تو نہیں لگی۔!" میں ڈری ڈری بولی" تو مرغا ہی خراب اٹھا
لایا تھا۔ اس میں میری کیا خطا ہے؟۔"
چوریج؟۔ اس کا کیا مطلب؟" بڑے میاں بھونچکے ہو کر بولے۔ اور
تب ہنستے ہوتے نجن نے قہقہہ لگا کر کہا۔
" اماں تم چوریج کھا لو۔ میں اپنے دوستوں کو ہوٹل لے جا رہا ہوں۔!"
وہ بھاگا بھاگا چلا گیا۔ میں حیرت سے سُن کھڑی بڑے میاں کو دیکھنے لگی۔
مُرغ پر اللہ صاحب کی لعنت۔!

انمول موتی

• ایک لائق اولاد زیادہ نالائق لڑکوں سے اسی طرح بہتر ہوتی ہے، جس طرح ایک چاند اس اندھیرے کو دور کر دیتا ہے۔ جسے ہزاروں ستارے مل کر بھی نہیں کر پاتے۔ اس کی ایک دوسری مثال یہ بھی ہے کہ شیرنی کا ایک بیٹا بھی ہو تو وہ جنگل پر راج کرتا ہے، لیکن گدھی کے دس بچے بھی ہوں تو وہ بوجھ اٹھاتے پھریں گے۔

• برے لوگ اچھائیوں میں بھی برے پہلو تلاش کر لیتے ہیں، جیسے مکھی، سارے خوبصورت جسم کو چھوڑ کر اس کے زخم ہی پر بیٹھتی ہے۔

• سمندر نہ برسات میں بھرتا ہے، نہ قحط میں خشک ہوتا ہے۔ اسی طرح با اصول لوگ نہ کامیابی سے مغرور ہوتے ہیں، نہ ناکامی سے رنجیدہ۔

• معمولی سے بات کی جانب سے بھی لاپروائی نہ برتو کشتی میں ایک معمولی سا سوراخ بھی ہو جائے تو وہ کشتی کو ڈبو سکتا ہے۔

مرسلہ۔ سیما سمیع (الندور)

سیلاب

رفیعہ بٹ

بادلوں کے تیور خوفناک تھے، بدمست سیاہ ہاتھیوں کی طرح جھومتے اور چنگھاڑتے چلے آرہے تھے۔ آسمان کی رنگت سیاہ لگتی تھی۔ ان سیاہیوں میں اترتی خنجر نما بجلیاں خوفناک دکھائی دیتی تھیں۔

کئی دنوں سے مسلسل موسلادھار بارشیں ہو رہی تھیں۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ زمین جذب کرلینے کی اتنی طاقت کہاں سے لاتی۔ وہ تو اب بوند بھر پانی بھی اپنے میں سمونے سے قاصر تھی۔ جتنا پانی برستا، وہ جل کا توں لوٹا دیتی۔ پانی نالیوں سے پھوٹ پڑتا۔ گلیوں میں بہنے لگتا۔ اور آوارہ گردوں کی طرح جدھر منہ اٹھتا بہہ نکلتا۔ گاؤں کے کچے مکانوں کی کیا بساط —— اب تو شہروں کی پکی آبادیاں بھی اس مسلسل پانی سے پناہ مانگ رہی تھیں۔ مکانوں کی بنیادوں میں پانی دھنس رہا تھا۔ چھتیں ٹپک رہی تھیں اور جہاں جہاں نکاس کی راہیں نہیں تھیں جوہڑ بن گئے تھے۔

"یارب، اب تو معافی دے دے۔" رحمت دین نے اپنے کچے مکان کے چھپر نما برآمدے میں کھڑے کھڑے آسمان کی طرف نگاہ ڈالی۔ کونے میں بنے مٹی کے چولہے پر چڑھی ہنڈیا میں ڈوئی ہلاتی برکتے نے اپنے شوہر کو بیزار سی نظروں سے دیکھا اور پھر طنز سے بولی:

"اب کیوں کہہ رہا ہے ایسی بات؟"

"کیوں برکتے، اپنے رب سے معافی ہی مانگ رہا ہوں اس طوفان کی —— دیکھ تو کتنے کالے بادل امڈتے آرہے ہیں، برس گئے تو خیر نہیں، یہ گھروندا ٹھہر سکے گا اب کے؟"

"تو تجھے کیا، تو تو بے فکرا ہے نا، مکان گر بھی گیا تو ماتھے پر بل تھوڑا ہی آئے گا؟"

"تیری تو مت ماری گئی ہے بھلی لوک۔ بتا تو بھلا ان بادلوں کو روکنے کی مجھ میں طاقت ہے؟"

"ہونہہ!"

برکتے نے تانبے کی بے قلعی تھالی اپنے دس سالہ بیٹے کے سامنے سرکا دی، جو ہنڈیا پکنے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

"لے پڑنے لگیں بوندیں۔" رحمت دین نے موٹی موٹی برستی بوندوں کو دیکھا اور پھر صحن میں پڑی چارپائی کو برآمدے میں گھسیٹ لایا۔

"اے زہری!" برکتے نے ہنڈیا چولہے سے اتارتے ہوئے گھبراہٹ میں بیٹی کو پکارا۔

"کیا ہے اماں!" زہری بے پٹ کی کھڑکی سے ماں کو جواب دیتے ہوئے بارش کی بوندیں اپنے پھیلے ہاتھوں پر لینے لگی۔

"اے لڑکی، کیا تماشا دیکھ رہی ہے، اس کمرے کی چھت ٹپکتی ہے، یہ راکھ اوپر ڈال آ۔ رات کو سونے کی جگہ بھی نہ ملے گی، اور وہ چارپائیاں بھی تو اٹھا لے بستر لگا دے ان پر، تنوری پر لگن بھی الٹا دے سارا پانی بھر جائے گا۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے بیٹی کو کئی احکامات سنا دیئے۔ زہری اچھا اماں کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی، پائنچے اٹھائے، دوپٹے کی دوہر بکل مارے وہ ادھر کچے صحن میں بھاگ بھاگ کر چیزیں اٹھانے لگی۔ بارش ایک دم تیز ہوگئی تھی اور ہواؤں میں بھی تندی آگئی تھی۔ شڑپ شڑپ پانی میں بھاگتی وہ چیزیں اٹھا رہی تھی۔

رحمت دین وہیں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھ گیا۔ حقے کی نے منہ میں دباتے ہوئے وہ کالے کالے بادلوں کو دیکھنے لگا۔ جن کے تیور خوفناک نظر آرہے تھے۔

"شیدا نہیں آیا ابھی؟" برکتے نے متفکرانہ انداز میں ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا: "اتنی بارش آگئی، جانے کہاں بھیگ رہا ہوگا۔"

"تو نے ہی تو بھیجا تھا۔ بہن کی خبرداری کو۔" رحمت دین حقہ گڑگڑاتے بولا۔ "آ ہی جائے گا، گرمیوں ہی کی بارش ہے، نمک کا تو بنا نہیں جو پگھل جائے گا۔ جوان ہو رہا ہے، اسے سنبھال کر نہ رکھا کر، حالات سے نبٹنا اسے آنا ہی چاہیئے۔"

"تو تو ہر وقت یہی درس دیا کر، دیکھ نہیں رہا کتنی طوفانی بارش ہے اور رات بھی اتر آئی ہے۔" ماں کا انداز متفکرانہ تھا۔ "چودہ پندرہ سال بھی کوئی عمر ہوتی ہے، حالات سے نپٹنے کو تو عمر پڑی ہے۔"

وہ جانے کیا کیا بکتی رہی، رحمت دین حقے کی گڑگڑاہٹ میں اس کی ان سنی کرتا رہا۔ زہری نے چھوٹے بھائی کو کھانا کھلایا، بہتن سمیٹے، ہنڈیا تپتی راکھ پہ ہی رہنے دی۔ برآمدے میں پڑی ہر چیز

اس نے جگہ جگہ رکھ دی۔ اور پھر ابا کے قریب چارپائی کے ایک کونے پر آ بیٹھی۔ چادروں کی صورت پڑتے پانی کو دیکھتے ہوئے وہ اباسے باتیں کرنے لگی۔

"ہائے ابا، اس بارش میں اگر ہمارا مکان گر گیا تو کیا کریں گے"

سولہ سترہ سالہ زہری خوف سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی۔

"کرنا کیا ہے، بارشیں تھمیں گی تو پھر بنالیں گے ـــــ" رحمت دین نے امید افزا سکون سے کہا۔ "اللہ کی رضا یہی ہے، تو پھر ہم اعتراض کرنے والے کون ہیں بیٹی"

برکتے اس کے پرسکون انداز سے جل ہی تو گئی۔ ہمیشہ ہی اس کی ایسی باتوں سے جل جایا کرتی تھی۔ ایسا متوکل انسان بھی کیا! کبھی تو نصیبوں کا شکوہ کرنا چاہیے، کسی وقت تو قناعت کا دامن چھوٹنا چاہیے۔ ہر نقصان پر صبر، ہر مصیبت پر شکر، جانے کس قسم کا آدمی تھا رحمت دین۔ برکتے کو اس کی اسی پرسکون عادت سے بس چڑ گئی تھی۔

وہ ابھی کوئی جلی کٹی سنانے ہی والی تھی کہ گلی میں لوگوں کے اونچی آواز میں بولنے کی گھبرائی گھبرائی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"اے پتہ تو کرو کیا ہوا ہے۔ بہت شور ہو رہا ہے ـــ اور سنا کیسی عجیب عجیب آوازیں آرہی ہیں ـــ" اس نے کان کھڑے کرتے ہوئے کہا ـــ

رحمت دین جلدی سے اٹھا۔ تہمد پر صرف بنیان پہنے ہوئے تھا۔ بیٹی سے کرتا لانے کو کہا، لیکن اسے باہر جانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ شور واضح ہوگیا تھا۔ اور آوازیں صاف ہوگئی تھیں۔

سیلاب آرہا ہے، پانی بڑھ رہا ہے، نکل چلو ـــــ نکل چلو ـــ

"ہائے میں مرگئی" برکتے نے سینے پر دوہتڑ مارا۔ زہری بھی خوف سے سپید پڑ گئی۔

"اماں شیدا!" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

برکتے تو تھر تھر کانپنے لگی۔

رحمت دین لپک کر بیرونی دروازے کی طرف گیا۔ گلی ندی بنی ہوئی تھی اور پانی بیرونی دہلیزوں سے اوپر آرہا تھا۔ سامنے دروازے سے سرداراں سر پر گٹھری اٹھائے نکل رہی تھی اور لوگ بھی تھوڑا تھوڑا سامان سروں پر رکھے پانی میں گھٹنے گھٹنے ڈوبے گھروں سے نکل رہے تھے۔

"اے منہ کیا دیکھ رہے ہو" نہر کا بند ٹوٹ گیا ہے، پانی تیزی سے آرہا ہے، جلدی جلدی نکل چلو، گاڑی کی پٹری اونچی ہے، وہاں تک پہنچتے پہنچتے بھی دیر لگے گی۔ پانی تو گولی کی تیزی سے آرہا ہے! لوگ رحمت دین سے کہہ رہے تھے۔

اور جب رحمت دین کندھوں پر اپنے دس سالہ بیٹے کو اٹھائے زہری اور برکتے کے ساتھ گھر سے نکلا، تو پانی کے ریلوں میں قیامت کا زور آگیا تھا۔ زہری کے سر پر رکھی کپڑوں کی گٹھری اس ریلے کی نذر ہوگئی اور برکتے کے سینے کے ساتھ لگی عمر بھر کی پونجی پانی کے تھپیڑے سے ہاتھوں سے چھوٹ گئی۔ شیدے کا غم الگ، زیور اور نقدی کا فکر الگ۔ برکتے تو بوکھلائی جارہی تھی۔ کمر کمر پانی میں چلنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ واویلا کرتی جارہی تھی۔ رحمت دین اُسے زہری کا ہاتھ پکڑنے کی تلقین کر رہا تھا۔ اسے تو چیزوں کے ڈوبنے کا غم نہیں تھا، فکر تھا تو شیدے کا ـــ یا زہری کا ـــ دعائیں مانگ رہا تھا کہ خیریت سے پٹری تک پہنچ جائیں۔

پٹری پر پوری بستی کے لوگ بے سروسامانی کے عالم میں چیخ رہے تھے۔ کوئی سامان کو رو رہا تھا، کوئی بال بچوں کو اکٹھا کر رہا تھا۔ بارش اب بھی انہی تیوروں سے پڑ رہی تھی اور بند ٹوٹ جانے سے بہہ آنے والا پانی غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ بڑی عجیب عجیب آوازیں آرہی تھیں۔ جب کوئی مکان پانی میں گرتا تو ایک ہولناک سا دھماکہ ہوتا۔ پٹری پر بیٹھے لوگ خوفزدہ ہو جاتے۔ عورتوں اور بچوں نے تو خاصہ کہرام مچایا ہوا تھا۔

برکتے ساری رات شیدے کے لئے تڑپتی رہی۔ تڑپ رحمت بھی رہا تھا، لیکن اس کا انداز ہمیشہ کی طرح تھا۔ برکتے تو اتنی گھبرائی تھی کہ اب رحمت دین کے سکون سے چڑ بھی نہیں لگتی تھی۔ بیٹے اور بیٹی کو پہلو سے لگائے وہ رات بھر روتی رہی۔

بارش تھم گئی، ہواؤں کا زور ٹوٹ گیا، لیکن پانی کا بے روک بہاؤ تھمنے میں نہیں آیا۔ یوں لگتا تھا پانی پٹری پر بھی آجائے گا۔ موت اتنی قریب نظر آرہی تھی، ہر دل سہما ہوا تھا۔ اب تو وہ وقت آگیا تھا کہ کسی کو مال کی نہ پڑی تھی، گھر بار بھی یاد نہ آرہا تھا۔ ساتھ لائی پونجی کا بھی احساس نہ رہا تھا۔ پوٹلیاں اور گٹھریاں بھی گڈمڈ ہوگئی تھیں ـــــ لیکن کسی کو پرواہ نہیں تھی ـــــ سب کی نظریں تو خونخوار پانی پر جمی تھیں جو اندھیرے میں اور بھی خوفناک لگ رہا تھا۔ جس میں سنسناہٹ آرہی تھی اور جس کی خونی لہریں لپک لپک کر پٹری تک آرہی تھیں۔

لیکن قدرت کو شاید ان لوگوں کی بے بسی پر رحم آ گیا۔ پانی پٹری سے دو ہاتھ نیچے ہی رک گیا۔ اس کی غراہٹیں بھی کچھ کم ہو گئیں۔ اور شور بھی قدرے تھم گیا۔ اِن مکان اب بھی ایک عجیب سی آواز کے ساتھ پانی میں گر رہے تھے۔

رات لوگوں نے آنکھوں میں گزار دی اور صبح جب بیدار ہوئی تو لوگوں نے دیکھا پوری بستی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سرخ سرخ پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور گھروں سے بہہ بہہ کر آنے والا سامان تیرتا پھر رہا تھا۔ لوگوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اپنے اپنے گھروں کو دیکھ کر اندازہ لگا رہے تھے۔ سیلاب کے جو آثار تھے یہی لگتا تھا کہ کسی کا کچھ بھی نہیں بچ سکے گا۔

رحمت دین کا مکان تو سرے سے نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ سوزاں کے مکان کی مٹی نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کے مکان کی چھت وغیرہ نظر نہ پڑتی تھی۔

ایک گہری ٹھنڈی آہ بھر کر وہ بے حال برکتے اور سہمی ہوئی زہری کے پاس بیٹھ گیا۔ سیلاب اسی کو تو کہتے ہیں، سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے، کچھ بھی تو نہیں بچتا۔

لیکن رحمت دین کو یوں محسوس ہوا جیسے سیلاب نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ سب کچھ بچ گیا ہے، کچھ بھی نہیں ڈوبا۔ اس نے اپنے شیدے کو جو دیکھ لیا تھا ——— شیدا ——— اس کا جواں سال بیٹا ——— جو رات بچھڑ گیا تھا۔ برکتے بھی اپنے بچے سے دیوانہ وار لپٹ گئی۔ ایک لمحے کو تو اسے بھی یوں محسوس ہوا کہ جیسے سیلاب آیا ہی نہیں۔

سارا دن بے سروسامانی کی حالت میں گزرا۔ تیز چمکتی دھوپ اور پانی کی بھڑاس، کچھ کھانے کو نہ پینے کو، ایک حشر کا عالم تھا۔ جیسے ——— چاروں طرف پانی ہی پانی ——— سیلن ہی سیلن ——— اور تھوڑا سا پٹری کا وہ حصّہ جو پانی سے محفوظ رہ گیا تھا۔ اس پر پوری بستی کے لوگ ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔

تیسرے دن پانی اترنا شروع ہوا، لوگ کر کر جب پانی کو چیرتے اپنے گھروں کی خبر لینے دوڑے۔ رحمت دین بھی گیا، لیکن اس کے مکان کی دو تین آدھی آدھی دیواریں ہی نظر آئیں۔ چھتیں گر گئی تھیں اور اثاثہ ڈوب گیا تھا۔

دکھ تو اسے بھی ہوا، لیکن حسب عادت صبر شکر کر گیا اور جب برکتے رو رو کر بین کرنے لگی تو وہ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولا۔

"بھلی لوک خدا کا شکر ادا کر کہ سب خیریت رہی"

"خیریت؟" اس نے قہر آلود نظروں سے رحمت دین کو دیکھا "مکان گر گیا، کوئی کپڑا بچا، نہ بستر برتن رہا، نہ کوئی اور شئے، اور کہہ رہا ہے خیریت رہی"

"اللہ نے چاہا تو سب کچھ پھر بن جائے گا، جانیں بچ گئیں، اللہ کا شکر ہے۔ بتا تو بھلا، خدانخواستہ شیدے کو کچھ ہو جاتا تو کیا کرتی۔ مولا نے بچھڑے ہوئے کو ملا دیا۔ میرے بچے خیریت سے رہے، تو بچ گئی، میں زندہ رہا ——— میں تو سمجھتا ہوں سیلاب آیا ہی نہیں، سیلاب تو سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے، ہماری دولت تو ہمارے پاس ہی ہے، باقی رہی آفت، تو وہ انسانوں پر ہی آتی ہے۔ ہاتھ پیر سلامت رہیں، میں پھر نئے سرے سے محنت کروں گا، میرا شیدا بازو بنے گا، دیکھ لینا، بہت جلد تجھے پکا مکان بنوا دوں گا"

برکتے کچھ نہیں بولی۔ واقعی اگر شیدا نہ ملتا، تو وہ کیا کرتی ——— زہری ڈوب جاتی یا حمیدا لاپتہ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔ بشیرے کی ماں کیسے لوٹ رہی تھی پٹری پر، بشیرا سا بیٹا ڈوب گیا تھا ——— نسیمہ بھی اپنی خالی گود کو پاگل کی طرح تک رہی تھی۔ چھ ماہ کی بچی رات گھر سے نکلتے نکلتے پانی کا نوالہ بن گئی تھی۔ آج پہلی بار برکتے کو محسوس ہوا کہ رحمت دین اچھی باتیں کرتا ہے، تینوں بچوں اور شوہر کے ساتھ بیٹھی پیلی کو پٹروں سے گرائی جانے والی سوکھی روٹیاں اور اچار کھاتے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہشتی میوہ کھا رہی ہے۔ اتنی تباہی کے باوجود وہ پرسکون تھی، بلکہ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شیدا اور حمید اچار کے لئے یوں لڑ رہے تھے جیسے گھر میں بوتلوں پر لڑا کرتے تھے

پانی اترنے کے بعد بھی بستی رہائش کے قابل نہ رہی تھی۔ جابجا جوہڑ بن گئے تھے۔ مکانوں کے ملبے اور ان کے تلے دبے سامان سے سڑاند اٹھتی تھی۔ جابجا ہی بدبو تھی۔

بے سروسامان لوگوں کو پٹری سے اب بڑی سڑک کے کنارے منتقل کر دیا گیا۔ امدادی پارٹیاں آن پہنچیں۔ لوگوں میں کپڑے، کھانا، بستر اور کچھ خیمے تقسیم ہوئے۔

رحمت دین کے ہاتھ بھی ایک خیمہ آ گیا۔ ننگی زمین اور کھلے آسمان تلے بیٹھتے وہ گھبراتا تو نہیں تھا، ہاں زہری کی وجہ سے فکرمند تھا۔ سر راہ پڑی جوان بیٹی کے لئے پناہ گاہ کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ خیمہ کیا ملا،

اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی۔

"اب فکر کی بات نہیں برکتے۔ اس جیسے کو اب گھر ہی سمجھو، تم اطمینان سے رہا کرو [illegible] کے ساتھ۔ میں اور رشید اب بے فکری کے ساتھ محنت مزدوری کے لئے نکلا کریں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" برکتے نے جواب دیا۔ واقعی خیمہ اب اسے گھر ہی کی طرح لگنے لگا تھا لیکن پھر بھی بولی۔

"جلدی جلدی چار دیواریں کھڑی کر لے اپنے گھر کی ۔۔۔ خیمہ بے شک ہے لیکن مجھے تو دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔ رنگ برنگے لوگ روز روز آتے ہیں۔"

"اے پگلی، یہ رنگ برنگے لوگ تو رحمت کے فرشتے ہیں ۔۔۔ لوگوں کو راشن دیتے ہیں، کپڑے لاتے ہیں، بستر برتن انہی لوگوں نے تو دیئے ہیں۔ سر پہ آن پڑے نا تو ہماری قوم تیر کی طرح سیدھی ہو جاتی ہے۔ سیلاب سے خاصے بے شک ہم لوگ ہوئے ہیں، لیکن خدا لے جھنجوڑ ان لوگوں کو دیا ہے۔ کتنا کام کر رہے ہیں، دن رات کی پرواہ کئے بغیر لوگوں کی مدد کرتے پھرتے ہیں اپنے اپنے طور پر سب کام کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" برکتے کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "پھر بھی جتنی جلدی ہو گھر کی دیواریں کھڑی کر لے۔"

"وہ تو کر ہی رہا ہوں، باپ بیٹے کی مزدوری کافی ہے، کھانے پینے کو یہاں سے مل جاتا ہے، بس مولا نے چاہا تو دس پندرہ دن میں اپنے گھر چلے جائیں گے۔"

برکتے خاموش ہو گئی۔ ان رحمت کے فرشتوں کا ذکر رحمت نے جس اعتماد اور عقیدت سے کیا تھا، وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ ویسے اس کے دل میں وسوسے ضرور رہتے۔ وہ راشن تقسیم کرنے والوں میں اونچے قد والا بھاری بھر کم سا آدمی جو ہر وقت آنکھوں پر کالا چشمہ چڑھائے رکھتا تھا، اسے کسی طور رحمت کا فرشتہ نہ لگتا تھا۔ جتنی دیر وہاں ٹھہرتا اس کی زہری ہی کی طرف رخ کئے رہتا، اور پھر جانے اپنے ساتھی کو انگریزی میں کیا کیا کہتا۔ اس کے چہرے کی شیطانی چمک تو برکتے کو پہلے دن ہی کھٹکی تھی۔ اسی لئے تو وہ چاہتی تھی کہ گھر کی دیواریں ہی اٹھ جائیں تو وہ یہاں سے چلی جائے۔ وہ بار بار اسی لئے رحمت سے کہتی تھی۔ رحمت، جو سیلاب میں گھر کی ایک ایک چیز بہہ جانے سے بھی متفکر نہیں تھا، اور جو مکان کے گر جانے سے بھی حوصلہ مند ہی رہا تھا۔ سیلاب کی پھیلائی تباہی کو تباہی سمجھتا ہی نہیں تھا، پہلے سے کہیں زیادہ حوصلے سے نپٹ رہا تھا۔

پچیس چھبیس دن گزر گئے، سیلاب آیا اور گزر گیا تھا۔ زندگی کی گٹ دوبارہ سے شروع ہو گئی تھی۔ لوگ گھروں کے ملبے سمیٹ رہے تھے بھیگی چوبی چیزیں نکال رہے تھے، خشک کر رہے تھے، زندگی مسلسل حرکت ہی کا نام تو ہے۔ رحمت دین نے پھر گھر کی دیواریں اٹھالی تھیں۔ بس دو ایک دن میں وہ بال بچوں کو گھر لے جانے والا تھا۔

اس دن وہ رشید کے علاوہ حمیدے کو بھی ساتھ کام پر لے گیا۔ چار پیسے فالتو مل جانے کی توقع تھی، اور برکتے نے بھاگ دوڑ مچا رکھی تھی کہ گھر جلدی بنے۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ زہری برتن وغیرہ دھو کر خیمے سے باہر نکلی۔ ماں کتنی دیر سے راشن لینے گئی تھی، اب تک نہ آئی تھی۔ اسے تشویش ہوئی۔ کسی کو بھیج کر پتہ کروانے کا سوچا۔ لیکن سبھی لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ مرد تو تقریباً سبھی اپنے کاموں پر گئے تھے۔ عورتیں کچھ راشن لینے گئی تھیں، کچھ کاموں میں مصروف تھیں۔ چند بچے درخت تلے کھیل رہے تھے ۔۔۔ وہ ان کی طرف بڑھی۔

لیکن بچوں تک پہنچنے سے پہلے ایک آدمی نے اسے اپنی طرف بلایا۔

"کیا ہے؟" اس نے کھڑے کھڑے پوچھا۔ یہ آدمی اس نے کئی بار راشن والوں کے ساتھ دیکھا تھا۔

"تمہاری ماں نے تمہیں بلایا ہے، راشن زیادہ ملا ہے، اس سے اکیلے اٹھایا نہیں جاتا، تمہیں بلا رہی ہے۔ وہ سامنے درخت کے پار جو دیوار نظر آ رہی ہے نا وہاں چلی جاؤ۔"

وہ اسی سیدھ پر چل دی۔

برکتے تھوڑی ہی دیر بعد واپس آ گئی۔ زہری کو خیمے میں نہ پایا۔ راشن کونے میں رکھ کر وہ باہر آ گئی۔ ادھر ادھر متلاشی نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ پاس والوں سے پوچھا۔ عورتوں سے، بچوں سے سبھی سے پوچھتی پھری۔ وہ کہیں نہ تھی۔ اسے یونہی خیال آیا کہ کہیں وہ گھر دیکھنے نہ چلی گئی ہو ۔۔۔ بھاگم بھاگ وہ پگڈنڈی تک پہنچی۔ ہانپتی کانپتی گھر تک آئی، زہری کہیں بھی نہ تھی۔ اور دھڑکتے دل کو تھامتے واپس آئی۔ زہری کہیں بھی نظر نہ آئی۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ کچھ بچوں نے اسے بتایا کہ وہ درخت کے اس طرف والی دیوار کی طرف گئی تھی۔ برکتے ادھر ہی دوڑ پڑی۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تھکے ہارے قدموں سے وہ واپس آئی، تو رحمت دین

کپڑے سے اپنا پسینہ سکھا رہا تھا۔ شیدا لوٹے میں پانی بھر کر پاؤں دھو رہا تھا، اور حمیدا باپ کی لائی ہوئی مٹھائی کھا رہا تھا۔

"کہاں کہاں کی سیریں کر رہی ہو ماں بیٹی۔" رحمت دین آج پیسے زیادہ ملنے پر بہت خوش تھا۔

لیکن

جب برکتے نے زہری کے متعلق بتایا، تو وہ چونک گیا۔ کپڑا ہاتھ میں لئے وہ برکتے کی طرف آیا۔

"کیا کہہ رہی ہو، اس کو جانا کہاں ہے، یہیں کہیں ہوگی۔"

برکتے زمین پر بے حال ہو کر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ "میں اسے ہر جگہ ڈھونڈ آئی کہیں نہیں ملی۔ بچوں نے بتایا اسے کسی آدمی نے درخت کے اس طرف والی دیوار کی طرف بھیجا تھا۔"

"کب؟" رحمت دین کا سانس اکھڑ سا گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے برکتے کو دیکھنے لگا۔

اور پھر گھر کے سبھی افراد زہری کی تلاش میں اٹھ دوڑے۔ راہگیروں سے پوچھتے پھرے، ویرانوں میں ڈھونڈتے پھرے، جہاں جہاں اس کے ملنے کا امکان تھا، تلاش کیا۔

لیکن اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔

تھک ہار کر سب واپس لوٹے، تو برکتے سینے پر پریشانی کے عالم میں دو ہتڑ مارتی جا رہی تھی اور رحمت دین تو یوں جھک کر چل رہا تھا جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی ہو۔ پھر بھی دل کو تسلیاں دیئے جا رہا تھا۔ برکتے کو واویلا کرنے سے اس نے جھڑک کر روکا، لیکن وہ چپ نہیں ہوئی۔ روتے روتے اپنے شک کا اظہار کر دیا۔

"وہ ماشن والے ۔۔۔۔۔ ان ہی کے ساتھ جو ایک لمبا سا موٹا سا آدمی آتا تھا۔ وہی ۔۔۔۔ وہی ۔۔۔۔"

"بک بک نہیں کر۔" رحمت دین نے اسے ٹوک دیا۔

"تو تو مانے گا نہیں میری، میں کہتی ہوں وہی ۔۔۔۔ وہی لے گئے میری بیٹی کو ۔۔۔۔ میں تو لٹ گئی ۔۔۔۔ تباہ ہو گئی ۔۔۔۔ مجھے تو ہر وقت یہی دھڑکا رہتا تھا۔"

رحمت دین گھبرا گیا۔ حوصلہ تو اس نے کبھی بڑی سے بڑی مصیبت میں گھبرا کر بھی نہیں ہارا تھا، لیکن جوان بیٹی کا معاملہ تھا۔ اب تو شام بھی گہری ہو گئی تھی اور ہر طرف ڈھونڈنے کے باوجود بھی اس کا سراغ نہیں ملا تھا۔ حوصلہ آپوں آپ ٹوٹ رہا تھا۔ کمر پر ہاتھ رکھے وہ شست شست قدم اٹھاتا تھڑے کی طرف آ رہا تھا۔ برکتے واویلا کر رہی تھی۔ شیدا اور حمیدا بھی چپ چاپ سر جھکائے چل رہے تھے۔

زہری کی گمشدگی نے گھر والوں کے علاوہ ارد گرد والوں کو بھی پریشان کر دیا۔ رحمت دین اور برکتے کو گھیرے میں لئے ہر کوئی اپنا ہی سوال کر رہا تھا۔ جواب دینے کی ہوش کسے تھی۔ برکتے تو رو دھو کر دل کی بھڑاس نکال رہی تھی، لیکن رحمت دین پر تو جوں جوں شام ڈھل رہی تھی، سکتے کی کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔ شیدا اور حمیدا پھر تلاش میں نکل پڑے تھے۔ بستی کے کئی جوان بھی ان کے ہمراہ ہو لئے تھے، باقی وہیں انتظار کرنے لگے تھے۔

لیکن انتظار کچھ زیادہ دیر نہیں کرنا پڑا۔

زہری آ گئی۔

وہ زہری نہیں جو یہاں سے گئی تھی، بلکہ دوسری زہری۔

جس کے بال کھلے تھے، جس کی آنکھوں میں وحشت جم گئی تھی اور جو بربادی کی داستان کا عنوان تھی۔

برکتے نے سر پیٹ لیا۔ بستی کے لوگوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔

شیدا شعلے کی طرح بھڑک اٹھا، حمیدا غرانے لگا۔

لیکن رحمت دین!

مضبوط اور مستحکم حوصلے والا رحمت دین، طوفانوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے والا رحمت دین، مصیبتوں کو صبر و شکر سے جھیل جانے والا رحمت دین آنکھیں پھاڑے بیٹی کو صرف تکے جا رہا تھا۔ اس کا وجود کانپ رہا تھا اور ٹھنڈے پسینے میں جیسے نہا سا گیا تھا۔ بستی کے ایک معمر شخص نے تھام لیا۔

"سیلاب تو ختم ۔۔۔۔ سیلاب تو ۔۔۔۔ ختم۔" اس کے بے دم ہونٹوں پر صرف یہی الفاظ پھڑپھڑائے، اور پھر اس کا سر تھامنے والے کے سینے پر ڈھلک گیا۔ شاید وہ کہنا چاہ رہا تھا کہ سیلاب تو ختم ہو گیا، پھر سب کچھ اب ڈوب کیوں گیا؟

اور جب لوگوں نے اس کے جسد بے جان کو چارپائی پر ڈالا تو اس کی کھلی ہوئی بے نور آنکھیں مجسم سوال تھیں، پوچھ رہی تھیں۔

کہ

سیلاب جب آیا تھا یا اب؟

دو نعرے

خاتونِ مشرق کی آواز

از جعفر ملیح آبادی

زنِ مشرقی ہوں زنِ مشرقی ہوں
سراپا حیا، پیکرِ سادگی ہوں
نجومِ وفا کی خنک چاندنی ہوں
حجابوں کے سائے میں پل کر بڑھی ہوں
زنِ مشرقی ہوں زنِ مشرقی ہوں

نکلتی ہوں پردے کے باہر کبھی اکثر
مگر صنفِ نازک کے انداز سے کر
حیا کی چمک رہتی ہے میرے رخ پر
زنِ مشرقی ہوں زنِ مشرقی ہوں

مری ہر نظر ترجمانِ حیا ہے
مرا ہر نفس پاسبانِ حیا ہے
زباں پر مری داستانِ حیا ہے
زنِ مشرقی ہوں زنِ مشرقی ہوں

فرشتوں کی معصوم فطرت ہے مجھ میں
رُخِ ماہ و انجم کی زینت ہے مجھ میں
رگِ گل کی شانِ نزاکت ہے مجھ میں
زنِ مشرقی ہوں زنِ مشرقی ہوں

فضائے کواکب جمالِ گلستاں
مرے ایک ہلکے تبسم پہ قرباں
بہارِ طلاعت مرا روئے خنداں
زنِ مشرقی ہوں زنِ مشرقی ہوں

مرا دل ہے صدق و صفا کا خزانہ
مرے دل پہ مہر و وفا کا فسانہ
محبت کا چھیڑے ہوئے ہوں ترانہ
زنِ مشرقی ہوں زنِ مشرقی ہوں

کبھی تاج ہوں گاہ نورِ جہاں ہوں
کبھی بن کے سیتا کا پیکر عیاں ہوں
کبھی چاند کے روپ میں حکمراں ہوں
زنِ مشرقی ہوں زنِ مشرقی ہوں

خاتونِ مغرب کی آواز

زنِ مغربی ہوں زنِ مغربی ہوں
سرِ شام ہوں رہگذاروں کی زینت
کچھ اوباش مردوں کی کاروں کی زینت
کلب، ناچ گھر، اور باروں کی زینت
زنِ مغربی ہوں زنِ مغربی ہوں

نکلتی ہوں سو سو طرح بن سنور کر
مجھے فخر ہے اپنی عریانیوں پر
کہ حصیاں کی ہوں دخترِ نیک اختر
زنِ مغربی ہوں زنِ مغربی ہوں

حجاب و حیا سے کنارا کئے ہوں
خلوص و وفا سے کنارا کئے ہوں
یہ حد ہے خدا سے کنارا کئے ہوں
زنِ مغربی ہوں زنِ مغربی ہوں

گناہوں کی دنیا بسائے ہوئے ہوں
تصنع کی محفل سجائے ہوئے ہوں
طہارت سے دامن بچائے ہوئے ہوں
زنِ مغربی ہوں زنِ مغربی ہوں

نہ ایماں سے مطلب نہ دیں سے غرض ہے
بس آرائشِ زیب و زیں سے غرض ہے
سرودِ مئے آتشیں سے غرض ہے
زنِ مغربی ہوں زنِ مغربی ہوں

نجابت، طہارت، شرافت، مروت
مجھے ہے ان الفاظ سے سخت نفرت
مرا دل ہے محرومِ سوزِ محبت
زنِ مغربی ہوں زنِ مغربی ہوں

ہوں اہل دل کی تباہی کا ما ل
پھرتے ہیں ہر دم سے عہد و پیاں
کبھی اس کی مہماں کبھی اس کو سہاں
زن مغربی ہوں زن مغربی ہوں
بڑی فرد ہوں میں فسوں کاریوں میں
بڑی طاق ہوں اپنی عیاریوں میں
ہوں ابلیس کی خاص دلداریوں میں
زن مغربی ہوں زن مغربی ہوں

• تبدیلی پتہ کی اطلاع قبل از وقت ملنا چاہیئے تاکہ حریم کی روانگی سے پہلے پتہ بدل دیا جائے۔ تاخیر سے اطلاع ملنے پر پرچے قیمتاً روانہ کئے جائیں گے۔

جو حضرات چاہتے ہوں کہ ان کا سالانہ [illegible] حفاظت سے پہنچ جائے وہ آج ہی منی آرڈر کوپن پر لکھ دیں کہ انھیں ایک روپیہ پچیس پیسے کا وی۔ پی کر دیا جائے لیکن اسکی اطلاع جلد سے جلد دفتر کو روانہ فرمائیں۔

باورچی خانے سے متعلق ضروری معلومات

حقیقت یہ ہے کہ حیات بخش اجزا خوراک کی جان ہیں اور کھانا پکاتے وقت یہ اجزا ضائع نہیں ہونے چاہئیں۔ ان اجزاء کو ضائع ہونے سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ تین باتوں کو خاص طور پر ذہن میں رکھا جائے۔ وہ تین باتیں ہیں، پکانے میں کم وقت لگایا جائے، کم درجہ حرارت پر پکایا جائے، اور پکانے کے لئے زیادہ بڑا برتن استعمال نہ کیا جائے۔ چاول اور سبزیاں وغیرہ تیار کرتے وقت ضرورت کے مطابق کم از کم پانی استعمال کیا جائے۔

کھانا تیار کرتے وقت اگر نامناسب طریقے اختیار کئے جائیں تو کھانے میں سے مقوی اجزا خاص طور سے قابل تحلیل وٹامن بعد ازاں اور پروٹین ضائع ہو جاتے ہیں۔ ہر قسم کا کھانا تیار کرنے کے کچھ اصول اور قاعدے ہوتے ہیں جن پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

کھانا تیار کرنے کے جدید ترین آلات اور دوسری چیزیں دستیاب ہونے کی وجہ سے بلاشبہ خانہ دار خواتین کو راحت ملی ہے لیکن ان جدید چیزوں کے استعمال سے تمام مقوی اجزا ضائع ہوتے ہیں جن کی عوام کے ایک [illegible] کو ضرورت ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ دور میں اشیاء خوردنی کو محفوظ کرنا بھی ضروری ہو گیا ہے لیکن اسے اس قدر کار آمد بنا دیا جائے کہ غذائی اجزا ہی ضائع ہو جائیں۔

اشیائے خوردنی کو مشینوں کی مدد سے صاف کیا جائے یا دستی طریقے سے مقوی اجزا بہر صورت ضائع ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ غیر مشینی طریقوں سے اجزا کم ضائع ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر گھروں میں نیم جوش پانی میں چاول صاف کئے جانے کے مقابلے میں مل میں صاف کئے جانے سے زیادہ اجزا ضائع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح [illegible] نکلے ہوئے آٹے کے مقابلے میں ایسا آٹا زیادہ مفید رہتا ہے جس کا میدہ نہ نکالا گیا ہو۔ گھروں میں آٹے سے بھوسی نکالے جانے کے بعد کا آٹا زیادہ اچھا اور مفید رہتا ہے نیز اس میں وٹامن بعد ازاں اور پروٹین وغیرہ کافی مقدار میں موجود رہتا ہے۔

عام طور پر یہ رواج ہے کہ چاول کو پکانے سے قبل تین یا چار مرتبہ ضرور دھویا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں چاول پکانے کے لئے زیادہ مقدار میں پانی استعمال کیا جاتا ہے اور بعد میں فاضل پانی پھینک دیا جاتا ہے۔ اس طرح قابل تحلیل یعنی وٹامن بی بڑی مقدار میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ اس طرح تک بھگ ۸۰ فیصد وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں۔

پھلوں اور سبزیوں کے چھلکے اتارنے یا انہیں کاٹنے سے بھی قیمتی اجزا ضائع ہوتے ہیں ایسے بہت سے پھل اور سبزیاں ہیں جن کے چھلکوں یا باہری پتیوں میں بھرپور وٹامن پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر آلو کے چھلکے کی تہہ میں بے انتہا وٹامن سی پایا جاتا ہے اور اس کا چھلکا اتارنے سے ۱۲ سے ۱۵ فیصد تک یہ وٹامن ضائع ہو جاتا ہے۔ گاجر کے چھلکے میں وٹامن بی کمپلیکس بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ سلاد کی باہری پتیوں میں وٹامن بی پایا جاتا ہے باہری پتیوں میں اندرونی پتیوں کے مقابلے میں زیادہ نمکیات پائے جاتے ہیں۔

سیب کے چھلکے کے اندر والے حصے کے مقابلے میں باہر کی طرف تین سے دس گنا زیادہ وٹامن سی ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سبزی یا پھل کے گودے کے مقابلے میں چھلکے میں زیادہ وٹامن پائے جاتے ہیں حتیٰ کہ ٹماٹر کے چھلکے میں بھی اندر والے حصے میں اصل گودے سے زیادہ وٹامن پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ سبزیوں اور پھلوں کو کاٹتے وقت نیز چھلکے اتارتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ ممکن حد تک مقوی اجزا محفوظ رہ سکیں۔

کھانا پکانے سے پہلے سبزیوں وغیرہ کو دھونے سے بھی بڑی مقدار میں وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں۔ اگر آلو کو ابلتے پانی میں بھگو دیا جائے تو ۹ سے ۱۱ فی صد تھایا مائن اور میٹھے آلو کو پانچ گھنٹے بھگو دیا جائے تو ۱۰ فیصد تھایامائن ضائع ہو جاتے ہیں۔ اگر کٹے ہوئے آلو کو ۲۴ گھنٹے تک پانی میں بھگو دیا جائے تو ۷۰ فی صد وٹامن سی ۵۰ فی صد تھایامائن اور ۷۰ فی صد نائیکاسن ضائع ہو جاتا ہے۔

سبزیوں کو کاٹنے سے پہلے دھویا جائے اور یہ کوشش کی جائے کہ انھیں کم سے کم کاٹا جائے اور سبزیوں کو بالکل نہ بھگویا جائے تاکہ غذائی اجزا تلف نہ ہونے پائیں۔

کرم کلا کاٹنے سے ۵ فی صد تک وٹامن سی اور ۵ فیصد تھائی مائن تلف ہو جاتا ہے۔ آلو کا بھرتا بنانے میں کثیر مقدار میں وٹامن سی ضائع ہو جاتا ہے۔ کھیرے کا سلاد تیار کرنے میں ۲۲ فی صد وٹامن سی ضائع ہوتا ہے اور اگر یہ ایک گھنٹہ رکھا رہے تو ۳ فیصد اور اگر تین گھنٹے رکھا رہے تو ۱۱ فی صد وٹامن سی مزید ضائع ہو جاتا ہے۔

تمام غذائی اجزا میں وٹامن سی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جوش سے وٹامن سی تو ضائع ہوتا ہی ہے ساتھ ہی کیلشیم بھی تلف ہو جاتا ہے۔ کرم کلا کو جوش دینے سے ۲۰ فی صد کیلشیم اور پریشر کوکر میں پکانے سے ۹ فی صد کیلشیم ضائع ہو جاتا ہے۔ سبزیوں کو پانی میں جوش دینے سے اوسطاً ۲۰ فی صد کیلشیم ضائع ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ پکنے خاص طور سے کھلے برتن میں پکنے سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ ڈھکنے والے برتن میں کھانا تیار کرنے سے یہ نقصان کم کیا جا سکتا ہے۔

ابالنے کے مقابلے میں پریشر کے ذریعے سبزیاں تیار کرنے میں غذائی اجزا کا کم نقصان ہوتا ہے۔ اگر کرم کلا کو پریشر ککر میں تیار کیا جائے تو اس میں ۱۰ فی صد وٹامن سی محفوظ رہتا ہے۔

بھاپ کے ذریعہ کھانا تیار کرنے میں بڑی حد تک غذائی اجزا محفوظ رہتے ہیں۔ بھاپ کے ذریعے کرم کلا کی تیاری میں ۹۰ فی صد وٹامن سی اور ۸۰ فی صد تھائی مائن محفوظ رہتا ہے جبکہ جوش دے کر اسے تیار کرنے سے صرف ۳۰ فی صد وٹامن سی اور ۴۳ فی صد تھائی مائن باقی رہ جاتا ہے۔

تانبے کے مرکبات اور لوہے کے برتنوں وغیرہ کا پھلوں کے اصل بو اور خوشبو پر برا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح جست اور کیڈ میم (ایک قسم کی ایک دھات) کے برتنوں کے بھی مضر اثرات پڑتے ہیں اور جہاں تک ہو سکے ان سے بچا جائے۔

تیار کھانا رکھنا

تیار کھانے کو زیادہ دیر تک رکھنے سے وٹامن سی اور دیگر اجزا تلف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سبزیاں تیار ہونے کے بعد فوراً ہی انھیں کھا لینا چاہیے۔

اگرچہ تیار سبزیاں فرج میں رکھنے سے تغذیہ بخش اجزا کا نقصان کم ہوتا ہے لیکن اگر ایک دفعہ کھا جائے تو کافی نقصان ہو جاتا ہے۔ جب ان سبزیوں کو دوبارہ گرم کیا جاتا ہے تو مزید وٹامن ضائع ہو جاتے ہیں۔

بار بار گرم کرنے سے تیل اور چکنائی کے وٹامن اے اور ڈی ضائع ہو جاتے ہیں لہٰذا بار بار گرم کئے جانے سے گریز کیا جائے۔

دودھ سے پنیر کی تیاری میں چھاچ الگ کر لی جاتی ہے۔ چھاچ میں وٹامن بی کمپلیکس اور کچھ حد تک دودھ کے قابل تحلیل پروٹین کے اجزا نیز کچھ دیگر اجزا ہوتے ہیں اگر چھاچ کو سبزیاں، دالوں اور چاول وغیرہ کی تیاری کے لئے استعمال کیا جائے تو نہ صرف قیمتی اجزا سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے بلکہ ان کی غذائی اہمیت بھی بڑھ جائے گی۔ چھاچ کو پیا بھی جا سکتا ہے۔

الغرض جس غذائی اجزا کو محفوظ رکھنے اور تغذیہ بخش خوراک استعمال کرنے کے لئے ان ہی باتوں کا خاص خیال رکھنا چاہیئے کم درجہ حرارت پر زیادہ دیر تک اور بڑے برتن میں کھانا نہ پکایا جائے سبزیوں کو بہت زیادہ دھونے، بہت زیادہ پکانے اور بہت زیادہ صاف کرنے سے ممکنہ حد تک گریز کیا جائے۔ بہترین سبزی وہی ہے جسے کم از کم کاٹا اور تراشا جائے۔ اپنی خوراک میں جتنے زیادہ سے زیادہ تغذیہ بخش اجزا شامل رکھیں گے اتنی ہی کم خوراک کی ہمیں ضرورت ہوگی۔ اس طرح غذائیت سے بھرپور خوراک بھی حاصل ہوگی اور جسم کو توانائی بھی ملے گی۔

سات حروف
سے قرآنی ترجمہ کی تعلیم

از محمود نیازی

قرآن مجید عربی زبان میں ہے۔ اس کی تلاوت ہی ایمان والوں کے لئے باعث خیر و برکت ہے لیکن اس کے معنی و مطالب کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو عربی زبان پر عبور رکھتا ہو۔ جو لوگ اس کو سمجھ کر پڑھتے ہیں ان کے لئے رہنمائی اور ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"قرآن مجید کی تلاوت شب و روز کیا کرو۔ اور ایسی
جیسا اس کا حق ہے کلام پاک کی اشاعت کرو۔ اس
کو اچھی آواز سے پڑھو اور اس کے معانی میں تدبر کرو
تاکہ تم فلاح کو پہنچو۔ اس کا بدلہ دنیا میں طلب نہ کرو کہ
(آخرت میں) اس کا بڑا اجر و بدلہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے "ہم نے لوگوں کی ہدایت کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے (ضروری) عمدہ مضامین بیان کئے ہیں تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں۔ جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ عربی قرآن ہے جس میں ذرا بھی کجی نہیں۔ تاکہ لوگ ڈریں" (پارہ ۲۳۔ سورۂ زمر۔ رکوع ۱۷)

قرآن مجید کے ان عمدہ مضامین کو دنیا کے تمام ہی مسلمان پڑھ لیتے ہیں کیونکہ ہر ترقی یافتہ زبان میں اس کے ترجمے موجود ہیں مگر اردو بھی قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس میں صرف سات حروف زائد ہیں جن کی وجہ سے قرآن پڑھنے والے بچے اس کا اردو ترجمہ نہیں پڑھ پاتے ہیں۔ ہندوستان میں اور خصوصاً یوپی میں اردو کا رشتہ چونکہ روزی روٹی سے نہیں ہے اس لئے اردو والے بھی اپنے بچوں کو اب اردو نہیں پڑھا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ دینی اور اسلامی مدارس تک تعلیم میں دو علاحدہ علاحدہ خانوں میں بٹی ہوئی ہے جو بچے قرآن پڑھتے ہیں ان کو اردو نہیں پڑھائی جاتی اور اردو مدارس میں قرآنی تعلیم کا انتظام بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کی اکثریت سرکاری اور انگریزی مدارس میں پڑھتی ہے وہ اپنے نصاب کے بوجھ تلے اتنے دبے ہوتے ہیں کہ قرآن پاک اور اردو کے لئے الگ الگ وقت نہیں نکال سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ موجودہ نسل کی اکثریت قرآن تو پڑھ لیتی ہے مگر اس کو سمجھ کر پڑھنے کی سعادت سے محروم ہے۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جس پر مسلمان بچوں کے والدین اور خصوصاً ماؤں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب مسلمان بچوں کو دینی ضرورت سے قرآن پڑھایا جاتا ہے تو اس کی ابتداً "قاعدہ بغدادی" سے ہوتی ہے اس قاعدہ سے عربی کے اٹھائیس حروف کی پہچان کرانے کے بعد ان کے مخارج اور مرکبات کی مشق کرائی جاتی ہے۔

حروف کی حرکت۔ اعراب اور تلفظ سیکھنے کے بعد بچے آسانی سے عربی پڑھنے لگتے ہیں۔ عربی زبان کے تمام حروف تہجی اردو میں بھی بجنسہ موجود ہیں گویا جو بچہ قرآن شریف پڑھنا جانتا ہو وہ اردو کے اٹھائیس حروف سے واقف ہوتا ہے اب باقی رہے اردو کے زائد سات حروف یعنی پ۔ ٹ۔ چ۔ ڈ۔ ڑ۔ ژ اور گ۔ ان ان سات حروف میں تین حروف جن پر ط کا نشان لگا ہے ہندی کے ہیں اور باقی چار فارسی کے ہیں۔ ہندی کے تینوں حرف ٹ۔ ڈ۔ اور ڑ نہ تو مہملہ ہیں اور نہ معجمہ ان پر شناخت کے لئے ط بنانے کا رواج بھی زیادہ قدیم نہیں ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ء تک ان حروف پر ط کی جگہ یہ علامت ـــ بنانے کا رواج تھا چنانچہ فورٹ ولیم کالج کی اکثر کتابوں میں اُٹھنے کو اٹھنے اور بیٹھنے کو بیٹھنے لکھا ہوا ملتا ہے۔ دکنی رسم الخط میں عموداً نقطے لگائے جاتے تھے جیسے ٹ۔ ڈ اور ڑ۔ بہرحال اردو کے یہ سات الفاظ کوئی نئے یا مشکل نہیں ہیں بلکہ عربی حروف کی ہی مختلف شکلیں ہیں۔ قرآن شریف پڑھاتے وقت اگر ان سات زائد حروف کو بھی سکھا دیا جائے تو بچے عربی کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ ان کو صرف اتنا بتانا کافی ہوگا کہ اگر ت کا نقطہ نیچے نہ لگا کر اوپر چھوٹی سی ط بنا دی جائے تو ٹماٹر والی ٹ بن جاتی ہے ان ساتوں حروف کو محض چند گھنٹوں میں آسانی کے ساتھ سمجھایا جا سکتا ہے اور ان حروف کو قاعدہ بغدادی میں شامل کر کے اس کا نام "قاعدہ بغدادی مترجم" رکھا جا سکتا ہے۔ ہم نے بھی اردو حروف تہجی میں بہت سے ایسے الفاظ شامل کر رکھے ہیں جن سے بہت کم واسطہ پڑتا ہے مثلاً ظاکی حرف ژ کو ہی لے لیجئے اردو میں اس کی آواز والے الفاظ کی تعداد ایک سے دو جن

سے زیادہ نہیں ہے جہاں میں ایک لفظ ثقیل و ملت کر چھوڑ کر کوئی بھی عربی لفظ نہیں ہے جو روزمرہ کے استعمال میں آتا ہو مگر صرف چند الفاظ کی خاطر ہم نے اس ثقیل حرف کو اپنے حروفِ تہجی میں شامل کر رکھا ہے۔ اسی طرح ہم زیادہ دینی مصلحت کی خاطر اردو کے سات زائد حروف کو عربی قاعدے میں شامل کر سکتے ہیں تاکہ بچے قرآن کے ساتھ اس کے معنی اور مفاہیم سے بھی واقف ہو جائیں اس طرح ہر مسلمان بچہ کو قرآن کی تعلیم کے ساتھ خود بخود اردو رسم الخط سے بھی واقفیت ہو جائے گی۔

درحقیقت قرآن شریف اور اس کے مطالب کے درمیان حروف زائد کے سات پردے حائل ہیں جو بظاہر تو سات پہاڑوں کی اوٹ معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ پردے ہٹنے کے بعد پہاڑوں کی یہ اوٹ تل کے برابر بھی نہ رہے گی۔

عربی اور اردو رسم الخطوں کے اس فرق سے سب ہی لوگ واقف ہیں مگر قرآن اور اس کے ترجمہ کو ایک ساتھ پڑھنے کا یہ طریقہ تل اوٹ پہاڑ کے مصداق ہے۔ بات بہت معمولی سی ہے اگر اس سے پہلے اس طرف توجہ دی جاتی تو ہماری نئی نسل اردو سے اتنی اجنبی نہ ہوتی۔ گزشتہ عید الضحیٰ کے موقع پر میں کسی کام سے رامپور گیا تھا وہاں بغرض تعزیت عرشی صاحب مرحوم کے یہاں بھی جانا ہوا۔ دورانِ گفتگو عرشی زادہ اکبر علی خاں صاحب نے مجھے اس انوکھے اور مفید طریقۂ تعلیم کے متعلق بتایا۔ عرشی زادہ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے کمزور طبیعت کے پڑھے ۹ سالہ لڑکے (میاں حسّان سلمہ) کو یہ سات حروف سکھا کر محض چند گھنٹوں میں اردو پڑھنا سکھا دیا تھا۔ اس لڑکے کی یہ ذہانت تھی کہ ایک دن میں ہی اس نے اپنے چچا کے نام اردو میں ایک خط بھی لکھا تھا جو مفرد حروف میں ہوتے ہوئے بھی سمجھ میں آ رہا ہے۔ اس خط کا عکس ملاحظہ ہو۔

پ ی ا ر ی اچ ھ ے چ چ ا س ل ا م ی ہ ا پ ر ہ م ل و گ خ ی ر ی ت
س ے ہ ی ں و ہ ا پ ر ا پ ب ھ ی خ ی ر ی ت س ے ہ و گ ے ا پ
ک ی ٹ ی و ن س ج ا ن ے ک ی خ ب ر آ گ ئ ی ہ ے ا پ ک ی
ٹ ی و ن س ج ا ن ے ک ی خ ب ر س ن ک ر ا م ا ں ا و ر ا ب ا
ب ہ ت خ و ش ہ و ئ ے ج ب ا پ ج ا ر ہ ے ت ھ ے ت و ہ م س ے
م ل ک ر ن ہ ی ں گ ئ ے ف ق ط

اصل عبارت

پیارے اچھے چچا۔ سلام یہاں پر ہم لوگ خیریت سے ہیں۔ وہاں آپ بھی خیریت سے ہوں گے۔ آپ کی ٹیونس جانے کی خبر آ گئی ہے۔ آپ کی ٹیونس جانے کی خبر سن کر اماں اور ابا بہت خوش ہوئے جب آپ جا رہے تھے تو ہم سے مل کر نہیں گئے۔

فقط حسّان

اس خط میں حسّان سلمہٗ نے مفرد حروف کا استعمال کر کے کہیں کہیں اعراب بالحروف سے کام لینے یا بعض جگہ خود اپنا املا ایجاد کیا ہے مگر خط سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے وہ کہنا کیا چاہتا ہے یہ کامیابی محض دو ڈھائی گھنٹے کی مشق کا کرشمہ تھی۔ اپنا نام اس نے صحیح لکھا کیونکہ وہ اس کے املا سے واقف تھا عرشی زادہ صاحب نے اسی دن اپنے بچپن کی رکھی ہوئی ایک دلچسپ کہانی "چیلا بلا" اس سے پڑھوانی شروع کر دی۔ شروع میں وہ اسے اٹک اٹک کر پڑھتا رہا مگر دوسرے دن سے فر فر پڑھنے لگا اس کے بعد اردو کی آسان عبارتیں اس سے نقل کرائی گئیں۔ آج وہ بچہ قرآن مجید کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی بلا تکلف پڑھ لیتا ہے۔ اور روانی سے اردو لکھ سکتا ہے۔

قرآن مجید کی تعلیم کے ساتھ اس کا ترجمہ پڑھنے کی مشق بھی کرائیں اس کی برکت سے اردو کا قدیم مسئلہ بھی چٹکی بجاتے حل ہو جائے گا۔ عرشی زادہ صاحب سے بھی درخواست ہے کہ وہ اس عجیب و انوکھے طریقۂ تعلیم کو پھیلانے اور فروغ دینے میں غیر معمولی دلچسپی لیں ـــــ اردو دنیا پر ان کا یہ کوئی خاص احسان نہیں ہوگا کیونکہ وہ ماہر غالبیات، علامۂ عصر اور بلند پایہ ادیب و مصنف حضرت امتیاز علی خاں صاحب عرشی کے جس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اس کا یہی منصب تھا۔

جزاک اللہ فی الدارین خیرا

مرسلہ محمود نیازی۔ محلہ قاضی زادگان چاندپور (ضلع بجنور)

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تک پھر آئے سب لوگ
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے

اختر

چکر

فرخندہ شمیم

تب وہ ایک لڑکی تھی، سادہ، پُرخلوص، الہڑ سی اٹھارہ انیس سال کی، ایک چھوٹی بہن اور بھی تھی، سترھویں سال میں قدم رکھ رہی تھی۔ ماں باپ کے بالوں کی سیاہی اولاد کی چمکیلی لٹوں میں اتر آئی تھی۔

باپ بیمار و ضعیف تھا، سارا دن بستر پہ پڑا کھانسا کرتا۔ بیٹیاں جوان ہو جائیں تو باپ بڑھاپے سے پہلے ہی ریٹائر ہو جاتے ہیں، غریب کے جھونپڑے میں تو بیٹیاں بڑھتی بھی بہت تیزی سے ہیں، تبھی تو بیٹیوں کا پہاڑ سا بوجھ سے زمین میں دھنس کے جاتا.... ماں جھکی کمر لئے گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتی رہتی، کبھی جھاڑو دے ڈالی، دھلے برتن اٹھا کر ٹھکانے لگا دیئے، فارغ وقت میں پوتے پوتیوں کو بہلانے لگی کبھی ان کے پوتڑے نلکے کے نیچے دھو دیئے... دو جوان بیٹوں کی شادی چند سال پہلے کر چکی تھی، بہوئیں زندگی بن کر آنگن میں اتریں تو وہ کھل اٹھی۔ سوکھے دھان پانی پڑ گیا.... بیٹوں کو خوش دیکھ کر نہال نہال ہو پڑتی..... اور اسی خوشی میں وہ سب کام بھی گزرتی جو بہوؤں کے فرائض میں شامل تھے۔

"اماں یہ تو صبح ہی صبح اٹھ کے ننھی گڈو کے پوتڑے کیوں دھونے لگتی ہے، بھابیاں خود دھو لیں گی" آخر ایک دن اس نے ماں سے کہہ ہی دیا۔ "چپ رہ کم بخت، بھاوج نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا" ماں دانت کچکچائی۔

"لیکن ماں یہ کوئی بات ہوئی کہ تو..." لیکن اس سے پہلے کہ مزید کچھ کہتی۔ ماں نے ایک دو تھپڑ جڑ دیا۔ "چل جا دفعان ہو، آئی نصیحت کرنے والی" بڑی بہو کو سامنے سے آتا دیکھ کر ماں نے اسے دھتکار دیا۔

"کیوں ڈانٹ رہی ہو بے چاری کو اماں" بہو نے حمایت کی۔

"بس یونہی منہ پھٹ ہوئی جاتی ہے، اتنی بڑی ہو کر چار آٹھ آنے ہر وقت مانگتی رہتی ہے" ماں نے جلدی سے بات بنا دی۔

"اچھا اچھا" بہو نے کچھ اور نہ کہا۔ "اماں جب تم کپڑے دھو چکو تو ذرا ابو کی قمیض کے بٹن ٹانک دینا، یا کبھی [illegible]"

وہ چارپائی پر اوندھی پڑی بلک بلک کر رو رہی تھی، نہ جانے کب اماں اس کے بالوں میں انگلیاں ڈالنے لگی۔ بسورتے ہوئے اس نے کروٹ بدل لی۔ "دیکھ رانو میری بیٹی، مجھے پتہ ہے تو میری جائز حمایت کرتی ہے۔ تیری تکلیف کا احساس ہے مجھے، لیکن جیدا تجھے یہ پتہ نہیں شاید کہ میں تو، تیری بہن اور تیرا باپ تیرے بھائی بھاوج ہی کے محتاج ہیں، ہمیں ان سے بنا کے رکھنا ہے، کیا پتہ کس وقت یہ ہمیں باہر نکال دیں" ماں کی آنکھوں سے حسرت و کرب مل جل کے ہویدا تھے۔

"کیوں اماں ہم کھاتے ہیں کیا کسی کا، ہمارا باپ زندہ ہے ابھی، اس کی پنشن آتی ہے گھر میں" وہ تفاخر سے تن گئی۔

"پاگل ہے تو بھی ہاری بے وقوف تیرے باپ کی پنشن سے ہی کتنی مشکل سے مکان کا کرایہ نکلتا ہے" اس سے ماں بولی۔

"لیکن اماں بھائیوں کو بھی تو ابا نے ہی اس قابل بنایا ہے نا" اس نے پھر دلیل پیش کی۔

"یہ بات نہ کر بیٹی، ایسا سوچنا زمین پہ رہ کے آسمان کے تارے توڑ لانے کی خواہش کے برابر ہے" ماں کے لہجے سے کرب مترشح تھا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پٹپٹاتی رہ گئی۔ "دیکھ رانی، اپنی بھاوجوں اور بھائیوں کی خدمت کیا کر، اسی میں تیری اور ہم سب کی بھلائی ہے" ماں نے اسے سمجھایا تو وہ پھوٹ پڑی۔

"میں کوئی لونڈی ہوں جو خدمت کروں۔ سب کی ماں کبھی تو ساس بن کر بیٹھی آیا کرو، ہوش ٹھکانے آجائیں گے" وہ بھاوجوں کے کمروں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"ساس بن کے تبھی دکھا سکتی ہوں پاگل لڑکی جب گھر کی ملکیت و تحفظ مجھے اور مجھے اپنے سائے میں لینے والا ہو یا چار پیسے پاس ہوں تو اہمیت جتانے والی بھی ٹھہروں" ماں تلخی سے بولیں اور وہ ماں کی شکن شکن آنکھوں کو گھورتی جانے کیا سوچتی رہ گئی۔

بڑی بھاوج نے ننھی کے فراک سینے کے لئے اسے دیئے تو وہ تو بوری سے بیٹھ ہی گئی۔ اپنی طرف سے درست سلائی کر رہی تھی۔ محنت اور لگن سے یہ کاوش بھاوج کو گوارا نہ ہوئی۔ اس نے مذاق اڑانا شروع کیا پھر اڑاتی چلی گئی۔

وہ تلملا کے رہ گئی۔ "بھابی کیا ہوا اگر کچھ غلط ہو گیا، پھر ٹھیک کردوں گی" مگر بھابی کے ہونٹوں سے مضحکہ الگ نہ ہوا۔ وہ اور بھی بل کھا گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ کچھ اور کہتی، ماں کی شعلہ بار نگاہوں سے سہم گئی۔... لیکن بھاوج کی طرف سے دل میں گرہ پڑ جانا فطری امر تھا۔ وہ اس سے کھچی کھچی رہنے لگی۔ آخر ماں نے ہی پوچھ ڈالا "اپنی بھاوج سے کھچی کھچی کیوں رہتی ہے تو؟" اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ماں کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "تمہیں نہیں پتہ ماں؟" اور پھر ماں نے سب کے بیچ اسے پھٹکارنا شروع کر دیا..... واقعہ سن کر بھائی کی بھنوئیں تن گئیں۔ موردِ الزام بہن ہی کو ٹھہرانا تھا۔ کیوں اس نے بھاوج کے ساتھ بدکلامی کی ہے۔

وقت تیزی سے گذرتا گیا۔ پھر وہ کسی کی بیوی بن گئی۔ ایک اور روپ عورت کا، عورت جو نصف بہتر کہلاتی ہے۔ شوہر کی مفاہمت کبھی اسکے ساتھ نہ ہو سکی۔ وہ اسے اسکی جہالت اور طراری کا طعنہ دیتا۔ کہا کرتا "شکر کر جو تجھ جیسی تنک مزاج کو نبھا رہا ہوں۔ ورنہ اس دنیا میں کوئی مرد ایسا نہیں جو تیری بیساکھیاں بننے پر تیار ہوتا۔ سارا دن مزدوری کر کے تیرے پیٹ کا دوزخ بھرتا ہوں اور تیرے مزاج ہی نہیں ملتے۔" وہ خونخوار لہجے میں بولا...

وہ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ "کیا میں بے وصف ہستی ہوں، کیا مجھ میں کوئی خوبی نہیں؟" "میں شوہر کے ساتھ اسی وقت تو غصہ کرتی ہوں جب وہ ذرا ذرا سی بات پر مجھے جوتے لگانے، ہتھا مارنے لگتا ہے۔ سالن میں نمک مرچ کم زیادہ ہو جائے تو کھانا باہر پھینک دیتا ہے، رزق کی بے حرمتی کرتا ہے۔ مجھے اپنی لونڈی سمجھتا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کبھی نہیں!" وہ پھر غیظ کی جولانیوں پر تھی.... مگر اس کی پکار سننے والا تو کب کا باہر جا چکا تھا۔

وہ اماں سے ملنے شہر آ رہی تھی۔ بس میں ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ایک فیشن ایبل باوقار خاتون کو پلکیں جھپک جھپک کر دیکھ رہی تھی۔ خاتون اس کی اس ادا پر کئی بار مسکرا کے اس کی طرف دیکھ چکی تھیں اور پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ کدھر سے آئی ہو، کہاں جا رہی ہو، کیا کرتی ہو وغیرہ وغیرہ سے بات بڑھتی ہی گئی۔ اسے معلوم ہوا فیشن ایبل خاتون ایک دفتر میں ملازمت کرتی تھیں۔

"آپ نوکری کرتی ہیں؟" وہ حیرت و مسرت سے چیخی۔

"ہاں" خاتون نے جیسے یقین دلایا۔

"پھر تو آپ کا گھر والا آپ کی بہت عزت کرتا ہوگا" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ خاتون نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تمہارا گھر والا تمہاری عزت نہیں کرتا؟" کچھ سمجھتے ہوئے خاتون نے آہستگی سے پوچھا۔

"نہیں" وہ بجھ گئی۔ "وہ مجھے ان پڑھ ہونے کا طعنہ دیتا ہے۔" وہ دکھ سے بولی پھر اچانک ہی پر امید لہجے میں بولی "آپ تو پڑھی لکھی ہیں تبھی تو نوکری کرتی ہیں۔ جب آپ اسے پیسے دیتی ہوں گی تو وہ کیسی عزت کرتا ہوگا آپ کی" وہ رشک سے بولی۔

"نہیں" خاتون کا لہجہ ایک دم سپاٹ ہو گیا۔ "میرے شوہر نے مجھے آج تک برابری کا درجہ نہیں دیا۔ میں تنخواہ لاتی ہوں تو شکر کا اظہار نہیں کرتا.... کسی کام میں دیر ہو جائے تو منہ پھوڑ کر کہہ دیتا ہے۔ نوکری کرتی ہو تو مجھ پر احسان نہیں دھرتیں۔ اپنے ہی بچوں کے لئے کر رہی ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ میرا سہارا بن گئی ہو۔ میں اپاہج نہیں کہ میری بیساکھیاں بننا چاہتی ہو" خاتون بڑی تلخی سے بول رہی تھیں..... وہ حیران رہ گئی اور ٹکر ٹکر خاتون کو دیکھتی چلی گئی۔ بیساکھیاں بیساکھیاں، یہ لفظ بار بار ذہن سے ٹکرانے لگا!!

اور پھر اس کے بیٹے جوان ہو گئے، اس نے ان کی شادی کر دی۔ بہوئیں آئیں تو اچانک اسے احساس ہوا بہوؤں اور اس کی بھاوجوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ وہ دونوں بھی بھاوجوں کی طرح آرام طلب اور سہل پسند تھیں۔ وہ جب تب ان کے کام بھی کر دیا کرتی..... ایک شام اس کی اکلوتی بیٹی بھتیجے بھتیجیوں کو لئے بیٹھی تھی کہ اچانک [illegible] گلدان بہو کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر آ رہا۔ چھن کی آواز سے بیٹا دوڑا دوڑا آیا اور اپنے بچوں کے بجائے بہن کو پھٹکارنے لگا۔

"بھیا میں نے نہیں توڑا" بہن رو دینے کو تھی۔

"خاموش بدتمیز، بھائی کے ساتھ سوال جواب کرتی ہے" اس نے خود اپنی آنکھوں سے بہو کے ہاتھوں گلدان ٹوٹتے دیکھا تھا لیکن ڈانٹ ڈپٹ بیٹی کو کر رہا تھا۔ بھائی غصے سے غراتا اپنے کمرے میں گیا تو وہ مجبور نگاہوں سے بیٹی کو دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو "کیا کرتی میری جندا، تیرا نام نہ لیتی تو تیرا بھائی اپنے بچوں کو پیٹتا۔ دوسرے کمرے سے تیری بھاوج پھٹکارتی باہر نکلتی اور پورے گھر کو صلواتیں سناتی پھر اپنے ہی بچوں کو مارتی۔ اور مسئلہ بڑھ جاتا" اس کی نمدیدہ چھلکتی آنکھوں کی زبانی اس نے سب کچھ کہہ دیا لیکن بچی تو کچھ بھی سمجھ

دبانی تھی!!

بشیرے کی طبیعت شروع سے تند تھی، بڈھا ہو گیا تھا۔ بستر پر پڑا رہتا... تند طبیعت کے ہاتھوں اکثر پوتے پوتیوں کو غل کرنے پر جھڑک دیتا۔ بیٹیوں کی کاہلی پر کچھ نہ کچھ کہہ جاتا، بہوؤں کی آرام طلبی پر کڑھا کرتا تو بیٹے کھا جانے والی نظروں سے اُسے گھورنے لگتے۔ وہ سب کچھ محسوس کرتی اور چپ رہتی۔ ہاں جب ضبط گریہ انتہا کو پہنچ جاتا تو بشیرے پر ہی بگڑ پڑتی: تم خاموش نہیں رہ سکتے ہر وقت بولے ہی جاتے ہو پھر بڑے خالی خالی سے بیٹھ کر کہتی: دیکھ بیٹوں سے بگاڑ نہ کر۔ یہ ہماری بیساکھیاں ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی ہی سہی، موجود تو ہیں نا۔ اور بشیرا اس کی بات سمجھتے ہوئے آنکھوں کی نمی پونچھ لیتا۔

حنا کو اپنی ماں یاد آجاتی۔ ٹھیک ہی تو کہا کرتی تھی۔ واقعی یہ ایک چکر ہے جو شاید ہر گھر میں چلتا رہتا ہوگا۔ اس وقت ماں کی باتیں مجھے بڑی لگتی تھیں، لیکن اب میں سوچتی ہوں کہ مصلحت کا یہی تقاضا تھا۔ میں بھی مجبور ہوں اور یقین ہے میری بیٹی بھی ایسا ہی کرنے پر مجبور ہوگی۔

نئی ناولیں

زندگی	رضیہ بٹ	۳۲/-
بے نام	سلمیٰ کنول	۳۵/-
شاید کہ بہار آئی	شمع قاضی	۱۵/-
برات	مینا ناز	۲۵/-
سپنے کب اپنے	فرخندہ شمیم	۲۴/-
غم کے سائے	بیگم محمودہ شیر	۳۵/-
زرد چاندنی	عقیلہ ہما	۳۰/-
لرزتے آنسو	گلشن نندہ	۳۶/-
بہتے آنسو	صادق دبیر	۳۶/-

بچوں کی سی سادہ زبان میں تحریر یہ ناول کسی بھی انسان کے دل میں پیار جگائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جب پیڑ ظلم بن جکا ہے **شدھارتھ** ترجمہ یعقوب یاور ۱۰/-

چند اور پاکستانی ناول

ثمینہ	رضیہ بٹ	۱۸/-
ناجیہ	〃	۲۵/-
بے مثال	سلمیٰ کنول	۳۰/-
سنگسار	〃	۴۰/-
معشا	زرینہ ضمیر	۱۰/-
شہیلا	بدر انجم خاتون	۲۴/-
پیاس کا صحرا	پروین شریف	۳۰/-
یادوں کے نقوش	سعدیہ ناز	۲۵/-
شیریں	ثریا محمود ندرت	۱۲/-
گورے کالے لوگ	مینا ناز	۲۰/-
آبرو	حمیدہ جبیں	۳۰/-
امامہ	یاسمین صوفی	۲۳/-
نیرا	شمیمہ نقوی	۲۳/-

لطیفے

• ایک انشورنس ایجنٹ کو آپریشن کے لئے ہسپتال لایا گیا... ڈاکٹر اسے فوراً آپریشن تھیٹر میں لے گئے تو اس کی بیوی باہر انتظار کرنے لگی۔

کافی دیر کے بعد جب ڈاکٹر باہر نکلے تو خاتون نے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب! آپریشن ہو گیا... ؟

- نہیں: ڈاکٹر بولا۔

خاتون نے پھر پوچھا... تو کیا ابھی ہونا ہے...؟

• نہیں: ڈاکٹر نے پھر کہا۔

خاتون نے جھنجھلا کر کہا تو پھر آپ دو گھنٹے آپریشن روم میں کیا کرتے رہے؟

ڈاکٹر بولا: بی بی... ان دو گھنٹوں میں تمہارا شوہر مجھے بیمے کے فائدے بتاتا رہا... اور بیمہ کروانے کے لئے اصرار کرتا رہا۔

خاتون بولی... پھر اب کیا ہوگا... ڈاکٹر صاحب!؟ ہو گیا ہے؟ ... خاتون تمہارا شوہر مرنے سے پہلے میرا بیمہ کر گیا۔

سولہ برس بعد

از ڈاکٹر یٰسین رضوی

اس کی آنکھوں میں فرعون کے دربار یوں کا سا جادو تھا اور ان جادو بھری آنکھوں میں رگِ گل کے سے جھلملاتے سرخ ڈوروں میں مصر کے اکلوتے دریا کی نیلگوں لہروں، مریم کی معصومیت اور عظیم مغل خاتون ممتاز بیگم کی تمکنت کا نایاب امتزاج موجود تھا۔ اس کے سرخ، نازک اور خاموش ہونٹوں پر فانی کی شاعری، خیام کی رباعیوں اور شمس تبریزی کی مقدس غزلوں کا رنگ نمایاں تھا اور اس کے چہرہ پر بیک وقت ساسانی بادشاہوں کا جلال اور برمکی وزیروں کی ذہانت اس طرح رقص کرتی تھیں جیسے امیر خسرو کی نعتیہ غزلیں سن کر سماع کی کیفیت میں صوفی۔ !! اس نے اپنے سفید، گورے، چٹے بدن پر سیاہ زلفوں کی بارات اس طرح منعقد کی تھی جیسے ہمالیہ کی برف پوش چوٹی اچانک سیاہ بادلوں میں چھپ گئی ہو۔

اس کا جسم جتنا خوبصورت تھا اتنا ہی اس کا ذہن و شعور حسین تھا۔ لباس پہننے، بات کرنے اور محفل میں ہر ایک کی توجہ اپنے عظیم ذوق کی طرف مبذول کرنے میں اسے قیامت کی مہارت حاصل تھی وہ جب مسکراتی تو بیری کائنات تھم جاتی اور جب اس کے چہرے پر سنجیدگی کی کیفیت [illegible] کی سرخی میں اضافہ ہو جاتا۔

اس کا نام گل تھا۔ بچپن میں اس کی چھوٹی بہن اسے پیار سے پھول کہتی مگر جب گل تعلیم حاصل کر کے عملی زندگی میں داخل ہوئی تو اس نے پھول کو گل میں بدل دیا۔ اور اس طرح گلاب کی خوبصورت پتیاں ہمیشہ کے لئے تر و تازہ ہو گئیں۔ سیرِ چمن کے دوران یوں محسوس ہوتا کہ باغ میں کھلا ہوا ہر پھول گل کے لئے سراپا سپاس بنا ہوا ہے جس نے خود کو گل کہلا کر پھولوں کو فخر اور عظمت کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔

گل نے ہزاروں پرستار، پجاری اور مدح خوان قدر دان سے اپنے حسن اور ذوقِ لباس کی سوغات میں پائے تھے اور یہ پرستار ہر قدم پر اپنا دل، نگاہیں اور شعور کی نازک ترین دھڑکنیں پوری جانبازی سے گل پر نثار کرنے کے گویا عادی ہو چکے تھے۔ وہ جب صبح صبح کالج جانے کے لئے اپنے ابو کے ساتھ۔ اور کبھی کبھی اکیلی بس سٹاپ کی طرف روانہ ہوتی تو راستے بھر اپنے حسن کی تجلیاں بکھیرتی جاتی اور دیدار کے مشتاقوں کی جھولیوں میں نظاروں اور جلوؤں کی بھیک ڈالتی چلی جاتی

گل کو کسی نے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا تھا مگر سب کو اسکے قیامت خیز تبسم کی رعنائیوں کا اندازہ ضرور تھا۔ وہ جب اپنی طویل، شب ہجر کی سی۔ زہریلے سانپ جیسی لہراتی اور باغِ بہشت کے پھولوں کے عطر میں بسی زلفیں سلیقے سے اپنے روپ پر سجائے، ریشمی شلوار قمیض اور لباس سے ملتے جلتے رنگ کے دوپٹے میں بن سج اپنی پالکی پر آتی تو گلی میں بیک وقت کئی کئی پجاریوں کو آدابِ عبادت بجا لاتے۔ مگر وہ سومنات کے مندر میں سجی ہوئی پتھر روپ دیوی کی طرح انتہائی سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہاں سے ہٹ جاتی۔

ابھی گل کی تعلیم مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے رشتے آنے شروع ہو گئے۔ اس کے چاہنے والوں میں تو ہر قسم کے پجاری تھے مگر اس کے من مندر میں بسنے اور جیون ساتھی بننے کی پیش کش لانے کی تاب صرف گنے چنے دولت والوں میں تھی اور یوں لگتا تھا کہ لوگوں کی خوشبوؤں میں جینے والے ہر قیمت پر گل کے حسن کی زرد، سرخ، سیاہ سبز اور روپہلی خوشبو کو اپنے گھروں میں بسا لینے کے لئے بے چین رہتے۔

جب گل کا رشتہ آتا اور بات ذرا آگے بڑھتی تو شہباز بے چین ہو جاتا۔ شہباز اس کا استاد ہی نہیں بلکہ اس کا پجاری بھی تھا مگر ایک غریب سکول ٹیچر، ایک بے بضاعت ٹیوٹر اور ایک عام محنت کے لڑکوں کی حیثیت سے اس نے اپنے عشق کی آگ کو دل کے اندر سلگا کر خود اس میں بھسم ہو جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ اس کو یہ تو منظور تھا کہ اس کی اپنی چتا جلائی جائے اس کے پجاری من کو راکھ کر دے مگر اس سے

یہ ہرگز برداشت نہ ہوتا کہ گل یا اس کے گھر والے اس کی غربت کو بہانا بنا کر اس کے ارمانوں کو روند ڈالیں

شہباز سماج کی کھڑی کی ہوئی بے حد مضبوط دیواروں اور عشق کے مقدس راستے میں حائل ریت کے ٹیلوں کی اصل ماہیت سے واقف تھا۔ قدرت نے اسے جیبوں میں کھنکنے والی اور بنکوں میں پلنے والی دولت سے تو محروم رکھا تھا مگر اسے علم کی دولت میں بے پناہ اضافہ کرنے کی استعداد جی کھول کر بخشی تھی۔ وہ صبح سویرے کرائے کی سائیکل پر اسکول جاتا۔ واپسی پر ٹیوشن پڑھاتا، شام کو اپنے مقدس عشق کی بارگاہ میں حاضری دیتا اور پھر رات گئے اپنے امتحان کی تیاری کرتا رہتا۔

رات گئے اسے پڑھتے پڑھتے اکثر یوں لگتا جیسے پوری کتاب پر گل کی پھولوں جیسی شکل ابھر آئی ہو اور اچانک اس شکل کو زبان مل گئی ہو، وہ گھنٹوں گل سے باتیں کرتا۔ اس کی شان میں قصیدے پڑھتا اور اس کی زلفوں، ہونٹوں، آنکھوں، نگاہوں، رخساروں اور گلابی ناخنوں کے بارے میں خوبصورت شعر سناتا۔ ایک روز اس نے کتاب پر ابھری ہوئی شکل کی طرف پیار سے دیکھا اور دل کی بات گل سے کہہ دی "گل میں تمہارا پجاری ہوں"۔

یہ سنتے ہی گل کی شکل کتاب سے غائب ہو گئی اور چار مقالے کے سیاہ حروف ابھر آئے۔ شہباز نے غور سے دیکھا تو علم و ادب کے فضائل کا باب اس کے سامنے تھا۔ اس پہلے باب میں "دبیر" یا اتالیق کے مقام پر بحث کی گئی تھی۔

شہباز کو یوں لگا کہ گل اس سے ناراض ہو گئی ہے پھر اس نے سوچا کہ اگر اسی طرح کسی روز میں نے سچ مچ دل کا راز گل سے کہہ دیا تو سماج کی مضبوط دیواریں مجھے کچل دیں گی۔ اور پھر میں اس سعادت سے بھی محروم نہ ہو جاؤں گا جو مجھے ہر روز دو گھنٹے گل کے بالکل آمنے سامنے بیٹھ کر اور اس کے سانسوں کی گرمی محسوس کر کے حاصل ہوتی ہے۔ گل کی بارگاہ میں روزانہ حاضری ہی تو شہباز کی زندگی کی اصل دولت تھی۔

کبھی کبھی شہباز کو گل کے سینے میں عشق کی چنگاری سلگتی محسوس ہوتی مگر وہ اس کو خوش بازی، یا خوش فہمی سمجھ کر پوری ذمہ داری سے نظر انداز کر دیا کرتا تھا۔ شہباز نے کئی بار گل کے قدموں پر پڑے ہونٹ لگائے تھے۔ اس وقت وہ گل کا استاد نہیں، پجاری ہوتا تھا۔ گل نے پہلی بار شہباز کی قدم بوسی پر ظاہرہ طور سے ناراضگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ مگر اس کے ایک پجاری کی طرف سے عقیدت کے والہانہ اور بھرپور اظہار کی علامت کے طور پر اس قدم بوسی کو قبول کر لیا تھا اور اس طرح گل کے قدموں پر جھک کر گاہے گاہے عقیدت بھرے ہونٹ پیش کرنا شہباز کا معمول بن گیا تھا۔

ایک عجیب سی بے چینی اور انجانی سی تشویش شہباز کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ نہ تو اپنے عشق کا راز گل کو سنا کر اس کی قربت سے محروم ہونے کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ اور نہ ہی اس طرح گل کے رشتے آتا دیکھ سکتا تھا۔ اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ وہ اپنے دل کی بازی شروع کرنے سے پہلے ہی ہار چکا ہے اور اسی احساس شکست نے اس کی زبان پر لگے ہوئے تالوں کو مصلحت کا زنگ لگا رکھا تھا۔

پھر شہباز نے قسمت سے ایک بڑا جوا کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ کچھ بن کر اپنی گل سے زندگی کے ساتھ کی بھیک مانگنا چاہتا تھا اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے ان دولت مندوں کے مقابل کھڑا ہو جائے جن کو اپنے بنگلوں، کاروں اور جھلملاتی زندگی کا پارا تھا۔ اس مقصد کے لئے شہباز کو گل سے طویل جدائی برداشت کرنی تھی اور یہ خطرہ بھی مول لینا تھا کہ اس کی واپسی تک گل کسی اور کی نہ ہو جائے۔

یہ ایک ہولناک اور پرخطر قمار تھا۔ شہباز ایک حسین مستقبل، گل کی پلکوں تلے زندگی گزارنے کی امید اور جیون بھر گل کے گرم سانس محسوس کرتے رہنے کی آس میں وطن سے روانہ ہو گیا۔ ایک غیر ملکی یونیورسٹی سے ادب کی اعلیٰ ترین ڈگری حاصل کر کے وہ اکیس ماہ بعد ہی وطن واپس آ گیا مگر گل ہمیشہ کے لئے اس محلے سے جا چکی تھی۔ سب یہی کہتے تھے کہ وہ اسی شہر میں کہیں دور جا بسی ہے۔

اس نے گلی گلی، کوچے کوچے گل کو تلاش کیا اور آخرکار گل کے سابق ہمسائے سے یہ سن کر اپنی تلاش ترک کر دی کہ گل کے ہاتھ پیلے ہو چکے ہیں اور وہ حجلۂ عروسی میں کسی اور کی باہوں میں سمٹ کر دوسروں کو کائنات کا سب سے خوش بخت اور سعادت مند انسان بنا چکی ہے۔ اس کے بعد شہباز نے اپنی پلکوں پر گل کی یادوں کے چراغ ہمیشہ کے لئے منعقد کر لئے اور گل کا شہر چھوڑ کر کراچی کی روشنیوں میں گم ہو گیا۔

ایک دو اور پھر پورے سولہ برس گزر گئے۔ شہباز کے تصور میں گل ابھی

ہوئی تھی جو ایک مصروف گھر کی ملکہ، ایک دل کی مالک، چند خوبصورت ذہین اور شرارتی شہزادوں کی ماں اور ایک کنبے کا سرمایۂ افتخار بن چکی ہو۔ وہ یہ سب کچھ سوچ کر اپنے جوئے پر افسوس کرتا لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ یہ جوا کھیلے بغیر بھی تو گل اس کی نہیں بن سکتی تھی۔ ساتھ ہی وہ گل کی مسکراتی اور کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے بھی دعا کرتا۔

شہباز نے زندگی کے حسین اور خوبصورت پہلوؤں پر نظر رکھ کر میر تقی میر کی سی قنوطیت اور یاس سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ وہ سوچ کر خوشی سے جھوم اٹھتا کہ گل کے تصور نے اس کو اعلیٰ تعلیم اور ایک شاندار مستقبل سے ہمکنار کر دیا ہے اور سوچتے ہی وہ گل کو اپنے سامنے کھڑے پاتا۔ بالکل اس طرح جیسے کہ گل اس سے دلی شکریہ وصول کرنے آئی ہو۔ مسکراتی، لجاتی اس کی اپنی گل۔!!

ایک روز شہباز نے گل کے شہر میں ایک ادبی محفل میں شرکت کی۔ وہاں سفید ساڑی میں ملبوس ایک خوبصورت دوشیزہ اسر پر زلفوں کی سیاہ مجلس جمائے، ہونٹوں پر شیراز کی شراب سرخ ملے اور آنکھوں میں برکھا رُت کا بہروپ بھرے موجود تھی۔ یہ گل تھی۔ سولہ سال پہلے کی طرح نازک، چھلاتی اور اپنی قیامت خیز بھیک مانگتی ہوئی گل!!

شہباز خواب دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ اسے خواب میں گل کے چرنوں میں گذارے ہوئے لمحے بار بار نظر آتے تھے اور وہ سمجھا کہ ایک اور خوبصورت خواب اس کے شعور و ادراک کی جھولی میں آگرا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور گل سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا: "آپ تو بالکل ہی بھول گئی ہوں گی مجھے!" گل نے ذہن پر بوجھ ڈالا اور چونک کر بولی: "آپ شہباز ہیں نا؟ اسے اتنے عرصے میں آپ کس قدر بدل گئے ہیں۔ یہ سر میں بالوں کی سفیدی، چہرے پر بڑھاپے کی شروع ہوتی لکیریں، نگاہوں میں ٹھہراؤ کی کیفیت اور لہجے میں بڑوں کی سی سنجیدگی۔!"

شہباز واقعی اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے عشق پر پوری زندگی تج دی تھی اور وہ پھر بھی گل کی نرم اور ریشم جیسی آغوش سے محروم رہا تھا۔ گل پہلے کی طرح تازہ، جوان اور حسین تھی مگر وہ خود اپنی عمر سے دس سال آگے نکل چکا تھا۔ گل سے باتیں کر کے شہباز کو علم ہوا کہ وہ کسی کالج میں لیکچرار ہے اور گذشتہ سولہ برس میں ذہانت کی طویل شاہراہ کے کئی سنگ میل طے کر چکی ہے۔ وہ اب صرف ایک حسین خوش لباس اور خوبصورت دوشیزہ ہی نہیں تھی بلکہ بے پناہ علمی لیاقت بھی اس کی زندگی کا دائمی حصہ بن چکی ہے۔ ذہانت اور علمی بحث کی پہلی پہلی اینٹیں تو شہباز نے ہی اپنے ہاتھ سے جمائی تھیں، اور یہ سوچتے ہی شہباز کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔

شہباز نے گل کی طرف دیکھا تو اسے لگا کہ اس کے ستم زدہ چہرے اور دیمک کے کھائے ہوئے وجود کا جائزہ لے رہی ہے۔ شہباز نے سوچا کہ اس حسین آسمانی مخلوق سے دل کا راز سولہ سال بعد بتانا اور پھر اس سے جیون ساتھ کی بھیک مانگنا کسی بھی صورت میں صحیح نہ ہوگا۔ اس حسین لڑکی کا حق یہ ہے کہ یہ کسی جوان، جذبات بھرے، شکیل اور وجیہہ شخص کی باہوں میں سمٹ کر زندگی سے لطف اندوز ہو اور یہ سب کچھ سوچ کر شہباز نے اپنی زبان پر لگے ہوئے مصلحت کے زنگ آلود قفل کو نہ توڑنے کا فیصلہ کر لیا

گل کہہ رہی تھی، میں ابھی تک تنہا ہوں۔ میرا کسی نے انتظار نہیں کیا۔ کئی علمی بونے میری طرف بڑھے تھے مگر میں نے ایک دریا ساگر کی تلاش میں ان سب کو ٹھکرا دیا۔ میں آج بھی کسی ایسے پرستار کی منتظر ہوں جس میں ظرف، علم، شخصیت کی عظمت کا عنصر ہے۔

شہباز نے یہ سب کچھ سنا۔ گل کی محبت کی شمع ایک بار پھر اس کی پلکوں پر سجی مگر اس بار یہ شمع کئی موتیوں کو جنم دے چکی تھی اور یہ موتی وقفے وقفے سے شہباز کے رخساروں کو چومتے ہوئے گل کی جھولی میں گر رہے تھے۔ شہباز کا ہاتھ آگے کی طرف بڑھا ہوا تھا اور گل نے بے حد خلوص سے اس ہاتھ کو تھام رکھا تھا۔

لطیفے

- ریستوران میں ویٹر کے آنے پر ایک صاحب نے اپنی محبوبہ سے کہا: "کہو کیا منگوایا جائے؟"
  میرے لئے کافی اور اپنے لئے ایمبولینس" محبوبہ نے جواب دیا۔ "دروازے کی طرف دیکھو، میرا شوہر ریستوران میں داخل ہو رہا ہے"!
- ایک یہودی بیس برس بعد نکمہ بنتی ہو کر اپنے گھر واپس آ رہا تھا۔ باپ اور بھائی اسے لینے اسٹیشن پہنچے۔ باپ اور بھائیوں کی بے ہنگم لمبی داڑھیاں جھاڑیوں کی طرح بڑھا رکھی ہیں؟"
- باپ نے جواب دیا: "بیٹے! تمہیں یاد نہیں کہ بلیڈ تم اپنے ساتھ لے گئے تھے؟"

بزمِ حریم

اس عنوان کے تحت حریمی بہنوں کی مرسلہ صرف ایک ایسی خبر ہر ماہ شائع کی جاتی ہے جو ولادت، شادی اور غمی سے متعلق ہو۔ خبر صاف صاف اور کم سے کم الفاظ میں لکھی جائے۔ خبر کے ساتھ جوابی پیسے کے جوابی ٹکٹ اور نمبر خریداری کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ جو خبریں دو تاریخ کے بعد موصول ہوتی ہیں وہ ایک ماہ کی تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔ جو خبر بغیر ٹکٹ کے موصول ہو اس کی اشاعت میں کوئی غلطی ہو جائے تو دفتر اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ البتہ غلطی کا علم ہو جانے کے بعد اس کی تصحیح کر دی جاتی ہے۔

- عائشہ تسنیم (گرگنشوری) ہمارے منجھلے ماموں جناب بی افضل الحق مالک اس ٹی گرگنشوری اور ممانی کریم النساء صاحبہ کو اللہ پاک نے ۱۵ اکتوبر ۸۳ء بروز جمعہ ایک دختر عطا فرمائی۔ نام زینب جہاں رکھا گیا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل دے اور صاحب نصیب بنائے۔

نسرین بانو (کالی پہاڑ۔ جینیا) ہماری ماموں زاد بہن نادرہ جبیں عرف شمع اور بہنوئی وقار احمد صاحب کو خدا تعالیٰ نے پہلی بار ۱۵ اگست ۸۳ء بروز جمعہ بوقت صبح ۸ بجے ایک بیٹی عطا فرمائی۔ نام بہار رکھا گیا۔ اللہ پاک بچی کو عمر طویل بخشے۔

- فرحت آراء دختر امیر حسن نرسے (پتھر، نالندہ) میرے خالہ زاد بھائی قربان اور بھابھی شمیم سلطانہ کو اللہ پاک نے ۲۹ ستمبر ۸۳ء بروز جمعہ بوقت ۱۱ بجے شب پہلی بار ایک بیٹی عطا کی۔ نام عنبر سلطانہ عرف انشاں رکھا گیا۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

- میرے محترم دوست افتخار حسین رضوی صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی رجسٹرار کی بہو چمن آرا بیگم سلمہا زوجہ سید اعتصار حسین رضوی محلہ لکھنؤ نے اطلاع دی ہے کہ ان کی ہمشیرہ عزیزہ نشاط سلمہا اور بہنوئی سید امین اختر رضوی کو اللہ پاک نے ۲۵ اکتوبر ۸۳ء بروز دوشنبہ ۱۰ بجکر ۵ منٹ پر شب میں بمقام دہلی ایک فرزند عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور صاحب نصیب بنائے۔

- فریدہ مجید (پھلور) میری تیسری بہن راحت اور بہنوئی محمد مصطفیٰ احمد (ہتی گولڈ مائنس) کو اللہ پاک نے ۹ اکتوبر ۸۳ء بروز جمعہ کو ایک لڑکی کے بعد ایک بیٹا عطا فرمایا۔ اللہ پاک اسے عمر طویل بخشے اور فخر خاندان بنائے۔

- سیما تکیہ (الفیروز) میرے بڑے بھائی امجد حسین و بھابی زینت النساء کو اللہ پاک نے ۱۰ اکتوبر ۸۳ء بروز منگل ایک دختر عطا فرمائی۔ نام فاطمہ بی بی قرار پایا۔ اللہ سے دعا ہے کہ بچی عمر طویل پائے اور صاحب نصیب ہو۔

- سمیٰ ناہید ردولوی (پرنام بٹ) میری ہمشیرہ عاصمہ تسنیم کی شادی جناب نثار احمد کے ساتھ ۲۳ اکتوبر ۸۳ء بروز اتوار بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

- افتخار التعظیم صاحب (مارٹین کا پورہ۔ لکھنؤ) کی صاحبزادی شبانہ سلمہا کی شادی عبدالحئی سلمہ کے ساتھ ۳ دسمبر ۸۳ء بروز سنیچر بوقت ۶ بجے شام بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک۔

(نسیم ردولوی)

- خریداری نمبر ۷۶۱۱ خبر بلا ٹکٹ کارڈ پر ملی۔ پھر سے ٹکٹ کے ساتھ بھیجیں۔

پیغامات نشاط

- شمع جبیں کہکشاں (بی اے) (گیا بند۔ کریم گنج) ہمارے پھوپھی زاد بھائی ابو الحیات بی۔اے (فرزند سید محمد صدر عالم صاحب مرحوم ساٹھی۔ چمپارن) کی شادی انجم آرہ عرف بے بی۔ بگھاد دختر نیک اختر سید حسن امام صاحب) کے ساتھ ۱۰ اکتوبر ۸۳ء بروز اتوار بڑے تزک و احتشام کے ساتھ انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

- نرگس فرحانہ (آرہ) میری سہیلی فردوس فاطمہ بی۔اے آنرز (دختر ڈاکٹر ظہور رضوی برق صاحب) کی شادی ڈاکٹر رئیس انور رحمٰن شعبہ اردو بھاگلپور یونیورسٹی کے ساتھ ۷ اکتوبر ۸۳ء کی شام کو وطن کرہ میں بحسن و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

شاہدہ انجم، نسرین دلشاد، فرحین نشاط (کمپی پدبنگلہ) ہمارے چچا ماما الیاس احمد عرف شہزادہ (فرزند جناب محمد عبدالرحمٰن مرحوم پرنام بٹ) کی شادی ام فاطمہ عرف تسنیم بانو (بنت جناب محمد ابراہیم صاحب مرحوم۔ مدراس) کے ساتھ ۲۴ اگست ۸۳ء بروز جمعرات حرم شادی محل، مدراس میں بخیر و خوبی انجام پائی۔ اللہ مبارک کرے۔

• سید اختیار الحق صاحب کے بھائی اسرار الحق صاحب مرحوم کے فرزند سید اقتدار الحق کی شادی صبیحہ سلمہا (دختر جناب ایاز احمد صاحب) کے ہمراہ، قاضی ٹولہ مراد آباد میں ۲۰ نومبر ۸۲ء بروز اتوار ۱۲ بجے دن میں بخیر و خوبی انجام پائی۔

• سید اختیار الحق کے بھائی سید اقتدار الحق سلمہ (فرزند جناب سید اسرار الحق صاحب) کی شادی ہمراہ صبیحہ سلمہا (دختر جناب ایاز احمد صاحب) کے ہمراہ انجام پائی۔ اس سلسلہ میں ۲۰ نومبر ۸۲ء کو دعوت ولیمہ محلہ قاضی ٹولہ۔ مراد آباد میں دی گئی۔ اللہ مبارک کرے

نسیم انہونوی

انتقال پُر ملال کی خبریں

• اے رحمٰن شریف صاحب نے کوئمبٹور سے اطلاع دی ہے کہ ان کی والدۂ محترمہ امینہ بی صاحبہ ۲۳ ر اکتوبر ۸۲ء کو دن میں تین بجکر تیس منٹ پر تین ماہ کی مسلسل علالت کے بعد انتقال فرما گئیں۔ امینہ بی صاحبہ حرم کی بہت ہی قدیم پرستار تھیں، ان کے انتقال کی خبر سے مجھے اس لئے بھی بیحد افسوس ہوا کہ ایک حرم نواز بہن کی سرپرستی سے حرم محروم ہوگیا۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نسیم انہونوی

• بہن صمدانی بیگم صاحبہ (مدراس) کے خط کے ذریعہ مولانا فاخر میاں صاحب نے فرنگی محل لکھنؤ سے اطلاع دی ہے کہ سید شاہ محمد صاحب قاضی مدراس ۱۱ ستمبر ۸۲ء کو مکہ معظمہ میں انتقال فرما گئے۔

مرحوم ۱۱ بجے دن میں باہر تشریف لے گئے تھے۔ واپس آئے تو بے حال لیٹ گئے اور بیہوش ہوگئے۔ ۲ بجے اسپتال لے جائے گئے۔ بعد مغرب اطلاع ملی کہ انتقال ہوگیا۔ مرحوم قاضی صاحب کی اہلیہ محترمہ بھی ہمسفر تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ سعودی لوگ مُردوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کرتے۔ جنازے کے ساتھ جانے والے بھی نہ تھے۔ بس تدفین کردی گئی۔ قاضی صاحب مرحوم کی اہلیہ محترمہ کا بیان ہے کہ مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس پر سلام کرنے کے بعد نکلے تو مرحوم کے باہر صدا آئی کہ آپ کا سلام قبول ہوگیا۔ انتقال کی خبر فوراً اسی روز شام تک پورے مدراس میں پھیل گئی تھی۔ اخبارات اور ریڈیو سے یہ المناک خبر لوگوں کو معلوم ہوئی۔ تمام مساجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور مولوی عزیز الدین صاحب کو قضات کے لئے نامزد کیا گیا۔ کتنے خوش نصیب تھے شاہ محمد صاحب کہ سرزمین مکہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

نسیم انہونوی

• میرے قدیم کرمفرما اور ہم وطن جناب ڈاکٹر سید غلام حیدر صاحب تعلقدار ریاست بہوا (جو انہونہ سے بہت قریب ہے)۔ ۳۰ ر اکتوبر ۸۲ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے اپنے وطن بہوا ہی میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم نے اپنی یادگار بیوہ، تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ اللہ پاک انھیں صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو اپنے دیار رحمت میں جگہ دے۔

مرحوم غلام حیدر صاحب بڑے علم دوست اور رنجان مرنج انسان تھے۔ مجھ حقیر پر بڑی نوازش فرماتے تھے۔ جب بھی لکھنؤ تشریف لاتے دفتر میں قدم رنجہ فرماتے۔ عرصہ سے صحت خراب ہوگئی، اس لئے وطن ہی میں رہتے تھے۔ (شریک غم۔ نسیم انہونوی)

• بہن شمس النساء محسن (مدراس) میرے بھائی عرفان بن حسین صاحب بندری صرف ۳۸ سال کی عمر میں ۱۷ ر اکتوبر ۸۲ء بروز سنیچر بوقت ۴ بجے سہ پہر انتقال فرما گئے، مرحوم نے گذشتہ سال حج بیت اللہ شریف کا شرف حاصل کیا تھا، اس کے بعد ہی کینسر میں مبتلا ہوئے اور عالم شباب میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔

• کے تحسین فاطمہ اور کے لبنیٰ مریم (مدراس) افسوس کہ ہماری نانی مجیب النساء صاحبہ (زوجہ۔ پی عبد الواحد صاحب) ۲۳ ستمبر ۸۲ء بروز جمعہ بوقت ۱۰ بجے شب انتقال فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ سے دعا ہے کہ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

• ہمارے دفتر کے منیجر جمیل الحسن کی بڑی بہن (اہلیہ قاضی سید منظور حسن صاحب) ۲۴ ستمبر بروز جمعہ بوقت پونے دو بجے دن بمقام ہردوئی محلہ صوفیانہ ایک مختصر علالت کے بعد انتقال فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون مرحومہ نہایت نیک خصلت، نیک سیرت اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں پروردگار عالم مرحومہ کو جوار جناب معصومہ صلوٰۃ اللہ علیہا رحمت فرماتے ہوئے پس ماندگان کو صبر جمیل کی دولت عطا فرمائے۔ سورۂ فاتحہ سے ایصال ثواب فرمانے کی استدعا ہے۔ نسیم انہونوی

پسندیدہ اشعار

اس عنوان کے تحت حریم بہنوں کا مرسلہ ایک شعر شائع کیا جاتا ہے جو پہلے سے مقررہ عنوان کے تحت بھیجا گیا ہو، شعر کا موزوں اور معیاری ہونا ضروری ہوتا ہے۔ شعر کے ساتھ اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جو اشعار ۲۰ تاریخ کے بعد وصول ہوتے ہیں وہ شائع نہیں ہو پاتے۔ جنوری کے لئے عنوان ہے "اجل" اور فروری کے لئے "عروج"۔

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مرسلہ: شہناز بیگم (بنگارا سیٹ)
مرسلہ: کشور سلطانہ۔ لال باغ۔ لکھنؤ

بجلی کی تاک جھانک مجھے ناگوار ہے
کالی گھٹا کی زلف پریشان کو کیا کروں

مرسلہ: عصمت آرا (بانکا)

زندگی کو نہ ملی جبکہ زمانے میں پناہ
تو تری زلف کی گھنگھور گھٹاؤں میں ملی

مرسلہ: مسرت واحد (پانی پت)

تمہارا یہ زلف گرہ گیر دیکھ کر صیاد
شکار آپ ہوئے، صید و دام بھول گئے

مرسلہ: قرۃ العین (سندیال)

گئی تھی کہہ کے کہ لاتی ہوں زلف یار کی بو
پھری تو باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا

مرسلہ: مس عفیرہ کرن (دالمیا ڈی)

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں، نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

مرسلہ: رفیع افزا (گرگیشوری)

نہ جھٹکو زلف سے پانی، یہ موتی ٹوٹ جائیں گے
تمہارا کچھ نہ بگڑے گا، مگر دل ٹوٹ جائیں گے

مرسلہ: نی عظمت فاروق (آمبور)

اے کاش میری آہ میں اتنا اثر تو ہو
آجائے کوئی زلف پریشاں کئے ہوئے

مرسلہ: شیلو طر فردوس (جیتول)

سرمۂ مازاغ آنکھوں میں لگایا آپ نے
پھر سنواری شانوں سے اپنے وہ زلف عنبریں

مرسلہ (صوفیہ مظفر ملکو جمشید پور)

بعد مردن ہوا احساس وفاؤں کا مری
سر جھکائے وہ ندامت سے پشیماں آئے

مرسلہ اب۔ن۔ آر۔ بنگلور)

گیسوئے تمنا کو رہ رہ کے سنواریں گے
یوں زلفوں کے سائے میں ہم رات گزاریں گے

مرسلہ (طلعت فاطمہ گومہ)

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا، زنداں سے گھبرائیں گے کیوں

مرسلہ (نجم راحت کرنول)

اٹھا بڑھایا۔

"دے دیجئے امی۔ تنخواہ مجھے دے دیجئے!"

امی نے لفافہ انھیں پکڑا دیا۔ غضنفر نے نوٹ نکالے۔ سیانے ہاتھ پھیلا دیا۔ مگر غضنفر نے طیش کے مارے نوٹ پھاڑ کے ہوا میں اچھال دیے۔ اتنے میں نیلا کافی لائی امی کے ہاتھ سے پیالی لی اور پختہ فرش پر دے ماری۔ پھر وہ پاؤں پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔ امی دم بخود تھیں۔ بچے مبہوت۔ جیسا اونچی آواز میں رو رہی تھی۔!!

کبھی کبھی مصیبتیں زندہ حیوان کی طرح انسان کو اپنا شکار بنا لیتی ہیں۔ وہ کر ایک ہی چیز پر حملہ کرتی ہیں اور مصیبت اپنے ساتھ پورا جرگہ لے کے حملہ آور ہوتی ہے۔

نصیبوں کا لکھا۔ شامت۔! ابھی گھر ہی جہنم بنا ہوا تھا کہ غضنفر کو ایک بار پھر قسمت نے نشانہ بنا لیا۔

داور عرصے سے کوششیں کر رہے تھے کہ کسی خلیجی خطے میں انھیں ملازمت مل جائے انھوں نے غضنفر کو خط لکھا تھا کہ وہ اپنی والدہ، بیوی اور بچے سمیت جلد ہی جانے والے ہیں۔ لہٰذا کسی طرح وہ ننھے جمشید کا بندوبست کر لیں۔ یا اگر غضنفر پسند کریں۔ تو پھر وہ اس پر بھی تیار ہیں کہ جمشید کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں!۔

غضنفر نے خط پڑھ کر سر تھام لیا۔ کم از کم دو سال تک جمشید کی کوئی فکر انھیں نہیں تھی!۔ داور نے اس کے دودھ کا [illegible] غضنفر سے نہیں لیا تھا

(باقی آئندہ)

اب انھیں پتا چلا ان کا ارمان تھا وہ پوتے کو گودی میں لیے جا نماز پر بیٹھی ہوں اور بہو ان کو دہی بڑے، روٹیاں، بچو بھر سالن اور چائے کی پیالی دے آئے۔ انھوں نے ایک ایک خواب دیکھے تھے۔ تبھی تو بہن کی لڑکی پر رال ٹپکائی تھی۔ اس سے بڑھ کر مزاج داں دوسری لڑکی نہیں ہو سکتی تھی!

اپنی حیرت کن مسرتوں میں انھیں بیٹے کا تاریک چہرہ دکھائی نہ دیا۔ اس کے علاوہ دال اندر سے باہر تک نے ٹپک کیا کم تھی!۔

غضنفر جوابی تار دے کر آئے اور اپنے کمرے میں پڑ گئے۔ دل کی بیقراری کا عالم اور تھا۔ اپنی بے وفائی، کم ہمتی اور بزدلی کا دکھ انھیں پگھلائے دیتا تھا۔ کہکشاں کی کسمپرسی کا خیال رگ رگ سے جان کھینچ رہا تھا۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ امی کو اپنی کرنی کا بھرن بھرنے دیں اور اڑ کر کہکشاں کے پاس پہونچ جائیں۔ بُرے بُرے وحشت انگیز وسوسوں نے دل کی دھڑکن کو خطرناک حد تک تیز کر دیا تھا!

کہکشاں چارپائی پر بے سدھ پڑی دکھائی دے رہی تھی۔

اسے اس کے آبا وراثی سنبھالے ہوئے آسمان کی وسعت میں اڑے جا رہے تھے۔

وہ کفن میں لپٹی گہوارے میں ڈالی جا رہی تھی۔

اور ان کے دل کی گہرائیوں میں ایک نوزائیدہ بچہ بلک بلک کے رو رہا تھا۔

وحشت زدہ ہو کر وہ کھڑے ہو گئے۔

تبھی دروازے سے چھوٹے بھائی جعفر نے سر نکال کے جھانکا۔

"کیا ہے؟" ان کے ہونٹ ہلے آواز نہ نکلی۔

"آپ کا ٹیلی گرام۔!" جعفر نے فارم ان کی طرف بڑھا دیا۔

"ٹیلی۔ گرام"۔ غضنفر کا دل دھک سے رہ گیا۔

ہاں۔ بڑے بھیا۔ یہ قصہ کیا ہے۔ پرسوں سے آپ کے نام دو تین ٹیلی گرام آچکے ہیں؛ جعفر نے پوچھا۔

اور بقول نوشینہ کے وہ بہانے بازی کے ماہر تھے۔ بلا ارادہ بول اٹھے: "دو دوست جو شادی میں شریک نہیں ہو سکے۔ تار کے ذریعہ مبارکباد بھیج رہے ہیں"

اچھا اچھا؛ جعفر بولا۔ اور غور سے ان کا چہرہ دیکھ کر سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ بڑی بے تابی سے غضنفر نے لفافہ پھاڑا۔

"حالت خراب ہے۔ فوری آؤ" لڑکا" صبح کے وقت مرا لڑکا۔ ان کا دل رو پڑا یا خدا کس کی حالت خراب ہے۔ بچے کی یا ماں کی۔ انھوں نے لفافہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی کتابوں میں چھپایا اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر سسکنے لگے۔!

کوئی راہ ایسی نظر نہیں آرہی تھی جو در محبوب تک پہونچاتی۔

ماحول عجیب تھا ان کے دل میں کئی غم پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ اور جسم کی دنیا پر خوشیوں کا نکھار آنے والا تھا جسم و روح میں کوئی بُعد نہیں لیکن ان کی کیفیتوں اور محسوسات میں کتنا بڑا تضاد ہے۔!

نجانے کیا وقت تھا۔ جب نبیلہ اندر آئی۔ اور چہکتی ہوئی آواز میں بولی۔

"بڑے بھیا آپ کو ابا جان باہر بلا رہے ہیں۔

"کیوں؟"

"یہ بھیے کیوں کا کیا مطلب؟ آپ کہاں ہیں۔ ارے آپ کو دولہا بنانے کے لیے اور کیوں؟" نبیلہ بھی چیخی۔

اچھا تو اب جنازہ روانہ ہوگا؟۔

جنازہ کس کا جنازہ!" نبیلہ حیرت سے بولی۔

پھینکا ہے۔ الگ الگ رازداریاں ہوتی ہیں۔ سکھائی پڑھائی ہوتی ہے۔ یہی بہو کا درجہ ہونا تھا تو بیاہ کر کیوں لائی تھیں"

اس گھر میں تمہارے لیے کیا کمی ہے!" امی نے کہا۔

میرے لیے یہاں رکھا کیا ہے؟" سیما چیخنے لگی" جب سے سہرے کے ناگ سر سے لپٹے ہیں۔ یہی رونا ہے۔ محبت الفت نام کی کوئی چیز مجھے نہیں ملی۔ بیگار میں پڑی پڑی دن گزار رہی ہوں۔ کبھی کسی نے میرے لیے کپڑے کے نام کی ایک دھجی، زیور کے نام پر سونے چاندی کا ایک تار بھی خریدا ہے۔ کبھی میرے بچے کے لیے کچھ آیا ہے۔ آپ ادھر ادھر کی تمام آمدنی سمیٹ لیتی ہیں۔ آپ کی ہوس ابھی گئی نہیں بڑھاپا آگیا مگر دنیاداری سے آپ کا جی نہیں بھرا۔ قیامت کے بوریے ——!"

سیما!" غضنفر دہاڑ کر بولے۔ اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ اماں کو سکتہ ہو گیا۔ سیما نے پھر کہا۔

"سچی بات پر ایسے ہی مرچ لگتی ہے۔ اب مجھے دکھ بھوگنا نہیں ہے۔ میں جاتی ہوں امی کے پاس۔ آپ کو اپنا گھر بار مبارک"

دلھن۔ آئندہ سے تم ہی خرچ کیا کرو" امی نے بمشکل آواز نکالی" میں نے تو اس خیال سے روپیہ تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا کہ اتنی جلدی تم کو گھر گرہستی کے جنجال میں الجھانا نہیں چاہتی تھی"

نہیں چاہیے مجھے خیرات" سیما بولی" آپ اپنی بیٹی کا جہیز اپنے شوہر کی کمائی سے جوڑیے۔ میں سب جانتی ہوں۔ نوشینہ کو دوہرا دوہرا جہیز دیا گیا۔ اب نبیلہ بھی جوڑے گی۔ مگر مجھے میرے شوہر کی تنخواہ چاہیے"!"

امی نے غضنفر کی طرف دیکھا۔ ان کے لبوں پر تحقیر انگیز مسکراہٹ تھی۔ انھوں نے

تم جاؤ۔ میں آرہا ہوں۔

اس کے جانے کے بعد بھی وہ باہر نہیں نکلے۔ دیر ہوگئی تب امی آئیں۔

گلابی رنگ کی زرق برق ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اپنا سارا زیور گلے میں لاد لیا تھا چمکیلی چوڑیوں کے پیچھے پیچھے موٹے موٹے کنگن جگمگا رہے تھے۔ اور وہ خود سر سے پاؤں تک چمک رہی تھیں۔ بیٹے کی بارات لے چلی تھیں۔ کوئی مذاق تھوڑی تھا!۔

بلاتے بلاتے زبان سوکھ گئی۔ انھوں نے کہا۔ آخر کر کیا رہے ہو جو باہر نہیں نکلتے؟

غصے اور بیزاری کا ایک لاوا سا غضنفر کے سینے میں مچلا۔ لیکن کیا فائدہ۔ اندھے کے آگے رونا اپنے نین کھونا۔ امی کسی کو دھارنے والی تھیں ہی نہیں۔ وہ چپ چاپ ان کے ساتھ نکلے اور پھر نوشینہ کے شوہر حمید انھیں لیے ہوئے باہر چلے گئے۔

بارات بڑی شاندار تھی۔ روشنیوں کی بہتات، باجوں کی جھنکار میں جلوس آگے بڑھا۔ اور غضنفر سہرے کے بوجھ سے سر جھکائے رومال آنکھوں پر رکھے بلا آواز رو رہے تھے۔

باجوں کا ترانہ بڑا ہیجان خیز تھا۔ تیرے ہاتھوں میں پہنا کے چوڑیاں۔

اللہ اللہ۔ اس بے چاری نے ایک دفعہ اور شاید پہلی ہی دفعہ نیلے رنگ کی ساڑھی خریدنے کی تمنا ظاہر کی تھی۔

غضنفر کے گرم گرم آنسوؤں کی روانی تیز ہوگئی۔

کیا نقصان ہو جاتا میرا۔ اگر ایک ساڑھی میں اسے نیلے رنگ کی خرید دیتا۔ اس کی زندگی کا فسانہ کتنا ناکام کتنا مختصر سا ہے۔ کہانیوں کی سی بات۔ ادھر وہ

اچھا اب پوچھوں گی۔

دو تین دنوں تک انھیں کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملا۔ غضنفر کمپنی سے نو دس بجے آئے۔ کبھی کھانا کھاتے اور اکثر یونہی سو جاتے! کسی سے بات چیت کی نوبت ہی نہ آئی!

اتوار کا دن تھا!۔ امی موقعہ کی تلاش میں تھیں۔ غضنفر غسلخانے سے نکلے اور نبیلہ سے گرم کافی کی فرمائش کی۔ پھر وہ ماں کے پاس بیٹھ کر بچے کو دیکھنے لگے جو وہیں تخت پر لیٹا ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا!۔ انھوں نے کوئی خاص تاثر دیے بغیر اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں گئے اور پانچ منٹ بعد واپس آکر امی کی گود میں ایک لفافہ ڈال دیا اور بولے۔ رات کو جب میں آیا آپ سو چکی تھیں۔ رکھ لیجئے۔

امی نے دیکھا وہ کتنے بدل گئے تھے۔ چہرہ سنجیدہ۔ آنکھوں کے گرد سرمئی حلقے۔ بڑی بڑی مونچھیں پال رکھی تھیں۔ زیادہ متین اور خاموش لگ رہے تھے۔ پچیس چھبیس برس کی عمر میں ایک معمر اور سنجیدہ مرد۔

بیٹے۔ اس میں سے کچھ دلھن کے لیے رکھ لیا کرو۔ امی نے دبی زبان سے کہا۔ تم اپنی پوری تنخواہ مجھے دے دیتے ہو۔ کہیں دلھن کو ناگوار نہ گزرے!۔ ہمارے لیے دوکان کی آمدنی اور گھر کا کرایہ کافی ہو جاتا ہے۔

خشک لہجہ میں غضنفر نے کہا۔ مجھے دینا چاہیئے۔ میں دے دیتا ہوں۔ دفعتہً دالان میں نبیلہ دکھائی دی۔ نجانے کیا ہوا تھا۔ شعلہ جوالہ نظر آ رہی تھی۔ زہر آلود لہجے میں بولی۔ میرے اور بچے کے حق میں ایک کانی کوڑی بھی آپ کے بیٹے کے کلیجے سے نہیں نکلتی۔ پوری پندرہ سو کی رقم آپ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ گھر کا کرایہ دوکان کی آمدنی۔ یہ سب کتنے ہوتے ہیں۔ مجھے تو آپ لوگوں نے دودھ کی مکھی کی طرح نکال

موت و حیات کی کشمکش میں پڑی سسک رہی ہوگی اور ادھر۔ میں دلہن بیاہنے جا رہا ہوں۔

یکایک ان کے دل میں بڑی شدت سے ٹیس اٹھی۔ سہرا دونوں ہاتھوں سے ہٹا کے وہ بے تابانہ چیخے: روکو۔ روکو:

کیا ہے۔ کیا بات ہے: حمید ان کے پاس بیٹھے تھے۔ حیرت سے پوچھنے لگے۔

کیا ہوا تمھیں:

پانی۔ پانی:

ان کی کار رک گئی۔ پورا جلوس رک گیا۔

ایک لڑکا دوڑ کر کہیں سے پانی لے آیا۔ انھوں نے پانی پیا۔ اور پھر۔ بارات باجے بجاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

اور اس کے بعد غضنفر کو ہوش نہ رہا کہ کیا کیا ہوا۔ ان کے چاروں طرف ایک گاڑھی دھند چھائی ہوئی تھی۔ روشنیاں کہیں دور ٹمٹما رہی تھیں۔ جہانوں کی چیخ پکار، غل، بیابانوں کی ہائے ہو معلوم ہو رہا تھا۔ ادھر ادھر آگے پیچھے انسانی ہیولے ایک دوسرے کے پیچھے لپک رہے تھے۔ خوشیوں کا طوفان ایسا لگتا تھا جیسے عود و عنبر کی بھینی بھینی مہک ہو جو کسی لاش کے سرہانے سے اٹھ رہی ہو۔!

خواب کے سے عالم میں نکاح کی ساعتیں گزریں: اور پھر بے ہوشی کی حالت میں وہ گھر واپس آئے۔!

ہنگامہ اب کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ لیکن اس بھری محفل میں تنہائی کا احساس روح پر نشتر سے لگا رہا تھا۔ محفل سے بڑھ کر کوئی تنہائی نہیں۔ ان کے درد و غم کی شریک ان کی بہن تھی۔ لیکن اس وقت وہ بھی ان کے پاس نہیں آئی۔ شاید

بن جانے کے غرور نے اسے آسمان پر پہونچا دیا۔ اپنے سامنے کسی کی اوقات ہی نہ سمجھتی تھی۔ امی کو پوتے کی پیدائش نے ایک بار پھر نہال کر دیا لیکن بیانے اپنے بچے کو انھیں چھونے بھی نہ دیا۔ بے چاری بڑی مایوس ہوئیں۔ اب اپنے میکے کی پرانی خادمہ حضوراں بوا کے پاس بیٹھ کر رو دیا کرتیں کبھی کبھی شوہر کے سامنے دل کی بھڑاس نکالتی تھیں۔ ابا جان بے چارے جو سارا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ وہ خاموش سے تھے بیوی کی گریہ و زاری پر سمجھانے لگے۔

"کنیز فاطمہ! ہمارا تمھارا وقت گیا۔ بھائی۔ زمانہ انسانوں کے درمیان کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ تم غم کیوں کھاتی ہو۔ دلہن کو بھی گھر گرہستی کا لطف اٹھانے دو۔ آخر وہ بھی تو کچھ تمنائیں رکھتی ہوں گی تمھیں پرواہ کیا ہے۔ مزے میں کھاؤ پیو خوش رہو۔ اس طرح صحت کو گھن لگا لینے سے کیا فائدہ۔ مت دخل دیا کرو۔ دلہن کے معاملات میں!"

کیا سوچا تھا میں نے۔ کیا ہوا: امی شوہر کو بھرا دیا کر رونے لگیں: سب سے بڑا دکھ مجھے اپنے غضنفر کا ہے۔ وہ کتنا خاموش رہنے لگا ہے۔ نجانے کون کون سے غم دل میں اتار رہا ہے۔ آپ نے دیکھا وہ اپنے بچے کی پیدائش پر بھی خوش نہیں ہوا:

ہاں یہ بات البتہ قابل غور ہے۔ میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ وہ کوئی صدمہ مسلسل سہہ رہے ہیں۔ اس قدر خاموش اور خود فراموش تو میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بیگم! تم نے اس کا سبب دریافت نہیں کیا؟:

"کیا دریافت کروں۔ میں تو اس سے شرمندہ رہتی ہوں:

"بہرحال۔ تم اس کی ماں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسی بات کا منتظر ہو کہ تم پوچھو تو وہ کھل جائے!"

پر مسرت ماحول میں وہ اپنے بھائی کے غم کو بھول چکی تھی!۔

وہ اپنے کمرے میں آئے۔ سہرا نوچ کر فرش پر پھینکا، مرصع شیروانی اور دستار اتار کر ادھر ادھر اچھالی۔ جوتے اتارے اور سلیپنگ گاؤن پہن کر کے کرسی پر آ بیٹھے پسینے سے شرابور جسم پر ذرا سی ٹھنڈی ہوا لگی تو حواس درست ہوئے۔ اور تب انھوں نے اس عرصہ میں پہلی بار سوچا۔ اس طرح دل کو بے قابو کرنے سے کوئی فائدہ نہیں اب تو جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ ایک بڑا طوفان سر سے گزر گیا۔ پاؤں کی وہ زنجیریں جو خاص وقت پر پہننی تھی پہن چکے۔ اب وقت ان کا ہے۔ رات کے یہ چند گھنٹے گزر جائیں۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی کہکشاں کے پاس چلے جائیں گے۔ اب انھیں آندھی طوفان بھی نہیں روک سکتے!!

رات کے سناٹے ہوئے پل بھاگ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ شور و غل ماند پڑنے لگا تھکے ہارے لوگ ادھر ادھر پڑ کے سو گئے۔ روشنیاں نیند اسی پلکیں جھپکانے لگیں۔ تاروں کا غبار مدھم ہو گیا۔ انیس تاریخ کا زرد زرد چاند اپنی تھکی کرنیں سمیٹے بوجھل قدموں سے پچھم کی طرف رواں دواں تھا۔ پچھلے پہر کی خنک و معطر ہوائیں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ فضا میں ابھی تک مہندی، سہاگ کے عطر اور سہرے کے پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

غضنفر کی دلہن سیما اپنی زرنگار مسہری پر بیٹھی تھی۔ جھلمل جھلمل کرتی ایک سرخ مرصع گٹھری جیسے پھولوں کے انبار میں چھپا دیا گیا تھا!۔ اس کے کمرے میں سناٹا تھا۔ ساتھ آنے والی ملازمہ دولہا میاں کا انتظار کر کے سونے جا چکی تھی! کمرے میں ایک خوابگوں نیلا بلب روشن تھا! چوڑے دروازے پر پڑا ہوا گلنار پردہ ہواؤں کی شوخیوں سے آہستہ آہستہ بل کھا رہا تھا۔ دروازہ چشم انتظار کی

خاموش رہنے لگی تھی۔ کہکشاں کے مرنے کی خبر سن کر نوشینہ کے دل پر بڑا بوجھ آ گرا۔ وہ اب پہلے کی طرح میکے نہیں آتی تھی!۔

غرض یہ کہ ہر شخص اپنی اپنی راہ پر گامزن تھا!۔

غضنفر کے دل سے کبھی کہکشاں کی یاد و محبت محو نہ ہوئی۔ وہ بہت گم صم بے حد خاموش رہنے لگے تھے۔ فکروں نے ان کی ساری شگفتگی چھین لی تھی۔ انھوں نے اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے غبار کو دور کرنے کے لیے بے تحاشہ سگریٹ پینے شروع کر دیے تھے۔ اپنی فکروں میں غرق سگریٹ پر سگریٹ سلگاتے چلے جاتے!۔

کالے پانی کے ان سزا یافتہ مجرموں میں بس اکیلی سیما ہی تھی۔ ہر پریشانی سے آزاد۔ ہر فکر و غم سے بے پرواہ۔ اسے شوہر سے وہ محبت کبھی نہ تھی جو عام طور پر مثالی روایت بن چکی ہے۔ اس نے شوہر کو اپنا غلام سمجھ رکھا تھا!۔

غضنفر ہر ماہ کچھ وقت بچا کے کریم نگر ضرور جاتے اور اپنے بچے کو دیکھ آتے تھے۔ کہاں تو وہ ایک جاندار ڈھیر کا سا تھا۔ کہاں تو خوب گل گوتھنا سا حسین نکل آیا تھا۔ ہر ایک کو دیکھ کر کلھیا کا سا لال لال منہ کھول کر ہنس دیتا۔ دادا دادی حقیقی معنوں میں اپنا بیٹا سمجھتے تھے۔ نشاط ایک پر محبت شفیق ماں کی طرح اس کی پرورش کر رہی تھی۔ سب سے زیادہ گھر کے دونوں چھوٹے بچے دادر کی والدہ سے مانوس تھے۔

انھوں نے اس کا نام جمشید رکھا تھا!۔ بے حد چاہتی تھیں۔ غضنفر نے بڑی بی سے کوئی بات چھپائی نہیں تھی۔!۔

اور پھر سال ڈیڑھ سال بعد سیما بھی ماں بنی۔ پہلی ہی دفعہ بیٹے کی ماں

طرح کھلا ہی رہا۔ پنکھا سَن سَن کرکے گھومتا رہا۔ رات کے قدم منزل نور کی جانب بڑھتے رہے۔ دُلھن ایک انداز سے بیٹھی رہی۔ اور بیٹھی ہی رہ گئی۔

غضنفر نے اپنے کمرے میں بیٹھے بیٹھے سحر کردی۔!

صبح جاگی۔ ایک بار پھر ہنگامے جاگے!۔

ابا جان گھر کے اندر آئے۔ اور انھوں نے خاصے ناگوار لہجے میں غضنفر کو آواز دی۔ ان کی نئی پوزیشن سے قطعی لاپرواہ نظر آرہے تھے۔ غضنفر اپنی دھندلی بیداری کے طویل خواب سے بیدار ہوئے۔ اور بوجھل قدموں سے باہر نکلے!۔

ابا جان نے ایک تیز نگاہ ان پر ڈالی۔

جی۔!" غضنفر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

معاف کرنا۔ تمھیں جگانا پڑا۔ یہ تمھارا تار۔!" ابا جان بولے۔

تار۔!" غضنفر کے پھر بچھو نے ڈنک مارا۔

پرسوں نرسوں سے اب تک بڑے بھیا کے نام کتنے تار آچکے ہیں:"

مظفر بولا۔

تار ہے؟۔ مولا خیر کرے:" امی چیخ پکار سن کر کچن سے دوڑی آئیں۔ "کس کا تار ہے۔ ارے پڑھو تو سہی۔ بھابی جان تو اچھی ہیں۔ بھائی جان نے خط میں لکھا تھا کہ ۔۔۔!؟

آپ کا نہیں ہے:" غضنفر نے اس بوچھاڑ سے گھبرا کر جلدی سے کہا:

میرے ایک دوست کا ہے:

مبارکباد کا ہے؟" ظفر نے پوچھا۔

نہیں: وہ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں آئے۔ پیچھے پیچھے نوشینہ

ہموار نہیں ہو جاتے۔ وہ ان کے بچے کی اپنے بچے کی طرح پرورش کرے گی!۔

موت کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ کسی نہ کسی طرح دل پر صبر و ضبط کی سلیں تو رکھنی ہی پڑتی ہیں۔ انھوں نے بھی تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور سوچا کہ ان کے سامنے زندگی کا خارزار میدان پھیلا ہوا تھا۔ اس کو انھیں تنہا عبور کرنا تھا۔ لہٰذا انھوں نے بھی خود کو تسلی دے دی۔ کہکشاں کا ساتھ بس اسی قدر تھا!۔

اب انھیں اس کے بچے کے لیے جینا تھا۔ وہ ہمیشہ ان سے دور نہیں رہ سکتا تھا لاکھ والد والدہ اس کی پرورش کرتے۔ لیکن خود غضنفر کا ضمیر اس کی اجازت کیسے دیتا۔

اب ان کی زندگی کا درخشاں دور ختم ہوا۔ دوسرا تکلیف دہ دور شروع ہو گیا تھا۔ وقت کی بے رحم گردش نے ان کے کندھوں پر بھاری فرائض کا بوجھ رکھ دیا۔ ایک طرف بوڑھے والدین کی راحت و آرام کی فکر تھی۔ دوسری طرف تلاش روزگار کا اہم مسئلہ۔ اور تیسرا مسئلہ بچے کی پرورش، اس کی کفالت کے ذرائع۔ ان سب پر مستزاد بیگم کی ناز برداری۔ ان کی جلی کٹی سننا اور برداشت کرنا بھی ان کے فرائض میں شامل تھا!

ان چھ سات مہینوں میں وہ قطعی بدل چکے تھے۔ ان کی ساری خوش مزاجی اور بذلہ سنجی کافور ہو چکی تھی۔ وہ ہنسنے ہنسانے والے کہلاتے تھے۔ لیکن ان کی ہنسی ان سے روٹھ گئی تھی۔ مسکراہٹ خاص ہونٹوں کے لیے ہوتی ہے ہر لب پر نہیں آتی۔! جو مدتوں دکھ کا زہر پیتا رہے۔ وہ ہنس کیسے سکتا تھا!۔

زندگی ان کے لیے مسلسل نوحہ بن کر رہ گئی۔

پھر دوڑ دھوپ کرکے انھوں نے ایک ادویہ ساز کمپنی میں ملازمت کرلی۔ مظفر نے اپنی تعلیم ختم کردی۔ وہ باہر جانے کی تیاریاں کررہا تھا۔ ابا جان کو جنرل اسٹور سے چھٹی دے کر اب وہ خود دوکان دیکھنے لگا تھا۔ ظفر اور جعفر پڑھ رہے تھے! نیلہ بڑی

کیا جینا ؟۔ اور وہ مرگئی۔ آخر وقت تک وہ غضنفر کا انتظار کرتی رہی
آخری سانسوں میں ان کا نام لیتی رہی۔ اور پھر ناامیدی نے اس کا دل
موت کی گہری وادی میں اتار دیا۔!

غضنفر اس وقت پہونچے جب اس کا جنازہ آخری سفر کے لیے تیار
تھا!۔ وہ اس کے لیے ایک نیلی ساڑی لے گئے تھے۔ جو اس کے گہوارے
پر اڑھا دی گئی۔

انھوں نے اپنے بچے کو دیکھا تھا۔ بے حد لاغر وکمزور بے وزن سا بچہ
تھا۔ چند گھڑیوں کا مہمان لگتا تھا!۔ اسے اپنی بانہوں میں لے کر وہ
اتنا روئے تھے کہ ان کے ساتھ داور کے گھر والے رو پڑے تھے۔ مگر آنسو ان کے ساتھ
پچھتاوے کا مداوا نہ بن سکے۔ ان کے سامنے بچے کا بڑا مسئلہ آکھڑا ہوا۔ اسے کون پالے گا! اسے
کہاں لے جاتے۔ انھوں نے اسے سینے سے لگا کر کہا تھا۔

میرے بچے۔ تیرا بدنصیب باپ تجھے کچھ نہیں دے سکتا۔ رحم کر اپنے باپ پر۔ اپنی ماں
کے پاس واپس چلا جا:

اور تب داور کی امی نے بچہ ان کے ہاتھوں سے لے لیا اور غضنفر کو اپنے گلے لگا کر وعدہ
کیا تھا کہ۔ بچے کو وہ پالیں گی!۔

داور نے غضنفر کے تمام حالات اپنی امی سے کہہ دیے تھے اور وہ خود بھی کم وبیش کچھ
جانتی ہی تھیں۔ غضنفر ان سے کتنا ڈرتے تھے۔ ان پر زبان ہلانے کی بھی سکت نہ تھی۔
داور کی امی کے اس فیصلے سے انھیں کچھ سکون ہوا۔

داور اپنی حسین اور خوب سیرت بیوی نشاط کو گھر لے آئے تھے۔ اس کی گود میں بھی
دو ماہ کا ننھا سا بیٹا تھا۔ ان نے ان سے وعدہ کیا کہ جب تک غضنفر کے گھر میں حالات

بھی آئی۔!

بڑے بھیا: وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

مرتعش انگلیوں سے غضنفر نے کاغذ چاک کیا۔ تحریر پر نظر ڈالی اور ساتھ
ہی کاغذ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ وہ دم بخود سکتہ زدہ سے
خلا میں گھورنے لگے۔! نوشینہ نے جھک کر فارم اٹھایا اور ڈرتے ڈرتے
تحریر دیکھی۔ صرف دو لفظ تحریر تھے :ک۔ ایکسپائرڈ:!
غضنفر بے ہوش ہو کر فرش پر گر گئے!!

اور پھر کتاب زندگی کے ورق الٹتے گئے تو غضنفر کی امی کو پتہ چلا کہ اس
کتاب میں طربیہ باب کم اور حزنیہ باب زیادہ ہیں۔ ابھی تک انھوں نے
ایک مطلق العنان ملکہ کی حیثیت سے سارے گھر پر حکومت کی تھی۔ شوہر کی
محبت پر نازاں، بچوں پر مفتخر، خاندان میں سرخرو۔! لیکن اب ان کا
بھرم جاتا رہا تھا۔ سیما گھر کی بڑی بہو کے روپ میں کیا آئی تھی کہ سب لوگ
عجیب بے ضابطہ بن کے رہ گئے تھے۔ سیما کو اپنے دیوروں اور نندوں کی بے تکلفی
قطعی پسند نہ تھی۔ اسے ہنسنا ہنسانا بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں
پر شفقت اسے آتی نہ تھی۔ جب تک وہ گھونگھٹ کاڑھے رہی کسی کو پتہ نہ
چلا کہ تیوری پر کتنے بل تھے۔ جب لاج کا گھونگھٹ الٹا تب جوہر کھلے۔ پھر
دن بدن وہ پرانی ہوئی تو زبان بھی کھل گئی۔ خواہ مخواہ بڑبڑاتی تھی۔

مزاج میں خشکی کا مادہ گھنی کی طرح پڑا تھا۔ جہاں کہیں چپکے چپکے باتیں کرتی دیکھتی فوراً کہتی کہ اس کی برائیاں ہو رہی ہیں۔ اب یہ عالم ہو گیا کہ بہن بھائی مل کے باتیں کرتے ہچکچاتے تھے! سب میں پھوٹ سی پڑ گئی تھی۔ ابا جان بس دوکان اور دیوان خانے کے ہو کر رہ گئے۔ امی کو جانماز پر بیٹھے بیٹھے بہو کے ہاتھ کا کھانا کھانے کا ارمان رہ گیا۔ بلکہ ان کے سر پر یہ بلا آئی کہ بہو بیگم کو پکا پکایا کھانا سینی میں لگا کے ان کے کمرے میں بھجوانا پڑتا تھا۔ سب کے ساتھ کھانا انھیں پسند نہ تھا!

پھر ہی بیٹے میں گھر سب کے لیے جیل خانہ ہو کر رہ گیا۔! امی کے منھ میں زبان ہی نہ تھی کہ وہ غضنفر سے شکایت کرتیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے دبے الفاظ میں تذکرہ کیا تھا۔ دلھن کے عادات اطوار عجیب ہیں! جواب میں نہایت رکھائی اور بے رخی سے غضنفر نے کہا تھا۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ کی بہن کی صاحبزادی آپ کی پسندیدہ بہو ہیں۔ جن کی خاطر آپ نے مجھے گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔ میں اب کیا بتا سکتا ہوں۔ اگر وہ آپ سب کے ساتھ اخلاق سے پیش نہیں آتیں تو فرمایئے۔ میں انھیں آپ کے سامنے طلاق دے دوں۔ آپ سمجھتی ہیں کہ میرا کلیجہ چھلنی نہیں ہے۔ نہیں۔ امی ایسا مت سوچیے۔ آپ نے مجھ سمیت سب کو ایک ساتھ سولی دی ہے:"

اور امی کے دل پر چھریاں سی چل گئیں۔ غضنفر بھی بیوی سے خوش نہیں۔ سابقہ تو دن رات اسی بے چارے کو رہتا ہے۔ نجانے اندر اندر کیا بگڑ کے رہا کرتی ہے۔!

امی کو غم کے زخم چاٹنے لگے۔ دلھن کا غم انھیں آہستہ آہستہ کھوکھلا کرتا رہا وہ بہو کو نصیحت کرتے ڈرتی تھیں۔ نجانے جواب میں انھیں کیا سننا پڑے۔ جو انھوں نے کبھی چھوٹوں سے تو کجا۔ اپنے شوہر کے منھ سے بھی نہ سنا تھا۔ آج تک انھوں نے سب کو سنائی ہی تھیں کسی کی سنی نہ تھی۔ مگر اب۔ خاموشی دکھ، پچھتاوا۔ یہ مل کر ان کی صحت کو متاثر کرنے لگے۔!

اب وہ پہروں گم صم رہتیں۔ اپنی تمام آرزوؤں سے انھوں نے ہاتھ دھو لیے یہ بالکل سچ ہے کہ وقت کا مرہم بڑے سے بڑے زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ ماضی پر ایک چادر اڑھا دیتا ہے اور بالآخر ایک دردناک حال ایک بھیانک ساسکر اور ایک جانگسل غم محض ماضی کی ایک جھلک یاد بن کر رہ جاتا ہے۔ زخم مٹ جاتا ہے۔ اپنے نشان چھوڑ جاتا ہے۔

اور وقت کی گرد اپنے ساتھ جب کہکشاں کو اڑا لے گئی تو اپنے پیچھے ایک ویران اور سوگوار سناٹا چھوڑ گئی۔

بڑا کربناک حادثہ تھا۔

کہکشاں کا بچہ دنیا میں آیا اور اپنی پہلی سانس بھی نہ لے سکا تھا کہ کہکشاں دنیا سے چلی گئی۔ مسلسل صدموں نے اسے وقت سے پہلے خاک کر دیا تھا۔ غضنفر کے طعنے کا زخم اندر اندر پھیلتا گیا۔ وہ پھر تو منھ سے کچھ نہ بولی۔ لیکن اسے غضنفر کے محسوسات کا اندازہ کرکے بے پناہ صدمہ ہوا۔ وہ ایسی لڑکی نہ تھی جو کسی کو پھانس لیتی۔ ۔۔ وہ مجبور ہو گئی تھی۔ غضنفر یہ بات سمجھے نہ تھے۔ کہکشاں کو ان خاص حالات میں آرام ملتا، دوائیں نہیں ملیں۔ اس نے چاہا بھی نہیں۔ بس وہ مرجانا ہی چاہتی تھی۔ نظروں سے گرنے کے بعد جینا بھی